فیوض الباری

شرح

صحیح البخاری

[illegible] [illegible]

مؤلف

علامہ سید محمود احمد رضوی

مقدمہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

مکتبہ رضوان لاہور

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا

احادیث نبویہ کا محبوب مقبول ذخیرہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب
امام الدنیا امیر المومنین فی الحدیث رأس المحدثین استاذ الحفاظ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری
قدس سرہ الباری کی تالیف صحیح البخاری کا سلیس اردو ترجمہ اور مکمل شرح

فیوض الباری

فی شرح

صحیح البخاری

حصہ اوّل

علامہ سید محمود احمد رضوی

ناشر: مکتبہ رضوان، داتا دربار روڈ لاہور

مختصر تعارف

مولف فیوض الباری

تحریر ــــ حکیم العلماء علامہ عبدالحکیم صاحب شرف قادری شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ لاہور

اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جس شخص کو دین کا فہم حاصل ہو جائے، رحمت الٰہیہ اس کے شامل حال ہوتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **ومن یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی بصیرت عطا فرما دیتا ہے۔

پھر اگر اس کے ساتھ تقویٰ و پرہیز گاری، حق گوئی اور بے باکی، رشد و ہدایت اور تبلیغ اسلام، تدریس و تصنیف اور اعلاء کلمہ حق ایسے اوصاف بھی جمع ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ۔ فضیلۃ الشیخ، جلالۃ العلم و المعرفۃ، محدث عصر، حضرت علامہ مولانا سید محمد دیدار علی شاہ الوری قدس سرہ العزیز ایسی ہی جامع صفات اور نادر روزگار شخصیت تھے، ان کی دینی اور ملی خدمات اس لائق ہیں کہ ان پر علمی اور تحقیقی مقالے لکھے اور شائع کئے جانے چاہئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دو قابل صد فخر فرزند عطا فرمائے۔

۱۔ غازی کشمیر علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری

۲۔ مفتی اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری

علامہ سید ابوالحسنات قادری نے میدان سیاست، خطابت قومی خدمات اور تصنیف میں وہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، ان کی عظمت و جلالت کا یہ عالم تھا کہ مخالف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے نامور علماء بھی ان کے قدموں میں بیٹھنے اور ان کے جوتے سیدھے کرنے کو سرمایہ فخر تصور کرتے تھے، علامہ سید ابوالبرکات قادری رحمہ اللہ اپنے دور کے مفتی اعظم پاکستان، یکتائے زمانہ محدث اور بے مثال مناظر تھے، اپنے اور بیگانے سب ہی ان کی جلالت علمی اور ژرف نگاہی کے معترف تھے۔

۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں پاکستان کی تاریخ کا سخت ترین مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا، کسی کو لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود حضرت سید ابوالبرکات ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن پاک کا درس دیتے۔ فتنہ قادیانیت کے موضوع پر تقریر

کرتے، ختم نبوت کے بارے میں قادیانیوں کے شبہات کا جواب دیتے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی پرزور تائید فرماتے۔ اس اثناء میں کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ آپ کا لاؤڈ سپیکر بند کرا دے۔

۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء میں جنگ ستمبر کے بعد علماء اہل سنت کا ایک وفد جنرل محمد ایوب خاں سے ملا، جس میں حضرت علامہ سید ابو البرکات قادری رحمتہ اللہ تعالیٰ بھی شامل تھے، ایوب خاں نے مزاج پرسی کے بعد دعا کے لیے کہا تو سید صاحب نے فرمایا:

دعا کیا کروں؟ آپ نے عائلی آرڈیننس نافذ کیا ہے جس کی بعض دفعات، صریح طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہیں، آپ نے شاستری کی ارتھی کو کندھا دیا، ایک مشرک کی ارتھی کو کندھا دینا کب جائز ہے؟

جنرل محمد ایوب خاں نے وعدہ کیا کہ عائلی آرڈیننس میں شریعت کے مطابق ترمیم کر دی جائے گی، اور شاستری کی ارتھی کو کندھا دینے کے متعلق کہا کہ یہ ایک رسمی چیز تھی اور مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس خاندان نے اعلاء کلمۃ الحق میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ اسی عظیم خانوادے کے جلیل القدر فرزند، وسیع النظر محدث، عظیم فقیہ اور محقق، حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی، مدظلہ العالی شارح بخاری ہیں، جو خاندانی وجاہت کے علاوہ قابل قدر خصوصیات کے حامل ہیں۔ اکثر و بیشتر جب بھی ان سے ملاقات ہوئی انہیں کسی نہ کسی دینی مسئلہ میں غور و فکر کرتے ہوئے پایا، ان کی گفتگو عام انداز سے ہٹ کر، مسائل دینیہ کے بارے میں ہی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں گہری سوچ بچار کے بعد لکھتے ہیں۔ ان کی تحریرات، مفید عام موضوعات پر ہیں اور عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی مدظلہ العالی کی ولادت باسعادت ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ علمی اور روحانی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی میں نشو و نما پائی، درس نظامی کی ابتدائی کتابیں آمد نامہ گلستان وغیرہ اپنے جد امجد، سید المحدثین مولانا سید محمد دیدار علی شاہ الوری قدس سرہ سے پڑھیں، بقیہ کتب، جید اور متبحر اساتذہ سے پڑھیں۔ شرح تہذیب، قطبی اور مختصر المعانی وغیرہ کتب منطقی بابا مولانا محمد دین بدھوی سے، ملاحسن، تفسیر بیضاوی وغیرہ کتب ملک المدرسین استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عطا محمد چشتی گولڑوی مدظلہ العالی سے پڑھیں۔

ان کے علاوہ دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا جن میں حضرت مولانا مہر الدین جماعتی رحمۃ اللہ علیہ شارح مختصر المعانی کا اسم گرامی نمایاں ہے۔ درس حدیث اپنے والد گرامی، مفتی اعظم پاکستان حضرت شیخ الحدیث علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری قدس سرہ سے لیا۔ ۱۹۴۳ء میں حزب الاحناف، لاہور کے سالانہ جلسے میں آپ کی دستار بندی کرائی گئی۔ اس اجلاس میں پاک و ہند کے اکابر علماء مثلاً حضرت صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مفتی آگرہ مولانا مفتی عبدالحفیظ، محدث اعظم ہند، علامہ سید محمد محدث کچھوچھوی، مولانا محمد یار، گڑھی شریف، علامہ عبدالغفور ہزاروی، حضرت مولانا سید مختار اشرف کچھوچھوی قدست اسرارہم تشریف فرما تھے، حضرت صدر الافاضل نے اس موقع پر بطور تبرک اپنی ٹوپی عنایت فرمائی۔

حضرت علامہ رضوی مدظلہ نے ۷ر جون ۱۹۴۳ء کو موقر جریدہ "رضوان" جاری کیا، جو ابتداً" ہفت روزہ تھا، پھر پندرہ روزہ ہوا، بعد ازاں ماہنامہ کی صورت میں شائع ہوا اور بحمدہ تعالیٰ آج تک شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدے میں وقیع اور گرانقدر مقالات شائع ہوا کرتے تھے، اس جریدے نے دین متین کی حفاظت اور مسلک اہل سنت و جماعت کی تبلیغ و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس رسالے کے کئی قیمتی نمبر، راقم کی نظر سے گزرے ہیں، مثلاً نماز نمبر، ختم نبوت نمبر، چکڑالویت نمبر اور معراج النبی نمبر وغیرہ، مشہور شیعہ مناظر مولوی اسمٰعیل گوجروی سے متعدد مسائل پر مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مباحثوں میں علامہ رضوی مدظلہ کا قلم علمی اور تحقیقی جواہر بکھیرتا رہا۔ علامہ کا استدلال، عالمانہ گرفت، مخالفین کے اعتراضات کے ٹھوس جوابات، یہ سب چیزیں پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت علامہ کی تصانیف رضوی گوجروی مکالمہ، بیعت رضوان، باغ فدک، حدیث قرطاس حضور کی نماز جنازہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ جب بھی ملی اور ملکی مسئلہ پیش آیا، یہ حضرات راہنمائی میں پیش پیش رہے۔ تحریک پاکستان میں دارالعلوم حزب الاحناف، لاہور کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جامع مسجد وزیر خاں، لاہور، تحریک پاکستان کا اہم ترین سٹیج تھی۔ اس اسٹیج سے پاکستان کی حمایت میں اٹھنے والی آواز اتنی زوردار تھی کہ اس کی گونج پورے پنجاب بلکہ اس کے اردگرد تک سنی جاتی تھی۔

۲۷ر تا ۳۰ر اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس کے باغ فاطماں میں منعقد ہونے والی آل انڈیا سنی

کانفرنس، تحریک پاکستان کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اجلاس میں اہل سنت و جماعت کے علماء و مشائخ نے اجتماعی طور پر مطالبہ پاکستان کی زبردست حمایت کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ جب تک پاکستان نہیں بن جاتا ہم آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس اجلاس میں مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری، علماء پنجاب کے وفد کے ہمراہ شریک ہوئے، اس وفد میں علامہ سید محمود احمد رضوی بھی شامل تھے۔

۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت چلائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ قادیانیوں کو پاکستان کے کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، اس تحریک کے صدر علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری تھے۔ علامہ سید محمود احمد رضوی نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی ذاتی مشین پر پمفلٹ چھاپ کر فوج اور پولیس کے نوجوانوں میں تقسیم کئے اور انہیں تحریک کے مقاصد سے آگاہ کیا اور گرفتار ہوئے، قلعہ لاہور اور سنٹرل جیل لاہور میں مقید رہے۔

۲۳؍ مارچ ۱۹۷۰ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں نام نہاد کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں "مولانا" بھاشانی مہمان خصوصی تھے۔ اس کانفرنس کا نعرہ تھا "ماریں گے۔ مرجائیں گے۔۔۔ سوشلزم لائیں گے"۔ اسی کانفرنس میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام لینن گراڈ تجویز کیا گیا۔ اہل سنت کے علماء و مشائخ نے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے سوشلزم کے پروپیگنڈے کا موثر جواب دینے اور کسان کانفرنس کے اثرات زائل کرنے کے لیے عین اسی جگہ ۱۳، ۱۴؍ جون ۱۹۷۰ء کو عظیم الشان سنی کانفرنس منعقد کی۔ جس میں حضرت مولانا فضل الرحمن قادری مدنی مدظلہ، مدینہ طیبہ سے تشریف لاکر بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

اس کانفرنس کا منظر دیدنی تھا۔ تاحد نظر پھیلے ہوئے غلامان مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جم غفیر اور تین ہزار علماء و مشائخ کے مبارک اجتماع سے وہ سماں پیدا ہوا کہ باطل کی تمام تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اس کانفرنس میں اسلامیان پاکستان کو مقام مصطفیٰ کے تحفظ اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا نعرہ ملا، اور اعلان کیا گیا کہ اسی منشور کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں حصہ لیا جائے گا۔ اس کانفرنس کے کنوینر حضرت علامہ رضوی مدظلہ اور ان کے رفقاء تھے۔ انہوں نے ملک بھر کے دورے کرکے کانفرنس کے انعقاد کے لیے فضا ہموار کی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مولانا مختار الحق مرحوم اور ان کے رفقاء نے بھی اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے گرانقدر

خدمات انجام دیں۔

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں تمام مکاتب فکر کے اشتراک سے مجلس عمل تحفظ ختم نبوت معرض وجود میں آئی۔ علامہ رضوی مدظلہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ آپ نے ملک کے طول و عرض میں دورے کئے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بالآخر ۷؍ ستمبر ۱۹۷۴ء کو اسلامیان پاکستان کے شدید دباؤ کی بنا پر قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

علامہ رضوی مدظلہ ۱۹۷۴ء تک جمعیۃ العلماء پاکستان کے مرکزی جنرل سیکرٹری رہے۔ ایک مرحلے پر جمعیۃ داخلی انتشار کا شکار ہو گئی، کوشش بسیار کے باوجود اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ ۱۹۶۹ء میں حضرت علامہ ابو البرکات سید احمد قادری قدس سرہ نے حزب الاحناف لاہور میں ملک بھر کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی، حضرت سید صاحب کی دعا و برکت سے تمام علماء اہل سنت شیر و شکر ہو گئے۔ علامہ رضوی پہلے سنی بورڈ پھر مجلس عمل جمعیۃ العلماء پاکستان کے کنوینر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر جمعیۃ کو فعال بنانے کے لیے دن رات کام کیا اور گوناگوں مشکلات کے باوجود اپنی مہم میں کامیاب رہے۔

یا رسول اللہ! کانفرنس

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اور تعظیم و تکریم اہل سنت و جماعت کا طرہ امتیاز اور سرمایہ ایمان ہے۔ بارگاہ رسالت کی بے ادبی اور گستاخی دیکھ اور سن کر خاموشی سے برداشت کر جانا ان کے نزدیک غیرت ایمانی کے منافی ہے۔ حضرت علامہ رضوی مدظلہ کو یہ عقیدہ ورثہ میں ملا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں برطانیہ کے نام نہاد ڈاکٹر منہاس نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ اس کتاب کی اشاعت کے خلاف جمعیۃ علماء پاکستان نے لاہور سے جلوس نکالے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کو ضبط کیا جائے۔ لیکن حکومت نے مطالبہ تسلیم کرنے کی بجائے ۱۸؍ جنوری ۱۹۷۱ء کو علامہ سید محمود احمد رضوی اور مولانا اکرام حسین مجددی، مولانا فیض القادری اور پیر طریقت میاں جمیل احمد شرقپوری کو گرفتار کر لیا۔ پھر ان حضرات کی رہائی کے لیے حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی اور حضرت مولانا حامد علی خاں کی قیادت میں ایک وفد ۲۰؍ جنوری کو اس وقت کے گورنر پنجاب، جنرل عتیق الرحمن سے ملا اور ان راہنماؤں کی رہائی کے بارے میں گفتگو کی۔

چنانچہ ۱۲؍ جنوری کو تمام حضرات رہا کر دیے گئے۔

۲۲؍ مارچ ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد، لاہور میں محفل قرأت منعقد ہوئی، مصر کے معروف قاری عبدالباسط نے تلاوت کی، سامعین میں ہر مکتب فکر کے افراد موجود تھے۔ اسی اثناء میں کسی نے نعرہ رسالت بلند کیا اور اس کے جواب میں کسی بدبخت نے مردہ باد کا نعرہ لگایا، نعرہ لگانے والے حافظ غلام معین الدین کو مارا گیا اور اسے مرزائی کہہ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

علامہ رضوی نے اس سانحہ کا بروقت نوٹس لیا اور اپریل ۱۹۸۴ء ملک بھر کے علماء و مشائخ اہلسنت کی میٹنگ بلا کر مجلس عمل علماء اہلسنت قائم کی اور طے پایا کہ ۱۲؍ اپریل کو حزب الاحناف لاہور میں یارسول اللہ کانفرنس منعقد کی جائے، چنانچہ اس کانفرنس میں ہزاروں علماء و مشائخ اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ سامعین نے شرکت کی۔ اہل سنت و جماعت نے مغرب اور عشاء کی نمازیں شاہی مسجد میں باجماعت ادا کیں اور رات کے ساڑھے بارہ بجے تک یارسول اللہ کانفرنس کا پروگرام جاری رہا۔ شاہی مسجد کے در و دیوار نعرہ رسالت سے گونجتے رہے۔ چاروں میناروں، برجیوں اور مسجد کے چپے چپے پر یارسول اللہ اور سبز گنبد کے عکس والے جھنڈے لہراتے رہے اور دنیا پر واضح ہو گیا کہ اس دور بے عملی میں بھی مسلمان ناموس رسول کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

مشہور صحافی جناب انور قدوائی نے نوائے وقت لاہور میں لکھا۔

"علامہ محمود احمد رضوی نے جس بات پر علم احتجاج بلند کیا تھا وہ اہم ترین اور سنگین مسئلہ تھا جس سے اختلاف بریلوی کیا؟ کوئی مسلمان بھی نہیں کر سکتا تھا"۔ اس کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا

(۱) کہ اس واقعہ کی تحقیق کی جائے اور گستاخ رسول کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۲) سنی اوقاف علیحدہ کیا جائے۔

یہ جنرل ضیاء الحق کی مارشل کا دور تھا۔ مگر اس کے باوجود لاہور اور ملک بھر میں یارسول اللہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ مجلس عمل نے ۱۲؍ مئی کو شاہی مسجد لاہور اور نومبر ۱۹۸۵ء کو عرس داتا گنج بخش کے موقع پر یارسول اللہ کانفرنسیں منعقد کیں۔ جس کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے۔

نوائے وقت کے جناب محترم انور قدوائی کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں ۱۲؍ مئی کو علامہ

ص

محمود احمد رضوی نے تمام سرکاری رکاوٹوں کو روند ڈالا اور نہ صرف جلوس نکالا بلکہ بادشاہی مسجد میں جلسہ بھی کیا۔ علامہ محمود احمد رضوی کی اپیل پر جس طرح لوگ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے ناموس رسول کے لیے جس جذبہ و جوش کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے دو فائدہ ہوئے ہیں۔

ایک تو یہ کہ علامہ محمود احمد رضوی جو ایک عرصہ سے علیل تھے، پھر جوان ہو گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ملک کے اندر اور باہر وہ عناصر جو یہ سوچ کر خوش تھے کہ پاکستان میں ایمان کی طاقت کمزور ہو گئی ہے اور یہ کہ روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آئیں گے۔ ان کے خواب بکھر گئے ہیں اور یہ کہ اسلام کے ماننے والوں کا ایمان ابھی تک قائم ہے اور اس ملک میں کسی کو اسلام کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

تدریس و تالیف

علامہ رضوی جہاں دقیق النظر محدث، نکتہ رس فقیہ اور مفتی صاحب طرز ادیب اور قادر الکلام خطیب بھی ہیں۔ ان کی تقریر علم و فضل، سنجیدگی اور متانت کا بہترین مرقع ہوتی ہے۔

علامہ رضوی نے زمانے طالب علمی میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دارالعلوم حزب الاحناف میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور درس نظامی کی اکثر کتب پڑھاتے رہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے تصنیف و تالیف اور دارلعلوم حزب الاحناف کی تعمیر و انتظام کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

علامہ رضوی کی تمام تصانیف، علم و تحقیق کا منہ بولتا ثبوت اور عوام و خواص کے لیے مفید ہیں اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی سب سے اہم تالیف بخاری شریف کی شرح فیوض الباری ہے جس کے اب تک دس پارے پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں خصائص مصطفےٰ، جامع الصفات، روح ایمان، شان مصطفیٰ، مقام مصطفیٰ، معراج النبی، علم غیب رسول بصیرت، لمحات فکر، دین مصطفیٰ، شان صحابہ، چراغ ہدایت، مسائل نماز، روشنی، اسلامی تقریبات، جواہر پارے، فتاوٰی برکات العلوم، سیدی ابوالبرکات، بھی آپ کی مشہور مقبول تصانیف ہیں۔

علامہ سید محمود احمد رضوی کو اللہ تعالیٰ نے تین صاحبزادیاں اور سات صاحبزادے عطا فرمائے ہیں۔ صاحبزادوں میں سے سید مصطفیٰ اشرف رضوی بڑے ہونہار اور باصلاحیت نوجوان ہیں جن کے بارے میں، توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قابل صد فخر آباؤ اجداد کے مسند نشین

گے۔

ستارہ امتیاز

حضرت علامہ رضوی نے غیر ممالک کے تبلیغی دورے بھی کئے ہیں۔ آپ کی دینی، علمی اور ملی خدمات کی بنا پر حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز بھی دیا۔ آپ تقریباً سات سال ۱۹۸۴ء تک مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے بلامقابلہ چیئرمین بھی رہے اور ۱۹۸۱ء سے ۳۱ر اپریل ۱۹۸۴ء تک اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ نے ممالک اسلامیہ کا بھی دورہ کیا اور تین حج اور ایک عمرہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

فیوض الباری شرح صحیح بخاری

علامہ سید محمود احمد رضوی مدظلہ کو اللہ تعالی نے بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ قلم و قرطاس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تحقیق کا مادہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کی تمام تصانیف علم و تحقیق کا بہترین شاہکار اور افادیت عامہ کی حامل ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کی جملہ تصانیف، عوام و خواص میں مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی تصانیف کے نام اس سے پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس وقت ان کی اہم تصنیف فیوض الباری کا مختصر تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔

فیوض الباری کا انداز بیان یہ ہے۔

۱۔ ہر حدیث کا بامحاورہ اور سلیس اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔
۲۔ الفاظ حدیث کی لغوی تحقیق پیش کی گئی ہے۔
۳۔ حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔
۴۔ ائمہ اربعہ رضی اللہ تعالی عنہم کے فقہی اختلافات کی تفصیل پھر روشن دلائل سے مذہب حنفی کی ترجیح اور تحقیق
۵۔ مسلک اہل سنت کو مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فرق باطلہ اور منکرین حدیث کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے معقول اور مسکت جوابات دیئے ہیں۔
۶۔ امام بخاری اکثر و بیشتر احادیث کی پوری سند بیان کرتے ہیں۔ فیوض الباری میں اختصار کے پیش نظر سندوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۷۔ امام بخاری ایک ہی حدیث کو مختلف ابواب میں بیان کر جاتے ہیں۔ فیوض الباری میں ابواب کے عنوانات تو باقی رکھے گئے ہیں، لیکن حدیث کو ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور اسی جگہ اس سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۸۔ حسب ضرورت راویوں کے مختصر احوال بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۹۔ ابتداء میں مفصل مقدمہ ہے جس میں حجیت حدیث، مقام رسول عہد نبوی، عہد صحابہ، عہد تابعین میں حدیث کی حفاظت و کتابت وغیرہ امور پر پر مغز علمی گفتگو کی گئی ہے۔ نیز امام بخاری کا تذکرہ مختصر مگر دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ علم حدیث کی چند ضروری اصطلاحات بھی بیان کی گئی ہیں۔

فیوض الباری کو جلیل القدر محدثین نے داد و تحسین سے نوازا ہے۔ قومی اخبارات نے شاندار تبصرے کئے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ فرماتے ہیں بخاری شریف کی ایک بلند پایہ شرح جن خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے وہ تمام خوبیاں "فیوض الباری" میں پائی جاتی ہیں.... اکثر و بیشتر اردو تراجم میں جو کمزوریاں اور نقائص پائے جاتے ہیں الحمد اللہ! فیوض الباری کا دامن ان سے پاک ہے۔ اس کا مطالعہ عوام کے لیے نہیں بلکہ خواص اہل علم، طلباء اور مدرسین کے لیے بھی نہایت ہی مفید ہے۔

فاضل مولف نے یہ کتاب لکھ کر وقت کے اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ اور ان کی یہ گران مایہ تالیف اہل سنت پر ایسا احسان عظیم ہے جس کو ہماری آئندہ نسلیں بھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ حضرت علامہ سید محمود احمد رضوی، مولف فیوض الباری، اپنی اس قابل قدر تالیف پر یقیناً شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری مرحوم فرماتے ہیں اس کتاب نے از اول تا آخر دریائے علم حدیث کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور حدیث پاک کی وہ خدمت کی ہے جس کے متعلق سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظها و وعاها واداها فرب حامل فقه لیس بفقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه** (مشکوٰۃ ص ۲۵) اللہ تعالیٰ اس بندے کو حسن و رونق عطا فرمائے جس نے میری حدیث سنی اور اس کو یاد کیا اور اسے سمجھا اور ادا کیا، اس لیے کہ بہت سے علم اٹھانے والے عالم نہیں اور بہت سے علم کے حامل اسے سناتے ہیں جو اس سے زیادہ فقیہ ہے۔

الغرض علامہ سید محمود احمد رضوی زید مجدہ نے فہم و افہام و تفہیم و اتقان و تلقین کا حق ادا کیا ہے اور حقائق و معارف حدیث کے دریا بہا دیئے ہیں اور مشککین کے شکوک و شبہات کو دفع کر کے حنفیہ و عقائد اہل سنت و جماعت کی خوب اور بہت خوب خدمت کی ہے۔ (عبدالمصطفیٰ ازہری، علامہ: تقریظ فیوض الباری ج ۵ ص ۲)

۲۷ر جولائی ۱۹۵۹ء کو روزنامہ نوائے وقت کے تبصرہ نگار نے پہلی جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

آج کے دور میں اکثر تصانیف، محض پرانے مصنفین کی محنتوں کو نئے قالب میں ڈھال کر پیش کی جاتی ہیں اور ایک روش یہ ہو گئی ہے کہ نئے مصنفین، اس محنت، کاوش، وسیع مطالعہ اور عمیق فکر سے کام نہیں لیتے جو کسی تصنیف کو مکمل بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس ماحول میں "فیوض الباری" ایک ایسی نئی تصنیف نظر آتی ہے جس میں مصنف نے وسعت علم کے فن پر عبور کے علاوہ محنت کا ثبوت دیا ہے جس سے اس کی افادیت علماء اور عوام سب کے لیے یکساں ہو گئی ہے۔ (فیوض الباری: ج ۳ ص ۳)

روزنامہ جنگ، شمارہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۶۱ء میں تبصرہ نگار تیسری جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ترجمہ و تشریح علمی لحاظ سے بہت بلند اور زبان کے لحاظ سے نہایت سلجھا ہوا ہے، حضرت مولف کا انداز تحریر مدرسانہ، فقیہانہ اور ناصحانہ ہے، ان کی تحریر میں تعصب، عناد، اور کرختگی نہیں، بلکہ اکثر مقامات پر فروعی مسائل پر تشدد کرنے والوں کو خوف خدا یاد دلایا گیا ہے۔

ان آراء اور تبصروں کے بعد راقم کی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ ہاں یہ دعا ضرور ہے کہ مولائے کریم حضرت علامہ کا سایہ تادیر سلامت رکھے اور اس شرح کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے صاحبزادوں کو علم دین میں کمال حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ اپنے آباء کی مسند کو سنبھال سکیں۔

سند حدیث اور سلسلہ بیعت

حضرت [illegible] رضوی کے جد امجد شیخ [illegible] حضرت [illegible] دیدار علی صا[illegible] [illegible]ث الوری علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری علیہ الرحمہ سے [illegible] درس حدیث [illegible] اس [illegible] [illegible] حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی علیہ الرح[illegible] سے دوبارہ [illegible] کا

درس لیا اور آپ سے بیعت ہوئے۔ حضرت گنج مراد آبادی نے آپ کو اپنی خلافت سے بھی نوازا اور سلاسل اولیاء اللہ کے معمولات و وظائف کی اجازت عطا فرمائی۔

حضرت علامہ رضوی کے والد محترم شیخ الحدیث علامہ ابو البرکات علیہ الرحمہ طریقت میں اعلیٰ حضرت شاہ سید علی حسین شاہ صاحب سجادہ نشین کچھوچھہ شریف علیہ الرحمہ سے بیعت ہیں اور ان کے خلیفہ مجاز بھی اور علامہ رضوی کو بھی اعلیٰ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ سے بیعت و خلافت حاصل ہے۔

علامہ رضوی نجیب الطرفین سید ہیں اور سیدنا امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے علامہ رضوی اپنے نام کے ساتھ رضوی لکھتے ہیں اور سلسلہ اشرفیہ میں مرید و خلیفہ ہیں۔ نیز آپ کو سلسلہ اشرفیہ کے موجودہ سجادہ نشین صدر شریعت حضرت ابوالمسعود شاہ سید محمد مختار اشرف الاشرفی الجیلانی مدظلہ العالی سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف انڈیا نے بھی اپنی خلافت سے نوازا ہے۔

آخر میں یہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ سید محمود احمد رضوی کا سلسلہ حدیث ایک واسطہ سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ تک پہنچتا ہے کیونکہ آپ کے والد ماجد قدس سرہ کو امام احمد رضا بریلوی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ (اور امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی قدس سرہ تک صرف چار واسطے ہیں۔ ۱۔ استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد صاحب رضوی قادری اشرفی۔ ۲۔ امام المحدثین حضرت مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ صاحب رضوی قادری فضل رحمانی۔ ۳۔ قطب وقت شیخ المحدثین حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی۔ ۴۔ سراج الہند شیخ الحدیث حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

* * *

• حسب فرمائش، صاحبزادہ سید فواد اشرف رضوی

مختصر فہرست مضامین

فیض الباری (پارہ اول) شرح صحیح البخاری

مضمون	صفحہ
مقدمہ کتاب	۱۸
تمہید اور مصنف کی سند حدیث	
خطبہ اور چند اہم گزارشات	
حجیت حدیث پر تفصیلی گفتگو	۱۹
حضور کے فرائض نبوت اور آپ کا منصب ومقام	
رسولوں کا منصب مرتبہ ومقام	۲۵
وحی متلو وغیر متلو	۳۱
حضور علیہ السلام پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی	
صحابہ کرام کا حدیث نبوی سے استدلال وامتثال	۳۶
جمع وتدوین حدیث	۳۹
عہد نبوی وعہد صحابہ وتابعین میں حفظ حدیث کا اہتمام	۴۲
کتابت حدیث کا اہتمام	۴۳
روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط	۴۹
حفاظت حدیث کے قدرتی اسباب	۵۱
مختصر حالات سیدنا امام بخاری علیہ الرحمہ، ولادت، حلیہ، اخلاق جودت ذہن، حلقہ درس	۵۳
جلاوطنی و وفات، تاریخ وفات	۵۷
تدوین بخاری اور بخاری شریف کا پورا نام	۵۸
احادیث بخاری کی تعداد	
صحاح ستہ، علم اصول حدیث	۶۰
حدیث کی تعریف	
حدیث کی قسمیں	۶۱
افتتاح بخاری	۶۵
باب	
باب حضور پر وحی کی ابتداء کیسے ہوئی	۶۹
رسول اور نبی کی تعریف	۷۲
تفسیر آیت	۷۴
حضرت نوح آدم ثانی ہیں	۷۵
عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے	
ہجرت کی اقسام	۸۰
حدیث مکہ کے بعد ہجرت نہیں اس کے معنی	
صحابہ کرام کی ہجرت کا منشا بھی	۸۱ ب
ہجرت کے لغوی و شرعی معنی اور اس کے اہم مسائل	۸۳
اعمال وعبادات کا مدار خلوص نیت پر ہے	۸۴
فساد نیت کا انجام	۸۵
حدیث الاعمال ..... الخ کے مسائل اور ائمہ کرام کے استدلالات پر تفصیلی گفتگو	۸۷
نزول وحی کی کیفیت	۹۱
وحی کی شدت	
ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات	۹۲
حضور کی ازواج ام المومنین ہیں	۹۳
بندے جن امور کے مکلف نہیں انہیں زیر بحث نہ لایا جائے	۹۷

مضمون صفحہ
وحی کے لغوی معنیٰ ۹۹
وحی کے شرعی معنی ۱۰۰
وحی و الہام میں فرق ۱۰۱
حضور کے ساتھ وحی کا آغاز ۱۰۲
غارِ حرا کا مجاہدہ
حضور پر سب سے پہلی وحی ۱۰۳
نزولِ وحی کی مدت
وحی کی اقسام وحی کی سات صورتیں
وحی متلو و غیر متلو؟
بوقتِ وحی حضور کی کیفیت ۱۰۵
وحی کی ابتدا رویائے صالحہ سے ہوئی
رویائے صالحہ و صادقہ کا فرق ۱۰۶
رویا کے اقسام اور کونسا رویا نبوت کا جزو ہے؟
رویائے صالحہ نبوت کا ایک جزو ہے۔ غیر نبی کے خواب کا حکم اور اس کی شرعی حیثیت ۱۰۷
غارِ حرا میں جبرئیل کی آمد
غارِ حرا میں جبرئیل بشکلِ بشر حاضر ہوئے
سورۂ اقرا کی تفسیر
لقد خشیت علی نفسی ۱۱۳

مضمون صفحہ
کا جواب؟
ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۱۱۶
ورقہ بن نوفل ۱۱۷
عبرانی زبان کی اصل
لفظ ناموس کی تحقیق ۱۱۸
لفظ ملک کی تحقیق
لفظ جبرئیل
حضرت جبرئیل کا اصلی نام ۱۱۹
فترۃ الوحی ۱۲۰
تفسیر آیت سورۃ مدثر ۱۲۱
حضور کا نام لے کر ندا کرنا ممنوع ہے ״
نماز میں تکبیر تحریمہ فرض ہے ۱۲۳
وثیابک فطہر کے معنیٰ
والرجز فاھجر کے معنیٰ ۱۲۵
حضور کے سینہ میں الفاظ اور معانی۔ قرآن کے جمع کرنے کا اللہ ذمہ دار ہے ۱۲۶
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۲۷
رمضان میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور ۱۲۸
حضور علیہ السلام اجود الخلق تھے ۱۲۹

مضمون صفحہ
نزولِ قرآن کی ابتدا اور کتبِ سماویہ کے نزول کی تاریخیں ۱۳۰
ہرقل کے دربار میں حضور کے متعلق سوال و جواب ۱۳۱
سلاطین کو اسلام کی دعوت ۱۳۷

کتاب الایمان

اسلام کی ہمہ گیری ۱۴۰
عقیدہ کی اہمیت و ضرورت ۱۴۱
عقیدہ اعمال کی اساس ہے ۱۴۲
ایمان کے بغیر عمل بیکار ہے
ایمان اور کفر کی تعریف
ثبوتِ قطعی، ضروری و بالضرورۃ و ضروریاتِ دین کی تعریف ۱۴۴
اسلام، ایمان، مسلم و مومن میں فرق ۱۴۶
[illegible] اور [illegible] اور [illegible] [illegible] ہے؟ ۱۴۸
بالثبوت کے معنیٰ
[illegible] الدلالت کے معنیٰ [illegible]
ضروریات دین اور قطعیات کے حکم [illegible]

مضمون	صفحہ
ضروریاتِ دین میں تاویل مسموع نہیں	۱۵۰
کفر کے لیے تمام ضروریاتِ دین کا انکار ضروری نہیں	
ارتداد، زندقہ اور الحاد کی تعریف، فتویٰ تکفیر میں احتیاط بہت ضروری ہے	۱۵۱ ۱۵۲
اگر کسی کلام میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں ؟	۱۵۳
مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ	
اہلِ قبلہ کی تعریف	۱۵۴
کفر و شرک و ارتداد کے دنیوی و اخروی احکام	۱۵۵
ایمان کی تعریف میں آئمہ کا اختلاف	۱۵۷
ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے	۱۵۸
اس کے عقلی و نقلی دلائل ؟	
امام شافعی کے نزدیک ایمان کی تعریف	۱۵۹
ایمان کی تعریف کے متعلق امام ابوحنیفہ و شافعی کے اختلاف کی حقیقت، گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ؟	۱۶۰
گناہ کبیرہ نو ہیں	

مضمون	صفحہ
ایمان کے متعلق معتزلہ و خوارج کا مسلک ؟	۱۶۱
ایمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا ؟	۱۶۲
ایمان کے متعلق امام اعظم کے مسلک پر شبہ کا جواب	
حضور کا ایمان اور حضرت جبرئیل کا ایمان عام لوگوں کے ایمان کے مثل نہیں ہے	
باب اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے	
حضرت عمر بن عبد العزیز کے حالات اور آیت لیطمئن قلبی کی تفسیر	۱۶۷ ۱۶۸
حضرت معاذ بن جبل کے حالات	
حضرت ابن مسعود و ابن عمرو	۱۷۰
امام مجاہد کے حالات	۱۷۱
اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے	۱۷۲
کیا نماز کا تارک کافر ہے ؟	
باب امور ایمان کے بیان میں	۱۷۴
آیت لیس البر ان تولوا وجوھکم کی تفسیر	
ایمان کے اثرات و ثمرات کا بیان	۱۷۶
حضرت ابوہریرہ کے حالات	۱۷۷

مضمون	صفحہ
باب مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں	۱۷۸
باب کونسا مسلمان افضل ہے	۱۷۹
حضرت ابوموسیٰ اشعری کے حالات	
باب کھانا کھلانا علامت ایمان ہے	۱۸۰
سلام سلام کی اہمیت	۱۸۵
سلام کے ضروری مسائل	
باب مومن کی شان یہ ہے جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے	۱۸۶
کسی ایک کام کو اسلامی قرار دینے کا مطلب ؟	۱۸۷
حضرت قتادہ کے حالات	۱۸۸
باب حُبِّ رسول شرطِ ایمان ہے	۱۸۹
باب حلاوۃ الایمان (لذت ایمان کے بیان میں) اللہ و رسول سے محبت کے معنی	۱۹۱
باب انصار سے محبت علامتِ ایمان ہے	۱۹۲

مضمون	صفحہ
صحابہ سے محبت ایمان ہے اور ان سے عداوت منافقت ہے	
حضور کا صحابہ کو بیعت کرنا	
عاصی کو سزا دینا اور مطیع کو ثواب عطا فرمانا اللہ پر واجب نہیں ؟	۱۹۶
کیا حدودِ شرعیہ گناہ کا کفارہ ہو جاتے ہیں ؟	۱۹۷
حضرت عبادہ بن صامت کے حالات	۲۰۰
باب فتنوں سے بھاگنا بھی علامتِ ایمان ہے	
گوشہ نشینی کا حکم اور حضرت ابو سعید خدری کے حالات	۲۰۱
باب حضور کا فرمانا : میں تم سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہوں	
وسوسہ کے احکام ، وسوسہ منافی اسلام نہیں ؟	
مسئلہ عصمتِ انبیا اور آیت لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک کی تفسیر	۲۰۴
باب تفاضل اہل الایمان	۲۰۶
حضرت عمر کی فضیلت	۲۰۷
خواب کی تعبیر لینا جائز ہے	

مضمون	صفحہ
باب حیا بھی ایمان کی نشانی ہے	۲۰۹
باب فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ	
تارکِ صلوٰۃ عمداً کا حکم اور عمل کی اہمیت	۲۱۱
باب من قال ان الایمان هو العمل	۲۱۲
کیا اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہیں ؟	
باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ	۲۱۴
اسلامِ معتبر و اسلامِ غیر معتبر کا بیان	
خوف کی حالت میں قبولِ اسلام کا حکم	
امورِ باطنہ پر حکم نہ لگانا چاہیے	
حضرت سعد بن وقاص کے حالات	۲۱۷
باب اسلام کا پھیلانا علامتِ ایمان ہے	
حضرت عمار بن یاسر کے حالات	۲۱۸
باب خاوند کی ناشکری کے متعلق اور اس کی توضیح کہ بعض کفر بعض سے کم ہوتا ہے۔	

مضمون	صفحہ
کفر کے لغوی معنیٰ اور اس کی قسمیں	۲۱۹
کفر اور کفرانِ نعمت کے معنیٰ	
لعنت کے معنیٰ اور اس کے احکام	
باب گناہوں کے مرتکب کو کافر نہیں کہا جائیگا	۲۲۰
مومن عاصی کا حکم	۲۲۱
حضرت ابو بکر کے حالات	۲۲۲
حضرت ابو ذر کے حالات	۲۲۴
باب ایک ظلم دوسرے ظلم سے کم رتبہ کا ہوتا ہے	
ظلم کے معنیٰ	
باب منافق کی علامتوں کے بیان میں	۲۲۵
نفاق عملی و اعتقادی کی تعریف	۲۲۶
بعض منافقانہ اعمال و افعال کا بیان	
باب لیلۃ القدر میں قیام علامتِ ایمان ہے	۲۲۹
ایمان و احتساب کے معنیٰ	۲۳۰
لیلۃ القدر کے احکام	
باب جہاد بھی اسلام سے ہے	۲۳

مضمون	صفحہ
مجاہد کو ہر صورت ثواب ملتا ہے	۲۳۲
باب رمضان کی راتوں میں نفل پڑھنا ایمان کی شاخ ہے	۲۳۴
باب بامید ثواب رمضان کے روزے رکھنا ایمان کی شاخ ہے	
باب دین آسان ہے	۲۳۴
قرآن نے منحرف یہودیت وعیسائیت کی مذمت کی ہے	۲۳۵
باب نماز بھی ایمان سے ہے	۲۳۷
قیام مکہ کے دوران قبلہ کس سمت تھا؟	
تحویلِ کعبہ کی حکمتیں	
حضرت براء کے حالات	۲۴۰
باب اسلام کی خوبی کے بیان میں	
ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملتا ہے	۲۴۱
باب اللہ عزوجل کو وہ کام بہت پسند ہے جو ہمیشہ پابندی سے کیا جائے	۲۴۲
باب ایمان کی کمی بیشی کے بیان میں	۲۴۲
آیت الیوم اکملت لکم دینکم کی تفسیر	۲۴۳
آیت "جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا اس کی نجات ہوگی"۔ اس کا مطلب ومفہوم	۲۴۴
ایمان میں کمی اور ضعف کا کیا مطلب ہے؟	۲۴۵
آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے نزول کا بیان	۲۴۷
یوم نزولِ نعمت کو عید بنانے کا ثبوت	۲۴۸
باب زکوٰۃ دینا بھی اسلام سے ہے	
حضرت طلحہ کے حالات	۲۴۹
کیا نفل شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں	۲۵۰
باب جنازہ کے ساتھ جانا ایمان کی ایک شاخ ہے	۲۵۲
باب مومن کا اعمال کے ضائع ہو جانے سے ڈرنا	۲۵۲
ابراہیم تیمی اور حضرت ابن ابی ملیکہ کے حالات	۲۴۳
یخاف النفاق علی نفسہٖ کا مطلب ومفہوم	
باب ان امور کے بیان میں جن سے ڈرایا جاتا ہے یعنی اصرار علی النفاق اور گناہ بلا توبہ	۲۵۴
گناہ پر اصرار کے معنیٰ	
لیلۃ القدر کی صحیح تاریخ اٹھالی گئی اس کا مطلب ومفہوم؟	
باب حضرت جبرئیل کا حضور سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے متعلق سوال کرنا	۲۵۷
ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کا بیان	۲۵۹
ایمان کے معنیٰ	
ایمان باللہ وایمان بالملائکہ اور ملائکہ کے متعلق قرآن کی تصریحات	۲۶۰
لقاءِ الٰہی اور ایمان بالرسل	
اسلام کے معنیٰ اور اس کی حقیقت	۲۶۳
عبادت کے معنیٰ اور عبادت وتعظیم میں فرق	
شرک کی تعریف	
احسان کے معنیٰ	
ہر عمل میں احسان، اور کیا	

مضمون صفحہ
دنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن ہے؟
قیامت اور اس کی علامتیں ۲۶۸
کیا قیامت کا علم کسی کو نہیں؟ ۲۶۹
المسئول عنہا باعلم من السائل کا مطلب
باب جو دین کی حفاظت کے لیے گناہ سے بچے اس کی فضیلت کے بیان میں ۲۷۷
لفظ مشتبہات کی تحقیق ۲۷۹
وفد عبد القیس
باب مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ دینا ایمان ہے۔
باب تمام اعمال کا ثواب نیت خالص پر مبنی ہے ۲۸۰
حدیث انما الاعمال بالنیات کے چند اہم فوائد و مسائل ۲۸۲
باب الدین النصیحۃ ۲۸۵

کتاب العلم

علم کی تعریف اور اس کی اقسام ۲۸۷
باب علم دین کی فضیلت کے بیان میں ۲۸۸
باب جو شخص اپنی بات میں مصروف ہو اور اس حالت میں اس سے مسئلہ علمی دریافت کیا جائے
باب بلند آواز سے مسئلہ بتانا ۲۸۹
باب محدث کا حدثنا یا اخبرنا یا انبانا کہنے کے بیان میں ۲۹۰
باب امام کا بطور امتحان اپنے اصحاب سے کوئی مسئلہ پوچھنا ۲۹۱
سوال کرنا عدمِ علم پر دلالت نہیں کرتا
کھجور کے درخت کے فوائد
باب محدث کے سامنے پڑھنے اور اس پر عرض کرنے کے بیان میں ۲۹۳
باب مناولہ و مکاتبہ کے بیان میں ۲۹۵
کسریٰ کا انجام، حضور کی پیش گوئی
باب مجلس کے کنارے یا جہاں کشادگی ہو وہاں بیٹھ جانے کے بیان میں ۲۹۷
باب حضور کا ارشاد کہ بعض اوقات سامع مبلغ سے زیادہ بات کو یاد رکھنے والا ہوتا ہے ۲۹۸
باب علم کا مرتبہ قول و عمل سے مقدم ہے ۲۹۹
علم دین و علمائے دین کے فضائل ۳۰۰
باب حضور علیہ السلام وعظ و نصیحت میں لوگوں کو رعایت فرماتے تھے۔ ۳۰۲
جائز کام کے لیے دن مقرر کرنے کا ثبوت
باب جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے ۳۰۳
امیر معاویہ کے حالات اور فقہ کی تعریف ۳۰۴
باب الفہم فی العلم
باب علم و حکمت کے حصول کے لیے رشک کرنا ۳۰۵
باب حضرت موسیٰ کا ملاقاتِ حضرت خضر کے لیے دریا کی طرف جانا ۳۰۶
حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ضروری معلومات ۳۰۸
باب اللّٰھم علمہ الکتاب کے بیان میں ۳۰۹
باب چھوٹے بچے کا سماعِ حدیث کس عمر میں معتبر ہے ۳۱۰

مضمون	صفحہ
باب علمِ دین کی طلب میں نکلنے کے بیان میں	۳۱۱
باب علمِ دین حاصل کرنے اور پڑھانے کی فضیلت کے بیان میں	
باب علمِ دین اُٹھ جانے اور جہالت کے ظاہر ہونے کے بیان میں	۳۱۴
باب چارپائے کی پشت پر کھڑے کھڑے جواب دینا	۳۱۶
حجۃ الوداع	
باب ہاتھ اور سر کے اشارہ سے جواب دینا	۳۱۷
دجال کے متعلق حدیثی تصریحات	۳۱۹
حضور علیہ السلام نے ساری کائنات کا مشاہدہ فرمایا	۳۲۱
قبر میں حضور کے متعلق سوال ہونے کی کیفیت	۳۲۵
کیا قبر میں کافر سے بھی سوال ہوگا	
تقلیدِ شخصی پر اعتراض اور اس کا جواب	
باب فضلِ علم کے بارے میں	۳۲۷
حضرت اسامہ کے حالات	
باب حضور نے وفد عبد القیس کو دین کی باتیں یاد رکھنے کی ترغیب دی	۳۲۸
باب نیا مسئلہ درپیش ہونے پر سفر کرنا	
کیا رضاعت کے ثبوت کے لیے صرف ایک عورت کا قول کافی نہیں ہے؟	
باب علم سیکھنے کے لیے باری باری جانا	۳۲۹
باب ناجائز بات دیکھ کر واعظ کا وعظ میں غصہ کا اظہار کرنا	۳۳۰
لقطہ کے مسائل	
باب امام یا محدث کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنا	۳۳۴
باب ایک بات کو تین بار بیان کرنے کے بیان میں	۳۳۵
باب اپنی باندی و اہلِ خانہ کو دین کی تعلیم دینے کے بیان میں	۳۳۶
اہلِ کتاب کون ہیں؟	۳۳۷
باب امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا اور ان کو مسائل بتانا	۳۳۹
باب حدیث حاصل کرنے کی حرص کا بیان	۳۴۰
باب علمِ دین کے اُٹھ جانے کے بیان میں	۳۴۱
باب عورتوں کو مسائلِ دین تعلیم کرنے کے لیے علیحدہ دن مقرر کرنا	۳۴۲
باب مسئلہ سُننے کے بعد سمجھ میں نہ آئے تو دوبارہ پوچھنا	۳۴۳
مناقشہ اور حسابِ یسیر کا بیان	
باب جو حاضر ہو غائب کو دین کی بات پہنچا دے	۳۴۵
باب حضور پر جھوٹ باندھنا گناہ ہے	۳۴۷
حضرت ربعی بن حراش	۳۴۸
حضرت علی کے حالات	
حضرت عبد اللہ بن زبیر	۳۴۹
حضرت زبیر بن عوام	
حضور کے نام و کنیت کو اختیار کرنے کے متعلق بحث	۳۵۱
حضور اکرم کو خواب میں دیکھنا	
باب کتابۃ العلم	۳۵۲
کیا حضور نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا؟	
صحیفۂ علی کی حقیقت	۳۵۳

مضمون	صفحہ
حضرت ابو جحیفہ کے حالات	۳۵۴
کیا ذمی کے بدلے مسلمان قاتل سے قصاص لیا جائیگا	۳۵۵
حضور اکرم مالکِ شریعت ہیں	۳۵۷
حضرت ابوہریرہ کا حافظ	۳۵۸
حدیثِ قرطاس	۳۵۹
باب رات میں تعلیم دینا اور وعظ کرنا	۳۶۰
حدیث ماذا فتح من الخزائن کے معنٰی	۳۶۱
باب رات کو سونے سے قبل دینی باتیں کرنا	۳۶۲
باب علمِ دین یاد رکھنے کے بیان میں	۳۶۴
باب علماء کے وعظ کو خاموشی کے ساتھ کان لگا کر سُننا	۳۶۶
باب یہ سوال ہو کر سب سے بڑا عالم کون ہے تو جواب واللہ اعلم کے ساتھ دینا	۳۶۷
باب عالم بیٹھا ہو کھڑے کھڑے سوال کرنا	
باب رمی جمار کے وقت مسئلہ پوچھنا اور جواب دینا	۳۶۸
باب وما اوتیتم من العلم الاقلیلا کے بیان میں	
اللہ تعالٰے کا علم غیر متناہی ہے اور حضور کا علم اللہ عزوجل کے علم سے ایک قطرہ ہے	۳۶۹
حضور علیہ السلام کو رُوح کا علم بھی دیا گیا	
آیت یسئلونک عن الروح کے متعلق علامہ عینی علیہ الرحمۃ کا ارشاد	
باب من ترك بعض الاختیار الخ	۳۷۱
باب علم کی بات بعض کو بتانے اور بعض کو نہ بتانے کے بیان میں	۳۷۲
کیا اقرار توحید و رسالت نجات کے لیے کافی ہے	۳۷۳
باب الحیاء فی العلم	۳۷۴
دین کا علم حاصل کرنے میں شرم نہ کرنی چاہیئے۔	
باب اگر آدمی خود پوچھنے میں شرم محسوس کرے تو دوسرے کے ذریعے مسئلہ معلوم کرائے	۳۷۶
باب مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتویٰ دینا	
باب سائل کو اس کے سوال سے زیادہ جواب دینا	۳۷۷
کتاب الوضو	۳۷۷
باب آیت اذا قمتم الی الصلوٰۃ	
وضو میں ایک بار اعضا کو دھونا فرض ہے	۳۷۸
باب بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں ہوتی۔	
فساء و ضراط کے معنٰی	۳۷۹
باب وضو کی فضیلت کے بیان میں	۳۸۰
یہ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ ان کے اعضا وضو قیامت کے دن نُورانی ہوں گے۔	
کیا مسجد میں وضو کرنا جائز ہے ؟	
علامہ عینی نے فرمایا کہ اللہ تعالٰے نے حضور کو مغیبات ماضیہ و مستقبلیہ کی اطلاع دی	
باب جب تک وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو صرف شک سے وضو نہ جائیگا۔	۳۸۲
باب وضو میں تخفیف کے	۳۸۳

مضمون — صفحہ

بیان میں
انبیاء کرام کے خواب وحی ہونے کے متعلق بحث ۳۸۴
انبیاء کرام کے خواب شیطانی تسلط سے محفوظ ہوتے ہیں
باب پورا وضو کرنے کے بیان میں ۳۸۷
اسباغ وضو کے معنی
پاؤں کو سات بار دھونے کی بحث
مزدلفہ میں مغرب و عشاء پڑھنے کے متعلق بحث
باب ایک ہاتھ سے پانی کا چلو لے کر دونوں ہاتھوں سے دھونے کے بیان میں ۳۸۹
مضمضہ کے معنی اور مسائل
باب ہر کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا اور جماع کے وقت بھی؟ ۳۹۱
کیا وضو سے قبل بسم اللہ پڑھنا واجب ہے؟ ۳۹۲
ہر کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے فوائد و مسائل
باب بیت الخلا جاتے وقت کیا پڑھے ۳۹۲
باب بیت الخلا کے پاس پانی رکھنا ۳۹۴
باب پیشاب و پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا ۳۹۶
حضرت ابو ایوب انصاری کے حالات
بوقتِ قضاء حاجت قبلہ کی طرف منہ و پیٹھ نہ کی جائے
باب دو کچی اینٹوں پر بیٹھ کر پاخانہ کرنا ۳۹۷
بوقتِ قضاء حاجت قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنے کے متعلق تفصیلی گفتگو ۳۹۸
حضور علیہ السلام کو قضاء حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ و پیٹھ کرنا روا تھا؟
حضور کے فضلاتِ مبارکہ کی کیفیت
باب عورتوں کا قضاء حاجت کے لیے نکلنا ۴۰۳
پردہ کا حکم حضرت عمر کی رائے کے موافق نازل ہوا
بوقتِ ضرورت عورتوں کو باپردہ باہر نکلنا جائز ہے
باب گھروں میں قضا حاجت کرنے کے بیان میں ۴۰۴
باب پانی سے استنجا کرنے کے بیان میں ۴۰۵
پانی سے استنجا کرنے کے مسائل اور اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ۴۰۶
باب طہارت کے لیے پانی کا ساتھ لے جانا ۴۰۸
باب استنجا کے لیے پانی کے ساتھ نیزہ لے جانے کے بیان میں "
باب داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت میں ۴۰۹
باب پیشاب کرتے وقت شرمگاہ کو داہنے ہاتھ سے نہ تھامے ۴۱۰
باب ڈھیلوں سے استنجا کرنے کے بیان میں
گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے کا بیان ۴۱۱
باب گوبر سے استنجا نہ کیا جائے ۴۱۲
کیا استنجا کے لیے تین عدد ڈھیلوں کا ہونا ضروری ہے؟
باب وضو میں ایک ایک اعضا کو دھونا ۴۱۵
باب وضو میں تین تین بار اعضا کو دھونا

مضمون	صفحہ
دین کا چھپانا حرام ہے	
وضو کرنے کا طریقہ	
باب وضو میں ناک صاف کرنیکا بیان	۴۱۹
وضو کرنے کا طریقہ	
کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا واجب ہے یا سُنّت؟	
باب استنجا طاق ڈھیلوں سے کیا جائے؟	۴۲۰
جو سو کر اُٹھے ہاتھ بغیر دھوئے پانی میں نہ ڈالے اور اس مسئلہ کی وضاحت	
اگر پانی بڑے برتن میں ہو تو اس سے وضو کیسے کرے؟	
ڈھیلے سے استنجا کے مسائل	
باب وضو میں پاؤں دھوئے جائیں	۴۲۱
وضو میں ایڑیوں کے خشک رہنے پر وعید شدید	
باب وضو میں کلی کرنے کے متعلق	۴۲۲
تحیۃ المسجد کا ثواب اور اس کے مسائل	
باب وضو میں ایڑیوں کے دھونے کے بیان میں	
تنگ انگوٹھی اور چھلے وغیرہ کے نیچے وضو میں پانی بہانے کے مسائل	
وضو میں پاؤں پر مسح کرنے سے وضو درست نہ ہوگا۔ اس مسئلہ کی وضاحت	۴۲۳
حدیث فَمَسَحَ رِجْلَيْهِ کا صحیح مفہوم	
باب جوتا پہنے ہو تو پاؤں دھوئے چپلوں پر مسح نہ کرے	۴۲۴
موزوں پر مسح کرنے کے دلائل،	
موزوں پر مسح کرنے کے مکمل احکام ومسائل	۴۲۵
(چپلوں) جوتوں پر مسح کرنا جائز نہیں اور اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اور اس سلسلہ کی حدیث پر نقد و تبصرہ	
طوافِ کعبہ میں حجرِ اسود چومنے کے مسائل	۴۲۹
زرد خضاب کرنا سُنّت ہے	
باب وضو وغسل کرتے وقت ابتدا سیدھی طرف سے کرنا سُنّت ہے	۴۳۰
باب صبح کی نماز کا وقت آنے پر پانی تلاش کرنا	۴۳۱
حضور علیہ السلام کی انگلیوں سے پانی جاری ہونے کا معجزہ اور اس کے مسائل کا بیان،	
زمزم کے پانی سے وضو وغسل جائز ہے	
باب جس پانی میں آدمی کے بال دھوئے جائیں اور آدمی کے بالوں کی رسی وغیرہ بنانے کے بیان میں	۴۳۲
آدمی کے بال پاک ہیں	
آدمی کے بالوں اور ہڈی وغیرہ کا استعمال ناجائز ہے	
باب کتے کے جھوٹے اور اس کے مسجد میں آنے جانے کے بیان میں	
کیا امام بخاری کے نزدیک کتے کا جھوٹا پاک ہے؟	
صحابہ کرام کا حضور کے آثارِ شریفہ سے برکت حاصل کرنا	۴۳۴
حضور کے موئے مبارک کا بیان اور اس کے فضائل	
حضور کے آثارِ شریفہ کا ادب احترام واجب ہے	
جس برتن میں کتا منہ ڈالدے اس کو تین بار دھویا جائے یا	۴۳۵

مضمون صفحہ

سات بار اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اور علماء کے اختلاف کا بیان ۴۲۶

مسجد نبوی میں کتوں کے آنے جانے کے متعلق توضیحات مزید

شکاری کتے کے ذریعے شکار کرنے کے مکمل احکام و مسائل ۴۳۰

باب ان علماء کا مسلک اور بیان جو یہ کہتے ہیں کہ وضو اسی حدث سے لازم آتا ہے جو مخرجین سے نکلے ۴۴۲

وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اور دلائل کا بیان ۴۴۳

کن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے

منہ بھر قے آنا ناقضِ وضو ہے

بے ہوشی ناقضِ وضو ہے

مسِ ذکر و دبر ناقضِ وضو نہیں

نیند ناقضِ وضو ہے اور اس مسئلہ میں علماء کے آٹھ مذاہب کا بیان اور ان کا جائزہ

کس طرح سونے سے وضو جاتا ہے

سونے کی دو صورتیں جن سے وضو نہیں جاتا۔ یہ مسائل اور ان کے دلائل کا تفصیلی بیان

استحاضہ و بواسیر کا خون ناقضِ وضو ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو اور ایسے مریضوں کے لیے وضو کے احکام و مسائل کا بیان ۴۵۴

عورت کو چھونا ناقضِ وضو نہیں اور اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ۴۵۵

آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور اس مسئلہ میں علماء کے اختلاف کا بیان اور دلائل پر تبصرہ ۴۵۶

کیا اونٹ کا گوشت کھانا ناقضِ وضو ہے؟ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ۴۵۷

محض شک سے وضو نہیں جاتا ۴۵۹

اور مذی کا نکلنا ناقضِ وضو ہے

دخول کے بعد انزال نہ ہو، تو غسل کے واجب ہونے اور نہ ہونے کی بحث ۴۶۰

باب کسی شخص کا اپنے ساتھی کو وضو کرانا ۴۶۱

باب قرآن کا بے وضو پڑھنا

قرآن پاک بے وضو پڑھنا جائز ہے؟ ۴۶۲

جنبی اور بے وضو کے احکام و مسائل

باب بحالت غشی ہو تو وضو جائیگا؟ ۴۶۳

باب سارے سر کا مسح کرنے کے متعلق ۴۶۴

وضو میں سارے سر کا مسح کرنے کے متعلق تفصیلی گفتگو ۴۶۵

عمامہ پر مسح کرنے کی مکمل بحث

چوتھائی سر کے مسح کرنے کا بیان اور دلائل

سر کے مسح کرنے کا طریقہ اور اس کے مسائل ۴۶۷

کیا سر کا مسح تین بار کیا جائے؟

باب وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت دھونا ۴۶۸

باب وضو کے بچے ہوئے پانی کے استعمال کرنے کے بیان میں ۴۶۹

فضلِ وضو کا مطلب

ماءِ مستعمل کے متعلق امام اعظم کے تین قول کیوں ہیں؟ ۴۷۰

وضو کرنے سے گناہ دھلتے ہیں کیا کبائر بھی؟

ان صورتوں میں پانی مستعمل قرار پائے گا۔ ۴۷۱

عمامہ پر مسح کرنے کی مکمل بحث	۴۱۲
چوتھائی سر کے مسح کا بیان اور دلائل	〃
سر کے مسح کرنے کا طریقہ اور اس کے مسائل	۴۱۳
کیا سر کا مسح تین بار کیا جائے ؟	〃
باب وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت دھونا	۴۱۴
باب وضو کے بچے ہوئے پانی کے استعمال کرنے کے بیان میں	〃
فضل وضو کا مطلب	〃
ماءِ مستعمل کے متعلق امام اعظم کے تین قول کیوں ہیں ؟	〃
وضو کرنے سے گناہ دھلتے ہیں کبائر بھی	۴۱۵
سیدنا امام اعظم اہلِ کشف و مشاہدہ ہیں	〃
ماءِ مستعمل کی تعریف نجاستِ حکمی و حقیقی کا فرق۔ ماءِ مستعمل کی صورتیں	〃
پانی کے مستعمل ہونے اور نہ ہونے کی صورتیں اور ان مسائل کو تفصیلی بیان ماءِ مستعمل کا حکم	۴۷۳
مہر نبوت کی کیفیت	
باب، ایک ہی چلو سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا	۴۷۶
باب، سر کا مسح ایک بار کرنا	۴۷۷
سر کا مسح ایک بار اور تین بار کرنے کے متعلق بحث	
باب، مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ مل کر وضو کرنا	۴۷۹
کفار کے کنوئیں اور ان کے برتنوں کے پانی کا حکم	〃
گرم پانی سے وضو و غسل کے مسائل	۴۷۹
باب، حضور نے اپنے وضو سے بچا ہوا پانی ایک بیہوش آدمی پر ڈالا	۴۸۰
کلالہ کے معنیٰ	〃
باب، لگن پیالے اور لکڑی و پتھر کے برتن سے وضو و غسل کرنا	۴۸۱
باب، ایک مُد پانی سے وضو کرنے کے بیان میں	۴۸۳
مُد اور صاع کے وزن کی تحقیق	〃
وضو اور غسل کے لیے پانی کی مقدار معین ہے ؟	〃
باب، موزوں پر مسح کرنے کے بیان میں	۴۸۸
عمامہ پر مسح کی بحث	〃
باب، موزوں کو باوضو پہننے کے بیان میں	۴۹۰
موزوں پر مسح کرنے کی صورتیں	〃
باب، بکری کا گوشت اور ستو کھانے کے بعد وضو نہ کرنے کے بیان میں	۴۹۱
باب، ستو کھانے کے بعد کلی کر کے نماز پڑھنا وضو نہ کرنا	〃
معجزہ ردِ شمس کے متعلق امام بخاری کے استاذ کا بیان	
باب، کیا دودھ پینے کے بعد کلی کر کے نماز پڑھی جائے ؟	۴۹۳
سو کر اٹھنے کے بعد وضو کرنا چاہیے	〃
اور جو لوگ اونگھنے یا ایک آدھ جھونکا لینے سے وضو لازم نہیں جانتے	〃
باب، بغیر حدث کے وضو کرنا	۴۹۴
باوجود وضو ہونے کے وضو کرنا مستحب ہے	〃
باب، اپنے پیشاب سے نہ بچنا گناہ کبیرہ ہے	۴۹۵
کیا ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ؟	〃
قبروں پر پھول ڈالنا جائز ہے ؟	〃
قبروں کے پاس تلاوتِ قرآن جائز ہے	〃
ایصالِ ثواب جائز ہے اور اس کی صورتیں	〃
انبیاءِ کرام کے حواس کی کیفیت	〃
ہم دیکھتے پہلے ہیں اور جانتے بعد میں ہیں اور نبی جانتا پہلے ہے پھر دیکھتا ہے	〃
باب، پیشاب کو دھونے کے بیان میں	۵۰۰
باب، حضور کا ایک دیہاتی کو مسجد میں پیشاب کرتے دیکھنا اور اس کو اتنی دیر چھوڑ دینا کہ وہ پیشاب کرنے سے فارغ ہو جائے	〃
باب، مسجد میں پیشاب پر پانی ڈالنے کے بیان میں	〃
باب، پیشاب پر پانی بہانے کے بیان میں۔ زمین سوکھنے کے بعد پاک ہو جاتی ہے	〃
باب، شیر خوار کے پیشاب کا حکم	۵۰۲
کیا شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہے ؟	〃
حضرت امام شافعی و امام احمد کی طرف اس بات کی نسبت غلط ہے کہ وہ شیر خوار لڑکے کے پیشاب کو پاک سمجھتے تھے	〃
صب، رش و نضح کے معنیٰ	
باب، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے متعلق	۰۵

کیا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز ہے؟ ۵۰۶
باب: اپنے ساتھی کے نزدیک بیٹھ کر پیشاب کرنا اور دیوار کی آڑ میں کرنا ۵۰۷
باب: خونِ حیض دھو ڈالنے کے بیان میں ۵۰۹
حضرت اسماء کے حالات ″
خونِ حیض دھونے کے متعلق احادیث ″
عرق گلاب وکیوڑہ وغیرہ سے نجاست صاف کرنے کے متعلق بیان ۵۱۰
ایک درہم سے کم نجاست کا حکم ″
مستحاضہ عورت ہر نماز کے لیے وضو کرے ″
باب: کسی قوم کے کوڑا گھر پر پیشاب کرنا ″
باب: منی کے دھونے کا اور دھونے کا بیان۔ منی کا حکم اور پاک کرنے کا طریقہ ۵۱۲
باب: اونٹوں، چارپایوں اور بکریوں کے پیشاب اور ان کے باندھنے کے مقامات کا حکم ۵۱۴
حدیثِ عرینہ کے فوائد و مسائل ″
حرام اشیاء میں شفا نہیں اور بطور دوا حرام اشیاء کا استعمال کرنا جائز نہیں ″
باب: گھی یا پانی میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ ۵۱۸
حدیثِ عرینین کے مزید فوائد و مسائل ″
کیا پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ″
بیر بضاعہ کے متعلق ضروری تصریحات ″
دو قلے پانی کے احکام ″
مُردار جانور کے بال و پر اور ہڈی کے احکام ″
مُردار کی کھال وغیرہ کے احکام ″
ناپاک گھی کو پاک کرنے کا طریقہ ″
باب: ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا ۵۲۲
باب: اگر نمازی کی پشت پر گندگی مُردار جانور ڈال دیا جائے، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ ″
باب: تھوک و رینٹ کپڑے کو لگ جانے کے بیان میں ۵۲۶
باب: نبیذ تمر اور نشہ والی چیزوں سے وضو کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ۵۲۷
کیا نبیذ تمر سے وضو جائز ہے؟ ″
دودھ، کیوڑہ، عرق گلاب سے وضو جائز نہیں ″
باب: عورت کا اپنے والد کے چہرہ سے خون دھونا ۵۲۹
باب: مسواک کرنے کے بیان میں ۵۳۰
مسواک کے فضائل اور مسواک کے احکام و مسائل ″
باب: بڑی عمر والے کو مسواک دینے کے بیان میں ۵۳۱
باب: باوضو سونے کی فضیلت کے بیان میں ۵۳۲

فسبح بحمد ربك وكن من الساجدين

واعبد ربك حتى يأتيك اليقين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین

مُقدمہ

مجموعہ احادیث کے تراجم اب عام ہوگئے ہیں اور مسلمان انہیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے محض اُردو ترجمہ سے اس ہستی مقدس کے ارشادات کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا جا سکتا جو معلمِ کائنات ہے اور جس کا قلبِ اقدس بے شمار اسرارِ غیب اور لطائف و حکم کا خزینہ ہے اور جس کو کتاب و حکمت دے کر مبعوث کیا گیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کتنے ہی ارشادات ایسے غامض و لطیف و دقیق ہیں کہ جب تک علمِ حدیث سے باخبر حضرات ان کے اسرار نہ کھولیں اور سیاق و سباق اور اصولِ دین کی روشنی میں ان کے معانی واضح نہ کریں۔ ایک عام قاری کے لیے محض ترجمہ سے ان کی تہ تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ احادیث کے اردو تراجم نے جہاں عوام کی ایک گونہ دینی رہنمائی کا سامان مہیا کیا ہے۔ وہاں ان کو نہایت ہی خطرناک اُلجھنوں میں مُبتلا کر دیا ہے بلکہ عام گمراہوں نے عموماً اور مُنکرینِ حدیث نے خصوصاً غلط ترجمے چھاپ کر بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ میں عرصہ سے محسوس کر رہا تھا کہ حدیث کے لفظی ترجمہ کے ساتھ اس کی ایسی ترجمانی و تفہیم بھی کر دی جائے کہ جس سے عام مسلمان اس کے صحیح مفہوم و مُدعا تک پہنچ سکیں اور جو اُلجھنیں ان کو پیش آتی ہیں وہ بھی صاف ہو جائیں۔ احباب نے مشورہ دیا کہ بخاری شریف جو احادیثِ نبویہ کا نہایت ہی مقبول و محبوب ذخیرہ ہے "تفہیم حدیث" کا سلسلہ اسی سے شروع کر دیا جائے۔ احباب کے اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے میں اس بار کو اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی و کم علمی کا پورا پورا احساس ہے۔ احادیثِ بخاری کی جو تفہیم و ترجمانی میں نے کی ہے یہ بہرحال حرفِ آخر نہیں ہے۔ اہلِ علم کی خدمت میں التماس ہے کہ جہاں کہیں لغزشِ قلم پائیں مجھے مطلع فرمائیں تاکہ اس کی تلافی کر سکوں کیونکہ نقص یا خطا بخاری میں نہیں ہے بلکہ میری تفہیم و ترجمانی میں ہو سکتا ہے۔ خدا ہی پر بھروسہ ہے اور اسی کے اختیار میں ہے کہ مجھ جیسے کم علم کو جتنی چاہے توفیق عطا فرمائے۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولٰی و

نعم النصیر

فیوض الباری

ان اوراق میں احادیث بخاری کی تفہیم وترجمانی کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا نام "فیوض الباری" تجویز کرتا ہوں اور اس میں امور ذیل کا خیال رکھا گیا ہے :-

۱- حدیث کا لفظی ترجمہ ۲- الفاظِ حدیث کی حسبِ ضرورت لُغوی تحقیق ۳- حدیث کے مسائل واحکام کی تفصیل ۴- ائمہ اربعہ کا حدیث زیرِ بحث سے استدلال اور ان کے مابین اختلافِ آراء کے دلائل کی وضاحت ۵- امام نے ہر حدیث کو پوری سند سے لکھا ہے- میں نے بوجہ اختصار ابتدائی سند کو حذف کر دیا ہے ۶- امام ایک ہی حدیث کو متعدد عنوانات کے ماتحت متعدد بار ذکر کرتے ہیں- میں نے بخاری کا ہر عنوان قائم رکھا ہے البتہ حدیث مکرر کو صرف ایک ہی جگہ ذکر کیا ہے ۷- جس عنوان میں حدیثِ مکرر آتی ہے وہاں میں نے اس کی مناسبت بلکہ بعض اوقات اس کے جملے بھی لکھ دیئے ہیں اور یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ یہاں حدیثِ مکرر ہے- اس کو ترک کیا گیا ہے ۸- ایک جگہ اگر کوئی حدیث مختصر مذکور ہے اور دوسری جگہ مفصل ہے تو مفصل حدیث کو بھی جہاں وہ آتی ہے باقی رکھا ہے-

ضروری نوٹ :- امام بخاری علیہ الرحمہ نے عنوانات کے تحت جو حدیثیں ذکر کی ہیں ہم نے تقریباً ہر حدیث کے متعلق یہ تصریح کر دی ہے کہ اس حدیث کو امام بخاری نے اور امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ محدثین کرام علیہم الرحمت والرضوان نے کو کن کن ابواب میں ذکر کیا ہے- اس کے دو فائدے ہیں- اوّل باب معلوم ہو تو حدیث تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ صفحات بعض اوقات بدل جاتے ہیں- دوم یہ کہ زیرِ بحث حدیث کے متعلق جو حضرات مزید توضیح وتشریح چاہیں تو دیگر شروح میں دیکھ سکتے ہیں-

حجیتِ حدیث

حجیتِ حدیث کے متعلق مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ابتدائے اسلام سے لے کر اب تک تمام مسلمان حدیث کی حجیت کے قائل رہے ہیں اور امت کا یہ عقیدہ ہے کہ حدیث اور قرآن دونوں ہی دین کا جزو اور شریعت کی اساس ہیں اور سنت کی پیروی بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآنِ حکیم کی- مگر اس پُرآشوب دور میں جہاں اور فتنوں نے سر نکالا ہے ایک فتنہ منکرینِ حدیث کا بھی ہے جو حجیتِ حدیث کے منکر ہی نہیں بلکہ اس کو عجمی سازش قرار دیتے ہیں- اس لیے ضروری ہوا کہ دیباچہ میں حجیتِ حدیث کے متعلق گفتگو کی جائے-

تنزیلِ کُتب

حدیث کی حجیت پر بحث کرنے سے پہلے تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل۔ اللہ تعالےٰ نے کتاب اور رسول کے واسطہ کے بغیر خود ہی مخلوق کی ہدایت کیوں نہ فرمائی دوم۔ رسالت کے کام کے لیے صرف انسانوں کو کیوں منتخب کیا۔ فرشتوں یا غیر انسانی ہستیوں کو اس کام کے لیے کیوں نہ مامور کر دیا سوم۔ تمام آسمانی کتابوں کو رسول کے واسطے سے کیوں نازل کیا۔ صرف کتاب ہی کیوں نہ نازل کر دی۔

اِن سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ غایتِ تجرد اور نہایت تقدس میں ہے یعنی وہ ایک ایسی ہستی ہے جو کمال کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہے اور انسان نقصان کے انتہائی درجہ پر ہے اس لیے انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خدا سے بلا واسطہ ہدایت اور فیض حاصل کرے اور نہ خدا ہی بلا واسطہ اپنے بندے سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ خدا قادر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقصان انسان میں ہے۔ اس میں یہ صلاحیت اور قابلیت اور استعداد ہی نہیں ہے کہ وہ براہِ راست خدا سے فیض لے کیونکہ ناقص، کامل سے اسی وقت بلا واسطہ فیض حاصل کر سکتا ہے جب کہ ناقص اور کامل میں کوئی مناسبت ہو اور خدا اور بندہ میں تو کوئی مناسبت ہے ہی نہیں۔ (وہ خالق ہے اور یہ مخلوق۔ خالق اور مخلوق کا کیا جوڑ) اس لیے اللہ سے فیض لینے اور اس کی رضا اور احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت پڑی۔ ایسا واسطہ جس کا تعلق خدا سے بھی ہو اور مخلوق سے بھی۔ پس یہ واسطہ انبیاء کرام ہیں۔ جن کے ذریعے مخلوق کا تعلق خدا سے قائم ہوتا ہے۔

اب یہ سمجھیے کہ انسان تو غایتِ نقصان میں تھا اور وہ اپنی عدمِ صلاحیت کی وجہ سے خدا سے بلا واسطہ تعلق پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر انبیاء جو انسان ہی ہوتے ہیں وہ اللہ سے کیسے تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء اگرچہ انسان ہی ہوتے ہیں مگر انسانیت کی نہایت بلند سطح پر ہوتے ہیں۔ ان میں اللہ تعالےٰ ایسی استعداد پیدا فرما دیتا ہے کہ وہ بلا واسطہ اس سے تعلق رکھیں۔ انبیاء میں چند خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ انسانوں میں کیا فرشتوں میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ جیسے خدا اپنی مخلوقات کے درمیان تقدس اور تجرد کے نہایت بلند مقام پر ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام عام انسانوں میں تقدس اور تجرد کے نہایت بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ تجرد کی جہت سے وہ خدا سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلق کی جہت سے وہ پیغاماتِ الٰہی بندوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام کو واسطہ قرار دیا اور خود بلا واسطہ مخلوق کی ہدایت نہیں فرمائی۔

سوال دوم کا جواب یہ ہے اللہ کی سنت یہ ہے کہ عام انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول

بشری ہی مبعوث فرماتا ہے اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتے یا غیر انسانی ہستیاں انسان کی ہدایت اور تزکیہ کا سبب نہیں بن سکتیں کیونکہ انسان کی ہدایت کا سبب وہی بن سکتا ہے جو انسان کے ساتھ مناسبت رکھے۔ فرشتے اپنی نورانیت اور ملکیت کی وجہ سے اور غیر انسانی ہستیاں اپنے فطری قصور اور عدم صلاحیت کی وجہ سے انسان کے لیے ہادی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہر زمانہ کے کفار نے انبیاء و مرسلین سے یہی مطالبہ کیا ہے کہ اگر خدا کو پیغام پہنچانا ہی منظور ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کرتا کہ ہمیں اس پیغام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین آجائے۔ اللہ تعالےٰ نے کفار کے جواب میں فرمایا:۔

لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا

اگر ہم فرشتے بھی بھیجتے تو ان کو انسانی لباس میں بھیجتے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ انسان کی ہدایت اور تزکیہ و تربیت کے لیے فرشتہ کام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ فرشتے اور انسان میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ فرشتہ انسانی جذبات سے محروم ہے۔ شہوانی قوتیں اس میں مفقود ہیں۔ انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہے۔ ایسے ملکی اور نوری افراد انسان کی تعلیم و تربیت کے فرائض ادا کر ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر ہم فرشتوں کو بھیجتے تو بھی ان کو لباسِ بشریت میں بھیجتے تاکہ انسان اور فرشتہ میں مناسبت پیدا ہو جاتی بلکہ قرآن کریم نے یہاں تک فرمایا کہ فرشتے اسی صورت میں بھیجے جا سکتے تھے جبکہ زمین پر فرشتے بستے ہوتے۔

لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا

اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لیے رسول ملکی کو مبعوث فرماتے (قرآن مجید)

اس لیے اللہ تعالےٰ نے عام انسانوں کی ہدایت و تزکیہ و تربیت کے لیے فرشتوں کی بجائے انسانوں کو ہی رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔

سوال سوم کا جواب یہ ہے

اب رہا یہ سوال کہ کتاب کو رسول کے واسطے سے کیوں نازل کیا۔ صرف کتاب ہی کیوں نہ نازل کر دی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمام آسمانی کتابوں کو رسول ہی کے واسطے سے نازل کیا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ صرف کتاب نازل کر دیتا اور کتاب کے مطبوعہ نسخے ہر انسان تک پہنچا دیے جاتے۔ اگر کتاب کی اشاعت کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو بلا شبہ یہ ہدایت کا یقینی ذریعہ ہوتا کیونکہ ایسے

صریح معجزہ ہے اور بالکل ظاہر خارق عادت کو دیکھ کر ہر شخص مان لیتا کہ یہ کتاب واقعی خدا کی طرف سے ہے لیکن اللہ تعالےٰ نے باوجود قادرِ مطلق ہونے کے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ اپنے رسولوں ہی کے ذریعہ کتابیں نازل کیں تا آنکہ قرآن شریف کی باری آئی تو قرآن بھی بلا واسطہ نہیں دیا بلکہ اس کے نزول سے پہلے بڑے بڑے انتظامات فرمائے۔ پھر ایک مقدس ہستی کو ابتدا ہی سے قرآن کے لیے مخصوص و منتخب فرمایا۔ جب وہ ہستی دنیا میں جلوہ فرما ہوگئی تو پھر قرآن نازل ہوا اور رسول کریم کے واسطے سے قرآن بھی دیا گیا۔ آخر کیوں؟ اس کا تسلی بخش جواب خود قرآن ہی نے دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اللہ نے جس قدر رسول مبعوث کیے ہیں۔ ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ فرامینِ الٰہی کے مطابق حکم دیں اور لوگ انہی کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ کتابِ الٰہی پر خود عمل کر کے دکھائیں اور لوگ انہیں کے نمونہ کو دیکھ کر ان کا اتباع کریں۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

دنیا میں جتنے انبیائے کرام تشریف لائے سب نے اپنی امت سے یہی مطالبہ کیا

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضور نبی کریم کی زبانِ مبارک سے یہ بھی کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اگر اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔

ان نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ کتاب کے ساتھ رسولوں کو اور قرآن کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ کتاب اور رسول دونوں کی اطاعت کی جائے اور اللہ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح لوگ میری کتاب کی اطاعت کریں ٹھیک اسی طرح لوگ کتاب کے ساتھ جو رسول بھیجا گیا ہے اس کا بھی اتباع کریں۔

معلم کتاب

اس میں شک نہیں کہ کتاب (قرآن) دین و شریعت کی اصل ہے اور ادلۂ شرعیہ میں سب سے مقدم اور محکم قرآن ہی ہے مگر یہ بات منکرین حدیث کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن صرف اصول دیتا ہے اور اپنے اصول کی تشریح و توضیح کسی اور پر چھوڑ دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا قرآن ناقص ہے؟ کیا وہ ملت کا دائمی اور آخری ضابطہ حیات نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے تو پھر قرآن میں اصول کیوں ہیں؟ اجمال اور ابہام کیوں ہے؟ تو اس کی وجہ بھی خود قرآن ہی نے بتا دی۔ اس نے ہمیں

بنایا کہ اگر محض کتاب اُتار دی جاتی اور اس کے ساتھ کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے۔ اصول کی جزئیات میں لڑتے جھگڑتے اور کوئی ان کو تسلی دینے والا اور غلطی کی نشاندہی کرنے والا نہ ہوتا اور اس طرح اللہ کی کتاب جدال و نزاع کا اکھاڑہ بن جاتی۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے کتاب کے ساتھ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کیا اور قرآن کو رسولِ کریم علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ یہ صرف اس لیے تاکہ لوگ اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ رسول کے بیان اور تشریح کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ قرآن کریم نے اپنے ساتھ رسول کے اس تعلق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ	ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ خوب کھول کھول کر بیان کردیں اس کو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ قرآن کے ساتھ رسول کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ رسول قرآن کے شارح ہیں اور ان کا فرض نبوت یہ ہے کہ وہ قرآن کی خوب تشریح و توضیح فرمائیں اور امت کا فرض یہ ہے کہ وہ رسول کا اتباع کرے اور اس کے اُسوۂ حسنہ پر چلے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لیے رسول کریم میں بہترین نمونہ ہے

تلاوتِ آیات

پھر یہ نہیں کہ قرآن نے صرف ایک ہی جگہ رسول کے اس منصب اور فرض کو بیان کر دیا بلکہ متعدد مقام پر رسول کے فرائض اور اس کے مراتب سے دنیا کو آگاہ کیا گیا۔

چنانچہ فرمایا۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	یہ رسول قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزیں الگ الگ ذکر کی گئی ہیں ۱۔ تلاوتِ آیات ۲۔ تعلیم کتاب

آیات کی تلاوت کا مطلب تو بالکل واضح ہے۔ البتہ تعلیمِ کتاب کی مراد پر غور کرنا ہے۔ اگر تعلیمِ کتاب سے بھی قرآن کی عبارت پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہی مقصود ہے تو تلاوتِ آیات سے الگ کوئی چیز نہ ہوئی حالانکہ وہ اس سے الگ چیز ہے اور الگ ہی ذکر کی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ یقیناً تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تشریح اس کے معانی و مطالب کی توضیح ہی ہے۔ جب قرآن مجید سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ نبوت میں الفاظ و کلماتِ قرآن کریم کی تلاوت ہے اسی طرح اس کے

معانی ومطالب کا بیان بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہے تو اب لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جس طرح متنِ قرآن حجت ہے اسی طرح اس کی نبوی تشریح بھی حجت ہے ورنہ قرآن کا آپ کو معلمِ کتاب کہنا اور کتاب کی تعلیم کو آپ کا فرضِ رسالت قرار دینا بالکل بے معنی ہوگا۔ جب قرآن سے حضور علیہ السلام کا معلّم اور شارح ہونا ثابت ہوگیا تو جو شخص آپ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے اس کو بھی یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ جیسے حضور علیہ السلام نے متنِ قرآن کی تلاوت وتبلیغ کی۔ اسی طرح آپ نے قرآن کے مطالب ومعانی بھی بیان فرمائے۔ پھر جب قرآنِ کریم اللہ کی آخری کتاب ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلّم آخری نبی تو نہ اب کوئی کتاب آسکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اور اس آخری کتاب کا اس کے نزول کے وقت سے رہتی دنیا تک باقی رہنا ضروری ہے۔ جب اس کی بقا ضروری ہے تو قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی قولی وفعلی تشریحات وتوضیحات کا بھی ہر دور اور ہر زمانہ میں منقول ومتداول اور موجود رہنا ضروری ہے۔

الغرض ان دو نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح ہیں ۲۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح متنِ قرآن کی تبلیغ کی اسی طرح آپ نے قرآنِ مجید کے مطالب ومعانی بھی بیان فرمائے ۳۔ جب قرآنِ کریم کو باقی رہنا ضروری ہے تو حضور علیہ السلام کی تشریح کا باقی رہنا بھی ضروری ہے ۴۔ جب قرآنِ مجید کی دین میں حجت یقینی ہے تو قرآنِ حکیم کی شرح بھی دین میں حجت ضروری ہے اور قرآنِ حکیم کے ساتھ اس کی شرح (حدیث) کو ماننا بھی ضروری ہے۔

تعلیمِ حکمت

اب آیۂ زیرِ غور کے دوسرے ٹکڑے پر غور کیجیے۔ تعلیمِ قرآن کے ساتھ تعلیمِ حکمت بھی حضور علیہ السلام کا ایک فریضہ بتایا گیا ہے یعنی جس طرح قرآنِ کریم کے مفہوم ومطالب کو بیان کرنا حضور علیہ السلام کا فرضِ نبوّت ہے۔ اسی طرح حکمت کی تعلیم دینا بھی آپ کا فرض ہے۔

یہ حکمت کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ حکمت ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے قرآن شریف کے علاوہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے:۔

۱۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی اور حکمت بھی نازل کی اور سکھا دیا تم کو وہ جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر تو اللہ کا بڑا فضل ہے۔
۲۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُنَّ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ	یاد کرو اس کو جس کی تلاوت ہوتی ہے تمہارے گھروں میں آیتیں اور حکمت

ان دونوں آیتوں سے واضح ہوا کہ جس طرح حضور علیہ السلام پر قرآن نازل ہوا اسی طرح اللہ نے آپ پر حکمت بھی نازل کی۔ اب یہ حکمت کیا ہے؟ جو ازواجِ مطہرات کے گھروں میں قرآنی آیتوں کے علاوہ پڑھی جاتی تھی؟ وہ کیا چیز تھی جو حضور علیہ السلام ان کو قرآن کے علاوہ سُناتے تھے؟ یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنت تھی۔ یعنی قرآن کی تشریح فرمانے کے ضمن میں حکمت و دانائی کی وہ باتیں جو الفاظِ قرآن کے علاوہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس یا فعل و عمل سے ظاہر ہوئیں وہی حدیث اور سُنّت ہے اور اسی کو قرآن نے حکمت سے موسوم کیا ہے اور چونکہ اس آیت سے حکمت کے یاد رکھنے کا وجوب بھی ثابت ہوا۔ پھر یاد رکھنے سے اصل مقصود ہی عمل ہے تو سنت و حدیث پر عمل کا واجب و مامور ہونا بھی ثابت ہوا اور جب سنت ہی کا دوسرا نام حکمت ہے اور حکمت منزّل من اللہ ہے تو اس سے سُنّت کا منزّل من اللہ اور وحی الٰہی ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ اسی لیے حضور سرور عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم اس حکمت کو اللہ کی طرف سے دیے جانے کی تصریح فرمائی۔

اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ (ابوداؤد)

خبردار مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کے ساتھ ایک اور چیز اس کی مثل دی گئی ہے

یہ قرآن کی مثل کیا چیز تھی؟ جس کے متعلق آپ نے فرمایا۔ "مجھے دی گئی"۔ گویا خود بخود آپ میں وہ چیز موجود نہ تھی بلکہ خدا کی طرف سے تھی۔ وہ چیز حکمت ہی تھی اور حکمت سنتِ رسول ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن کی جو تشریح و توضیح حضور صے اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے وہ اللہ کی وحی اور اس کی ہدایت کے ماتحت ہوتی تھی۔ جب وہ اللہ کی ہدایت کے ماتحت ہوتی تھی تو پھر اس کا دین کا جزو اور مامور بہٖ ہونا بالکل ظاہر بات ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح قرآنِ مجید کو ماننا ضروری ہے اسی طرح سنتِ رسول کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور سنت کے بغیر فہمِ قرآن ناممکن ہے۔

رسُول کا مرتبہ و مقام

حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث دراصل منصبِ نبوت و رسالت کے منکر ہیں۔ اسی لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول کا کام صرف اللہ کی وحی کو بندوں تک پہنچا دینا ہے اور بس۔ باقی رہے اس کے اقوال و اعمال، یہ دین نہیں ہیں۔ لیکن قرآن صاف لفظوں میں ان کے اس کافرانہ نظریہ کی تردید کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ پیغامِ الٰہی کے معانی و مفہوم، تشریح و مطالب کو بیان کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ رسول صرف قاصد ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ مطاع، ہادی، امام، مربّی، حاکم، مبشر، نذیر، سراجِ منیر، صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ، مصطفےٰ، مقبول، مبین، شارح، معلّم، حکَم،

مزکّی، داعی الی اللہ، آمر و ناہی بھی ہوتا ہے۔

رسول کے ان اوصافِ جلیلہ پر قرآنِ مجید کی آیات شاہد ہیں جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہے تاہم چند آیاتِ قرآنیہ یہاں درج کی جاتی ہیں جو رسول کے مرتبہ و مقام کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گی۔

۱۔ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

۱۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کو اللہ کا رسول مان لیا جائے اور بس ۲۔ پھر اطاعتِ رسول کا حکم جہاں جہاں آیا ہے بالکل مطلق ہے۔ اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ فلاں امور میں تو رسول کی اطاعت کرو اور فلاں میں نہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول ایک حاکمِ عام ہے۔ جو حکم بھی وہ دے مومنوں کو اس کا ماننا لازمی ہے۔

۲۔ قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت ایک عام انسان کی اطاعت کی طرح نہیں ہے جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا۔ جو یہ کہتے تھے:

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ	یہ تم جیسا بشر ہی تو ہے۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے۔

۳۔ قرآن نے جاہل کفار کے اس خیال کی تردید کردی اور مومنوں کو یہ اطمینان دلایا کہ رسول کی اطاعت عام انسانوں کی اطاعت کی طرح نہیں بلکہ دراصل خدا کی اطاعت ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ	جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

۴۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ رسول من جانب اللہ امام ہوتا ہے اور ہر اختلاف اور نزاع کی صورت میں رسول کو حکم بنانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کو

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا	ہم نے انبیاء کو ہدایت کا امام بنایا ہے وہ ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں
۵۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو تو اس میں اللہ و رسول

کی طرف رجوع کرو۔

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ اس میں خدا اور رسول دونوں کو حکم بنانے کا حکم ہے۔ اگر مرجع بالکل قرآنِ مجید ہوتا تو فردوہ الی اللہ کہنا کافی تھا لیکن اس کے ساتھ والرسول بھی کہا گیا۔ جس میں صاف وضاحت ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ ہی مرجع ہے اور دین کے اصلی دو جزو قرآن اور حدیث ہی ہیں۔

۶- قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو دل و جان سے ماننا اہلِ ایمان کے لیے فرض بلکہ شرطِ ایمان ہے۔ جو شخص رسول کے فیصلہ کو نہ مانے وہ بے ایمان ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ الخ	اے رسول! تیرے رب کی قسم یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ مان لیں
۷- مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ	کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے

یہاں کسی زمانہ کی قید نہیں ہے۔ مومن و مومنہ سے صرف عہدِ نبوی کے مومن مرد و عورت مراد نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے مومن مراد ہیں۔ اَمْرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر کام اور ہر بات میں خدا و رسول کے فیصلہ کو تسلیم کرنا فرض ہے۔

۸- قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ اللہ کی طرح اس کے رسول کو بھی ساری دنیا کی چیزوں سے محبوب رکھنا ضروری ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین سے ہیں اور اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں۔ جب اللہ اور رسول کسی کام کی دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر ایک کے لیے فرض ہے۔

اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ	اگر یہ دنیا تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہے تو اللہ کے امر (عذاب) کا انتظار کرو۔
۹- اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ	اللہ اور اس کے رسول جب تمہیں آواز دیں تو فوراً لبیک کہو۔

۱۰- اور یہ بھی کہ مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے حکم پر لبیک کہتے ہیں اور اللہ و رسول دونوں کی

اطاعت کرتے ہیں-

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا	ایمان والوں کو جب اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ اللہ اور رسول ان کے درمیان فیصلہ دیں تو ان کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں سمعنا و اطعنا

۱۱- قرآن نے یہ بھی بتایا کہ کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کے لیے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے- اسی طرح رسول کی اطاعت بھی فرض ہے- جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی و بدبختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی کا حال ہے-

مَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا	جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی اس نے بڑی مراد کو پالیا
۱۲- وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا	جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے-

۱۳- قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے کہ مسلمانوں کو رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہیں کرنی چاہیے- ایک مومن کا اپنی جان پر جتنا حق ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی جان پر نبی کا حق ہے اور اللہ کے ساتھ نبی کو راضی کرنا بھی ضروری ہے بلکہ شرطِ ایمان ہے :-

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ	اے ایمان والو! جب تم چپکے چپکے بھی کوئی بات کرو تو گناہ، زیادتی، ظلم اور رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو-
۱۴- اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ	نبی زیادہ قریب ہے مومنوں کی جانوں سے
۱۵- وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوْهُ إِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ	اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری ہے-

۱۶- قرآن نے ان منافقین کی مذمت بھی کی ہے جو اپنی خود غرضی اور منافقت کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے ہیں-

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ	جب ان سے کہا جاتا ہے آؤ اس کتاب کی طرف

اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ
یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا

جس کو اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف آؤ۔ تو اے رسول تو دیکھے گا۔ ان منافقوں کو کہ اعراض کرتے ہیں تیری طرف سے

اس آیت میں رسول کی اطاعت کا جس طرح حکم دیا گیا ہے وہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ رسول کی اطاعت مستقل طور پر فرض ہے۔ دیکھئے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ تو کتاب ہے لیکن وَاِلَی الرسول یہ کتاب نہیں ہے یہ تو رسول کی مستقل طور پر اطاعت کا حکم ہے۔

۱۷۔ قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح اللہ کی نافرمانی پر کف افسوس ملیں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ
یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ
اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (احزاب)

جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ میں تلے جائیں گے تو کہتے ہوں گے ہائے کسی طرح ہم نے اللہ کا حکم مانا ہوتا اور رسول کا حکم مانا ہوتا

اگر رسول کی اطاعت ایک مستقل اطاعت نہیں تھی تو پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

۱۸۔ قرآن نے یہ بھی بتایا کہ رسول کی اطاعت غیر مشروط اور غیر محدود طور پر ہے۔ اس میں کسی زمانہ کی قید نہیں ہے اور رسول مستقل طور پر خدا کی طرح مطاع ہے۔ فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت خدا ہی کے حکم اور اذن سے کی جاتی ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔

یہاں اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کو اَطِیْعُوا اللّٰهَ سے ایک مستقل جملہ کی شکل میں لایا گیا ہے جس سے اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت بھی مستقل طور پر فرض ہے اور اگر اس کا یہ مطلب ہوتا کہ بس رسول جو کتاب لاتے ہیں اس کو مانا جائے تو صرف اطیعوا اللہ کہنا ہی کافی تھا۔ اطیعوا الرسول کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔

۱۹۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ رسول کی مستقل طور پر اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کی ہدایت اور اس کی وحی کے ماتحت کہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی خواہش سے کوئی با نہیں کہتا۔ اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہئیے کہ رسول کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

تمہارے صاحب (محمد) نہ گمراہ ہوئے اور نہ کج رو۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے (وہ جو کچھ کہتے ہیں وحی سے کہتے ہیں جو ان پر کی جاتی ہے

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں ھو کی ضمیر نطقِ رسول کی طرف لوٹتی ہے جس کا ذکر مَا يَنْطِقُ میں کیا گیا ہے۔ اس آیت میں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ نطقِ رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جائے۔ یہاں تو ہر بات کو وحی الٰہی قرار دیا گیا ہے جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کا نطق (بولنا) خالص وحی سے ہوتا ہے اور اس میں رسول کی خواہش کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

قرآن نے یہ تصریح اس لیے کی ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ (دین سے متعلق) رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کسی ایک بات میں بھی شبہ ہو جائے کہ رسول خواہشِ نفس سے بولتا ہے اور اس کا نطق خدا کی وحی سے نہیں ہے تو پھر تو رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لیے قرآن نے وضاحت کر دی کہ رسول کا نطق وحی الٰہی سے ہے۔ اس کی زبان سے جو نکلتا ہے خاص خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہی بات حضور علیہ السلام نے خود اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی۔

فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ

(بخاری)

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس سے جو کچھ نکلتا ہے۔ حق ہی نکلتا ہے۔

۲۰۔ قرآن نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ اللہ کا اپنے نبی سے عارضی اور وقتی تعلق نہیں ہوتا کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہوا اسی وقت یہ تعلق قائم ہوا اور اس کے بعد منقطع ہو جائے بلکہ اللہ کا اپنے نبی سے دائمی تعلق ہوتا ہے چنانچہ ذیل کی آیت اس امر پر دال ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ

اے محبوب! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو راہِ راست سے ہٹا دینے کا ارادہ کر ہی چکا تھا۔ مگر وہ خود اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے (کیونکہ) اللہ نے تم پر کتاب

مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

اتاری اور حکمت نازل کی اور تمہیں وہ سب کچھ سکھا دیا جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں تصریح کر دی گئی کہ حضور علیہ السلام کا نگران اللہ تعالےٰ ہے۔ فضلِ الٰہی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے اور اللہ تعالےٰ دائمی طور پر آپ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام کے تمام اقوال و افعال اللہ تعالےٰ کی رضا کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی مضمون کو اس آیہ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

اللہ تعالےٰ تم کو لوگوں کی دست بُرد سے بچائیگا۔

اس آیہ کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ جسمِ نبوی کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائیگا۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مبارک اللہ کی حفاظت میں ہے۔ اس لیے نبی کی آنکھیں اور اس کی زبان حق دیکھتی اور حق ہی کہتی ہے اور نبی دین سے متعلق جو کچھ فرماتا ہے۔ وہ منشاء ایزدی کی ترجمانی ہوتی ہے ان آیاتِ قرآنیہ نے بتا دیا کہ نبی صرف پیامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ آمر و ناہی بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے قول وعمل سے نازل شدہ کتاب کے احکام کی جو تفسیر و تشریح اور توضیح فرماتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کی منشا کی ترجمانی ہوتی ہے اور دین سے متعلق رسول کا قول و عمل قرآن کی طرح غیر متبدل اور واجب العمل ہوتا ہے۔

وحی متلو وغیر متلوء

مُنکرینِ حدیث یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل کی وہ قرآن میں بند ہے۔ قرآنِ مجید کے علاوہ آپ پر کوئی اور وحی نازل ہی نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا صرف قرآن واجب العمل ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال دین اور شریعت نہیں ہیں۔ لیکن ان کا ایسا کہنا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

اصطلاحِ شریعت میں وحی ان مطالب و معارف کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل ہوتے ہیں۔ بنیادی حیثیت سے وحی کی تین قسمیں ہیں۔ براہ راست بلا واسطہ خطاب جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا۔ دوسرے فرشتے کے واسطہ سے کلام جیسا کہ نزولِ قرآن کے باب میں ہوا۔ تیسرے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر مطالب و احکام کا قلبِ رسول پر نزول۔ یہ تیسری قسم ہی وہ ہے جس کی روشنی میں حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کے بیشمار امور کی تفصیل ہیئت و شکل متعین کی اور قرآن کے اجمال کو اس طرح مفصل کر دیا کہ اس کی تسلیم شرطِ ایمان ٹھہری۔ مُنکرینِ حدیث اسی تیسری قسم کی وحی کو تسلیم نہیں کرتے اور دین کو قرآن تک محدود کر دینے کی غرض سے نہ صرف اس کا انکار ہی کر رہے ہیں بلکہ

اس کے خلاف منظم مہم چلا رہے ہیں۔ یہ لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھ پاتے کہ جو قادر و قدیر خدا ہر شے پر قادر ہے اور نہ صرف گنہگار انسانوں بلکہ جانوروں تک صحیح خیالات اور درست فیصلوں کا الہام کرتا رہتا ہے اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ جیسے چاہے قرآن کے علاوہ بھی اپنے رسول کو خصوصی رہنمائی عطا فرمائے اور قرآن کے اجمال و ابہام کی صحیح ترین تفصیلات معین کرنے کے لیے اپنے رسول پر محفوظ و معصوم افکار وہدایات کسی طرح بھی نازل فرمائے۔ اسی ربانی رہنمائی کو وحی غیر متلو سے موسوم کیا جاتا ہے (یعنی وہ وحی جو قرآن کے علاوہ حضور علیہ السلام پر آئی) اور یہ وحی غیر متلو صحت میں قرآن سے کم نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ رسول جس سے روکے رک جاؤ۔ جس کا حکم دے اس کو مان لو۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر وہ بات جو آپ نے دین سے متعلق فرمائی۔ قرآن ہی کے حکم سے واجب القبول ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن یہ حکم اسی وقت دے سکتا ہے جب کہ رسول کریم کے امر و نہی میں قطعیً غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ سورہ نحل کی ذیل کی آیت پر غور کیجیے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝	اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں درختوں اور ان جگہوں میں جہاں لوگ چھت بناتے ہیں گھر بنائے۔

غور کیجیے کیا اللہ عزوجل نے شہد کی مکھیوں سے براہ راست کلام کیا ہوگا یا فرشتہ کے ذریعہ کہلوایا ہوگا۔ ظاہر ہے یہاں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی سی بھی صورت واقع نہیں ہوئی بلکہ یہاں وہ وحی مراد ہے جو اللہ عزوجل شعور و ادراک پر بلا واسطہ الفاظ وارد فرماتا ہے۔ یہ وحی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسان و حیوان کے صدہا امور ایسے ہیں جو اس کے ذیل میں آتے ہیں۔ بس جس اللہ نے مکھی تک کو سے نوازا اس کے لیے آخر کیا دشوار ہے کہ اپنے آخری نبی کے قلب و ادراک پر وقتاً فوقتاً بلا واسطہ الفاظ مطالب خاصہ و معارفِ معنویہ کا نزول فرماتا رہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ صرف عقلی نہیں ہے بلکہ خود قرآن کی نصوص اس کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔ سورہ توبہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے ان لفظوں میں منع فرمایا گیا ہے۔

١۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا	ان میں سے جو کوئی مرے آپ کبھی ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے نماز جنازہ شروع ہو چکی تھی اور حضور علیہ السلام منافق کی نمازِ جنازہ بھی پڑھا دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن میں اس سے پہلے نازل ہونے والی ایسی کوئی

آیت نہیں ہے جس میں حضور علیہ السلام کو نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ نمازِ جنازہ کا حکم اس وحی سے تھا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

۲۔ اسی طرح جمعہ کے خطبہ کو لے لیجئے جو ایک دینی عمل اور شرعی حکم ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم خود خطبہ دیا کرتے تھے اور امت میں اسی طرح آج تک جاری ہے۔ سورہ جمعہ میں شکایت کے ضمن میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَاِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا	جب یہ تجارت یا کھیل کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں

حالانکہ کوئی قرآنی آیت نہیں دکھائی دیتی جس میں اس خطبہ کا حکم ہو۔ پس لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم اس وحی کے ذریعہ ملا جو قرآن کے علاوہ تھی۔

۳۔ علیٰ ہذا اذان کو لیجئے نماز سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک دینی عمل ہے۔ سورہ جمعہ اور مائدہ میں بطور حکایت اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا	جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو منافق اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۵۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کے متعلق قرآنِ حکیم میں کوئی حکم موجود نہیں مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الحرام کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو ارشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ	جس قبلہ پر آپ تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا اتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ موڑنے والوں کے درمیان امتیاز ہو جائے

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا وہ اللہ کی وحی کی بنا پر تھا۔

۶۔ جنگِ اُحد کے موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمانوں سے فرمایا۔ اللہ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ	اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا ہے

ثابت ہوا۔ حضور علیہ السلام نے جب مسلمانوں کو فرشتوں کی امداد کی اطلاع دی تھی وہ اس وحی

(غیر متلو) سے تھی۔ جس کا ذکر قرآن نے بعد میں کیا۔

۵۔ جنگِ اُحد کے بعد حضور علیہ السلام نے غزوۂ بدر ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں نہیں ہے مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی۔ یہ بھی اسی کی جانب سے تھا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ

جن افراد نے زخم کھانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو مانا۔

۶۔ حضور علیہ السلام نے صدقات تقسیم کیے۔ اس پر منافقین نے اعتراضات کیے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ ظالمو! رسول کے فعل پر اعتراض کرتے ہو۔ حالانکہ یہ تقسیم جو رسول نے کی اللہ کے حکم سے کی تھی اور فرمایا۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

اگر وہ راضی ہو جاتے اس حصہ پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا۔

۷۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کا واقعہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ تمام صحابہ کرام نے صلح نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور صلح کی شرائط ہر ایک کو نہایت دبی ہوئی نظر آتی تھیں مگر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں شرائط کو جو کفار نے مقرر کی تھیں قبول فرمالیا اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے یہ تصدیق فرمائی۔ یہ صلح اللہ کی ہدایت کے ماتحت تھی۔ جس کو صحابہ کرام نہ سمجھ سکے۔ قرآن نے اعلان کیا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا

اے رسول ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عطا کی

۸۔ حضور سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ سے ایک راز کی بات فرمائی اور اس کے اظہار سے منع فرمایا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان سے اس راز کا افشا ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زوجہ مطہرہ سے راز افشا کرنے کا تذکرہ فرمایا۔ حضرت حفصہ نے عرض کی۔ حضور مَنْ اَنْۢبَاَکَ آپ کو کس نے خبر دی کہ مجھ سے آپ کا راز افشا ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے فوراً جواب دیا۔ اَنْۢبَاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (قرآن) مجھے میرے علیم و خبیر رب نے بتایا ہے (کہ تم سے میرا راز افشا ہو گیا ہے) یہ اور اس قسم کی اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یقیناً قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی اور حضور علیہ السلام دین سے متعلق جو ہدایات فرماتے تھے اور اصول قرآنی کی اپنے قول و عمل سے جو توضیح و تشریح فرماتے تھے وہ بھی وحی ہی سے ہوتی تھی۔ نماز ہی کو لیجئے۔ قرآنِ مجید صرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ نماز کا طریقہ اس کے آداب و فرائض بیان نہیں کرتا۔ اب یہ امور کس سے معلوم کیے جائیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ	جیسے میں نماز پڑھوں ایسے ہی تم پڑھو

ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کا یہ طریقہ معاذ اللہ اپنے جی سے نہیں گھڑ لیا تھا۔ بلکہ اسی وحی کے ذریعے متعین فرمایا تھا جو آپ پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔ نماز کی تو یہ صرف ایک مثال ہے۔ آپ عقائد، معاملات، حرام و حلال، نکاح و طلاق۔ غرضیکہ دنیا کے کسی بھی معاملہ کو لے لیجئے، ان کے سمجھنے اور ان کے تفصیلی احکامات جاننے کا مرکز حضور اکرم کی ذاتِ اقدس بنتی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے قول و عمل سے قرآن کے اصولی احکام کی توضیح اور اس کے جزئیات کی جو تعیین فرمائی وہ اسی وحی سے فرمائی جو آپ پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دین کو سمجھنے کے لیے احادیثِ نبوی کو قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے تو خود بہت سی آیات کا مفہوم و مطلب مبہم بلکہ بڑی حد تک تشنہ رہ جاتا ہے۔ چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱- قرآن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا حکم ہے۔ مگر کیا صرف قرآنِ مجید سے ان عبادات کے تفصیلی احکام معلوم ہو سکتے ہیں اور آدمی ان احکاماتِ قرآنیہ پر اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

۲- قرآنِ کریم میں طیب چیزوں کے کھانے کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔ کیا صرف قرآنِ مجید سے حلال و حرام کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے؟ اگر کہا جائے کہ ہم خود اپنی عقل و فہم سے حرام و حلال کی فہرست بنالیں گے تو کیا جن چیزوں کو ہم حلال یا حرام قرار دیں گے ان کے متعلق ہمیں یقین بھی ہو جائیگا کہ اللہ کے نزدیک بھی ان اشیاء کا یہی حکم ہے۔

۳- قرآن میں ہے فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا	پھر جب زید اس عورت سے اپنی غرض پوری کر چکے تو پھر ہم نے اس کو تمہارے نکاح میں دیدیا۔

دیکھئے یہ قرآن شریف کی آیت ہے مگر کیا صرف قرآن مجید سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ زید کون تھے اور یہ عورت کون تھی۔ لامحالہ یہ بات روایات سے ہی معلوم ہوگی یا مثلاً ارشاد ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى	تیوری چڑھائی اور منہ موڑا جب اس کے پاس ایک نابینا آیا۔

کیا صرف قرآن شریف سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ نابینا کون تھے اور اصل واقعہ کیا تھا۔ اسی طرح سورہ توبہ کی آیت کو لیجئے۔ اس میں ہے۔

لَا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِىَ اثْنَيْنِ اِذْ	اگر تم رسول کی مدد نہیں کرو گے تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جب کافروں نے ان کو نکالا

هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ

جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر

کیا صرف قرآن مجید سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو کافروں نے کہاں سے نکالا تھا نیز یہ رفیق غار کون تھے اور کس غار میں آپ رفیق کے ساتھ روپوش ہوئے تھے۔

۴۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ (توبہ)

اللہ نے بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کی

کیا روایات کے انکار کرنے کے بعد ان بہت سے میدانوں کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے؟۔

۵۔ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا (توبہ)

اللہ کی مہربانی ہوئی ان تینوں پر جن کے معاملہ کو ملتوی رکھا گیا۔

یہ تین شخص کون تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا اور کیوں ملتوی رکھا گیا۔ کیا روایات کے بغیر یہ باتیں حل ہو سکتی ہیں ۶۔ اسی سورہ توبہ کی اس آیت پر غور کیجیے۔ ارشاد ہے۔

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ۔ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا

جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔ اول دن ہی سے یہ مسجد لائق ہے کہ آپ اس میں نماز پڑھیں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں

یہ کس مسجد کا ذکر ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جن کی اس آیت میں مدح ہے۔ ان کی طہارت پسندی کا خاص معیار کیا تھا۔ جس کو اس آیت میں سراہا گیا ہے۔ کیا ان امور کا جواب صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

۷۔ اسی طرح سورۃ انفال کی آیت کو لیجیے۔

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ

اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے قبضہ میں آجائے گی۔

کیا صرف قرآن سے بتلایا جا سکتا ہے کہ یہ دو جماعتیں کون تھیں؟ اور یہ وعدہ کیا تھا۔ قرآن میں تو ہے نہیں۔ تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ کوئی دوسری قسم کی وحی بھی ہوتی تھی۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں جو بوجہ اختصار چھوڑی جا رہی ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے اور قرآن کو سمجھنے سمجھانے کے لیے روایات و احادیث کا دامن تھامنا ناگزیر ہے

صحابہ کرام کا سنتِ نبوی سے استدلال و امتثال

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام و خلفاء راشدین نے اپنے ہر عمل و حرکت کا محور ہی

ذاتِ نبوی کو قرار دیا اور ہر مسئلہ اور ہر فیصلہ کا مدار حضور علیہ السلام کے ارشادات کو رکھا۔ اس سلسلہ میں اگر وہ تمام واقعات پیش کیے جائیں تو اس کے لیے دفتر درکار ہے۔ دو ایک واقعات بطور مثال پیش کر کے ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰے عنہ کو جب قرآن مجید سے کسی قضیہ کا فیصلہ نہ ملتا تو آپ سنت ہی سے فیصلہ فرماتے تھے۔ پھر اگر اس معاملہ میں ان کو سنت یاد نہ ہوتی تو صحابہ کرام سے کہا کرتے تھے کہ تم کو معلوم ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں کوئی فیصلہ دیا ہو۔ جب صحابہ میں سے کوئی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ بتا دیتے تو اس پر حضرت صدیق اکبر فرماتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْنَا مَنْ یَّحْفَظُ عَنْ نَّبِیِّنَا (تاریخ الخلفاء مصری ص ۳۱)	خدا کا شکر ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ بھی بنائے ہیں جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں

۲۔ صحابہ کرام کو سب سے پہلی مشکل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین کے متعلق پیش آئی کہ حضور علیہ السلام کا جانشین کس کو مقرر کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل بھی صحابہ نے سنتِ نبوی میں تلاش کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ جب خود حضور علیہ السلام نے صدیق اکبر کو نماز کے لیے امام مقرر فرمایا تو جس کو آپ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا ہم نے اس کو اپنی دنیا کے لیے بھی پسند کر لیا۔ (طبقات ابن سعد)

۳۔ وصالِ نبوی کے بعد دوسرا مرحلہ حضور علیہ السلام کے دفن کا تھا۔ جب صحابہ کرام میں اختلافِ آراء ہوا تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے کہا کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ہر نبی اپنی اسی خوابگاہ میں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہوتی ہے۔ یہ حدیث سُن کر سب اختلافات ختم ہو گئے اور صحابہ کلام نے اپنی ذاتی آراء کو حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آگے جھکا دیا۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے قرآن کو یکجا کرنے کا مشورہ دیا تو جناب صدیق اکبر نے فرمایا۔

کَیْفَ اَفْعَلُ شَیْئًا لَّمْ یَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ	میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔

یہی جواب دیگر صحابہ نے دیا۔ حتیٰ کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰے عنہ کا شرح صدر ہوا اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ کے مشورہ کو مان لیا۔ اس واقعہ سے اتنا ثابت ہوا کہ صحابہ کرام ہر اقدام سے پہلے سنت رسول تلاش کرتے تھے۔

۵۔ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا نے میراث طلب کی تو حضرت صدیق اکبر نے فرمایا۔ میں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ اِنَّ النَّبِیَّ لَا یُوْرَثُ نبی کسی کو اپنے متروکات میں وارث

نہیں بناتے اس کے بعد فرمایا۔

فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ تَرَکْتُ شَیْئًا مِنْ اَمْرِہٖ اَنْ اَزِیْغَ (مسند احمد جلد ۱ ص۲۷ - بیہقی جلد ۱ ص۱۰۳)	میں ڈرتا ہوں کہ آپ کے حکم میں سے کسی کو چھوڑ دوں گا تو بھٹک جاؤں گا۔

نہ صرف یہ بلکہ یہاں تک فرمایا۔

لَسْتُ تَارِکًا شَیْئًا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْمَلُ بِہٖ اِلَّا عَمِلْتُہٗ (مسند احمد جلد ۱ ص۶ منتخب کنز العمال جلد ۳ ص۱۲۵)	میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعمالِ شریفہ سے کوئی عمل ایسا نہ چھوڑوں گا

دیکھئے خلیفہ راشد سیدنا امیر المومنین صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جو مرکزِ ملت بھی تھے، قضیہ وراثت میں سنت نبویہ سے فیصلہ فرمایا اور قرآن مجید کی آیتِ میراث سے میراثِ نبی کو مستثنیٰ قرار دیا اور سنت پر عمل کر کے یہ بتا دیا کہ قرآن مجید میں میراث کا حکم عام مسلمانوں کے لیے ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہے اور یہ کہ اصولِ قرآن کی توضیح و تشریح صرف سنتِ رسول علیہ السلام ہی سے ہو سکتی ہے۔

۶۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ماتحتی میں ایک لشکر شام کی مہم پر بھیجنے کا حکم فرمایا تھا کہ آپ کا وصال ہو گیا اور حالات بدل گئے۔ قبائلِ عرب مرتد ہونے لگے جو منافق تھے وہ سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ اجلہ صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ ایسے نازک اور پُرخطر موقع پر مرکزِ اسلام مدینہ منورہ سے لشکر کو علیحدہ کرنا اور مرکز کو خالی کر دینا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اس وقت تو مدینہ منورہ دار الخلافہ کو ہر طرح مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب باہر کے حالات سازگار ہو جائیں تب اس لشکر کی روانگی عمل میں لائی جائے۔ لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ حالات ناسازگار ہیں مگر ماحول کے پُرفتن دباؤ کے باوجود لشکرِ اسامہ ضرور روانہ ہوگا اور اس لیے روانہ ہوگا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے۔ انفذوا جیش اسامہ۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پُرجوش لہجہ میں مزید فرمایا۔ "بخدا اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے روانہ کر دینے کی بنا پر مرکز کمزور ہو جائے گا اور درندے مجھے کھا جائیں گے تو بھی حکمِ نبوی علیہ السلام کی تعمیل ضرور کروں گا۔"

اِنَّمَا اَنَا مُنَفِّذٌ لِاَمْرٍ اَمَرَ بِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (منتخب کنز العمال جلد ۴ ص۴۲)	کیونکہ میں اپنا حکم نہیں بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم نافذ کر رہا ہوں۔

دیکھئے ماحول کا تقاضا تھا کہ لشکرِ اسلام مرکز کی مضبوطی کے لیے مدینہ میں موجود رہے۔ اجلہ صحابہ کی

رائے بھی یہی تھی مگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حکمِ نبوی (حدیث) میں ذرا بھی ردوبدل نہ کیا۔

غرضیکہ اس نوع کے ایک نہیں سینکڑوں واقعات ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلفاء اربعہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ اجمعین نے ہر موقع اور محل پر سنتِ نبوی کو مشعلِ راہ بنایا اور ہر حادثہ اور ہر معاملہ میں سنت رسول سے ہدایت حاصل کی۔ بلکہ سُنتِ رسول کے مطابق کاروبارِ خلافت انجام دینے کی شرط پر بیعت تک کی۔ جب سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے بیعت ہوئی تو صحابہ کرام نے بایں لفظ بیعت کی۔

نُبَايِعُكَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ سُنَّةِ الْخَلِيْفَتَيْنِ	ہم آپ کے ہاتھ پر اس شرط پر بیعت کرتے ہیں کہ آپ کتاب اللہ، سنتِ رسول اور دونوں سابق خلیفوں کے طرزِ عمل پر بیعت کریں گے۔

قرآن کریم نے انہیں صحابہ کرام کے راستہ پر چلنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

مَنْ يَّتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا	جو مومنین (صحابہ کرام) کے راستہ سے الگ راستہ اختیار کرے تو ہم اسی راستے پر چلنے دیں گے اور انجام کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو بُرا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت میں مومنین سے مراد یقیناً صحابہ کرام ہیں۔ انہیں کے راستہ پر چلنے کی قرآنِ کریم تاکید کر رہا ہے اور ان کے خلاف چلنے والے کو جہنمی قرار دے رہا ہے اور سبیلِ صحابہ یہی ہے کہ وہ سُنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دین جانتے تھے اور اخلاق وعبادات ومعاملات غرضیکہ دین ودنیا کے ہر مسئلہ اور ہر حادثہ میں سنتِ نبوی کا اتباع کرتے تھے اور قرآنی اصول کی جزئیات سنتِ نبویہ سے متعین کرکے اس پر عمل کرتے تھے اور سُنتِ نبویہ میں ذرا بھی ردّوبدل گوارا نہ کرتے تھے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

جمع وتدوینِ حدیث

اس موضوع پر میں نے ابتداءً ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ مگر چونکہ اب اس موضوع پر مستقل کتابیں منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔ اس لیے بنظرِ اختصار اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

منکرینِ حدیث جمع وتدوینِ حدیث کے سلسلے میں سب سے بڑا مغالطہ یہ دیتے ہیں کہ حدیث کی موجودہ کتابیں دوسری اور تیسری صدی میں تصنیف ہوئی ہیں اور جامعینِ حدیث نے سنی سنائی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے کہ اتنے طویل عرصے کے بعد جو باتیں جمع کرکے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ وہ حضور علیہ السلام ہی کی فرمودہ ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت سے صحابہ کو منع فرما دیا تھا۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کا رواج عہد نبوی ہی میں شروع ہو چکا تھا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قولاً و فعلاً اس میں حصہ لیا ہے اور حفظ و ضبط و کتابتِ حدیث کا اہتمام عہدِ نبوی و عہد صحابہ و تابعین تمام ادوار میں جاری رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔

حدیث کی تبلیغ کا حکم

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو تاکیدی حکم تھا کہ جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ میری حدیثیں خوب اچھی طرح یاد کریں اور بجنسہٖ دوسروں تک پہنچائیں۔

رَحِمَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ كَلَامِيْ فَوَعٰهَا ثُمَّ اَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا

اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے میرا کلام سنا اور دوسروں تک پہنچایا۔

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَحَفِظَهٗ وَبَلَّغَهٗ غَيْرَهٗ

اور اس شخص کے چہرہ کو روشن رکھے جو ہم سے حدیث سن کر یاد رکھے اور دوسروں تک پہنچا دے۔

مَنْ حَفِظَ مِنْ اُمَّتِيْ اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا مِنَ السُّنَّةِ حَتّٰى يُؤَدِّيَهَا اِلَيْهِمْ كُنْتُ لَهٗ شَهِيْدًا وَّشَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

میرا جو امتی چالیس حدیثیں یاد رکھے اور ان کو تبلیغ کرے۔ قیامت کے دن میں اس کے ایمان کی شہادت دوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا۔

(جامع بیان العلم)

بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ كَانَ اٰيَةً۔ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّؤْا مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

مجھ سے جو کچھ سنو اس کو دوسروں کو پہنچا دو۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اس کی جگہ جہنم ہے۔ (بخاری)

حَدِّثُوْا عَنِّيْ بِمَا تَسْمَعُوْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا اِلَّا حَقًّا۔ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِيْ جَهَنَّمَ يُوَقَّعُ فِيْهِ (طبرانی)

جو کچھ مجھ سے سنو عوام تک پہنچا دو اور سچ کہو جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا اس کا مقام جہنم ہے۔

تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے اس وقت تک گمراہ نہ ہو گے۔

مَنْ حَفِظَ شَيْئًا فَلْيُحَدِّثْ (مستدرک) | جو میری حدیثوں کو حفظ کرے تو ان کو روایت بھی کرے۔

اور ان ارشادات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی احادیث کو یاد کرنے اور ان کی تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ حافظِ حدیث کے مرتبہ و مقام کو بیان فرما کر حفظ و اشاعتِ حدیث کی اہمیت کو ظاہر فرمایا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ منشاءِ رسالت یہی تھا کہ حدیث کی حفاظت ہو اور یہ دین کا جزو قرار پائیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ حدیث کے بیان کرنے، اس کے یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے پر سرسبز رہنے کی دعا نہ فرماتے۔ اب یہ ملاحظہ کیجئے کہ صحابہ کرام و تابعین عظام نے حدیث کے حفظ و ضبط کا کیسا کچھ اہتمام کیا۔ اس کا اندازہ ذیل کی چند مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

عہدِ نبوی میں حفظِ حدیث

عہدِ نبوی میں حدیثوں کے حفظ یا یاد کرنے کا یہ اہتمام تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے حدیثیں سنتے تھے۔ جب آپ مجلس سے اُٹھتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دورہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کل حدیثیں بیان کر جاتا۔ پھر دوسرا، تیسرا، بعض اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور ساٹھوں باری باری سے حدیثیں بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم اُٹھتے تو حدیثیں اس طرح یاد ہوتیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں (مجمع الزوائد جلد ۱ ص۱۶۱)

۲۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عہدِ نبوی میں فرض نمازوں کے بعد صحابہ کرام مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویہ کا اندازہ کرتے تھے (مستدرک جلد ۱ ص۹۴) حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ صحابہ کرام جب کہیں بیٹھتے تھے تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی حضور کی حدیثیں ہوتی تھیں یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآنِ پاک کی کوئی سورت پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے (مستدرک حاکم ص۹۴) ۴۔ دور کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کے یاد کرنے کا بڑا اہتمام تھا اور جن کو کوشش کے باوجود بھی حدیثیں یاد نہ ہوتیں تو وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی تدابیر معلوم کیا کرتے تھے۔ جیسے حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے اپنے حافظہ کے متعلق عرض کیا تھا۔ نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں حدیثوں کو دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ازبر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کا بیان ہے کہ ہم حدیثیں یاد کرتے تھے (مسلم جلد ۱ ص۱۰، ابن ماجہ ص۹۴)

اس قسم کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے عہدِ نبوی میں حفظِ حدیث کا اہتمام بلیغ کر رکھا تھا۔ عہدِ نبوی کے بعد عہدِ صحابہ کو لے لیجئے کہ اس دور میں بھی حدیث کو یاد رکھنے

اور اپنے شاگردوں کو یاد کرانے کی برابر تاکید کی جاتی تھی۔

عہد صحابہ میں حفظِ حدیث

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ تَذَاکَرُوْا ھٰذَا الْحَدِیْثَ لَایَنْفَلِتُ مِنْکُمْ۔ حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ (دور) کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے (دارمی ص۷۴) وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کو بار بار دہرایا اور اس کو مستحضر کرو۔ اگر اس طرح یاد نہ کروگے تو جاتی رہیں گی (دارمی) حضرت ابن عباس کی یہ بھی تاکید تھی کہ ہر روز کچھ حدیثیں بیان کیا کرو۔

۲۔ حضرت ابو سعید خدری بھی آپس میں حدیث کا دورہ کرتے تھے (دارمی ص۷۹ مستدرک جلد ۱ ص۹۴) بلکہ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ حدیثیں حفظ یاد کرو (دارمی ص۶۶) ۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔ تَذَاکَرُوا الْحَدِیْثَ فَاِنَّکُمْ لَا تَفْعَلُوْا یَنْدَرِسْ (مستدرک جلد ۱ ص۹۵) ۴۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی سخت تاکید تھی کہ حدیثوں کا دورہ کرتے رہو۔ یہی اس کے بقا کا سامان ہے (مستدرک جلد ۱ ص۹۵ ـ دارمی ص۷۹) ۵۔ حضرت علی کرم اللہ تعالٰے وجہہ فرمایا کرتے تھے۔ تَذَاوَرُوْا وَتَدَارَسُوا الْحَدِیْثَ وَلَا تَتْرُکُوْہُ (کنز العمال ج ۵ ص۲۴۲ دارمی ص۷۹) ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو۔ اس کو چھوڑ نہ دو غرضکہ عہدِ نبوی کے بعد عہد صحابہ میں بھی حدیث کے حفظ و ضبط اور دور کا باقاعدہ نظام تھا۔ صحابہ کے شاگرد اپنے اساتذہ کے احکام کا پورا احترام کرتے تھے اور حدیث کے دور سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے (دارمی ص۷۹) اور تذکرہ میں عطا کا بیان ہے کہ ہم جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سُن کر اُٹھتے تو ان کا دور کرتے تھے۔ ہمارے ہم سبقوں میں ابو زبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا۔ ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں (مستدرک جلد ص۹۴) امام زہری علیہ الرحمہ عشا کی نماز کے بعد حدیث کے دور کے لیے بیٹھتے تو صبح کر دیتے تھے (دارمی ص۹۵) دارمی میں بیان ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو اور ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا دور بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا۔ ہاں اور اگر ہمارا کوئی ساتھی غائب ہو جائے تو وہ کوفہ کے آخری سرے پر ملتا ہے تو وہیں جا کر اس سے ملتے ہیں (دارمی ص۷۹)

عہدِ تابعین میں حفظِ حدیث

صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا تو اس میں بھی حدیثوں کے حفظ کرنے اور اس کے مذاکرہ کے لیے مجالس قائم تھیں۔ چنانچہ دارمی میں ہے کہ عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ زہری اور علقمہ حدیث کے دور کی تاکید فرماتے تھے۔ انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث ابن زید عکلی، قعقاع ابن یزید، مغیرہ اور فضیل عشا کی نماز کے بعد جب حدیث کے لیے بیٹھتے تو صبح ہی

کردیتے تھے (دارمی ص۱۸، تہذیب جلد ۱ ص۲۷)

یونس کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تو پھر آپس میں دور کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اسماعیل بن رجاء کا دستور تھا کہ جب کوئی نہ ملتا تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے حدیثیں بیان کرتے تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو اور بھولنے نہ پائیں (دارمی ص۸۰، تہذیب ج۱ ص۲۹۶)۔ ان مختصر مثالوں سے آپ نے معلوم کر لیا کہ حفظِ حدیث کا عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ اور تابعین میں کیا کچھ غیر معمولی اہتمام تھا۔

عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث

حدیث کے حفظ و ضبط کے اہتمامِ بلیغ کے ساتھ کتابتِ حدیث کا رواج عہدِ نبوی میں ہو چکا تھا۔ وہ مکاتیب جو مختلف اوقات میں حضور علیہ السلام نے لکھوائے ان میں مسائلِ شرعیہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ مکاتیب و تحریرات حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ صحابہ کرام کی متعدد جماعتیں دربارِ نبوی میں حدیث سنتی اور لکھتی تھیں حضرت ابن عباس و عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں۔

۱۔ بَيْنَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ نَكْتُبُ (دارمی ص۹۸)

ہم حضور کے حلقہ درس میں آنحضرت کے ارشادات لکھ رہے تھے۔

۲۔ سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقعہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق اور مکہ کی حرمت کے متعلق مسائل بیان فرمائے تو ایک یمنی نے عرض کی مجھے یہ احکام لکھوا دیجئے۔ آپ نے حکم دیا۔ اُكْتُبُوْهُ لِاَبِيْ شَاهٍ یہ احکام ابو شاہ کو لکھ کر دو (بخاری ابوداؤد) ۳۔ قبیلہ جہنیہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مُردہ جانوروں کے متعلق احکام لکھوا کر بھیجے (مشکوٰۃ شریف) ابوداؤد ۴۔ مسلم شریف جلد ۱ ص۴۹۵ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قبیلہ والوں کو دیت (خون بہا) کے احکامات لکھوا کر بھجوائے ۵۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں وہ تمام حدیثیں جن کا تعلق مسائلِ زکوٰۃ سے تھا یکجا تحریر کروادیں جس کا نام کتاب الصدقہ تھا مگر اس کو عمال و حکام کے پاس روانہ کرنے سے قبل ہی آپ کا وصال ہو گیا تو خلفائے راشدین میں سے سیدنا صدیقِ اکبر و فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے اپنے زمانہ میں اسے نافذ کیا۔ اس کے مطابق زکوٰۃ کے وصول و تحصیل کا ہمیشہ انتظام رکھا (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ص۱۵۶)

۶۔ امام بخاری نے اسی کتاب الصدقہ کا مضمون نقل کیا ہے جسے صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بحرین کا حاکم بنا کر بھیجتے وقت ان کے حوالے کیا تھا۔ اس میں اونٹوں، بکریوں، چاندی سونے کی زکوٰۃ کے نصاب کا بیان ہے ۷۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں حدیثوں کا ایک ضخیم مجموعہ اہلِ یمن کے پاس عمرو بن حزم صحابی کی معرفت روانہ فرمایا۔ جس کے الفاظ

یہ ہیں۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبَ اِلٰی اَھْلِ الْیَمَنِ کِتَابًا فِیْہِ الْفَرَائِضُ وَالسُّنَنُ وَالدِّیَاتُ وَبَعَثَ مَعَ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ (موطا امام مالک صہ ۲۳۱) جس میں فرائض و کے احکام مندرج تھے (نسائی جلد ۲ صہ ۲۴۷) ۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حدیثیں جمع کرکے اس مجموعہ کا نام صادقہ رکھا۔ اس میں ایک ہزار حدیثیں تھیں (بخاری ۲ اصابہ۔ طبقات ابن سعد) ۹۔ حضرت انس نے حدیثیں لکھی تھیں (بخاری تدریب الراوی) ۱۰۔ تحریری احکام اور معاہدات حدیبیہ اور وہ فرامین جو حضور علیہ السلام نے قبائل کو بھیجے تھے (ابن ماجہ، طبقات ابن سعد) ۱۱۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سلاطین و امراء کے نام ارسال فرماتے تھے (بخاری، تذکرۃ الحفاظ) ۱۲۔ کتاب الصدقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر بن حزم صحابی والئے بحرین کو لکھائی تھی۔ یہ وہ صفحات تھے جن میں زکوٰۃ کے احکام تھے یہ دیگر امراء کو بھی بھیجا گیا تھا (دارقطنی، مسند احمد بن حنبل) یہ تحریر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابی حزم سے لے لی تھی (دارقطنی) ۱۳۔ محصلین زکوٰۃ کے پاس کتاب الصدقہ کے علاوہ اور بھی تحریریں تھیں (دارقطنی) ۱۴۔ عمرو بن حزم کو جب یمن کا حاکم مقرر کیا تو ایک تحریر لکھا دی۔ جس میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، صلوٰۃ، مس مصحف وغیرہ کے احکام تھے (کنز العمال مسند امام احمد بن حنبل، مستدرک) ۱۵۔ عبداللہ بن حکیم صحابی کے پاس حضور علیہ السلام کا ایک نامہ تھا جس میں مُردہ جانوروں کے احکام تھے (معجم صغیر طبرانی) ۱۶۔ وائل بن حجر صحابی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز، روزہ، ربوٰ، شراب وغیرہ کے احکام لکھا دیے تھے (معجم صغیر) ۱۷۔ ضحاک بن سفیان صحابی کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت جس میں شوہر کی دیت کا حکم تھا (دارقطنی) اشیم نام تھا اس مقتول کا جس کی بیوی کو شوہر کی دیت دلانے کا فرمان تحریر کرایا تھا (ابوداؤد) ۱۸۔ حضرت معاذ بن جبل کو ایک تحریر یمن بھیجی گئی جس میں سبزیوں، ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا (دارقطنی) ۱۹۔ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام کی تحریر رافع بن خدیج کے پاس تھی (مسند احمد) ۲۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک مجموعہ لکھا تھا جو ان کے صاحبزادہ کے پاس تھا (جامع بیان العلم) ۲۱۔ حضرت سعد بن عبادہ نے ایک مجموعہ حدیث مرتب کیا، اس کا نام کتاب سعد بن عبادہ تھا جو کئی پشت تک ان کے خاندان میں رہا (مسند احمد) ۲۲۔ سعد ابن ربیع انصاری نے حدیثیں لکھی تھیں (اسد الغابہ) ۲۳۔ سمرہ بن جندب نے ایک نسخہ حدیث مرتب کیا تھا (تہذیب) ۲۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰے عنہ کے پاس ایک دفتر حدیث لکھا ہوا تھا (فتح الباری) چنانچہ ہمام بن منبہ کا صحیفہ جو حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ چھپ چکا ہے اس مجموعہ کی اکثر احادیث مسند احمد و صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔ جن کے دیکھنے سے حدیث کی حفاظت

کا یقین مستحکم ہوجاتا ہے۔ اس صحیفہ میں جن الفاظ کے ساتھ حدیثیں درج ہیں من وعن صحاح میں پائی جاتی ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے صحیفہ کی احادیث تیسری صدی کے مجموعوں میں نقل در نقل ہوکر آئیں اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ خط جو آپ نے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس کا فوٹو بھی شائع ہوچکا ہے۔ اس خط کی نقل حضور علیہ السلام کے پاس نہیں تھی۔ حضرت صحابہ کرام نے وہ خط سنا، حفظ کیا پھر واسطوں کے ساتھ مصنفین صحاح تک پہنچایا اور تیسری صدی میں نقل در نقل کی صورت میں لکھا گیا۔ مگر اس کے مضمون میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

عہد صحابہ میں کتابت حدیث

اس کے بعد عہد صحابہ کو لیجئے۔ اس دور میں بھی کتابت حدیث کے بیشمار واقعات ملتے ہیں۔ تمثیل کے طور پر چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ دارمی ص۶۸ و مستدرک حاکم جلد ۱ ص۱۰۶ میں امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالے عنہ کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقید کرلو ۲۔ دارمی و مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقید کرلو۔ نیز صحیح مسلم جلد ۱ ص۴۶ میں ہے کہ حضرت انس نے محمود ابن الربیع صحابی کی زبانی حضرت عتبان کی ایک طویل حدیث سنی تو اپنے لڑکے سے کہا اس کو لکھ لو چنانچہ انہوں نے لکھ لیا۔ طحاوی جلد ۲ ص۳۸۷ میں بھی حضرت انس کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے ۳۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کرلیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری جلد ۱ ص۱۸۴ میں حسن ابن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور حدیث نبوی کی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں اور بشیر ابن نہیک کا بیان طحاوی جلد ۲ ص۳۸۵ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ سے حدیث کی کتابیں عاریۃً لے کر نقل کرتا تھا۔ نقل سے فارغ ہوکر ان کو کل سناتا جاتا تھا۔ سنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ میں نے آپ کو جو سنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ وہ فرماتے تھے ہاں ۴۔ حضرت ابن عباس کے چند صحیفے تھے جن میں حدیثیں قلمبند تھیں۔ چنانچہ ترمذی جلد ۲ ص۲۳۸ اور طحاوی جلد ۲ ص۳۸۴ میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباس کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو سنا دیں۔ اس وقت حضرت ابن عباس کی نگاہ بہت کمزور ہوگئی تھی اس لیے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا۔ تم خود سنا دو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا جواز روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔ ۵۔ دارمی ص۶۸ میں ہے کہ ابان (تابعی) حضرت انس کے پاس بیٹھے ساگوان کی تختیوں پہ حدیثیں لکھتے رہتے تھے ۶۔ جلد ۲ ص۳۸۴ میں عبداللہ ابن محمد ابن عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر کی

کی خدمت میں حاضر ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو پوچھتے اور لکھ لیتے تھے۔ ۷۔ دارمی ص ۶۹ میں ہے کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ علم کو قیدِ تحریر میں لاؤ۔ چنانچہ دارمی ہی میں حضرت سعید ابن جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمر سے حدیثیں سنتا اور لکھ لیتا تھا ۸۔ دارمی ص ۱۲۹ اور طحاوی جلد ۲ ص ۳۴۴ میں ہے کہ حضرت سعید ابن جبیر وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے بلکہ دارمی میں ہے کہ کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری چیز پر لکھ لیتے تھے۔

عہدِ تابعین میں کتابتِ حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے ہیں۔ ان میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے سامنے یا صحابہ سے سن کر حدیث لکھنے کا ذکر ہے۔ اب چند ایسے واقعات سنئے جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سن کر حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے۔ ۱۔ ترمذی جلد ۲ ص ۲۲۸ اور دارمی ص ۶۶ میں ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ سالم ابن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ سالم کی وفات سنہ ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے اور انھوں نے بعض صحابہ سے بھی حدیثیں سنی ہیں۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۳ میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سننے کے لیے جایا کرتے تھے۔ زہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لیے رہتے تھے اور جتنا سنتے تھے سب لکھتے رہتے تھے۔ زہری کی وفات سنہ ۱۲۴ھ میں ہوئی ہے ۳۔ کنز العمال جلد ۵ ص ۲۳۸ میں صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا۔ زہری نے مجھ سے کہا آؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھیں ۴۔ دارمی ص ۶۹ میں ہشام ابن الغاز کا بیان منقول ہے کہ عطا ابن ابی رباح تابعی سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور انھی کے سامنے لکھتے جاتے تھے۔ عطا کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی ۵۔ دارمی میں سلیمان ابن موسےٰ کا بیان ہے کہ میں نے نافع کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے ہیں۔ نافع کا انتقال سنہ ۱۱۷ھ میں ہے ۶۔ ترمذی جلد ۲ ص ۲۳۹ میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں۔ میں ان کی روایت آپ سے کر سکتا ہوں؟ تو انھوں نے کہا "ہاں"۔

تہذیب التہذیب میں ہے کہ حمید طویل نے حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں (جلد ۳ ص ۳۹) حسن بصری کی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی ۷۔ ترمذی جلد ۲ ص ۲۳۹ میں ابن جریج کا بیان ہے کہ ہشام بن عروہ کی وفات سنہ ۱۴۶ھ میں ہوئی ۸۔ تذکرۃ جلد ۱ ص ۸۸ میں ہے کہ ابوقلابہ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوب سختیانی کے لیے کر گئے تھے چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں۔ ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ، چودہ درم ان کا کرایہ ادا کیا۔ ابوقلابہ کی وفات سنہ ۱۰۴ھ میں ہوئی ۹۔ صحیح بخاری

جلد ۱ ص۱۲۰ اسعاف المبطا ص۵، دارمی ص۶۸ میں ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے تمام اطراف سلطنت میں یہ فرمان بھیجا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو جمع کر دو، چنانچہ ابوبکر بن حزم (جو ان کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو انھوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کیے۔ مگر ابھی ان کو دربار خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عمر بن عبد العزیز کی وفات ہو گئی۔ نیز عمر بن عبد العزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری نے بھی حدیثوں کو مدون کیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۰۶ میں معمر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے۔ عمر بن عبد العزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی۔

لہٰذا تابعین کے یہ چند واقعات بر سبیل تذکرہ میں نے پیش کیے ہیں اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحب واقعہ کا سن وفات بھی لکھ دیا ہے۔ سنین وفات دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات وفات نبوی سے صرف سو برس بعد کے ہیں بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آئیے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھیے تو اور زیادہ کتابت حدیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے جو اس عہد میں لکھے گئے اور ان میں سے بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تھا کہ استاد سے جو حدیثیں سنیں لکھ لیں چنانچہ محمد ابن بشر کا بیان ہے کہ مسعر المتوفی ۱۵۵ھ کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں۔ میں نے دس کے سوا ساری لکھ لیں (تذکرہ ص۱۶۷) عبد الرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمر المتوفی ۱۵۳ھ سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۵) حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی (تذکرہ جلد ۱ ص۱۹۸) ثوری یمن گئے تو ان کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی۔ ہشام ابن یوسف کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا چنانچہ میں ان کے لیے حدیثیں لکھا کرتا تھا (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۶) ابونعیم کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔ شعیب بن حمزہ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں۔ زہری بولتے اور شعیب لکھتے تھے۔ امام احمد نے شعیب کی کتابیں دیکھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ شعیب کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں۔ شعیب کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی ہے (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۰)

ابوعوانہ پڑھنا جانتے تھے لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اس لیے جب حدیث سننے کے لیے جاتے تھے تو دوسرے سے لکھواتے تھے۔ ابوعوانہ کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۹) ابن لہیعہ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھیں۔ چنانچہ ابن صالح کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ ابن غزیہ کی حدیثیں ابن لہیعہ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں۔ ابن لہیعہ نے ۱۷۴ھ میں انتقال کیا (تذکرہ جلد ۱ ص۲۲۲) سلیمان بن ابی بلال المتوفی

۱۷۲ھ کے مسموعات کی بھی کئی کتابیں تھیں اور اپنے مرنے کے وقت وصیت کر گئے تھے کہ وہ کتابیں عبدالعزیز ابن حازم کو دے دی جائیں (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۴۹)

ابن المبارک نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی اور لوگوں کو سنایا ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۵۳) غندر کے پاس بھی ان کی مسموعات کی کتابیں تھیں۔ ابن معین کا بیان ہے کہ ان کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح تھیں۔ ابن مہدی کا بیان ہے کہ ہم شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ غندر کی وفات ۱۹۳ھ میں ہوئی (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۶۷)

بہرحال کتابتِ حدیث کے اس دستور کے علاوہ باقاعدہ تصانیف کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے، یمن میں معمر بن راشد المتوفی ۱۵۳ھ نے، بصرہ میں سعید ابن ابی عروبہ المتوفی ۱۵۲ھ اور ربیع ابن صبیح المتوفی ۱۴۱ھ نے حدیث کی کتابیں تصنیف کیں اور اسی عہد میں موسیٰ ابن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ نے غزوات اور سیرتِ نبوی پر کتابیں لکھیں اور ان کے بعد امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ نے شام میں، امام ابن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ نے خراسان میں حماد بن سلمہ المتوفی ۱۶۷ھ نے بصرہ میں، سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ نے کوفہ میں، جریر بن عبدالحمید المتوفی ۱۸۸ھ نے رے میں اور ہشیم المتوفی ۱۸۳ھ نے واسط میں حدیث کی کتابیں لکھیں اور تقریباً اسی زمانہ میں امام مالک نے اپنی شہرہ آفاق کتاب موطا تصنیف کی۔ امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ اسی زمانہ ابو معشر سندی نے غزواتِ نبوی پر کتاب لکھی۔ ابو معشر نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

ان حضرات کے بعد ابراہیم بن محمد اسلمی استاد شافعی نے امام مالک کی موطا کے طرز پر اپنی موطا لکھی جس کی نسبت ابن عدی کا بیان ہے کہ موطاء مالک سے وہ چند گونہ بڑی تھی۔ ابراہیم کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی (تذکر

یحییٰ بن زکریا بن زائدہ کوفی شاگرد امام اعظم بھی صاحب تصنیف تھے۔ یحییٰ کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۴۶) معافی بن عمران موصلی المتوفی ۱۸۵ھ نے کتاب السنن، کتاب الزہد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ تصنیف کیں (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۶۵)

عبدالرحیم بن سلیمان کنانی نے بھی کئی کتابیں لکھیں (تہذیب جلد ۶ صـ۳۰۶) ——— امام ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ نے کتاب الآثار، کتاب الخراج وغیرہ لکھیں ——— امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ نے موطا، کتاب الآ کتاب الحج وغیرہ تصنیف فرمائیں۔

ولید بن مسلم المتوفی ۱۹۵ھ نے حدیث کے مختلف ابواب و موضوعات پر ستر کتابیں لکھیں (تذکر جلد ۱ صـ۲۷۳) ابن وہب المتوفی ۱۹۷ھ نے اہوال القیامہ اور جامع وغیرہ تصنیف کیں۔ نیز ایک

ضخیم موطا بھی ان کی تصنیفات میں ہے۔

محمد ابن فضیل المتوفی ۱۹۵ھ نے کتاب الزہد کتاب الدعاء وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔ اس دور کی تصنیفات میں سے سفیان کی جامع ابن المبارک کی کتاب الزہد والرقاق۔ امام مالک کی موطا، ابو یوسف کی کتاب الآثار اور کتاب الخراج اور امام محمد کی موطا کتاب الآثار اور کتاب الحج وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

بطور تمثیل یہ چند واقعات ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ورنہ اس سلسلہ کے تاریخی حقائق کو یکجا جمع کیا جائے تو مستقل طور پر ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ بہرحال حفظ وکتابتِ حدیث کے اس اہتمامِ بلیغ کے ہوتے ہوئے یہ خیال قائم کر لینا کہ زبانی روایت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئی ہوں گی انصاف کا خون اور حقائق سے چشم پوشی اور محض وہم پرستی سے زائد وقیع نہیں ہے۔

روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط

حدیث کے حفظ وکتابت کے لیے صحابہ کرام و تابعینِ عظام کا یہ غیر معمولی اہتمام ملاحظہ فرمانے کے بعد اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت وتبلیغ کے لیے تاکیدیں فرمائیں وہاں اس کی بھی نہایت سخت تاکید فرمائی کہ کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔ اس لیے ابتدا ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے جیسا کہ حضرت زبیر کا واقعہ صحیح بخاری جلد ۱ ص۲۱ میں مذکور ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا یہ کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے تو وہ اس کو بیان نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا (دارمی ص۴۲)

امام ربانی محمد باقر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا کہ حدیث میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہو (تذکرہ ص۳۴) چنانچہ صحیح مسلم جلد ۱ ص۳۲ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر نے یہ حدیث بیان کی کہ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ حضرت ابن عمر کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دہرایا تو یوں کہہ دیا۔ وَالْحَجِّ وَصِيَامُ رَمَضَانَ۔ حضرت ابن عمر نے فوراً اس کو ٹوک دیا اور فرمایا یوں نہیں بلکہ ”وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ“ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔ غور فرمائیے کہ باوجودیکہ معنیٰ میں کوئی خرابی پیدا نہیں

ہوتی تھی۔ پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتے تھے۔ اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ دارمی ص۵ میں عبداللہ بن عمر کا ایسا ہی دوسرا واقعہ ایک دوسری حدیث کے باب میں مذکور ہے اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کی نسبت تذکرۃ الحفاظ میں مذکور ہے۔

كان ممن يتحرى في الأداء ويشدد في الرواية ويزجر تلامذته عن التهاون وضبط الالفاظ (جلد ا ص۱۳)

ان کا شمار ان حضرات میں ہے جن کو ادائے حدیث میں بے حد احتیاط اور روایت کے بارے میں بڑا تشدد تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو الفاظِ حدیث کے ضبط کرنے میں سستی پر بہت ڈانٹتے تھے۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ وہ یا اور تا کا بھی خیال رکھتے تھے یعنی خطاب وغیبت کا (تذکرۃ الح
جلد ا ص۱۹۸) ۔ حضرت زید ابن ارقم کا جب بڑھاپا آیا۔ اس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے (ابن ماجہ) اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت ابن عمر اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے تین دفعہ اس کو دُہرا لیا کرو (دارمی ص۲)

نیز اسی شدتِ احتیاط کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی بڑی تاکید تھی کہ حضو
صلے اللہ علیہ وسلم سے وہی حدیثیں روایت کی جائیں جن پر سُننے والے کو پختہ یقین ہو۔

صحابہ کرام کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جس جماعت کو اس قد
احتیاط کا پاس ولحاظ ہو اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں امکان ہی نہیں کہ انھو
جان بوجھ کر غلط تو درکنار کوئی مشکوک بات بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہوگی بلک
میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حدیثوں کی روایت سے بھی چارہ کار نہ تھا تو لازمی طور پر حد
کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا انتہائی اہتمام ہوا۔ اس حالت میں بھول چوک سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔ خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس
بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو مزید اطمینان کے لیے کوئی دوسرا اس کا مؤید تلا
کیا جاتا تھا جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص۳ میں مذکور ہے کہ جب حضرت مغیرہ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم نے دادی کو پوتے کی میراث کا چھٹا حصہ دلوایا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ
نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو نقل کرنے میں تمہارا ش

ہے؛ معلوم ہوا کہ حضرت محمد ابن مسلمہ بھی اس کو جانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اگر شہادت دی تو حضرت ابوبکر نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ سے ایک حدیث بیان کی تو انھوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو۔ حضرت ابو موسیٰ انصار کے مجمع میں گئے اور اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں کسی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے فلاں حدیث سُنی ہے۔ انھوں نے کہا ہم سب نے یہ حدیث سُنی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا اور حضرت عمر کے سامنے ان کی شہادت دلائی (تذکرہ ۶)

خود حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا تو فرمایا کہ ڈر تو لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے لیکن عمّار نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سُنا ہے اس لیے بیان کرتا ہوں۔ تم عمّار کے پاس آدمی بھیج کر ان سے تصدیق کرا لو۔ چنانچہ عمار کو بُلا کر پوچھا گیا تو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کی تصدیق کی (ابوداؤد طیالسی)

حدیث کی حفاظت کے اصل اسباب

صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین نے حدیث کی حفاظت وکتابت و اشاعت کا اہتمام بلیغ اسی لیے کیا کہ حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دین کا جزو اور قرآن کی طرح اسلام کی اساس اور منبع و ماخذ ہے۔ جب حدیث رسول دین کا جزو قرار پائی تو قدرتی طور پر بھی حفاظتِ حدیث کا اہتمام ہونا لازمی تھا۔ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے متعلق قرآن کا حکم تھا کہ آپ کا اتباع کیا جائے اور آپ کے طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اسی ہدایتِ قرآنی کا یہ اثر تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کوئی بات کہتے یا عمل کرتے تو اس پر عملدرآمد کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دین کے متعلق جو کچھ فرماتے خود بھی اس پر عمل کرتے اور قوم کو اس پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالے عنہم ان امور میں بھی حضور علیہ السلام کے اتباع کی کوشش کرتے جو حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے یا جن کو حضور علیہ السلام نے از خود اپنے لیے مقرر کر لیا تھا جیسے صوم وصال۔ چنانچہ اس دور میں مومن مسلمان کی پہچان ہی یہ ہو گئی تھی کہ جو زندگی کے ہر معاملہ میں حضور علیہ السلام کی ہدایات کو عملی طور پر قبول کیے ہوئے ہو۔ حضور علیہ السلام پانچ وقت خود نماز پڑھاتے تھے اور ہر مکلف مسلمان کے لیے باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا۔ جو بھی نماز پڑھتا تھا وہ نماز کے مسائل و احکام حضور علیہ السلام کے قول و عمل سے اخذ کر کے نہ صرف اپنے علم میں لے آتا بلکہ ان پہ پانچ وقت عمل بھی کرتا تھا۔ حج کا موسم آتا تو حضور علیہ السلام صحابہ کے ہمراہ حج فرماتے اور اس سلسلہ میں جو امور پیش آتے ان کا تصفیہ فرما دیتے۔ سال گزر جانے پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے قاصدوں کو بھیجتے اور زکوٰۃ وصول کی

جاتی۔ جنگ کا موقع آتا تو خود سربراہی کے فرائض سرانجام دیتے اور جنگ کے متعلق قواعد وضوابط بیان فرماتے۔ جنگ ختم ہوتی تو مالِ غنیمت کی تقسیم، قیدیوں کا تبادلہ اور اسی نوع کے متعدد امور سے متعلق ہدایات دیتے۔ معاہدہ یا صلح کی ضرورت پیش آتی تو اس کے احکام و مسائل سے آگاہ فرماتے۔ غرضیکہ کوئی معاملہ ہوتا خواہ دینی یا سیاسی، معاشی، اقتصادی، داخلی وخارجی، زرعی و صنعتی، ملکی یا بیرونی، ان سب کے متعلق ہدایاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فوری طور پر عمل شروع ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز تقریر کے عمل سے گزر کر روزمرہ کے عمل سے رواج پاتے اور قوم کی زندگی کا لائحہ عمل اور دستورِ حیات بن جائے۔ اس کا مٹنا اور اس میں تغیر و تبدل ہونا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ عہدِ نبوی میں اسلام نے ریاست کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسلامی سٹیٹ کا قانون قرآن اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات تھیں۔ مثلاً جب زکوٰۃ کے احکام جاری کیے گئے تو ہر سال ڈھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے ۵۲½ تولے چاندی ۷½ تولے سونے سے وصول کی جانے لگی۔ اسی طرح گائے، بھینس، بکری، بھیڑ، اونٹ کا نصاب مقرر ہوا اور ان کی وصول کی شرح بھی متعین کی گئی۔ زرعی پیداوار سے بھی مقررہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ یہی حال نکاح، طلاق، عدت، میراث، حدود و قصاص، حقوق و معاملات وغیرہ ذالک امور کا تھا۔ ان امور کے احکامات مرتب کر کے علماء و قضاۃ، امراء و عمال کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے ان امور کی تبلیغ کے لیے مبلغ جایا کرتے تھے اور یہ مبلغین صرف تبلیغ ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر عمل کر کے دکھاتے تھے اور وہاں کے باشندو کو اس سے آگاہ کرتے اور اس طرح حدیثوں کو عملی شکل دے کر ان کی حفاظت کی طرح ڈال دیا کرتے تھے۔ بس جو چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے عہد میں قانون بن گئی اس کا محفوظ رہنا لازمی ولابدی تھا۔ پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو مبلغ احکام کی تبلیغ و نفاذ کے لیے جاتا تو وہاں کے لوگ خود خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اس امر کی تصدیق و تحقیق کر لیتے تھے کہ یہ مبلغ حضور علیہ السلام کا بھیجا ہوا ہے یا نہیں او اس نے جو احکام ہمیں سنائے ہیں وہ آپ کے ہیں یا نہیں۔ ایسے لوگ جب خدمتِ نبوی میں آتے تو حضور علیہ السلا اپنے مبلغ کی تصدیق فرما دیتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں ایسے متعدد واقعات مل جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ رواج بھی تھا کہ اگر کسی کو کسی لفظ میں شبہ گزرتا تو اس کو دوبارہ سُنا کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصحیح کر لیتا جیسا کہ بخاری کتاب العلم باب القرآۃ والعرض علی المحدث میں مذکور ہے۔

یہ کیفیت تو عہدِ نبوی کی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں بھ حدیث قانونی ماخذ تھی۔ سیدنا صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمانِ غنی، علی مرتضےٰ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے دو میں قرآن مجید کے بعد سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ خلفاء اربعہ اور تمام صحابہ کر

کی بالاتفاق یہی روش تھی کہ جب ان کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے کتاب میں دیکھتے۔ اگر اس میں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ اگر قرآنِ مجید میں نہ پاتے تو پھر سنتِ رسول میں تلاش کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ حتیٰ کہ اگر ان کو حدیث یاد نہ ہوتی تو صحابہ کرام کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ کسی کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اس معاملہ میں یاد ہو تو بتائے۔ بسا اوقات جماعت کی جماعت مطلوبہ حدیث بیان کر دیتی تو اس پر صدیق اکبر فرماتے۔

" الحمد للہ کہ ہم میں ایسے لوگ اللہ نے پیدا کئے ہیں جو حدیث یاد رکھتے ہیں (دارمی ص۳۲) یہی کیفیت تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں تھی۔ وہ بھی ہر معاملہ اور ہر مقدمہ میں سنتِ رسول اللہ سے روشنی حاصل کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ غور کیجئے کہ جب حدیث رسول اللہ کی تبلیغ و اشاعت کی یہ کیفیت ہو اور اس کے حفظ و تکرار کی یہ نوعیت ہو کر ہر مرحلہ میں اس سے مسائل معلوم کئے جائیں تو ایسی صورت میں حدیثوں میں رد و بدل ہو جانے کا دعویٰ کرنا اور احادیثِ نبویہ کے ذخیرہ کو جعلی قرار دینا انصاف و دیانت کا خون کرنا نہیں تو اور کیا ہے (واللہ یھدی من یشاء)

مختصر حالات امام بخاری

نام مبارک محمدؒ، ابو عبد اللہ کنیت ہے۔ والد ماجد کا نام اسمٰعیل ہے جو چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت اور مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انہوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے۔ اہلِ عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کیں۔ خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اپنے والد کے فضل و کمال کو بیان کیا۔

نسب

امام بخاری کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔ آپ کے جد اعلیٰ بردزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔ امام صاحب کے جد امجد مغیرہ پہلے شخص ہیں جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے اسی کی نسبت سے نو مسلم مشہور ہو جاتے۔ مغیرہ چونکہ امیرِ بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اس لیے جعفی مشہور ہوئے۔ یہ لقب نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا امام تک پہنچا۔ اس بنا پر امام بخاری جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔

وطن

امام صاحب کے نام سے زیادہ اُن کی وطنیت مشہور ہے۔ اس لیے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصل وطن بخارا ہے۔ دوسری صدی کے اواخر میں جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا۔ خلفاءِ عباسیہ کے زیرِ حکومت تھا اور مقامی انتظام کے لیے دربارِ خلافت سے ایک گورنر رہا کرتا تھا۔

ولادت و یتیمی

۱۳ شوال ۱۹۴ھ بروز جمعہ امام صاحب پیدا ہوئے۔ ابھی کھیل کود کے دن ختم نہ ہوئے تھے کہ آپ کے والد اسمٰعیل یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے آپ سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی والدہ جن کی سرپرستی اور توجہ پر ان کی ترقی کا دارومدار تھا ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں۔ رہیں آپ نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ آپ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ آپ والد آپ کے لیے رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کرتی تھیں کہ ایک دن، رات کو خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ آپ نے فرمایا۔ تیری دُعا قبول ہو گئی۔ صبح کو دیکھا تو آپ کی آنکھیں روشن تھیں (اشعۃ اللمعات) اس کے بعد آپ کی بینائی کا یہ عالم تھا کہ چاند کی چاندنی میں کتابیں لکھتے تھے۔

حُلیہ، اخلاق و عادات

امام بخاری کا حُلیہ یہ تھا۔ جسم دُبلا پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی، طبیعت حد درجہ غیور اور خوددار تھی کہ تمام عمر امراء و سلاطین سے وظیفہ قبول نہیں کیا۔ اپنے پدر بزرگوار سے جو کچھ میراث میں ملا اسی پر آخری عمر تک قناعت کی۔ خود تو علم کی خدمت میں مصروف رہے۔ مضاربت کے طور پر تجارت میں شریک ہوتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریاتِ زندگی پوری کرتے۔ زندگی گو بہت ہی سادہ تھی مگر صفائی کا اس درجہ خیال فرماتے کہ فرش پر ایک تنکا پڑا رہنا گوارہ نہ ہوتا۔ غذا نہایت سادہ کھاتے۔ ایک بار بیمار ہوئے تو اطباء نے آپ کا قارورہ دیکھ کر کہا۔ یہ تو کسی راہب کا قارورہ ہے جو روٹی کے ساتھ سالن نہیں کھاتا۔ امام سے پوچھا گیا تو فرمایا۔ چالیس سال سے صرف روٹی پر قناعت ہے۔

جُودتِ ذہن

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے۔ فطرت کی اس فیاضی سے انھوں نے فنِ حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا۔ استاد سے جو حدیث سُن لیتے فوراً یاد کر لیتے گیارہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے شیخ کی غلطی پکڑی۔ ۱۵ سال کی عمر میں ابن مبارک، امام وکیع اور دیگر محدثین کی کتبِ حدیث کو مع ان کے راویوں کے حالات کے حفظ کیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں قضایائے صحابہ و تابعین تالیف کی۔ پھر روضۂ نبوی کے جوار میں بیٹھ کر تاریخ کبیر لکھی۔

امام بخاری کے حافظہ کا حال حاشد بن اسماعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سُننے کے لیے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے تو لکھتے نہ تھے۔ بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے۔ ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے تو وہ کچھ نہ بولتے۔ ایک دن انھوں نے کہا۔ تم لوگ مجھ کو بہت کہتے رہے۔ لاؤ مجھ کو دکھاؤ تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زائد حدیثیں تھیں۔ اس کے بعد ہماری بیاضیں انھوں نے ہم کو دیں اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سُنانا شروع کر دیا تو کُل کی کُل سنا دیں۔ ان کی یادداشت

اتنی درست تھی کہ ہم نے ان کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں۔ اس کے بعد بخاری نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لیے روزانہ آتا ہوں (تذکرہ جلد ۲ صہ ۱۳۲۔ مقدمہ فتح الباری صہ ۵۱۴)

خود امام بخاری فرماتے تھے کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں (تذکرہ جلد ۲ صہ ۱۲۳ مقدمہ صہ ۵۷۵) بخاری کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے تو وہاں کے محدثین نے متفق ہو کر ان کے حافظ کا امتحان کرنا چاہا اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر ان کے سند و متن کو اُلٹ پلٹ کر دکھایا گیا۔ اِس کی سند اُس کے ساتھ اور اُس کی اِس کے ساتھ جوڑ دی گئی۔ پھر دس محدث چنے گئے اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئیں کہ جب مجلس میں سب لوگ باطمینان بیٹھ جائیں تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیثِ تبدیل پڑھ کر امام بخاری سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے؟ اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ کر پوچھتا جائے۔ جب وہ فارغ ہو جائے تو دوسرا آگے بڑھے۔ اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں۔ یہ طے کر کے بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بلایا گیا اور بہت بڑا مجمع کیا گیا۔ اس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو لوگ مقرر ہوئے تھے انھوں نے پوچھنا شروع کیا۔ بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں اس کو نہیں مانتا۔ جب وہ دسوں آدمی پوچھ چکے تو بخاری نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے حالانکہ وہ اس طرح ہے اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے حالانکہ اس کی سند یوں ہے۔ اسی طرح فرداً فرداً ترتیب کے ساتھ ہر حدیث کی سند و متن کی صحیح نسبت بیان کر گئے۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کے بے مثال حافظ کے قائل ہو گئے (الکمال فی اسماء الرجال صہ ۶۲۶) امام صاحب کی اس وسعتِ معلومات اور معرفتِ حدیث کو دیکھ کر اکثر علماء کہا کرتے تھے۔

انما هو آية من آيات الله تمشي على وجه الارض ما خلق الا للحديث	امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ خدا نے ان کو صرف حدیث کے لیے پیدا کیا۔

مرتبہ و مقام

آپ حدیث کے امام اور اس فن میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ محدثین نے آپ کو امام الدنیا، امیر المومنین فی الحدیث، ناصر الاحادیث، سید المحدثین کے معزز القابات سے یاد کیا ہے اور سب نے آپ کے علم و فضل کو تسلیم کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا۔ خراسان کی زمین میں بخاری جیسا کوئی پیدا نہ ہوا۔ اسحٰق بن راہویہ نے فرمایا۔ اگر امام بخاری حسن بصری کے زمانہ میں ہوتے تو حسن بصری حدیث و فقہ میں آپ کے محتاج ہوتے۔ امام ترمذی نے فرمایا۔ میں نے عراق و خراسان میں بخاری سے زیادہ حدیث کا ماہر کسی کو نہ پایا۔ امام مسلم نے فرمایا۔ بخاری بے نظیر شخصیت ہیں۔ احمد بن حمدون کہتے ہیں کہ

ایک مرتبہ امام مسلم، امام بخاری کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے۔ بخاری مجھے اپنے قدم چومنے دو ـــ تم سید المحدثین ہو۔ امام محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ اس آسمان کے نیچے میں نے بخاری جیسا حافظِ حدیث کسی کو نہ پایا۔ غرضکہ ایک عالم نے امام بخاری کے علم وفضل، ورع، تقویٰ، جودتِ ذہن وحفظ وضبط، تفاہت و درایت کا اعتراف کیا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

اساتذہ وشیوخ

اگرچہ اس امر کا تفصیلی حال معلوم نہیں ہوتا کہ امام نے ابتداءً کن کن مشائخ سے فنِ حدیث حاصل کیا۔ لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ آپ کا فضل وکمال اسحٰق بن راہویہ اور علی بن مدینی کے فیضانِ تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔ امام کے شوقِ تحصیلِ حدیث کا یہ عالم تھا کہ بغداد، مصر، خراسان، خوارزم، حجاز وشام میں کوئی ایسا محدث نہ تھا جس سے امام نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو۔ ان تمام شیوخ واساتذ ی تعداد ایک ہزار اسی تک پہنچتی ہے۔

امام بخاری کو زمانہ تحصیلِ علم ہی میں تصنیف وتالیف کا شوق ہوا اور آخری عمر تک جاری رہا۔ آپ نے اٹھارہ یا سترہ برس کی عمر میں کتاب قضایائے صحابہ وتابعین لکھی۔ تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی۔ تاریخ کبیر، تاریخ اوسط، تاریخ صغیر، خلق افعال عباد، رسالہ رفع الیدین، قرأت خلف الامام، الادب المفرد، برالوالدین، کتاب الضعفاء، الجامع الکبیر، التفسیر الکبیر، کتاب الاشربہ، کتاب الہبہ، کتاب المبسوط، کتاب الکنیٰ، کتاب المناقب، کتاب العلل، کتاب الفوائد بھی آپ کی تالیفات ہیں۔

امام کی شہرت وحلقۂ درس

امام کے فضل وکمال کی شہرت ان کے زمانہ تعلیم ہی میں دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ بڑے بڑے محدثین جو خود امامِ فن تھے، ان کے کسی مجہو حدیث کو امام صاحب تسلیم کرتے تو وہ فخریہ کہتے۔ ہماری ان حدیثوں کو امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح تسلیم کیا۔ امام صاحب کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلباء کی جماعتیں جوق در جوق آکر شریک ہوتیں۔ آپ کے شاگردوں میں حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی[1]، ابوعبدالرحمٰن نسائی[2]، مسلم بن حجاج[3] جیسے محدث نظر آتے ہیں جو صحاح ستہ کے تین جلیل القدر رکن بھی ہیں۔ ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، صالح بن جو آگے چل کر بہت پائے کے مصنف ہیں۔ امام بخاری کے عام شاگردوں میں شاگرد ہیں۔

---

[1] ان کی وفات ۲۷۹ھ میں ترمذ میں ہوئی جو خراسان کا ایک شہر ہے۔ آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ جامع ترمذی آپ مشہور تالیف ہے جو جامع کی حیثیت سے بخاری شریف کے بعد درجہ رکھتی ہے۔ [2] یہ حدیث کے مشہور امام ہیں۔ پیدائش ۲۲۵ھ وفات ۳۰۳ھ۔ [3] نسائی شریف کے مؤلف پیدائش ـــ ھ وفات ـــ ھ ہے۔ [4] آپ کی پیدائش ۲۰۴ھ اور وفات ۲۶۱ھ ہے۔ آ اصل وطن نیشاپور تھا۔ مسلم شریف کے مؤلف ہیں۔ صحاح میں عام طور پر بخاری شریف کے بعد آپ کی صحیح مسلم ہی کو اصح سمجھا جا

تحصیلِ علم کے لیے سفر

امام صاحب نے تحصیلِ علمِ حدیث کے لیے دُور دراز مقامات کے سفر کیے۔ مصر، شام، عراق، کوفہ اور بغداد تک پہنچے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں نے سماعتِ حدیث کے لیے دو دفعہ شام و مصر کا اور چار دفعہ کوفہ و بغداد کا، چھ دفعہ حجاز کا سفر کیا اور شمار نہیں کر سکتا کہ کتنی دفعہ کوفہ و بغداد آیا ہوں اور گیا ہوں۔ امام نے حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا۔ بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا۔ ایامِ حج میں مکہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ آجاتے۔ ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر امتیازی شان کا تھا۔ آپ جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے وہاں آپ کا خیر مقدم ہوا۔ اس کی تصویر خود امام مسلم نے خود ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

"امام بخاری جب نیشاپور تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال ہوا کہ والیانِ ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔"

جلاوطنی اور بخارا کو مراجعت

لیکن نیشاپور آپ کو بعض حاسدوں کی زیادتیوں کی وجہ سے چھوڑنا پڑا اور پھر آپ بخارا واپس ہوئے۔ اہلِ بخارا کو جب معلوم ہوا کہ ان کا ہم وطن کمالِ شہرت کی خلعت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن کو آرہا ہے تو جوشِ مسرت میں استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ شہر سے دو کوس کے فاصلہ پہ امراء شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نچھاور کرتے ہوئے نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ شہر میں لائے۔ بخارا میں کچھ دن تو آرام و راحت سے زندگی بسر ہوئی لیکن آخر میں اپنی غیور طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ امیر بخارا نے آپ کو جلاوطن[ف] کر دیا اور آپ مقامِ خرتنگ میں مقیم ہو گئے۔

خرتنگ میں قیام اور وفات

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے تھے۔ امام صاحب بخارا سے نکل کر وہاں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ جلاوطنی کا ان کو سخت صدمہ تھا۔ ایک روز نمازِ تہجد سے فارغ ہوئے تو زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"الٰہی باوجود وسعت کے تیری زمین میرے لیے تنگ ہوگئی ہے۔ اس لیے اب مجھے اٹھا لے۔"

ابھی پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ بعد نمازِ عشاء آپ کی رحلت ہوئی۔ آپ شوال کی ۳ تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی میں وفات پائی۔ سالِ پیدائش ۳ شوال ۱۹۴ھ ہے اور سالِ وفات ۱۰ شوال ۲۵۶ھ ہے۔

[ف] امیر بخارا نے امام صاحب سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ دربار میں آکر مجھے بخاری و تاریخ کبیر سنائیں۔ نیز قصر شاہی میں آکر شہزادوں کو تعلیم بھی دیں۔ امام نے اس کی اس خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔ میری مجلس علم ہے جس کا جی چاہے آکر شریک ہو۔ امیر بخارا کو آپ کا یہ استغنا ناگوار گذرا۔ حکم دیدیا کہ ہمارے شہر سے نکل جائیے (اکمال فی اسماء الرجال ص ۶۲)

اس حساب سے تیرہ دن کم باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ دوسرے دن جب خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں تہلکہ مچ گیا۔ دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا اور بڑے بڑے علماء و امراء باچشم نم نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ کے بعد جب آپ کے چہرہ سے کفن اٹھایا گیا تو مشک و عنبر کی خوشبو سے لوگوں کے دماغ معطر ہو گئے۔ حتیٰ کہ آپ کی قبر سے عرصہ تک خوشبو آتی رہی۔ شیخ الاسلام امام الدنیا رئیس المحدثین ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ عرض کی گئی حضور علیہ السلام کس کا انتظار ہے؟ فرمایا — محمد بن اسماعیل بخاری کا۔

تاریخ ولادت: - آپ کی تاریخِ ولادت صدق ۱۹۴ مدت عمر حمید ۶۲ وفات نور ۲۵۶ کے الفاظ سے نکلتی ہے۔ طاب اللہ ثراہ

مولوی وحید الزمان

جو وہابی خیال کے تھے انھوں نے بھی لکھا ۱۔ کہ امام بخاری کی قبر کی مٹی سے خوشبو آتی تھی اور لوگ کئی روز تک ان کی قبر کی مٹی بطور تبرک لے جاتے رہے۔

۲۔ ۲۶۴ھ میں سمرقند میں قحط پڑا تو لوگ امام بخاری کی قبر مبارک پر آئے وہاں روئے اور آپ کی قبر کے وسیلہ سے پانی مانگا۔ اسی وقت شدت کی بارش ہوئی جو سات روز تک جاری رہی اور خرتنگ کے لوگ بارش کی وجہ سے سات روز تک گھروں سے نہ نکل سکے ۳۔ صدہا مشائخ نے تجربہ کیا صحیح بخاری کا ختم ہر مطلب و مقصد کے لیے مجرب ہے ۴۔ امام صاحب کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند موئے مبارک تھے جن کو وہ اپنے لباس میں بطور تبرک رکھتے تھے (تسہیل القاری ص ۴۳ مصنفہ مولوی وحید الزمان صاحب)

تدوینِ بخاری

امام خود بیان کرتے ہیں کہ صحیح بخاری کی تدوین کا محرک ایک خواب ہوا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں اور میں پنکھے سے ہوا کر رہا ہوں۔ معبرین نے اس کی تعبیر دی کہ بخاری تم حضور علیہ السلام سے جھوٹ کو جدا کرو گے یعنی آپ کے ارشادات کو صحیح جمع کرو گے۔ چنانچہ اس کے بعد میرے دل میں صحیح بخاری کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور سولہ سال کے عرصہ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ امام نے سب سے پہلے اس کا مسودہ مسجدِ حرام میں بیٹھ کر لکھا۔ لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ضروری عنوان لکھ لیتے تھے پھر ہر عنوان کے نیچے حدیث درج کرتے۔ ہر حدیث کے اندراج سے پہلے آبِ زمزم سے غسل فرماتے۔ مقام ابراہیم میں دو رکعت نفل استخارہ پڑھتے تھے۔ بعدہٗ حدیث قلمبند فرماتے۔ مسودہ مکمل کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ مبارک و منبر اقدس کے درمیان بیٹھ کر مسودہ کو دوبارہ لکھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ بعض صلحاء نے خواب میں دیکھا کہ جس

جگہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم قدم مبارک رکھتے ہیں ٹھیک اسی جگہ امام کا قدم پڑتا ہے۔

صحیح بخاری کا پورا نام

یہ ہے۔ "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ و سننہ وایامہ۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)" امام نے جن امور کا اس کتاب میں ذکر کیا ہے ان سب کی طرف نام ہی میں اشارہ کر دیا ہے اَلْجَامِعُ کتب حدیث کی مختلف قسمیں ہیں جیسے مسند، مستخرج، مستدرک وغیرہ۔ جامع بھی کتب احادیث کی ایک قسم ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل آٹھ باتیں پائی جاتی ہیں:۔

ا۔ ۱۔ سیر پر مشتمل روایات۔ سیر وایام فقہاء و محدثین کی اصطلاح میں ان روایات کو کہتے ہیں جو غزوات اور جہاد سے متعلق ہوں ۲۔ آداب پر مشتمل روایات ۳۔ تفسیر قرآن سے متعلق روایات ۴۔ عقائد یعنی وہ روایات جن میں ایمان کے اصول و فروع کا بیان ہو ۵۔ وہ روایات جن میں فتنوں اور آزمائشوں کی خبریں ہوں۔ ۶۔ احکام یعنی وہ روایات جن میں امر و نواہی کی توضیحات ہوں ۷۔ مناقب یعنی وہ روایتیں جن میں افراد کے یا قبائل کے یا قریوں اور بستیوں کے مناقب درج ہوں ۸۔ وہ روایات جن میں علامات قیامت کا بیان ہو۔ یہ ہیں وہ آٹھ امور جن کا اجتماع کسی کتاب کو اصطلاحاً جامع بناتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں یہ تمام اجزاء موجود ہیں۔

ب۔ صحیح کے متعلق بس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ صحیح اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے تمام راوی عادل ثقہ ہوں۔ سند متصل ہو۔ مسند یعنی متصل جو منقطع اور مرسل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ جس کا اصطلاحی مطلب یہ ہے کہ درمیان میں کوئی راوی نہ چھوٹا ہو۔ امام نے چونکہ نام ہی میں من احادیث رسول اللہ کا لفظ رکھ دیا ہے اس لیے المسند کا مطلب یہ ہوا (مرفوع و متصل احادیث) یعنی وہ حدیثیں جن کے راویوں کا سلسلہ بیان کرنے والے سے لے کر حضور علیہ السلام تک بلاشبہ ملا ہوا ہو اور صحابی کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنا ثابت ہو۔ سننہ وایامہ یعنی اس مجموعہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سنن و ایام درج ہوں۔ امام نے سنن و ایام سے حضور علیہ السلام کی فعلی احادیث اور لفظ احادیث سے حضور علیہ السلام کی قولی احادیث مراد لی ہیں۔ یہ نہیں تو پھر لفظ حدیث کہنے کے بعد خصوصیت کے لیے سنن وامام کا ذکر کیا ہے۔

احادیث کی تعداد۔ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں مع ان کے راویوں کے نام و حالات کے یاد تھیں۔ سات ہزار دو سو پچھتر مسند حدیثیں آپ نے بخاری میں درج کیں۔ مکررات کو علیحدہ کر دیا جائے تو چار ہزار حدیثیں ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک سو ساٹھ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو باب ہیں۔ ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے بخاری میں حدیثیں لی گئیں ۲۰۸۹ ہیں۔ تیرہ سو چالیس مشائخ ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت

کی۔ صحیح بخاری میں بائیس حدیثیں ثلاثیات ہیں جن پر امام کو فخر ہے اور بجا طور پر فخر ہے۔ ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطے سے حضور علیہ السلام تک پہنچے۔

صحاحِ ستّہ۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ ان چھ کتابوں کو صحاحِ ستّہ کہتے ہیں۔ جمہور محدثین کے نزدیک صحیح بخاری تمام کتبِ مصنّفہ پر مقدم ہے۔ نیز یہ بھی مشہور ہے کہ جمہور صحیح بخاری کو مسلم پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بحث بھی کی ہے کہ ان دونوں میں اصح کون ہے۔ جس کی تفصیل طول وطویل کلام کو چاہتی ہے۔ صحیح کی تعریف میں امام بخاری ومسلم کے مابین جو اختلاف ہے اس کی بحث بھی کافی طویل ہے۔ پھر شذوذ اعلال کا مبحث نہایت پیچیدہ اور دقیق ہے جسے عوام کا مزاج بھی ہضم نہ کر پائیگا۔

۲۔ متفق علیہ وہ حدیث ہے جس کو بخاری ومسلم دونوں نے تخریج کیا ہے۔ اسی کو ”اخرجہ الشیخان“ کہتے ہیں۔ تمام احادیث متفق علیہ دو ہزار تین سو چھبیس (۲۳۲۶) ہیں۔ مذہب جمہور یہ ہے کہ سب سے بلند درجہ حدیثِ صحیح متفق علیہ کا ہے۔ پھر اس کو جسے تنہا بخاری لائے۔ پھر اس کا جس کو تنہا مسلم نے ذکر کیا۔ پھر اس کا جو بخاری ومسلم کی شرطوں پر ہو۔ پھر اس کا جو بخاری کی شرط پر ہو۔ پھر اس کا جو مسلم کی شرط پر ہو۔ پھر بخاری ومسلم کے سوا ان ائمہ کی حدیثوں کا مرتبہ ہے جنھوں نے التزام صحت کا کر کے صحیح کی ہیں۔ شرط بخاری ومسلم کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے راوی ان شرطوں کے ساتھ متصف ہوں۔ جس کی رعایت بخاری ومسلم نے کی ہے جیسے راوی کا ضبط، عدالت وغیرہ۔ بہرحال بخاری حدیث نبویہ کا نہایت معتبر ذخیرہ ہے اور بہت ہی مقبول کتاب۔ اس کی محبوبیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عربی زبان میں تقریباً ستر سے زیادہ بخاری کی شرحیں موجود ہیں۔ واضح ہو کہ تمام صحیح حدیثیں صرف بخاری میں منحصر نہیں ہیں۔ خود بخاری نے بہت سی ایسی حدیثوں کو چھوڑا ہے۔ جو صحیح ہونے کے باوجود ان کی شرط پر تھیں۔ ان کو امام حاکم ابو عبد اللہ نیشاپوری نے مستدرک میں جمع کیا ہے اور کہا۔ **علیٰ شرط بخاری**۔

کتب حدیث کی تعریفات

صحاحِ ستّہ میں مذکورہ بالا اصطلاح کے مطابق ۱۔ جامع صرف بخاری شریف اور ترمذی شریف ہے۔ مسلم شریف کو بعض حضرات قلّتِ تفسیر کی وجہ سے جامع نہیں کہتے اور بعض اس قلت کو نظر انداز کر کے مسلم پر بھی جامع کا اطلاق کر دیتے ہیں ۲۔ سنن جس میں بترتیبِ ابواب فقہ صرف احکام مذکور ہوں۔ صحاح ستّہ میں بایں معنیٰ سنن، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ ہے ۳۔ **مسند** جس میں صحابہ کرام کی احادیث بترتیبِ مراتب مذکور ہوں ۴۔ **معجم** جس میں شیوخ کی احادیث بترتیبِ مراتب ذکر کی جائیں ۵۔ **جزء** جس میں صرف ایک مسئلہ کے متعلق احادیث جمع کر دی جائیں ۶۔ **مفرد** جس میں صرف ایک شخص کی روایت کردہ احادیث ذکر کی جائیں ۷۔ **غریبہ**

حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صرف ایک تلمیذ کے تفردات کا ذکر ہو۔

مصطلحات حدیث

اب قارئین کے اضافۂ معلومات کے لیے حدیث کے اصطلاحی ناموں اور قسموں کو حسب ضرورت بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث جو واقعہ میں حدیث ہے وہ غلط یا ناقابلِ عمل نہیں ہو سکتی۔ حدیث کی یہ قسمیں بیان کی جاتی ہیں اور جو احکام بتائے جاتے ہیں وہ صرف راویوں سے متعلق ہیں۔ یعنی یہ کہ راوی کس مرتبہ کا ہے اور کس سے روایت کر رہا ہے اور روایت کا سلسلہ کہاں تک ہے۔ حضور علیہ السلام تک ہے یا صحابی تک یا تابعی تک۔ پھر اس حدیث کو بیان کرنے والے بہت ہیں یا ایک یا چند وغیرہ وغیرہ۔

علم اصُولِ حدیث

۱۔ اصولِ حدیث ۔ ایسے قواعد وضوابط کا جاننا جن سے حدیث کی سند اور متن کے حالات معلوم ہوں ۲۔ متنِ حدیث ۔ حدیث کے ان الفاظ کو کہتے ہیں جو معانی مقصودہ پر دلالت کرتے ہوں ۳۔ سند ۔ حدیث کے تین راویوں کو کہتے ہیں ۴۔ علمِ حدیث ۔ وہ علم ہے جس کے ذریعہ حضور سرور کائنات علیہ السلام کے قول، فعل اور تقریر معلوم ہو ۔ ۵۔ علم حدیث کا موضوع حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے ۔ اس لحاظ سے کہ آپ اللہ تعالٰے کے آخری اور سچے رسُول ہیں ۶۔ علمِ حدیث کی غرض یہ ہے کہ احکامِ خداوندی پر صحیح طور پر اللہ کی منشا کے مطابق عمل کر کے دارین کی سعادت حاصل کی جائے۔

حدیث کی تعریف

۱۔ حضور علیہ السلام کے قول فعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں ۲۔ افعال سے حضور علیہ السلام کے وہ امور مراد ہیں جو آپ کی ذاتِ اقدس سے ظاہر ہوئے اور ان کے اتباع کا حکم بھی دیا گیا۔ اس قید سے آپ کے طبعی اور خصوصی امور خارج ہو گئے ۳۔ بعض جمہور نے صحابہ و تابعین کے قول وفعل اور تقریر کو بھی حدیث سے موسوم کیا ہے ۴۔ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے سامنے کسی نے کوئی کام کیا یا حضور علیہ السلام نے کسی کے کام پر اطلاع پائی اور آپ نے انکار نہ فرما کر اس کی توثیق فرما دی اور اس پر سکوت فرمایا۔

حدیث کی قسمیں مرفوع موقوف

۱۔ مرفوع وہ حدیث ہے جس کی سند حضور اکرم علیہ السلام تک پہنچ جائے ۔ مثلاً کہا جائے حضور علیہ السلام نے فرمایا ۲۔ موقوف حدیث ہے جو کسی صحابی تک پہنچے مثلاً کہا جائے ابن عباس نے فرمایا ۲۔ مقطوع وہ حدیث ہے جس کی سند تابعی تک پہنچے۔

فائدہ ۱۔ اثر، موقوف اور مقطوع حدیث کو کہتے ہیں۔ بعض حدیث مرفوع کو بھی اثر کہہ دیتے ہیں جیسے

ادعیہ ماثورہ ودعاء ماثورہ ۲۔ خبر اور حدیث دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ مگر بعض محدثین نے حدیث کو حضور علیہ السلام صحابہ اور تابعین کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور (لفظ) خبر کا اطلاق بادشاہوں کے قصے اور تاریخی واقعات پر کیا ہے۔

متواتر، مشہور

باعتبار اس بات کے کہ راوی تک اصل حدیث کس طرح پہنچی۔ چار قسم پر ہے ۱۔ متواتر وہ حدیث ہے جس کے راویوں کی کثرت اس درجہ کو پہنچ گئی ہو کہ عادت ان کے جھوٹ پر متفق ہونے کو محال جانے ۲۔ مشہور وہ حدیث ہے جس کو دو سے زیادہ راوی روایت کریں اسی کو مستفیض بھی کہتے ہیں ۳۔ عزیز وہ حدیث ہے جس کو دو راوی روایت کریں اور تمام اسناد میں کہیں دو سے کم نہ ہوں

۴۔ غریب وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں نہ کہیں تفرد یعنی ایک ہونا پایا جائے۔

فائدہ: اور مشہور کے علاوہ ، عزیز ، غریب کو اخبار احاد کہتے ہیں۔ یعنی خبر واحد وہ ہے جو جامع شروط تواتر نہ ہو۔ اور شہرت کو نہ پہنچتی ہو۔

فائدہ: حدیث مرفوع تین قسم پر ہے۔ قولی، فعلی، تقریری۔ ان سب کے معنیٰ بالکل ظاہر ہیں۔

خبر واحد مقبول کی قسمیں

خبر واحد دو قسم پر ہے۔ مقبول۔ جس کے راوی صدق وعدالت کی جانب راجح ہوں اور اس کا سچا ہونا ثابت ہوگیا ہو تو یہ مقبول ہے ورنہ مردود۔ حدیثِ مقبول عند الجمہور واجب العمل ہے۔ خبر واحد مقبول کی چار قسمیں ہیں ۱۔ صحیح لذاتہ۔ وہ ہے جو آخر تک عادل تام الضبط کی نقل سے متصل السند ثابت ہو اور اس میں کوئی قصور اور نقصان نہ ہو ۲۔ صحیح لغیرہ۔ جس کی صفاتِ مذکورہ میں کسی قسم کا نقصان ہو اور کثرتِ طرق سے اس کے نقصان کی تلافی ہو گئی ہو ۳۔ حسن لذاتہ۔ جس کے نقصان کی تلافی نہ ہوئی ہو اور نقصان صرف ضبط میں ہو اور باقی صفتیں اپنے حال پر ہوں ۴۔ حسن لغیرہ وہ ضعیف حدیث ہے جس میں تعدد طرق سے اس کے ضعف کی تلافی ہو گئی ہو۔ مگر اسکی تما صفات میں نقصان راہ پاتا ہو۔

فائدہ۔ حدیثِ ضعیف وہ ہے جس میں وہ شرطیں نہ پائی جاتی ہوں جو صحیح اور حسن میں معتبر ہ

حدیث کی دیگر قسمیں

۱۔ حدیث متصل۔ اگر حدیث کے راویوں سے کوئی راوی درمیا سے نہ چھوٹے تو اس کو حدیثِ متصل کہتے ہیں ۲۔ منقطع وہ حدی ہے جس کے ایک یا زیادہ راوی چھوٹ جائیں۔ ایک جگہ سے پیہم چھوٹتے ہوں یا دو تین جگہ سے ۳۔ معلق وہ ہے کہ ابتدائے سند میں ایک یا زیادہ راوی چھوٹ گئے ہوں جیسے کہہ دیتے ہیں۔ قال رسول اللہ (حضور علیہ السلام نے فرمایا) اس میں ابتدا سند سے تمام راوی چھوڑ دیئے گئے اور کہہ دیا گیا قال رسول ال

۴- **مرسل** وہ ہے جس میں آخر سند سے بعد تابعین کے راوی ساقط کر دیئے گئے ہوں مثلاً تابعی کہے قال رسول اللہ ۵- **معضل** وہ ہے جس میں اثنائے اسناد میں دو راوی پیہم ساقط ہو گئے ہوں ۶- **مُدَلِّس** اس فعل کو تدلیس، فاعل کو مدلس کہتے ہیں۔ تدلیس یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ کا نام نہ لے اور اس سے اوپر کے شیخ سے روایت کرے اور لفظ ایسا لائے جس میں سماع کا وہم ہو۔ تدلیس بعض اوقات مذموم ہوتی ہے اور بعض موقع پر نہیں ہوتی ۷- **مضطرب** وہ حدیث ہے جس کی اسناد یا اصل متن میں راوی سے اختلاف واقع ہو جائے ۸- **مدرج** وہ ہے جس میں راوی کسی غرض یا مصلحت کی وجہ سے اپنا ذاتی کلام حدیث کے درمیان لے آئے ۹- **روایۃ بالمعنیٰ** کا مطلب یہ ہے کہ راوی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصل کلمات ذکر نہ کرے بلکہ حضور علیہ السلام کے منشار کو اپنے ذاتی لفظوں میں ادا کرے۔

فائدہ: یہ اس وقت جائز ہے جب کہ راوی عربی جانے اور اسالیبِ کلام، خواص عبارات اور مفہومات خطابات سے واقف ہو تاکہ روایت بالمعنیٰ میں خطا کمی یا زیادتی ہونے کا امکان نہ رہے۔

۱۰- **مُسند** وہ حدیثِ مرفوع ہے جس کی سند متصل ہو ۱۱- **شاذ** وہ حدیث ہے جو ثقہ اور معتبر راویوں کی روایت کے مخالف ہو ۱۲- **مُنکر**- وہ حدیث ہے جس کا راوی فسق، غفلت کی زیادتی اور غلط گوئی کے ساتھ مطعون ہو ۱۳- **مُعَلَّل**- اس اسناد کو کہتے ہیں جس میں ایسے اسباب اور علتیں ہوں جو اس کی صحت کے لیے قادح ہوں ۱۴- **عنعنہ** یعنی عن فلاں عن فلاں کہہ کر روایت کرنا۔ ۱۵- **معنعن** جو بطریق عنعنہ روایت کی جائے وہ حدیث معنعن ہے ۱۶- **متابع**- جس کو راوی دوسری حدیث کے موافق روایت کرے اس سے حدیث میں قوت پیدا ہوتی ہے ۱۷- **شاھد**- جس کو راوی دوسری حدیث کے موافق روایت کرے اور وہ دونوں دو صحابیوں سے مروی ہوں۔

صحابی ۱- وہ شخص ہے جس نے عالم بیداری میں ایمان کی حالت میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور ایمان پر ہی اس کا خاتمہ ہوا۔ ۲- تابعی بشرائط مذکورہ صحابی کو دیکھنے والے کو کہتے ہیں۔

صفاتِ قبولیت یہ ہیں۔ عدالت، تقویٰ، ضبط، اتصالِ سند ۱- **عدالت** اس کیفیتِ راسخہ در نفس کا نام ہے جو ملازمتِ تقویٰ اور استعمالِ مروۃ پر ہر وقت انسان کو آمادہ کار رکھے۔ مروت سے مراد یہ ہے کہ خسیس افعال سے بھی پرہیز کرے جیسے بازار میں کھانا اور شارع عام پر پیشاب کرنا وغیرہ ۲- **تقویٰ**- شرک جلی و خفی اور گناہ کبیرہ، فسق و بدعت وغیرہ اعمالِ بد سے کنارہ کش رہنے کا نام ہے۔ صغیرہ گناہ سے بچنا اگرچہ شرط نہیں ہے مگر صغیرہ پر اصرار اور دوام بھی کبیرہ گناہ ہو جاتا ہے

۳-**ضبطِ صدر** یہ ہے کہ سنی ہوئی بات کو اس طرح یاد رکھنا کہ بوقتِ ضرورت بلا کسی دقت کے من و عن یاد آ جائے اور اس کو راوی زبان سے ادا کر دے۔ ضبط کتاب کا مطلب یہ ہوا کہ جس کتاب میں حدیثِ نبوی کو لکھا ہے اس کتاب کو ادا کے وقت تک اپنے پاس رکھے اور اس میں تغیر و تبدل نہ ہونے دے ۴- **اتصالِ سند**۔ سلسلہ روایت میں کوئی بھی راوی چھوٹا ہوا نہ ہو۔ **فائدہ**۔ تعلیلِ حدیث میں ایسے نقص یا علت کا پایا جانا جو اس حدیث کے رد و قدح کا موجب ہو۔ **شذوذ** کسی ثقہ راوی کا اپنے سے زیادہ ثقہ اور معتبر راوی کی روایت میں کسی قسم کی مخالفت کرنے کا نام ہے۔ احکام میں خبر صحیح لذاتہ سے حجت پکڑنے پر اجماع ہے۔ اسی طرح حسن لذاتہ سے اکثر کے نزدیک اور یہ حجت پکڑنے میں صحیح کے ساتھ ملحق ہے اگرچہ رتبہ میں کم ہے اور چونکہ تعدد طرق سے ضعیف حدیث بھی حسن کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے اس لیے اس سے بھی حجت پکڑی جائے گی اور بعض نے کہا ہے کہ اگر باوجود صدق و دیانت کے بعض رواۃ کے سوءِ حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو تو تعدد طرق سے اس کا جبر ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر ضعفِ حدیث، اتہامِ کذب راوی یا شذوذ یا خطا فحش کی بنا پر ہو تو تعدد طرق سے جبر نہیں ہو سکتا۔ حدیثِ ضعیف فضائل اعمال میں مقبول ہوتی ہے۔

۱-وجوہِ طعن

وجوہِ طعن دس ہیں۔ اول جو عدالت راوی کے متعلق ہیں وہ پانچ ہیں۔ کذبِ راوی، اتہامِ راوی بکذب فسق جہالت، بدعت ۱- کذب راوی یہ ہے کہ اس کا حدیث نبوی میں جھوٹ بولنا ثابت ہو جائے۔ اگر کسی سے عمر میں ایک بار بھی حدیثِ نبوی میں قصداً کذب ثابت ہو جائے تو توبہ کے باوجود اس کی روایت کردہ حدیث کبھی مقبول نہ ہوگی۔

فائدہ۔ موضوع حدیث وہ ہے جس کا راوی کذب کے ساتھ مطعون ہو۔

۲- اتہامِ راوی بکذب یہ ہے کہ راوی باتیں کہنے میں جھوٹا ثابت ہو گیا ہو۔ اگرچہ اس کا جھوٹ حدیث نبوی میں ثابت نہ ہو۔ ایسا شخص اگر توبہ کر لے اور توبہ کا ثبوت عملی طور پر دے تو اس کی حدیث مانی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر بطریقِ اتفاق، راوی کا حدیث کے سوا کسی اور بات میں کذب ثابت ہو تو ایسے راوی کی حدیث کو موضو یا متروک نہیں کہہ سکتے۔ حدیث متروک وہ ہے جس کا راوی متہم بکذب ہو یا اس کی روایت شریعت کے قوا معلومِ ضروریہ کے خلاف ہو ۳- **فسق** سے مراد وہ قول یا فعل فسق ہے جو مرتبہ کفر کو نہ پہنچے اور فسق اعتقا مانندِ اعتزال اور رفض وغیرہ بدعت میں داخل ہے ۴- **جہالت**۔ راوی کا نام معلوم نہ ہو تو جب نام ہی معلوم نہ ہوگا تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ راوی ثقہ ہے یا کیا ہے؛ اس کی مثال یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے ک فلاں نے یہ بات کہی۔ **فائدہ**۔ حدیثِ مبہم وہ ہے جس کا راوی مجہول ہو۔ ایسی حدیث مقبول نہیں ہوتی۔

مگر جب کہ وہ صحابی ہو تو پھر مقبول ہیں کیونکہ صحابہ تمام کے تمام عادل ہیں۔

۵۔ بدعت یہ ہے کہ کسی امر کی نسبت ایسا اعتقاد کر لینا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ سے ثابت شدہ اعتقاد کے خلاف ہو۔ یعنی دین میں کسی غیر ثابت شدہ امر کو فرض یا واجب قرار دینا۔ مبتدع کی کی حدیث مردود ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو ضروریاتِ دین میں سے کسی امر متواتر کا منکر ہے مردود ہے۔

۲- وجوہ طعن جو ضبط سے متعلق ہیں وہ بھی پانچ ہیں۔ فرطِ غفلت، کثرتِ غلط، مخالفتِ ثقات، وہم، سوءِ حفظ (۱، ۲) فرطِ غفلت وکثرتِ غلط کا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث کے سمجھنے یا سنانے میں غلطی کرے ۳۔ مخالفتِ ثقات۔ اسناد یا متنِ حدیث میں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہو۔

۴۔ وہم، راوی وہم یا نسیان کی وجہ سے خطا کرے اور اپنے توہم پر روایت کرے۔

فائدہ۔ معلل وہ ہے جس حدیث کے متعلق راوی کے توہم پر قرائن دالہ معتبرہ سے اطلاع ہو جائے اور یہ حدیث میں بہت سخت اور دشوار ہے ۵۔ سوءِ حفظ یہ ہے کہ راوی حدیث حافظ کی کمزوری میں مبتلا ہو اور خطاء ونسیان اس کو غالب ہو۔ اگر سوءِ حفظ کسی کو تمام عمر لازم رہے تو اس کی حدیث معتبر نہیں ہوگی۔

فائدہ۔ مختلط وہ حدیث ہے جس کے راوی کو بڑھاپے کی وجہ سے سوءِ حفظ عارض ہو یا وہ نابینا ہو جائے یا جس میں اس نے حدیثیں لکھ رکھی ہیں وہ کتاب گم ہو جائے۔

واضح ہو کہ ہم نے عوام کی سمجھ کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف مقدمۃ الکتاب کی مناسبت سے یہ ضروری باتیں لکھ دی ہیں ورنہ یہاں بڑی علمی بحثیں ہیں اور طویل مباحث ہیں جن کو مجبوراً ترک کرنا پڑ رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحم والا ہے

افتتاحِ کتاب مصنفِ کتاب و مؤلفِ رسالہ کے لیے یہ مستحب ہے کہ وہ اپنی کتاب کو اللہ عز و جل کے ذکر اور اس کی حمد وثنا سے شروع کرے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اس کی تاکید فرمائی ہے۔

۱۔ كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ فِيْهِ بِذِكْرِ اللّٰهِ وَبِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ	کسی بھی عزت والے کام کو اللہ تعالےٰ کے ذکر یا بسم اللہ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ اقطع ہے۔
۲۔ كُلُّ كَلَامٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِحَمْدِ اللّٰهِ فَهُوَ اَجْزَمُ (نسائی)	کسی کلام کو حمد الٰہی سے افتتاح نہ کیا جائے تو وہ اجزم ہے۔

۲ - کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ فِیْہِ بِالْحَمْدِ فَھُوَ اَقْطَعُ

کسی عزت والے کام کو حمدِ الٰہی سے شروع نہ کیا جائے تو وہ اقطع ہے۔

اقطع اور اجزم کے حاصلِ معنی یہ ہیں کہ وہ کام قلیل البرکت ہوگا یا اس میں برکت نہ ہوگی۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امرِ ذی شان کو خدا کی حمد و ثناء سے شروع کرنا چاہیے تاکہ اس میں برکت ہو لیکن امام بخاری نے اپنی تالیف کو صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا ہے۔

شارحین نے اس سوال کے متعدد جوابات دیے ہیں جو یہ ہیں ۔ ۱ - امام بخاری علیہ الرحمۃ نے حمد اس لیے نہیں لکھی تاکہ اللہ اور رسول کے کلام پر تقدیم لازم نہ آئے۔ قرآن مجید میں فرمایا۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ

اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو (نہ قول میں اور نہ فعل میں)

اس آیت کی رعایت ملحوظ رکھ کر امام بخاری نے حمد تحریر نہیں کی اور صرف بسم اللہ پر اکتفا کیا جو کلامِ الٰہی ہے مگر یہ جواب متعدد وجوہ سے ضعیف ہے۔ اولاً اس لیے کہ قرآنی الفاظ سے بھی حمد ممکن تھی مثلاً یوں کہتے الحمد للہ رب العالمین اور اس طرح اللہ اور رسول کے کلام پر تقدیم لازم نہ آتی۔ ثانیاً آیت میں اس تقدیم کی ممانعت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر ہو اور جو اجازت ہو وہ ممنوع نہیں ہے اور حمد اسی قبیل سے ہے۔ کیونکہ اطاعتِ رسول کا حکم اللہ نے دیا اور اللہ کے رسو نے ہر شاندار کام سے پہلے حمد بجا لانے کا حکم دیا تو تقدیم حمد اجازت پر مبنی ہوئی۔ لہٰذا یہاں تقدیم ممنو نہیں ہو سکتی۔ ثالثاً مذکورہ بالا جواب اس لیے بھی ضعیف ہے کہ اگر اپنے کلام کی تقدیم مطلقاً ممنوع تسلی کرلی جائے تو پھر تو امام بخاری پر آیت کے خلاف عمل کرنے کا الزام قائم ہو جائے گا کیونکہ انھوں نے خو آیت پر ترجمۃ الباب اور حدیث کی سند کو مقدم کیا ہے۔

۲۔ تحمید کے ساتھ ابتدا کا حکم خطبات کے ساتھ خاص ہے۔ ایامِ جاہلیت میں لوگ خطبہ کو حمد کی بج شعر و اشعار سے شروع کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے جب بغیر حمد کے اپنا خطبہ شروع کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا کہ جو کلام حمد سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔ لیکن جواب بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ حدیثِ تحمید میں خطبہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر شاندار کام کے متع یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اس سے قبل حمدِ الٰہی بجا لائی جائے خواہ وہ خطبہ ہو یا کچھ اور۔ پس عمومِ لفظ کا اعتبا کیا جائے گا۔ خصوصِ مورد کا نہیں۔ لہٰذا تحمید کو خطبہ کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے۔

۳۔ حدیثِ تحمید منسوخ ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے عام الحدیبیہ میں قریش سے جو صلح۔ لکھ

کی عبارت یہ تھی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ھٰذَا مَا صَالَحَ عَلَیْہِ الخ۔ اگر حدیثِ تحمید منسوخ نہ ہوتی تو حضور علیہ السلام ترک نہ فرماتے لیکن یہ جواب بہت ہی بودا ہے کیونکہ اس کی کیا دلیل ہے کہ حضور علیہ السلام کا حمد کو ترک کرنا نسخ کی بنا پر تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیانِ جواز کے لیے حمد ترک کی ہو۔

۴۔ بعض علماء نے کہا حدیث تحمید ضعیف ہے لہٰذا امام پر کوئی الزام نہیں۔ مگر یہ توجیہ صحیح نہیں کیونکہ اول تو روایت کا ضعف تمام علماء کے نزدیک مسلّم نہیں۔ علامہ تاج الدین سبکی اس کی سند کو جیّد بتاتے ہیں۔ علامہ عینی نے لکھا۔ حدیث ہٰذا کو ضعیف کہنا صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ فضائل میں تو ضعیف بھی مقبول ہوتی ہے۔

۵۔ علامہ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فرمایا مامور بہ مطلق حمد ہے خواہ زبان سے ہو یا کتابت سے کیونکہ حدیث میں لم یبدأ کا لفظ آیا ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ آغاز حمد کے ساتھ ہو۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے زبان سے حمد کر لی ہوگی۔ یہ جواب اگرچہ اچھا ہے مگر یہی جواب بسم اللہ کے ترک کرنے والے کے لیے بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب مصنفین کی مخالفت تو بہر صورت باقی رہتی ہے۔

۶۔ علامہ نووی نے فرمایا۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے کہیں لم یبدأ بحمد اللّٰہ آیا ہے کہیں لا یبدأ فیہ ببسم اللّٰہ آیا اور کہیں لا یبدأ فیہ بذکر اللّٰہ تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترغیب خاص طور پر حمد ہی کی نہیں ہے بلکہ ترغیب اس امر کی ہے کہ آغاز میں اللہ کا ذکر آنا چاہیئے چاہے بسم اللہ سے ہو، الحمد للہ سے یا سبحان اللہ وغیرہ سے۔ حافظ ابن حجر نے اس جواب کو قوی قرار دیا ہے (فتح الباری

۷۔ امام زرقانی فرماتے ہیں کہ کل امر ذی بال میں واقعی بسم اللہ اور حمد کی ترغیب دی گئی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خطوط میں صرف بسم اللہ ملتی ہے۔ خود قرآن مجید میں ملکہ بلقیس کے نام حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ہے اس میں بھی صرف بسم اللہ ہے۔ اس کے برخلاف حضور علیہ السلام کے خطبات میں بسم اللہ نہیں ملتی۔ صرف الحمد للہ کے لفظ ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ تحریر میں خود حضور علیہ السلام اور سابق انبیاء کرام نے بسم اللہ ہی کو آغاز کے لیے کافی جانا اس لیے امام بخاری نے تحریر میں بسم اللہ پر اکتفا کرکے سنّتِ نبوی کا اتباع کیا ہے۔

۸۔ ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حمد کے تین معنیٰ ہیں۔

لغوی۔ یعنی زبان سے کسی کی خوبی تعظیماً بیان کرنا۔

عرفی۔ یعنی انعام کے باعث منعم کی تعظیم کرنا خواہ دل سے خواہ زبان سے خواہ اعضاء سے۔

اصطلاحی۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے بندے کو جس قدر نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ سب کو ان کے مقصد

تخلیق کے مطابق طاقتِ بشری صرف کرنا۔

توجب حمد کے یہ تین معنی ہیں تو جو معنی بھی مراد لیے جائیں۔ کسی صورت میں بھی امام بخاری پر ترکِ حمد کا الزام قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ کہ امام نے صرف زبان سے یا صرف دل سے یا دل و زبان دونوں سے حمد ادا کی ہو یا جملہ نعمتوں کو مقصدِ تخلیق میں صرف کرکے بخاری کو شروع کیا ہو۔ البتہ اگر حدیث میں حمد لکھنے کا حکم ہوتا تو عدمِ تعمیلِ حکم کا الزام قائم ہو سکتا تھا؛

۹۔ نیز جب امام بخاری علیہ الرحمۃ نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تحریر فرمائی تو اس میں اللہ عزّوجل کی صفتِ رحمت کا بیان ہے لہٰذا بسم اللہ کے تحریر کرنے سے حمد بھی ہو گئی۔ اگر بسم اللہ تحریر کرتے وقت زبان سے بھی پڑھی تھی تو حمد لغوی بھی ادا ہو گئی ورنہ حمد عرفی فافہم

درود و سلام سلف صالحین کی یہ بھی عادت ہے کہ حمد و ثنا کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ حضور علیہ السلام کا ذکر بھی ملا ہوا ہے۔ اسی لیے مفسرین نے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ذكرت حيثما ذكرت

محبوب جہاں میرا ذکر کیا جائے وہاں تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ میں امام مجاہد کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا جو شخص لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھے گا وہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پڑھے گا۔ یہی معنی رفع ذکر کے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دربارِ نبوی میں بیان کیے جسے امام نووی نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے (عینی جلد ۱ صفحہ ۱۵) لیکن امام بخاری نے بسم اللہ پر ہی اکتفا کیا ہے اور صلوٰۃ و سلام کی کتابت نہیں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی حدیث میں یہ حکم نہیں ہے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے درود شریف لکھ لیا کرو۔ لہٰذا یہ اعتراض ہی باطل ہے۔ ثانیاً حدیث میں درود کے متعلق جو وعید آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

رغم انف رجل ذكرت عنده فلم يصل عليّ والبخيلُ الذي ذكرت عنده فلم يُصلّ عليّ (نسائی)

اس شخص کی ناک غبار آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے

اس حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جس کے سامنے حضور علیہ السلام کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے تو حدیث میں درود پڑھنے کی ہدایت ہے لکھنے کی نہیں۔ اب اگر حضرت

امام بخاری نے درود نہیں لکھا تو معترض کو یہ کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ نے زبان سے بھی درود نہیں پڑھا تھا۔ امام بخاری کا ورع۔ تقویٰ اور عشقِ رسول یہ سب باتیں تو اس امر پر دلیل ہیں کہ آپ نے افتتاحِ بخاری سے پہلے ہی نہیں بلکہ ہر حدیث کی کتابت سے پہلے درود پڑھا ہے اور پھر ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے آپ دو رکعت بھی تو پڑھتے تھے جو خدا کی حمد و ثنا بھی تھی اور حضور علیہ السلام پر درود و سلام بھی۔

مقدمۃ العلم مؤلفینِ کتاب کی یہ بھی عادت ہے کہ وہ شروع فی العلم سے پہلے وجہ تالیف، فن کی اہمیت اور عظمت، ابواب کی تقسیم اور کیفیت، علم کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت کو تفصیل سے بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر حضرت بخاری نے ابتداءِ کتاب میں ان امور کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور بسم اللہ کے بعد حضور علیہ السلام کی حدیث بیان کرنی شروع کردی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ عاشقِ رسول تھے اور فنافی الرسول کے مرتبہ پر فائز تھے۔ انھیں مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کی لفظی بحثوں سے کچھ مطلب نہ تھا۔ ان کا مقدمہ بھی حضور علیہ السلام تھے اور تعریف بھی۔ موضوع بھی حضور علیہ السلام تھے اور غایت بھی۔ ان کی نظر تو محض محبوب رب العالمین کی صورت و سیرت اور آپ کے کردار اور اقوال پر تھی۔ اس لیے انھوں نے ان لفظی بحثوں سے اپنے دامن کو نہیں الجھایا اور قالَ رسول اللہ سے اپنی تالیف کی ابتداء فرمادی۔

ثانیاً۔ امام بخاری نے فنِ حدیث کے مبادیات کا ذکر نہ کرکے عملی طور پر اس امر کا اظہار فرمایا ہے کہ علمِ حدیث ایسا فن نہیں ہے جس کی تعریف اور غرض و غایت اور وجہ تالیف کو بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ بخاری میری تصنیف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کے آخری رسول کے اقوال و اعمال، صورت و کردار کا مجموعہ ہے جو منزل من اللہ ہے وحی خفی ہے۔ انسانیت کی فطرت اور آدمیت کی جان ہے۔ اگر یہ میری تصنیف ہوتی یا میں انسان کے ساختہ فنون پر کوئی تصنیف کرتا تو ضرور فن کے مبادیات کو بیان کر دیتا مگر بخاری تو اللہ کے محبوب کی گفتگو اور سیرت و کردار پر مشتمل ہے جس کی غرض و غایت مجھے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی غرض و غایت تعریف اور عظمت و رفعت کو خود خالقِ کائنات نے اپنی وحی جلی قرآن مجید میں تفصیل سے بیان فرما دیا ہے۔ اس لیے علمِ حدیث کے مبادیات مجھ سے نہیں بلکہ قرآن سے پوچھو۔

بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یہ باب اس امر کے بیان میں ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء کیسے ہوئی؟

یہ بخاری کا پہلا عنوان ہے جس کو اصطلاح میں ترجمۃ الباب کہتے ہیں۔ اس عنوان میں آغازِ وحی اور اس کے متعلقات کا بیان کرنا مقصود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محدثین کرام بالعموم کتاب الایمان، کتاب الاعتصام بالسنۃ اور کتاب الطہارۃ سے اپنی تالیفات کی ابتدا کرتے ہیں۔ تنہا امام بخاری نے اپنی تالیف کی ابتدا آغازِ وحی سے کیوں کی؟ جواب یہ ہے کہ جن محدثین کرام نے مذکورہ بالا عنوانات سے ان کی عظمت و اہمیت کے پیشِ نظر کتاب کا آغاز کیا ہے۔ ان سب کے نقطۂ نظر کی پاکیزگی و صالحیت بھی تسلیم ہے لیکن امام بخاری علیہ الرحمۃ نے جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب سے اہم ہے۔ امام نے اپنی تالیف کو وحی سے شروع کرکے یہ بتایا ہے کہ ایمان ہو یا عمل، عقائد ہوں یا احکام ان سب کی بنیاد و اساس صرف وحی ہے اور جب تک یہ چیزیں اصلاً وحی کی طرف منسوب نہ ہوں دین و شریعت نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ کشف و الہام اور بڑے سے بڑے مفسر، امام و مجتہد کی ذاتی رائے اور وہ قیاس و اجتہاد جو وحی سے ماخوذ نہ ہو۔ دین کے کسی بھی عقیدہ کے ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نفسِ ایمان بھی وہی معتبر و مفید ہے جس کو وحی کی توثیق و تائید حاصل ہو۔ خوارج و معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقے اور ملحدین کو چھوڑ کر ہر مذہب و ملت کے ماننے والوں میں بھی کسی نہ کسی نوعیت کا ایمان پایا ہی جاتا ہے مگر یہ اس لیے ناقابلِ اعتبار اور لاحاصل ہے کہ وحی الٰہی سے اس کی مطابقت نہیں ہے۔ غرضیکہ امام نے ذکرِ وحی سے کتاب کا آغاز کرکے اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اصل الاصول صرف وحی ہے اور جب تک کسی چیز کو وحی کی تائید و توثیق حاصل نہ ہو دینِ اسلام میں وہ نامعتبر ہے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عنوان یہ ہے کہ وحی کا آغاز کیونکر ہوا تو زیرِ عنوان وہ روایات آنی چاہئیں جن میں وحی اور آغازِ وحی کا ذکر ہو مگر آپ دیکھیں گے کہ اس عنوان میں چھ روایتیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں وحی و آغازِ وحی کا ذکر ہے۔ پانچ روایتوں میں سے صرف تین میں وحی کا ذکر آیا ہے آغازِ وحی کا نہیں اور دو روایتیں تو وحی اور آغازِ وحی کے ذکر ہی سے خالی ہیں حالانکہ عنوان کا اقتضا یہ تھا کہ تمام روایتوں میں وحی اور آغازِ وحی کا ذکر ہو۔ جواب یہ ہے کہ امام کی عادتِ کریمہ یہ ہے کہ وہ کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی ضروری تفصیلات اور اس کے مناسبات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ امام کے اس طرزِ فکر کی متعدد مثالیں خود بخاری میں موجود ہیں۔

مثلاً باب ہے **بدء الخلق**۔ پیدائش کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ مگر امام نے اس میں جو روایتیں ذکر کیں۔ ان میں صرف آغازِ پیدائش ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ وسط و آخر تک کے حالات، ملائکہ اور آسمانوں وغیرہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اسی طرح امام نے باب باندھا ہے **بدء الاذان** کا تو اس میں صرف

آغازِ اذان ہی کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ اس عنوان میں امام نے وہ روایتیں بھی ذکر کر دی ہیں جن میں اذان کی ابتدائی کیفیت، وسط اور آخر کے حال کا ذکر ہے۔ غرضیکہ امام کا انداز فکر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کے آغاز کا عنوان قائم کرتے ہیں تو صرف اس شے کے آغاز کے بیان پر ہی اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے اسباب وعلل اور دیگر تفصیلات کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب امام نے آغازِ وحی کا عنوان قائم کیا تو اس کی عظمت و اہمیت کے اظہار کے لیے یہی اسلوب بہتر تھا کہ وحی و آغازِ وحی کے ساتھ ساتھ وحی بھیجنے والے اور اس کے لانے والے اور جس ہستی مقدس پر وحی نازل ہوئی۔ اس کا تعارف بھی کرائیں اور یہ بھی بتائیں کہ جس کو وحی نبوت کے لیے خاص کیا جاتا ہے اس کی فطرت سلیم ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں۔ اس کا فہم و ذکار، صدق و امانت، عادات و اطوار ایسے ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ امام کے نزدیک وحی صرف قرآنِ کریم ہی نہیں ہے بلکہ سنتِ رسول بھی وحی ہے۔ ایسی صورت میں تو صاحبِ وحی کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ و تعارف اور اہم ہو جاتا ہے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ عنوان اور زیرِ عنوان روایات میں کیا تعلق ہے۔ جس میں وحی یا آغازِ وحی کا ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہے محض عنوان پر گفتگو۔ اب عنوان کے الفاظ پر بحث کی جاتی ہے۔

تشریح الفاظ ترجمہ

۱۔ باب اصل میں "بَوَبٌ" تھا۔ واؤ کو الف سے بدل دیا باب ہو گیا باب کے متعدد معنی آتے ہیں۔ یہاں نوع کے معنٰے میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ من فتح الباب من العلم۔ جس نے علم کا دروازہ کھول دیا۔ یعنی علم کی ایک قسم ظاہر کر دی باب اور کتاب میں فرق ہے۔ کتاب کے ضمن میں متعدد فصلیں ہوتی ہیں اور باب کے ضمن میں ایک ہی فصل ہوتی ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے باب کہا۔ کیف کا استعمال متعدد معنوں میں ہوتا ہے ۱۔ کیف استفہامِ حقیقی کے لیے جیسے کیف زیدٌ زید کیسے ہے؟ ۲۔ کبھی تعجب کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے کیف تکفرون باللہ۔ تم اللہ سے کیونکر کفر کرتے ہو ۳۔ کبھی خبر واقع ہوتا ہے جیسے کیف انت ۴۔ کبھی حال واقع ہوتا ہے جیسے کیف جاء زیدٌ زید کس حال میں آیا۔ کَانَ افعالِ ناقصہ سے ہے جو زمانِ ماضی پر دلالت کرتا ہے۔ بَدْءٌ۔ فَعْلٌ کے وزن پر۔ ب کی زبر دال ساکن۔ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی ابتدا کے ہوں گے اور اگر بغیر ہمزہ کے دال کا پیش۔ واؤ پر تشدید بُدُوٌّ بروزن فُعُولٌ و قُعُودٌ۔ تو اب اس کے معنی ظہور کے ہوں گے۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یا وحی کا ظہور کس طرح ہوا؟ وَحْیٌ کے لغوی معنے تیزی کے ساتھ اشارہ کرنے کے ہیں۔ الاعلام فی خفاء یعنی انتہائی پوشیدگی کے ساتھ اپنے دل منشار کو ظاہر کر دینا اور

اصطلاحِ شریعت میں اللہ کا وہ کلام ہے جو وہ اپنے نبی پر نازل فرماتا ہے۔

نبی و رسول کی تعریف

نبی وہ بشر ہے جسے اللہ تعالےٰ نے ہدایت کے لیے وحی بھیجی ہو۔ وحی خواہ فرشتہ کی معرفت ہو یا بلا واسطہ مگر نبی ہونے کے لیے وحی ہونا ضروری ہے۔ رسول وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے تبلیغِ احکام کے واسطے مبعوث فرمایا اور اس پر کتاب نازل ہوئی ہو یا جدید شریعت رکھتا ہو۔ پس رسول اور نبی میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوئی رسول خاص ہے اور نبی عام یعنی ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ۲۔ لیکن یہ واضح رہے کہ نبی و رسو میں جو فرق تعریفوں سے پیدا ہوتا ہے وہ محض اعتباری ہے۔ حقیقت میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی دونوں ہی اللہ عزوجل کی طرف سے مخلوقِ خدا کی ہدایت اور تبلیغِ احکام کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ دونوں ہی ہادی، مطاع، آمر، ناہی اور امت کے لیے روشنی کا مینار ہوتے ہیں۔

رسولِ ملکی و رسولِ بشری

اسی طرح رسول ہونا بشر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلک ملائکہ میں بھی رسول ہیں۔ علامہ عبد العزیز فرہاوی علیہ الرحمۃ لک

۱۔ ان من الملٰئکۃ رسلا قال اللہ تعالی - اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ وھم المقربون الذین یبلغون الامر والنہی الی عوام الملٰئکۃ والی انبیاء البشر

ملائکہ میں بھی رسول ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ الل چن لیتا ہے ملائکہ سے رسول اور انسانوں سے او (رسول ملکی) اللہ کے وہ مقرب ہیں جو اللہ کے امر نہی کو عوام ملائکہ، انبیاء بشر تک پہنچاتے ہیں۔ (نبراس ص۴۲۵)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی آیت

۲۔ مگر کسیکہ پسند می کند و آں کس رسول می باشد خواہ از جنس ملک مثل حضرت جبرئیل و خواہ از جنس بشر مثل حضرت محمد و موسیٰ و عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام (تفسیر عزیزی تبارک ص۲۰۵)

تفسیر جلالین و مدارک و بیضاوی و مظہری وغیرہ تفاسیر میں ہے۔

۳۔ رسلا کجبرئیل ومیکائیل و ابراھیم ومحمد وغیرھم (جلالین)

رسول جیسے حضرت جبرئیل ومیکائیل و ابراہیم محمد صلے اللہ علیہم وسلم

۴۔ اعم من البشر والملٰئکۃ (مظہری الملک ص۹۵)

رسول ہونا عام ہے خواہ بشری ہو یا ملکی

۵- رسل اللہ علی ضرب بین ملک و بشر (مدارک صـ۲۸)

رسول دو ضرب پر ہے - ملکی اور بشری

علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں۔

اِتَّفَقَ اَئِمَّةُ المسلمین ان حکم المرسلین منہم ای من الملٰئکة حکم النبیین سواء فی العصمة و تعظیم الحرمة مما ذکرنا عصمتہم منہ وانہم فی حقوق الانبیاء والتبلیغ الیہم کالانبیاء
(شرح شفا ج ۲ صـ۱۵۴)

ائمہ مسلمین کا اس پر اتفاق ہے۔ ملائکہ مرسلین کا حکم وہی ہے جو انبیاء کا ہے اور وہ عصمت اور تعظیم حرمت میں برابر ہیں جیسے انبیاء بشری اپنی امتوں کو احکام خداوندی پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح مرسلین ملائکہ انبیاء بشری کو اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں اور مرسلین ملائکہ کو حقوق انبیاء حاصل ہیں۔

غرضکہ جس طرح اللہ عزوجل نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے رسول بنائے ہیں اور وہ اپنی امتوں کو احکام الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے فرشتوں میں سے بھی رسول مبعوث کیے ہیں جو انبیاء بشری کو احکام الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں اور مرسلین ملائکہ کی تعظیم و توقیر اور ان کی رسالت پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے انبیاء و مرسلین بشری کی تعظیم و توقیر اور ان کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا۔

امام بخاری علیہ الرحمہ کی عادت یہ ہے کہ وہ عنوان ہی میں حسب موقع و محل کوئی آیت درج کر دیتے ہیں جس کو ترجمۃ الباب سے مناسبت ہوتی ہے۔ چنانچہ عنوان مذکورہ بالا کے ماتحت یہ آیت لکھی گئی ہے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جیسی وحی نوح اور ان کے بعد پیغمبروں پر وحی بھیجی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس آیت کو انھوں نے کیوں منتخب کیا تو جواب یہ ہے کہ اس رکوع میں مضمون وحی کی جس قدر تفصیل ہے۔ قرآن مجید کے کسی اور جز میں نہیں ہے نیز اس رکوع میں اہل کتاب نے وحی سے متعلق جو سوال کیا تھا اس کا جواب بھی ہے۔ انھوں نے ازراہِ عناد و طنز یہ کہا تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو ہمارے پاس ایک لکھی لکھائی کتاب لائیے۔ انہیں جواب دیا گیا کہ وحی کا معاملہ کچھ نیا اور اچھوتا نہیں کہ تم نامعقولیت پر اتر آؤ۔ سلسلۂ وحی تمام انبیاء کے زمانوں میں قائم رہا ہے نیز وہ جس پر چاہتا ہے کتاب

بھی اُتار دیتا ہے جیسے حضرت عیسٰے علیہ السلام پر انجیل ، موسیٰ علیہ السلام پر توریت ، داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی اور آخر کار سب سے معظم و مکمل کتاب (قرآن) اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا پر نازل فرما کر یہ سلسلہ قیامت تک کے لیے بند کر دیا ۲۔ غرضکہ اس مقام پر مذکورہ آیت کے نقل کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ترجمۃ الباب میں وحی سے وہ وحی مراد ہے جو آیت میں مذکور ہے۔

۲۔ **قَوْل** ۔ مَا يَنْطِقُ بِهٖ اللسان کو کہتے ہیں یعنی جو زبان سے ہی بولا جائے۔ قول کا اطلاق کلمہ، کلام اور کلم پر آتا ہے خواہ وہ تام ہو یا ناقص اور مجازاً رائے اور اعتقاد کو بھی قول کہتے ہیں۔ جیسے بولتے ہیں۔ یقول فلان يقول ابو حنيفة يذهب الى قول مالك ۔ یہاں قول کا لفظ اعتقاد یا رائے کے معنی میں مستعمل ہوا۔ کبھی قول کا اطلاق غیر نطق پر بھی آتا ہے۔

۱۔ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ فرمائیں ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔
۲۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ	تو اس سے اور زمین سے فرمایا دونو حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے دونوں نے کہا ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں قول کا اطلاق غیر نطق پر آیا ہے۔ کیونکہ خدا زبان سے پاک ہے اور زمین کی زبان نہیں ہے۔ خدا کا حکم فرمانا بے کیف ہے اور زمین نے اطاعت کا جو اقرار کیا وہ بھی بے نطق ہے۔

تفسیر آیت اِنَّا اَوْحَيْنَا

اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ میں کلمہ اِنَّ تحقیق و تاکید کے لیے آیا ہے یعنی اِنَّ کسی بات میں جب قوت پیدا کرنا مقصود ہو اس وقت بولا جاتا ہے۔ كَمَا اَوْحَيْنَا میں ك تشبیہ کے لیے ہے۔ مشبہ وہ "وحی" ہے جو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی اور مشبہ بہ وہ وحی ہے جو حضرت نوح اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو ہوئی وجہ تشبیہ وحی رسالت ہے۔

مفہوم آیت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسی طرح حضور اکرم علیہ السلام پر وحی رسالت کی جس طرح حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء پر کی ہے یہ آیت سورۃ نساء کی ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ نے حضور علیہ السلام سے یہ سوال کیا تھا کہ ان کے لیے آسمان سے یکبارگی کتاب نازل ہو تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائیں گے۔ اس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور ان پر حجت تمام کی گئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا بکثرت انبیاء ہیں (جن میں سے گیارہ کے نام یہاں آیت میں بیان فرمائے گئے)

اہلِ کتاب ان سب کی نبوت کو مانتے ہیں۔ حالانکہ ان سب حضرات میں سے کسی پر بھی یکبارگی کتاب نازل نہ ہوئی تو جب اس وجہ سے ان انبیاء کی نبوت تسلیم کرنے میں اہلِ کتاب کو کوئی عذر نہیں ہوا تو سید عالم علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرنے میں کیا عذر ہے۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد توحید کی معرفت کا درس دینا اور ایمان کی تکمیل اور طریقِ عبادت کی تعلیم ہے۔ کتاب کے متفرق طور پر نازل ہونے میں یہ مقصد بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے کہ تھوڑا تھوڑا بہ آسانی دلنشین ہوتا چلا جائے۔ اس حکمت کو نہ سمجھنا اور اعتراض کرنا کمالِ حماقت ہے۔

واضح ہو کہ قرآنِ مجید ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوا بلکہ حسبِ ضرورت و مصلحت وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت یکبارگی نازل ہوئی۔ یہود نے یہی سوال کیا تھا کہ آپ پر یکبارگی قرآن کیوں نازل نہیں ہوا تو اس پر آیۂ مذکورہ میں ان کی جہالت و حماقت پر تنبیہ کی گئی کہ کتاب کا یکبارگی نازل ہونا، یا نجماً نجماً اس کا اُترنا یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے نبی کی نبوت میں کوئی نقص پیدا ہو سکے۔ وحی نازل کرنا یہ اللہ کی سُنّت ہے اور جیسے اللہ تعالےٰ نے حضرت نوح پر وحی نازل کی تھی اسی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی کی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں اور نسلِ انسانی حضرت نوح سے جاری ہوئی ہے

آیت میں حضرت نوح کا نام خصوصیت سے اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ آدمِ ثانی ہیں اور دوبارہ نسلِ انسانی انہیں سے چلی ہے کیونکہ جب طوفانِ نوح آیا تھا تو اس وقت روئے زمین کے رہنے والے ہلاک ہو گئے تھے۔ صرف کشتی میں سوار افراد باقی بچے تھے (عینی)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ کشتی میں صرف آٹھ افراد تھے۔ حضرت نوح، ان کی بیوی، ان کے تین فرزند سام، حام اور یافث اور ان کی تین عورتیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ان کی عورتوں کے علاوہ ۱۰ افراد تھے مقاتل کہتے ہیں کہ ۷۲ نفوس تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کل اسّی آدمی تھے۔ بہرحال جب یہ لوگ کشتی سے باہر آ گئے تو سوائے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے تین فرزند اور ان کی عورتوں کے سب ہی ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت نوح کا بھی وصال ہو گیا۔ صرف آپ کے تین فرزندوں سے نسلِ انسانی دوبارہ جاری ہوئی۔ قرآنِ مجید نے کہا۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ الْبَاقِيْنَ۔ پس حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد سب سے پہلے رسول قرار پائے۔ اس لیے ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا۔ اس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ حضرت نوح علیہ السلام ایسے پہلے رسول ہیں جن کو ان کی امت نے ستایا اور سخت تکلیفیں پہنچائیں اور آپ کی قوم پر اس لیے عذاب آیا کہ اس نے آپ کی دعوت قبول نہیں کی۔ آپ سے پیشتر

ایسے رسول نہیں گذرے کہ دعوت قبول نہ کرنے کی بنا پر ان کی قوم پر عذاب نازل ہوا ہو۔ اس لیے اس آیت میں ان کا نام خصوصیت سے لیا گیا (فتح الباری و عینی)

ترجمۃ الباب اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے سب سے پہلے حدیث انما الاعمال لکھی ہے۔ جس میں نیت و ہجرۃ کا بیان ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ترجمۃ الباب سے اسے کیا نسبت ہے۔ ذکر تو ظہورِ وحی کا ہے۔ نیت اور ہجرۃ کا قصہ بیچ میں کیوں آگیا؟ یعنی عنوان کا اقتضا یہ ہے کہ اس میں صرف وہ روایات درج ہوں جن کا تعلق وحی اور اس کے اسباب و علل سے ہو۔ مگر امام نے اس عنوان کے ماتحت جو چھ حدیثیں لکھی ہیں۔ اول میں نیت و ہجرتِ خالصہ کا بیان ہے اور باقی پانچ میں نزولِ وحی کی کیفیت، ابتدائے وحی، جبریل علیہ السلام سے قرآنِ کریم کا دَور کرنا اور حضور علیہ السلام کی صفات کا بیان ہے۔ ان پانچوں کی عنوان سے مناسبت تو ظاہر ہے مگر حدیثِ اول جس میں ہجرت اور نیت کا ذکر ہے وہ عنوان سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وحی اور نیت و ہجرت میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ شارحین نے اس سوال ک متعدد جواب دیئے ہیں۔

۱۔ علامہ خطابی نے فرمایا۔ محض برکت کے لیے ذکر کی ہے ۲۔ بعض نے کہا چونکہ یہ حدیث متواتر المعنی ہے اس لیے ذکر کر دی ۳۔ علامہ محمد اسماعیل تیمی نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو خطبہ میں بیان کیا۔ امام نے بطور خطبہ کتاب حدیث ہذا کو ذکر کر دیا ۴۔ بعض نے یہ توجیہ کی چونکہ اسلام میں اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اس لیے امام نے یہ حدیث بطور دیباچہ کتاب ذکر کر کے یہ بتایا ک نیت اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں اور یہ کتاب حدیث کی کتاب ہے۔ اس کا پڑھنا پڑھانا عبا ہے اور عبادت میں نیت درست رکھنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ کہ امام نے بخاری پڑھنے اور پڑھانے والو کو نیت درست رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس حدیث کا ذکر کیا ۵۔ بعض نے یہ توجیہ کی کہ جیسے سورۂ فاتحہ قرآنِ کریم کا خلاصہ ہے۔ اسی طرح یہ حدیث بھی احادیثِ نبویہ کا خلاصہ ہے اس لیے امام نے سب سے پہلے اس کو لکھ دیا ۶۔ بخاری کی تالیف کا مقصود وحی سنت کو جمع کرنا ہے۔ اس لیے و کا باب مقرر کیا اور وحی سے چونکہ شرعی اعمال بیان ہوتے ہیں۔ اس لیے اس باب میں سب سے پہلے حدی اعمال ذکر کی ہے ۷۔ سب سے پہلے عمدہ توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام کے لیے اس حدیث کو یہاں لا کا محرک وہی اندازِ فکر ہے جو اس عنوان کے ماتحت بیان کی ہوئی دیگر روایات میں ہو رہا ہے۔ یعنی وحی ک تعارف کے لیے اس ہستیٔ مقدس کا تعارف جس پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے نبوت کے لیے ہر ک

کا انتخاب نہیں فرماتا۔ بلکہ اس کو منتخب فرماتا ہے۔ جس میں نبوت کی سزاواری کے لیے فطری طور پر صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو افراد نبی بنائے گئے وہ قبل نبوت بھی کبائر و صغائر سے پاک وصاف اور اخلاق حسنہ سے متصف رہے۔ اب ظاہر ہے کہ تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے تو نیک نیتی بجائے خود ایک اعلیٰ درجہ کی صفتِ حسنہ ہوئی۔ امام نے اس حدیث کو ذکر کر کے نبی کی اس صفتِ حسنہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نبی کے تمام افعال و اعمال اخلاق و کردار خلوصِ نیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیاوی منفعت یا مادی جاہ و اقتدار کی غرض پورا کرنے کے لیے حُسنِ اخلاق اور نیک کرداری کا مظاہرہ کرے۔ پس مُبادیاتِ وحی میں نیت کی درستگی سب سے مقدم ہے ۸۔ نیز اس حدیث میں ہجرتِ الی اللہ کا ذکر بھی ہے اور عُنوان کا مقصود بھی اوّل شانِ رسالت کو بیان کرنا ہے (یعنی وحی کا آغاز کیسے ہوا)، تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء ہجرت الی اللہ سے ہوگی۔ نزولِ وحی سے قبل آپ سب کو چھوڑ کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور مُناجات میں مشغول رہتے تو غارِ حرا میں خلوت فرمانا اور اللہ عزوجل کی طرف متوجہ ہونا (ہجرت کرنا) حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں مقدمہ نبوت بنا تا آنکہ وحی کا آغاز ہوگیا۔ پس حدیثِ اعمال کو ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ اس میں ترجمۃ الباب کا مقدمہ مذکور ہے۔

عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے

۱- عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی تو جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اس کو پہنچے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ (بخاری)

تعلق ۱- اس حدیث کا آیت سے تعلق یہ ہے کہ وحی بھیجنا اللہ تعالےٰ کی سنت ہے اور اللہ تعالےٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام اور حضور اکرم علیہ السلام پر یہ وحی نازل کی کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے جیسی نیت ہوگی ویسا ہی عمل کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے کہ اللہ نے تمام انبیاء پر صفتِ نیت کی وحی بھیجی ہے۔ ۲- اس حدیث کو امام نے چھ جگہ ذکر کیا ہے۔ مسلم نے کتاب الجہاد میں۔

ابوداود نے کتاب الطہارت میں، ترمذی نے کتاب الحدود میں، نسائی نے طہارت، طلاق اور عتاق میں ذکر فرمایا ہے۔ امام احمد و بیہقی و دارقطنی و ابن حبان نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔	اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اسی پر عقیدہ لاتے۔

یعنی اخلاص کے ساتھ نماز قائم رکھیں۔ زکوٰۃ دیں۔ شرک و نفاق سے دور رہیں اور تمام دینوں کو چھوڑ کر خالص اسلام کے متبع ہو جائیں۔

۲۔ محدثینِ کرام اپنی تالیفات میں عموماً اس حدیث کو پہلے لکھتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد اخلاص قصد اور تصحیح نیت اور اللہ کی رضا جوئی ہوتی ہے۔ امام بخاری نے بھی اس کو پہلے لکھ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری تصنیف خلوصِ نیت پر مبنی ہے اور یہ بات ان کو حاصل بھی ہو گئی اور بخاری کو اہل شرق و غرب نے قبول کیا ۳۔ حافظ ابن مہدی فرماتے ہیں کہ جو شخص کتاب لکھے تو اس کو چاہیے کہ اس حدیث سے اپنی کتاب کا افتتاح کرے ۴۔ ابوداود کا قول ہے کہ وہ چار ہزار حدیثیں جن میں مسائل دینیہ کا ذکر ہے انسان کو اپنے دین کے لیے ان میں سے صرف چار حدیثیں کافی ہیں۔

۱۔ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ	عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔
۲۔ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ	حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے۔
۳۔ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ	آدمی کے حسنِ اسلام سے یہ بات ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کو نفع نہ دے۔
۴۔ وَلَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ مُؤْمِنًا حَتّٰى يَرْضٰى لِأَخِيْهِ مَا يَرْضٰى لِنَفْسِهٖ	مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھائی (مومن) کے لیے اس چیز کو پسند نہ کر جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ظاہر ہے جو شخص ان چار حدیثوں پر عمل کرتا ہے وہ یقیناً پورے اسلام کو عملی طور پر قبول کرنے وا میں شمار ہو گا۔ غرضیکہ یہ حدیث ایک ہزار حدیثوں کے برابر ہے اور انتہائی جامع حدیث ہے۔ امام قا عیاض کہتے ہیں کہ ائمہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ثلث اسلام (دین کا تہائی حصہ) ہے۔ ابن مہدی کہتے علم کے تیس بابوں میں اس حدیث کو دخل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا۔ ستر باب ہیں۔

۵۔ یہ حدیث حضور علیہ السلام نے خطبہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس کو منبر پہ بیان فرمایا۔ حضرت عمر کے سوا اصحابہ میں "عمر بن الخطاب" کسی کا نام نہیں ہے اور عمر نامی صحا

میں ۲۳ عدد افراد ہوتے ہیں۔ اسی لیے عمر کے آخر میں واؤ زیادہ لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ اس عمر سے عمر بن الخطاب مراد نہیں ہے۔

تشریح الفاظِ حدیث

اعمال عمل کی جمع ہے نیات نیت کی جمع ہے۔ اس کے معنیٰ قصد، ارادہ اور عزم کے ہیں۔ امام نووی نے فرمایا۔ نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں۔ البتہ اہلِ تحقیق نے نیت و عزم میں فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں عزم وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقدم ہو مثلاً یہ ارادہ کہ کل ہم سفر کریں گے اور قصد وہ ارادہ ہے جو فعل سے متصل اور مقترن ہو مثلاً سفر کا وہ ارادہ جو عین حالتِ سفر میں پایا جاتا ہے اور نیت وہ ارادہ ہے جو فعل سے مقترن و متصل بھی ہو اور یہ علم بھی اس کے ساتھ پایا جائے کہ فلاں چیز کا ارادہ کس لیے کیا جارہا ہے۔

هِجرة - فِعلۃٌ کے وزن پر وصل کی ضد ہے۔ پھر اس کے عام معنیٰ ترکِ وطن یا ایک زمین کو چھوڑ کر دوسری زمین میں چلے جانے کے ہوگئے۔ اصطلاحِ شریعت میں ہجرت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی اپنے دین و ایمان کو بچانے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے دار الکفر سے دار الاسلام میں چلا جائے گا اور اللہ و رسول کے پسندیدہ افعال و اعمال کو اختیار کرے۔ صحابہ کرام کو اس لیے مہاجر کہتے ہیں کہ انھوں نے صرف دین کی خاطر اپنے محبوب وطن مکہ کو چھوڑ دیا تھا اور مدینہ منورہ آگئے تھے۔ صحابہ کرام اس معنے میں بھی حقیقی مہاجر ہیں کہ انھوں نے باطل کو ترک کیا اور حق کو قبول کیا اور حضور علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اسلام کو اپنے خون سے سینچا اور راہِ الٰہی میں ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کو اٹھایا اور اسلام پر آنچ نہ آنے دی۔

دُنْیَا - فُعْلٰی کے وزن پر ہے۔ امامِ لغت جوہری نے کہا۔ دنیا کو اس لیے دنیا کہتے ہیں کہ یہ زوال کے قریب ہوتی ہے۔ دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ اس میں متکلمین کے دو قول ہیں ۱۔ جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے دنیا ہے ۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تمام مخلوقات جواہر ہوں یا اعراض، دنیا ہیں۔ قرآن حکیم نے فرمایا وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ دنیا کا جینا تو نہیں مگر دھوکے کا مال۔ مگر یہ اس کے لیے ہے جو اس کا ہوجائے اور آخرت کو بھول جائے۔ لیکن وہ شخص جو اسبابِ دنیوی سے صرف آخرت کے لیے تعلق رکھے اور خدا کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرے تو اس کے لیے دنیا کی کامیابی آخرت کا ذریعہ ہے حضرت ذوالنون فرمایا کرتے تھے۔ اے گروہِ مریدین! دنیا طلب نہ کرو اور اگر طلب کرو تو اس سے محبت نہ رکھو۔ توشہ یہاں سے لو۔ آرام گاہ اور ہے۔

حدیث انما الاعمال

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں۔ ہم میں ایک شخص تھا جس نے ام قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ ام قیس نے کہا جب تک تو

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہ کرے میں تیرے ساتھ نکاح نہیں کروں گی۔ آخر اس شخص نے ہجرت کی اور نکاح کیا۔ ہم اس شخص کو اسی لیے مہاجر اُم قیس کہا کرتے تھے (طبرانی) جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور جو شخص جس نیت سے ہجرت کرتا ہے وہی اس کے لیے ہے۔

ہجرت کے اقسام

اگرچہ اس حدیث کا مورد خاص ہے مگر عموم لفظ کی وجہ سے تمام اقسام کی ہجرتوں کو شامل ہے۔ صحابہ کرام نے جو ہجرت کی وہ پانچ قسم کی تھی۔ پہلی ہجرت حبشہ کی طرف، دوسری مکہ سے مدینہ کی طرف۔ تیسری قبائل کی ہجرت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ چوتھی اہل مکہ سے جو مسلمان ہوا۔ اس نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ پانچویں اللہ تعالےٰ نے جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے ہجرت کی۔ بعض نے تین ہجرتوں کا اور ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔

اوّل۔ حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کیونکہ صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف دوبارہ ہجرت کی تھی۔

دوم۔ ان افراد کی ہجرت جو دارالکفر میں مقیم تھے اور اپنے ایمان کے اظہار پر قادر نہ تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کریں۔

سوم۔ وہ ہجرت جو آخری زمانہ میں ظہور فتن کے وقت شام کی طرف ہوگی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس ہجرت کے بعد ایک اور ہجرت ہے جب کہ اہل ایمان سمٹ سمٹا کر مہاجر ابراہیم علیہ السلام (شام) میں جمع ہو جائیں گے اور زمین پر شریر افراد رہ جائیں گے۔ (ابوداؤد)

صاحب نہایہ نے کہا۔ مہاجر ابراہیم علیہ السلام سے ملک شام مراد ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کرکے شام چلے آئے تھے۔

حدیث فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں، اسکے معنیٰ

اس موقع پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے باب میں جو احادیث وارد ہوتی ہیں بظاہر معارض ہیں مثلاً بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت کی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا (بخاری)	فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ لیکن جہاد اور نیت ہے اور جب امام تم کو کوچ کے لیے (جہاد کے لیے) بلائے تو اس کے ساتھ کوچ کرو۔
بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں۔ لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ الْيَوْمَ لَا هِجْرَةَ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (بخاری)	فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت نہیں ہے

نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے عبید بن عمر نے ہجرت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا آج کے دن ہجرت نہیں اور مومن اپنے دین کو ساتھ لے کر اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرتے تھے تو خوف فتنہ کی وجہ سے کرتے تھے لیکن آج کے دن تو اللہ تعالےٰ نے اسلام کو بلند فرمادیا ہے اور ایک مومن مسلمان اپنے رب کی عبادت کرتا ہے جہاں چاہتا ہے۔ اس لیے اب تو جہاد اور نیت ہی ہے۔ ہجرت نہیں ہے۔ بخاری

نیز بخاری و مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں ابی معبد کو ساتھ لے کر ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا۔

اِنْقَضَتِ الْهِجْرَةُ لِاَهْلِهَا (بخاری و مسلم) | ہجرت، ہجرت کرنیوالوں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

پھر آپ نے اسلام اور جہاد پر بیعت کی۔ انقطاعِ ہجرت کے مضمون کی احادیث امام احمد نے ابی سعید خدری، رافع بن خدیج اور زید بن ثابت سے بھی روایت کی ہیں۔ یہ تمام حدیثیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اب ہجرت منقطع ہے اور فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن ابوداؤد اور نسائی میں حضرت معاویہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ہجرت منقطع نہ ہوگی جبتک توبہ کا دروازہ بند نہ ہو اور توبہ منقطع نہ ہوگی۔ جبتک کہ آفتاب مغرب سے نہ نکلے۔ اسی طرح امام احمد نے ابن سعدی سے اور جنادہ بن ابی امیہ سے مرفوعاً روایت کی جس کا مضمون یہ ہے کہ ہجرت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کافر مسلمانوں سے جنگ کرتے رہیں یا جہاد ہوتا رہے یہ اور اس مضمون کی احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ ہجرت فتح مکہ کے بعد بھی جاری ہے۔ شارحین نے اس تعارض کو اُٹھانے کے لیے متعدد جواب دیئے ہیں

۱۔ ابن الخطابی نے فرمایا کہ وہ ہجرت جو اوّل اسلام میں تھی وہ فرض تھی۔ لہٰذا جن احادیث میں انقطاعِ ہجرت کا ذکر ہے۔ اس سے مراد یہی ہجرت ہے یعنی فرض ہجرت جو اوّل میں تھی وہ اب نہیں ہے اور فتح مکہ کے بعد جو ہجرت ہے وہ مستحب تھی لہٰذا جن احادیث میں ہجرت کے جاری رہنے کا ذکر ہے۔ اس سے مستحب ہجرت مراد ہے اور وہ جاری ہے۔

۲۔ ابن اثیر نے فرمایا۔ ہجرت دو قسم کی تھی ایک تو وہ کہ لوگ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور آتے تھے اور مال و اولاد سے قطع تعلق کر لیتے تھے (یعنی دین کے ہی ہو رہتے تھے) اور اس پر اللہ تعالےٰ نے جنّت کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ ایسی ہجرت جس کے بدلے میں جنّت کا ملنا یقینی ہے، فتح مکہ کے بعد منقطع ہوگئی۔ دوسری ہجرت وہ ہے جو اعراب کی تھی جو مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کرتے تھے اور اپنے وطن کو چھوڑتے تھے اور جیسے عمل اصحاب ہجرت (صحابہ کرام) نے کیے وہ نہیں کر سکے۔ اس کے متعلق حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ یہ ہجرت توبہ کے منقطع ہونے تک جاری ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہجرت باقیہ سے مراد

ہجر السیئات ہو یعنی گناہوں کو ترک کرنا اور یہ ہجرت بلاشبہ قیامت تک جاری ہے - چنانچہ متعدد احادیث اس مضمون کی ملتی ہیں - حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا - ہجرت دو قسم کی ہے - ایک تو گناہوں کو ترک کر دینا - دوسری اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرنا اور ہجرت منقطع نہ ہوگی جبتک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا اور توبہ اس وقت تک قبول کی جائے گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے (احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں - ایک اعرابی حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا - اس نے عرض کی حضور! ہجرت کہاں پر ہے کس زمین پر ہے؟ کس قوم کے ساتھ خاص ہے - کیا آپ کے وصال کے بعد بھی ہجرت ہے؟ حضور علیہ السلام نے کچھ دیر سکوت فرمایا - پھر فرمایا - جب تو نماز قائم کرے - زکوٰۃ ادا کرے تو مہاجر ہے اگرچہ تو یمامہ کی زمین پر انتقال کرے (احمد) دوسری روایت کے لفظ یہ ہیں :-

اَلْهِجْرَةُ اَنْ تَهْجُرَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ ثُمَّ اَنْتَ مُهَاجِرٌ	ہجرت یہ ہے کہ تو ظاہری اور باطنی برائیوں سے قطع تعلق کرے - نماز قائم کرے - زکوٰۃ ادا کرے پھر تو مہاجر ہے - (احمد)

شارحین کے جوابات سے اس باب کی تمام حدیثوں میں تطبیق ہو گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث میں بظاہر بھی تضاد نہیں ہے اور ہر حدیث اپنے موقع و محل پر بالکل صحیح اترتی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ احادیث پر غور کرنے سے پہلے ہجرت کے پس منظر کو دیکھنا چاہیئے -

ہجرت کا پس منظر

یہ ہجرت جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف فرمائی - اللہ تعالیٰ کا حکم تھی - حضرت صدیق اکبر سے بھی حضور علیہ السلام نے یہی فرمایا تھا کہ اب ہجرت کا حکم آگیا ہے ۲- اس ہجرت کا ذکر کتب سماویہ میں بھی تھا - چنانچہ وحی کی ابتدائی کیفیت جب حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ورقہ بن نوفل کو سنائی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ یہ وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا اور اے کاش! میں اس وقت تک زندہ رہ سکوں جب کہ آپ کی قوم آپ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کرے گی ۳- نیز سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ آخری معجزۂ عذاب اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ پیغمبر کو مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم دیتا ہے - ایسی ہجرت ہر نبی نے کی ہے - حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے ہجرت کرتے ہیں - اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ - حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرتے ہیں - پھر جب یہ ہجرت ہو لیتی ہے تو معجزۂ عذاب آتا ہے - چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر سوار نہ ہوئے عذاب نہیں آیا - حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر شام

اور مصر نہ چلے گئے عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوط، ہود، صالح، شعیب علیہم السلام جب تک اپنی اپنی قوموں کو لے کر الگ نہ ہو گئے عذاب نہ آیا۔ جب ان حضرات نے ہجرت کر لی تو اب عذاب نازل ہو گیا۔ بعینہٖ اسی سنّتِ الٰہی کے مطابق حضور علیہ السلام کو بھی ہجرت کرنی پڑی۔ کفار نے انتہائی تنگ کیا مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ دیئے۔ طرح طرح کے معجزات طلب کیے۔ تو اب وہ وقت آگیا کہ کفار پر عذاب نازل ہو چنانچہ حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے انا للہ پڑھا تھا اور فرمایا تھا کہ اب قریش کی ہلاکت نزدیک آگئی (مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۱۶)

چنانچہ آیۂ قتال بھی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور بدر کی لڑائی بھی جو دراصل معجزۂ عذاب تھا جس میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو شکست ہوئی تھی اور جس کی تفصیل سورۂ انفال میں ہے۔ وہ بھی ہجرت کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ بہر حال حضور علیہ السلام نے مکہ سے جو ہجرت فرمائی یہ سنّتِ الٰہی کے مطابق تھی اور ہر نبی کو ایسی ہجرت کرنی ہوتی ہے۔

۴۔ پھر اس ہجرت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہجرت کرنے والے انتہائی مخلص تھے اور ان کو ہجرت پر برانگیختہ کرنے والی چیز رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس امر کا اندازہ یوں بھی کیجئے کہ مکہ میں اسلام غریب تھا کفار نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ وطن اور مال و اولاد سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ پھر بظاہر ایسے حالات بھی نہ تھے۔ جن سے یہ اُمید باندھی جائے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو غلبہ ہوگا۔ مگر صحابہ کرام کا خلوص و للّٰہیت دیکھئے کہ انھوں نے بلا کسی لالچ و طمع کے رسول کریم علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ وطن چھوڑا، مال و دولت، اہل و عیال، رشتہ دار سب کو رسول پر قربان کر دیا۔ ایسی خصوصیت والی ہجرت، ایسے پاکیزہ نفوس کی ہجرت اور اس خلوص و للّٰہیت کے ساتھ ہجرت واقع میں بے مثال ہجرت تھی۔ یہ ہجرت مقبول ہجرت تھی۔ اس کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے ان مہاجرین کی ہجرت کو قبول فرما لیا اور اللہ تعالٰے ان حضرات سے یقیناً تمام راضی ہو گیا

پس ایسی ہجرت جس کے ثواب میں جنت اور رضائے الٰہی کا حصول یقینی ہے بلاشبہ فتح مکہ کے بعد ختم ہو چکی اب قیامت تک ایسی ہجرت نہیں ہوگی۔ ایسی ہجرت کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔

لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ	فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

یعنی یہ مخصوص ہجرت اب منقطع ہو چکی ہے البتہ ایسا ہوتا رہے گا کہ مسلمانوں کو ہجرت کرنی پڑے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ اسلام کے مقابلہ میں کفر موجود ہے مگر اس ہجرت کا حال یہ ہے کہ اگر خلوص نیت کے ساتھ ہے اور اللہ تعالٰے کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہے تو ثواب ملے گا مگر اس دنیا میں اس کے متعلق قطعی حکم نہیں دیا جا سکتا کہ اس کو اللہ تعالٰے نے قبول بھی فرما لیا۔ اس کے برعکس مکہ سے مدینہ والی

ہجرت ہے۔ جواب نہیں ہے اور جن احادیث میں ہجرت کا ذکر ہے اگر ان پر غور کیا جائے تو تضاد و اختلاف کے لفظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دوسری توجیہہ

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ سے یہ مراد لینا کہ فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لیے ہجرت شرعی ختم ہوگئی صحیح نہیں۔ حدیث ہذا پر غور کرنے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فتح مکہ سے قبل مدینہ چلے آنے والے مسلمان مہاجر سمجھے جاتے تھے اور ان کو ہجرت کا ثواب ملتا تھا۔ اس طرح اب فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آنے والے مسلمان مہاجر نہیں سمجھے جا سکتے کیونکہ اب مکہ و مدینہ دو دارالاسلام ہوگئے ہیں اور ہجرت شرعی کے اسباب وعلل میں سے کوئی بھی سبب اب موجود نہیں رہا۔ چنانچہ حضو علیہ السلام ایسا نہ فرماتے تو ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ فتح مکہ کے بعد بھی ثواب ہجرت حاصل کرنے کے لیے مدینہ ہجرت کرنے لگتے تو ان کی تنبیہہ و تفہیم کے لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اب فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ یعنی اب مکہ سے مدینہ آرہنے والے افراد مہاجر نہیں ہو سکتے کیونکہ ہجرت کی تعبدی نوعیت اور حقیقت کا تعلق مکہ اور مدینہ کے شہ سے خاص نہیں ہے بلکہ ان خاص حالات سے ہے جن میں ہجرت ہوتی ہے اور یہ حالات کسی بھی ملک میں ہوں حکم نافذ ہو جائیگا اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں گے تو مکہ اور مدینہ سے حکم ہجرت اٹھ جائیگا۔

ہجرت کے شرعی معنیٰ

باعتبار لغت ہجرت کے معنی ترک کے ہیں۔ حدیث میں بھی یہ لفظ ترک کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ

مہاجر وہ ہے جو اس چیز سے رک جائے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

اور اصطلاحِ شرع میں ہجرت یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنے شہر یا اقامت گا کو چھوڑ کر کسی اور شہر یا ملک میں چلا جائے اور وہاں مقیم ہو جائے۔ اکثر علماء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ یہ سفر دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہو مگر یہ قید ضروری نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اس قید سے صحابہ کی "پہلی ہجرت جو حبشہ کی طرف ہوئی۔ "حبشہ" اس وقت دارالاسلام نہ تھا۔ بہر حال علماء کی تفصیلی آراء کے مطالعہ کے بعد ی واضح ہوتا ہے کہ شرعی ہجرت میں یہ قید ضروری نہیں ہے کہ ہجرت دارالکفر سے دارالاسلام ہی کی طرف ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اسلامی ملک میں اہلِ اقتدار نظریات وعقائد کے لحاظ سے ایسے بگڑ جائیں کہ صحیح العقیدہ مسلما کی زندگی وہاں دوبھر ہو جائے۔ وہ ملک اگرچہ اسلامی ملک ہی کہلاتا ہو۔ مگر باوجود اس کے وہاں منکرات و فوا کا زور ہو اور اہلِ اقتدار کی طرف سے حق کہنے اور حق پر چلنے والے "مستحقِ تعزیر" ہوں۔ ایسی حالت میں اگر کو صحیح العقیدہ مسلمان حمیت وغیرت میں صرف اپنے دین و ایمان کے سلامت لے جانے کی نیت سے اس کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو شرعاً یہ بھی ہجرت ہوگی اور انشاء اللہ العزیز اس پر بھی ثواب ملے گا ۲۔ اسی طرح کیجیے کہ کسی دارالکفر سے مسلمان تنگ آکر ہجرت کرتا ہے اور جغرافیائی مصالح اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے

قریب دار الکفر ہی پہنچ سکتا ہے اور یہ دار الکفر باوجود دار الکفر ہونے کے اسلام کے حق میں اتنا ظالم وجابر نہ ہو کہ کسی مسلمان کے لیے رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ تو پہلے دار الکفر سے اس دار الکفر کی طرف حفاظتِ دین وایمان کے لیے آنا جانا ہجرتِ شرعی ہی ہوگا۔

اعمال وعقائد کی مقبولیت کا مدار خلوصِ نیّت پر ہے

واضح ہو کہ اسلام میں نیّت یعنی ارادہ قلبی ہر عمل کی بنیاد ہے۔ کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے نیت کا معاملہ بڑے نمایاں طور پہ بیان کیا ہے اور جگہ جگہ اخلاص اور حُسنِ نیت کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱- فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف)	اللہ کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو
۲- فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (زمر)	خدا کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو
۳- مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آلِ عمران)	اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم دنیا ہی میں بدلہ دیں گے اور جو آخرت میں طالبِ ثواب ہو اُس کو آخرت میں اجر عطا کریں گے۔
۴- مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (نساء)	جو شخص دنیاوی اجر کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ کے پاس دُنیا وآخرت دونوں کے بدلے ہیں اور اللہ تعالےٰ سُننے اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں سمیع وبصیر کے الفاظ اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ قادر وقدیر خدا تمہارے دلوں کی آواز سُننے والا اور پوشیدہ ارادوں کو جاننے والا ہے۔ لہٰذا اگر عمل دنیاوی منفعت کی نیت سے کیا گیا ہے تو بس دنیا ہی میں اس کا بدلہ دے دیا جائیگا اور آخرت کا انعام تو صرف انہیں کے لیے ہے جو آخرت کے ارادہ سے نیک کام کریں اسی لیے علماء نے فرمایا کہ مومن کا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخلہ اس کے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ حُسنِ نیت کی وجہ سے ہوگا کیونکہ عمل کا تقاضہ تو صرف یہ ہے کہ اسی مقدار میں ثواب دیا جائے جتنا اس کا عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے نیک اعمال کا وزن اور مدت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بدلہ میں خلود فی الجنة کا انعام مل سکے۔ یہ خلود فی الجنة تو در اصل نتیجہ ہے مومن کے اس قصد وارادہ کا کہ اگر اللہ نے مجھے ہمیشہ زندہ رکھا تو ہمیشہ اس کی خوشنودی کے لیے اس کی اطاعت کروں گا۔ چونکہ عزم وارادہ میں ہمیشگی پائی گئی ہے اس لیے اس کے بدلہ میں خلود فی الجنة کا انعام دیا جائے گا۔

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے نیت درست رکھنے اور ریا وسمعہ سے بچنے کی ترغیب کے لیے متعدد اسلوب اختیار فرمائے۔ کہیں فرمایا۔ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ کہیں فرمایا۔ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا دکھاوے کو صدقہ دیا۔ شرک کیا۔ کہیں فرمایا۔ سب سے زیادہ خطرناک چیز جس سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔ پوچھا گیا حضور! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا قیامت کے دن جب اللہ تعالےٰ اپنے بندوں

کے اعمال کی جزاو سزا دے گا۔ تو دکھاوے کی نیت رکھنے والوں سے فرمائے گا۔ انہیں کے پاس جاؤ جنہیں دکھانے کے لیے تم نے فلاں فلاں عمل کیا تھا۔ دیکھیں؟ ان کے پاس تمہیں دینے کے لیے کیا ہے؟ کہیں فرمایا جس نے نیک عمل کا ارادہ کیا اور پھر نہ کر سکا تو محض نیت پر ثواب ملے گا۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ میرا ایک صحابی ایک مد یا نصف مد اللہ تعالٰے کی راہ میں خرچ کرے اور تم (غیر صحابی) سونے کا ایک پورا پہاڑ راہِ خدا میں دے دو تب بھی صحابی کے ایک مد کی برابری نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ سونے کے ایک پورے پہاڑ کے مقابلے میں ایک مد کی حیثیت ہی کیا ہے۔ مگر چونکہ اعمال میں بنیادی اہمیت نیت کی ہے اور اخلاص و نیت میں کوئی بھی صحابی کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس لیے صحابی کا تھوڑا عمل بھی ہمارے بڑے بڑے نیک عملوں کے مقابل عنداللہ کہیں ارفع و اعلیٰ ہو گیا۔

پھر خلوصِ نیت کا تعلق صرف اعمال ہی سے نہیں ہے بلکہ خیالات و جذبات، افکار و معتقدات کے مفید و مقبول ہونے کے لیے خلوصِ نیت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کسی سے بدگمان ہیں یا اس کے مخالف ہیں تو یہ دیکھا جائیگا کہ یہ مخالفت آیا اس لیے ہے کہ یہ اللہ کا نافرمان ہے اور اس جیسے لوگوں سے اللہ نے بدگمانی کا حکم دیا ہے یا یہ بدگمانی اور مخالفت اس لیے ہے کہ اللہ تعالٰے کے حکم سے قطع نظر کر کے ہمیں کسی گروہ کا ساتھ دینا ہے یا کسی شخص کی خوشنودی سے اپنے نفس کی تسکین مقصود ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو بیشک ہماری بدگمانی اور مخالفت نہ صرف حق ہے بلکہ اس پر ثواب کی امید بھی ہے اور اگر دوسری صورت ہے تو یقیناً ہماری یہ مخالفت و بدگمانی گناہ ہے۔ اس لیے ہر عمل، ہر عقیدہ اور ہر جذبہ کو جانچ کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی تہ میں کس حد تک رضائے مولا کی طلب ہے اور کس حد تک کوئی اور جذبہ۔

فسادِ نیت کا انجام

یہی وجہ ہے کہ فسادِ نیت کے باعث بہتر سے بہتر اور افضل سے افضل عمل کرنے والے قیامت کے دن منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور ان کے اعمالِ خیر ان کے لیے وبالِ جان ہو جائیں گے۔ مسلم شریف میں ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ فَاُتِيَ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَقَرَءَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن لوگوں کا فیصلہ اللہ تعالٰے قیامت کے دن سب سے پہلے کرے گا ان میں ایک شخص تو وہ ہوگا جسے اللہ کی راہ میں شہید کیا گیا۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالٰے فرمائیگا۔ یہ یہ نعمتیں ہم نے تمہیں دیں۔ وہ جواب دے گا بیشک دی تھیں۔ اللہ کہے گا پھر تو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا میں تیری خاطر لڑا۔ یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالٰے فرمائیگا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری خاطر تو کہاں لڑا بلکہ تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں۔ پس لوگوں نے بہادر

فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ۔

(مشکوٰۃ، کتاب العلم)

کہا اور تجھے تیرا انعام مل گیا ۔ پھر اللہ تعالے اس کے بارے میں حکم صادر فرمائے گا اور اُسے منہ کے بل کھینچ کر آگ میں ڈال دیا جائیگا ۔۔ اور ایک شخص وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھلایا اور قرآن پڑھا ۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ کہے گا ۔ یہ یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں وہ کہے گا بیشک دی تھیں اور اللہ فرمائیگا ۔ پھر تو نے ان کی سپاس گزاری کیا کیا؟ وہ کہے گا میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں تک پہنچایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا اور اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے علم تو نے اس لیے سیکھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور تلاوت قرآن اس لیے کی تھی کہ لوگ تجھے قاری کہیں ۔ پس انھوں نے کہا اور تیرا اجر تجھے مل گیا ۔ پھر اللہ تعالے اس کے بارے میں حکم صادر فرمائے گا اور اسے منہ کے بل کھینچ کر آگ میں جھونک دیا جائیگا اور ایک شخص وہ ہوگا جس پر اللہ نے روزی کو کشادہ کیا اور ہر قسم کا مال و متاع اسے عطا کیا ۔ یہ لایا جائیگا اور اللہ تعالے فرمائیگا ۔ یہ نعمتیں ہم نے تجھے دی تھیں ۔ وہ کہے گا بیشک دی تھیں ۔ اللہ کہے گا پھر تو نے ان کی سپاس گزاری میں کیا کیا؟ وہ کہے گا ۔ میں نے ہر اُس میں مال خرچ کیا جس میں خرچ کرنا آپ پسند کرتے ہیں ۔ اللہ تعالے فرمائے گا تو دروغ گو ہے میری پسند کے خیال سے کہاں ۔ تو نے تو اس لیے مال خرچ کیا کہ لوگ تجھے سخی کہیں ۔ پس انھوں نے کہا اور تیرا اجر تجھے مل گیا ۔ پھر اللہ تعالے اس کے بارے میں حکم صادر کرے گا اور اُسے منہ کے بل کھینچ کر آگ کے حوالے کر دیا جائیگا ۔

غور تو کیجئے! جہاد جیسا عمل خیر، شہادت جیسی جلیل القدر نعمت، تعلیم و تعلّم جیسا پاکیزہ مشغلہ، صدقہ و خیرات جیسا نفیس کام اللہ کی خوشنودی کی بجائے دنیا کی ناموری اور شہرت کے جذبہ نے مسخ کر دیا ۔ صرف اتنی سی بات پر کہ دل کے بہادر کہلانے کا شوق تھا ۔ عالم مشہور ہونے، قاری اور سخی پکارے جانے کی تمنا تھی ۔ سب کچھ اکارت گیا اور آگ میں جلنا پڑا ۔

اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور تمام عقائد و اعمال، جذبات و عبادت کا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ان کی تہ میں حد درجہ کا خلوص اور رضاء الٰہی کے حصول کی نیت کار فرما ہو ۔ نیت کی مثال بیج کی طرح ہے اور اعمال و افعال گویا زمین میں جوتنے اور پانی دینے کے درجہ میں ہیں ۔ ہم عمل تو کریں دنیا کو دکھانے کے لیے اور امید رکھیں انعام آخرت سے نوازے جانے کی تو یہ بالکل ایسے ہی ہے

جیسے بوئیں تو تھوہر اور نیم کے بیج مگر امید لگائیں کھجور اور آم کے پیدا ہونے کی۔

تو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے آغاز ہی میں حدیث انما الاعمال ذکر فرما کر اسلام کے اس بنیادی مسئلہ کو بیان فرمایا ہے کہ تمام اعمال وعقائد کے مفید ہونے کا مدار خلوصِ نیت پر ہے۔ نیت میں خلوص اور للّٰہیت ہے تو عمل عنداللہ مقبول اور باعثِ اجر وثواب ہے ورنہ ریا وسمعہ کی آمیزش اچھے سے اچھے عمل کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے

حدیث انما الاعمال کے مسائل اور ائمہ کا اختلاف

ائمہ ثلاثہ: امام شافعی، امام مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالے علیہم نے اسی حدیث سے وضو اور غسل میں نیت کو فرض قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ الاعمال میں الف لام استغراقی ہے تمام اعمال، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، وضو کو شامل ہے۔ لہٰذا ان سب میں نیت فرض ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک تقدیر حدیث یہ ہے کہ "صحۃ الاعمال بالنیات" اعمال کی صحت نیتوں سے ہے۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے وضو کرلیا تو ان ائمہ کے نزدیک صحیح نہ ہوگا اور نماز اس سے جائز نہ ہوگی۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالے عنہ نے اسی حدیث سے وضو میں نیت کو سنت قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تقد حدیث یہ ہے: ثواب الاعمال لایکون الا بالنیۃ۔ عملوں کا ثواب بغیر نیت کے نہیں ملے گا۔ لہٰذا مسئ یہ ہوا کہ اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے غسل یا وضو کرلیا تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک اس کا غسل وضو صحیح ہوگیا اور اس غسل ووضو سے نماز بھی صحیح ہوگی البتہ غسل اور وضو کا ثواب اس وقت ملے گا۔ جب کہ نیت عبادت کرے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالے علیہ فرماتے ہیں کہ جن کاموں سے ثواب متعلق ہوتا ہے وہ دو قسم پر ہیں۔

عبادات مقصودہ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ عبادات مقصودہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت جو کسی دوسری عبادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو۔ اس کا مقصود ہی ثواب ہو۔ اگر ثواب کو اس سے علیحدہ کرلیا جائے تو اس کا مقص ہی فوت ہوجائے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجیے۔ یہ عبادتِ مقصودہ ہے۔ اس کا مقصد ہی ثواب ہے اور یہ کسی دوسر

عبادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ نہ ہو۔ اس کا مقصود ہی ثواب ہو۔ اگر ثواب کو اس سے علیحدہ کرلیا جائے تو اس کا مقص ہی فوت ہوجائے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجیے۔ یہ عبادتِ مقصودہ ہے اس کا مقصد ہی ثواب ہے اور یہ کسی دوسری

کے لیے ذریعہ یا آلہ نہیں ہے۔ جب بھی نماز کے افعال ادا کیے جائیں گے۔ ثواب اس کے ساتھ ضرور متعلق ہوجا گا تو چونکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی حقیقت ہی ثواب ہے۔ اس لیے ان میں نیت فرض ہے۔ نیت کے بغیر چاہے آپ لاکھ نمازیں پڑھیں بیکار ہیں۔

اس کے برعکس عبادات کی دوسری قسم عبادات غیر مقصودہ ہیں جن کی حقیقت ثواب نہیں ہوتی بلکہ وہ عبا مقصودہ کے لیے ذریعہ اور آلہ ہوتی ہیں۔ اگر ثواب کو ان سے علیحدہ بھی کرلیا جائے تو بھی وہ عبادات مقصودہ کے لی آلہ رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر وضو وغسل کو لیجیے۔ فی نفسہٖ ان کی حقیقت محض ثواب نہیں ہے بلکہ وضو ذریعہ بنتا ہے کا یعنی اصل چیز نماز ہے اور وضو نماز کے لیے آلہ اور ذریعہ ہے تو اگر بغیر نیت کے وضو کرلیا جائے تو وضو صحیح

ہو جائے اور نماز کے لیے آلہ بن جائیگا گو ثواب نہیں ہوگا۔

ممکن ہے قارئین کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نیت اور عدم نیت کا یہ اختلاف فضول معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو شخص وضو و غسل کرتا ہے ارادہ ہوتا ہے جبھی تو کرتا ہے اور یہ ارادہ ہی نیت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ کسی کام کو ثواب کی نیت سے کرنا اور یہ اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ ثواب کی نیت کی جائے

فرض کیجئے زید بے وضو ہے۔ اتفاقاً بارش ہوگئی اور اس کے تمام اعضائے وضو بارش کے پانی سے دھل گئے تو ایسی صورت میں زید کا قصد نہیں ہے مگر وضو ہوگیا اور امام اعظم کے نزدیک اس وضو سے نماز جائز ہوگی لیکن امام شافعی کے نزدیک چونکہ نیت نہیں پائی گئی۔ اس لیے وضو درست نہ ہوا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ تیمم بھی عبادتِ غیر مقصودہ ہے حالانکہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک تیمم بغیر نیت کے درست نہیں ہوتا تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تیمم میں جو نیت فرض ہے وہ حصولِ ثواب کے لیے نہیں ہے بلکہ تیمم کو وضو کے قائم مقام کرنے کے لیے ہے اس لیے تیمم میں نیت فرض ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمہ اسی حدیث سے طلاق، عتاق اور تمام اعمال میں نیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحتِ اعمال شرع میں نیت پر موقوف ہیں۔ لہٰذا تمام اعمال وغیرہ خواہ وہ اقوال ہوں یا افعال۔ فرض ہوں یا نفل۔ سب کے سب درست اور شرعاً معتبر ہونے کے لیے نیت ضروری ہے۔ پس اگر کسی شخص نے بغیر نیت کے بیوی کو طلاق دیدی تو ان کے نزدیک یہ طلاق واقع نہ ہوگی۔ لیکن حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ حدیث انما الاعمال بالنیات کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ اعمال کا وجود نیت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی حالانکہ یہ معنی بالاجماع متروک ہیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ اعمال کا وجود بغیر نیت کے پایا جاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ بہت سے اعمال ایسے ہیں جن کو شریعت نے بغیر نیت کے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً قرض ادا کرنا، ودیعت واپس کرنا، اذان، تلاوت قرآن مجید، درود وظائف، ہدایۃ الطریق اور راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا وغیرہ۔ وذالک افعال سب کے سب عبادات ہیں اور بغیر نیت کے صحیح ہو جاتے ہیں تو اسی طرح طلاق عتاق بغیر نیت کے صحیح ہونے چاہئیں۔ دوسرے طلاق صریح لفظ ہے اور صریح میں نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تحقیقِ مقام

یہ ہے کہ حدیث انما الاعمال کے ظاہری معنی تو بالاجماع مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہیں اور یہ کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کا حکم نیت پر موقوف ہے۔ اب حکم دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جس کا تعلق آخرت سے ہے اور وہ ثواب ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو دُنیا سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل جائز ہوا یا مکروہ، فاسد ہوا یا حرام۔ حکم کی یہ دونوں قسمیں آپس میں متضاد ہیں۔ کیونکہ اول کی بنیاد صدقِ ارادہ اور خلوصِ نیت پر ہے۔ اگر نیت پائی گئی تو ثواب پایا جائیگا ورنہ نہیں اور دوسری کا مبنی یہ ہے کہ اس عمل کے ارکان و شرائط پائے گئے یا نہیں تاکہ اس کی صحت یا عدم صحت کا حکم کیا جائے خواہ اس میں نیت ہو یا نہ ہو تو جب لفظ حکم دو قسم پر مشتمل ہوا تو یہ بحسبِ وضع کے مشترک ہوگیا اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ مشترک میں عموم نہیں ہوتا۔

یعنی لفظ مشترک کے دونوں معنی ایک دم لینا جائز نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ بھی مجاز میں عموم کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں دونوں میں سے ایک معنی لینا لازم ہے۔ لہٰذا امام شافعی نے نوعِ ثانی کو اختیار کر لیا۔ اس بنیاد پر کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپ اعمال کی صحت و فساد، حلال و حرام کے متعلق حکم صادر فرمائیں۔ اس لیے انھوں نے حدیث انما الاعمال کے معنی یہ کیے کہ صحتِ اعمال نیت پر موقوف ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ نے نوعِ اول کو اختیار فرمایا اور تقدیرِ حدیث یہ قرار دی کہ اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔ نوعِ اول کو اختیار کرنے کی ان کے پاس دو دلیلیں ہیں جو نہایت معقول ہیں۔ اول یہ کہ یہ بات تو بالاتفاق تسلیم ہے کہ نیت کے بغیر ثواب نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں اگر صحت کو بھی مراد لے لیا جائے تو مشترک میں عموم لازم آئے گا جو باطل ہے۔ دوم یہ کہ ثواب کو مقدر ماننے میں یہ فائدہ ہے کہ یہ ثواب اپنے عموم پر باقی رہتا ہے اور کسی بھی نوع میں اس کی تخصیص کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ یہ بالاجماع ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثواب اعمال نیت ہی پر موقوف ہیں۔ اس کے برعکس اگر صحت کو لیا جائے تو اس میں لامحالہ تخصیص کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس میں بعض اعمال مثلاً نکاح، بیع و شراء وغیرہ کی صحت بلانیت بھی بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے۔

غرضکہ شوافع صحیح مقدر مانتے ہیں جس سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے کہ بلانیت کے وضو سے نماز درست نہ ہو اور احناف ثواب مقدر مانتے ہیں تو اس سے اس رائے کو مدد ملتی ہے کہ بلانیت کے وضو پر ثواب تو نہ ملے گا لیکن اس وضو سے نماز درست ہو جائے گی۔ چنانچہ یہ بدیہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص بدن کو پاک کرے یا صاف لباس پہنے اور مقصود صرف فرحت حاصل کرنا اور صاف پوشی ہو۔ بدن کو نجاست سے پاک کرتے وقت اور تبدیلِ لباس کے وقت یہ تصور بھی نہ ہو کہ دونوں کام نماز پڑھنے کی نیت سے کیے جا رہے ہیں۔ پھر نماز کا وقت آ جائے اور وہ شخص وضو کر کے نماز پڑھ لے تو بتائیے نماز ہو گی یا نہیں تو ظاہر ہے کہ شوافع بھی یہ کہیں گے کہ نماز ہو جائے گی تو ہم کہیں گے کہ جیسے بدن اور لباس کی پاکی نماز کے لیے شرط ضروری ہے اور وہ نیت کے بغیر ہو سکتی ہے تو اسی طرح وضو بھی ایک شرط ہے۔ جسے نیت کے بغیر معتبر ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پانی طاہر و مطہر (پاک اور پاک کرنے والا ہے) قرآن کریم نے ماءً طہوراً فرمایا ہے تو پانی سے بدن یا کپڑا جو کچھ بھی دُھلے گا خود بخود پاک ہو جائے گا۔ نیت ہو یا نہ ہو۔ یہی حال وضو کا ہے کہ پانی چونکہ اصلاً طاہر و مطہر ہے اس لیے بلانیت کے وضو سے بھی وہ پاکی حاصل ہو جائے گی جو نماز کے لیے شرط ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد پر امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اور ائمہ ثلاثہ کے مابین متعدد مسائل میں اختلاف ہو جاتا ہے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

۲- زیرِ تفہیم حدیث سے متعلق یہ امر بھی قابلِ وضاحت ہے کہ جب حدیث میں "الیٰ دنیا" آ گیا تو

تو اس میں عورت بھی آگئی - پھر "الی امراۃ" فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ علامہ قسطلانی و دیگر شارحین نے جواب دیا چونکہ عورت ہی دنیا میں سب سے زیادہ فتنہ و فساد کا سبب بنتی ہے - لہٰذا تخصیص بعد التعمیم کے طور پہ اسے خصوصیت سے ذکر کردیا جیسا کہ قرآنِ کریم میں لفظِ ملائکہ کے بعد جبرئیل کا ذکر آیا ہے اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا -

مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرُّجُلِ مِنَ النِّسَآءِ (عینی جلد ۱ صـ ۳۲)

میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر فتنہ انگیز چیز کوئی نہیں چھوڑی -

تو اگرچہ لفظِ دنیا میں عورت آگئی تھی مگر خصوصی تنبیہ کے طور پہ عورت کا پھر ذکر فرمادیا - ظاہر ہے کہ یہ توجیہ یک طرفہ ہے اور سوال تو پھر بھی باقی رہتا ہے کیونکہ دنیا میں جو چیز فتنہ و مصیبت کا سبب بنتی ہے وہ صرف عورت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ مال و دولت اور اولاد بھی ہے جس کا ذکر خود قرآنِ حکیم نے کیا ہے پھر عورت مطلقاً ایسی چیز نہیں ہے جو فتنہ و فساد کی جڑ بنے - حدیث میں یہ بھی تو ہے کہ عورت صالح ہو تو دنیا کی بہترین متاع ہے اور یہ بھی کہ اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْءَةُ الصَّالِحَةُ دنیا پوری کی پوری سرمایہ ہے اور اس سرمایہ کا سب سے بہترین حصہ صالح عورت ہے -

بعض شارحین نے یہ جواب دیا کہ یہ حدیث مہاجر ام القیس کے متعلق آئی - مدینہ میں قیلہ نامی ایک عورت تھی جن سے ایک صاحب نے نکاح کرنا چاہا تو قیلہ نے کہا مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آؤ تو نکاح منظور ہے چنانچہ انھوں نے ہجرت کرکے نکاح کرلیا - لوگ انھیں مہاجر ام القیس کہنے لگے لہٰذا حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کے طور پر خصوصاً عورتوں کا ذکر بھی فرمادیا -

۴ - اب رہی یہ بات کہ عملِ مخلوط یعنی ایسے عمل کا کیا حکم ہے جس میں دین و دنیا دونوں کی غرضیں مل جل گئی ہوں - مثلاً ایک شخص حج کے لیے جاتا ہے اور تجارتی منفعت کا بھی کوئی پہلو اس کے پیش نظر ہے تو ثواب ملے یا نہیں - واضح ہو کہ اصطلاح شرع میں خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے کو نیت کہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ بعض وہ اعمال و افعال جو عبادت نہیں ہیں اگر ان کے کرنے والا قربۃ کی نیت کرلے تو ان پر بھی ثواب ملتا ہے چنانچہ عمل کی چند صورتیں ہیں :-

۱ - عمل کا باعث اور اصل محرک صرف دنیا ہے تو ثواب نہیں ملے گا -

۲ - عمل کا باعث تو صرف اُخروی ہے مگر ضمناً کوئی دنیوی منفعت بھی ملحوظ ہے تو یہ عمل عبادت ہی سمجھا جائیگا - البتہ یہ ضرور ہے کہ جس نسبت سے دنیاوی نیت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب میں کمی ہوجائیگی -

۳ - پھر اس میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد جو عبادت کے ساتھ ملایا گیا وہ حلال ہے یا حرام - اگر حرام ہے تو عمل ضائع ہوجائے گا اور اگر حلال ہے تو بقدرِ نیت دنیاوی ثواب کم ہوکر رہ جائیگا -

۴ - اور اگر عمل کا اصل محرک صرف رضائے الٰہی ہے اور ضمناً بھی کوئی دنیاوی منفعت ملحوظ نہیں ہے تو ہر عمل

اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور ثوابِ کامل اس پر دیا جائیگا۔ اب آگے مثالیں لیجیے۔

ایک شخص حج کے لیے روانہ ہوا۔ عزم و ارادہ تو فریضہ حج کی ادائیگی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ موقع ملا تو تجارت بھی کروں گا اور عزیز و اقارب سے بھی مل لوں گا تو اس کا یہ فعل عبادت ہی قرار پائے گا۔ قرآن حکیم میں اس کے متعلق فرمایا:۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے خیال کیا کہ راہِ حج میں جس نے تجارت کی اس کا حج ہی کیا، جس پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ راہِ حج میں تجارت کرنا مباح ہے جس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ عملِ مخلوط میں یہ دیکھنا پڑے گا کہ دوسرا مقصد حرام ہے یا حلال۔ اگر حرام ہے تو عمل بھی ضائع ہو جائے گا جیسے حج کرنے والا یہ نیت بھی کرے کہ حج کر کے حاجی کہلاؤں گا اور دوسروں کی نگاہوں میں عزت و جاہ حاصل کروں گا تو چونکہ ریا و سمعہ حرام ہے اس لیے یہ حج بھی ضائع ہو جائے گا اور اگر دوسرا مقصد حلال ہے تو بقدرِ حصہ ثواب مل جائے گا۔ مثلاً حج ہی کو لے لیجیے کہ نیت تو حج کی ہے مگر اس کے ساتھ تجارت کا بھی خیال ہے تو تجارت چونکہ حلال ہے اس لیے ثوابِ حج تو ملے گا مگر چونکہ اس میں تجارت کی نیت بھی ہے تو جس نسبت سے دنیاوی نیت شامل ہے اسی نسبت سے ثواب کم ہو کر ملے گا۔ بہر حال یہ نیت کا معاملہ ایسا ہے کہ عمل میں جس قدر زیادہ خلوص ہوگا۔ اسی قدر ثواب میں زیادتی ہوگی اور خلوص میں جس قدر کمی ہوگی ثواب میں بھی کمی ہو جائے گی اور سب سے برتر و بالا عمل وہی ہے جس میں شروع سے لے کر آخیر تک حسنِ نیت یکساں قائم رہے اور ضمناً بھی کسی دُنیاوی منفعت کا خیال تک نہ ہو۔

نزولِ وحی کی کیفیت۔ وحی کی حقیقت اور اس کے اقسام

حدیث نمبر۲۔ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَاْتِيْكَ الْوَحْيُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہے کہ حارث بن ہشام نے پوچھا۔ یا رسول اللہ۔ آپ پر وحی کیونکر آتی ہے۔ فرمایا کبھی گھڑیال کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دُور ہو جاتی ہے در آنحالیکہ میں اس سے مفہوم اخذ کر لیتا ہوں اور کبھی وہ فرشتہ (جبریل) میرے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وحی اُترنے کی

مُنِيْ فَأَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا

کی حالت میں میں نے آپ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک سے پسینہ بہتا تھا۔

(بخاری)

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے باب بدء الخلق میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے فضائل میں۔ ۲۔ حضرت حارث بن ہشام حضرت خالد بن ولید کے چچازاد بھائی تھے۔ بحالتِ کفر جنگِ بدر اور اُحد میں شریک ہوئے۔ پھر فتح مکہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ام ہانی نے حضرت حارث کو امان دی تھی حضرت علی انھیں قتل کرنا چاہتے تھے۔

حضرت ام ہانی نے بحضورِ نبوی عرض کی۔ سرکار حضرت علی ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کو میں امان دے چکی ہوں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کو تم نے امان دی اس کو ہم نے امان دی۔ یہ سن کر حضرت علی بھی دستکش ہو گئے۔

حضرت حارث کے بتیس صاحبزادے تھے۔ جن میں سے ابوبکر مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت حارث نہایت مہمان نواز، شریف اور سخی تھے۔ عہدِ فاروقی میں مکہ معظمہ سے شام کی طرف اس عزم سے روانہ ہوئے کہ باقی عمر جہاد میں صرف کر دوں گا۔ ماہِ رجب ۱۵ھ جنگِ یرموک میں شہید ہوئے (استیعاب)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات پر لفظ ام المومنین کا اطلاق، قرآنِ مجید کے ارشاد اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ سے ماخوذ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دوسری مقدس بی بی ہیں۔ آپ کا نام عائشہ اور کنیت ام عبداللہ ہے۔ آپ کی کنیت ام عبداللہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی رکھی تھی۔ جب کہ آپ کے بھانجے عبداللہ بن زبیر کو بغرض تحنیک بحضورِ نبوی پیش کیا گیا تو حضور نے فرمایا۔ یہ عبداللہ ہے اور تم ام عبداللہ (فتح الباری)

والد کا نام امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہے اور والدہ کا نام ام رومان زینب بنت ہے جن کا انتقال ۶ھ میں ہوا۔

حضرت عائشہ بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں۔ نبوت کے دسویں سال حضور علیہ السلام کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ آپ کی عمر شریف اس وقت ۶ سال کی تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم کی وساطت سے نکاح ہوا۔ چار سو درہم مہر مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد حضور علیہ السلام تین سال مکہ میں مقیم رہے۔ سنہ ۱ ہجری میں جب آپ نے ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر ساتھ تھے۔ اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے۔

جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عیال کو مدینہ بلا لیا۔ حضور علیہ السلام نے بھی حضرت فاطمہ، ام کلثوم اور حضرت سودہ وغیرہ کے لانے کے لیے حضرت عبداللہ بن اریقط کو بھیج دیا۔ ماہ شوال میں ۹ سال کی عمر میں رخصتی ہوئی۔

وفات: حضرت عائشہ صدیقہ نے ۹ سال تک حضور علیہ السلام کے ساتھ زندگی بسر کی۔ جب حضور علیہ السلام کا وصال ہوا تو آپ کی عمر شریف ۱۸ سال تھی۔ حضور علیہ السلام کے بعد حضرت عائشہ ۴۸ سال زند زندہ رہیں اور ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۶ سال تھی۔ وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ اس وقت مروان بن حکم کی طرف سے حاکم مدینہ تھے۔ انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

فضائل ازواج مطہرات میں حضرت ام المومنین سیدہ عفیفہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے فضائل مناقب، آپ کا ورع تقویٰ، علم وفقہ اور اجتہادی بصیرت اتنی اعلیٰ ہے کہ جس کے بیان کے لیے دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ آپ ام المومنین ہیں۔ آپ سے حضور علیہ السلام کی بہت محبت تھی۔ اسی محبت کی وج آپ نے اپنے مرض وفات میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لے کر اپنی مقدس زندگی کے آخری ایام عائشہ کے نوری حجرہ میں بسر فرمائے۔ اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا۔ ان کے متعلق احادیث و کثیر واقعات ہیں جو بوجہ اختصار چھوڑے جا رہے ہیں —— حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خود تحدیث نعمت کے طور پر فرماتی ہیں۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے نو خوبیاں ایسی عطا فرمائی ہیں جو کسی عورت کو نہ ملیں۔

۱۔ عقد سے پیشتر میری تصویر حضرت جبریل امین نے بحضور نبوی پیش کی (یہ تصویر قدرتی تھی کسی انسان ک بنائی ہوئی نہ تھی ۲۔ حضور علیہ السلام نے بجز میرے کسی اور کنواری عورت سے نکاح نہیں فرمایا ۳۔ میں آپ خلیفہ اور صدیق کی صاحبزادی ہوں ۴۔ مجھ کو پاکیزہ کے گھر پاکیزہ پیدا فرمایا ۵۔ بوقت وصال حضور علیہ السلام سر اقدس میری گود میں تھا ۶۔ حضور میرے گھر میں دفن ہوئے ۷۔ حضور میرے گھر میں ہوتے تو بھی وحی نازل ہو تھی ۸۔ مجھ سے اللہ تعالےٰ نے مغفرت اور رزق کریم کا وعدہ فرمایا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيمٌ ۹۔ میری برأت آسمان سے نازل ہوئی —— بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام پر تہم رکھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک شیرخوار بچے کی زبان سے آپ کی برأت ظاہر فرمائی۔ حضرت مریم کو مطعون کیا گیا ان کے صاحبزادے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بحالت شیرخوارگی آپ کی برأت کا اظہار فرمایا گیا جب منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو متہم کیا تو اللہ تعالےٰ نے آپ کی برأت کسی ن کسی نبی کی زبان سے نہیں کرائی بلکہ اپنے محبوب کی زوجہ محترمہ کی خود برأت فرمائی اور سورہ نور نازل فرما کر حض عائشہ صدیقہ کی پاکدامنی پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔

علمی زندگی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہ علم وفضل کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالٰے علیہم کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں۔ اکابر صحابہ آپ کے و فضل کے معترف تھے اور مسائل میں آپ سے استفسار کرتے تھے۔ آپ سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۱۷۴ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ بخاری نے ان سے منفرداً ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۶۸ حدیثیں امام مسلم نے منفرد طور پہ روایت کی ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ کا ایک چوتھائی حصہ حضرت عائشہ صدیقہ سے منقول ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ صحابہ کو جب کوئی مشکل سوال پیش آتا تو اس کو حضرت عائشہ صدیقہ ہی حل کرتی تھیں۔ تفسیر حدیث، اسرارِ شریعت، خطابت، ادب اور انساب میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

مختصر یہ کہ ایک مسلمان کے لیے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت عائشہ، حضور علیہ السلام کی محبوب بی بی ہیں۔ ام المومنین ہیں۔ صدیق اکبر کی صاحب زادی ہیں اور حضور علیہ السلام سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰے عنہ کے داماد یعنی صدیق وہ ہیں جن کے داماد کرم رسول، نہ صرف رسول بلکہ رسولوں کے رسول اور اللہ کے محبوب اور خاتم النبیین ہیں۔ سبحان اللہ!

حضور اکرم کی ازواج ام المومنین ہیں

بخاری و کتبِ حدیث میں ازواج مطہرات کے ساتھ ام المومنین کا لفظ بھی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواج کو مومنوں کی مائیں قرار دیا ہے اور حضور علیہ السلام کی ازواج کی فضیلت دراصل خود حضور علیہ السلام کی فضیلت کا ایک شعبہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ	اے نبی کی بیبیو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو

النساء میں الف لام جنسی ہے۔ لفظ احد بھی موجود ہے جیسے لَمْ يَكُنْ كُفُوًا اَحَدٌ میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ رسول کا درجہ و مقام ہر عورت سے بالاتر ہے —— البتہ یہ ظاہر ہے کہ ازواجِ رسول جملہ احکام میں مسلمانوں کی مائیں نہیں ہیں ورنہ امتیوں سے پردہ کیوں ہوتا؟ ہاں چونکہ بے حد معظم و محترم ہوتی ہیں اور کسی طرح غلط خیالات و جذبات ان کے بارے میں انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتے اس لیے بطور تعظیم و تکریم ازواجِ رسول کو امہات المومنین فرمایا گیا۔

اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ (قرآن کریم)	اے محبوب! ہم نے تمہاری ازواج کو تمہارے لیے حلال کر دیا

اس آیت سے یہ فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام کی بیویوں کا ازواج النبی ہونا بمنظوری ربّ العلمین ظاہر ہے کہ یہ منظوری فی الواقع ان کے لیے فضیلتِ عظیم ہے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ	اے ایمان والو! تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ تم رسول کو ایذا دو اور یہ بھی جائز نہیں کہ رسول کے بعد ان کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کرو۔

اس آیت میں ان کی حرمتِ دوام کا اعلان ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ پہلے اس آیت میں حضور علیہ السلام کو

ایذا دینے سے روکا گیا۔ اس کے بعد حقوقِ ازواج بیان کیے۔ جس سے ثابت ہوا کہ ایذائے رسول کے جس قدر اقسام ہو سکتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ سخت صورت وہ ہوگی جس میں حضور علیہ السلام کی ازواج کی شان کے خلاف کوئی رویہ اختیار کیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ اس آیت میں ایذاء رسول کے تحت بخصوصیت سے اسی جزئی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۴۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّہٰتُہُمْ

مومنین سے نبی ان کی جانوں سے بڑھ کر نزدیک ہے اور نبی کی ازواج مومنوں کی مائیں ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ازواجهم وانفسهم کی ضمیر مومنین کی طرف ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ ازواج النبی کا لقب امہات المومنین ہے نہ کہ امہات الامت، لفظِ مومنین کے استعمال کا راز یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے

اوّل۔ مومن وہ ہے جو نبی علیہ السلام کو اپنی جانِ شیریں سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دوم۔ مومن وہ ہے جو ازواج النبی کو اپنی ماں جانتا ہے وہ ماں نہیں جس سے جسمِ عنصری کا ظہور ہوا بلکہ وہ ماں جس کی فرزندی کا شرف اس کو ملتا ہے جس کو (ولاء) محبتِ نبی اور ایمان میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

تشریح الفاظِ حدیث

سؤال: اگر بوقتِ وحی حضرت عائشہ موجود تھیں تو حدیث ہذا مسند قرار پائے گی۔ اسی بناء پر بعض علماء نے حدیث ہذا کو حضرت عائشہ کے مسند میں تخریج کیا۔ اگر موجود نہ تھیں بلکہ حضرت حارث نے انہیں جواب وسوال کی خبر دی تو حدیثِ ہذا مرسل صحابی ہے جو جمہور کے نزدیک مسند کے حکم میں ہے چنانچہ مسند امام احمد و معجم بغوی وغیرہ سے احتمالِ ثانی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان میں عن عائشہ عن الحارث بن ہشام قالت سالت کے الفاظ ہیں مگر احتمالِ اوّل مشہور ہے۔

کیف یاتیک الوحی۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ فرمایا دو طرح۔ ایک تو مانندِ آوازِ جرس کا آنا دوم فرشتہ کا انسانی شکل میں آکر کلام کرنا۔

سوال۔ حضور علیہ السلام کے اس جواب میں وحی کی کیفیت کا بیان ہے۔ ابتداء وحی کی کیفیت کا بیان نہیں ہے اور ترجمۃ الباب ابتداء وحی کی کیفیت ہے لہٰذا یہ حدیث ترجمۃ الباب کے مطابق نہیں۔

جواب۔ ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ حدیث میں اتیانِ وحی کی دو صورتوں کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ ابتداء وحی کی کیفیت انہیں دو صورتوں میں سے ایک ہوگی لہٰذا حدیثِ ہذا ترجمہ کے مطابق ہے۔

سوال۔ سائل نے وحی کی کیفیت دریافت کی تھی۔ حاملِ وحی کی صفت دریافت نہیں کی تھی اور جواب میں حا وحی کی صفت کا بھی بیان ہے کہ کبھی فرشتہ بشکلِ انسانی حاضر ہو کر کلام کرتا تھا۔ لہٰذا جواب سوال کے مطابق نہ

جواب۔ اگر کسی سوال کے جواب میں سوال سے زائد امور کو بھی بیان کر دیا جائے تو ایسے جواب کو سوال کے غیر مطابق نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ یہ جواب مع الزیادۃ کہلاتا ہے۔ جواب میں اضافہ نکتے پر مبنی ہوتا ہے دیکھے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا تمہارے ہاتھ میں کیا ہے عرض کی ھی عصای یہ میرا عصا ہے جواب

تو اسی جملہ پر ختم ہوگیا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کے مزید فوائد بھی عرض کر دیے۔

تَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ
لِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى

(قرآن مجید)

میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں۔ اپنی بکریوں کے لیے درخت سے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے اس میں دوسرے کام بھی ہیں۔

دیکھیے جواب موسوی میں یہ اضافے اس نکتہ پر مبنی ہیں کہ آپ نے عصا کے فوائد کا اضافہ بطور شکر کیا کیونکہ نعمتوں کا شمار بھی شکر ہے ـــــ اسی طرح حضور علیہ السلام نے بھی جواب میں اضافہ اظہارِ شکر کے لیے کیا کہ بشکلِ انسانی فرشتہ کا وحی لے کر آنا بھی نعمتِ عظیمہ ہے یا آپ نے بھی جواب میں اضافہ اس لیے فرمایا کہ صفتِ وحی کے بیان کے بعد سائل کے ذہن میں حاملِ وحی کے متعلق بھی سوال پیدا ہوتا تو حضور علیہ السلام نے پہلے ہی سے حاملِ وحی کی صفت بھی بیان فرما دی تاکہ سائل کو سوال کی زحمت ہی نہ ہو۔

صلصلة مسلسل اور متصل آواز کو کہتے ہیں اور جرس گھڑیال کو جو اسکولوں اور دفاتر وغیرہ میں چھٹی کے وقت بجایا جاتا ہے اس پر جب ضرب پڑتی ہے تو آواز میں گونج ہوتی ہے۔ اسی طرح بلا تمثیل حضور علیہ السلام کو غیب سے آواز آتی تھی نہ کوئی صورت نظر آتی اور نہ یہ کلام صریح ہوتا۔ سمجھانے کے لیے اس غیبی آواز کو بانگِ جرس سے تشبیہ دی گئی۔ چنانچہ اسی مقصد کے وحی کی دوسری قسم یہ بیان فرمائی کہ لانے والا فرشتہ مجسم ہو کر سامنے آجاتا تھا اور باتیں کرتا تھا۔

وھو اشدہ علیّ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ صلصلة الجرس والی وحی بہت شدید و ثقیل ہوتی تھی اور دوسری قسم کی وحی میں اتنی شدت نہیں ہوتی۔ اس کی اصل وجہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ پھر فکرِ انسانی میں طاقت ہی کہاں ہے کہ وہ ناقابلِ تشریح امور کی حقیقت و ماہیت کو پا سکے۔ البتہ یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ صلصلة جرس والی وحی آواز جرس کی طرح ایک کلام تھا۔ اس لیے اس کا دشوار و سخت ہونا قدرتی بات ہے۔ اس لیے اس نوع کی وحی میں آپ دشواری محسوس فرماتے ہوں گے اور دوسری صورت میں تو فرشتہ متشکل ہو کر کلام صریح پیش کرتا تھا۔ اس لیے اس میں وہ دشواری نہ ہوتی ہوگی۔

فیفصم عنی۔ فصم کے معنی قطع ہونے، جدا ہونے کے ہیں وقد وعیت عنہ کے معنی جمع کرنے، حفظ کرنے اور سمجھنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب جرس کی طرح مسلسل آواز آتی تو پھر وہ منقطع ہو جاتی تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے مطلب اخذ فرما چکے ہوتے تھے۔

یتمثل لی الملك یہ وحی کی دوسری کیفیت کا بیان ہے کہ کبھی فرشتہ بشکلِ انسانی حاضر ہو کر کلام کرتا۔ ملک سے مراد جبریل امین ہیں۔ رجلا سے معلوم ہوا کہ جبریل امین مردانہ شکل میں حاضر ہوتے تھے ـــــ اس حدیث سے فرشتہ کا وجود ثابت ہوا۔ یہ نورانی مخلوق ہے اور کسی بھی شکل و صورت میں آ سکتی ہے۔ حضرت جبریل امین عموماً حضرت دحیہ صحابی کی شکل میں حاضر ہوتے تھے اور کبھی کسی اعرابی کی صورت میں۔

فائدہ علامہ قسطلانی نے بحوالہ تفسیر ابن عادل لکھا کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کو
حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں بارہ مرتبہ
حضرت ادریس علیہ السلام کی خدمت میں چار مرتبہ
حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں پچاس مرتبہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں بیالیس مرتبہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں چار سو مرتبہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں دس مرتبہ اور
حضور سید عالم نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں چوبیس ہزار مرتبہ باریابی کا شرف حا

۲۔ اس حدیث میں وحی کی دو صورتوں کا بیان ہے مگر مقصود حصر نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کو ان صو
کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی چونکہ ان دو طریقوں سے اکثر و بیشتر وحی سے نوازا جاتا تھا۔ اس لیے ان دو صورتو
خصوصیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

۳۔ وحی کی دو صورتیں اس حدیث میں بیان ہوئیں۔ اوّل۔ صلصلة الجرس۔ گھڑیال کی
آواز آنا۔ دوم: فرشتہ کا آدمی کی صورت میں آنا اور پیغام الٰہی پہنچانا۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صلص
الجرس والی وحی قرآن میں نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کلام صریح ہوتا ہے اور یہ صرف ایک آواز تھی جس
حضور علیہ السلام مفہوم اخذ فرماتے تھے۔

۴۔ عجیب وغریب امور کی تحقیق و تفتیش کا شوق انسان کی جبلّت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ حض
حارث نے وحی کے متعلق جو سوال کیا وہ بھی اسی فطری داعیہ کے ماتحت تھا۔ یہ نہیں کہ آپ کو وحی کے با
میں کوئی شک وشبہ تھا (۲) اسی سے علما نے یہ مسئلہ نکالا کہ سوال کرنے کا جواز صرف مسائل شریعت ہی کے س
خاص نہیں ہے بلکہ پوشیدہ حقائق واسرار کے بارے میں سوال کرنا بھی جائز ہے۔

بندے جن امور کی معرفت کے مکلّف نہیں انہیں زیرِ بحث نہ لائیں

چنانچہ فقہاء کرام نے اس
میں یہ ہدایت دی ہے کہ
باتیں جن کی تحقیق و تفتیش کے ہم مکلّف نہیں اور جن کی معرفت ضروری نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں زی
نہ لایا جائے۔

ردالمحتار میں ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ جبریل امین کس طرح اترے کس شکل میں حضور نے ان کو دیکھا کہ جب
نے ان کو بشری شکل میں دیکھا تو وہ فرشتے رہے یا نہیں اور جنت و دوزخ کہاں ہے۔ قیامت کب ہوگی
عیسےٰ علیہ السلام کس تاریخ کو نازل ہوں گے۔ حضرت اسماعیل افضل ہیں یا حضرت اسحاق۔ ان دونوں میں
کون ہے؟ حضرت فاطمہ افضل ہیں یا حضرت عائشہ۔ حضور علیہ السلام کے والدین کس دین پر تھے اور ابوط

یا دین تھا، مہدی کون ہیں۔

بغی ان لا یسئل الانسان عما لا حاجة
یه مما لا تجب معرفته ولم یرد
تکلیف به (ردالمحتار ج ۵ ص ۵۲۴)

اس قسم کی اور باتیں جن کی معرفت ضروری نہیں یا بندہ ان کے ساتھ مکلّف ہے۔ انہیں زیر بحث لانا چاہیے۔

بلکہ میرے نزدیک تو فی زمانہ اس نوع کے مسائل کو زیر بحث نہ لانا ضروری ہے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے س نوع کے مسائل میں بحث و تمحیص سے فتنوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ پارٹیاں اور فرقے بن جاتے یں اور سخت انتشار و افتراق پیدا ہو جاتا ہے۔

فَاعِيْ مَا يَقُوْلُ: حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب فرشتہ مردانہ شکل میں ظاہر ہو کر کلام یں اس کو محفوظ کر لیتا۔ صحیح ابن عوانہ میں یہ لفظ بھی ہیں وَهُوَ اَهْوَنُهٗ عَلَيَّ اور وحی کا اس کیفیت ے آنا مجھ پر آسان ہوتا تھا۔ یعنی اس کو محفوظ کرنے میں مجھے آسانی ہوتی تھی۔

لَيَتَفَصَّدُ: تفصد کے معنی بہنے کے ہیں۔ فصد کو اسی لیے فصد کہتے ہیں کہ خون بہانے کے لیے نس ٹتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالے عنہا کہتی ہیں کہ بوقتِ وحی حضور علیہ السلام کو جبینِ اقدس ے پسینہ بہتا تھا۔

یہ پسینہ کا بہنا دراصل وحی الٰہی کی ہیبت و عظمت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ متعدد احادیث کا مضمون ہے کہ

حی کی شدّت و ثقالت

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو اس کی شدت و ثقالت کا یہ عالم ہوتا کہ جبینِ اقدس پسینہ سے تر ہو جاتی۔ چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا۔ آپ نی پر جا رہے ہوتے اور وحی نازل ہوتی تو اونٹنی بوجھ سے بیٹھنے لگتی۔ حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ ور علیہ السلام کا سر مبارک میری ران پر تھا کہ اس حالت میں آیت کا یہ ٹکڑا نازل ہوا غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ یری ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ میرا خیال ہو گیا کہ ران کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ حضور علیہ السلام غارِ حرا ے شریف لاتے تو قلبِ اقدس دھڑکتا ہوتا۔ سردی محسوس فرماتے تو چادر اوڑھا دینے کا حکم دیتے۔ اس ازہ کیجیے کہ وحی کس قدر شدید و ثقیل ہے اور اس کے تحمل و برداشت کے لیے کیسے مطمئن قلب کی ضرورت ہے نے وحی کو قَوْلًا ثَقِيْلًا کہا۔ جس کو خود رب العالمین قولِ ثقیل فرمائے۔ اس کے ثقل و شدت کا کیا ے۔ ایک دوسرے مقام پر قرآنِ حکیم نے وحی کی شدت و قوت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

زَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ
شِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اُتارتے تو ضرور تُو اسے دیکھتا جھکا ہوا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے۔

لہ اکبر! جس وحی سے پہاڑ پارہ پارہ ہو جائیں، جس کی شدت و ثقالت کو پہاڑ جیسی سخت چیز برداشت کے۔ اسے انبیاء کرام برداشت کرتے ہیں۔ جس کا معمولی سا مظاہرہ دیکھئے کہ اونٹنی یا حضرت زید بن ثابت کا

کا زانو جس کو وحی سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ صرف مہبطِ وحی کے جسدِ مبارک سے اس کا اتصال تھا مگر پھر بھی وحی کی شدت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس سے قلوبِ انبیاء کی زبردست قوتِ برداشت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اقدس پر جو کچھ نازل ہوا۔ ہمارے دل اس ک احاطہ نہیں کر سکتے۔

وکیف یکون لمورد الوحی ومنزل القرآن نسبة مع رجل من امته هیهات ذالك (حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص ۵۶۳)	اور وہ ذاتِ اقدس جس پر وحی نازل ہوتی اور قرآن اترا اس کی اپنی امت کے ایک شخص سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ان دونوں کی حالت میں بڑا فرق ہے۔

حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمسری و برابری کا دعویٰ کرنے والے اگر صرف نفسِ وحی کی شدت اور قوت ہی کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو یہ بات کھل جائے گی کہ انبیائے کرام علیہم السلام باوجود انسان ہونے کے عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے۔ ان کی بشریت و انسانیت نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ان کے قوائے بشریت کو ریزہ ریزہ کر دینے والی چیز کو برداشت کر لیتے ہیں۔

بشر ضرور ہیں پہ داخلِ انام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

وحی کے لغوی معنیٰ

وحی کے لغوی معنیٰ اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، خفیہ بات ک کے ہیں (لسان العرب) امام کسائی عرب کا محاورہ بتاتے ہیں۔

وحیت الیه بالکلام واوحیت الیه وهو ان تکلمه بکلام تخفیه من غیره	کسی سے اس طرح بات کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔

ابو اسحاق امام لغت کہتے ہیں۔

وَاَصْلُ الْوَحْيِ فِي اللُّغَةِ كُلِّهَا اِعْلَامٌ فِيْ خَفَاءٍ	وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا ک اطلاع دینے کے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں وحی کا لفظ متعدد مقام پر آیا ہے۔ مثلاً

۱- وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ	تیرے رب نے شہد کی مکھیوں کو وحی کی
۲- بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا	تیرے رب نے زمین کو وحی کی۔

ان دونوں آیتوں میں وحی "فطری" حکم کے معنیٰ میں آیا ہے۔

۳- وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ	اور ہم نے حواریوں کو وحی کی کہ ہم پر اور ہمارے پیغمبر پر ایمان لاؤ
۴- وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی کی کہ اس بچہ کو دودھ پلا

ان دونوں آیتوں میں وحی کا لفظ الہام کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے (یعنی دل میں بات ڈالنا)

۵۔ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ	ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں سے وحی کرتے ہیں۔
۶۔ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ	اور یہ شیاطین اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں لفظِ وحی "پوشیدہ طور پر بات کرنے" میں استعمال ہوا ہے۔ جب ان تمام مقامات کو جہاں قرآن میں لفظِ وحی آیا ہے ایک جگہ جمع کیا جائے تو یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ وہ کلام جو منہ اور کان کے بغیر کسی تک پہنچا ہو وحی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دی تو انہیں یہ علامت بتائی کہ تم تین رات دن کلام نہیں کرسکو گے۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب حجرہ سے باہر آئے تو بات نہ کرسکے۔ اس لیے انھوں نے اشارہ سے لوگوں کو سمجھا دیا کہ صبح و شام اللہ تعالےٰ کی تسبیح کرتے رہو۔

فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا۔

اس آیت میں منہ اور کان کی مدد کے بغیر ایک بات کے سمجھا دینے کو وحی کہا گیا (عینی جلد ۱ ص۱۴) امام راغب نے فرمایا۔ الاشارۃ السریعۃ فی خفیۃ۔ گویا تین چیزیں ہوئیں۔ اشارہ، سرعت، خفاء۔ کسی مبسوط اور مفصل مضمون کو کم از کم عنوان سے ادا کر دینے کا نام اشارہ ہے۔ یہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ کبھی زبان سے ہوتا ہے کہ ایک دو لفظ کہہ دیئے۔ کبھی ہاتھ یا انگلی وغیرہ سے کبھی آنکھ یا گردن سے کبھی کسی اور ذریعہ سے جیسے آج کل بجلی اور ایتھر وغیرہ سے اشارات کا کام لیا جاتا ہے ۲۔ سریعۃ کے معنیٰ بہت تیز ۳۔ فی خفیہ یعنی اشارہ مخصوص و پوشیدہ طور پر ہوتا ہے جیسے آپ شارٹ ہینڈ کو دیکھتے ہیں کہ مخصوص و مخفی قواعد کے تحت چند الفاظ و خطوط میں لمبی عبارتوں کو سمو لیا جاتا ہے یا جیسے جہازوں کے سگنل میں خاص قواعد کے تحت اشارے ہوتے ہیں یا جیسے ٹیلیفون آپریٹر کے دفاتر میں ٹک ٹک کی آواز سے مفہوم اخذ کیا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ وحی نام ہے ایک ایسے تیز رفتار اشارے کا جو اپنے مخصوص و مخفی قاعدوں کے تحت مفصل باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

وحی کے شرعی معنیٰ

اور اصطلاحِ شرع میں وحی ان مطالب و معارف کا نام ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتے ہیں۔ بنیادی حیثیت سے وحی کی تین قسمیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا بندے سے بلا واسطہ براہِ راست خطاب جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ حکیم میں مذکور ہے۔ دوسرے فرشتہ کے واسطے سے کلام۔ تیسرے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر کسی اور طرح کلام یا مطالب و احکام کا قلبِ نبی پر نزول۔ یہ تیسری قسم ہی وہ ہے جس کی روشنی میں حضور علیہ السلام نے دین کے بارے میں بے شمار امور کی تفصیلی ہیئت و شکل متعین فرمائی اور قرآنِ حکیم کے اجمال و ابہام کی تبیین و تشریح کی۔ واضح ہو وحی جلی جیسے قرآنِ کریم، توریت، زبور و انجیل۔ یہ کلام صریح ہے اسی

علماء نے وحی جلی کی تعریف یہ کی:-

هُوَ كَلَامُ اللهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَائِهٖ (عینی)

(وحی جلی) اللہ کے اس کلام صریح کو کہتے ہیں جو وہ اپنے انبیاء میں سے کسی نبی پر نازل فرماتا ہے۔

وحی اللہ کی سنت ہے اور انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے جس اہمیت سے وحی کو بیان کیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وحی نبوت کے مترادف ہے اور نبی کے سوا کسی کو وحی ہوتی ہی نہیں ہے۔

وحی اور الہام میں فرق

لغت کے لحاظ سے وحی اور الہام میں کچھ فرق نہیں ہے کیونکہ وحی کا اطلاق کتابت، اشارات، الہام، خفیہ کلام، اشارہ سریعہ (تیزی سے اشارہ کرنا) دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔ سبھی پر آتا ہے لیکن شرع میں وحی نبوت کے مترادف ہے اور الہام یا اشارہ یا القاء جو نبی کو ہوتا ہے اسی کو وحی کہتے ہیں اور جو الہام یا اشارہ غیر نبی کو ہوتا ہے اس کو الہام کہتے ہیں۔

وحی والہام کے متعلق قارئین کرام کو خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اوّل۔ وحی کے لیے فرشتے کی وساطت نہ شرعاً ضروری ہے اور نہ لغتہً۔ مطلقاً القاء ربانی کو وحی کہتے ہیں۔

دوم۔ اصطلاح شرع میں وحی کا جو مفہوم ہے وہ اب منقطع ہو چکا ہے اور قیامت تک ایسی وحی کوئی نہیں پا سکتا کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے آخری نبی ہیں۔ نبوت و رسالت آپ پر ختم ہو چکی ہے اس لیے اب وحی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

سوم۔ الہام، یہ اب بھی جاری ہے۔ اولیائے کرام اور صلحائے اُمّت کو ہوتا ہے۔ جس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کبھی غیب سے آواز آتی ہے کبھی ملکوتی اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں اور غیب کے امور ان کو صفائی باطن کی وجہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں مگر حجت نہیں ہوتے اور وحی رسول سے جو حکم بھی ثابت ہو وہ لازم القبول ہوتا ہے اس کے برعکس الہام اولیاء ہرگز ہرگز کسی حکم اور امر و نہی کے صادر کرنے یا نافذ کرنے کی مجاز نہیں اور نہ ہمارے لیے حجت اور سند ہے۔ حضرت شیخ اکبر قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:-

"وحی انبیاء میں احکام اور امر و نہی ہوتے ہیں اور وحی (الہام) اولیاء میں یہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو ولی اس کا دعوےٰ کرے اس کی گردن مار دینی چاہیے کیونکہ در پردہ وہ نبوت کا دعوےٰ کرتا ہے۔"

پھر الہام اولیاء میں عصمت بھی ضروری نہیں۔ ممکن ہے اس میں شیطان کا دخل ہو۔ اسی لیے الہام کی دو قسمیں ہو گئیں۔ رحمانی و شیطانی۔ جو الہام کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو وہ رحمانی ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ شیطانی ہے۔ پھر اگر الہام واقع میں رحمانی بھی ہو تو بھی دین میں حجت نہیں بن سکتا اور نہ اس کو ماننا ضروری ہوتا ہے اور نہ الہام کی بنیاد پر کسی عقیدے یا کسی امر و نہی کا نفاذ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غیر نبی کے الہام شریعت میں حجت و سند نہیں تو پھر اس کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ اس کا

جواب یہ ہے جو علم غور و فکر، نظر و استدلال کے بغیر طرق مذکورہ سے حاصل ہو اس کو الہام کہتے ہیں۔ اب اگر کسی کا دل الہامِ ربانی کا مخزن بنتا ہے اور اسرارِ ملکوتیہ اس پر منکشف ہوتے ہیں تو یہ بات اس کے دل کی صفائی اور مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی دلیل بنتی ہے اور اس الہام سے ملہم اپنی منزلوں کو طے کرتا ہے اور معرفتِ الٰہی میں زیادتی پاتا ہے گویا اس الہام سے ملہم کی ذات کو یقیناً فائدہ پہنچتا ہے اور بعض اوقات دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام غزالی نے الہام کو اللہ کی رحمت قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

> ”وحی و الہام الطافِ ربانی کے جھونکے ہیں جو قلب کی آنکھوں سے حجاب کو دور کرتے ہیں اور پھر حقائقِ علوم آئینۂ لوحِ محفوظ سے آئینۂ قلبِ عارف پر عکس انداز ہوتے ہیں اور ملکوتی اسرار کے ادراک کرنے کی راہِ سعادت کھلتی ہے۔“ (احیاء العلوم ص۱۱)

حضور علیہ السلام کے ساتھ وحی کا آغاز

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز رویائے صادقہ (سچے خوابوں) سے ہوا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے۔

فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ (بخاری) | وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔

گویا ابتدائے وحی یہ تھی کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے اور جو کچھ ملاحظہ فرماتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا۔

غارِ حراء کا مجاہدہ

مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک غار تھا۔ جس کو حرا کہتے ہیں۔ آپ مہینوں وہاں جاکر قیام فرماتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے وہ ختم ہو جاتا تو پھر گھر واپس تشریف لاتے اور پھر واپس جاکر مصروفِ مراقبہ ہو جاتے۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ غارِ حرا میں حضور علیہ السلام تحنث (عبادت) فرمایا کرتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟

اجیب بان ذالک کان بالتفکر والاعتبار | جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری تھی۔

ایک دن جب آپ حسبِ معمول غارِ حرا میں مصروفِ مراقبہ تھے کہ فرشتہ غیب نظر آیا۔ فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں ہوئی۔

حضور علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی

جب کہ آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔ غارِ حرا میں پہلی بار سورۂ اقراء کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک یہ سلسلہ رکا رہا —— محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلہ وحی کے رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۃ

مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپ حرا سے واپس آرہے تھے کہ ایک آواز سنائی دی۔ آپ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جبریل نظر آیا۔ حضور علیہ السلام حضرت خدیجہ کے پاس آئے۔ فرمایا مجھے چادر دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں :۔

یَآاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اے بادلہ پوش (محبوب) اٹھو! اور لوگوں کو خدا
سے ڈراؤ اور اپنے رب کی کبریائی بیان فرما۔

نزولِ وحی کی مدت

تمام قرآنِ حکیم یکدم نازل نہیں ہوا بلکہ حسبِ ضرورت اور وقفاً توقفاً تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اول نزول شب قدر میں ہوا۔ شب قدر رمضان المبارک کی آخری راتوں میں سے ایک طاق تاریخ کی رات ہے۔ غارِ حرا میں سب سے پہلے وحی سو اقراء کی پانچ آیتیں ہیں۔ اس کے بعد قرآنِ مجید نجماً نجماً وصالِ اقدس سے کچھ دن پہلے تک نازل ہوتا رہا۔ بہ اعت نزول کے قرآنِ مجید کی آخری آیت واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ ہے۔ اس حساب سے چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ سال کے سن تک کل ۲۳ برس نزولِ وحی کے ہیں یعنی تکمیلِ قرآن کی کل مدت ۲۳ س

وحی کے اقسام

قرآنِ حکیم نے وحی کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔
۱۔ وحی، اشاروں سے بات کرنا۔ یعنی دل میں کسی معنیٰ کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا۔ یہ اگر حالتِ بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رویا ہے ۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی حض نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہیے ۳۔ فرشتہ کے ذریعہ بات یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ جن کو سُن کر نبی محفو کرلیتا ہے۔ قرآنِ پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے۔ وحی کے یہ تین اقسام خود قرآنِ پاک نے بیان فرمائے ہیں اگرچہ قرآنِ مجید نے ان تینوں قسم کی وحی کا علیحدہ علیحدہ نام نہیں رکھا ہے۔ ان اقسام کا ذکر سورۃ شوریٰ کی اس آ میں ہے :۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا
اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ
(سورہ شوریٰ)

کسی بشر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ
سے بات کرے لیکن وحی کے ذریعہ یا پردہ کی آڑ
وہ کسی فرشتہ کو بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ
ہے بشر کو پہنچا دے۔

انبیاء کرام کی وحی کی تین قسمیں ہیں۔
اول۔ کلامِ قدیم کا سننا جیسے بنص قرآن موسیٰ علیہ السلام نے سنا اور ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم صحیح آثار کے ساتھ۔ دوم۔ وحی رسالت یعنی فرشتہ کی وساطت سے کلام کرنا سوم۔ تلقی قلب جس کو حض علیہ السلام نے یوں بیان فرمایا :۔

ان روح القدس نفث فی رُوعی

روح القدس نے میرے دل میں ڈالا

وحی کی سات صورتیں

امام سہیلی نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی کی سات صورتیں بیان کی ہیں جو سب کے سب احادیث سے مستخرج ہیں:-

اوّل:- رویائے صادقہ، سچے خواب دیکھنا دوم:- صلصلۃ الجرس، گھڑیال کی طرح آواز آنا سوم:- نفث فی القلب، دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا چہارم:- تمثل، فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہوکر آنا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جبریل حضرت دحیہ کلبی صحابی کی شکل میں حاضر ہوتے تھے۔ پنجم:- فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا ششم:- وہ طریقِ مکالمہ جو حضور علیہ السلام کو شب معراج میں پیش آیا اور اس شب اللہ نے آپ پر وحی فرمائی اور بلاواسطہ مکالمہ جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:-

تانی ربّی فی احسن صورۃ فقال
یم یختصم الملاء الاعلیٰ (بخاری)

میرے رب نے بہترین صورت میں تجلّی فرمائی اور کہا ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے کس بات میں جھگڑا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ حضور اکرم پندرہ سال مکہ میں مقیم رہے اور آپ کو سات برس متواتر غیبی آوازیں آتی رہیں اور آپ روشنی دیکھتے رہے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور آٹھ سال آپ پر وحی نازل ہوئی (مسلم)

ھفتم:- وحی اسرافیل، مسند احمد میں صحیح حدیث ہے۔ حضرت شعبی کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم علیہ السلام کی عمر مبارک ۴۰ سال کی ہوئی۔ اس وقت وحی نازل ہونا شروع ہوئی (ابتداء میں تین سال تک حضرت اسرافیل (قرآن کے علاوہ) وحی لاتے رہے) ۱۰ سال مکہ میں اور ۱۰ سال مدینہ میں اور حضور علیہ السلام کا وصال ۶۳ برس کی عمر میں ہوا (عینی ص۴۲) اس روایت کی رو سے نزولِ قرآن کی کل مدت ۲۰ سال ہوتی ہے۔

وحی متلو و غیر متلو

احادیث میں طریقہ وحی کی متعدد صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

روحَ القُدُسِ نَفَثَ فِی رُوعِی

روح القدس نے میرے دل میں پھونکا

کہیں یہ صیغہ مجہول بھی آیا ہے۔ نُفِثَ میرے دل میں پھونکا گیا۔ بہت سی حدیثوں میں یہ تصریح ہے کہ ـالے نے مجھے حکم دیا۔ یا اللہ تعالےٰ نے مجھ سے کہا۔ ان میں ایسی وحی بھی ہے جو قرآن مجید کے اجزاء نہیں ہے یے فقہاء نے وحی کی دو قسمیں کردیں۔ وحی متلو:- یعنی جس کی تلاوت کی جیسے قرآن کریم۔ اس کی خصوصیت ـے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے منقول ہے اور قرآن کے لفظ اور معنی دونوں خدا کا کلام ہیں۔ وحی متلو:- جو تلاوت نہیں کی جاتی اور قرآن کریم کے علاوہ ہوتی ہے جیسے وہ احکام شرعیہ و نصائح وغیرہ جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ یہ تواتر سے بہت کم مروی ہیں۔ وحی غیر متلو یعنی حدیث۔ یہ الفاظ کے ـے خدا کا کلام نہیں مگر معنی مفہوم کے لحاظ سے یقیناً اللہ کا ارشاد ہے کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم منشائے ایزدی

کے ترجمان ہیں اور آپ کی زبانِ اقدس سے وہی کچھ خارج ہوتا ہے جو وحی الٰہی ہوتی ہے۔

بوقتِ وحی حضور علیہ السلام کی کیفیت

بوقتِ وحی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ صلصلۃ الجرس والی وحی مجھ پر بہت زیادہ سخت ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو اس کی شدت سے جاڑوں میں آپ کی پیشانی اقدس سے موتیوں کی طرح پسینہ کے قطرے ڈھلکنے لگتے۔ (بخاری واقعہ افک)

صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسمِ مبارک بہت بھاری ہو جاتا۔ اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تو وہ بیٹھ بیٹھ جاتی (مسند احمد حنبل) حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے پس جائیگا۔ (بخاری)

یعلی بن اُمیہ کہتے ہیں کہ وحی کی حالت میں آپ کا چہرہ مبارک سُرخ ہو جاتا تھا۔ (بخاری)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہو جاتی تو آپ مضطرب ہوتے۔ چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ آپ سرِ اقدس جھکا لیتے۔ صحابہ بھی اپنے سر نیچے کر لیتے۔ وحی کے بعد آپ سر اٹھا لیتے (صحیح مسلم باب عرق النبی)

وحی کی ابتداء رویائے صالحہ سے ہوئی

حدیث نمبر۳ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّهَا قَالَتْ اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ (بخاری)

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ تعالےٰ عنہا کہتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ سحر کی طرح (سچا ہوکر) نمودار ہوتا۔ پھر آپ کو تنہائی پسند کیا گیا اور آپ غارِ حرا میں خلوت گزینی فرمانے لگے اور وہاں متعدد راتیں عبادت فرماتے۔ بغیر اس کے کہ اپنے اہل وعیال کی طرف جائیں اور آپ اپنے ہمراہ توشہ لے جاتے جب وہ ختم ہوتا تو آپ حضرت خدیجہ کے پاس آتے اور مزید توشہ لے جاتے یہاں تک کہ حق آپ کے سامنے آگیا اور آپ غارِ حرا میں تھے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے تفسیر میں، مسلم نے ایمان میں اور ترمذی و نسائی نے کتاب التفسیر میں ذکر کیا ۲۔ یہ سوال نہ کیا جائے کہ حضرت عائشہ تو حضور علیہ السلام کے مجاہدۂ حرا کے موقع پر موجود ہی نہ تھیں پھر نزولِ وحی کے واقعہ کو کیسے بیان فرما رہی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے حضور علیہ السلام

سے سن کر ہی اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے جس پر حدیث کے الفاظ قَالَ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ دال ہیں۔ البتہ اوّل ما بُدِیَٔ بِہٖ ۔۔۔۔ الخ یہ عائشہ صدیقہ کے اپنے الفاظ ہیں جن سے نبوی کلام کی حکایت فرمائی ہے لہٰذا حدیث ہذا مرسل نہیں بلکہ مسند ہے۔

۲۔ من الوحی بتقدیر مضاف یعنی من اقسام الوحی۔ کیونکہ من برائے تبعیض ہے اور اس کے مدخول کے لیے ذی ابعاض ہونا ضروری ہے۔ نبوی خواب چونکہ وحی ہوتے ہیں اس لیے ان کو اقسام وحی میں شمار کرنا درست ہے۔

رؤیائے صالحہ وصادقہ کا فرق

۳۔ رُؤْیَا صادقہ اس خواب کو کہتے ہیں جو انتشار اور شیطانی عمل دخل سے پاک ہو۔ جو اپنی تعبیر خود ہو۔ علامہ قسطلانی نے فرمایا کہ صالحہ اور صادقہ انبیاء کرام کے حق میں بنظر آخرت متساوی ہیں مگر دنیوی لحاظ سے ان میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے رویا دنیوی اعتبار سے صادقہ تو سبھی ہوتے ہیں لیکن سب کے سب کا صالحہ ہونا ضروری نہیں جیسے یوم احد کا رویا کہ دنیوی حیثیت سے صالحہ نہ تھا اگرچہ صادقہ ضرور تھا لہٰذا ان میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوئی۔ صالحہ خاص اور صادقہ عام ہے۔

۴۔ فی المنام: رؤیا نیند کے ساتھ خاص ہے۔ رویت آنکھ کے ساتھ اور رأی دل کے ساتھ۔ لہٰذا یہاں فی المنام کے الفاظ بغرض مزید توضیح کے لیے ہیں یا دفع وہم تجوّز کے لیے اس لیے کہ کبھی رویت عینی پر بھی رویا کا اطلاق مجازاً ہوتا ہے جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں مَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ ۔۔۔۔۔ الخ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے آنکھ کا دیکھنا مراد ہے جو حضور علیہ السلام کو شب اسراء دکھایا گیا (عامہ تفاسیر)

رؤیا کے اقسام اور کونسا رویا نبوت کا جزء ہے؟

واضح ہو کہ رویا کی دو قسم ہیں۔ باطلہ۔ حقہ۔ پھر رویائے باطلہ سات قسم پر ہے۔

۱۔ حدیث نفس: وہ باتیں جو آدمی اپنے نفس سے کہتا رہتا ہے خواہ وہ کسی چیز کے منصوبے ہوں یا کسی چیز کی آرزوئیں اسی کو عربی میں اضغاث اور فارسی میں پریشان خواب کہتے ہیں۔

۲۔ تحذیر شیطان: جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اگر بیدار ہو کر آدمی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے تو مضرت رساں نہیں ہوتے۔

۳۔ حلم: یعنی خواب میں جماع کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنا جو موجب غسل ہوتا ہے اور اس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

۴۔ ساحری: جو کسی جن یا انسان کی وجہ سے نظر آتا ہے۔

۵۔ شیطانی۔ وہ خواب جو شیطان دکھائے۔

۶۔ خلطی: جو اخلاطِ اربعہ میں سے کسی ایک کے غالب ہونے سے نظر آتا ہے مثلاً سودا کے غلبہ سے

قبریں، سیاہی، صفرا کے غلبہ سے آگ، چراغ، خون وغیرہ۔ بلغم کے غلبہ سے سپیدی، پانی، مرغیاں وغیرہ، دم کے غلبہ سے مشروبات، پھول، آلات، مزامیر وغیرہ دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔ رجعی:۔ جو ایسے زمانہ میں نظر آئے جس میں دیکھنے والا موجود تھا اور اس کو بیس ہزار سال کا عرصہ گزر گیا ہو۔

رؤیائے حقہ پانچ قسم پر ہے۔

۱۔ شاہدی:۔ وہ خواب جس کی صحت پر شاہد ہو جو شر کے خیر اور خیر کے شر ہونے پر دلالت کرے جیسے کوئی دیکھے کہ مسجد میں طنبورہ بجا رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ بے حیائی کی باتوں سے اور برے افعال سے توبہ کرے گا یا کسی نے دیکھا کہ حمام میں قرآن پڑھ رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ کسی برے کام میں مشہور ہو گیا اور اس پر شاہد یہ ہے کہ حمام ستر کھلنے کی جگہ ہے اور یہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور مسجد میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

۲۔ مرموزہ:۔ وہ خواب جس میں تعبیر کی طرف اشارہ ہو جیسے کسی نے فرشتہ کو دیکھا کہ وہ کہتا ہے کہ تیری بیوی تیرے فلاں دوست کے ذریعہ تجھ کو زہر پلانا چاہتی ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ یہ دوست اس کی بیوی سے زنا میں مبتلا ہوگا۔ اس خواب میں تعبیر کی طرف اشارہ یوں ہے کہ جیسے زہر پوشیدہ طور پہ کھلایا جاتا ہے۔ اسی طرح زنا بھی مخفی طور پر کیا جاتا ہے۔

۳۔ ملکی:۔ وہ خواب جو ملکِ رؤیا کے توسط سے ہو۔ جن کا نام صدیقون ہے۔ جس طرح آفتاب کی روشنی میں اشیاء نظر آتی ہیں۔ اسی طرح صدیقون نور الٰہی کی روشنی میں اشیاء کی معرفت کراتے ہیں۔ دنیوی و اخروی خیر و شر کی تلقین کرتے ہیں۔ گزشتہ یا آئندہ عمل خیر کی بشارت دیتے ہیں۔ گزشتہ معصیت یا آئندہ معصیت پر ڈراتے ہیں اگر ڈراؤنا خواب دکھائیں تو اسی وقت ہو جاتا ہے تاکہ دیکھنے والا مغموم نہ رہے اور اگر مسرور کن خواب دکھائیں تو چند دنوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس وقت تک دل مسرور رہے۔

۴۔ صالحہ:۔ جو اللہ عزوجل کی طرف سے بشارت ہوتا ہے۔

۵۔ صادقہ ظاہرہ:۔ وہ خواب جس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنی تعبیر ہوتا ہے جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا رؤیا جس کو قرآن نے بیان کیا۔ یٰٓاَبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ یا حضور علیہ السلام کا وہ رؤیا جو سورۃ فتح میں مذکور ہے جس کو یوں بیان فرمایا گیا لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ الخ۔ یہی رؤیا یعنی صادقہ ظاہرہ نبوت کے ۴۶ اجزاء میں سے ایک جز ہے اور یہ رؤیا صرف انبیاء کرام کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کو بھی نظر آجاتا ہے۔

رؤیائے صالحہ نبوت کا ایک جز ہے۔ غیر نبی کے خواب کا حکم اور اسکی شرعی حیثیت

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پاکیزہ خواب بھی نبوت کا جزو ہیں اور اس اتفاق کی بنیاد قرآن حکیم کے فیصلے پر ہے۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض خواب کی ہدایت پر ہی ذبح فرزند کا اہتمام فرمایا تھا اور اللہ عزوجل نے ان کے اس اقدام کو غلط نہیں ٹھہرایا بلکہ اس

کی مدح فرمائی۔ اس سے واضح ہوا کہ خواب جزو نبوت نہ ہوتا تو نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ذبح فرزند کا قصد فرماسکتے تھے اور نہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کی تحسین ہوسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اریٰ فی المنام میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ اس پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جواب دیا فعل ما تؤمر جو آپ کو حکم ملا ہے اس کو کر ڈالیے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا جواب بھی اس امر کی تصریح کر رہا ہے کہ وہ خود بھی خواب کو حکم ربانی سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر خالی اپنے والد کی اطاعت مقصود ہوتی تو ان کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا افعل ما ترلی۔ کیجیے جو آپ مناسب سمجھیں لیکن انھوں نے یہ جواب نہیں دیا جس سے واضح ہوا کہ نبی کا خواب بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسے جاگتے ہیں کوئی حکم ملا ہو ——— خوب یاد رکھئے کہ رؤیائے صالحہ اگرچہ نبوت کا جز ہیں لیکن غیر نبی کے رویائے صالحہ دین میں حجت نہیں ہوتے اور نہ اس سے کوئی شرعی حکم ماخذ کیا جاسکتا ہے نبوت کے بہت سے اجزاء ہیں جو صالح انسانوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان اجزاء کا پایا جانا آدمی کو نبی نہیں بناتا۔ نبوت ایک وہبی چیز ہے جو اللہ عزوجل کی خاص عطا کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ نبی میں حسنِ اخلاق اور متعدد صفات کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ حسنِ اخلاق اور ملکات جس میں پائے جائیں وہ لازماً نبی ہوجائے۔

علاوہ ازیں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تو کسی نبی کے مبعوث ہونے کا امکان تھا مگر حضور علیہ السلام کی ذات پر تو اللہ عزوجل نے نبوت کو ختم کردیا۔ آپ کے بعد تو کسی نبی کے پیدا ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر جب حضور علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا تو غیر نبی کے رویائے صالحہ دین یا شریعت بھی نہیں بن سکتے۔

الرویاء الصالحہ یعنی وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا۔ ویسے رویاء صالحہ سے قبل بھی کچھ امور حضور علیہ السلام کو پیش آئے تھے مثلاً روشنی کا نظر آنا، حجر و شجر کا بزبانِ فصیح سلام عرض کرنا، درختوں کا سایہ ریز ہونا۔ یہ سب مبادیات وحی تھے۔ یعنی یہ سب چیزیں وحی بواسطہ ملک کے لیے تمہید تھیں۔ اس کے بعد رویاء صالحہ سے وحی کی ابتداء ہوئی۔ یہ شاید اس لیے کہ رویاء صالحہ وحی کی بہت ہی نیک اور ملکی قسم تھی۔

فَلَقَ الصُّبْح ۔ فلق کے معنی صبح کی روشنی کے ہیں اور فلق کی اضافت صبح کی طرف بیانیہ ہے۔ اس تشبیہ سے واضح ہوتا ہے کہ جو خواب حضور علیہ السلام کو دکھائے جاتے تھے ان کا نتیجہ عملی زندگی میں وہی ظاہر ہوتا تھا جو آپ کو خواب میں صاف و صریح طور پر دکھایا جاتا تھا۔

ثُمَّ حُبِّبَ اِلَیْهِ الْخَلَاءُ : خوابوں کے نظر آنے سے حضور علیہ السلام کی طبیعت میں روحانیت کا اور غلبہ ہوا اور آپ کا میلان خلوت و یکسوئی کی طرف ہوگیا اور آپ اکثر و بیشتر غارِ حراء کی خلوت میں رہنے لگے۔ خلوت زیر بحث چونکہ وحی کی شروعات ہوجانے کے بعد وقوع پذیر ہوئی جس پر لفظ ثم دلالت کرتا ہے جس سے واضح ہوا کہ ان کا اختیار فرمانا بھی بحکم الٰہی ہی تھا۔

بِغَارِ حِرَاءٍ : حراء، مکہ سے منیٰ جاتے ہوئے تین میل کے فاصلے پر بائیں ہاتھ ایک پہاڑ ہے۔ تین چٹانیں

کچھ اس طرح مل گئی ہیں کہ قدرتاً حجرہ بن گیا ہے۔ مختصر اتنا کہ دو آدمی اس میں تنگی سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ داخلہ کا ر
ایک ہی راستہ ہے اور وہ بھی سیدھا نہیں ہے بلکہ سکڑ سمٹ کر جانا پڑتا ہے۔ خلوت نشینی و یکسوئی کے لیے یہ ا
بہترین جگہ تھی۔ جس میں خلوت نشینی کی محبت آپ کے قلب مبارک میں ڈال دی گئی۔ فَیَتَحَنَّثُ: حنث باب تف
سے ہو تو اس میں سلب و نفی کے معنیٰ پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے تأثم گناہ سے دُور ہونا تو تحنث کے معنیٰ
خلافِ شان کام سے اجتناب و دُوری اور شایانِ شان کام میں انہماک و مستعدی۔ ابنِ شہاب زہری نے تحنث
تفسیر تعبد سے کی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ حضور علیہ السلام غارِ حرا میں کیا عبادت فرماتے تھے؛ اس کے متعلق
یقینی فیصلے کی تو کوئی صورت نہیں کیونکہ واقعات کا تعین خالی قیاسات سے نہیں ہو سکتا تاہم شارحین نے
احتمالات نکالے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

اس معرفت کا طریقہ حضور علیہ السلام کو اپنے نورِ معرفت سے ہوا۔ بذریعہ الہام اس کا طریقہ بتایا گیا
صالحہ میں طریقہ عبادت بتایا گیا (عینی جلد ۱ ص۲) یَتَزَوَّدُ۔ تزود کے معنیٰ توشہ لینے کے ہیں جس سے
ہوا کہ اپنے ساتھ توشہ یعنی سامانِ ضرورت رکھنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ حَتّٰی جَاءَهُ الْحَقُّ یعنی غارِ ح
خلوت نشینی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ آپ پر وحی آگئی۔

فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا
بِقَارِئٍ قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ
مِنِّي الْجَهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ
فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي
الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ
رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ
عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

(بخاری)

پس فرشتہ آپ کے پاس آیا اس نے کہا پڑھو
کہا۔ میں نہیں پڑھتا۔ حتیٰ کہ فرشتے نے مجھے پکڑا
اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ می
پھر کہا۔ میں نہیں پڑھتا۔ فرشتے نے پھر دوسری بار مجھے
اور اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھ
نے پھر وہی جواب دیا۔ میں نہیں پڑھتا۔ فرشتے نے ت
بار مجھے پھر دبایا اور کہا پڑھیے اپنے رب کے نام
سب کا بنانے والا ہے جس نے انسان کو بستہ لہو
کیا۔ پڑھیے تمہارا رب بڑا ہی کریم ہے ...... الخ

غارِ حرا میں جبریل کی آمد

۱۔ یہ تھی غارِ حرا میں حضور السلام پر سب سے پہلی وحی اور ایک پیام
حیثیت سے جبریل کی پہلی حاضری۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ا
سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہیں اور قرآنِ کریم جبریل ہی لے کر نازل ہوئے۔ قرآن مجید میں بھی
کی تصریح کی گئی۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلٰى قَلْبِكَ ۲۔ رویائے صالحہ اور حرا میں خلوت گ
بعد تیسری کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ حضرت جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سامنے آگئے اور انھوں نے سورۂ اقرا
پانچ آیتیں سنائیں۔ یہ ۷ رمضان پیر کا دن تھا۔ اس وقت حضور علیہ السلام کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔

غارِ حرا میں جبریل بشکلِ بشر حاضر ہوتے تھے

اس حدیث سے پیشتر جو حدیث تھی۔ اس میں وحی کی دو صورتوں کا بیان تھا ۱۔ مانندِ آوازِ جرس ۲۔ فرشتہ کا بشکلِ بشر حاضر ہوکر کلام کرنا اور حدیث زیرِ بحث میں چونکہ آمدِ وحی کی ابتدائی کیفیت کا ذکر ہے تو لامحالہ یہ آمد انہیں دو صورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوگی اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ وحی مانندِ جرس نہ تھی۔ تو جب پہلی صورت کا انتفاء ہوا تو دوسری صورت متعین ہوگئی کہ حضرت جبریل بشکلِ بشر حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ تین بار اقرأ کہنا اور غطّی کے بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

فَقَالَ اِقْرَءْ۔ حضرت جبریل امین نے عرض کی اقرأ پڑھیے۔ حضرت جبریل امین نے تین مرتبہ اقرأ کہا اور نے تینوں بار مَا اَنَا بِقَارِئٍ "میں تو نہیں پڑھتا" فرمایا[1] تین بار اقرأ کہنے میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس آغاز ہو رہا ہے وہ تین چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ توحید، احکام، قصص۔ مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ حضور علیہ السلام فرمایا۔ میں نہیں پڑھتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے پڑھنے سے انکار کیوں فرمایا؟ تو حق یہ حضرت جبریل امین کا تین بار اقرأ کہنا اور حضور کا مَا اَنَا بِقَارِئٍ کے الفاظ سے جواب دینا اللہ ہی جانے اس میں کیا حکمتیں تھیں۔ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ البتہ بظاہر انکار کی وجہ یہ معلوم ہے کہ حضور علیہ السلام غارِ حرا میں ذکرِ الٰہی سے لذت اندوز تھے کہ قلبِ اقدس پر کیف کا عالم طاری تھا کہ حضرت جبریل امین نے حاضر ہوکر استدعا کی، پڑھیے تو ظاہر ہے کہ جب آپ کا قلبِ مبارک محبوبِ حقیقی میں سرشار تھا اور ایک استغراق کی کیفیت طاری تھی تو ایسی صورت میں آپ نے دوسری جانب توجہ مبذول۔ حضرت جبریل امین نے تین بار اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے معانقہ بھی فرمایا مگر حضور علیہ السلام کا قلبی یہی رہا کہ ذکرِ حبیب سے لطف اندوز ہوتا رہوں تا آنکہ سیدنا جبریل امین نے اسی محبوب کے نام کی برکت سے کی استدعا کی جس کے مشاہدۂ جمال میں حضور مستغرق تھے ——— غرضیکہ اب حضور علیہ السلام ادھر متوجہ

---

[1] چنانچہ شارحین نے کہا کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ میں مَا نافیہ ہے اَنَا اس کا اسم ہے اور بِقَارِئٍ خبر ہے ب زائدہ ہے نفی کی ہے۔ البتہ علامہ عینی کی رائے یہ ہے کہ یہاں مَا استفہامیہ ہے جیسے مَا بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ میں ہے اور اس روایت ابی الاسود فی مغازیہ بھی کرتی ہے جس میں مَا اَنَا بِقَارِئٍ کی جگہ كَيْفَ اَقْرَءُ یا مَاذَا اَقْرَءُ آیا ہے (عینی جلد ا صفحہ ۶۶) ابن اسحٰق نے بروایت عبید بن عمیر مَاذَا اَقْرَءُ اور ابو الاسود نے اپنے مغازی میں كَيْفَ اَقْرَءُ روایت کیا اس ترجمہ ہوگا کیا پڑھوں؟ کیسے پڑھوں، ہوگا (عینی ج ا صفحہ ۶۶) میرے والد محترم حضرت علامہ ابو البرکات قدس سرہ العزیز نے بخاری ترتیب سنہ ۱۹۲۶ء میں مَا اَنَا بِقَارِئٍ کی ایک توجیہ یہ بیان فرمائی کہ لفظ مَا برائے نفی مشبہ بلیس ہے اور با کے ہے اور یہ کہ مَا اَنَا بِقَارِئٍ میں نفی جنسِ قرأت میں ہے تو اب ترجمہ ہوگا میں تو نہیں پڑھتا حضرت صدر الافاضل نعیم الدین صاحب مراد آبادی علیہ الرحمہ نے خزائن العرفان میں مَا اَنَا بِقَارِئٍ کا ترجمہ "ہم پڑھے نہیں ہیں" کیا ہے۔

اقرأ باسم ربك الذي خلق - اس رب کے نام کی برکت اور مدد سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ امام راغب مفردات میں رب کے معنی بیان کرتے ہیں کہ رب وہ ہے جو کسی چیز کو تدریجاً اس کے حد کمال تک پہنچا دے وہ حد کمال جس کی وہ شے لائق ہے اور جس کی اس میں استعداد ہے ۲- خلق کہا گیا مگر یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کس چیز کو پیدا کیا؟ تو کار تخلیق کو نکرہ چھوڑ دینے سے یہ واضح ہوا کہ کائنات و موجودات کی ہر شے کا خالق صرف ایک رب ہے

گویا رب اور خلق کے لفظ سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ گو بظاہر اقرأ (پڑھیے) جبریل کی زبان سے ادا ہو رہا ہے مگر یہ تو وسیلہ اور واسطہ ہیں ہمارے حکم کی تعمیل میں اقرأ کہہ رہے ہیں ورنہ حقیقت میں اقرأ کہنے والا اور کے پڑھنے کی آپ میں استعداد و ہمت پیدا فرمانے والا بھی آپ کا رب ہی ہے۔ لہٰذا اسی کا نام لے کر پڑھیے خلق الانسان من علق - ہاں وہ رب جس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے پیدا کیا تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ انسان کامل محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کو اپنے تلمذ میں لے کر ان کے سینہ کو علم و عرفان سے بھر دے۔

اقرأ وربك الاكرم بالفعل پڑھیے اور آپ کیوں نہ پڑھیں گے جب کہ آپ کا رب کریم ہی نہیں بلکہ اکرم ہے وہ فیض کے لامتناہی خزانوں کی بلا شرکتِ غیرے مالک، مستحق فیض پہنچانا چاہ رہی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں فیض قبول کرنے کی پوری استعداد بھی موجود ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ فیض پہنچنے میں کوئی کسر رہ جائے۔

الذي علم بالقلم - جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا —— ظاہر ہے کہ اگر اللہ عزوجل انسان کو قلم سے کام لینے کا سلیقہ و شعور نہ عطا فرماتا تو آج علم و عرفان کے یہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر قلب انسانی کی گھاٹیوں میں کھوئے رہتے لیکن اللہ عزوجل نے قلم سے کام لینے کا سلیقہ عطا فرمایا اور اس کے ذریعہ انسان نے علوم و معارف کے دریا بہا دیئے۔

یہیں سے اس امر کی وضاحت بھی ہو گئی کہ گو وحی کا نزول بذریعہ جبریل ہوا اور بزبان جبریل نے حضور نبوی علیہ السلام اقرأ کہا۔ مگر جبریل حضور علیہ السلام کے استاد پھر بھی نہیں ہوئے اور ان نادانوں کے خیال کی تردید اسی چھوٹے سے جملے نے کر دی جو حضور علیہ السلام کو جبریل کا شاگرد قرار دیتے ہیں (معاذ اللہ)

غور کیجیے کہ قلم علم کے سکھانے کا واسطہ بنتا ہے لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ قلم خود صاحب قلم سے افضل ہو گیا یا جس شخص نے قلم کے ذریعے علم حاصل کیا وہ شاگرد اور قلم اس کا استاد ہو گیا؟ نہیں بلکہ ہر عقل و فہم کا مالک کہتا جانتا مانتا ہے کہ استاد قلم نہیں ہے بلکہ وہ شخص ہے جو قلم کے ذریعے کسی دوسرے کو علم سکھا رہا ہے پس جبریل کہاں اور کیسے استاد تو وہ رب کریم ہے جو جبریل کے واسطے سے حضور علیہ السلام کو علم دے رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قلم ایک بے جان آلہ ہے جس کی بجائے خود کوئی حیثیت نہیں ہے اور حضرت جبر امین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اللہ کے مقدس رسول ہیں۔ ملکِ مقرب ہیں۔ واجب التعظیم ہیں۔ مرسل ملائکہ میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ حضور علیہ السلام کے مقابل ان کی حیثیت معلم اور حاکم کی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے وحی پہنچانے کے سلسلہ میں انہیں حضور علیہ السلام کا استاد قرار دینا یا کسی نہ کسی درجہ میں انہیں حضور علیہ السلام

فضیلت دینا باطلِ محض ہے۔

یہاں یہ شبہ وارد نہیں ہو سکتا کہ قرآن حکیم میں علم سکھانے کی نسبت جبریل کی طرف کی گئی ہے اور بہت سے سرین نے بھی وہاں جبریل امین کو ہی مراد لیا ہے۔ جیسے اس آیت میں علّمہ شدید القوٰی۔ تو یہ یاد رکھنا ہیے کہ جہاں قرآن میں علم سکھانے کی نسبت جبریل امین کی طرف کی گئی ہے وہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے حقیقۃً ستاد و معلم اللہ عزوجل ہی ہے۔ جبریل امین کی طرف علم سکھانے کی نسبت مجازاً کر دی گئی ہے چنانچہ اُردو کا محاورہ ے "اس کا قلم موتی بکھیرتا ہے"۔ "اس کے قلم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے" —— ظاہر ہے کہ اس ل میں حقیقتاً تعریف اس قلم کی نہیں جس سے آدمی مضمون لکھتا ہے بلکہ تعریف خود اس شخص کے ملکۂ تحریر اور ن بیان کی کی جا رہی ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی تلوار نے کتنے ہی ک زیر نگین کر لیے۔ تو حقیقت میں یہ تعریف لوہے کے اس تیز دھار والے ٹکڑے کی نہیں ہے جسے تلوار ہیں بلکہ صاحبِ تلوار کی جنگجویانہ قابلیت اور اس کی شجاعت و بسالت کی تعریف ہوتی ہے ایسی سینکڑوں یں ہیں جن میں معنیٰ مجازی مراد ہوتے ہیں تو اسی طرح جہاں کہیں بھی کتاب و سنت میں حضور علیہ السلام کو تعلیم ینے کی نسبت حضرت جبریل کی طرف کی گئی ہے وہ نسبت بھی مجازی ہے حقیقی نہیں ہے۔ علم الانسان مالم یعلم آدمی کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ یہ فقرہ بھی بے شمار لطائف و حکم پر مشتمل ہے۔ مگر سب سے ممتاز حقیقت س کی طرف اس فقرہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

کہ یہ مت سمجھنا کہ وہ رب کائنات صرف وسائل و ذرائع ہی سے علم سکھاتا ہے اور اس کی قدرت (معاذ اللہ) حد تک محدود ہے۔ نہیں بلکہ وہ تو یہاں تک قادر ہے کہ بلا کسی واسطہ اور وسیلہ کے انسان کو وہ کچھ سکھا دے جو یں جانتا —— پھر اس میں اس اہم حقیقت کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کہ اللہ عزوجل نے نزولِ وحی کے جبریل امین کو وسیلہ و واسطہ بنایا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ عزوجل نے اپنے رسول پر صرف بذریعہ جبریل ہی وحی نازل کی ہے اور بلا واسطہ جبریل کچھ نازل نہیں کیا ہے یا حضور علیہ السلام تک جو ہدایات خداوندی پہنچی ہیں ف بذریعہ جبریل ہی پہنچی ہیں اور جبریل کے واسطہ کے بغیر اللہ عزوجل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ہدایت یں دی ہے۔ ایسا کہنا اور سمجھنا بالکل لغو و باطل ہے۔ اس لیے کہ وہ قادر و قدیر خدا جبریل کے وسیلہ کا محتاج ے اور نہ اس کا پابند ہے، کہ وہ وسائل و ذرائع ہی سے اپنے رسولوں پر اپنے احکام نازل فرمائے بلکہ اس کی ہے کہ علم الانسان مالم یعلم کہ وہ بلا واسطہ و وسیلہ بھی انسان کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔

علم بالقلم کے بعد علم الانسان مالم یعلم فرمایا یعنی پہلے قلم کے ذریعہ علم سکھانے کا مستقل ذکر کرنے فرمایا کہ سکھایا آدمی کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا۔ اسی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فُؤَادُهُ فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیات لے کر واپس
گھر تشریف لائے۔ قلب مبارک مضطرب تھا۔ فرمایا۔

بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي فَزَمَّلُوهُ
حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيجَةَ
وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى
نَفْسِي (بخاری)

مجھے کمبل اڑھاؤ مجھے کمبل اڑھاؤ۔ آپ کو کمبل اڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ کیفیتِ اضطراب جاتی رہی پھر حضور علیہ السلام نے (حضرت خدیجہ) کو (غار حرا) کا تمام ماجرا بیان کر کے فرمایا مجھے تو اپنی حالت کا خطرہ ہو گیا تھا۔

يَرْجُفُ فُؤَادُہ، رجف، باب نصر ینصر سے لازم و متعدی دونوں آتا ہے اس کے اصل معنے ہلنے
جلانے کے ہیں۔ یہاں اس جملہ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قلبی کیفیت کا اضافہ حرکت سے ظاہر کیا گیا کہ جب
آپ غار حرا سے تشریف لائے تو قلبِ مبارک مضطرب تھا اور جب آپ کو چادر اڑھا دی گئی تو وہ اضطرابی کیفیت
جاتی رہی جس پر حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ کا جملہ نصِ صریح ہے۔ اور جب یہ اضطرابی کیفیت رفع ہو گئی تو اس کے
بعد حضور اکرم نے غار حرا کی پیش آمدہ سرگزشت بیان کر کے فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوا۔ لقد خشیت علی
نفسی کا ترجمہ بعض لوگوں نے "حال" کا کیا ہے۔ "یعنی مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ لیکن جب خشیت ماضی کا صیغہ
ہے۔ قد بھی یہاں موجود ہے اور سیاقِ حدیث فاخبرھا الخبر بھی اس پر دال ہے کہ واقعہ ماضی کا ہے تو ترجمہ
"ہے" کی بجائے "ہوا" کرنا چاہیئے۔ معروف محاورہ ہے کہ جب آدمی کسی انتہائی تکلیف دہ چیز سے دوچار ہوتا ہے تو
موقع پر وہ کہتا ہے کہ بھئی مجھے تو جان کا خطرہ ہو گیا تھا۔ اس جملہ سے مقصود صرف واقعہ کی اہمیت، اور تکلیف
شدت کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ بلاتمثیل ایسے ہی غار حرا میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی
انوار و برکاتِ صمدیت متوجہ نمائش ہوئے اور اللہ عزوجل نے اپنی سب سے زیادہ ثقیل و شدید چیز کا بار دو
نبوی پر رکھا تو اس کی سرگزشت سنانے کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب خدیجہ رضی اللہ تعالٰے عن
سے فرمایا کہ وحی کی ثقالت اور کلام الٰہی کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب جان چلی۔ چنا
وحی کو خود قرآن نے قولِ ثقیل کہا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ اگر وحی کسی پہاڑ پر اتار دی جاتی تو وہ جلالِ الٰہی
پاش پاش ہو جاتا مگر یہ تو ذاتِ نبوی ہی تھی جس نے بتوفیقِ الٰہی پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دینے والی چیز کی شدت
برداشت کر لیا۔

الغرض لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي کے جملہ سے حضور علیہ السلام نے وحی کی اس تکلیف اور شدت کو بیان فر
جو غار حرا میں آپ کو پہنچی اور جس کے اثرات گھر تشریف لانے اور چادر اوڑھا دینے تک رہے اور جب چادر او
دی گئی تو وہ اضطرابی کیفیت ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد حضور علیہ السلام نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالٰے عنہا کو
حرا کا واقعہ سنایا چنانچہ ذھب عنہ الروع کا جملہ اس امر کی تصریح کر رہا ہے کہ خوف دُور ہو جانے کے بعد
قصہ سنایا۔ یہ نہیں کہ قصہ سناتے وقت بھی آپ اپنی جان کے خوف میں مبتلا تھے۔

۲۔ اور اگر لقد خشیت علی نفسی کا ترجمہ حال کا کیا جائے یعنی مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ تب بھی ا
مطلب و معنی بالکل واضح ہے۔ یعنی اس جملہ سے حضور علیہ السلام کا مقصود بارِ نبوت اور رسالت کی عظیم ذمہ دا

بیان کرنا ہے اور بالکل ابتدائی مرحلہ میں نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کو نبھانے کے متعلق حضور کو عارضی فکر ہو جانا قدرتی تھا اس وقت کے حالات کو ذہن میں لائیے۔ آپ کو نبی بنایا گیا آپ تن تنہا ہیں اور پوری انسانی کائنات آپ کی مخاطب ہے اور سارے عالم میں جہالت و معصیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ رُشد و ہدایت کی تمام مشعلیں گُل ہو چکی ہیں اور ایک جہاں گیر تاریکی عالم پر مسلط ہے۔ ساری دنیا نشۂ جہالت میں سرشار ہے غرضیکہ ایک پوری دنیا اور اس کی مسلح جماعتیں ہیں اور ایک طرف صرف ذاتِ نبوی ہے جس کے ذمہ اس تحریکِ الٰہی کی ذمہ داری عائد کی جا رہی ہے جس کا ضعیف سے ضعیف ذوق بھی مخاطبین میں نہیں ہے۔ ان کے جذبات، ان کی عقیدتیں اور ان کے صدیوں سے جمے ہوئے اعتقادات اس تحریک کے یکسر خلاف ہیں۔ پھر یہ تحریک بھی کسی ایک شہر ایک صوبے یا ملک کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام عالم کو دعوت دینی ہے۔

نبوت کی یہی عظیم ذمہ داریاں تھیں جن سے آپ فکر مند ہوئے اور اسی کا اظہار آپ نے لقد خشیت علی نفسی کے جملے سے فرمایا کہ اب تک تو میں الصادق الامین کے لقب سے مشہور ہوں۔ پوری قوم میری دیانت و امانت، خلوص و للّٰہیت، ورع، تقویٰ اور حسنِ سیرت و صورت کی معترف ہے اور مجھ سے بے پناہ محبت رکھتی ہے لیکن نزولِ وحی کے بعد اب مجھے فرائضِ نبوت ادا کرنے ہیں۔ دین کی تبلیغ و اشاعت کرنی ہے اور باطل کی جہانگیر قوتوں سے ٹکر لینی ہے اور پوری دنیا کی مسلح جہالتوں اور معصیتوں سے تن تنہا مقابلہ کرنا ہے۔ یہی وہ خطرات و حوادث ہیں جن کے پیش نظر حضور نے لقد خشیت علی نفسی فرمایا۔

یہ بالکل ایک سیدھی سی بات ہے جس میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ یعنی کہ نبوت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں فرائضِ نبوت کو نبھانے کا عارضی فکر ہو جانا شانِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ منکرین سنت کا اس معصوم جملہ کو غلط رنگ دے کر کہنا کہ بخاری سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کو اپنی نبوت ہی میں شک تھا نہایت بے ایمانی کے ساتھ حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کی تحریفِ معنوی کرنا ہے کیونکہ پوری حدیث میں کوئی لفظ تو درکنار اشارہ تک نہیں ہے کہ معاذ اللہ آپ نبوت کے معاملہ میں ذرا بھی ریب و شک میں مبتلا تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت کا حکم ہوا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اِنَّہٗ طَغٰی بیشک اس نے سر اُٹھایا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی:۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (طٰہٰ)	دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! بیشک ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا شرارت سے پیش آئے۔

دیکھئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی خوف ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے خوف کی علت یہ نہیں تھی کہ جناب کلیم علیہ السلام کو نبوت میں شک تھا بلکہ یہ خوف فرضِ نبوت کی ادائیگی کے سلسلہ میں تھا کہ مجھے فرعون جیسی عظیم طاقت کے مقابلہ کے لیے بھیجا جا رہا ہے تو میں تنہا فرائضِ نبوت سے کیونکر عہدہ برآ ہوں گا۔ یہی فکر تھا جس نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو

خوف میں مبتلا کر دیا اور انہیں عرض کرنا پڑا کہ الٰہی میں ڈرتا ہوں کہ کہیں فرعون زیادتی نہ کرے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کا نبوت کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں فرائض نبوت کی ادائیگی اور رسالت کی ذمہ داریوں کے متعلق عارضی طور پر ذرا دیر کے لیے باقتضاء بشریت خوف و اضطراب میں مبتلا ہو جانا منافیِ شانِ نبوت نہیں ہے۔

۳۔ اسی طرح لقد خشیت علی نفسی کا یہ مطلب لینا بھی باطل ہے کہ حضور علیہ السلام کو یہ خوف پیدا ہ کہ فرشتے کو دیکھنے سے بوجہ رعب کے عاجز رہوں گا۔ اولاً اس لیے کہ اگر اس موقع پر جبریل امین ملکی شکل میں حاضر ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ملکی شکل کے دیکھنے سے رعب طاری ہو گیا اور اس رعب کی وجہ سے یہ خوف ہوا کہ آئندہ ان کو دیکھنے سے عاجز رہیں گے لیکن حضرت جبریل کا اس موقع پر ملکی شکل میں حاضر ہونا ثابت نہیں اور حدیث زیر بحث میں تو خود اشارات موجود ہیں کہ وہ انسانی شکل میں حاضر ہوتے تھے۔ لہٰذا رویتِ ملک سے عاجز رہنے کے خوف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ثانیاً۔ اگر طاری شدہ رعب کا سبب حضرت جبریل امین کی ذات ہوتی تو یہ رعب شروع ملاقات ہی میں ہو جاتا مگر اس وقت پیدا نہیں ہوا بلکہ اس وقت تو حضور علیہ السلام کو اس قدر سکون تھا کہ حضرت جبریل امین کے بار بار اقراء عرض کرنے اور معانقہ کرنے کے باوجود آپ نہایت ہی سکون و وقار کے ساتھ ما انا بقاری فرماتے ر اس سے واضح ہوا کہ رعب و اضطراب کا سبب حضرت جبریل کی رویت نہ تھی بلکہ کلام الٰہی کا نزول اور وحی کی شدت و ثقالت ہی تھی۔

فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَ تُكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔

حضرت خدیجہ کہنے لگیں۔ ہرگز نہیں بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی پریشان و شرمندہ نہیں کرے گا۔ آپ قرابتدار کا خوب حق ادا کرتے ہیں۔ بے سہاروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں مسافروں کی میزبانی کرتے ہیں اور لوگوں کو راہِ حق میں پیش آنے والے حوادث پر مدد دیتے ہیں۔

حضور نے خشیتُ علی نفسی سے وحی کی شدت و ثقالت یا نبوت کی عظیم ذمہ داریوں کا اظہار فرمایا تھا مگر جنابِ خدیجہؓ کو حضور علیہ السلام سے والہانہ محبت تھی وہ اپنی جان میں حضور علیہ السلام کو تسلی دینے لگیں آپ کی اخلاقی خوبیوں کو گنانے لگیں کہ ایسی خوبیوں کے مالک ہستی کو جان کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اور آپ کو ورق بن نوفل کے پاس لے گئیں۔

حَتّٰى اَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى ابْنَ عَمِّ خَدِيْجَةَ وَ

پھر حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ اپنے چچازاد بھائی کے پاس لے گئیں۔ ورق

كَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ
كِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ
نْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ
كْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ
فَقَالَتْ لَهُ خَدِيْجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ
مِنِ ابْنِ أَخِيكَ فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ يَا ابْنَ
خِي مَاذَا تَرٰى فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَأٰى فَقَالَ
هُ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ
هُ عَلٰى مُوسٰى يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا
لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ
فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ
طُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ وَ
نْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا
مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ
وُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ

بن نوفل زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور وہ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جو اللہ چاہتا اور بہت بوڑھے تھے اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے ورقہ سے فرمایا۔ اے ابن عم! اپنے بھتیجے کا ماجرا سنئے! ورقہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے میرے بھتیجے! ہاں بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؛ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمادیا۔ ورقہ نے کہا۔ یہی وہ ناموس (محرم اسرار) ہے جسے خدا نے موسیٰ پر اُتارا تھا۔ اے کاش میں آپ کے زمانۂ دعوت میں جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا۔ جب کہ آپ کی قوم آپ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کر دے گی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا ہاں! جو کچھ آپ لے کر آئے ہیں اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا۔ جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو۔ اگر اس زمانہ میں میں زندہ رہا تو آپ کی ہر طرح مدد کروں گا۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد ہی ورقہ نے وفات پائی اور اس کے بعد وحی رکی رہی۔

سورہ اقرأ کی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد جبریل کی آمد رکی رہی۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلۂ وحی کے جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ حضور علیہ السلام غارِ حرا سے واپس تشریف لا رہے کہ فرشتہ نظر آیا جس کا قصہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ اس کے بعد جبریل امین کی پے در پے آمد شروع ہو گئی اور مبارک کے آخری لمحات تک جاری رہی بلکہ آخر عمر شریف میں وحی کی کثرت ہو گئی تھی (بخاری)

المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

اس حدیث میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کا نام خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ آپ ہی حضور علیہ السلام کی محرم راز ہیں اور ابتدائے وحی کے موقع پر آپ ہی حضور علیہ السلام کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئی تھیں۔ آپ کا دیجہ اور لقب طاہرہ ہے۔ آپ حضور علیہ السلام کی پہلی مقدس بی بی ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے کا نام عامر بن لوی ہے۔ حضرت خدیجہ کی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی اور دو لڑکے ہند اور حارث پیدا

ہوئے۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد آپ عتیق بن عائذ مخزومی کے عقد میں آئیں۔ ان سے ایک لڑکی بنام ہند پیدا ہوئی اسی لیے آپ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ سید المرسلین علیہ السلام کے عقد میں آئیں۔ اس وقت حضور علیہ السلام کی عمر شریف ۲۵ برس اور حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ حضرت خدیجہ نکاح کے بعد ۲۵ برس تک زندہ رہیں۔ ان کی زندگی میں حضور علیہ السلام نے دوسری شادی نہیں فرمائی۔ حضور علیہ السلام کے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو صاحبزادے جو کہ بچپن ہی میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ، زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ تعالے۔

حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالے عنہا سے حضور علیہ السلام کو بے انتہا محبت تھی۔ ان کی وفات کے بعد آپ کا معمول تھا۔ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ حضرت خدیجہ کی ملنے والی عورتوں کے پاس گوشت ضرور بھجواتے۔ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مجھے حضرت خدیجہ پر بہت رشک آتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس پر آپ کو کچھ کہا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا نے مجھے خدیجہ کی محبت دی ہے (مسلم شریف، فضل خدیجہ) ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ آپ ایک بڑھیا کی یاد کرتے ہیں جو مر چکی ہیں۔ استیعاب میں ہے۔ کہ اس کے جواب میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ لیکن جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو خدیجہ نے میری تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب میرا کوئی معین نہ تھا انھوں نے میری مدد کی۔

ورقہ بن نوفل

یہ حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے جو زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور کتب سماویہ کے عالم اور نیک آدمی تھے۔ اگرچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظہار نبوت سے قبل ہی وفات پا گئے۔ مگر نزول وحی کا واقعہ سن کر انھوں نے حضور علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی تھی۔ چنانچہ مستدرک کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ ورقہ بن نوفل نے نزول وحی کا واقعہ سن کر عرض کی۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّكَ نَبِیٌّ
(مستدرک)

مجھے اس کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آپ تو نبی ہیں۔

نیز ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت خدیجہ نے پوچھا کہ حضور ورقہ نے آپ کی تصدیق تو کر لی تھی۔ مگر آپ کے اظہار نبوت سے قبل ہی وہ وفات پا گئے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میں نے خواب میں ان کو سفید لباس میں دیکھا ہے۔ اگر وہ دوزخی ہوتے تو ان کا لباس سفید نہ ہوتا۔ ان احادیث کی روشنی میں شراح حدیث نے ورقہ بن نوفل کو مسلمان قرار دیا ہے۔ بہرحال اتنا تو ظاہر ہے کہ ورقہ عیسائی تھے۔ کتب سماویہ کے عالم تھے۔ نیک تھے اور حضور علیہ السلام کی نبوت کی انھوں نے تصدیق کی تھی۔ حضور علیہ السلام کی کیفیت سن کر عرض کی تھی کہ یہ تو وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا۔

عبرانی زبان کی اصل

اس حدیث میں آیا ہے کہ ورقہ عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی زبان میں لکھتے تھے۔

بعض روایات میں یہ ہے، کہ عربی میں لکھتے تھے۔ عبرانی عبر کی طرف منسوب ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سریانی تھی۔ جب نمرود سے جدا ہو کر آپ نے نہر فرات کو عبور کیا تو اللہ تعالے نے آپ کی زبان عبرانی کر دی کیونکہ نمرود نے اپنی پولیس سے کہہ دیا تھا کہ جو شخص تمہیں سریانی بولتا ہوا ملے اس کو گرفتار کر لو تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہر فرات کو عبور کیا تو اس کے بعد اس زبان کا نام عبرانی ہو گیا۔ تیمی نے کہا ہے کہ تمام کتب سماویہ انجیل و توریت عبرانی زبان میں تھیں۔

علامہ عینی کہتے ہیں۔ انجیل اور توریت عبرانی زبان میں تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی وہ اولاد جو نبی ہوئی ان سب کی زبان سریانی تھی۔ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نہر فرات کو عبور کرنے کے بعد عبرانی بولتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی بولتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام تمام لغات کے عالم تھے۔ حضرت صالح و شعیب علیہما السلام کی زبان بھی عربی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اصلی زبان عربی تھی۔ پھر سریانی ہو گئی مگر قبولِ توبہ کے بعد پھر عربی بولنے لگے۔

سفیان کہتے ہیں کہ اللہ تعالے نے جو بھی وحی نازل فرمائی وہ عربی میں تھی اور انبیاء کرام اپنی قوموں کی زبان میں اس وحی کی ترجمانی کرتے تھے۔ سریانی زبان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ سِر سے مشتق ہے۔ اللہ تعالے نے ملائکہ سے پوشیدہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ زبان سکھائی تھی۔ اس لیے اسے سریانی کہنے لگے۔

لفظِ ناموس کی تحقیق لفظِ ناموس، جاسوس کے وزن پر ہے۔ دونوں کے معنی رازدار کے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ نامسته ای ساررته اس نے راز کو چھپایا۔

ناموس اور جاسوس میں فرق یہ ہے کہ ناموس خیر و برکت کا رازدار ہوتا ہے اور جاسوس برائی کا۔ جبرئیل امین کو ناموسِ اکبر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انبیاء کرام کے رازدار ہوتے تھے۔

لفظِ ملک کی تحقیق حدیث ہذا میں لفظ ملک ہے۔ لفظ ملائکہ کا واحد ملاک ہے جو بقاعدہ صرف ملک ہو گیا۔ یہ الوکۃ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پیغام کے ہیں۔ ملائکہ الٰہی، خالق و مخلوق کے درمیان قاصد ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے ان کو رسل اور رسل اللہ قاصدانِ الٰہی فرمایا ہے۔

یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا | اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر منتخب فرماتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ اللہ تعالے کے حکم سے کارخانہ الٰہیہ کو چلاتے ہیں۔ اسی لیے ان کو مدبراتِ امر کہا گیا ہے۔ سورہ نازعات میں ملائکہ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالے کے سراپا مطیع ہیں اور اس کے حکم کے تابع و فرمان ہیں حکمِ الٰہی سے کبھی روگردانی نہیں کرتے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتیں، ان کی آمد سے معمور ہیں اور کتبِ سماویہ کے ساتھ ان کا نام ضرور آتا ہے۔ ملائکہ کے سرخیل اور شہنشاہ حضرت جبرئیل ہیں۔ جو وحی رسالت کے لانے پر مامور ہیں اور دیگر امور کو سرانجام دینا ان کے فرائض ہیں۔

لفظ جبرئیل | عبرانی لفظ ہے جس کے معنی مردِ خدا کے ہیں لیکن اصطلاحِ شرع میں جبرئیل اس ملکِ مقرب کا نام ہے

جوخدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے اور جو رسل ملائکہ سے ہے۔ کتبِ عقائد میں

رسل الملائكة هم المبلغون لاحكام الوحي الى الانبياء من البشر وافضلهم جبرئيل عليه السلام كما اخرجه الطبراني مرفوعاً

اور مرسل ملائکہ وہ ہیں جو احکام وحی انبیاء بشری کو ہیں اور ان میں جبریل امین سب سے افضل ہیں طبرانی کی مرفوع حدیث میں آیا۔

(نبراس)

علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے لکھا:-

اتفق ائمة المسلمين ان حكم المرسلين منهم اي من الملئكة حكم النبيين سواء في العصمة وتعظيم الحرمة مما ذكرنا عصمتهم منه وانهم في حقوق الانبياء والتبليغ اليهم كالانبياء مع الامم

تمام ائمہ مسلمین کا اتفاق ہے کہ جو انبیاء کرام کا حکم ہے وہی مرسلین ملائکہ کا حکم ہے اور وہ عصمت و تعظیم حرمت میں برابر ہیں اور بے شک مرسلین ملائکہ کو حقوقِ حاصل ہیں اور جیسے انبیاء کرام امتوں کو احکام پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح مرسلین ملائکہ حضرات انبیاء کو احکام پہنچاتے ہیں۔

(شفاء مع نسیم الریاض و شرح علی قاری ج ۲ ص ۱۵۱)

قرآنِ حکیم میں جبریل علیہ السلام کو الروح الامین (امانت دار روح) بھی کہا گیا ہے اور روح القدس بھی قرآنِ پاک میں جبریل کا نام تین مقام پر آتا ہے۔ آغازِ وحی کی اس حدیث میں جو ملک کا لفظ آیا ہے اور جس کو ورقہ ناموس کے لفظ سے موسوم کیا ہے وہ یہی جبریل ہیں۔

۱- فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

۲- نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ

۱- جبریل نے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا۔

۲- تم فرماؤ اس کو روح القدس نے تیرے رب طرف سے سچائی کے ساتھ اتارا ہے۔

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ جبرئیل وہ فرشتہ ہیں جن کے سپرد وحی لانے کی خدمت ہے۔ حضرت جبریل ہی زلزلے، ہدم و غرق وغیرہ امور انجام دیتے ہیں۔ جبر سریانی زبان میں عبد کو کہتے ہیں اور ایل اللہ تعالیٰ کے میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت جبریل کا نام عبداللہ ہے اور میکائیل کا نام عبید اللہ ہے۔

حضرت جبرئیل کا اصلی نام

۱- بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کا اصلی نام عبدالجلیل ہے اور ان کی کنیت ابوالفتوح ہے۔

۲- میکائیل کا نام عبدالرزاق اور کنیت ابوالغنائم ہے۔

۳- اسرافیل کا نام عبدالخالق اور کنیت ابوالمنافع ہے۔

۴- عزرائیل کا نام عبدالجبار اور کنیت ابویحییٰ ہے علیہم السلام (عینی جلد ۱ ص ۴۳)

لفظ جبریل نو لغتوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:۔ جبرائیل، جبرائیل، جبرین، جبرال، بریل وغیرہ وغیرہ۔

بارگاہ نبوی میں جبریل امین کی حاضری کے لیے وقت مقرر نہ تھا، صبح و شام، روز و شب، صلح و جنگ، جبریل حاضری ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو لاحظہ فرمایا۔ جبریل امین انسانی شکل میں حاضری دیتے تھے اور حضرت دحیہ کلبی جو ایک حسین صحابی تھے ان کی شکل میں ایا کرتے تھے

فترۃ الوحی

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَ أَخْبَرَنِيْ أَبُوْ سَلَمَةَ بْنُ بْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ الْأَنْصَارِيَّ لَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ الَ فِيْ حَدِيْثِهِ بَيْنَا أَنَا أَمْشِيْ إِذْ سَمِعْتُ وْتًا مِنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ ذَا الْمَلَكُ جَاءَنِيْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰى رْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرُعِبْتُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ زَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ بَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ فَحَمِيَ الْوَحْيُ

ابن شہاب نے کہا کہ مجھے خبر دی ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری فترۂ وحی کے متعلق حدیث بیان کرتے تھے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں (غار حرا سے) آرہا تھا کہ آسمان سے ایک آواز میں نے سنی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ تو مجھے اس سے خوف آیا۔ میں گھر واپس ہوا اور میں نے کہا مجھے چادر اڑھا دو مجھے چادر اڑھا دو پھر اللہ تعالے نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ یا ایہا المدثر قم فانذر الخ

د و مسائل

۱۔ سورۃ اقراء کی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد وحی آنا بند ہو گئی تھی جس کی مدت تین سال بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد جبرائیل امین حاضر ہوئے تو سب سے پہلے سورۃ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں جن دیث زیر بحث میں ہے۔ اس کے بعد وحی آنا شروع ہو گئی اور ۲۳ سال تک قرآن حکیم کا نزول ہوتا رہا۔

۲۔ فترہ کے معنی سستی، کمزوری اور رک رک کے آنے کے ہیں۔ باری کے بخار میں وہ دن جن میں بخار نہیں آتا اسی وہ زمانہ جو دو نبیوں کے درمیان ہوتا ہے اس کو بھی فترہ کہتے ہیں۔ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب عارضی طور پر بند ہو گئی تو آپ بہت ملول رہتے تھے تا آنکہ رحمت الٰہی پھر متوجہ ہو گئی اور وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ فترۃ وحی کیوں س کی اصل حکمت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ البتہ بعض شارحین نے یہ حکمت بیان کی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے وحی آنا یے بند ہوئی کہ پہلی بار جو آپ پر وحی کی شدت اور ثقالت کے اثرات مرتب ہوئے تھے وہ دور ہو جائیں اور آپ کا ور بڑھ جائے۔

۳۔ حدیث زیر بحث میں وحی کے رکنے کے بعد پھر وحی کی ابتداء کا ذکر ہے یعنی اس امر کا بیان ہے کہ وحی کے رک

جانے کے بعد سب سے پہلے سورہ یاایہا المدثر کی مذکورہ بالا آیات کے نزول سے وحی کی ابتدا اس کیفیت کے ساتھ ہوئی کہ موحی الیہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے ہوئے تھے اور یہی ترجمۃ الباب تھا کہ وحی کی ابتدا کی کیفـ کیا تھی؟ یعنی ترجمۃ الباب میں جو ابتدا کا لفظ ہے وہ ابتداءً قبل احتباس اور ابتداءً بعد احتباس دونوں کو شامل ہے۔ اور حدیث زیر بحث میں ابتدا وحی بعد احتباس کی کیفیت کا ذکر ہے۔ لہٰذا حدیث زیر بحث اور ترجمۃ الباب میں مناسبت ظاہر ہے۔

تفسیر آیات سُورہ مُدثر

یاایہا المدثر۔ تدثر بمعنیٰ دثار۔ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو گرمی کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جیسے چادر، رضائی، کمبل وغیرہ؛ اور شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو بدن سے ملا ہوا ہو جیسے تہبند، بنیان، پاجامہ وغیرہ۔ نزول وحی کے وقت چونکہ حضور علیہ السلام اوڑھے ہوئے تھے اس لیے اسی لباس کے ساتھ حضور کو مخاطب کیا گیا جس سے واضح ہوا کہ اللہ عزوجل کو اپنے محبوب رسول کی ہر ادا محبوب ہے۔ حتیٰ کہ استعمال لباس کی ہیئت کذائی بھی اس درجہ پسند ہے کہ اس کے ساتھ ندا فرمائی اس میں امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انبیاء کرام کو ان کا نام لے کر ندا نہ کی جائے بلکہ ادب واحترام تعظیم و توقیر کے ساتھ معزز و پرعظمت اوصاف والقابات سے یاد کیا جائے۔ پھر اس خصوص میں حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ دیگر انبیاء کرام کو تو رب العزت جل مجدہ نے نام بنام خطاب کیا ہے۔ یا آدم، یا ابراھیم، موسیٰ، یا داؤد، یا عیسیٰ کی ندائیں قرآن میں موجود ہیں لیکن جب اپنے حبیب مکرم کو ندا فرمائی تو ان کی کمال عظمت ورفعت کے اظہار کے لیے ان کے نام پاک کے ساتھ ندا نہیں کی گئی بلکہ ان کے معزز اوصاف والقابات کے سا یاایہا النبی، یاایہا الرسول، طٰہٰ، یٰسین کے الفاظ سے خطاب فرمایا گیا ہے ؎

یا آدم است باپدر انبیاء خطاب
یاایہا النبی خطاب محمد است

قرآن نے آداب بارگاہ نبوت کے سلسلہ میں فرمایا:۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا

رسول کو اس طرح مت پکارو جیسے تم آپس میں دوسرے کو پکارتے ہو

حضُور کا نام لے کر ندا کرنا ممنُوع ہے

علامہ صاوی علیہ الرحمۃ نے تحت آیت فرمایا کہ آیت معنی یہ ہیں کہ حضور کو ان کا نام لے کر یا محمد یا ابوالقا کر ندا نہ کرنا چاہیے بلکہ تعظیم و توقیر کے ساتھ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، یا امام المسلمین، یا رسول رب العالمین خاتم النبیین الفاظ کے ساتھ ندا کیا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کو ایسے الفاظ

واستفید من الآیۃ انہ لا یجوز نداء النبی بغیر ما یفید التعظیم لا فی حیاتہ ولا بعد وفاتہ

کے ساتھ ندا جائز نہیں۔ جس سے تعظیم مفہوم نہ ہو۔ نہ دنیوی حیات میں اور نہ وصال کے بعد

لہذا تحریر و تقریر میں جب بھی نام اقدس لیا جائے تو تعظیم و توقیر کے ساتھ لیا جائے اور درود و سلام لکھا جائے محض نام اقدس اور وہ بھی ایک عام انداز میں اور بغیر درود و سلام کے لکھنا اور بولنا انتہائی درجہ کی شقاوت و بدنصیبی ے۔ اللہ تعالے ہم سب کو آداب نبوی کے پاس و لحاظ کی توفیق عطا فرمائے۔

۲۔ بعض علماء نے یہ معنی کیے۔

دثر بلباس النبوة والمعارف نسيله (تفسیر ابو السعود)	اے ہماری معرفت اور نبوت کی پوشاک زیب تن فرمانے والے۔

۳۔ تدثیر کے معنی "طائر کا اپنے گھونسلے کو درست کر لینا" کے بھی آتے ہیں تو اب یا ایھا المدثر کے معنی یہ ے کہ اے کاشانۂ عالم کو درست و محکم بنانے والے رسول، کاشانۂ عالم حضور کے علو مراتب کے مقابلہ میں ایک آشیانہ یثیت رکھتا ہے۔ حضور کا اس آشیانہ کو درست و محکم بنا دینا، اہل عالم کی ضروریات مادی و اخلاقی و روحانی کو مکمل فرما ے۔ یہ تکمیل انذار اور تکبیر و تہلیل ربانی اور تطہیر خلائق از علائق مادی و قلبی کی تدابیر سے فرمائی گئی۔ رجز و رجس ور طہارتِ ظاہری و باطنی سے اہل عالم کو حضور ہی نے مطہر بنایا ہے۔

۴۔ تدثر کے معنی "کود کر گھوڑے پر سوار ہونے" کے بھی آتے ہیں جیسے بولتے ہیں تدثر فرسہ ای ب علیہ فرکبہ تو اب یا ایھا المدثر کے معنی یہ ہوں گے کہ نہایت ہی جوانمردی، تیزی اور احتیاط کے ساتھ صب نبوت کو ادا کرنے والے رسول۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضور علیہ السلام نے نہایت ہی حزم و احتیاط ساتھ اور انتہائی جوانمردی، صداقت و امانت کے ساتھ فرائض نبوت کو ادا فرمایا اور قرآن نے حضور علیہ السلام س کوشش کے نتیجہ کا یوں اعلان فرمایا۔ ورایت النّاس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا

ربک فکبّر

فقہاء نے اس آیت کو تکبیر تحریمہ کی فرضیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ لفظ تکبیر کبھی بمعنی تعظیم آتا ہے اور آیت مذکورہ میں فکبّر کا صیغہ بیر بمعنی تعظیم سے ماخوذ ہے اور مامور بہ مطلقاً" تعظیم نہیں بلکہ وہ تعظیم ہے جو تکبیر تحریمہ کے ضمن میں حاصل ہوتی س سے تکبیر تحریمہ مراد ہونے پر اہل تفسیر متفق ہیں۔ اور اس مراد پر اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے اور تکبیر تحریمہ ف اللہ اکبر کو نہیں کہتے بلکہ اس سے مراد ذکر الٰہی ہے۔ جس کے بعد بلا فصل[1] نماز شروع ہو جاتی ہے تو اللہ اکبر س کا ایک فرد ہوا تو آیت سے بطریق مذکور تکبیر تحریمہ بمعنی ذکر مذکور کی فرضیت ثابت ہوئی نہ لفظ اکبر۔

بیر تحریمہ کا اس فرد مخصوص (اللہ اکبر) کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ کا یہی ب ہے اور یہ وجوب حدیث سے مستفاد ہے لہذا اگر تکبیر تحریمہ میں اللہ اکبر نہ کہا اور اس کی جگہ بیر وغیرہ الفاظ کہے جو تعظیم خداوندی پر دلالت کرتے ہیں تو فرضیت ادا ہو گئی، کیونکہ مامور بہ تکبیر بمعنی تعظیم

---

[1] ق الفلاح اور اس کے حاشیہ طحاوی ص۱۱۱ پر ہے اجمع المسلمون علی ان المراد بہ تکبیرۃ الافتتاح وعلیہ الاجماع ۱۲ والذکر الذی تعقبہ الصلوٰۃ بلا فصل ھو تکبیرۃ الافتتاح بدائع ج ۱ ص ۱۳۰

ہی تھی جو ان الفاظ سے حاصل ہو جاتی ہے البتہ وجوب سے بری الذمہ نہ ہو گا۔

تکبیر تحریمہ نماز میں فرض ہے

اور کبھی لفظِ تکبیر، اللہ اکبر کے معنیٰ میں بھی آتا ہے تو اللہ اکبر کہنا مامور بہ ہوا اور امر وجوب کے لیے ہے لہٰذا اللہ اکبر کہنا واجب قرار پایا اور چونکہ یہ امر فکبر کتاب کا جز ہونے کی وجہ سے قطعی ہے اور امر قطعی کے مامور بہ کو اصطلاح میں فرض کہتے ہیں اس لیے اللہ اکبر کہنا فرض ہوا اور اللہ اکبر کہنے کی فرضیت اجماعاً بجز تحریمہ اور کہیں نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ حکم تحریمہ کے لیے ہے ورنہ نص معطل ہو جائے گی۔ بس بوقتِ تحریمہ خاص لفظ اللہ اکبر کہنا فرض ثابت ہوا —— لیکن اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ امر "فکبر" کے مامور بہ سے مراد تکبیر تحریمہ ہے تو اللہ اکبر کہنے کی طلب سے مراد تکبیر تحریمہ بجا لانا ہوا جو اللہ اکبر کہنے سے عام ہے لہٰذا اس تقریر سے بھی تکبیر تحریمہ کی فرضیت ثابت ہوئی۔

فائدہ

یہ نہ کہا جائے کہ اس آیت کے نزول کے وقت نماز فرض ہی نہ تھی۔ پھر تکبیرِ تحریمہ کی فرضیت کیسی؟ کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت حضور نفل ادا فرماتے ہوں تو اس میں تکبیر تحریمہ کا حکم آ گیا (تفسیر کبیر) —— نیز یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول متاخر ہے اور ان کے حکم کا نفاذ مقدم تھا جیسے آیتِ وضو کہ یہ بالاجماع مدنی ہے اور اس کا حکم پہلے[1] ہی مکہ میں نماز کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اسی طرح آیتِ جمعہ کہ مدنی ہے حالانکہ نمازِ جمعہ کے حکم کا نفاذ ہجرت سے قبل ہو چکا تھا اور بعض آیات ایسی ہیں جن کا نزول مقدم اور حکم کا نفاذ مؤخر[2] ہے جیسے سورۂ مزمل میں وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کہ یہ آیت مکی ہے اور اس کے حکم پر عملدرآمد مدینہ منورہ میں ہوا (اتقان) اس لیے ممکن ہے کہ آیت وربک فکبر کا نزول مقدم ہوا اور حکم پر عملدرآمد مؤخر ہو۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ

"ثیاب" ثوب کی جمع ہے اور "طہّر" تطہیر سے مشتق ہے۔ ان دونوں لفظوں میں چار احتمال ہیں۔ اوّل: یہ کہ ثوب اور تطہیر کے حقیقی معنیٰ مراد ہوں تو اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں کو نجاست سے پاک رکھیے۔ اندرونِ نماز یا بیرونِ نماز؟ آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن آیت "ربک فکبر" میں جب اجماعاً تکبیر تحریمہ مراد ہے اور یہ پہلی آیت کے بعد بلافصل واقع ہے تو بقرینہ سباق آیت ثیابک فطہر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ بحالتِ نماز کپڑے پاک رکھے جائیں۔ چنانچہ کپڑوں کا پاک رکھنا اندرونِ نماز فرض ہے۔ بیرونِ نماز مستحب ہے فرض نہیں —— اور بر تقدیر بیرونِ نماز مراد یہ

---

[1] واضح رہے کہ مکہ میں نماز کے ساتھ وضو کا حکم اس وقت قرآن میں کسی آیت میں نازل نہیں ہوا بلکہ بعد میں مدینہ شریف میں وضو کا حکم آیا۔ اس سے واضح ہوا کہ مکہ میں ہجرت سے قبل وضو کا حکم اس وحی کے ذریعے نازل ہوا تھا جو حضور پر قرآن کے علاوہ نازل ہوتی تھی۔

[2] اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ قرآنی احکام کے نفاذ کے متعلق بھی اللہ تعالےٰ قرآن کے علاوہ حضور پر وحی فرماتا تھا اور حضور اسی وحی کے مطابق جو قرآن کے علاوہ ہوتی تھی قرآنی احکام کو نافذ و جاری فرماتے تھے اور یہ بات حضور کی ذاتِ مقدس کے ساتھ خاص تھی۔ حضور کے وصال کے بعد قرآن کا کوئی مؤخر و مقدم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حضور کے بعد کسی پر وحی کا آنا اور کسی کو نبوت کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔ فافہم

ہوں کہ مشرکین اپنے کپڑوں کو نجاست سے پاک نہیں رکھتے۔ آپ ان کی عادت اختیار نہ کریں۔ تو یہ حکم بیرونِ نماز کے لیے ہوا کیونکہ اس وقت تک نماز فرض نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ امر استحباب کے لیے ہوا۔ یعنی بیرونِ نماز کپڑوں کو نجاست سے پاک رکھنا مستحب ہے۔

دوم: یہ کہ ثوب کے حقیقی معنیٰ اور تطہیر کے مجازی معنیٰ مراد ہوں تو اس صورت میں اگر تطہیر بمعنیٰ تقصیر لی جائے تو اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں میں تقصیر کی جائے یعنی اہلِ عرب کی طرح اتنے لمبے نہ ہوں کہ زمین سے لگیں کیونکہ یہ متکبرین کا طریقہ ہے ـــــ اور اگر تطہیر بمعنیٰ ازالہ[1] نجاستِ معنوی ہو تو اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ کپڑوں کو نجاستِ معنوی سے پاک رکھئے یعنی حلال طریقہ پر حاصل کئے گئے ہوں مغصوب نہ ہوں۔

سوم: یہ کہ ثوب کے معنیٰ مجازی اور تطہیر کے حقیقی معنیٰ مراد ہوں۔ اس احتمال پر ثیاب بمعنیٰ جسد[2] ہوگا تو اب معنیٰ یہ ہوں گے۔ مشرکین بوقتِ استنجا نظافت کا خیال نہیں کرتے ان کی اس عادت سے اجتناب چاہیے۔

چہارم: یہ کہ ثوب اور تطہیر دونوں میں مجازی معنیٰ مراد ہوں۔ اس احتمال پر اگر لفظِ ثیاب بمعنیٰ نفس ہوگا تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اپنے نفس کو اخلاقِ ذمیمہ سے پاک رکھئے ۲۔ ثوب بمعنیٰ دین بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے خواب میں لوگوں کو کپڑے پہنے ہوئے دیکھا (بخاری) پھر آپ نے اس کی تعبیر دین سے فرمائی ۳۔ ثوب بمعنیٰ عمل و اخلاق اور بمعنیٰ عورت (بیوی) اور بمعنیٰ خلق و نیت بھی استعمال ہوتا ہے تو اب معنیٰ یہ ہوں گے۔

"اپنے اخلاق اچھے رکھئے۔ اپنے عمل کو درست رکھئے۔ اپنے دین کو پاک رکھئے۔ اپنی بیویوں کو بذریعہ وعظ و نصیحت و تادیب پاک رکھئے۔ اپنے قلب اور اپنی نیت کو پاک رکھئے۔"

۲۔ امام بیضاوی نے فرمایا کہ معنیٰ یہ ہیں۔ فطہر دثار النبوۃ یعنی پوشاکِ نبوت کو ایسی چیزوں سے پاک رکھئے جو اس کے مناسب نہیں۔ جیسے کینہ، بغض و حسد وغیرہ۔

واضح ہو ان سب احتمالوں میں اول بہر حال راجح ترین ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لفظ ثیاب اور لفظ تطہیر اور امر تینوں اپنے حقیقی معنیٰ پر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس باقی احتمالوں میں بلا ضرورت حقیقت سے عدول لازم آتا ہے۔ اسی لیے فقہائے احناف نے آیت مذکورہ میں حقیقی معنیٰ اختیار کیے ہیں اور

---

[1] واضح ہو کہ تطہیر کا بمعنیٰ تقصیر مجاز ہونا ظاہر ہے لے اور تطہیر بمعنیٰ ازالہ نجاستِ معنوی میں دو قول ہیں اول یہ کہ نجاستِ حسی جیسے پاخانہ پیشاب وغیرہ) اور نجاستِ معنوی جیسے زنا، چوری، شراب خوری، گناہ وغیرہ میں تطہیر حقیقت ہے۔ دوم یہ کہ تطہیر نجاستِ حسی کے ازالہ میں حقیقت اور نجاستِ معنوی کے ازالہ میں مجاز ہے۔ احتمالِ دوم کی دوسری صورت اسی قول پر مبنی ہے (فافہم)

[2] اہلِ عرب لفظ ثیاب کو بمعنیٰ جسد استعمال کرتے ہیں۔ عرب کا مشہور شاعر عنترہ کہتا ہے۔ فشککت بالرمح الاصم ثیابه ای جسده بالرمح الاصم اہل عرب ایسے شخص کو جو برے اخلاق سے متصف ہو طاھر الثیاب کہتے ہیں نیز

باقی اگلے صفحہ پر

بحالتِ نماز طہارتِ ثوب کی فرضیت کا اثبات اسی آیت سے فرمایا ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ رجز کے چند معنیٰ ہیں۔ اصنام، عبادتِ اصنام، معصیت، شرک، پلیدی، عذاب، شیطان ——— یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اخلاقِ عالیہ وصفاتِ حسنہ سے خلقتاً موصوف ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ وذمیمہ، عہد شکنی، تکبر وریا وغیرہ سے پاک صاف ہوتے ہیں۔ اسی طرح رجز کے پانچوں معنیٰ سے بھی انبیاء کرام کا پاک وصاف ہونا بدیہی امر ہے اور مذکورہ بالا احتمالوں کی بناء پر وثیابک فطہر کا ترجمہ ہوگا کہ اپنے اخلاق اچھے رکھئے۔ عمل کو درست رکھیے۔ دین کو پاک رکھیے؛ تو کیا اس حکم کے نزول سے قبل آپ کے اخلاق اچھے نہ تھے؛ یا عمل درست نہ تھا؟ اسی طرح رجز کے معنیٰ اگر عبادتِ اصنام کے لیے جائیں تو ترجمہ ہوگا "بتوں کی عبادت ترک کر دیجئے"۔ معصیت کے لیے جائیں تو ترجمہ ہوگا۔ "معصیت ترک کر دیجئے"۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ جس وقت حضور علیہ السلام کو ترک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس وقت آپ عبادتِ اصنام کرتے تھے یا معصیت کے ساتھ متصف تھے۔ غرضکہ رجز کے جو بھی معنیٰ لیے جائیں اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ بروقت حکم آپ اس معنیٰ کے ساتھ متصف ہوں؛ حالانکہ یہ محال ہے۔ جواب یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں اور کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ اس لیے دونوں جگہ فطہر و فاھجر کا امر مداومت کے لیے ہے۔ لہذا وثیابک فطہر کے معنیٰ یہ قرار پائیں گے کہ اخلاقِ حسنہ کے ساتھ تو آپ پہلے ہی سے متصف ہیں لیکن اخلاقِ حسنہ کے اختیار کرنے پر مداومت فرمائیے۔ اسی طرح والرجز فاھجر کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اصنام کی عبادت اور معصیت کا ارتکاب تو آپ سے ممکن ہی نہیں ہے لیکن عبادتِ اصنام وغیرہ کے ترک پر ہمیشگی (مداومت) کیجئے۔ یعنی جیسے اب تک آپ ان سے علیحدہ رہے ہیں آئندہ بھی علیحدہ رہیں اور اس کی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں مثلاً یاایہا النبی اتق اللہ اے اللہ کے نبی اللہ سے ڈریئے۔ ولا تطع الکافرین کافروں کی اطاعت نہ کیجئے یا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمانا۔ لا تتبع سبیل المفسدین مفسدوں کا راستہ اختیار نہ کیجئے تو ان سب آیتوں میں امر مداومت کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے تو آپ ڈرتے ہیں۔ آئندہ بھی ڈرتے

خبیث العمل آدمی کو خبیث الثیاب کہا جاتا ہے۔ ٹہ چنانچہ ابراہیم حلبی نے غنیہ میں فرمایا۔ علی ان المراد به حقيقة التطه
ويراد ايضاً حال ارادة الصلوٰة ليكون الامر على حقيقة ايضاً وما قيل ان المراد فقصر ففيه
عدول عن الحقيقة من غير ضرورة۔ وقال الامام الطحطاوی فی حاشية در مختار ص۱۹۰
فان الاظهر ان المراد ثيابك الملبوسة فى الصَّلوٰة وَتطهيرها من النجاسة وَهُوَ قول
الفقهاء وارجح التفاسير (منہ) لہ ایک جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس نوع کی جملہ آیات میں گو خطاب حضور
سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت ہے۔

رہیے۔ مفسدوں کے راستہ کو اختیار کرنا آپ کے لیے ممکن ہی نہیں ہے آئندہ بھی اس راستہ کو اختیار نہ کیجیے۔

حضور علیہ السلام کے سینہ میں الفاظ اور معانی قرآن کے جمع کرنے کا اللہ ذمہ دار ہے

حدیث ۴ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً وَّكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَأَنَا أُحَرِّكُهُمَا لَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَرِّكُهُمَا وَقَالَ سَعِيدٌ أَنَا أُحَرِّكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا يُحَرِّكُهُمَا فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ قَالَ جَمْعُهُ لَكَ صَدْرُكَ وَتَقْرَأَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ قَالَ فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ فَكَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذٰلِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اسْتَمَعَ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ

(بخاری)

سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس سے آیت لا تحرک بہ لسانک کی تفسیر میں یہ بیان کیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کے نازل ہونے سے شدت محسوس فرماتے تھے۔ بسا اوقات اپنے لبوں اور زبان کو حرکت دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں میں بھی اپنے لبوں کو اسی طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم حرکت دیتے تھے۔ سعید نے کہا میں بھی اسی طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح حضرت ابن عباس اپنے لبوں کو حرکت دیتے تھے۔ پھر سعید نے اپنے لبوں کو حرکت دی تو اس پر اللہ تعالے نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ اے محبوب تم وحی اپنی زبان پر ادا کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ بیشک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا تمہارے سینہ میں جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے (یعنی اللہ تعالے کے) ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس وقت اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو۔ اتباع کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ "اس کو سنیں اور خاموش رہیں پھر یقیناً وحی کے مطلب کا سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ بیان کی تفسیر میں ابن عباس نے فرمایا۔ پھر بے شک ہمارے ذمہ ہے کہ آپ اس کو پڑھتے رہیں گے اور اس کے بعد جب حضور کی خدمت میں جبرئیل حاضر ہوتے تو حضور لبوں کو حرکت دینے کے بجائے سنتے رہتے پھر جب وہ چلے جاتے تو پھر حضور اس کو ویسا ہی پڑھ لیتے جیسا

انھوں نے پڑھا تھا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب التفسیر و باب فضائل القرآن میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الصلوٰۃ میں۔ امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ بوقتِ وحی تکلیف محسوس فرمانے کی وجہ اس کی ثقالت اور کلامِ الٰہی کی ہیبت تھی۔ اسی لیے قرآن نے وحی کو قولِ ثقیل کہا۔ لب کو حضور علیہ السلام اس لیے ہلاتے تھے تاکہ وحی یاد ہو جائے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں۔ یعنی متنِ قرآن کا آپ کے سینہ میں ضبط کرنا اور آپ کے حافظہ میں محفوظ کرنا ہمارا کام ہے ۳۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام جب وحی سُناتے تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ یاد کرنے کے لیے اپنی زبانِ مبارک کو ہلاتے اس پر فرمایا کہ آپ ایسا نہ کیجیے۔

۱۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ	قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے۔
۲۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ	جب ہم پڑھیں تو تم اس پڑھنے کی پیروی کرو
۳۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قرآن)	پھر وحی کے مطالب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ان آیات سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآنِ مجید کا کوئی حکم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے مجمل و مبہم نہیں ہے۔ ال عزّوجل نے جس طرح سینۂ نبوی میں قرآنِ مجید کو محفوظ کر دینے کی ذمہ داری لی ہے۔ اسی طرح اس کے مطالب و معانی اور اس کے اصولوں کے جزئیات کے تعین و تبیین کی ذمہ داری بھی لی ہے۔ اسی لیے فرمایا:۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (قرآن)	ہم نے تم پر کتاب اُتاری جس میں ہر شے کا روشن بیان ہے۔

یہ ہر شے کا روشن بیان ہر ایک کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ستو صفات کے لیے ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے اصولوں کی حضور علیہ السلام نے جو تبیین و تش فرمائی ہے اور جو مطالب و معانی اپنے قول و عمل سے اُمت کو تعلیم دیتے ہیں وہ سب وحی الٰہی سے ہے اور و (سُنّت) بھی قرآنِ مجید کی طرح دین ہے اور قرآنِ حکیم کی طرح ہی واجب العمل ہے۔

فائدہ حدیثِ زیرِ بحث میں راوی سے نقلِ تفسیر میں سہو واقع ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے ان تف کو بیانہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے حالانکہ وہ بیانہ کی تفسیر ہے اور قرانہ کی تفسیر یہ نہیں بلکہ اس کی تفسیر ان نبینہ علی لسانک ہے جیسا کہ بخاری کتاب التفسیر میں مذکور ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپ عہدِ صحابہ کے سب سے کمسن مفسرِ قرآن ہیں۔ حضو علیہ السلام کے چچازاد بھائی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے آپ کو دُعا دی تھی کہ الٰہی ان کو حکمت اور تاویلِ قرآن سکھا۔ یہ اسی دُعا کا اثر تھا کہ جلیل القدر صحابہ کرام نے آپ

ے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ آپ سے مشکل مسائل میں مشورہ لیتے تھے اور
کیا کرتے تھے۔

عباس فتى الكهول له لسان سئول
وقلب عقول (استیعاب)

ابن عباس جسیم اکابر کے جوان ہیں ان کو خدا نے سوال کرنے والی زبان اور سمجھنے والا دل دیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود اس دور کے ایک جلیل القدر مفسر تھے۔ ان کا جو مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس سے کہ وہ خود اپنی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن کریم کی ہر آیت کی بابت جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلتا جو مجھ سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والا ہے اور سواری کے ذریعے اس تک پہنچنا ممکن ہوتا تو اس کے پاس ضرور پہنچتا۔" لیکن اس جلالت مرتبہ کے باوجود حضرت ابن عباس کے بارے میں ان کا ارشاد یہ ہے:-

سعود ترجمان القرآن ابن عباس لو ادرك
سننا ما عاشره منا رجل

عبداللہ ابن عباس کیا خوب مفسر ہیں اگر وہ ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کی ہمسری کی جرأت نہ کرسکتا۔

حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ سیدنا ابن عباس جس راستے سے گزر جاتے۔ وہ خوشبو سے معطر ہو جاتا۔ حضرت ابن عباس عبادلہ اربعہ میں سے ایک ہیں۔ عبادلہ اربعہ کے نام یہ ہیں۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن زبیر، امام احمد نے فرمایا کہ ذیل کے چھ صحابہ کثیر الروایت ہیں

اور ان میں سب سے زیادہ کثیر الروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں۔ حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر، حضرت انس، حضرت ابن عمر رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین۔

حضرت ابن عباس سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۹۵ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۱۲۰ پر صرف بخاری نے اور ۴۹ حدیثوں پر صرف مسلم نے اتفاق کیا ہے۔ بوقت وصالِ نبوی آپ کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال تھی (عینی جلد ۱ ص ۴۲) ستر سال کی عمر میں بمقام طائف ۶۸ھ میں وفات پائی۔ حضرت محمد بن حنفیہ نے نماز جنازہ پڑھانے کے بعد کہا آج اُمت کا مفسر اُٹھ گیا۔

حدیث نمبر ۵۔ رمضان میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دَور

ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدَ
يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور تمام اوقات سے زیادہ آپ رمضان میں زیادہ سخی ہو

جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ (بخاری)

جاتے تھے جب کہ جبریل علیہ السلام سے ملاقات کر تھے۔ حضرت جبریل امین رمضان کی ہر رات میں آ تھے اور آپ کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان دنوں میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔

تشریح الفاظِ حدیث

اجود النّاس۔ اجود اسم تفضیل کا صیغہ ہے جود سے مشتق ہے۔ اس کے معنی (اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی) یعنی مناسب چیز منا شخص کو دینے کے ہیں۔ یہی معنی سخاوت کے ہیں تو اجود الناس کے معنی ہوئے تمام لوگوں سے زیادہ سخ ایک حدیث میں فرمایا " اللہ تعالے سب سے زیادہ جود فرمانے والا ہے۔ پھر تمام انسانوں سے سخی تر میں ہو میرے بعد وہ شخص جو علمِ دین کو پھیلائے "۔

حضور علیہ السلام اجود الخلق ہیں

یہاں النّاس کی قید اس لیے ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ظاہر ہے کہ جب بہ نسبت اشرف المخلوقات حضور اجود ہیں تو ب غیر اشرف تو بدرجہ اولیٰ اجود قرار پائیں گے جس سے واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام نہ صرف اجود الناس ہیں بلکہ اجود الخلق ہیں اور وہ بھی ایسے کہ دنیا و آخرت آپ کے خوانِ جود کا ایک ٹکڑا ہے۔ امام بوصیری قدس سرہ نے اسی لیے عرض کیا ؎

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا
وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

حضور! دنیا و آخرت آپ کے خوانِ جود کا ایک ٹک
اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ

رَمَضَانَ سے رمضان کا مہینہ مراد ہے۔ یہ رمض سے مشتق ہے۔ رمض کے معنی جل جانے کے چونکہ اس وقت جب اس مہینہ کا نام رکھا گیا تھا گرمی تھی۔ اس لیے اس کا نام رمضان ہو گیا۔ یدارس باب مفاعلہ ہے۔ درس کے معنی سرعت کے ساتھ پڑھنے کے ہیں۔ یعنی رمضان المبارک میں حضور اکر جبریل امین قرآنِ پاک کا دور فرماتے تھے۔

الرِّیح المرسلۃ۔ وہ ہوا جو لوگوں کے نفع کے لیے بھیجی جائے۔ حضرت ابن عباس رضی تعالے عنہ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مطلقاً فیاض اور تھے لیکن رمضان المبارک میں حضور علیہ السلام کی سخاوت اور دنوں سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی ایک تو جبریل سے ملاقات ہوتی تھی جو اللہ کے پیامبر تھے دوسرے رمضان مبارک وہ عظیم الشان مہینہ ہے اس میں لیلۃ القدر ہے اور رمضان کے مہینہ میں نیک کاموں کا ثواب دگنا ملتا ہے۔

۲- امام زہری نے فرمایا کہ رمضان میں ایک مرتبہ اللہ کی تسبیح کرنا ستر مرتبہ تسبیح کرنے کے مترادف ہے

پھر جبریل کی حاضری اور قرآن پاک کا دور یہ وہ باتیں ہیں جن سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو روحانی کیف صل ہوتا تھا اور اس کے شکریہ میں حضور علیہ السلام بہ نسبت دیگر ایام اور زیادہ سخاوت فرماتے تھے ۔ ضرت جبریل کے ساتھ قرآن کے دَور میں متعدد حکمتیں تھیں ۔ اللہ تعالٰے نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم پڑھائیں گے اور پھر آپ بھُولیں گے نہیں ۔ اس لیے جبریل امین رمضان کی ہر رات میں حاضر ہو کر دَور فرماتے اور رمضان کے مہینہ کو درس کے لیے اس لیے بھی مقرر فرمایا کہ اسی ماہ میں قرآنِ کریم لوحِ محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل ہوا اور پھر یہاں سے حسبِ مصلحت ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا ۔

سائلِ حدیث

۱۔ سخاوت بہر صورت بہتر ہے اور مومن فیاض ہے ۔ ۲۔ رمضانِ مبارک کے مہینہ میں زیادہ سخاوت کرنی چاہیے کیونکہ ثواب زیادہ ملتا ہے ۔ ۳۔ صلحاء اور اہلِ خیر کی زیارت کرنا باعثِ برکت ہے ۔ جیسے جبریل امین علیہ السلام بار بار حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ف ہوتے تھے ۔ ۴۔ رمضان المبارک میں قرآنِ حکیم خصوصیت کے ساتھ زیادہ پڑھنا بھی مستحب ہے ۔ ۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت تمام اذکار و وظائف سے افضل ہے کیونکہ تمام وظائف کی اصل قرآن مجید ہی ہے ۶۔ قرآن ید کے دَور کرنے اور بار بار پڑھنے سے قرآن یاد رہتا ہے اور حفاظ کے لیے قرآنِ مجید کا دَور ناگزیر ہے ۔ دَور کے یر قرآنِ مجید بھُول جاتا ہے ۷۔ وکان یلقاہ من کل لیلۃ من رمضان میں ابتدائی نزول کی یفیت کی جانب اشارہ ہے تو ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہوئی کہ وحی کی ابتداء رمضان المبارک کے مہینہ ے ہوئی ۔

زولِ قرآن کی ابتداء اور کتبِ سماویہ کے نزول کی تاریخیں

۱۔ واضح ہو کہ قرآنی وحی کے نزول کی ابتداء رمضان المبارک وشنبہ میں ہوئی ۔ جیسا کہ حدیث زیرِ بحث کے مذکورہ جملہ میں بصراحت مذکور ہے کہ جبریل امین رمضان کی ات میں حاضر ہو کر ایک مرتبہ قرآن کا دَور کیا کرتے تھے تو قرآنی دَور کے لیے بارہ مہینوں میں رمضان کا انتخاب سی مناسبت سے ہوا کہ زمین پر نزول کی ابتداء رمضان سے ہوئی تھی ۔ علاوہ ازیں خود قرآنِ مجید میں بھی اس کی ریح ہے ۔ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ۲۔ اسی طرح لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا رآن کا یکبارگی نزول بھی رمضان میں ہوا یعنی جبریل امین لوحِ محفوظ سے پورا قرآن اخذ کر کے آسمانِ دُنیا پر ے اور وہاں فرشتوں کو املا کرایا ۔ فرشتوں نے موجودہ ترتیب کے مطابق اپنے صحیفوں میں لکھ کر بیت العزۃ میں یا جو آسمانِ دنیا پر ایک مقام ہے ۔ پھر جبریل امین یہاں سے وقتاً فوقتاً حسبِ اقتضائے حکمت جتنا منظورِ الٰہی ہوا ۔ بحضور نبوی پیش کرتے رہے حتیٰ کہ بذریعہ جبریل امین نزولِ قرآن تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں ہوا ۳۔ علماء فرماتے ہیں کہ صحفِ ابراہیم رمضان کی یکم کو ــــ توریت ۲۰ رمضان کو ــــ انجیل رمضان کو اور قرآنِ حکیم ۱۷ رمضان کو نازل ہوا ۔ پھر جتنا قرآن مجید نازل ہوتا ایک رمضان سے دوسرے

رمضان تک ... اس کا دور کیا جاتا تھا اور جس سال حضور علیہ السلام کا وصال ہوا اس سال دو بار دور ہوا۔

ہرقل کے دربار میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کے متعلق ابوسفیان کا بیان

حدیث نمبر ۷ مَسْعُوْدٍ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّ اَبَا سُفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ اَخْبَرَهٗ اِنَّ هِرَقْلَ اَرْسَلَ اِلَيْهِ فِيْ رَكْبٍ مِّنْ قُرَيْشٍ وَّ كَانُوْا تُجَّارًا بِالشَّامِ فِي الْمُدَّةِ الَّتِيْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَادَّ فِيْهَا اَبَا سُفْيَانَ وَ كُفَّارَ قُرَيْشٍ فَاَتَوْهُ وَهُمْ بِاِيْلِيَاءَ فَدَعَاهُمْ فِيْ مَجْلِسِهٖ وَحَوْلَهٗ عُظَمَاءُ الرُّوْمِ ثُمَّ دَعَاهُمْ وَدَعَا تَرْجُمَانَهٗ فَقَالَ اَيُّكُمْ اَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ قَالَ اَبُوْ سُفْيَانَ فَقُلْتُ اَنَا اَقْرَبُهُمْ نَسَبًا فَقَالَ اَدْنُوْهُ مِنِّيْ وَقَرِّبُوْا اَصْحَابَهٗ فَاجْعَلُوْهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهٖ ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهٖ قُلْ لَّهُمْ اِنِّيْ سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ فَاِنْ كَذَبَنِيْ فَكَذِّبُوْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ اَنْ يَّاْثِرُوْا عَلَيَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَنْهُ ثُمَّ كَانَ اَوَّلَ مَا سَاَلَنِيْ عَنْهُ اَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهٗ فِيْكُمْ قُلْتُ هُوَ فِيْنَا ذُوْ نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ اَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهٗ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ اٰبَائِهٖ مِنْ مَّلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَاَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُوْنَهٗ اَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ قُلْتُ بَلْ ضُعَفَاؤُهُمْ

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ابوسفیان
حرب نے ان سے بیان کیا کہ ہرقل (شاہِ روم)
ان کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ جب کہ وہ قریش کے
سواروں میں (بیٹھے) تھے اور یہ لوگ شام میں تاجر بن کر
تھے اور یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ حضور اکرم
ابوسفیان اور کفارِ قریش سے ایک معاہدہ کیا
چنانچہ یہ لوگ ہرقل کے پاس آئے جب کہ یہ لوگ ای
میں تھے تو ہرقل نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا
کے گرد روم کے رئیس بھی جمع تھے۔ ہرقل نے ان
اپنے پاس بلایا اور ترجمان کو بھی بلایا۔ پھر ابوسف
ان کے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں اس شخص کا قریب
کون ہے۔ جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کا نبی ہے
حضور اکرم)؟ ابوسفیان نے کہا۔ میں حضور اکرم
قریبی رشتہ دار ہوں۔ ہرقل نے کہا۔ ابوسفیان
سامنے کھڑا کردو اور اس کے ساتھیوں کو اس کے
کھڑا کردو۔ پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ
کہو میں ابوسفیان سے اس شخص کا حال معلوم کر
(جس نے نبوت کا دعوےٰ کیا ہے) اگر یہ (ابوسف
جھوٹ بولیں تو تم ان کی تکذیب کردینا۔ ابوسف
کہتے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کی شرم نہ ہوتی
ساتھی میرے جھوٹ کو ظاہر کردیں گے تو میں حض
کے متعلق غلط بیانی سے کام لیتا۔ پھر سب سے
سوال ہرقل نے مجھ سے یہ کہا: قیصر: مدعی نبو
خاندان کیسا ہے؟ ابوسفیان: وہ (حضور اکرم

قَالَ أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ قُلْتُ بَلْ يَزِيدُونَ قَالَ هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سَخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ قُلْتُ قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا قَالَ وَلَمْ تُمْكِنِّي كَلِمَةٌ أُدْخِلُ فِيهَا شَيْئًا غَيْرُ هَذِهِ الْكَلِمَةِ قَاتَلْتُمُوهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ۔ قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ قَالَ مَا يَأْمُرُكُمْ قُلْتُ يَقُولُ اعْبُدُوا اللَّهَ وَحْدَهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاؤُكُمْ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهُ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُو نَسَبٍ فَكَذَلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا قُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَأْتَسِي بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ

ہیں شریف خاندان سے ہیں۔ قیصر، اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوے کیا؟ ابوسفیان، نہیں قیصر، جن لوگوں نے اس کا (یعنی حضور کا) اتباع کیا ہے وہ کمزور (غریب) لوگ ہیں یا اشراف (صاحب اثر)؟ ابوسفیان، کمزور لوگ۔ قیصر، اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟ ابوسفیان، بڑھتے جاتے ہیں۔ قیصر، اس کے پیروؤں میں سے کوئی اس کے دین کو برا جان کر مرتد بھی ہو جاتا ہے یا نہیں؟ ابوسفیان، نہیں! قیصر، کیا تم نے اس کو نبوت کے دعوے سے قبل جھوٹ کے ساتھ متہم بھی کیا ہے؟ ابوسفیان، نہیں۔ قیصر، وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے یا نہیں؟ ابوسفیان، ابھی تک تو اس نے بدعہدی نہیں کی اور اب ہمارا اس کا معاہدہ ہوا ہے نہیں معلوم وہ اس میں کیا کرے گا؟ (ابوسفیان کہتے ہیں کہ سوائے اس کلمے کے میں حضور کے خلاف اور کوئی بات نہ کہہ سکا) قیصر، تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی ہے؟ ابوسفیان، ہاں۔ قیصر، جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟ (یعنی فتح کس کو ہوتی ہے) ابوسفیان، ہماری اس کی لڑائی ڈولوں کی طرح ہے۔ کبھی ڈول ہماری طرف آتا ہے اور کبھی ہم سے اس کی طرف (یعنی کبھی ہمیں فتح ہوئی کبھی اس کی۔ قیصر، وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے۔ ابوسفیان، اس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو خدا کا شریک مت بناؤ اور وہ باتیں ترک کر دو جو تمہارے ماں باپ کہتے ہیں (یعنی بت پرستی) وہ ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاکدامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اس کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ۔ میں نے تم سے اس کے نسب کے

مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ قَالَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ اتَّبَعُوهُ وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَسَأَلْتُكَ أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذٰلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ حَتّٰى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ أَيَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوبَ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَأَلْتُكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ فَلَوْ أَنِّي أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ

متعلق پوچھا تم نے اس کو شریف النسب بتایا اور پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے یہ بھی پوچھا کہ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوےٰ کیا ہے۔ تم نے کہا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے تم نے کہا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو اپنے باپ کی حکومت مطلوب ہے (یعنی حکومت کی ہوس ہے) میں نے تم سے سوال کیا تم نے کبھی اس کو نبوت کے دعویٰ سے قبل جھوٹ سے متہم کیا ہے تم نے کہا نہیں۔ پس جو شخص کسی آدمی سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ضعیف لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں یا اشراف اور مالدار۔ تم نے جواب دیا غریب لوگ تو پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم سے میں نے پوچھا کہ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ بڑھ رہے ہیں تو ایمان کا یہی حال ہے یہاں تک کہ پورا ہو جائے (یعنی سچا مذہب بڑھتا ہی جاتا ہے) میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کو برا سمجھ کر کوئی پھرتا ہے؟ تم نے کہا نہیں: تو ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے دل میں سما جاتی ہے کہ جب وہ پختہ ہو جائے (یعنی جب ایمان کامل ہو جائے تو پھر کفر سے نفرت ہو جاتی ہے) میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس نے کبھی بد عہدی بھی کی ہے؟ تم نے کہا نہیں تو انبیاء کا یہی حال ہوتا ہے وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ میں نے تم سے اس کی تعلیم کے متعلق پوچھا تھا تم نے کہا وہ ہم کو ایک خدا کو پوجنے اور اس کا کسی کو شریک نہ بنانے کا حکم دیتا ہے بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہے۔ نماز سچائی اور پاکدامنی کا

ـوگیا ہے۔ پس اگر جو کچھ تم نے جواب میں کہا ہے، صحیح ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا اور میں ـتا تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم میں ہوگا (یعنی قریش میں پیدا ہوگا) اور اگر مجھے یہ امید ہوتی ـس تک پہنچ جاؤں گا تو ضرور اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔"

ـمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ ـيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ بَعَثَ بِهٖ مَعَ ـحْيَةَ الْكَلْبِيِّ اِلٰى عَظِيْمِ بُصْرٰى ـدَفَعَهٗ عَظِيْمُ بُصْرٰى اِلٰى ـرَقْلَ فَقَرَأَهٗ فَاِذَا ـيْهِ

ـسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ ـبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ ـرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ـا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ ـسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ ـجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ ـيْكَ اِثْمَ الْيَرِيْسِيِّيْنَ وَيٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا ـىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ ـلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا ـعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا ـشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

ـالَ اَبُوْ سُفْيَانَ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ ـنْ قِرَاءَةِ الْكِتٰبِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ ـرْتَفَعَتِ الْاَصْوَاتُ وَاُخْرِجْنَا فَقُلْتُ ـاَصْحَابِيْ حِيْنَ اُخْرِجْنَا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ ـىْ كَبْشَةَ اِنَّهٗ يَخَافُهٗ مَلِكُ ـنِي الْاَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوْقِنًا اَنَّهٗ ـيَظْهَرُ حَتّٰى اَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الْاِسْلَامَ

پھر قیصر نے حضور علیہ السلام کا خط طلب کیا جو حضور علیہ السلام نے حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بصرے کے رئیس کو ارسال فرمایا تھا اور رئیسِ بصریٰ نے ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا (یہ خط ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا تھا) ہرقل نے اس نامہ مبارک کو پڑھا۔ فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیسِ اعظم (بادشاہ) ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لا۔ سلامت رہے گا۔ خدا تجھ کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہلِ ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے۔ اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو ہم تو ایک خدا کے تابعدار ہیں۔

ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب ہرقل نے یہ باتیں کیں اور نامہ اقدس پڑھنے سے فارغ ہوا تو دربار میں بڑا شور ہوا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم دربار سے باہر نکال دیئے گئے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب ہم دربار سے نکال دیئے گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابوکبشہ کے بیٹے کا درجہ بڑھ گیا ہے۔ بنی اصفر کا بادشاہ ان سے ڈرتا ہے (ابوکبشہ حضور کے رضاعی والد ہیں) (بنی اصفر

كَانَ ابْنُ النَّاطُوْرِ صَاحِبُ اِيْلِيَاءَ وَ
هِرَقْلَ سُقُفًّا عَلٰى نَصَارَى الشَّامِ
يُحَدِّثُ اَنَّ هِرَقْلَ حِيْنَ قَدِمَ
اِيْلِيَاءَ اَصْبَحَ يَوْمًا خَبِيْثَ
النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهٖ قَدِ
اسْتَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُوْرِ
وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً يَنْظُرُ فِى
النُّجُوْمِ فَقَالَ لَهُمْ حِيْنَ سَاَلُوْهُ اِنِّىْ
رَاَيْتُ اللَّيْلَةَ حِيْنَ نَظَرْتُ فِى النُّجُوْمِ
مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ فَمَنْ
يَخْتَتِنُ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ قَالُوْا
لَيْسَ يَخْتَتِنُ اِلَّا الْيَهُوْدُ فَلَا
يُهِمَّنَّكَ شَاْنُهُمْ وَاكْتُبْ اِلٰى
مَدَايِنِ مُلْكِكَ فَلْيَقْتُلُوْا مَنْ فِيْهِمْ
مِنَ الْيَهُوْدِ فَبَيْنَا هُمْ عَلٰى اَمْرِهِمْ اُتِىَ
هِرَقْلُ بِرَجُلٍ اَرْسَلَ بِهٖ مَلِكُ
غَسَّانَ يُخْبِرُ عَنْ خَبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ
هِرَقْلُ قَالَ اذْهَبُوْا فَانْظُرُوْا
اَمُخْتَتِنٌ هُوَ اَمْ لَا فَنَظَرُوْا اِلَيْهِ
فَحَدَّثُوْهُ اَنَّهٗ مُخْتَتِنٌ وَسَاَلَهٗ
عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَتِنُوْنَ
فَقَالَ هِرَقْلُ هٰذَا مَلِكُ هٰذِهِ
الْاُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ
اِلٰى صَاحِبٍ لَهٗ بِرُوْمِيَةَ وَكَانَ نَظِيْرَهٗ
فِى الْعِلْمِ وَسَارَ هِرَقْلُ اِلٰى حِمْصَ فَلَمْ
يَرِمْ حِمْصَ حَتّٰى اَتَاهُ كِتَابٌ مِنْ

سے روم کے لوگ مراد ہیں ، ابوسفیان کہتے ہیں کہ پھر
مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور غلبہ ہو گا۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے
اسلام نصیب کر دیا اور ابن ناطور جو ایلیا کا امیر تھا او
ہرقل کا مصاحب تھا اور شام کے نصاریٰ کا سردار
بھی تھا وہ کہتا ہے کہ جب ہرقل ایلیا میں آیا تو ایک صبح
پریشان حال اٹھا تو ہرقل کے بطارقہ (مصاحبوں) نے
کہا کیا بات ہے آج ہمیں تمہاری طبیعت خراب دکھا
دیتی ہے۔ ابن ناطور کہتا ہے کہ۔ ہرقل کاہن بھی تھا
ستاروں کو دیکھا کرتا تھا تو ہرقل نے مصاحبوں کے سوال
پر جواب دیا میں نے رات ستاروں کو دیکھا تو مجھے معلو
ہوا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے تو بتا
اس امت میں کونسی قوم ختنہ کراتی ہے تو مصاحبوں نے جو
دیا۔ یہودی ختنہ کراتے ہیں لیکن آپ کو ان سے ڈرنے
ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے علاقہ کے شہروں کے حا
کو حکم دے دیجئے کہ ان شہروں میں جو بھی یہودی ہیں
کو قتل کر دیں۔ ابھی ہرقل اور اس کے مصاحب اسی
میں مصروف تھے کہ ہرقل کے حضور ایک شخص لایا گیا
غسان کے بادشاہ نے بھیجا تھا جو حضور اکرم صلے اللہ
کے حالات کی اطلاع دیتا تھا۔ جب ہرقل نے اس شخص
حضور علیہ السلام کے حالات معلوم کیے تو اپنے مصا
کہا۔ جاؤ دیکھو وہ ختنہ شدہ ہے یا نہیں تو انھوں نے
علیہ السلام کا حال دیکھ کر واپس آ کر بتایا کہ آپ مختو
پھر ہرقل نے عرب کے متعلق پوچھا تو جواب دیا گیا کہ
ختنہ کراتے ہیں۔ ہرقل نے کہا۔ بس یہی شخص (حضو
علیہ السلام) اس امت کے بادشاہ ہیں جو ظاہر
ہے۔ پھر نجوم اور علامات کے ذریعہ ہرقل نے جو
قائم کی تھی اس کی مزید تائید کے لیے ہرقل نے اپنے

صَاحِبِهٖ يُوَافِقُ رَاْيَ هِرَقْلَ عَلٰى خُرُوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَّهٗ نَبِيٌّ فَاَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَآءِ الرُّوْمِ فِيْ دَسْكَرَةٍ لَّهٗ بِحِمْصَ ثُمَّ اَمَرَ بِاَبْوَابِهَا فَغُلِّقَتْ ثُمَّ اطَّلَعَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الرُّوْمِ هَلْ لَّكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ وَاَنْ يَّثْبُتَ مُلْكُكُمْ فَتُبَايِعُوْا هٰذَا النَّبِيَّ فَحَاصُوْا حَيْصَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ اِلَى الْاَبْوَابِ فَوَجَدُوْهَا قَدْ غُلِّقَتْ فَلَمَّا رَاٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَاَيِسَ مِنَ الْاِيْمَانِ قَالَ رُدُّوْهُمْ عَلَيَّ وَقَالَ اِنِّيْ قُلْتُ مَقَالَتِيْ اٰنِفًا اَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰى دِيْنِكُمْ فَقَدْ رَاَيْتُ فَسَجَدُوْا لَهٗ وَرَضُوْا عَنْهُ فَكَانَ ذٰلِكَ اٰخِرَ شَاْنِ هِرَقْلَ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُوْنُسُ وَمَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ

نجومی دوست کو جو رومیہ میں تھا۔ یہ تمام حال لکھا۔ یہ شخص ہرقل کا علم میں مثل تھا۔ پھر ہرقل حمص چلا گیا۔ ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ دوست کا جواب آ گیا جس میں ہرقل کی رائے اور حساب نجوم کی تائید کی گئی تھی کہ حضور علیہ السلام عرب میں پیدا ہو چکے ہیں۔ آخر ہرقل نے حمص میں اپنے محل میں روم کے رئیسوں کو جمع کیا اور محل کے دروازے بند کروا دیئے۔ پھر ان پر ظاہر ہوا اور ارکانِ دولت و روسائے مملکت کو خطاب کر کے کہا۔ اے رومیو! کیا تم اپنا فائدہ اور بھلائی چاہتے ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ تمہارا ملک سلامت رہے؟ تو اس نبی کی بیعت کر لو جو عرب میں ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ کلمات سنتے ہی تمام سردارانِ روم وحشی گورخر کی طرح دروازوں کی طرف لپکے تو دروازہ کو بند پایا۔ ہرقل نے جب ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو کہا کہ میں نے ابھی ابھی تم سے جو بات کہی تھی وہ تو صرف اس لیے کہی تھی تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ تم اپنے دین پر کس قدر ثابت قدم ہو اور وہ مجھے ظاہر ہو گیا۔ یہ بات سن کر تمام سردار سجدہ میں گر گئے اور ہرقل سے راضی ہو گئے۔ بس یہ آخری حال ہے ہرقل کا۔

فوائد و مسائلِ حدیث

۱۔ حدیث ہذا کو امام نے ابواب ذیل میں چودہ جگہ ذکر کیا ہے۔ تفسیر، جہاد، شہادت، جزیہ، مغازی، استیذان، ادب، علم، احکام، خبرِ واحد وغیرہ ابواب میں اور امام مسلم نے مغازی میں۔ ابوداؤد نے ادب میں۔ ترمذی نے استیذان میں اور نسائی نے تفسیر میں ذکر کیا۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا ۲۔ ہرقل روم کا لقب قیصر ہے یہ بہت بہادر، جنگجو اور جبار بادشاہ تھا۔ یہ لفظ ان کی لغت میں قطع سے مشتق ہے۔ اس کی والدہ مر گئی تھی اور پیٹ کا آپریشن کر کے اس کو نکالا گیا تھا۔ قیصر فخر کیا کرتا تھا کہ میں شرمگاہ کے راستے پیدا نہیں ہوا ۳۔ ایک حدیث میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیصر کی ہلاکت کے بعد دوسرا قیصر نہ ہوگا اور کسریٰ کے مرنے کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا۔ علامہ عینی فرماتے ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ملکِ شام میں دوسرا قیصر نہ ہوگا۔ اور عراق میں کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی اس پیشگوئی کے مطابق شام میں قیصر اور عراق میں کسریٰ آج تک کوئی نہیں ہوا اور نہ ہوگا امام حجت

سفیان رضی اللہ تعالٰے عنہ جلیل القدر صحابی ہیں - آپ کا نام صخر کنیت ابوحنظلہ ہے - واقعہ عام فیل سے دس سال قبل پیدا ہوئے اور فتح مکہ کے دن ایمان لائے - طائف، حنین اور جنگ یرموک میں شریک ہوئے - غنائم حنین سے حضور علیہ السلام نے ان کو ایک سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا تھا - ان کی ایک آنکھ یوم طائف میں اور دوسری جنگ یرموک میں خراب ہو گئی تھی - آخری ایام مدینہ میں گزرے - اور وہیں ۳۱ھ میں وفات پائی - ۸۸ برس کی عمر ہوئی - حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالٰے عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی - آپ سے حضرت معاویہ اور ابن عباس لوگوں نے حدیثیں روایت کی ہیں - سفیان نامی متعدد صحابہ ہوتے ہیں مگر سفیان بن حرب صرف یہی ہیں -

۵ - مختلف ملکوں کے بادشاہوں کے لقب - یہ ہیں - حبشہ نجاشی - ترک خاقان - قبط، فرعون - مصر عزیز - یمن تبع - فارس کسریٰ - ہند - خسرو - یونان، بطلیموس - یہود، قیطون - بربر، جالوت - روم، قیصر ۶ - قیصر نے ۳۱ سال حکومت کی اور اسی کے عہد حکومت میں حضور علیہ السلام نے وصال فرمایا ہے - ہرقل کے نام حضور علیہ ال نے صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں بذریعہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ دعوتِ اسلام کا خط بھیجا تھا - علامہ قسطلا علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ ہرقل نے ازراہِ تعظیم اس خط کو سونے کے ڈبے میں رکھا اور یہ خط برابر ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک منتقل ہوتا رہا اور یہ سب نامہ اقدس کی تعظیم و توقیر کرتے تھے - بادشاہِ فرنگ نے ملک منص قلاوون صالحی کے زمانہ میں سیف الدین فلیح کو ایک سونے کا صندوق دکھایا اور اس میں سے ایک خط نکالا جس اکثر حروف مدھم ہو گئے تھے - اس نے کہا یہ تمہارے پیغمبر کا خط ہے جو انھوں نے ہمارے دادا قیصر کے بھیجا تھا - ہمارے باپ دادا کی یہ وصیت تھی کہ اس کو احتیاط سے رکھنا - جب تک یہ خط تمہارے پاس رہے تمہارے خاندان میں سلطنت باقی رہے گی -

۸ - حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ایک نہایت حسین صحابی ہیں - ان کا نام زید ہے - حضرت جبریل امین علیہ السلام نبی علیہ السلام کے پاس اکثر دحیہ کی صورت اختیار کر کے حاضری دیا کرتے تھے - آپ قدیم الاسلام ہیں - بدر کے علاوہ تمام مع میں شریک ہوئے - آپ نے امیر معاویہ کی خلافت کا زمانہ دیکھا - صحابہ میں دحیہ نامی صرف یہی ہیں -

سلاطین کو اسلام کی دعوت

۹ - ۶ھ حدیبیہ کی صلح کے بعد وہ وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام د کانوں تک پہنچا دیا جائے - اس بنا پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دن تمام صحابہ کو جمع کیا اور خطبہ دیا - اے لوگو! خدا نے مجھے تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے - جاؤ میر سے پیغام حق ادا کرو - اس کے بعد حضور علیہ السلام نے قیصر روم، شہنشاہ عجم، عزیز مصر اور رؤسائے عرب کے نام اسلام کے خطوط ارسال فرمائے - جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے ان کی تفصیل یہ ہے -

۱ - حضرت دحیہ کلبی ، قیصر روم
۲ - عبداللہ بن حذافہ سہمی ، خسرو پرویز کجکلاہِ ایرا
۳ - حاطب بن بلتعہ ، عزیز مصر
۴ - عمرو بن اُمیّہ ، نجاشی بادشاہ حبش
۵ - سلیط بن عمرو بن عبد شمس ، رؤسائے یمامہ (تاریخ ابن ہشام وطبری)

۹- شجاع بن وہب بن الاسدی، رئیس حدودِ شام حارث غسانی

ہرقل کے نام جو حضور علیہ السلام نے تحریر فرمایا تھا۔ وہ حضرت دحیہ کلبی کے ذریعہ ارسال فرمایا تھا۔ ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی۔ جس کا ذکر کتاب مجید کی اس آیت غُلِبَتِ الرُّوم میں ہے۔ ہرقل نے اس کے انتقام کے لیے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو شکست دی۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہرقل حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور پھول بچھائے جاتے تھے (فتح الباری)

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایہ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس علاقہ کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کا نامہ مبارک یہیں سے بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا۔ اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس بھیج دیا۔ قیصر کو جب حضور علیہ السلام کا نامہ مبارک ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان (جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے) تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ابوسفیان کو غزہ سے جا کر لائے۔ پھر قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا۔ خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا۔ تخت کے چاروں طرف بطارقہ و قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں۔ پھر اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ حضرت ابوسفیان نے کہا۔ میں ہوں۔ پھر قیصر نے ابوسفیان سے سوالات کیے جن کا ذکر حدیثِ بالا میں ہے۔ اس کے بعد قیصر کو یقین ہو گیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں۔ اور آپ وہی ہیں جن کی آمد کا ذکر کتبِ سماویہ میں ہے۔ اس لیے اس نے رومیوں سے کہا کہ دین و دنیا کی بھلائی چاہتے ہو تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرو۔ پھر اس نے حضور علیہ السلام کا نامہ اقدس دربار میں پڑھ کر سنایا۔ قیصر کی زبان سے یہ کلمات سن کر رؤسائے روم برہم ہو گئے۔ قیصر نے جب یہ صورت دیکھی تو نزاکتِ وقت کو محسوس کر کے کہنے لگا۔ رومیو! میں تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں کہ تم اپنے مذہب پر کس قدر ثابت قدم ہو۔ یہ سن کر رومی سجدہ میں گر گئے اور قیصر سے راضی ہو گئے۔ قیصر کے دل میں گو اسلام کا نور آ چکا تھا اور اس پر اسلام کی حقانیت آفتاب کی طرح روشن ہو گئی تھی مگر تخت و تاج کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ گئی اور قیصر نے اسلام قبول نہیں کیا۔

۱۰- حدیث ہٰذا کا باب سے تعلق یہی ہے کہ اس میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ جمیلہ و خصائلِ حمیدہ کا بیان ہے۔ امام نے وحی کے باب میں اس حدیث کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ جس ہستی مقدس پر وحی آتی ہے اس کے یہ اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ شریف النسب ہوتا ہے اور اس کا اخلاق بلند اور سیرت بے داغ ہوتی ہے وہ کذب و دروغ و عہد شکنی وغیرہ ذالک عیوب سے پاک و منزہ ہوتا ہے اور دوست و دشمن اس کی پاکدامنی، راستبازی و صداقت کے معترف ہوتے ہیں۔ نبی کے تمام ظاہری افعال و اعمال اور کردار کے پیچھے نیت بھی نہایت پاک اور مخلص ہوتی ہے۔ وہ کسی دنیاوی منفعت اور مادی جاہ و اقتدار کے لیے حسنِ اخلاق و نیک کرداری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

مسائلِ حدیث

حدیثِ ہٰذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ ایک کافر کو اگر دعوتِ اسلام دی جائے تو اس کے دنیاوی اعزاز کا لحاظ رکھ کر خطاب کیا جائے اور دعوتی خط میں نرم الفاظ لکھے جائیں جیس رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہرقل روم کو عظیم الرُّوم کے الفاظ سے خطاب کیا۔ یعنی لے وہ کہ رومی جس عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ مکتوب اور اس کی ساری عبارت "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" کے مطابق ہے ۲۔ خط کی ابتدا بسم اللہ سے کی جائے اگر مکتوب الیہ کافر ہی ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط کی ابتدا جو انھوں بلقیس کے نام بھیجا یوں کی تھی۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مگر اس جواب یہ ہے کہ انھوں نے خط میں پہلے اپنا نام اس لیے لکھا تاکہ اگر بلقیس گالی دے تو اسم الٰہی اس کی زد سے بچا رہے (عینی جلد ۱ صـ ۱۰۱) ۳۔ خبرِ واحد پر عمل کا وجوب ثابت ہوا ورنہ حضور علیہ السلام صرف حضرت دحیہ کو نہ بھیجتے ۴۔ خطبہ میں اور خطوط میں اَمَّا بَعْدُ لکھنا مستحب ہے ۵۔ اہلِ کتاب میں سے جو شخص حضور علیہ السلا پر بھی ایمان لے آئے تو وہ دو اجر کا مستحق ہے ۶۔ علامہ خطابی نے کہا کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ حض علیہ السلام نے جو منع فرمایا ہے کہ دشمن کے ملک میں قرآن کو ساتھ لے کر سفر نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (قرآن پاک یا اکثر آیات کا مجموعہ جیسے پنجسورہ وغیرہ کے ساتھ سفر نہ کیا جائے۔ البتہ ایک دو آیتیں لکھی ہوئی تو سفر کر سکتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں منع ہے کہ کافر حکومت سے یہ خطرہ ہو کہ وہ قرآن پاک کی توہین کرے گی یا کو چھین لے گی ۷۔ جنگ سے پہلے کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے۔ دعوت سے قبل جنگ کرنا حرام ہے اگر ان کو دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہے تو پھر جنگ سے قبل دوبارہ اسلام کی دعوت دینا مستحب ہے ۸۔ بعض علما اسی حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کافر اور بے وضو شخص کو ایسی کتاب یا خط کا چھونا جائز ہے جس میں ایک آیاتِ قرآنیہ لکھی ہوں۔ جیسے حضور علیہ السلام کے مکتوب بنام ہرقل میں قرآنِ پاک کی آیت لکھی ہوئی تھی۔ صا ہدایہ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ حائضہ عورت اور جنبی قرآنِ پاک کا ایک لفظ بھی نہ پڑھے شَيْئًا مِّنَ الْقُرْاٰنِ، حدیث کے یہ مطلق الفاظ ہیں۔ جو اس امر پر دال ہیں کہ حائضہ و جنبی کو ایک پوری آیت تو درکنار آیت کم کا پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ کتبِ شرعیہ و فقہیہ جس میں آیاتِ قرآنیہ بھی لکھی ہوتی ہیں۔ محدث اس کو اس کے دامن سے پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح بچوں کو پڑھنے کے لیے قرآن دے سکتے ہیں اگرچہ وہ بے وضو ہوں کیونکہ با وضو کی تکلیف دینے میں حرج ہوتا ہے ۹۔ خطبہ یا تقریر یا خط میں فصیح و بلیغ الفاظ کا استعمال کرنا جائز ہے حضور علیہ السلام کا یہ خط فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے ۱۰۔ جھوٹ ہر امت میں عیب سمجھا گیا ہے یعنی اس کی قباحت بین الاقوامی چیز ہے ۱۱۔ انبیاء کرام افضل ترین افرادِ انسانیہ سے ہوتے ہیں ۱۲۔ یہ کہ اہلِ کتاب کو اس کا علمِ قطعی حاصل تھا کہ حضور علیہ السلام نبی صادق ہیں اور علاماتِ نبوت بھی ان کے علم میں تھیں۔ کتبِ سماویہ میں حض اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خصائل فضائل کا بالتصریح ذکر تھا مگر بغض و عناد اور ذاتی مفاد نے ان لوگوں کو قبول حق سے

کتاب الایمان

۱۔ چونکہ وحی خواہ وہ جلی ہو یا خفی دین کی اصل ہے اس لیے باب بدء الوحی کو امام بخاری نے بطور مقدمۃ الکتاب ذکر کیا کتاب اس کے بعد سب سے پہلے ایمان کی بحث شروع کردی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے پہلا واجب ایمان ہے۔ ہر خیر کا مبدا اور ہر کمال کا منتہا ایمان ہے۔ ایمان کو تمام امور پر فضیلتِ مطلقہ حاصل ہے اور دارین کی نجات ایمان پر موقوف ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ایمان کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۲۔ کتاب الایمان کے بعد بخاری میں کتاب الصلوٰۃ ہے۔ کیونکہ نماز کا مرتبہ ایمان کے بعد ہے اور قرآن و حدیث میں بھی نماز کو ایمان کے بعد رکھا گیا ہے۔ نماز دین کی بنیاد ہے اور دن میں پانچ وقت ہر مسلمان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لیے ایمان کے بعد صلوٰۃ کا بیان ضروری ہے۔

۳۔ صلوٰۃ کے بعد بخاری میں کتاب الزکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ ایمان کے تیسرے اور نماز کے بعد دوسرے درجہ پر ہے اور شارع نے زکوٰۃ کا ذکر صوم سے زیادہ کیا ہے اس لیے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الزکوٰۃ لائے۔

۴۔ زکوٰۃ کے بعد حج کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت تو محض مالی ہوگی یا بدنی یا مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہوگی۔ نماز محض بدنی عبادت ہے۔ زکوٰۃ محض مالی عبادت ہے اور حج مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہے اور مفرد مرکب سے پہلے ہوتا ہے اس لیے نماز اور زکوٰۃ کے بعد حج کا ذکر کیا۔

۵۔ بخاری میں حج کے بعد صوم کا ذکر ہے۔ حالانکہ فقہاء زکوٰۃ کے بعد صوم کا ذکر کرتے ہیں۔ فقہاء نے صلوٰۃ کے بعد صوم کو اس لیے ذکر کیا کہ یہ عبادت ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف حج کے کہ وہ عمر میں ایک بار ہی فرض ہے امام بخاری نے حج کو صوم سے پہلے ذکر کیا کیونکہ احادیثِ مشہورہ میں ان دونوں کا اسی ترتیب سے ذکر ہے۔

اسلام کی ہمہ گیری

دنیا کے مذاہب میں وہ کاملیت نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ دنیا کے مذاہب دین و دنیا کے کسی ایک شعبہ پر زور دیتے ہیں اور دوسرے شعبہ کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مذاہب کو اپنے دینی و دنیوی مسائل کی تکمیل کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کو اپنانے اور اس سے ہدایت لینے کی ضرورت پڑتی ہے مگر دینِ اسلام ایک کامل قانون اور مکمل شریعت ہے اور اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ یہ حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر حاوی ہے کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اصلاحِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی تکمیل اپنے ارشاد و عمل سے نہ کر دی ہو۔ اسلام میں حضور علیہ السلام کے سوا اور کچھ نہیں۔ عبادات ہوں یا اخلاق انسان کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ۔ ان سب کا ماخذ و مرکز ذاتِ نبوی ہے۔

لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر

منقسم ہے۔

۱۔ خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ ہے اس کا تعلق صرف دل سے ہے تو اس کا نام عقیدہ اور ایمان ہے
۲۔ اور اگر قلبی حالات کے ساتھ جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے ۳۔ باہم انسا
میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو تعلق ہے اور اس حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہوتے ہیں اگر ان
حیثیت قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے ۴۔ اور اگر قانون کی حیثیت نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور ہد
ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

غرضکہ دین اسلام عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق انہیں چاروں کا مجموعہ ہے اور ان میں ایما
عقیدہ تمام اعمال و افعال کی اصل ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے ایمان کے متعلق گفتگو کی جائے کہ
یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے۔

عقیدہ کی اہمیت اور ضرورت

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ عقیدہ و خیال کے بغیر حیاتِ انسانی کی
ناممکن ہے۔ عقیدہ کے عام معنیٰ غیر متزلزل اور پختہ اصول خیا
کے ہیں۔ یہی اصول خیالات انسان کے ارادہ اور عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ خیال کے بغیر ارادہ اور عمل کا ظہور ناممک
ایک معمار مکان بناتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں خیال ہوتا ہے۔ وہ خیال اس کو ارادہ پر مجبور کرتا ہے اور ارادہ عم
شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عمل اور ارادہ کا دا
خیال اور عقیدہ پر ہے۔ جسم انسانی میں دل ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام اقلیم بدن پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہی گوشت
وہ ٹکڑا ہے جس کو عقیدہ، خیال یا ضمیر سے موسوم کرتے ہیں۔ معلم کائنات نے بھی دل ہی کو تمام اعضائے انس
نیکی و بدی کا مرکز قرار دیا ہے۔

أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو
درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ
تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن حکیم نے دل کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں ۱۔ قلب سلیم، جو ہر گناہ سے پاک رہ کر نجات کے را
چلتا ہے ۲۔ قلب آثم، یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے (فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ) ۳۔ قلب م
رجوع ہونے والا دل جو اگر کبھی بھٹکتا ہے تو فوراً نیکی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ غرضکہ انسانی مشین کا ہر پرزہ ا
کے ارادہ و نیت کی طاقت سے چلتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم علیہ السلام نے فرمایا۔ "تمام کاموں کا مدار نیت پر

علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے عمل و ارادہ پر کوئی چیز حکمران ہے تو
کا عقیدہ ہے۔ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی و دماغی اصلاح مقدم ہے لہٰذا صحیح اور صالح عمل
ضروری ہے کہ چند اصول اس طرح مان لیے جائیں کہ وہ دل کا غیر متزلزل اور غیر مشکوک عقیدہ بن جائیں

عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

عقیدہ اعمال کی اساس ہے

قرآن پاک نے ایمان کا ذکر عمل کے ذکر سے لازمی طور پر پہلے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں قرار دیا کیونکہ ایمان وعقیدہ کے عدم سے اس نیت ارادہ کا عدم ہوجاتا ہے۔ جس پر حسنِ عمل کا مدار ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن جدعان کے متعلق پوچھا۔ جس نے جاہلیت کے زمانہ میں نیکی کے کام کیے تھے۔ کیا اس کو ثواب ملے گا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نہیں کیونکہ اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ الٰہی میرے گناہوں کو قیامت کے دن بخش دے۔ یعنی اس نے عمل تو نیک کیے مگر عمل کا جس عقیدہ پر مدار تھا وہ اس میں نہ پایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عقیدہ عمل کی اساس ہے اور عقیدہ کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔

ایمان کے بغیر عمل بے کار ہے

قرآنِ حکیم نے تمام اعمال کی اساس ایمان کو قرار دیا ہے اور ایمان سے محروم افراد کے کاموں کی مثال راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا کر کردیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا چنانچہ ارشاد ہے:۔

١- مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ رَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ (ابراہیم)	جنھوں نے اپنے رب سے کفر کیا۔ ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔
٢- وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور)	جنھوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

یہ اور اسی مضمون کی متعدد آیات ہیں جن میں اس امر کی تصریح ہے کہ ایمان کے بغیر عمل بیکار ہے اور ایمان سے محروم افراد خواہ کتنے ہی نیک عمل کریں وہ سراب اور راکھ کی طرح ہیں جیسے سراب سے پیاسا پانی نہیں پاتا۔ راکھ کے ڈھیر سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی طرح بے ایمان کے اعمال کا حال ہے۔

ایمان اور کفر کی تعریف

خدا کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے اور خدا کی اطاعت اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہمیں اس کی پسند و ناپسند کا علم ہو۔ ہم اپنے کسی عزیز یا دوست کی پسند و ناپسند کو اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک کہ وہ خود اپنے کلام سے یا طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ کردے تو جب عقلِ انسانی اپنے ہم جنس کی پسند و ناپسند کے ادراک سے قاصر ہے تو اس ہستی مقدس کی پسند و ناپسند کو صرف عقل کیسے جان سکتی ہے جس کا ادراک ہی سرحد عقل سے باہر ہے۔ دنیا میں انبیاء کرام کے بھیجنے کی حکمت ہی یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعے اللہ کی پسند و ناپسند سے واقف ہو جائے۔

پس اس دنیا میں خدا کے ماننے کا صرف یہی ایک حر ہے کہ اس کے رسول کی لائی ہوئی ہدایات کو دل وزبان سے تسلیم کیا جائے کیونکہ رسول خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں کے ذریعہ مخلوق کی ہدایت فر ہے اور انہیں کے ذریعے اللہ تعالےٰ کی پسند و ناپسند کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہد کے قبول کرنے کا نام اسلام ہے اور ان کی ہدایات کو قبول نہ کرنے کا نام کفر ہے۔

مذہب کا بنیادی مسئلہ کفر و ایمان ہے۔ اسی لیے قرآن کی سب سے پہلی سورہ (بقرہ) میں اس کو بیان کیا گیا او عالم کو تین گروہوں میں تقسیم کردیا۔ مومن، کافر، منافق۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیتوں میں مومنین کی شان کا بیان ہے بعد کی دو آیتیں کفار کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد تیرہ آیتیں منافقین کے حال میں ہیں۔ اگرچہ کافر و منافق اصل ایک ہی گروہ ہے۔ لیکن چونکہ منافق کی ظاہری صورت عام کفار سے مختلف ہوتی ہے اور منافقین کا گروہ بہ نسبت کھ ہوئے کافروں کے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے ان کے حالات کا بیان تیرہ آیتوں میں تفصیل سے کیا گیا۔

۱۔ الٓمّٓ ــــ مُفْلِحُوْنَ تک پانچ آیتوں میں مومن اور ایمان کا اجمالی ذکر ہے۔ الذین یؤمنو بالغیب یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غیب سے اس جگ تمام اعتقادات مراد ہیں جو انسان کی نظر اور مشاہدہ سے پوشیدہ ہیں۔ جیسے قیامت، جنت، دوزخ، پلصراط، میز عدل وغیرہ (خازن وابن کثیر)۔ اس ایمان اجمالی کی تفصیل بعد کی تیسری آیت میں کردی۔

وَالذین یؤمنون بما اُنزل الیك وما انزل من قبلك وبالاخرۃ هم یوقنون	جو حضور پر نازل شدہ کتاب اور شریعت پر ایمان لا گذشتہ انبیاء پر نازل شدہ وحی اور شریعت پر بھی آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

یہاں ایمان کے سب سے پہلے جزو ایمان باللہ کا صراحۃً ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ جب اللہ ہی پر ایمان تو اس کے اصولوں اور وحی پر ایمان کیونکر ہو سکے گا۔ اسی سورۃ کے ختم پر جب کہ ایمان کے مفہوم کی تشریح فرمائی گئی "ایمان باللہ" کو صریح لفظوں میں ذکر کیا گیا۔ "کل اٰمن باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ..... الخ چنانچہ ای و مفصل جو مشہور ہیں اس کا مبنی یہ ہے کہ ایمان مجمل سورہ بقرہ کی پہلی آیات سے اور ایمان مفصل اس کی آخری آیات اخذ کیا گیا۔

پس آیت مذکورہ سے ایمان کے تین بنیادی اصول معلوم ہوئے۔ اللہ پر ایمان لانا، رسول اللہ اور انبیاء س اور ان سب کی وحیوں پر ایمان لانا، آخرت پر ایمان لانا۔ یہی تین چیزیں دراصل ایمان کے اصول ہیں باقی سب ف

امام غزالی نے فیصل التفرقہ فی الاسلام والزندقہ میں لکھا۔

اُصُوۡلُ الۡاِیۡمَانِ ثَلٰثَۃٌ اَلۡاِیۡمَانُ بِاللّٰہِ وَبِرَسُوۡلِہٖ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا	ایمان کے اصول تین ہیں۔ اللہ تعالےٰ پر ایمان اس کے رسول پر ایمان لانا اور قیامت پر ای

ـداد فروع

کے سوا سب فروع ہے۔

اور ان اصولوں کو بھی مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "ایمان بالرسول" میں سب اصول آجاتے ہیں کیونکہ جب تک اللہ تعالے پر ایمان نہ ہو رسول پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا اور رسول پر ایمان ہو جائے تو یوم قیامت پر ایمان خود اس کے اندر داخل ہے کیونکہ "ایمان بالرسول" کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی تمام باتوں پر ایمان لایا ـ

ـسی لیے ائمہ اسلام نے ایمان کی تعریف یوں فرمائی۔

هُوَ التَّصْدِيْقُ بِمَا جَآءَ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَيْ تَصْدِيْقُ النَّبِيِّ بِالْقَلْبِ فِيْ جَمِيْعِ مَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِيْئُهٗ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِجْمَالًا

ایمان ان امور کی تصدیق کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے آئے یعنی اجمالی طور پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرنا ہر اس چیز میں جو آپ اللہ کی طرف سے لائے جس کا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہو۔

ثبوتِ قطعی ضروری وبالضرورۃ وضروریاتِ دین کی تعریف

۱۔ ثبوتِ قطعی :۔ یعنی وہ امور جو حضور علیہ السلام سے ہم تک بطریقِ تواتر پہنچے، کا ثبوتِ قطعی ہے جیسے تعداد رکعات، زکوٰۃ کی مقدار، قرآنِ حکیم وغیرہ۔ تواتر کے معنی یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام سے لے کر ہم تک ہر قرن اور ہر زمانہ میں دنیا کے مختلف خطوں میں اس بات کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا غلطی یا کذب پر متفق ہو جانا عقلاً محال ہے۔

۲۔ ضروری وبالضرورۃ :۔ عرف فقہا و متکلمین میں ضروری وبالضرورۃ کا مطلب یہ ہے کہ تواتر کے ساتھ ساتھ اس بات کی شہرت تمام خاص وعام مسلمانوں میں اس درجہ کی ہو جائے کہ عوام تک اس سے واقف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا۔ نبوت کا حضور علیہ السلام پر ختم ہونا وغیرہ۔

۳۔ ضروریات :۔ جو امور حضور علیہ السلام سے بذریعہ تواتر اس درجہ شہرت وبداہت کے ساتھ ثابت ہوں کہ ہر خاص وعام اس سے باخبر ہو۔ ان کو فقہاء و متکلمین کی اصطلاح میں ضروریاتِ دین سے موسوم کیا جاتا ہے۔

هُوَ مَا يَعْرِفُ الْخَوَاصُّ وَالْعَوَامُّ اَنَّهٗ مِنَ الدِّيْنِ كَوُجُوْبِ اعْتِقَادِ التَّوْحِيْدِ وَالرِّسَالَةِ وَالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ وَاَخَوَاتِهَا يَكْفُرُ مُنْكِرُهٗ (ردالمحتار صـ۳۶۶ جلد ۱)

ضروریاتِ دین وہ امور ہیں جن کو ان کی شہرت کی وجہ سے خواص وعوام سب ہی دین کی ضروری باتیں سمجھتے ہیں جیسے توحید، رسالت، پانچ نمازیں اور اسی کے مثل اور باتیں جن کا منکر کافر ہوتا ہے۔

۴۔ علامہ شہاب الدین ابن حجر اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں :۔

ـثم المعلوم بالضرورة من الشرع ـسمان احدهما مما يعرفه الخاصة ـثاني ما قد يخفى على بعض العوام

پھر ضروریاتِ دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسے ہر خاص وعام جانتا ہو (عام جو کہ مخالط بالخواص ہو) اور دوسری قسم وہ ہے جو کبھی بعض عوام پر مخفی رہتی ہے۔ جیسے

ولا ینافی فی هذا قولنا انه معلوم بالضرورة لان المراد من مارس الشریعة علم منها ما یحصل به العلم الضروری بذلك وهذا یحصل بعض الناس دون بعض بحسب الممارسة و کثرتها او قلتها او عدمها فالقسم الاول من انکره من العوام والخواص فقد کفر لانه کالمکذب للنبی صلی الله علیه وسلم فی خبره

۲- والقسم الثانی من انکره من العوام الذین لم یحصل عندهم من ممارسة الشرع ما یحصل به العلم الضروری لم یکفروا ان کانت کثرة الممارسة توجب للعلماء العلم الضروری

(فتاوی حدیثیہ ص۱۳۲)

۳- الا اذا ذکر له اهل العلم انه من الدین وانه قطعی فتمادی فیما هو علیه عنادًا فیکفر بظهور التکذیب منه حینئذٍ

(فتاوی حدیثیہ ص۱۳۲)

اس کے باوجود اسے معلوم بالضرورۃ کہا جائیگا کیونکہ بالضرورۃ سے وہ مسائل مراد ہیں جن کا ماہرین شر کو علم ضروری ہے اور یہ قلت وکثرت مہارت کی وج بعض کو معلوم ہوتا ہے اور بعض اس سے بے خبر ہیں۔ قسم اول کا انکار عوام وخواص میں سے جو شخ بھی کرے وہ کافر قرار پائے گا اس لیے کہ وہ نبی اللہ علیہ وسلم کی خبر میں حضور کی تکذیب کرتا ہے۔ اور قسم ثانی کا انکار اگر عوام میں سے وہ لوگ کریں شریعت میں مہارت تامہ حاصل نہیں جس کی سے انہیں علم ضروری حاصل ہو جائے تو وہ کا نہیں ہوں گے۔ اگرچہ کثرتِ مہارت علماء کے اس کے علم ضروری کو واجب کرتی ہے۔

لیکن جب اہل علم قسم ثانی کے منکر کو یہ بتا دیں ک مسئلہ دین سے ہے اور قطعی ہے۔ اس کے باو وہ منکر اپنی بات پر عناداً اڑا رہے تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی کیونکہ معلوم ہو جانے کے بعد انکا حضور علیہ السلام کی تکذیب کا ظہور ہو گیا۔

ان عبارات سے واضح ہوا کہ ضروریاتِ دین کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اول تو یہ ہے جس کا دینی ضروری ہونا کو معلوم ہوتا ہے اور ان عوام کو بھی معلوم ہوتا ہے جو علماء سے ربط وضبط رکھتے ہیں تو قسم اول کا انکار خواہ عوام خواص بہر صورت کفر قطعی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس کا ضروری دینی ہونا بعض عوام پر مخفی ہوتا ہے تو اگر عوام سے کوئی انکار کر دے تو اسے کافر قرار نہیں دیں گے لیکن جب کہ علماء اس کو بتا دیں کہ یہ مسئلہ بھی ضروری وقطعی ہے اس پر بھی وہ از راہ عناد انکار پر اصرار رہے تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی۔

الغرض ضروریاتِ دین اصطلاحِ شریعت میں انہیں امور کو کہا جاتا ہے جو حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ و بطریق تواتر ثابت ہوں اور عام طور پر مسلمان ان امور کو جانتے ہوں۔ اسلام وایمان کے لیے ان امور کا تسلیم کر ضروری ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔

فائدہ ضروریاتِ دین پر ایمان کے لیے ان کی پوری تفصیل کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔ نفسِ ایمان

…صدیق بھی کافی ہے۔ ایمانِ اجمالی کے الفاظ یہ ہیں:-

…ت بِاللّٰهِ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَ
…ـتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ

میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات وصفات میں ہے ایمان لایا اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کئے۔

…اس کلمہ میں خدا پر جیسا کہ وہ اپنی ذات وصفات میں ہے۔ ایمان لانے کا مجمل طور پر اقرار ہے مثلاً ایمان …سے خدا کی ذات وصفات کے متعلق دین سے جو بھی تفصیل معلوم ہوگی اس پر ایمان لانے کا اعتراف بھی ہے …طرح یہ جملہ کہ "اس کے تمام احکام قبول کرتا ہوں" یہ بھی مجمل ہے مگر بایں طور پر کہ ہر وہ حکم جس کا حکم الٰہی ہونا ثابت …اس پر ایمان لانے کا بھی اقرار ہے اس سے واضح ہوگیا کہ ایمانِ مجمل میں ایمان مفصل بہرحال داخل ہوتا ہے

…یمان مفصل کے الفاظ یہ ہیں:-

…ـتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَ
…ـلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ
…ـرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى
…ـعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت پر، نیکی و بدی پر اللہ کی طرف سے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لاتا ہوں۔

الغرض نجات کے لیے مجمل طور پر ایمانیات کو قبول کر لینا کافی ہے۔

…ـح ہو | کہ امور ایمانیہ کی جو تشریح و تفصیل کتاب و سنت نے کردی ہے۔ اس کو بعینہٖ تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان کا اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم و معنی متعین کرنا یا کسی قسم کی ترمیم کرنا گمراہی و بے دینی

…ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق کا نام ہے۔ تو کفر میں تمام ایمانیات کا انکار و تکذیب ضروری نہیں۔ …میں سے کسی ایک چیز کی تکذیب و انکار بھی کفر ہے۔ خواہ باقی تمام امور ایمانیہ کو صدقِ دل سے قبول کیا جائے۔

…تفصیلی گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ

ایمان۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو کہتے ہیں۔ ہر اس …میں جس کا ثبوت آپ سے قطعی وبدیہی طور پر ہو چکا ہے۔

مومن۔ وہ شخص ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرے۔ ہر اس امر میں جس کا ثبوت …سے قطعی طور پر ہوا ہے۔

اسلام۔ اللہ و رسول کی اطاعت (فرمانبرداری) کا اقرار بشرطیکہ اس کے ساتھ ایمان تصدیق قلبی موجود ہو۔

مسلمان۔ وہ شخص جو اللہ و رسول کی اطاعت کا اقرار کرے بشرطیکہ اس کے ساتھ تصدیق قلبی بھی ہو۔

کفر۔ جن امور کی تصدیق ایمان میں ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک امر کی تکذیب و انکار کفر ہے۔

کافر۔ وہ شخص ہے جو ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا دل سے انکار یا زبان سے تکذیب کردے۔

…سلام، ایمان، مسلم و مومن میں فرق

لغۃً ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری

کا۔ ایمان کا محل قلب ہے اور اسلام کا محل قلب اور سب اعضاء و جوارح ہیں۔ لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں۔ یعنی اللہ و رسول کی محض دل سے تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں۔ جب زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار اس وقت معتبر نہیں جب تک اس کے ساتھ دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔ غرضیکہ از روئے لغت ایمان واس الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بنا پر ایمان و اسلام کے اختلاف کا ذکر ہے لیک خود قرآن و حدیث ہی کی تصریحات کے مطابق یہی معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً کوئی ایمان بدون اسلام کے یا اسلام بدون کے معتبر نہیں ہے۔ اسی مضمون کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی ساخت تو ایک ہے فرق مبدء و م کا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر پر منتہی ہوتا ہے اور اسلام ظاہر سے شروع ہو کر قلب پر منتہی ہو ہے۔ اگر قلبی تصدیق ظاہری اقرار تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح ظاہری اقرار و اطاعت اگر تصد قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔ چنانچہ قرآن نے کہا۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

سے واضح ہو گیا کہ اللہ کا دین اسلام ہے اور ہر وہ چیز جو اسلام نہ ہو وہ غیر مقبول ہے اور ظاہر ہے کہ ایمان بھی دین ہ تو اگر ایمان، اسلام کا غیر ہوتا تو وہ مقبول نہ ہوتا لہٰذا اسلام اور ایمان کا ایک ہونا ثابت ہوا۔ شرح عقائد نسفی م

اَلْاِسْلَامُ وَالْاِيْمَانُ وَاحِدٌ	اسلام و ایمان شے واحد ہیں

علامہ شیخ کمال الدین ہمام شارح ہدایہ نے شرح مسامرہ میں فرمایا:۔

وَقَدِ اتَّفَقَ اَهْلُ الْحَقِّ وَهُوَ فَرِيْقَا الْاَشَاعِرَةِ وَالْحَنَفِيَّةِ عَلٰى تَلَازُمِ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ بِمَعْنٰى اَنَّهٗ لَا اِيْمَانَ يُعْتَبَرُ بِلَا اِسْلَامٍ وَعَكْسُهٗ	اہل حق نے اتفاق کیا اور وہ دونوں گروہ اش وحنفیہ ہیں کہ ایمان و اسلام باہم متلازم ہیں معنی کہ اسلام بغیر ایمان کے اور ایمان بغیر اس کے معتبر نہیں۔

یعنی یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر اس موقع پر یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ قرآن پاک میں ہے۔ قالت الاعراب ا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ اس آیت سے ثابت ہوتا اسلام بغیر ایمان کے بھی پایا جاتا ہے۔ جبھی تو قرآن حکیم نے اسلام کا اثبات اور ایمان کی نفی کردی۔ جواب یہ ہے ک میں جس اسلام کا ذکر ہے۔ وہ ہے جس میں تصدیق قلبی نہ ہو۔ جیسے جو شخص زبان سے کلمہ پڑھے اور دل میں تصدیق تو اس کا ایمان معتبر نہیں۔ تو آیت میں اعراب کے نفاق کا بیان ہے کہ تم لوگ ظاہری طور پر اطاعت کرتے ہ تمہارے دلوں میں تصدیق نہیں ہے اور شرعاً وہ اسلام معتبر ہے جس میں تصدیق قلبی بھی ہو۔ لہٰذا آیت کا مفہو کہ اسلام بغیر ایمان کے پایا جاتا ہے بلکہ اعراب کی منافقت کا بیان ہے۔ اگر کہا جائے کہ حدیث سے بھی ثابت ہو

سلام صرف زبان [illegible] حدیث [illegible] جیسے حضور [illegible] [illegible] نو عمر [illegible] ز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے۔ رمضان کے روزے رکھے، [illegible] کرے۔ جواب۔ یہ حدیث [illegible] میں اسلام کے ثمرات وعلامات کا بیان ہے۔ یعنی ایمان واسلام کی علامت یہ ہے کہ اسلام قبول کر کے احکام اسلامیہ کی تعمیل کرے۔ جب کہ دوسری حدیث میں فرمایا۔ تم جانتے ہو۔ ایمان کیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت دے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو ادا کرے۔ یہاں ایمان کی تعریف میں عمل کو صرف اس لیے داخل کیا تاکہ یہ بات معلوم ہوجائے کہ اعمال صالحہ ایمان واسلام کی علامتیں اور اس کے ثمرات ہیں تو اسی طرح مذکورہ بالا حدیث میں اسلام کے ثمرات وعلامات کا بیان ہے۔

کفر کی تعریف اور اس کے اقسام

کفر شریعت میں ایمان کی ضد ہے یعنی ایسے احکام شرعیہ جو ہم کو قطعی اور یقینی طور پر حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہنچے ہیں نہیں ماننا کفر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ کفر تکذیبِ رسول کا نام ہے پھر تکذیب کی چند صورتیں ہیں:۔

۱۔ صراحۃً حضور علیہ السلام کو اللہ کا رسول ہی تسلیم نہ کرنا جیسے ہندو، سکھ وعیسائی تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ رسول تسلیم کرنے کے باوجود آپ کے کسی قول کو صراحۃً غلط یا جھوٹ قرار دینا۔ یعنی آپ کی بعض ہدایات کو ماننا اور بعض کی تکذیب کرنا۔

۳۔ یہ کہ کسی قطعی الثبوت قول یا فعلِ رسول کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ یہ حضور علیہ السلام کا قول یا فعل نہیں ہے۔

۴۔ یہ کہ قول وفعلِ رسول کو تسلیم کرتے ہوئے قرآن وحدیث میں ایسی تاویلاتِ باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقائد کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہوجائے۔ ایسی تاویل بھی تکذیب رسول علیہ السلام کے حکم میں ہے۔

کفر وارتداد کا معیار کیا ہے؟

واضح ہو کہ کفر وارتداد اس صورت میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکم قطعی سے انکار کر دے۔ مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں ہے۔ جنت کا کوئی وجود نہیں ہے یا کوئی شخص پانچ وقت کی نماز تو شدت سے پابندی سے پڑھے مگر فرض و واجب نہیں مانتا تو یہ بھی کفر ہے اور دوسرا شخص جو غفلت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا مگر نماز کی فرضیت کا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہے اگرچہ فاسق وفاجر و سخت گنہگار ہے۔

دوسرے یہ کہ ثبوت کے اعتبار سے احکام اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہیں۔ تمام اقسام کا حکم ایک نہیں ہے تو کفر وارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت بھی ہوں۔

قطعی الثبوت کے معنی

یہ ہیں کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے حضور علیہ السلام سے لے کر آج تک ہر زمانہ، ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہیں کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔

اسی کو اصطلاحِ حدیث میں تواتر اور ایسی حدیث کو احادیث متواترہ کہتے ہیں۔

قطعی الدلالت کے معنی

ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے یا حدیث متواتر سے ثابت ہوں۔ ہے وہ اپنے مفہوم مراد کو صاف صاف بیان کرتی ہے کہ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ اور ابہام بھی نہیں۔

پھر اس قسم کے احکام قطعیہ اگر عوام و خواص میں مشہور و معروف ہوں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا، شراب اور زنا کا گناہ ہونا۔ حضور علیہ السلام کا خاتم الانبیاء ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعیہ کو ضروریات دین سے موسوم کرتے ہیں جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں۔

ضروریات دین اور قطعیات کے حکم میں کیا فرق ہے؟

ضروریات دین اور قطعیات کے حکم میں فرق یہ ہے کہ ضروریات دین کا انکار باجماعِ امت مطلق کفر ہے۔ ناواقفیت وجہالت کو اس میں عذر قرار دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی تاویل سنی جائے گی۔ اور قطعیات محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچے تو حنفیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی آدمی بوجہ ناواقفیت جہالت کے انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر وارتداد کا حکم نہ کیا جائیگا۔ بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائیگی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام سے ہے۔ اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب حکم کفر دیا جائیگا۔ علامہ ابن الہمام نے لکھا۔

واما ما ثبت قطعا ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس مع البنت الصلبية باجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الاكفار بجحده بانهم لم يشترطوا فى الاكفار سوى القطع فى الثبوت الى قوله ويجب حمله على ما اذا علم المنكر ثبوته قطعا

(مسامرہ صہ ۱۳۹ ۔ شامی جلد ۳ صہ ۳۰۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچے جیسے میراث میں اگر پوتی اور حقیقی بیٹی جمع ہو تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے تو ظاہر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جائے کیونکہ انھوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الی قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اس صورت پر محمول کیا جائے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

---

[1] عوام سے مراد علماء کی صحبت میں رہنے والے عوام مراد ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ حدیثیہ میں ہے۔

وهو ان يكون قطعيا مشهورا بحيث لا يخفى على العامة المخالطين للعلماء بان يعرفوا بداهة من غير افتقار الى نظر واستدلال (۱)

وہ قطعی ایسا مشہور ہو کہ علماء سے اختلاط رکھنے والے عوام پر مخفی نہ ہو بایں طور پر کہ نظر و استدلال کی طرف احتیاج کے بغیر وہ اسے بداہۃً جانتے ہوں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کفر و ارتداد کی ایک قسم تو تبدیلِ مذہب ہے۔ اسی طرح دوسری قسم یہ ہے کہ ضروریاتِ دین اور تعلیماتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریاتِ دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے ان کے معروف فی الشرع معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور بغرضِ معروف بدل جائے۔ بنا بریں اگر کوئی شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف ہوں تو اس شخص کے کفر میں کوئی تامل نہیں کیا جائیگا۔

ضروریاتِ دین میں تاویل مسموع نہیں ہے

واضح ہو کہ تاویل وہاں معتبر ہے جہاں کوئی اشتباہ ہو اور قواعدِ عربیت اور قواعدِ شریعت میں اس کی واقعی گنجائش ہو یعنی وہ تاویلِ کتاب و سنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف نہ ہو اور جو حکمِ شرعی ایسی دلیل سے ثابت ہو جو کہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہو اس پر تاویل معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے امور میں تاویل کفر ہے ——— مثلاً کوئی عین نصف النہار کے وقت جب کہ ابر و غبار بھی ہو اور دھوپ نکل رہی ہو یہ کہے اس وقت دن نہیں ہے بلکہ رات ہے کیونکہ ممکن ہے کہ آسمان پر کوئی بجلی کوند رہی ہو اور یہ روشنی اسی کی ہو جسے لوگ دھوپ سمجھ رہے ہوں تو کیا کوئی عاقل اس تاویل کو تاویل کہے گا؟ بلکہ یہی کہا جائیگا کہ یہ محسوس اور مشاہدہ کا انکار کر رہا ہے لہذا ضروریاتِ دین میں ایسی تاویل معتبر نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کی تاویلیں معتبر مان لی جائیں تو پھر تو دنیا میں کوئی کافر نہ رہے گا۔ منکرینِ توحید و رسالت اور دہریہ تک کافر نہیں ہوں گے۔ آخر وہ بھی تو کسی دلیل اور تاویل ہی کی وجہ سے توحید و رسالت کے منکر ہیں۔ چنانچہ علامہ عبدالحکیم حاشیہ خیالی میں لکھتے ہیں۔

وَالتَّاوِيْلُ فِي الضَّرُوْرِيَاتِ الدِّيْنِيَّةِ لَا يَدْفَعُ الْكُفْرَ (حاشیہ ص۶)	ضروریاتِ دین میں تاویل کرنا کفر سے نہیں بچا سکتا۔
شیخ نے فتوحات میں فرمایا:۔	
اَلتَّاوِيْلُ الْفَاسِدُ كَالْكُفْرِ (ج ۲ ص۸۴)	تاویلِ فاسد مثلِ کفر کے ہے۔

حضرت امام غزالی نے "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور آئمہ دین فقہاء و متکلمین نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"قرآن و حدیث میں ایسی تاویلاتِ باطلہ کرنا جو ان کے اجماعی مفہوم کو بدل دیں اور امت کے اجماعی عقائد کے خلاف کوئی نیا مفہوم ان سے پیدا ہو جائے تو ایسی تاویل بھی تکذیبِ رسول ہی کے حکم میں ہے اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔ تفصیل کے لیے اہلِ علم درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:۔

التفرقہ، مسوی ج ۲ ص۱۴۰، جوہر التوحید، رد المختار ج ۳ ص۲۹۶، شفاء ص۱۲۱، ایثار الحق علی الخلق ص۲۴۱

کفر کے لیے تمام امورِ ایمانیہ کا انکار ضروری نہیں ہے

واضح ہو کہ ایمان بہت سی مجموعی چیزوں کی تصدیق و تسلیم کا نام ہے لیکن کفر میں ان سب

چیزوں کی تکذیب یا انکار ضروری نہیں ہے بلکہ ایمانیات میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر ہے مثلاً تمام امور ایمانیہ تسلیم کرے مگر صرف نماز کی فرضیت کا انکار کرے تو کافر ہی قرار پائیگا۔ اس صورت میں باقی امور اسلامی کا ایمان اس کو کفر سے نہیں بچا سکتا۔ ۲۔ اسی طرح دائرہ اسلام سے نکلنے یا کافر ہونے کے لیے اس کا قصد وارادہ ضروری نہیں ہے شیط ے کافر ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا مگر اس کی حرکت نے اس کو کافر بنا دیا اور قرآن میں فرمایا گیا۔ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْ اور وہ کافر تھا —— البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلمان سے بے خبری میں کوئی کلمہ کفر نکل جائے تو اس کی فوراً تکفیر نہ کی بلکہ اس کو بتایا جائے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے توبہ کرلو۔ اس پر بھی اگر وہ توبہ نہ کرے اور اپنی بات پر اڑ جائے تو اب تکفیر کی گی کیونکہ لزوم کفر کفر نہیں، التزام کفر کفر ہے۔ فافہم

ارتداد، زندقہ اور الحاد کی تعریف

ارتداد کے معنی لغت میں لوٹ جانے اور پھر جانے کے ہیں اور اصطلا شریعت میں ایمان واسلام میں داخل ہونے کے بعد کفر کی طرف ا جانے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں۔

هُوَ الرُّجُوْعُ مِنَ الْاِسْلَامِ | اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کا نام ارتداد ہے۔

ارتداد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعلانیہ طور پر مذہب تبدیل کرلے۔ مثلاً اسلام کو ترک کردے اور یہودی یا سکھ ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نہ تو مذہب تبدیل کرے اور نہ توحید ورسالت کا انکار کرے لیکن ضروریات د سے کسی امر کا انکار کردے مثلاً یہ کہے کہ نماز فرض نہیں۔ روزہ و حج ضروری نہیں تو ایسا شخص کافر و مرتد دائرہ اسلام سے ہے اگرچہ وہ صدق دل کے ساتھ اللہ کی تمام صفات پر اور حضور علیہ السلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس لیے ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر وارتداد ہے۔ اسی طرح ضروریات دین میں ایسی تاویل کرنا اور ان کے معنی بیان کرنا جو اجماعی عقیدہ کے خلاف ہوں۔ قرآن حکیم میں اس کا نام الحاد ہے۔

ان الذین یلحدون فی ایاتنا
لا یخفون علینا | جو ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس کا نام زندقہ رکھا گیا ہے۔ صاحب مجمع البحار نے جناب علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روای کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت کے پاس چند زنادقہ لائے گئے۔

هِیَ جَمْعُ زِنْدِیْقٍ (الی قوله) ثم استعمل
فی کل ملحد فی الدین والمراد منه قوم
ارتدوا عن الاسلام (مجمع البحار ص۹۶) | زنادقہ زندیق کی جمع ہے اور لفظ زندیق ہر اس ش لیے ہے جو دین میں الحاد (بے جا تاویلات) کر اس جگہ مراد ایک مرتد جماعت ہے۔

غرضکہ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو الفاظ تو اسلام کے کہے مگر معنی ا کرے جن سے اس کی حقیقت ہی بدل جائے جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں یہ تاویل کرے کہ قرآن میں صلوٰۃ سے فقط ذکر مراد ہے اور اس خاص ہیئت سے نماز پڑھنا ضروری نہیں اور زکوٰۃ سے تزکیہ نفس مراد ہے۔ ایک معین نصاب

کی خاص مقدار دینا مراد نہیں۔ ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں اس نوع کی تاویلات کرنا زندقہ و الحاد ہے اور زندقہ و الحاد منافقت سے بھی زیادہ اشد ہے۔ جس طرح منافق ملمع کاری سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح زندیق اپنے عقائدِ کفریہ پر تاویلِ فاسد کے ذریعہ اسلامی لیبل لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اسلام کے دھوکہ میں اس کے بھی کفر کو قبول کریں۔ علامہ شامی نے لکھا ہے۔

فان الزنديق يموه كفره ويروج عقيدة الفاسدة ويخرجها فى الصورة الصحيحة (شامی ج ۳ ص ۲۴۴)

تحقیق ملحد و زندیق اپنے کفر پر اسلام کا ملمع کرتا ہے تاکہ اپنے عقیدہ فاسدہ کو اس ملمع کاری کے ذریعہ لوگوں میں رائج کر سکے۔ اور اپنے اس عقیدہ کو عمدہ طریقہ پر پیش کر سکے۔

اس لیے کہ الحاد و زندقہ درحقیقت نفاق کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز نے لکھا۔

وان اعترف به ظاهرا ولكن يفسر بعض ما ثبت من الدين ضرورة بخلاف ما فسره الصحابة والتابعون واجمعت عليه الامة فهو الزنديق كما اعترف بان القرآن حق وما فيه من ذكر الجنة والنار حق لكن المراد بالجنة الابتهاج الذى يحصل بسبب الملكات المحمودة والمراد بالنار الندامة التى تحصل بسبب الملكات المذمومة وليس فى الخارج جنة ولا نار فهو زنديق

اور اگر (ضروریاتِ دین کا اقرار) تو کرے مگر بعض ان چیزوں کو جو دین میں ثابت ہیں ایسی تفسیر بیان کرے جو صحابہ و تابعین اور اجماعِ امت کے خلاف ہو تو وہ زندیق ہے مثلاً یہ تو اقرار کرے کہ قرآن حق ہے اور اس میں جو جنت و دوزخ کا ذکر ہے وہ بھی حق ہے۔ لیکن جنت سے مراد وہ خوشی اور فرحت ہے جو اخلاقِ حمیدہ سے پیدا ہوتی ہے اور دوزخ سے مراد وہ ندامت ہے جو اخلاقِ مذمومہ کے سبب حاصل ہوتی ہے۔ ویسے نہ کوئی جنت ہے اور نہ دوزخ۔ (تو ایسی تاویل کرنے والا) زندیق ہے۔

(مسویٰ شرح موطا ج ۲ ص ۱۳۰)

واضح ہو کہ کفر و ارتداد کی یہ صورت چونکہ دعویٰ اسلام کے ساتھ اور شعائرِ اسلامی کی ادائیگی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ بہک جاتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے کہ اسلام کے قطعی اور یقینی اسلام میں قرآن و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ مفہوم کے خلاف کوئی مفہوم قرار دینا الحاد و زندقہ ہے اور ایسے لوگوں سے بچنا فی زمانہ تمام فرائض سے اہم ہے۔

فتویٰ تکفیر میں احتیاط نہایت ضروری ہے

خوب یاد رکھیے کہ تکفیر میں کبھی عجلت نہیں کرنی چاہیے اور اس سلسلہ میں کامل غور و فکر سے کام لینا چاہیے اور جب تک کسی کا کفر واقعی طور پر ثابت نہ ہو جائے تکفیر نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ معاملہ بڑا سخت ہے اور فتویٰ تکفیر سے پوری ملتِ اسلامی متاثر ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کسی امر کا کفر ہونا واقعی ثابت ہو جائے تو ایسی صورت میں تکفیر نہ کرنا یا تاویلاتِ فاسدہ سے کام لینا یہ بھی جائز نہیں ہے کیونکہ کسی کافر کو مسلمان کہہ دینا یا کسی کلمہ کفر کو اسلام قرار دے دینا محض ایک لفظی سخاوت نہیں ہے

بلکہ ملتِ اسلامیہ پر ظلم عظیم ہے کیونکہ اس کے نتائج و عواقب ملت کے لیے بڑے عظیم خطرات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور کفر و اسلام ایک بے معنی سی حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اگر کسی کے کلام میں ۹۹ وجوہ کفر کے ہوں؟

چنانچہ حضرات فقہاء کرام نے اس معاملہ میں اس درج احتیاط کا حکم دیا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی مشتبہ کلا سرزد ہو جائے جس میں سو احتمال ہیں سے ننانوے احتمالات مضمون کفر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال عبارت میں اس کا بھی ہو کہ اس کے کوئی صحیح و جائز معنی بن سکیں تو مفتی پر لازم ہے کہ ننانوے احتمال کو چھوڑ کر اسی ایک احتمال کی طرف ہو اور تکفیر نہ کرے لیکن یاد رہے کہ یہ احتیاط اسی صورت میں ہے جب کہ واقعی اس عبارت کے ایک صحیح و جائز معنی بن اور قائل بھی خود اپنے کسی قول و فعل سے اس کی تصریح نہ کر دے کہ اس کی مراد وہی معنی ہیں جن سے کفر عائد ہوتا ہے ورن صحیح و جائز معنی نہ بن سکیں تو وہ کلمہ کفر قرار پائے گا اور اگر قائل خود ہی یہ تصریح کر دے۔ میری مراد یہی معنی کفری ہیں تو پھر کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ شامی نے لکھا:-

> اذا کان فی المسئلة وجوه توجب الکفر و
> وجه واحد یمنع فعلی المفتی ان
> یمیل الی ذالك الوجه الا اذا صرح
> بارادة ما یوجب الکفر فلا ینفعه
> التاویل حینئذ

جب کسی مسئلہ میں متعدد وجوہ کفر کے ہوں اور ایک مانع کفر تو مفتی پر لازم ہے کہ اس ایک وجہ کی طرف مائل ہو مگر جب کہ قائل اس وجہ کی تصریح کر دے موجب کفر ہے تو پھر تاویل سے اس وقت کوئی فا ہوگا۔ (شامی)

واضح رہے کہ فقہاء کے اس کلام کے بعض جہلاء نے یہ معنی لیے ہیں کہ اگر کسی شخص کے عقائد میں ایک یا قول بھی ایمان کا ہو تو اسے مومن سمجھو خواہ وہ کتنے ہی واضح کفری عقائد کیوں نہ رکھتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ فقہاء کے کلام یہ مطلب لینا قطعاً و حتماً مردود ہے۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو پھر تو شیطان بھی کافر نہیں رہتا۔ کیونکہ ہر کافر کا کوئی عقیدہ اور قول تو ضرور ہی ایمان کے موافق ہوتا ہے۔ شیطان بھی تو، توحید و رسالت، حشر و نشر سب کا اسی طرح یہود و نصاریٰ محض ایک اسلامی عقیدہ رکھنے کی بنا پر مسلمان قرار پائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ فقہاء مذکورہ بالا عبارت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ جو لغت و عرف کے اعتبار سے مختلف معانی ہو سکتا ہے۔ جن میں ایک معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ عقیدہ کفریہ سے نکل جاتا ہو اور دوسرے تمام معانی اس کو عقیدہ کفر ہوں تو ایسی صورت میں مفتی احتیاط کرے اور اس کلام کو صحیح معنی پر محمول کر کے تکفیر سے باز رہے۔ بشرطیکہ وہ خو تصریح نہ کر دے کہ اس کی مراد معنی کفری ہیں اور کلام میں واقعی یہ گنجائش بھی ہو کہ وہ صحیح معنی پر محمول ہو سکے۔

مسئلہ تکفیر اہل قبلہ

یہ بات بہت مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے اور کتب عقائد و فقہ میں تصریح ہے۔ اسی تصریح کے پیش نظر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کلمہ گو اہل اس کی تکفیر ممنوع ہے لیکن سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اہل قبلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

اصطلاحِ شریعت میں اہلِ قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام قطعیاتِ اسلام اور ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتے ہوں لیکن وہ جو ضروریاتِ دین کے منکر ہوں مثلاً شراب و زنا و دیگر محرماتِ قطعیہ کو حلال جانیں یا ضروریاتِ دین میں تاویل کریں اور سلام کے قطعی و یقینی احکام کے ثابت شدہ مفہوم و معنی میں ایجاد سے کام لیں تو ایسے لوگ ہرگز ہرگز اہلِ قبلہ نہیں ہیں۔

۲۔ اور فقہاء نے جو یہ فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قبلہ کی گناہِ کبیرہ کے ارتکاب پر تکفیر نہ کی جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اہلِ قبلہ اگر ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار کر دیں تو بھی ان کو کافر نہ کہا چنانچہ ان امور کی تصریح و توضیح خود ائمہ دین و فقہاء کرام نے فرمائی ہے۔ چند اقوالِ ائمہ پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:۔

اعلم ان المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين

جاننا چاہئے کہ اہلِ قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین پر متفق ہیں۔

۲۔ فمن وَاظَبَ طول عمره على الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم ونفي الحشر او نفي علمه سبحانه وتعالىٰ بالجزئيات لا يكون من اهل القبله

پس جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات کا پابند ہونے کے باوجود قدمِ عالم اور نفیِ حشر یا نفیِ علم اللہ بالجزئیات کا معتقد ہو۔ وہ اہلِ قبلہ نہیں ہے۔
(شرح فقہ اکبر صـ۱۸۹)

اہلِ قبلہ کی تعریف

۳۔ محقق ابن امیر الحاج شرح تحریر الاصول میں فرماتے ہیں۔

هُوَ الْمُوَافِقُ على مَا هُوَ مِنْ ضَرُوْرِيَاتِ الْاِسْلَامِ

اہلِ قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ اسلام میں موافق ہوں (شرح تحریر الاصول)

۴۔ شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں ہے۔

اهل القبلة في اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين (نبراس صـ۵۷۲)

اہلِ قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے۔

۵۔ شرح مقاصد مبحث سابع میں ہے:۔

فلا نزاع في كفر اهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفي الحشر الخ

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہلِ قبلہ میں سے اس شخص کو کافر کہا جائیگا جو اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزارے مگر عالم کے قدیم ہونے یا قیامت و حشر کا انکار کرے۔

۶۔ لا يكفر اهل القبلة الا فيما فيه انكار ما علم مجيئه به بالضرورة او المجمع عليه كاستحلال المحرمات (مواقف)

اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے گی مگر اس صورت میں کہ اس میں ضروریاتِ دین کا انکار یا ایسی چیز کا انکار لازم ہے جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جیسے حرام اشیاء کو حلال سمجھنا۔

۷۔ لا خلاف في كفر المخالف في ضروريات

جو شخص ضروریاتِ اسلام کا مخالف ہو اس کے کفر میں

الاسلام وان کان من اھل القبلہ (شامی ۱۲، ص ۲۷۴)

کوئی اختلاف نہیں اگرچہ وہ اہلِ قبلہ میں سے ہو۔

۸۔ ومعنی عدم تکفیر اھل القبلۃ ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیہ غیر المشھورۃ (نبراس ص ۵۷۲)

(اور فقہا نے جو یہ کہا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اور اسلام کے ایسے امور کے انکار کی وجہ سے جو کہ مشہور نہ ہوں تکفیر نہ کی جائے۔

۹۔ فتح المغیث شرح الفیہ الحدیث میں ہے :۔

اذلا نکفر احدا من اھل القبلۃ الا بانکار قطعی من الشریعۃ (شرح الفیہ ص ۳۴۲ وعقائد عضدیہ)

ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے مگر بسبب انکار کسی حکم قطعی کے۔

۱۰۔ امام ربانی مجدد الف ثانی مکتوبات میں فرماتے ہیں :۔

وچوں ایں فرقہ مبتدعہ اہل قبلہ اند در تکفیر آنہا جرأت نباید نمود تا زمانے کہ انکار ضروریتِ دینیہ نماید و ردمتواترات احکام شرعیہ نکنند وقبول ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ نکنند۔ (مکتوبات ۳۸ ج ۲ ص ۹)

اور چونکہ یہ فرقہ مبتدعیہ اہلِ قبلہ ہیں اس لیے ان کی تکفیر میں جرأت نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ ضروریاتِ دین کا انکار اور متواترات احکام شرعیہ کا انکار نہ کریں اور ضروریاتِ دین کو قبول نہ کریں۔

فقہاء کرام اور آئمہ متکلمین کی ان تصریحات سے واضح ہوا۔

۱۔ اہلِ قبلہ وہ نہیں جو صرف کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھیں بلکہ اہلِ قبلہ وہ ہیں جو تمام ضروریاتِ دین اور اسلام کے قطعی و یقینی اُمور پر ایمان رکھتے ہوں اور انہیں تسلیم کرتے ہوں اور دین کی کسی بھی ضروری بات کے منکر نہ ہوں۔

۲۔ فقہاء نے جو فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے تو اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اگر وہ کفر و شرک کے علاوہ کسی گناہ میں ملوث ہو جائیں مثلاً شراب پئیں زنا کریں تو گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے ان کی تکفیر جائز نہ ہوگی جیسے خوارج و معتزلہ مرتکبِ کبیرہ کی تکفیر کرتے ہیں۔

۳۔ لیکن اگر اہلِ قبلہ جو نماز بھی پڑھیں اور تمام عمر عبادات و طاعات میں گزاریں اور اس کے باوجود ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کر دیں تو اب ان کی تکفیر کی جائیگی۔

کفر و شرک و ارتداد کے دُنیوی و اُخروی احکام

کتاب و سُنّت کے حسب ذیل دنیوی و اُخروی بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں اور ان احکام پر تمام اہل اسلام کا اتفاق بھی ہے۔ ۱۔ کُفر کا اُخروی حکم یہ ہے کہ اس کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے اور کافر و مشرک کی بخشش نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا :۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ

اللہ تعالےٰ مشرک کی بخشش نہیں فرمائیگا۔

ن الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنْ
لِيَغْفِرَ لَهُمْ

جو لوگ کافر ہوئے اور ظلم کیا۔ انہیں اللہ تعالےٰ ہرگز نہیں بخشے گا۔

۲- کفار ومرتدین، ملحدین وزنادقہ سے میل جول سلام کلام موالات وغیرہ حرام وممنوع ہے ۳- کفار سے مناکحت ہے ۴- کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا ۵- کافر کی نماز جنازہ میں شریک ہونا یا اس کی پر جانا یا اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا:-

تصل على احد منهم ابدا ولا تقم على
هم كفروا بالله ورسوله وماتوا وهم فاسقون
كان للنبي والذين امنوا ان يستغفروا
كانوا اولى قربى

ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیے ان کی قبر پر کھڑے نہ ہوجیے اس لیے کہ وہ اللہ ورسول کے منکر ہوئے اور نافرمان مرے۔
نبی کو اور مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ وہ مشرکوں کی مغفرت کی دعا کریں۔ اگرچہ وہ ان کے قرابتدار ہوں۔

۷- کافر کا ذبیحہ اور شکار مسلمان کے لیے حلال نہیں ۸- کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں ۹- جو الاسلام میں مسلمانوں کی رعایا ہوں ان کو فوج میں بھرتی کر کے جہاد میں لے جانا جائز نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ ش کر کے دار الحرب سے کفار سے جا ملیں ۱۰- جو کافر اسلامی حکومت میں رہتے ہوں ان سے جزیہ لیا جائیگا۔ قرآن مجید فرمایا:-

يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون

یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہوکر

۱۱- کسی کافر ومرتد کو کوئی وزارتی یا فوجی یا افسری کسی قسم کا کلیدی عہدہ دینا اور اس کو مسلمانوں کا سردار بنا دینا اور سے سیاسی وملکی امور میں مشورہ لینا جائز نہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ابو موسیٰ کو ہدایت کی تھی۔

كرموهم وقد اهانهم الله۔ ولا
هم وقد خونهم الله ولا تستعملوا
الكتاب الخ (قرطبی ج ۴ ص ۱۶۹)

کافروں کا اعزاز واکرام نہ کرو، اللہ نے ان کی اہانت کا حکم دیا ہے۔ ان کو امین اور امانت دار نہ سمجھو اللہ نے ان کو خائن بتلایا ہے۔ یہود ونصاریٰ کو کوئی عہدہ نہ دو۔

حضرت فاروق اعظم کا یہ حکم قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

كافرين كانوا لكم عدوا مبينا

بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔

ظاہر ہے کہ دشمن کو کلیدی آسامیوں پر فائز کردینے کا نتیجہ بہرحال اسلام ومسلمین کی ذلت ورسوائی ہوگا اور ہوا ہے۔ جب بھی کسی مسلمان حکمران نے کافر ومشرک یا مرتد کو کسی عہدہ پر فائز کیا ہے تو بُرے وقت میں اس نے غداری ہے۔ مجھے یہاں مرتدوں ومنافقین کی نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہی آپ کو بتا دے گا کہ ممالک اسلامی ی وبربادی میں اصل ہاتھ ان کفار ومرتدین کا ہی رہا ہے بلکہ کھلے ہوئے کافر ہندو سکھ عیسائی وغیرہ اتنا نقصان نہیں پہنچا سکے جتنا کہ مرتدوں اور منافقوں نے پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص واضحہ میں مرتد

کی سزا موت ہے اور قتلِ مرتد پر علمائے امت کا اجماع ہے۔

۱۔ حافظ عسقلانی فتح الباری صفحہ ۲۷۷، جلد ۱۲ میں فرماتے ہیں۔

قال ابن دقيق العيد الردة سبب لاباحة دم المسلم بالاجماع فى الرجل واما المرأة ففيها خلاف

(فتح الباری صفحہ ۲۷۷، جلد ۱۲ کتاب الدیات)

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرتد ہونا یعنی دینِ اسلام سے پھر جانا بالاتفاق مرد کے حق میں موجبِ قتل ہے البتہ اگر عورت دینِ اسلام سے پھر جا تو اس کے قتل میں اختلاف ہے۔

۲۔ حافظ بدر الدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

وقال شيخنا فى شرح الترمذى وقد اجمع العلماء على قتل المرتد اذا لم يرجع الى الاسلام واصر على الكفر واختلفوا فى قتل المرتدة فجعلها اكثر العلماء كالرجل المرتد وقال ابو حنيفة لا تقتل المرتدة لعموم قوله نهى عن قتل النساء والصبيان

(عمدۃ القاری صفحہ ۴۱ جلد ۲۴ کتاب الدیات باب قولہ تعالیٰ النفس بالنفس والعین بالعین)

ہمارے شیخ نے شرح ترمذی میں فرمایا ہے۔ علمائے قتل مرتد پر اجماع فرمایا ہے جب کہ وہ ارتداد پر قائم رہے اسلام کی طرف نہ لوٹے اور کفر پر مداومت اختیار کرے اور مرتد عورت کے قتل میں اختلاف ہے۔ اکثر علما مرتد عورت کو بھی مثل مرد کے واجب القتل قرار دیا اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مرتد عورت کو قتل نہ کیا جا بوجہ عموم قولِ پیغمبر علیہ السلام کے کہ آپ نے عورتوں اور کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ (کذا فی عمدۃ القاری

۳۔ شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ میزانِ کبریٰ میں فرماتے ہیں:۔

قد اتفق الائمة على ان من ارتد عن الاسلام وجب قتله

ائمہ نے اتفاق فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام لا کر اس سے پھر جائے تو اس کا قتل واجب ہے۔

ایمان کی تعریف میں ائمہ کا اختلاف

حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔

ان الایمان اقرار باللسان ومعرفة القلب

ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اق کرنے کو کہتے ہیں۔

معرفتِ قلب کے معنی پختہ اور غیر متزلزل اعتقاد کے ہیں یعنی ایمان فقط دل کے اعتقادِ جازم کا نام ہے اور سے اقرار کرنا شرط ہے۔ چنانچہ شرح عقائد میں ہے:۔

وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الْمُحَقِّقِيْنَ إِلَى أَنَّهُ هُوَ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَالْإِقْرَارُ شَرْطٌ لِإِجْرَاءِ الْاَحْكَامِ فِي الدُّنْيَا لِمَا أَنَّ تَصْدِيْقَ الْقَلْبِ أَمْرٌ بَاطِنٌ لَا بُدَّ مِنْ عَلَامَةٍ

جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور اقرار لسانی صرف دنیوی احکام جاری کی ایک شرط ہے کیونکہ تصدیقِ قلبی ایک امر پوشیدہ اس لیے لازمی طور پر اس کے لیے کوئی علامت ظا

مَنْ صَدَّقَ بِقَلْبِهٖ وَلَمْ يُقِرَّ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى
(شرح عقائد)

چاہیے۔ لہٰذا جو شخص دل سے (تمام ضروریاتِ دین) کی تصدیق کرے اور زبان سے (کسی کے سامنے) اس کا اقرار واظہار نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے۔

معلوم ہوا کہ زبان سے اقرار کرنا صرف اس لیے ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص مومن ہے کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرے گا۔ اس کے دل کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور "اقرارِ لسانی" صرف شرط ہے۔

ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اس کے عقلی و نقلی دلائل

ایمان دل کے اعتقاد کو کہتے ہیں اس کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

۱- عربی زبان میں اٰمنوا باللہ کا اولین مفہوم تصدیق ہی سمجھا جاتا ہے اور اس معنیٰ سے عدول کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ ۲- ایمان کا محل دل ہی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں دل کو ایمان کا محل قرار دیا گیا ہے۔

۱- اُولٰٓئِكَ كَتَبَ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ
یہ وہ ہیں جن کے دل میں ہم نے ایمان کو پختہ کر دیا۔

۲- مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ
ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر دل سے ایمان نہیں لاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے۔

۳- حضرت اسامہ نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے زبان سے کلمہ پڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص دل سے نہیں پڑھ رہا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا۔ اسامہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ لہٰذا دل کی تصدیق کا نام ایمان ہوا۔

۴- اہلِ کتاب اور فرعون حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی جانتے تھے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔ اس کی وجہ یہی تو تھی کہ وہ دل سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔

۵- کفر ایمان کی ضد ہے اسی لیے قرآنِ مجید میں کفر کے مقابل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے جیسے اس آیت میں مَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ اور یہ ظاہر ہے کہ کفر کے معنیٰ جھٹلانے اور انکار کرنے کے ہیں اور یہ دل ہی کا فعل ہے۔ لہٰذا جب کفر دل کا فعل ہے تو کفر کی ضد ایمان بھی دل کا فعل ہی ہونا چاہیے اور دل کا فعل عبارت ہے تصدیق سے اور تکذیب کی ضد تصدیق ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل

نوٹ:۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث اور اس پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ العزیز فیض الباری کے آخری حصص میں اپنی جگہ پر پیش کیجائیگی

آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہیں۔

۶- وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس آیت میں منافقین سے ایمان کی نفی کی گئی ہے حالانکہ منافق زبان سے اقرار کرتے تھے۔ مگر چونکہ دل سے تصدیق نہیں کرتے تھے اس لیے ایمان کی نفی کردی گئی۔

۷- اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ۔ اس آیت میں مُکرَہ کے لیے یہ جائز کیا گیا کہ وہ جان بچانے کے لیے زبان سے انکار کردے مگر اس زبانی انکار کے باوجود اس کو مومن قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اس میں تصدیقِ قلبی باقی جا رہی ہے۔

۸- (۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ ۳- اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ...... الخ ان آیات میں ایمان کا عطف اعمال پر کیا گیا اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے یعنی معطوف معطوف علیہ میں داخل نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

۹- وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ۔ اس آیت میں اعمال کی صحت ایمان پر موقوف قرار دی گئی ہے اور مشروط شرط میں داخل نہیں ہوتا ورنہ اِشْتِرَاطُ الشَّیْءِ فِیْ نَفْسِہٖ لازم آئیگا جو باطل ہے۔

۱۰- قرآن میں مرتکب حرام کو مومن کہا گیا جیسے اس آیت میں وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا حالانکہ یہ امر قطعی ہے کہ کسی رکن کے بغیر مستحق نہیں ہوتی تو اگر اعمالِ صالحہ حقیقتِ ایمان میں داخل ہوتے تو مرتکبِ حرام کو مومن نہ کہا جاتا۔

۱۱- قرآن میں جہاں روزہ، نماز اور وضوء کا حکم دیا ہے وہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے خطاب کیا ہے۔ اس کے بعد ان کو عمل کی تکلیف دی ہے۔ یہ بات بھی ایمان میں عمل کے خروج پر دلالت کرتی ہے۔ ورنہ تکلیف تحصیل لازم آئے گی جو باطل ہے۔

۱۲- قرآنِ پاک میں اللہ تعالےٰ نے مومنوں کو توبہ کا حکم دیا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً...... الخ یہ بات بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معصیت ایمان کے منافی نہیں۔ معصیت کے ساتھ ایمان بھی ہوتا ہے کیونکہ توبہ گنہگار کے لیے ہوتی ہے۔ نیز گنہگار کو اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں مومن قرار دیا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں۔

امام شافعی کے نزدیک ایمان کی تعریف

حضرت امام مالک، امام شافعی، امام احمد رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے نزدیک ایمان کی تعریف یہ ہے ـــ

اَلْاِیْمَانُ فِعْلُ الْقَلْبِ وَاللِّسَانِ مَعَ سَائِرِ الْجَوَارِحِ (عینی) (ترجمہ) ایمان دل سے تصدیق کرنے زبان سے اقرار کرنے اور جوارح مامور بہ کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔

ایمان کی تعریف کے متعلق امام ابوحنیفہ وامام شافعی علیہما الرحمۃ کے اختلاف کی حقیقت

واضح رہے کہ امام ابوحنیفہ وامام شافعی علیہما الرحمۃ کے نزدیک ایمان کی تعریف میں جو اختلاف نظر آرہا ہے۔ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہی ہے۔ جس کی تقریر یہ ہے کہ ایمان دو طرح کا ہوتا ہے اوّل وہ ایمان جو انسان کو خلود فی النار سے نجات دے۔ (خلود فی النّار سے نجات کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہوں کی پاداش میں کچھ عرصہ کے لیے بطور سزا جہنّم میں داخل کیا جائے۔ اس کے بعد پھر جنّت ہی میں داخل ہو) دوم۔ وہ ایمان جو انسان کو دخولِ نار سے نجات دے یعنی ذرا دیر کے لیے بھی وہ جہنّم میں نہ جائے تو ظاہر ہے کہ خلود فی النّار سے نجات دینے والے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ انسان دل سے تمام ضروریاتِ دین کے اقرار و تصدیق کرے اور زبان سے اقرار کرے اور دخولِ نار سے نجات دینے والے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ ضروریاتِ دین کے اقرار و تصدیق کے ساتھ ساتھ احکام شرعیہ کی پابندی کرے۔ جب آپ نے اس تقریر کو اچھی طرح سمجھ لیا تو اب غور کیجئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ وامام شافعی میں ایمان کی تعریف میں جو اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ صرف نزاعِ لفظی رہ جاتا ہے کیونکہ امام شافعی اعمال کو ایمان کا رکن قرار دیتے ہیں تو اس سے وہ قسمِ دوم کے ایمان کی تعریف کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اعمال کو دین کا رکن نہیں قرار دیتے تو اس سے وہ قسمِ اوّل والے ایمان کی تعریف فرمارہے ہیں۔ چنانچہ وہ ایمان جو خلود فی النار سے نجات دے۔ امام شافعی اور تمام ائمہ کے نزدیک اس کی تعریف صرف یہ ہے کہ دل سے ضروریاتِ دین کی تصدیق کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص دل سے ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے گناہ بھی ہو جائے یا وہ تصدیق تو کرے مگر عمل ذکرے تو ایسا شخص تمام ائمہ کے نزدیک کافر نہیں ہوتا۔

گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں

جب آپ نے یہ سمجھ لیا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہیں تو اب ثمرہ یہ نکلے گا کہ مرتکبِ کبیرہ کافر نہیں ہے۔ اس موقعہ پر چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

اوّل:۔ گناہِ کبیرہ سے مراد کفر و شرک کے علاوہ گناہ ہے دوم۔ جب ایک مسلمان بشری کمزوری کی بنا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ گناہ کو گناہ ہی سمجھتا ہے اور حرام کو حرام ہی جانتا ہے مگر پھر بھی گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے تو ایسا شخص اہلِ سنت وجماعت کے نزدیک مسلمان ہے دوسرے یہ کہ گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا ہے اور حرام کو حلال جان کر اختیار کرتا ہے تو ایسا شخص بلا اختلاف بے ایمان ہے۔ کیونکہ اب اس میں تصدیق نہیں جو ایمان کی حقیقت تھی وہ نہیں پائی گئی۔

گناہِ کبیرہ نو ہیں

حضرت ابنِ عمر سے روایت ہے کہ گناہِ کبیرہ نو ہیں ۱۔ شرک باللہ ۲۔ ناحق قتل کرنا ۳۔ آزاد مکلف مسلمان پاکدامن عورت پر تہمت لگانا ۴۔ زنا کرنا ۵۔ یتیم کا مال ناحق کھانا ۶۔ مسلمان والدین کی نافرمانی کرنا ۷۔ جادو کرنا ۸۔ جہاد سے بلا وجہ شرعی بھاگ آنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰے عنہ کی روایت میں سُود لینا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی روایت میں چوری کرنا

اور شراب پینا بھی گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ابوطالب مکی سے روایت ہے کہ گناہ کبیرہ سترہ ہیں۔ چار وہ جن کا تعل دل سے ہوتا ہے ۱۔ شرک ۲۔ گناہوں پر اصرار ۳۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا ۴۔ اَلْاَمْنُ مِنْ مَکْر ——— چار وہ ہیں جن کا تعلق زبان سے ہے ۱۔ جھوٹی گواہی دینا ۲۔ عفیفہ کو تہمت لگانا ۳۔ جادو کرنا ۴۔ حرم گناہ کرنا ——— تین وہ ہیں جن کا تعلق پیٹ سے ہے ۱۔ شراب پینا ۲۔ یتیم کا مال ناحق کھانا ۳۔ سود لین دو وہ ہیں جن کا تعلق شرم گاہ سے ہے ۱۔ زنا ۲۔ لواطت ——— ایک وہ ہے جس کا تعلق پاؤں سے ہے شرعی جہاد سے بھاگ جانا ——— ایک وہ ہے جس کا تعلق تمام بدن سے ہے ۱۔ والدین کی نافرمانی کرنا ——— دو ہیں جن کا تعلق ہاتھ سے ہے ۱۔ ناحق قتل کرنا ۲۔ چوری کرنا (شرح عقائد ص[illegible])

واضح ہو کہ روایات میں جن امور کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بطور حصر نہیں ہے بلکہ بطور مثال ہے یعنی مذ گناہوں کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو گناہ کبیرہ ہیں مثلاً بلا عذر شرعی نماز ترک کرنا، روزہ نہ رکھنا، زکوٰۃ نہ مالدار ہو کر حج نہ کرنا، ظلم کرنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، دھوکہ دینا، گالی دینا، ڈاکہ ڈالنا، دو مسلمانوں میں لڑائی عورتوں کا بے پردہ پھرنا، فحاشی و عریانی کو اختیار کرنا، ناچ رنگ کی مجالس قائم کرنا، نامحرم عورت پر بلا ضرورت شر نظر ڈالنا، سودا کم تولنا، حالت حیض میں اپنی بیوی سے جماع کرنا، غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا بھی گناہ کبیرہ ہی

ایمان سے متعلق معتزلہ و خوارج کا مسلک

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امام شافعی گو اعمال کو ایمان داخل مانتے ہیں مگر اس کے باوجود مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ خوارج و معتزلہ کے نزدیک اعمال حقیقت ایمان میں داخل ہیں اور ان کا مسلک کہ مرتکب کبیرہ نہ کافر ہے اور نہ مومن اور خوارج یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے۔ معتزلہ و خوارج کا مذہب باطل ہے حق یہی ہے کہ مرتکب کبیرہ گنہگار ضرور ہے مگر کافر نہیں ہے یا امام شافعی کے مسلک کے مطابق مرتکب کبیرہ کامل نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں عاصی پر مومن کا اطلاق آیا ہے جیسے ان آیات میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ۲۔ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا ۳۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ۔ اگر مرتکب کبیرہ کافر ہوتا تو اس پر قرآن حکیم میں مومن ہونے کا اطلاق نہ اسی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آج تک ہر اہل قبلہ کی (خواہ اس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کبیرہ تھا اور بغیر توبہ کے مرا ہے) نماز جنازہ پڑھی گئی ہے۔ اس کے لیے بخشش کی دعا کی جاتی رہی ہے حالانکہ بات ہے کہ کافر کے لیے دعاء استغفار اور نماز جنازہ پڑھنا حرام ہے۔ اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا تو حضور علیہ اور صحابہ کرام ایسے شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھتے۔ نیز حدیث ابوذر میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نے لا اِلَّا اللّٰہ پڑھ لیا ہو اور اسی اعتقاد پر مرگیا تو وہ جنتی ہے۔ حضرت ابوذر نے عرض کی کہ اگرچہ اس نے زنا کیا چوری کی ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ دوسری حدیث میں فرمایا۔

یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ | وہ شخص بالآخر دوزخ سے نکالا جائیگا جس کے د

مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْإِيمَانِ | ایک ذرہ بھی ایمان کا ہوگا۔

یہ اور اس مضمون کی متعدد احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرتکبِ کبیرہ کافر نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تعریف میں کہیں اعمال کو ایمان میں داخل فرمایا ہے اور کہیں نہیں مثلاً آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، ملائکہ پر، اس کے رسولوں پر ایمان لا اور وفد عبد القیس کی حدیث میں فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ ایمان کیا ہے۔ پھر فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ تو توحید و رسالت کی شہادت دے اور نماز پڑھے اور روزہ رکھے وغیرہ وغیرہ تو پہلی حدیث میں اعمال کو ایمان میں شامل نہیں فرمایا کیونکہ یہاں حضور علیہ السلام نے صرف اہلِ اسلام کی تعریف فرمائی ہے یعنی وہ ایمان جو انسان کو خلود فی النار سے نجات دے اور وفد عبد القیس کی حدیث میں اعمال کو ایمان میں شامل فرمایا ہے تو اس سے مراد ایمانِ کامل ہے جو انسان کو جنت کا مستحق بنا دیتا ہے اور دخولِ نار سے بچاتا ہے چنانچہ اس حدیث میں :۔

لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ | زانی زنا نہیں کرتا مگر وہ مومن ہو

اس میں زانی سے ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے تو اس سے ایمانِ کامل ہی کی نفی مراد ہے۔ اصل ایمان کی نفی مراد نہیں ہے۔ اسی طرح احادیث میں آیا ہے کہ جس نے قصداً نماز ترک کر دی اس نے کفر کیا۔ قرآن میں ہے۔ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی مخالف و موافق تمام احادیث و آیات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے کی ضرو ہے۔ صرف تصویر کے ایک رخ کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔ یہ آیات و احادیث اپنے ظاہری معنوں پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو حکم الٰہی کو حکم الٰہی اعتقاد نہ کرے یا نماز کی فرضیت کا منکر ہو جائے تو وہ کافر ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی آیات و احادیث کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے اس پر اجماع ہے۔

ایمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور اس کے ۱۲ دلائل بھی لکھ چکے ہیں جن کو آپ دوبارہ ذہن میں لے آئیے کیونکہ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے تو اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ایمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا جس کی تقریر یہ ہے:۔

ایمان کی زیادتی و نقصان کے اختلاف کا مبنیٰ اس امر پر ہے کہ اعمالِ صالحہ جزوِ ایمان ہیں یا نہیں؟

جن لوگوں نے اعمالِ صالحہ کو حقیقتِ ایمان میں داخل مان کر ان کو جزوِ ایمان قرار دیدیا۔ ان کے نزدیک اعمالِ صالحہ کی کمی بیشی کی وجہ سے اصلِ ایمان میں کمی بیشی کا واقع ہونا بدیہی امر ہے کیونکہ جب اعمالِ صالحہ جزوِ ایمان قرار پائیں گے تو اعمال کی کمی بیشی کی وجہ سے اصلِ ایمان میں بھی لامحالہ کمی بیشی ہو جائے گی۔

لیکن ـــــ محققین و متکلمین اور سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے نزدیک تصدیقِ قلبی کا نام ایمان ہے جو کمی بیشی کو قبول نہیں کرتی۔ اقرارِ لسانی اور دیگر اعمالِ صالحہ امام اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے نزدیک جزوِ ایمان نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کا غیر ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں ایمان کو اعمالِ صالحہ کا غیر قرار دیئے

ہوئے اعمال کا عطف ایمان پر فرمایا۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ | بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صال

عطف میں حقیقت یہ ہے کہ معطوف علیہ معطوف کا مغائر ہو جہاں مغائرت نہ ہو وہاں مجاز ہوگا اور ظاہر ہے ک تعذرِ حقیقت کے بغیر مجاز صحیح نہیں۔ جن آیات میں ایمان پر اعمالِ صالحہ کا عطف وارد ہے۔ وہاں تعذرِ حقیقت پر کوئی دلیل قائم نہیں اس لیے بلا وجہ مجاز مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا —— تو جب امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے تو ایمان کا کمی و زیادتی کو قبول نہ کرنا بالکل واضح ہے۔ کیونکہ ظنّ و یقین میں یہ فرق ضرور ہوتا ہے مگر یقین اور یقین میں اُس تفاوت کا وجود کسی طرح متصور نہیں۔

پس ایمان کی تفسیر جب تصدیقِ یقینی کے ساتھ کی جائے تو اس میں کمی بیشی اور قوت وضعف کا پایا جانا ممکن نہیں کیونکہ یقین میں احتمالِ نقیض نہیں ہوتا۔ اگر یقین میں ادنیٰ ترین کمی بیشی بھی پائی جائے تو وہ محتملِ نقیض ہوکر یقین نہ رہے گا۔ جب وہ یقین ہی نہ رہا تو اس کو ایمان کیسے کہا جائیگا۔ معلوم ہوا کہ اصل ایمان زیادتی ونقصان اور قوت و ضعف کو قبول نہیں کرتا۔

فائدہ | بعض لوگ کمالاتِ ایمان اور اماراتِ تصدیق کی کمی بیشی کو نفسِ ایمان کی کمی بیشی سمجھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ ایمان وتصدیق ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کے کمالات و امارت دوسری چیز ہے ایک کی کمی بیشی کو دوسرے کی کمی بیشی سمجھ لینا صحیح نہیں۔

جن آیات میں ایمان کی زیادتی مذکور ہے وہاں نفسِ ایمان یعنی تصدیقِ یقینی مراد نہیں بلکہ لفظِ ایمان سے وہ ایمان کامل مراد ہے جو اپنے کمالات و امارات اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو۔ اس لیے ان آیات سے نفسِ ایمان کی زیادتی ثابت نہ ہوئی بلکہ اعمالِ صالحہ اور کمالات و اماراتِ ایمان کی زیادتی ثابت ہوئی جو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی بہترین تائید و تصدیق ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیاتِ زیادتی ایمان میں ثمراتِ ایمان کی زیادتی مراد ہو مثلاً رقتِ قلب اور تزکیہ نفس وقرب الی الحق سبحانہٗ وتعالیٰ وغیر ذالک۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آیاتِ مبارکہ میں مطلقاً ایمان کی زیادتی مراد نہیں بلکہ اشیاءِ مصدقہ مومن بہا کی زیادتی کے لحاظ سے ایمان کی زیادتی بیان فرمائی گئی ہے۔

بنا بریں جن آیات واحادیث میں ایمان کی زیادتی ونقصان یا قوت وضعف وارد ہے۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصل ایمان کم وبیش یا قوی وضعیف ہوتا ہے بلکہ ان سے علامات وکمالاتِ ایمان (جو اصلِ ایمان پر زائد امور ہیں) ثمراتِ ایمان کی کمی بیشی اور تفاوت مراد ہے یا ایمانِ تفصیلی مراد ہے جو اپنے متعلقات کی کثرت کے اعتبار سے ایمانِ اجمالی کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

۲- ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ اجمالی اور تفصیلی —— ایمانِ اجمالی یہ ہے کہ جو کچھ شارع السلام اللہ تعالےٰ کی طرف سے لے کر آئے مجمل طور پر ان کی تصدیق کرنا اور ایمان تفصیلی یہ ہے کہ جن چیزوں پر نا ضروری ہے ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ تصدیق کرنا اور ہر چیز پر تفصیلاً ایمان لانا۔ صحابہ کرام اولاً

اجمال و تفصیل کا فرق اب بھی ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ایک شخص جو اولاً ایمان لایا ہے تمام احکام شرعیہ پر

اصل ایمان لاتے تھے۔ پھر وقتاً فوقتاً جو آیات و احکام نازل ہوتے تھے ان کی تصدیق علیحدہ علیحدہ تفصیل کے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایمانِ اجمالی امرِ واحد (ماجاء به الرسول صلی الله علیه وسلم) سے متعلق ہے اور ایمان تفصیلی امورِ متعددہ (احکامِ مفصلہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اگر ایمان مفصل کو باعتبار اس کے متعلقات کے زیادہ کہہ دیا جائے تو یہ بالکل صحیح ہے۔ بنا بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن آیات میں زیادتی ایمان وارد ہے۔ ایمان تفصیلی کے متعلقات کے اعتبار سے زیادتی مراد ہے۔ اعتبار مذکور سے قطع نظر کر کے نفسِ ایمان کی زیادتی مقصود نہیں۔

الغرض ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور حقیقت تصدیق شئ واحد ہے جو زیادتی و نقصان کو قبول ہی نہیں کرتی لہٰذا آیات و حدیث میں ایمان کی کمی یا زیادتی کا بیان ہے وہاں نفسِ ایمان یعنی محض تصدیقِ قلبی مراد نہیں ہے بلکہ ایمان سے وہ ایمان مراد ہے جو اپنے کمالات و امارات اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو لہٰذا اس سے نفسِ ایمان کی زیادتی ثابت نہ ہوئی بلکہ اعمالِ صالحہ اور ایمان کے کمالات اور اس کی علامتوں میں زیادتی ثابت ہوئی۔

شبہ کا ازالہ

یہاں اگر امام اعظم کے مسلک پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ جب امام صاحب کے نزدیک اصل ایمان زیادتی و نقصان اور قوت و ضعف کے تفاوت کو قبول نہیں کرتا تو پھر تو تمام مومن ادنیٰ، اعلیٰ، غیر نبی اصل ایمان میں مساوی ہو گئے اور اعلیٰ و ادنیٰ، نبی، غیر نبی میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس صورت میں اولیاء اللہ اور انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ حضور سید عالم نورِ مجسم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قدح پیدا ہوتی ہے اور کے فضائل و کمالات بھی باقی نہیں رہتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کمی بیشی متصور نہیں وہاں مساوات کیونکر متصور ہو سکتی ہے اور اگر ہو بھی تو یہ مساوات گزیدہ ہستی کے حق میں موجب قدح یا اس کی فضیلت کے کب منافی ہے —— دیکھئے ماہیتِ نبوت میں تشکیک نفسِ نبوت کمی بیشی کو قبول نہیں کرتی مگر اس کے باوجود قرآنِ مجید میں فرمایا۔

رُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ | یہ رسول ہیں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

سی طرح مخلوقیت اور حدوث وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن میں کمی بیشی کا تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن بایں ہمہ اس کا ب ہرگز نہیں ہے کہ ہر مخلوق و حادث اپنے کمالاتِ مخلوقیت کے اعتبار سے بھی مساوی ہے اور ایک دوسرے پر بار سے بھی امتیاز و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ایسا ہو تو پھر تو نبی و غیر نبی تو علیحدہ رہے مومن و کافر میں بھی کوئی

عہ اطلاع نہیں ہوئی۔ اس لیے اس کا وہ ایمان اجمالی ہے۔ اس کے بعد جب اسے احکامِ شرعیہ کی تفصیلات معلوم ہوا اور اس نے الگ الگ ان کی تصدیق کی تو یہ ایمان اس کے لیے ایمان تفصیلی ہے۔
میں شک نہیں کہ ماجاء به الرسول صلے اللہ علیہ وسلم اور احکام مفصلہ ایک ہی چیز ہیں لیکن وہ اجمال کے امور کثیرہ اور اعتبارات کا لحاظ ضروری ہے۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ۔

امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ پس اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جس طرح اصل مخلوقیت میں مساوی ہونے سے کمالات میں مساوی ہونا لازم نہیں اسی طرح نفسِ ایمان وتصدیق میں مساوات کمالاتِ ایمانیہ کی مساوات کو مستلزم نہیں ہے۔

سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک ایمانِ تفصیلی باعتبار اپنے تعلق کے ایمانِ اجمالی سے زیادہ ہے کیونکہ اجمالی امرِ واحد سے متعلق ہے اور ایمانِ تفصیلی کا تعلق امورِ کثیرہ سے ہے۔

عارفِ کامل پر جب شیونِ الٰہیہ (اللہ تعالےٰ کی شانوں) کا انکشاف ہوتا ہے تو اس پر جو شانِ ایزدی منکشف ہوتی ہے وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر جب دوسری شان کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اس پر ایمان لاتا ہے۔ شیون غیر متناہی ہیں۔ اس لیے ان کی معرفت کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس صورت میں عارف کا ایمان معرفت کے ہر درجہ پر چلا جاتا ہے۔ اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کرام کا یہی حال ہے۔ جس کا عرفان ز ہوگا۔ اس کا ایمان تفصیلی بھی زیادہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم سب عارفوں سردار ہیں۔ اس لیے سرکارِ ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کا ایمان سب سے زیادہ اور تمام عالم سے اکمل و اقویٰ اور بر ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى

پیارے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم! آپ کی آئندہ گھ
گذشتہ گھڑی سے بہتر ہوتی رہے گی۔

عارفین اور حضرات انبیاء کرام کے کمالاتِ ایمانی کو ان کا غیر کسی طرح نہیں پا سکتا۔ چہ جائیکہ حضور سرورِ عا علیہ وسلم کے ایمانِ مبارک کے کمال کو کوئی پہنچ سکے ۔؎

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيْكٍ فِيْ مَحَاسِنِهٖ | فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْقَسِ

ترجمہ:۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خوبیوں میں شریک سے منزہ ہیں۔ آپ حُسن کا جوہر ہے وہ قابلِ تقسیم نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ نفسِ ایمان میں مساوات ایمانِ تفصیلی میں مساوات کو مستلزم نہیں ہے۔ نفسِ ایمان میں کمی بیشی متصور نہیں ہے لیکن ایمانِ تفصیلی میں بہرحال کمی وبیشی لازمی ہے اور یہی سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا م اور اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سیدنا امام اعظم کے نزدیک عام مومنین کا ایمان عارفین کے ایمان کے کل الوجوہ مساوی نہیں ہے۔ کیونکہ امام کے نزدیک ایمان تفصیلی باعتبار اپنے متعلق کے ایمانِ اجمالی سے زیادہ ہے کہ ایمان اجمالی امرِ واحد ہے اور ایمانِ تفصیلی کا تعلق امورِ کثیرہ سے ہے اور ظاہر ہے کہ نفسِ ایمان میں مساوات کما میں مساوات کو مستلزم نہیں ہے شرح فقہ اکبر میں ہے:۔

وروی عن ابی حنیفۃ رحمۃ اللہ انہ قال ایمانی کایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل لان المثلیۃ تقتضی

اور جناب ابو حنیفہ سے مروی ہے کہ فرمایا میرا ای
کے ایمان کی طرح ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ جبرئیل کے
کی مثل ہے کیونکہ مثلیت تمام صفات میں ہوتی ۔

ساوات فی کل الصفات والتشبیه لا تقتضیه یکفی لاطلاقه المساوات فی بعضه فلا حد یساوی بین ایمان احاد الناس وایمان لائکة والانبیاء علیهم السلام من ل وجه۔ (شرح فقه اکبر ملا علی قاری ص۱۱۳)

تشبیہ تمام میں نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے اطلاق کے لیے بعض وجوہ سے مساوات کافی ہے۔ پس عام لوگوں کا ایمان ملائکہ کرام اور انبیاء کرام کے ایمانوں کے من کل الوجوہ مساوی نہیں ہے۔ (شرح فقہ اکبر)

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد

نِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ وَّھُوَ قَوْلٌ فِعْلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ

کے بیان میں کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے ایمان قول و فعل کو کہتے ہیں اور یہ کم اور زیادہ ہوتا ہے

تشریح ایمان کی تعریف اور ایمان سے متعلق پوری بحث اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ کے نزدیک ایمان کی تعریف وہی ہے جو امام شافعی کے نزدیک ہے اور چونکہ ان ے نزدیک اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہیں اس لیے امام بخاری ایمان کی کمی بیشی کے قائل ہیں۔

۱۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا عَ اِیْمَانِھِمْ

۲۔ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی

۳۔ وَیَزِیْدُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی

۴۔ وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّ تٰھُمْ تَقْوٰھُمْ

۵۔ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِیْمَانًا

۶۔ اَیُّکُمْ زَادَتْهُ ھٰذِهٖ اِیْمَانًا فَاَمَّا الَّذِیْنَ مَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا

۷۔ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا

۸۔ مَا زَادَھُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا (بخاری)

اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھائیں۔

ہم نے ان کی ہدایت بڑھادی۔

جنہوں نے ہدایت پائی اللہ ان کے ایمان کو بڑھاتا ہے۔

جنہوں نے ہدایت پائی اللہ نے ان کے ایمان وتقویٰ میں زیادتی فرمائی۔

تاکہ ایمان والوں کا ایمان زیادہ ہو جائے۔

تم میں کس کا ایمان بڑھایا اس صورت نے انہیں کا جو ایمان لائے۔

ان کو ڈرایا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا

نہیں بڑھا ان کا مگر ایمان اور تابعداری

تشریح ۱۔ ان آیات میں پہلی آیت سورۂ فتح کی ہے اور دوسری سورۂ کہف کی۔ تیسری سورہ مریم کی، چوتھی سورۂ قتال کی۔ پانچویں سورۂ مدثر کی، چھٹی سورہ توبہ کی، ساتویں سورۂ آلِ عمران کی اور آٹھویں آیت سورہ زاب کی ہے۔ یہ آٹھ آیتیں امام بخاری اس امر کے ثبوت میں لائے ہیں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا۔ جس کا جواب ہم تفصیل سے ذکر کرچکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں نفسِ ایمان کی کمی یا زیادتی کا بیان نہیں ہے بلکہ

ایمان کے ثمرات وعلامات کی زیادتی کا بیان ہے۔

۲۔ ان آیات کے بعد امام بخاری علیہ الرحمہ اپنے دعوے کے ثبوت میں آثارِ صحابہ و اقوالِ علماء ذکر فرماتے ہیں یہ ہیں:۔

وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ مِنَ الْاِيْمَانِ (بخاری)

اور اللہ کیلئے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھ علاماتِ ایمان ہے۔

تشریح: اسی مضمون کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰهِ (بخاری)

بہترین اعمال میں یہ ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت جائے اور اسی کے لیے دشمنی

اس حدیث میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مومن کے عمل کی غرض وغایت رضاءِ الٰہی ہونی چاہیے اور حُبّ بُغض کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان فرمایا کہ حُبّ وبغض پر ہی تمام معاملاتِ دینی ودُنیوی کا مدار ہے۔ جب دونوں ہی خدا کے لیے ہوں گے تو پھر انسان سعادتِ دارین حاصل کرے گا۔ امام بخاری غالباً اس حدیث کو ایمان کی کمی وزیادتی پر بطور دلیل لاتے ہیں۔ وجہ استدلال ان کا یہ ہے کہ حُبٌّ فِی اللّٰہ اور بغض فی اللّٰہ ایمان میں داخل ہے اور دوستی ودشمنی کم یا زیادہ ہوا کرتی ہے تو کمی وزیادتی ایمان میں نہ ہوئی یعنی ایمان کی علا اور اس کے ثمرات میں ہوئی۔

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى عَدِيِّ ابْنِ عَدِيٍّ اَنَّ لِلْاِيْمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُوْدًا وَّسُنَنًا فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا اِسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْاِيْمَانَ فَاِنْ اَعِشْ فَسَاُبَيِّنُهَا لَكُمْ حَتّٰى تَعْمَلُوْا بِهَا وَاِنْ اَمُتْ فَمَا اَنَا عَلٰى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيْصٍ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عدی بن عدی کو لکھا ک کے لیے فرائض وعقائد حدود اور سُنن ہیں تو ج ان کو پورا کیا اس نے ایمان کو پورا کیا اور جس نے ان پروا نہ کی اس نے ایمان کو پورا نہ کیا۔ اگر میں زندہ ر تم سے ان سب امور کو بیان کروں گا کہ تم اس پر عمل کرو اگر میں زندہ نہ رہا تو مجھے تمہاری ہم نشینی کی آرزو نہیں

تشریح

یہاں چند امور قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ فرائض سے مراد وہ اعمال جو فرض کئے گئے جیسے نماز، زکوٰۃ وغیر شرائع سے مراد عقائد وغیرہ، حدود یعنی محرمات اور ممنوعات۔ سُنن یعنی مندوبات ومستحبات ۲۔ اما نے عمر بن عبدالعزیز کے اس قول کو ایمان کے کم وزیادہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز

حضرت عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔ آپ نے حضرت انس اور عبداللہ بن جعف سے مُلاقات کی ہے۔ حضرت انس نے عمر بن عبدالعزیز کے پیچھے اس وقت پڑھی جب کہ آپ خلیفہ نہ ہوئے تھے تو اس وقت حضرت انس نے فرمایا تھا عمر بن عبدالعزیز کی نماز حضور اکرم ص

کی نماز کے مشابہ ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سنہ ۹۹ھ میں خلیفہ ہوئے اور دو سال کچھ دن آپ کی خلافت رہی نیک، پرہیزگار عادل خلیفہ تھے۔ دیر سمعان جو حمص میں ہے۔ رجب کے مہینہ میں سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ مجدد دین امت میں شمار کیا گیا ہے۔ آپ نے بوقت وفات یہ وصیت کی تھی کہ حضور اکرم علیہ السلام کے موے و ناخن مبارک قبر میں ان کے ساتھ رکھے جائیں۔

۱۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت تک تمام صحابہ وفات پا چکے تھے ۲۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مذکورہ بالا احکام عدی بن عدی کو لکھے جو آپ کی طرف سے موصل میں گورنر تھے ۳۔ عدی بن عدی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور اپنے چچا عمر بن وہب بن عمیرہ سے روایت کی ہے جو دونوں اصحابی تھے۔ خود سے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ روایت کرتے ہیں۔ لیکن بخاری و مسلم و ترمذی نے ان سے کوئی روایت نہیں کی۔

لیطمئن قلبی کی تفسیر

(قَالَ اِبْرَاهِيْمُ السَّلَامُ) وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی) یقین کیوں نہیں۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آئے۔ (بخاری)

۔ اس آیت کو امام بخاری ایمان کے کم و بیش ہونے کے ثبوت میں لائے ہیں ۲۔ اس آیت کی مختصر تفسیر یہ ہے کے کنارے ایک آدمی مرا پڑا تھا۔ جوار بھاٹے میں پانی چڑھتا اترتا ہے۔ جب پانی چڑھتا تو مچھلیاں اس لاش ں۔ جب اتر جاتا تو جنگل کے درندے کھاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ ملاحظہ فرمایا تو آپ کو ہوا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ مُردے کس طرح زندہ کیے جائیں گے۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے رب یقین ہے کہ تو مُردوں کو زندہ فرمائیگا اور ان کے اجزا دریائی جانوروں اور درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے سے جمع فرمائے گا لیکن میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مفسرین کا یہ قول بھی ہے کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو ملک الموت حضرت رب العزت سے اذن لے کر آپ کو یہ بشارت سنانے آپ نے بشارت سن کر اللہ کی حمد کی اور ملک الموت سے فرمایا کہ اس خلعت کی علامت کیا ہے۔ انہوں نے یہ کہ اللہ آپ کی دُعا قبول فرمائے گا اور آپ کے سوال پر مُردے زندہ فرمائے گا تب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا زن) ——— جب آپ نے یہ دُعا کی کہ اے رب تو مُردے کیسے زندہ کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ اَوَلَمْ کیا تجھے یقین نہیں؟ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ عالم غیب و شہادت ہے۔ اس کو حضرت ابراہیم کے ان و یقین کا علم ہے باوجود اس کے کہ یہ سوال فرمایا کیا تجھے یقین نہیں، اس لیے ہے کہ سامعین کو سوال کا مقصد ہو جائے اور جان لیں کہ یہ سوال کسی شک و شبہ کی بنا پر نہ تھا (بیضاوی جمل)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بَلٰی کیوں نہیں۔ مگر چاہتا ہوں کہ میرے دل کو طمانیت حاصل ہو جائے۔ حضرت شیخ ابن الہمام مسامرہ ہیں کہ طمانیت کے معنی سکون، قرار اور ٹھہراؤ کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سوال ہی ایسا تھا جیسے کوئی کر معظمہ کے حالات بیان کرنے لگے اور تمہیں مکہ یا مدینہ خود جا کر ان کے حالات کو دیکھنے کا اشتیاق

پیدا ہو جائے تو جس طرح اشتیاق کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں بیان کرنے والے کے بیان میں شک ہے بلد یہ ہے کہ تم نے پوری طرح یقین کر لیا ہے۔ اسی لیے تو بچشم خود ان حالات کو دیکھنے کا شوق و اضطراب پیدا یہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے اندر کام کرنے والے شوق و اضطراب کا حال ہے کہ انہیں شک و تھا۔ بلکہ یقینِ کامل تھا کہ اللہ تعالےٰ مُردوں کو زندہ فرمائے گا اور اسی یقین کے تحت شوقِ نظارہ سوال بن کر

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي کے معنی یہ ہیں کہ اس علامت سے میرے دل کو جائے کہ تو نے مجھے اپنا خلیل بنایا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلا لیجیے۔ مور، مُرغ، کبوتر، کوا یہ چار پرندے لیے۔ انہیں بحکم الٰہی ذبح کیا۔ ان کے پَر اُکھاڑے اور قیمہ کر کے ان باہم خلط کر دیے اور اس مجموعہ کے کئی حصے کیے۔ ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھا اور ان کے سر اپنے پا رکھے۔ پھر فرمایا چلے آؤ حکمِ الٰہی سے۔ یہ فرماتے ہی وہ اجزاء اُڑے اور ہر ہر جانور کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ترتیب سے جمع ہوتے اور پرندوں کی شکلیں بن کر اپنے پاؤں سے دوڑتے ہوتے اپنے اپنے سروں سے پہلے کی طرح مکمل پرند بن کر اُڑ گئے اور اس طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کو قرار آیا اور ایمان میں زیادتی ہو گئی۔

وَقَالَ مُعَاذٌ اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً (بخاری)	اور معاذ نے کہا ہمارے ساتھ بیٹھو تاکہ ایک دین کی باتیں کریں۔

تشریح

۱۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے یہ جملے حضرت اسود بن بلال سے کہے تھے ۲۔ ا حضرت معاذ کے اس قول کو اس امر کے ثبوت میں لائے ہیں کہ ایمان کم و بیش ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ حضرت معاذ مومن ہی تھے۔ پھر ان کا یہ فرمانا کہ مومن ہوں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ذکر خیر کریں بڑھائیں یعنی احکامِ دین بیان کریں اور ذکرِ خیر میں مشغول ہوں۔ یہی نُؤْمِنْ سَاعَةً کا مفہوم ہے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالےٰ عنہ

معاذ بن جبل انصاری خزرجی جلیل القدر عظیم المرتبت رئیس الفقہاء عابد و زاہد قاری اور فقیہہ مشہور صحابی ہیں۔ کنیت ہے۔ نہایت خوبصورت، جوانمرد اور سخی تھے۔ آپ انصار کے ان ستر اشخاص میں سے ہیں جو بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں ایمان لائے۔ غزوۂ بدر اور دوسرے تمام غزوات میں شریک ر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بارہا آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ قرآن حکیم چار آدمیوں ابن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل سے ——— کبھی فرمایا کہ حلال و حرام کے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں ——— یہ بھی ارشاد فرمایا کہ معاذ قیامت کے دن علماء کے آگے بڑے ٹیلے کے آئیں گے ——— اور کبار صحابہ بھی معاذ بن جبل کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ حضرت رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے تھے کہ عورتیں عاجز ہو گئی ہیں کہ اب معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ جیسا بچہ جنیں۔

ہو جاتا ـــــ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضرت عمر فاروق الےٰ عنہ کے کس قدر گہرے مشیر تھے۔

حضرت معاذ کے مناقب و فضائل بہت ہیں۔ جب حضور علیہ السلام نے ان کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ے سرفراز فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاذ بن جبل امام الفقہا تھے اور قیاس پر عمل کرنے کی انہوں نے ہی ے اللہ علیہ وسلم سے سب سے پہلے اجازت حاصل کی تھی عہد رسالت کے بعد حضرت ابوبکر و حضرت عمر ان سے ت اور امور جہاد میں مشورہ اور مدد لیتے رہے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی وفات کے بعد افواج اسلامیہ کے سپہ سالار اعظم مقرر ہوئے۔ طاعون عمواس میں حضرت ابوعبیدہ کی وفات کے چند ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں آپ نے جوانی ہی میں ۳۳ سال یا کسی قدر زائد عمر میں وفات پائی۔ آپ سے ۱۵۰ یں۔ ۲۰ حدیثیں ایسی ہیں جن پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور تین ایسی ہیں جن کو صرف بخاری نے ذکر ایسی ہے جو صرف مسلم نے ذکر کی۔

مَسْعُوْدٍ اَلْیَقِیْنُ الْاِیْمَانُ (بخاری)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ یقین پورا ایمان ہے۔

ر کا دوسرا ٹکڑا ہے۔ وَالصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ صبر نصف ایمان ہے۔ اس سے بھی ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ یقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود صحابی ہیں۔

ت ابن مسعود مکہ میں قدیم سے ایمان لائے۔ دونوں ہجرتوں میں شریک ہوئے۔ بدر اور دیگر تمام لڑائیوں میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ یہ بڑے خوش قسمت صحابی ہیں۔ حضور نعلین برداری کا شرف انہیں کو حاصل ہوا۔ جب حضور علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو یہ نعلین مبارک میں رکھ لیتے۔ آپ کا مدینہ شریف میں ۳۲ھ میں انتقال ہوا۔ حضرت عثمان یا حضرت زبیر یا حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی عمر شریف کچھ اوپر ساٹھ برس کی ہوئی۔ آپ سے ۸۴۸ حدیثیں مروی ہیں ۶۴ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور ۲۱ حدیثیں ایسی ہیں جن کو صرف بخاری نے اور ۳۵ ایسی ف مسلم نے ذکر کیں۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ

عُمَرَ لَا یَبْلُغُ الْعَبْدُ
تَّقْوٰی حَتّٰی یَدَعَ مَا حَاكَ
صَّدْرِ (بخاری)

اور حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ انسان تقویٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک اس بات سے کنارہ کشی نہ کرے جو دل میں کھٹکے

تقویٰ۔ خشیت الٰہی کا نام ہے یعنی اللہ سے ڈر کر معاصی کو ترک کرنا۔ حَاكَ یَحِیْكُ اس کے معنے تاثیر کے ہیں جیسے کہتے ہیں ضَرَبَهٗ فَمَا حَاكَ فِیْهِ السَّیْفُ۔ اس نے تلوار چلائی مگر تلوار نے

تاثیر نہ کی۔ امام بخاری اس اثر کو بھی اس امر کی دلیل لائے ہیں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمر
بندہ حقیقتِ تقویٰ (ایمان) کو اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک ان امور کو ترک نہ کر دے جو دل میں کھٹکیں
جس کام کے متعلق یہ شبہ ہو جائے کہ شاید خلافِ شرع ہو۔ اس کو بھی چھوڑ دے جس سے واضح ہوا کہ بعض لوگ حقیقت
ایمان کو پا لیتے ہیں اور بعض نہیں جو نہیں پاتے ان کا ایمان ناقص ہوتا ہے۔ لہٰذا ایمان میں کمی بیشی ہونا ثابت

حضرت ابن عمرؓ

حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب قرشی عدوی مکی۔ آپ مکہ میں اپنے والد مکرم
فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ہمراہ ایمان لائے۔ جب کہ آپ صغیر السنّ
آپ خندق اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ آپ مسلمانوں کے امام اور مشہور مفتیوں میں سے ہیں
عبادلۂ اربعہ میں اول ہیں۔ آپ سے دو ہزار چھ سو تیس حدیثیں مروی ہیں۔ صحاح ستّہ میں آپ سے کل ۱۶۳۰
روایت کی گئی ہیں جن میں سے ۱۷۰ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۸۱ حدیثیں ایسی ہیں جن کو صرف
نے اور ۳۱ ایسی ہیں جن کو صرف مسلم نے ذکر کیا۔ آپ نے موضع فخ میں ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں حضرت ابن زبیر کی
کے تین ماہ بعد یا ۸۴ھ میں وصال فرمایا اور حجاج نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا اَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ
وَاِيَّاهُ دِيْنًا وَّاحِدًا
(بخاری)

اور امام مجاہد نے کہا "تمہارے لیے وہی دین ہے جس
کی وصیت کی تھی حضرت نوح کو" کی تفسیر میں
یعنی حکم دیا ہم نے تم کو اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور
کو ایک ہی دین کا۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ جس دین کا حکم اللہ عزّ وجل نے حضرت نوح
دیگر انبیاءِ کرام علیہم السلام کو دیا۔ اسی دین کا حکم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

امام مجاہد

یہ فقہ، تفسیر اور حدیث میں امام مانے گئے ہیں۔ ان کے والد کا نام جبر تھا۔ یہ عبداللہ بن سائب
مخزومی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ امام مجاہد حضرت ابن عباس و ابن عمرو و ابوہریرہ و جابر و
بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہم وغیرہم جلیل القدر صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں
تین مرتبہ حضرت ابن عباس پر قرآن پیش کیا ہے۔ آپ کی عمر ۸۳ سال کی ہوئی۔ آپ نے مکہ میں بحالت
۱۰۰ھ یا ۱۰۱ھ یا ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا
سَبِيْلًا وَّسُنَّةً
(بخاری)

اور حضرت ابن عباس نے آیۂ مبارکہ شرعۃ و منہا
کی تفسیر سبیل اور سنّت سے کی۔

۱۔ یعنی آیۂ مبارکہ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کا
اور طریقہ بنایا۔ حضرت ابن عباس نے شرعۃ کی تفسیر لفظ سبیل سے کی۔ جس کے معنی راستے کے ہیں اور منہاج
کی تفسیر لفظ سنت سے کی جس کے معنی طریقہ کے ہیں ۲۔ یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی آیت سے یہ ثابت ہوتا

تمام انبیا علیہم السلام کا دین ایک ہے اور دوسری آیت یعنی لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا سے یہ یت ہے کہ ہر نبی کا دین علیحدہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں اس امر کا بیان ہے کہ اصولِ دین میں تمام بیا متحد ہیں اور دوسری آیت میں فروعِ دین میں اختلاف کا بیان ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں تناقض نہیں۔ ان دونوں آیتوں کا باب سے کیا تعلق ہے۔ شارحین نے اُس کی مناسبت کے بیان سے سکوت کیا ہے۔

دُعَآؤُكُمْ اِيْمَانُكُمْ (بخاری) | "دُعاءکم" کے معنی "ایمانکم" کے ہیں۔

یعنی حضرت ابن عباس نے دُعاء کے معنی ایمان کے کیے ہیں۔ امام بخاری اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عا میں کمی وزیادتی ہوتی ہے لہٰذا ایمان میں ہوگی۔ پوری آیت یہ ہے:۔

لْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا
عَاؤُكُمْ

تم فرماؤ تم کچھ قدر نہیں میرے رب کے ہاں اگر تم اسے نہ پوجو (ترجمہ رضویہ)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اہلِ مکہ کو کہلوایا گیا تھا کہ جب تک اللہ عزوجل کی پرستش نہ کرو س وقت تک اس کی جناب میں تمہاری کوئی قدر نہیں۔

واضح ہو کہ لفظ دعا کے متعدد معنی ہیں اور یہ لفظ قرآن پاک میں بھی متعدد معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً پکارنا، انگنا، دُعا مانگنا، بُلانا، پوجنا، تمنا یا آرزو کرنا وغیرہ۔ لہٰذا ہر جگہ کی مناسبت کے لحاظ سے اس لفظ کے معنی کیے یں گے۔ حضرت ابن عباس نے اس آیت میں دُعا کے معنی ایمان کے کیے ہیں تو اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب تم ایمان نہ لے آؤ اس وقت تک خدا کے ہاں تمہاری کوئی قدر نہیں ہے۔

سلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

حدیث ۷ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ يْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ ادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا سُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ زَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ

حضرت ابن عمر سے ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے۔ گواہی دینا اس بات کی کہ خدا کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

شریح الفاظ حدیث

بُنِيَ۔ بنی یبنی سے ہے اس کے معنی بنیاد کے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ سولہ لفظوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل لغت میں اس کے معنی سرین ہلانے کے یں اور شریعت میں ارکانِ مخصوصہ کے یعنی نماز پڑھنا زکوٰۃ کے معنے پاکیزگی وطہارت کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى اس کے معنی نشوونما کے بھی آتے ہیں جیسے کہتے ہیں۔ زَكَى الزَّرْعُ یعنی کھیتی سرسبز و اداب ہوگئی اور شریعت میں زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ سال گزر جانے پر صرف خدا کے لیے شارع کی مقرر کردہ مدون

اور مقدار میں اپنے مال کا ایک حصہ دینا۔ حج لغت میں قصد کرنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں حج کا مفہوم یہ ہے کہ مخصوص مکان کی طرف مخصوص ایام میں شارع کے مقرر کردہ نظام کے مطابق قصد کرنا۔ صوم کے معنی لغت میں رُکنے کے ہیں خواہ کسی بھی چیز سے رُک جائے اور شریعت میں صوم کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کا بہ نیت عبادت صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک اپنے آپ کو قصداً کھانے پینے اور جماع سے باز رکھنا۔ روزہ اور زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئے۔

مسائل حدیث

۱۔ اللہ عزوجل کی طرف سے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستور ہمارے پاس آیا۔ اس میں توحید خداوندی اور رسالتِ محمدی کی شہادت کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کو ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ نماز فرض ہے اور اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے۔ جو قصداً چھوڑے اگرچہ ایک ہی وقت کی ہو وہ فاسق ہے اور جو نماز نہ پڑھتا ہو اسے قید کیا جائے۔ یہاں تک کہ توبہ کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ ائمہ ثلاثہ مالک و شافعی و احمد رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے نزدیک سلطانِ اسلام کو اس کے قتل کا حکم ہے۔ واضح ہو کہ ائمہ ثلاثہ تارکِ صلوٰۃ کے لیے قتل کا جو حکم دیتے ہیں تو یہ بطورِ تعزیر ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کافر ہے۔ بچہ کی جب سات برس کی عمر ہو۔ تو اس کو نماز پڑھنا سکھایا جائے اور جب دس برس کا ہو جائے تو مار کر پڑھوانا چاہئے (ترمذی) زکوٰۃ بھی فرض ہے اس کا منکر کافر ہے اور نہ دینے والا فاسق اور قتل کا مستحق ہے اور ادا میں تاخیر کرنے والا گنہگار مردود الشہادۃ ہے۔ روزہ بھی فرضِ عین ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ بلا عذرِ شرعی روزہ رکھنے والا سخت گنہگار ہے اور عام طور پر کھلے بندوں روزے کا احترام نہ کرنے والا مستحقِ تعزیر ہے۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا اس کی فرضیت بھی قطعی ہے اس کا منکر بھی کافر ہے۔ عمر بھر میں حج صرف ایک بار فرض ہے۔

۲۔ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں سے کسی کا بھی تارک مسلم نہیں ہے۔ لیکن اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہے کہ ان میں سے کسی چیز کا محض تارک کافر نہیں ہوتا جب تک ان کی فرضیت کا انکار نہ کر دے۔ چنانچہ وہ حدیث جس کا مضمون یہ ہے کہ جس نے قصداً نماز ترک کی وہ کافر ہے۔ یہ وعید زجر و توبیخ پر محمول ہے یا اس سے مراد کفرانِ نعمت ہے یا یہ حدیث مؤوّل ہے یعنی معنیٔ حدیث یہ ہے کہ جو شخص ان کے ترک کو حلال جانے وہ کافر ہے۔ (عینی جلد ۱ صـ ۱۴۲) ۳۔ ارکانِ اسلام کے پانچ امور میں بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عبادت یا قولی ہوگی تو یہ شہادت ہے۔ یعنی توحید و رسالت پر ایمان لانا یا غیر قولی ہوگی۔ اس کی دو صورتیں ہیں ترکی ہوگی تو یہ روزہ ہے۔ فعلی ہوگی تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں۔ بدنی ہوگی تو یہ نماز ہے یا مالی ہوگی تو زکوٰۃ ہے یا مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہوگی تو یہ حج ہے ۴۔ ان ارکانِ اسلام میں رکنِ اصلی صرف ایمان ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا دارومدار بھی ایمان پر ہے اور یہاں نماز، روزہ کو رکنِ اصلی کے ساتھ صرف اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ یہ اعظم شعائرِ اسلام ہیں ۵۔ اس حدیث میں ایمان بالانبیاء، کتبِ سماویہ و ملائکہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کرنا تو اس میں تمام عقائدِ اسلامیہ آ گئے۔ گویا اس حدیث میں عقائدِ اسلامیہ کی تفصیل نہیں ہے اور دوسری حدیثوں میں عقائدِ اسلامیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

نوٹ : ۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب التفسیر میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور یہ حدیث رباعیاتِ بخاری سے ہے۔

بَابُ اُمُوْرِ الْاِیْمَانِ

یہ باب امور ایمان کے بیان میں

وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ لَيْسَ الْبِرَّ
اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ اِلَخ قَوْلِهٖ الْمُتَّقُوْنَ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى
قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (بخاری)

ہے۔ اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو۔ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ (اخیر آیت متقون تک پڑھیے) اور اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ مومن فلاح یافتہ ہیں (اخیر آیت تک پڑھیے) (ترجمہ بلفظہٖ ہے)

۱۔ واضح ہو کہ مرجیہ اس امر کے قائل ہیں کہ ایمان تو صرف قول کا نام ہے۔ عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد چاہے انسان کتنے ہی گناہ کرے اس سے کسی قسم کا مواخذہ نہ ہوگا۔ چونکہ مرجیہ کا یہ نظریہ کتاب و سنت کے خلاف ہے اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اس لیے امام بخاری نے ان ابواب کو قائم کر کے ان کی تردید فرمائی ہے اور کتاب و سنت کی نصوص سے یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے ایمان کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے اور یہ کہ کتاب و سنت سے ہی ایمان کے کاموں کی تفصیل معلوم ہوتی ہے ۲۔ امام بخاری نے اس باب میں دو آیتیں ذکر کی ہیں۔ پہلی آیت کا مکمل ترجمہ یہ ہے۔ ”کچھ اصلی نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو۔ ہاں اصل نیکی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں اور سائلوں کو اور غلام آزاد کرانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر کرنے والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں“ (البقرہ پ۲) یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہوئی۔ کیونکہ نصاریٰ نے بیت المقدس کے مشرق کو اور یہود نے اس کے مغرب کو قبلہ بنا رکھا تھا اور ہر فریق کا گمان تھا کہ صرف اس کی طرف منہ کرنا ہی کافی ہے۔ اس آیت میں اس کا رد فرما دیا گیا۔ کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہو گیا (مدارک) مفسرین کا ایک قول یہ بھی ہے کہ خطاب اہلِ کتاب اور مومنین سب کو عام ہے اور معنی آیت یہ ہیں کہ ”صرف قبلہ کی طرف منہ کر لینا اصل نیکی نہیں۔ جب تک عقائد درست نہ ہوں اور دل اخلاص کے ساتھ ربِّ قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

دوسری آیت کا مکمل ترجمہ یہ ہے ”بے شک ایمان والے مراد کو پہنچے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ جو زکوٰۃ دینے کا کام کرتے ہیں اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (المومنون پ۱۸ رکوع ۱)

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کے ضروری اوصاف معلوم ہوئے۔ نماز میں خشوع و خضوع بے کار باتوں سے احتراز

زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت، پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی۔ یہ گویا ایمان کے ثمرات و نتا
واضح ہو کہ قرآن پاک سے بھی ایمان کے اثرات و نتائج کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط

ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے

معلوم ہوا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے۔ اسی طرح سورۃ نور رکوع ۷ میں فرمایا۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ..... الخ

(سورۃ نور رکوع ۷)

ایمان والوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ ک
لیے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں۔ ہم
سُنا اور ہم نے مانا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلے کے سامنے سر
ہے۔ ایک اور آیت میں فرمایا:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورہ حجرات ع)

ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت و شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے۔ ایک اور مقام پر ف

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(سورۃ آل عمران رکوع ۱۷)

خدا تعالےٰ پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل ایمان والوں کی نشانی ہے۔ اس قسم کی بہت سی آیات مل جاتی ہیں۔
ایمان کے نتائج و ثمرات کا ذکر ہے۔ تو جیسے قرآنِ پاک نے ایمان کے نتائج و ثمرات اور ایمانداروں کے اوصاف
کئے ہیں۔ اسی طرح قرآنِ حکیم کے شارع حضور سید عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان کے نتائج و علامات ک
فرمایا ہے۔ جن کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آ رہی ہے۔

حدیث ث عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّوْنَ شُعْبَةً وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکر
صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایمان کے کچھ اوپر
شعبے ہیں اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

(بخاری)

اس حدیث کو مسلم و نسائی نے کتاب الایمان میں اور ابو داؤد و ابن ماجہ نے سنت میں ذکر کیا ہے۔

فوائد و مسائل

بِضع کے لفظ کا استعمال تین سے لے کر نو تک ہوتا ہے۔ شُعْبَۃٌ ش کے زیر، زبر
پیش تینوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ شعب درخت
ٹہنیوں اور ہڈی کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس کے معنی خصلت کے ہیں۔ یعنی ایمان کی متعدد علامتیں اور خصلتیں ہیں۔
ظاہر ہے کہ ایمان اصل ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں اور اس حدیث میں فرع پر ایمان کا اطلاق بطور مجاز کیا گیا
کیونکہ اعمالِ صالحہ ایمان کی علامتیں ہیں۔ بعض احادیث میں بضع و سبعون کا لفظ بھی آیا ہے۔ یعنی ایمان کی کچھ او

ستر شاخیں ہیں۔ لیکن اس تعداد سے مراد حصر نہیں ہے کہ ایمان کی صرف اتنی ہی شاخیں ہیں بلکہ مراد تکثیر ہے یعنی ایمان کی کثرت سے شاخیں اور خصلتیں ہیں ۳۔ حیا۔ انسان کی ایک فطری صفت ہے اور اس سے وہ حیا مراد ہے جو انسان کو برائیوں سے روکے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ سے پوری حیا کرنے کا مطلب یہ ہے:۔

تَحْفَظَ الرَّاسَ وَمَا هَوٰى وَالْبَطْنَ وَ مَا حَوٰى وَتَذْكُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى

سر و خواہشات و پیٹ اور اس کے اندر جو ہے اس کی حفاظت کر اور بلاء و مصیبت کو یاد رکھ

ایمان کے اثرات و ثمرات

علماء کی ایک جماعت نے ایمان کے کچھ اوپر ستر ثمرات و اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً شیخ عبدالجلیل نے اپنی تصنیف "شعب الایمان" میں۔ اسحاق قرطبی نے "کتاب النصائح" میں۔ امام ابو حاتم نے اپنی کتاب "وصف الایمان" میں، امام ابو عبداللہ حلیمی نے اپنی کتاب "فوائد المنہاج" میں اور امام حافظ بیہقی نے مختصر شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کے ان ستر اثرات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ علامہ عینی نے اختصار کے ساتھ اثراتِ ایمان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے: ایمان تصدیقِ قلبی و اقرارِ لسانی کا نام ہے مگر نجاتِ کامل کے لیے تصدیق، اقرار اور عمل صالح کی ضرورت ہے۔ یہ شاخیں ہوئیں۔

اول:۔ **اعتقادات**۔ اس کے تیس شعبے ہیں ۱۔ ایمان باللہ۔ اس میں توحید اور خدا کی ذات و صفات شامل ہیں ۲۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے حادث ہے ۳۔ فرشتوں پر ایمان ۴۔ رسولوں پر ایمان ۵۔ کتبِ سماویہ پر ایمان ۶۔ ملائکہ پر ایمان ۷۔ تقدیر پر ایمان ۸۔ یومِ آخرت پر ایمان۔ اس میں سوالِ قبر، عذابِ قبر، بعث و نشور، حساب، میزان و پلِ صراط پر ایمان لانا بھی داخل ہے ۹۔ جن کے لیے اللہ تعالےٰ نے جنت یا نار کا وعدہ فرمایا ہے اس پر ایمان لانا اور وعید نار پر ایمان لانا ۱۰۔ اللہ سے محبت کرنا ۱۱۔ اللہ تعالےٰ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور عداوت رکھنا۔ اس میں صحابہ کرام، مہاجرین و انصار اور آلِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی داخل ہے ۱۲۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا، اس میں نماز اور اتباعِ سنتِ نبوی داخل ہے ۱۳۔ اخلاص، اس میں ریاء اور نفاق کا ترک بھی شامل ہے ۱۴۔ توبہ ۱۵۔ خوفِ الٰہی ۱۶۔ خدا سے امید ۱۷۔ خدا سے کسی حال میں ناامید نہ ہونا ۱۸۔ شکر ۱۹۔ وفا ۲۰۔ صبر ۲۱۔ تواضع ۲۲۔ بڑوں کا ادب کرنا ۲۳۔ تقدیر پر راضی ہونا، ۲۴۔ توکل ۲۵۔ رحمت و شفقت، اس میں چھوٹوں پر رحم کرنا بھی شامل ہے ۲۶۔ غضب کا ترک کرنا ۲۷۔ بدگمانی سے ۲۸۔ عجب و تفاخر سے پرہیز کرنا ۲۹۔ ترک الحقد ۳۰۔ حبِ دنیا کا ترک۔ اس میں حبِ مال اور جاہ شامل ہے۔

دوم۔ وہ جن کا تعلق زبان سے ہے اس کے چھ شعبے ہیں ۱۔ زبان سے توحید کا اقرار کرنا ۲۔ قرآن پاک کی تلاوت ۳۔ علمِ دین کی تعلیم دینا ۴۔ دعا ۵۔ ذکرِ الٰہی، اس میں استغفار بھی شامل ہے ۶۔ لغو سے پرہیز کرنا

سوم۔ بدن کے اعمال۔ اس کے چالیس شعبے ہیں اور پھر ان کی تین طرح ہیں اول۔ وہ جن کا اعیان سے تعلق ہے اس کے ۱۶ شعبے ہیں ۱۔ پاکی، اس میں بدن، کپڑا، مکان کی طہارت، وضو، غسل جنابت و حیض و نفاس بھی

شامل ہے ۲۔ اقامۃ الصلوٰۃ۔ اس میں فرض، نفل اور قضا داخل ہے ۳۔ صدقہ، اس میں ادائے زکوٰۃ، صدقۂ فطر جود و کرم، کھانا کھلانا اور مکان کی تکریم بھی شامل ہے ۴۔ صوم، اس میں فرضی، نفلی روزے داخل ہیں ۵۔ حج، اس میں عمرہ بھی داخل ہے ۶۔ اعتکاف، اس میں لیلۃ القدر کا قیام بھی داخل ہے ۷۔ دینی وجہ سے ہجرت کرنا ۸۔ نذر کو پوری کرنا ۹۔ غلاموں کو آزادی دلانا ۱۰۔ کفارہ کو ادا کرنا ۱۱۔ نماز اور خارج نماز میں ستر عورت ۱۲۔ قربانی کرنا ۱۳۔ القیام بامر الجنازۃ ۱۴۔ قرض ادا کرنا ۱۵۔ معاملات میں سچائی کو اختیار کرنا اور سود سے بچنا ۱۶۔ حق کی شہادت دینا اور اس کو نہ چھپانا۔

دوم۔ وَمَا یَخْتَصُّ بِالْاَتْبَاعِ۔ اس کے چھ شعبے ہیں ۱۔ نکاح کے بعد زنا سے بچنا ۲۔ اہل و عیال کے حقوق ادا کرنا۔ اس میں خادموں کے ساتھ نرمی بھی شامل ہے ۳۔ والدین سے نیک سلوک کرنا ۴۔ اولاد کی تربیت کا خیال کرنا ۵۔ صلہ رحمی کو اختیار کرنا ۶۔ اپنے آقا کی اطاعت کرنا۔

سوم۔ وہ جن کا تعلق عام لوگوں سے ہے۔ اس کے اٹھارہ شعبے ہیں ۱۔ حاکم ہونے کی صورت میں عدل و انصاف کرنا ۲۔ سوادِ اعظم کے ساتھ رہنا ۳۔ نیک و صالح حاکموں کی اطاعت کرنا ۴۔ اصلاح بین الناس۔ اس میں قتالِ خوارج و بغاوت داخل ہے ۵۔ نیکی پر تعاون ۶۔ اچھی باتوں کا حکم کرنا برائی سے روکنا ۷۔ حُدود کو قائم رکھنا راہِ خدا میں جہاد کرنا ۹۔ امانت کو ادا کرنا ۱۰۔ قرض وعدہ پر ادا کرنا ۱۱۔ ہمسایہ کی عزت کرنا ۱۲۔ معاملہ کی صفائی اسراف و تبذیر سے بچنا ۱۴۔ سلام کا جواب دینا ۱۵۔ چھینک کا جواب دینا ۱۶۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ ۱۷۔ لہو و لعب سے پرہیز کرنا ۱۸۔ راستے سے ایذا دینے والی چیز کو ہٹانا۔ یہ ۷۷ شعبے ہیں جو ایمان کے اثرات و نتا ہیں (عینی جلد ۱ صفحہ ۱۵۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابوہریرہ بہت اہم ہیں۔ آپ ازدی، دوسی، یمنی اور پھر مدنی ہیں۔ آپ کا اصل عبد اللہ یا عبد الرحمٰن بن صخر الدوسی ہے۔ بعض نے کہا۔ ایامِ جاہلیت میں ان کا نام عبد شمس تھا۔ اسلام لانے کے بعد عبد الرحمٰن رکھا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کے اور ان کے والد کے نام میں اختلاف ہے اور اس میں تیس ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام میمہ یا امیمہ ہے۔ آپ کی والدہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مشرف بہ اسلام آپ کو بلیوں سے بہت محبت تھی۔ ایک دن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آستین میں بلی کو دیکھا تو ف ابا ہریرہ (بلیوں کے باپ) حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد آپ ابوہریرہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ہے کہ یہ حضور علیہ السلام کے ارشاد ہی کا اثر ہو کہ لوگ ان کا اصل نام ہی بھول گئے۔ حتیٰ کہ ان کے والد کے نام میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوہریرہ سے بہت زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ آپ نے حضور علیہ السلام سے عرض کی تھی کہ حدیثیں بھول جاتی ہیں جس پر حضور علیہ السلام نے ان کی جھولی میں کچھ ڈال دیا اور فرمایا سمیٹ لو۔ بس اس وقت سے آپ جو حدیث سنتے یاد رہتی تھی۔ آپ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد رسول

صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہجرت کر کے آئے اور تا وفات حضور علیہ السلام کی صحبت میں رہے اور آپ سے بکثرت حدیثیں روایت کیں۔ صحاح ستہ میں ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ تین سو پچیس کی تخریج پر بخاری و مسلم متفق ہیں۔ تین سو نوے کی تخریج امام بخاری اور ایک سو تترے کی تخریج پر امام مسلم منفرد ہیں اور ان سے آٹھ سو تابعین نے روایات حدیث لیں اور بیان کیں۔ سب سے زیادہ سعید ابن المسیب ان کے داماد اور ان کے مولی رج نے اور مدینہ کے کبار تابعین نے ان سے بکثرت حدیثیں لیں۔

آپ بڑے جلیل القدر، عبادت گزار اور متواضع و خاکسار تھے اور صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ الحدیث تھے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ تم ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور تم ہم سب سے زیادہ آپ کی حدیثوں کا علم رکھتے ہو۔

ابن سعید کا بیان ہے کہ روزانہ بارہ ہزار نفل پڑھتے تھے واقدی کے قول کے مطابق سنہ ۵۹ھ ۷۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے (عینی جلد ۱ صـ۱۲۶)

حدیث نمبر ۹۔ بَابُ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ

باب مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان

مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ

اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دیں جس کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمائی۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ ہجر کے لغوی معنیٰ چھوڑنے کے ہیں۔ اسی لیے جو شخص اپنے اہل و عیال و وطن سے جدا ہو جائے اس کو مہاجر کہنے لگے۔ **ہجرت شرعی** کے متعلق تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔ حدیث زیر بحث میں مسلمان کی دو علامتوں کا بیان ہے۔ اوّل اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو ایذا نہ پہنچے اگرچہ ایذا ہاتھ کے بغیر بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ مگر چونکہ افعال کا صدور زیادہ تر ہاتھ ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہاتھ کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اور زبان کو ہاتھ سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ زبان کے ذریعے ایذا پہنچانا عامۃ الوقوع ہے اور زیادہ آسان ہے۔ اس کے علاوہ زبان سے جو ایذا پہنچائی جاتی ہے۔ وہ زیادہ اشد اور تکلیف دہ ہوتی ہے اور یہ بھی کہ زبان سے حاضر و غائب، قریب و بعید سب کو ایذا پہنچائی جا سکتی ہے۔ برخلاف ہاتھ کے کہ وہ موجودین کے ساتھ خاص ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد پوری ملت کے لیے امن و چین کا ضامن ہے۔ اس پر اگر عمل کیا جائے تو پھر کسی پولیس و عدالت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ افسوس اگر ہم اپنے موجودہ حالات اور اپنے

گردوپیش پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی زبان یا ہاتھ سے محفوظ نہیں ہے (الاما خودغرضی، لالچ، دھوکا فریب، خیانت، ظلم وحسد ہمارے معاشرہ کی بڑی بڑی خرابیاں ہیں۔ جو حدیث زیر بحث عمل کرنے سے دور ہو سکتی ہیں۔ جب ایک مسلمان اپنا یہ دستور بنالے گا کہ بحیثیت مسلمان میرا فرض یہ ہے کہ دوسرے کو میری کسی حرکت سے نقصان نہ پہنچے تو پھر معاشرہ امن وعافیت کا گہوارہ بن جائیگا ——— حدیث زیر بحث کا دو ہمیں مہاجر کی صحیح تعریف بتاتا ہے کہ صحیح معنوں میں مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں سے باز آجائے۔ جن کی اللہ ورسول علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ خواہ ان میں کتنی ہی کشش کیوں نہ ہو۔ غرضیکہ پوری حدیث پر عمل کرنے سے ایک تو انسا اپنی روح کی صفائی ہوتی ہے۔ دوسرے معاشرہ میں امن وسکون قائم ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے ہمیں توفیق عمل عطا فرما

۳۔ علماء نے اس حدیث کو جوامع الکلم میں شمار کیا ہے اور واقعی حضور اکرم صلے اللہ کے یہ کلمات طیبہ مختصر ہونے باوجود نہایت جامع ومانع ہیں ——— فرمایا مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سل رہے۔ اس جملہ میں تمام حقوق العبد آگئے خواہ ان کا تعلق دوست واحباب سے ہو یا عزیز واقارب سے سب ہی حقوق پورا کرنے کی ہدایت۔ اس مختصر جملہ سے ملتی ہے جس کو اگر پھیلایا جائے تو سینکڑوں صفحات بھر جائیں۔ اسی یہ ارشاد کہ مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالٰے کی ناپسندیدہ باتوں کو چھوڑ دے "حقوق اللہ" کی تمام صورتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے

حدیث نمبر ۱۰

بَابُ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ

باب کون سا مسلمان افضل ہے۔ حضرت

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔

ابی موسیٰ اشعری سے روایت ہے۔ صحابہ نے عر کی یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کونسا مسلمان اف ہے۔ فرمایا۔ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسل سلامت رہے۔

فوائد ومسائل حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالٰے عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ حضور علیہ السلام آپ کو زبید، عدن اور ساحل یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعا لے نے بھی آپ کو کوفہ وبصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ آپ علماء صحابہ سے ہیں۔ متقی بھی ہیں۔ ابو موسیٰ نامی چار صحابہ ہوتے ہیں۔ ابو انصاری، ابو موسیٰ غافقی، ابو موسیٰ حکمی اور چوتھے یہ ہی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالٰے عنہم۔ آپ سے کل ۳۶۰ حدیث ہیں۔ جن سے بخاری ومسلم نے ۵۰ پر اتفاق کیا اور ۴ حدیثوں کو بخاری نے اور ۱۵ حدیثوں کو مسلم نے منفرداً روایت آپ سے حضرت انس بن مالک وطارق بن شہاب تابعین کی کثیر تعداد اور آپ کے بیٹوں ابو بردہ، ابو بکر، ابراہیم و نے حدیثیں روایت کیں۔ مکہ یا کوفہ میں آپ کا انتقال ہوا ۲۔ اس حدیث کو مسلم ونسائی نے کتاب الایمان میں ترمذی نے کتاب الزہد میں درج کیا ہے۔ مسلم شریف میں اسی مضمون کی جس دوسری روایت میں ای الاسلام خیر کی بج ای المسلمین افضل آیا ہے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کے نزدیک مسلمانوں میں وہ مسلمان افضل

جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہے ۔ ۲- اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کی زبان یا ہاتھ سے مسلمان کو ایذا پہنچے وہ مسلمان ہی نہیں ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ کامل مسلمان یا افضل مسلمان وہی ہے کہ جس میں یہ صفت پائی جائے۔

حدیث نمبر۱۱

بَابٌ اِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب کھانا کھلانا اسلام کی خصلت ہے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَئُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ

حضرت عبد اللہ بن عمر سے ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ۔ اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے ۔ آپ نے فرمایا ۔ کھانا کھلانا اور سلام کرنا اسکو جس کو تو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔

فوائد و مسائل

۱- امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الایمان اور باب اسلام للمعرفۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے کتاب الایمان میں اور ابوداؤد نے کتاب الادب میں اور ابن ماجہ نے کتاب الاطعمہ میں ذکر کیا۔ ۲- اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے ۔ یہ سوال غالباً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے جواب میں دو باتوں کو اسلام کی بہترین خصلت قرار دیا۔ کھانا کھلانا اور سلام کرنا مگر اس کا مطلب نہیں ہے کہ صرف دو ہی بہترین خصلتیں ہیں بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اسلام کی بہترین خصلتوں میں سے یہ دو بھی ہیں۔ کھانا کھلانے کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے ۔ خصوصاً غریب و نادار کو کھانا کھلانا ایک ایسا ہے جو اللہ عزوجل کو بہت ہی محبوب ہے ۔ کتاب مجید میں یتیموں، مسکینوں، غریبوں کے لیے خوراک مہیا کرنے کی ت وموثر انداز میں ترغیب دی گئی ہے ۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے دوستی اور پُرخلوص تعلقات کے فروغ کے کثیر آداب ومراسم کی ترغیب دی ہے۔ ان میں ایک "سلام" بھی ہے ۔ کتاب مجید میں فرمایا:-

ذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا الخ

جب تمہیں کوئی سلام کرے تو اس سے بہتر انداز میں جواب دو۔

ذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا الخ

جب گھروں میں داخل ہو تو ان کے اہل کو سلام کرو

سلام کی اہمیت

اگرچہ دیگر اقوام میں بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ جب دو اشخاص ملتے ہیں یا ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں تو کسی اور گفتگو سے قبل کوئی لفظ یا فقرہ ایسا کہتے ہیں جو دوستی اور تعارف کو پیدا ہیں ۔ مثلاً انگریزوں میں وقت کے تعلق سے "گڈ مارننگ" اور "گڈ نائٹ" وغیرہ رائج ہیں اور متوجہ کرنے کے لیے " کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اہل ہنود میں رام رام یا اسی طرح کے اور الفاظ رائج ہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں وہ وسعت اور عمومیت نہیں ہے جو اسلام کے "سلام" میں پائی جاتی ہے ۔ "گڈ مارننگ" کا مطلب روز بخیر ہے۔ گویا کہنے والا دعا دے رہا ہے کہ آپ کا دن خیریت سے گزرے"۔ اسی طرح دوسرے الفاظ بھی وقت کے ساتھ مقید

ہیں لیکن لفظ "سلام" کے مفہوم میں ہر طرح کی خیر و برکت، مسرت و راحت داخل ہے۔ اس میں نہ وقت کی قید نہ زمانے کی۔ "السلام علیکم" کہہ کر گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حق میں بطور دعا بہترین جذبات و خواہشات کرتا ہے۔ اور "سلامتی ہو تم پر" کے ذیل میں دین و دنیا کی تمام راحتیں اور برکتیں آجاتی ہیں۔ غرضیکہ اسلام کے سلام جو وسعت و عمومیت ہے۔ وہ دنیا کے کسی ضابطہ، تہذیب و نظام، تمدن کے مقرر کردہ الفاظ میں نہیں ہے۔

"سلام کا وسیع پس منظر

۱۔ پھر جہاں سلام باہمی ربط و ضبط بڑھانے کا مفید ذریعہ ہے۔ وہاں وسیع ذہنی پس منظر اور بنیادی فکر کا اعلامیہ اور آئینہ بھی ہے۔ اسلام ماننے والوں کو تعلیم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کو سلام کرو۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِذَا لَقِیَ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْہِ (ابوداؤد)

تم میں سے کوئی جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے
کہ سلام کرے۔

ہادی کامل صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت دراصل اس امر کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ اسلام ایک ایسا قائم کرنا چاہتا ہے جس میں مسلمان بہی خواہی تعاون اور محبت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بھائی ہوں۔ جس ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے غم سے غم اور خوشی سے خوشی ہونا خون کے رشتہ کی وجہ سے فطری امر ہے۔ اسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تکلیف سے تکلیف، راحت سے راحت محسوس ہونا اسلام کے تعلق سے لازمی دو مسلمانوں میں خواہ ظاہری و مادی طور پر کوئی تعلق نہ ہو صرف اسلام کا مقدس رشتہ ہی انہیں ایک دوسرے مونس و غمگسار، ہمدرد و مشیر بنانے کے لیے کافی ہو۔ لہٰذا اس شان کے معاشرے والے ایک دوسرے کے بالکل خاموش گزر جائیں تو یہ نہایت ہی غیر مناسب روش ہو گی۔ اسی لیے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے کی ہدایت فرمائی۔ گویا "سلام" اس رشتہ کا آئینہ دار ہے کہ ایک مسلم کو دوسرے مسلم سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس کی وسعت و عمومیت کا یہ عالم ہے کہ حدیث زیر بحث میں فرمایا۔

۲۔ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ

جس سے تم واقف ہو اسے بھی سلام کرو اور جس
تمہاری شناسائی نہیں ہے اسے بھی۔

یعنی سلام کرنے کے لیے پہلے سے شناسائی اور مادی و رسمی تعارف شرط نہیں ہے۔ صرف اسلامی رشتہ کیونکہ "سلام" اسلام کے تعلق سے بڑھ کر کسی اور تعلق کو نہیں مانتا۔ نسلی، جغرافیائی، طبقاتی اور لسانی وغیرہ رشتے کی نگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام کا رشتہ سب پر مقدم اور سب سے برتر و اعلیٰ ہے۔ جہاں بھی میں حقیقۃً کوئی اجنبیت نہ ہو گی۔ لہٰذا ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے شناسائی ہو یا نہ ہو۔ وہ بہر صورت اس کرے اور ہر موقع و محل پر اس حقیقت ثابتہ کی یاد دلاتا رہے کہ اسلام و ایمان کا تعلق ختم ہونے والا نہیں ہے۔ یہ تعلق تعلقات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر السلام علیکم کے جملہ پر غور کیجئے۔ یہ اپنے اندر کتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ جہاں

طلب ہے کہ سلام کرنے والا مخاطب کو یقین دلا رہا ہے کہ ہم تم اجنبی نہیں ہیں بلکہ ہمارے درمیان ایک مضبوط تعلق ے۔ وہیں یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں اپنے کو تنہا مت سمجھو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ رنج و راحت میں شریکِ حال یں کوئی مشکل پیش آئے تو میرا تعاون لو۔

اور مخاطب کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ جواب میں واؤ کے اضافہ کے ساتھ یہی الفاظ دہرائے یعنی وعلیکم السلام کہے۔ ب دینے والا یہ کہہ رہا ہے کہ تم جو میری سلامتی کے خواہشمند ہو۔ تو میں بھی تمہاری سلامتی کا خواہشمند ہوں۔ غور کیجئے حت و محبت مضمر ہے اس سوال و جواب میں اور کتنا پُرامن اور راحت بیز ہو سکتا ہے وہ معاشرہ جہاں واقعۃً ن دوسرے مسلمان کی سلامتی اور خیر و فلاح کا دل سے خواہشمند ہو۔ اسی لیے قرآن پاک نے بھی مومنوں کو ایک دوسرے ائی بطور تشبیہ نہیں بلکہ بطور امر واقعہ کہا ہے۔

۳۔ افسوس بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات نے السلام علیکم کے الفاظ کو رجعت پسندانہ قرار دے کر ترک کر دیا ہے اور کی جگہ جدید الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلامی تصورات سے بُعد اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے شیفتگی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ عقلاً بھی السلام علیکم سے بہتر اور جامع الفاظ کسی اور نظامِ تمدن میں رائج نہیں ہیں۔ خود سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمائی۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جابر ایک مرتبہ خدمتِ نبوی ضر ہوئے اور کہا۔ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حضور نے فرمایا لَا تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلَامُ ہے کہ علیک السلام میں لفظی تبدیلی کوئی نہیں صرف ترتیبِ الفاظ بدل دی گئی ہے مگر حضور علیہ السلام نے یہ بھی گوارا نہ ہٰذا لَا تَقُلْ کی واضح نہی سے معلوم ہوا کہ الفاظ تو کیا ترتیب بدلنا بھی جائز نہیں ہے۔

۴۔ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ عمران بن حصین کہتے ہیں۔ ہم اسلام سے پہلے بوقتِ ملاقات یہ الفاظ کہا کرتے تھے۔

مَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا وَّ اَنْعِمْ
حًا (ابوداؤد)

تیری آنکھوں کو اللہ ٹھنڈا رکھے اور تیری صبح نعمتوں کے ہجوم میں طلوع ہو۔

ظاہر ہے باعتبار مفہوم و معنی آداب تسلیمات گڈ مارننگ وغیرہ سے یہ جملے زیادہ مبارک اور خوشگوار ہیں۔ لیکن حضور علیہ السلام ی جگہ السلام علیکم مقرر فرما کر یہ بتا دیا کہ السلام علیکم نہایت جامع ہے اور یہ کہ مسلمان کو اغیار کے طریقوں کو چھوڑ کر سلامی طریقہ کو اپنانا چاہیے۔

۵۔ سلام کی مقدس رسم کو شارع علیہ السلام نے کبر و نخوت، علو پسندی، طبقاتی تفاوت اور اس طرح کے فاسد ت کی آبیاری میں استعمال ہونے سے کس شان سے روکا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کی ہدایت سے ہو سکتا ہے۔ بخاری کی حدیث میں فرمایا:

مُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ

سوار پیادے کو سلام کرے

جب آدمی گھوڑے یا کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو نفسیاتی طور پر پیدل چلنے والوں کے مقابلہ میں اس کے ری اور شان کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پیادے کو حکم دیا جاتا کہ وہ سوار کو سلام کرے تو لازماً

سواروں کے غلط احساسِ برتری ونخوت وتکبر کو غذا ملتی۔ اس لیے ہادیٔ کامل صلے اللہ علیہ وسلم نے سوار کے غلط
برتری کا علاج یوں فرمایا کہ وہ پیدل چلنے والوں کو سلام کرے اور پیدل چلنے والوں پر نفسیاتی طور پر یہ اثر ڈالا کہ وہ
صرف پیدل ہونے کی وجہ سے کمتر نہ سمجھیں کیونکہ اسلام میں بزرگی وبڑائی صرف تقوٰی وطہارت پر ہے نہ کہ دولت وثر
دنیاوی وجاہت وعزت پر

وَالْمَاشِیْ عَلَی الْقَاعِدِ وَالْقَلِیْلُ عَلَی الْکَثِیْرِ

چلنے والا بیٹھنے والے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ لو
کو سلام کریں۔

گویا اس کا لحاظ نہیں کیا جائیگا کہ چلنے والا کوئی ذی وجاہت اور باشوکت آدمی ہے لہٰذا جب وہ گز
ہر وہ شخص اس کو سلام کرے جو عرفِ عام میں اس سے کم حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس گزرنے والے پر لازم ہے کہ وہ
میں پہل کرے۔ اسی طرح قلیل کثیر کو سلام کریں۔ اس میں بھی سلام کی پہل کو طبقاتی تفاوت اور فرقِ مراتب
نہیں کیا بلکہ ایسا طریقہ مقرر فرمایا کہ "سلام" کی پاکیزہ رسم سے کسی حال میں بھی کمتری و برتری کی آبیاری نہ ہو۔ اسی لی

یُسَلِّمُ الصَّغِیْرُ عَلَی الْکَبِیْرِ

چھوٹا بڑے کو سلام کرے

یعنی کم عمر سلام میں پہل کرے مگر یہ نہ دیکھے کہ زیادہ عمر والا رتبہ وحیثیت میں بڑھا ہوا ہے یا گھٹا ہوا۔ ح
کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام لڑکوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں سلام کیا۔ بظاہر حضور
کا یہ طرزِ عمل سابقہ حدیث کے متعارض ہے مگر حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔ اوّلاً اس لیے کہ حضور علیہ السلا
شفیق تھے کہ ہر چھوٹے بڑے کے لیے دُعا میں سبقت کرنا گویا آپ کے قلبِ اقدس کا تقاضا تھا۔ چنانچہ بارہا آپ
ان صحابہ کو سلام کیا جو یقیناً آپ سے کم عمر تھے۔ دوسرے آپ کا فرضِ نبوت یہ تھا کہ صرف قول ہی سے تعلیم بلکہ
بھی اسلامی آداب وضوابط اُمت کو سکھائیں۔ چنانچہ لڑکوں کو سلام کی پاکیزہ رسم پر خصوصی توجہ دینے کے لیے آپ
سلام کیا جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جس پر آدابِ اسلامی کی رُو سے سلام میں سبقت ضروری ہو
کو فراموش کردے تو ہمیں اس کے انتقام میں سلام سے گریز نہ کرنا چاہیئے بلکہ سلام ہے کہ خود سلام کرکے اسے بھو
یاد دلادیں۔ اسی لیے فرمایا:۔

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاللّٰہِ مَنْ بَدَءَ
بِالسَّلَامِ (ابوداؤد)

لوگوں میں اللہ سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو
میں پہل کرے۔

یعنی سلام میں پہل کرنا کسی کمتری وبے حیثیتی کی علامت نہیں ہے بلکہ تقرب الی اللہ اور نیکی کا مظہر ہے۔
یہ سلام کی مقدس رسمِ اسلام کو کس درجہ پسند ہے اس کا اندازہ حدیثِ ذیل سے کیجئے۔ حضور علیہ السلام
جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کو ملے تو سلام کرے۔

فَاِنْ حَالَتْ بَیْنَہُمَا شَجَرَۃٌ اَوْ جِدَارٌ
اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِیَہٗ

پھر اگر اس باہمی سلام کے بعد درمیان میں کوئی
دیوار یا پتھر آجائے اور اس کے بعد پھر ملاقات

فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ (ابوداؤد)	سلام کرنا چاہیے۔

گویا ہر ملاقات کے آغاز میں تجدیدِ سلام ہونا چاہیے۔ خواہ وہ ملاقات چند لمحوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مسلمان کو ہر صورت میں دوسرے مسلمان کے ساتھ ہمدردی، بہی خواہی و عافیت طلبی کی نیک خواہش کا اظہار ضرور کر دینا چاہیے۔ اور سلام جیسی پاکیزہ دعا سے نہ چوکنا چاہیے۔

افسوس ہمارے معاشرہ میں یہ عمل تقریباً متروک ہے۔ صرف اس وقت تو سلام کر لیتے ہیں جب سفر سے واپسی ہو یا پہلی بار ملاقات ہو۔ ورنہ ایک لمحے کے بعد دوسرے لمحہ کی ملاقات میں اسے نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تو یہ ہے۔

يَا بُنَيَّ إِذَا دَخَلْتَ عَلَىٰ أَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُوْنُ بَرَكَةٌ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أَهْلِ بَيْتِكَ (ترمذی)	اے بیٹے! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس پہنچے تو سلام کر یہ سلام تیرے اور تیرے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔

بیہقی کی حدیث میں فرمایا۔

إِذَا دَخَلْتُمْ بَيْتًا فَسَلِّمُوْا عَلَىٰ أَهْلِهِ وَإِذَا خَرَجْتُمْ فَأَوْدِعُوْا أَهْلَهُ بِسَلَامٍ (بیہقی)	جب گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو اور جب گھر سے چلنے لگو اور انہیں سلام ہی سے رخصت کرو۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلم پر مسلم کے چھ حقوق ہیں۔ جب اس سے ملے تو سلام کرے۔ جب وہ بیمار ہو عیادت کرے۔ جب چھینکے جواب دے۔ جب بلائے اس کے پاس جائے۔ جب وہ مر جائے اس کے جنازہ کے ساتھ جائے اور جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی اسکے لیے پسند کرے (ترمذی) ۲۔ جو شخص پہلے سلام کرے وہ رحمت الٰہی کا زیادہ مستحق ہے (ترمذی) ۳۔ جو پہلے سلام کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہے (بیہقی) ۴۔ ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے موقع پر بھی سلام کرو (ابوداؤد) ۵۔ آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے جواب میں السلام علیکم کہا تھا (بخاری و مسلم) ۶۔ سلام بات چیت کرنے سے پہلے کیا جائے (ترمذی) ۷۔ مجلس میں پہنچنے کے بعد اور مجلس سے واپسی پر دونوں مواقع پر سلام کرے (ابوداؤد) ۸۔ بچوں کو سلام کرو (مسلم) ۹۔ چھوٹا بڑے کو، سوار پیدل کو، گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ آدمیوں کو سلام کریں (مسلم) ۱۰۔ اہل کتاب سلام کریں تو ان کے جواب میں صرف وعلیکم کہہ دیں (مسلم) ۱۱۔ راستہ کا حق یہ ہے کہ نظر نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیز کو دور کرنا، سلام کا جواب دینا، اچھی بات کا حکم اور بری باتوں سے روکنا (مسلم) ۱۲۔ السلام علیکم کہنے والے کے لیے دس نیکیاں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے والے کے لیے بیس، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ومغفرتہ کے کہنے والے کے حق میں چالیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں (ابوداؤد) ۱۳۔ یہود و نصاریٰ سے تشبہ نہ کرو۔ یہود کا سلام انگلیوں کے اشارہ سے ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں کے اشارہ سے (ترمذی) ۱۴۔ علیک السلام مت کہو یہ مُردوں کی تحیت ہے بلکہ السلام علیک کہا کرو (ابوداؤد)

سلام کے ضُروری مُسائل

یہ اور اس مضمون کی احادیث سے فقہا نے بہت سے مسائل اخذ کیے ہیں۔
جن میں سے بعض یہ ہیں ۱۔ سلام کرنے میں مسلم کی عزت و آبرو اور مال و جا
کی حفاظت کی نیت کرے ۲۔ ایک شخص کو سلام کرے تو اس کے لیے بھی جمع کا لفظ استعمال کرے یعنی السلام علیکم
کہے۔ جواب دینے والا بھی وعلیکم السلام کہے۔ رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ بہتر ہے۔ صرف علیکم یا علیک نہ ک
جائے ۳۔ سلام کا جواب فوراً دینا واجب ہے۔ بلا عذر تاخیر کی تو گنہ گار ہوگا اور یہ گناہ جواب دینے سے دفع
ہوگا بلکہ توبہ کرنی ہوگی ۴۔ مجلس میں سے کسی ایک شخص کا جواب دے دینا اہل مجلس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے ۵
قاضی جب کہ عدالت میں اجلاس کر رہا ہو اس کو کسی نے سلام کیا تو اس پر جواب دینا واجب نہیں ۶۔ جو شخص تلا
میں یا درس و تدریس یا علمی گفتگو یا سبق کی تکرار کر رہا ہو یا عالم دین وعظ کر رہا ہے یا تعلیم میں مشغول ہے یا کوئی
ذکر میں مشغول ہے یا تقریر ہو رہی ہے اور لوگ سن رہے ہیں؛ ان صورتوں میں سلام نہ کیا جائے ۷۔ جو شخص پیشاب
پاخانہ، کبوتر اڑانے یا گانے یا حمام یا غسل خانہ میں ننگا نہا رہا ہے اس کو بھی سلام نہ کیا جائے۔ اگر کیا تو اس
جواب واجب نہیں۔ پیشاب کے بعد ڈھیلا لے کر استنجا سکھاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی سلام نہ کیا جائے۔ فاسق
بھی سلام نہ کرے۔ گمراہ و بے دین کو سلام کرنا گناہ ہے ۸۔ کسی کو سلام پہنچانے کا وعدہ کر لیا ہے تو سلام پہنچانا واج
۹۔ ہتھیلی یا انگلی کے اشارے سے سلام کرنا ممنوع ہے ۱۰۔ یونہی اشارہ سے جواب دینا بھی ناکافی ہے منہ سے وعلیکم ا
کہنا واجب ہے ۱۱۔ رکوع کی حد تک جھک کر سلام کرنا حرام ہے اور اس سے کم جھکنا مکروہ ہے ۱۲۔ بندگی عرض ہے
لفظوں سے سلام کرنا ناجائز ہے ۱۳۔ آداب عرض ہے۔ گو اس میں اتنی برائی نہیں مگر سنت کے خلاف ہے۔ تسلیمات
تسلیم اور سلام۔ یہ سلام ہی کے معنی میں ہے مگر السلام علیکم کہنا بہر حال افضل ہے ۱۴۔ بچے جب سلام کرتے ہیں تو
طور پر جواب میں جیتے رہو کہا جاتا ہے یہ کافی ہے۔ یہ جواب ایام جاہلیت میں کفار دیا کرتے تھے۔ اسی لیے اسلام
سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کا لفظ مقرر کیا ہے ۱۵۔ جب کوئی کسی کو سلام پہنچائے تو جواب میں اسی طرح ک
علیک وعلیہ السلام ۱۶۔ نبی و فرشتہ کے نام کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے۔ ۔
میں سلام لکھا ہوتا ہے اس کا جواب دینا بھی واجب ہے اور جواب کی دو صورتیں ہیں۔ یہ کہ زبان سے جواب د
دوسری صورت یہ ہے کہ سلام کا جواب لکھ کر بھیج دے۔ مگر چونکہ جواب سلام فوراً دینا واجب ہے اور تحریری جواب
بہر صورت تاخیر ہوتی ہے اس لیے فوراً جواب دے تاکہ تاخیر سے گناہ نہ ہو۔ کافر کو سلام نہ کیا جائے۔ اگر وہ سلام ک
تو جواب میں صرف وعلیکم یا علیک کہا جائے اور بقصد تعظیم کافر کو ہرگز ہرگز سلام نہ کیا جائے کیونکہ کافر کی تعظیم کفر
(در مختار) ۱۸۔ اگر ایسی جگہ گزر ہو جہاں مسلم و کافر دونوں ہوں تو السلام علیکم کہے اور مسلمانوں کو سلام کا ارادہ ک
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ کہے ——— غیر مسلموں کو ابتداءً سلام نہ کیا جائے۔ حضور علیہ السلام

لَا تَبْدَءُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى بِالسَّلَامِ | یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں۔ جب انہیں سلام کرنے کی ممانعت ہے تو غیر اہل کتاب کفار

ولی اس حکم میں شامل ہوں گے۔ اسی طرح بدمذہب و بے دین خصوصاً جن کے عقائد حدِ کفر تک پہنچ چکے ہیں، ان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ البتہ جب غیر مسلم ہمیں سلام کریں تو صرف وَعَلَیْکَ کہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور یہ حکم کوئی تنگ نظری، تنگ دلی اور بداخلاقی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انصاف و دیانت اور خلوص و للّٰہیت کا آئینہ دار ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ السلام علیکم میں جس سلامتی کا ذکر ہے وہ اس محدود پیمانے کی سلامتی نہیں ہے جو صرف دنیاوی عیش و آرام، امن و عافیت تک محدود ہو بلکہ اس میں آخرت کی فلاح و نجات، عافیت و خیریت بھی شامل ہے یعنی السلام علیکم یا وعلیکم السلام کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ عزوجل تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں امن و عافیت عطا فرمائے۔ ظاہر ہے کہ جب اہلِ کفر کے لیے قرآنی تصریحات کے مطابق آخرت کی فلاح و نجات ہے ہی نہیں تو انہیں سلامتی کی دعا دینا کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ جس سلامتی کے ہم اہلِ کفر کے لیے قائل ہی نہیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ قائل ہو جائیں تو مسلمان ہی نہیں رہ سکتے۔ اسی سلامتی کی دعا اگر ہم اہلِ کفر کو دے دیں تو یہ منافقانہ رواداری ہوگی اور مسلمان منافقانہ رواداری کا قائل نہیں ہے اور اس کو شرافت و نجابت اور اخلاق کے خلاف سمجھتا ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پہل نہ کریں۔ یعنی ان کو السلام علیکم نہ کہیں اور اگر وہ سلام کریں تو ہم صرف وعلیک جواب میں کہہ دیں اور اس وعلیک کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم پر سلامتی ہو بلکہ "سلام" کو حذف کر دینے کے بعد وعلیک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر بھی وہی کچھ ہو جس کے تم مستحق ہو۔ البتہ جہاں غیر مسلموں کے ساتھ مل جُل کر رہنا پڑتا ہے یا ان کی حکومت ہوتی ہے یا ان سے ربط و ضبط ناگزیر ہوتا ہے۔ وہاں "آداب عرض ہے" ایسے جملے استعمال کر سکتے ہیں۔ جن میں کوئی شرعی خرابی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ لیکن السلام علیکم کے الفاظ بہر صورت نہیں کہیں گے۔ اسی طرح وہ الفاظ بھی نہیں استعمال کر سکتے جو غیر اسلامی ثقافت کا جزو بن گئے ہیں۔ جیسے نمستے رام رام یا جے بھارت وغیرہ۔

حدیث نمبر ۱۲

بَابٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ اَنْ یُّحِبَّ

باب مومن کی شان یہ ہے کہ جو اپنے لیے

لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

(بخاری)

پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے حضرت قتادہ، حضرت انس سے راوی ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ جو اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے چاہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام مسلم و ترمذی و نسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے ۲۔ یحب کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف دل کے مائل ہونے کے ہیں۔ میلانِ قلب کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔ حسن، علم و فضل، احسان ظاہر ہے۔ یہ میلان طبعی و فطری ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی میں حُسن پایا جائے یا کمال موجود ہو یا کوئی شخص احسان کرے تو انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ محبت کم اور زیادہ ہوتی رہتی

ہے۔ جب احسان بڑھے گا محبت بڑھ جائے گی۔ جب احسان کم ہوگا محبت کم ہو جائے گی۔ علمانے فرمایا کہ حدیث میں محبت اختیاری مراد ہے ——— اور فطری نہیں ۳۔ لا مومن میں لا نفی کے لیے ہے لیکن علماء یہاں وتاما جیسے الفاظ مقدر مانتے ہیں اور معنی یہ کرتے ہیں کہ مومن کامل وہ ہے جس میں یہ صفت پائی جائے کیونکہ اگر میں مذکورہ بالا صفت نہ پائی جائے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

کسی ایک کام کو اسلامی قرار دینے کا مطلب

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اکثر احادیث میں کس کام کو اسلام یا اسلام کی علامت قرار دیا گیا مثلاً یہی حدیث کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہے یا مومن کی شان یہ ہے کہ جو بات لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے یا اسی مضمون کی متعدد حدیثیں آگے آ رہی ہیں۔ جن کا مضم کھانا کھلانا اسلام ہے۔ سلام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ تو ان احادیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس مسلمان میں صرف سلام کر صفت پائی گئی وہ مومن کامل ہے اگرچہ بقیہ اعمال و ارکان اسلامی کی وہ پابندی نہ کرتا ہو۔ اسی طرح ان احادیث کا بھی نہیں ہے کہ بس یہ ایک کام ہی اسلامی ہے اور باقی اعمال و ارکان اسلامیہ غیر ضروری ہیں بلکہ کسی ایک کام کو خص کے ساتھ بیان کر دینے سے شارع علیہ السلام کا مقصد اس عمل کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی واضح یہ حدیث ہے۔ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِطُھُوْرٍ طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز کے لیے صرف طہارت کافی ہے بلکہ مقصد صرف طہارت کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے تو جیسے طہارت کو محض اس کے لیے خصوصیت کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ اسی طرح اعمال اسلامیہ میں سے کسی ایک عمل کی اہمیت و عظمت کے اظہ لیے ذکر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ لوگوں میں اس عمل کو اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ لہٰذا مومنِ کامل وہی مسلمان قرا تمام افعال و اعمالِ اسلامیہ کو بجا لائے۔

اسی طرح

حدیث کے پڑھنے والوں کو یہ اصولی بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ وہ حدیثیں جن میں خاص خاص اور بد اخلاقیوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ان کے مرتکب ہوں ان میں ایمان نہیں یا وہ موم نیز وہ حدیثیں جن میں بعض اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ان کا تارک ہو وہ ایمان خالی ہے یا وہ مومن نہیں ہے۔ ان کا منشاء و مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص دائرہ اسلام سے بالکل خارج ہو گیا او آخرت میں اس سے کافروں والا معاملہ ہوگا بلکہ مطلب صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ایسا مسلمان اس درجہ اور مقام سے جو ایک مومن کی اصلی شان ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ جس کسی میں کوئی صفت بہت ناقص ہوتی ہے تو اس کو کالعدم قرار دے کر اس کی بالکل نفی کر دی جاتی ہے۔ خصوصاً دعوت و خطابت اور ترغیب و تر یہی طرزِ بیان زیادہ موزوں اور زیادہ مفید مطلب ہوتا ہے ——— حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ کہ جب آپ کو کسی فعل یا عمل کی انتہائی قباحت یا بے حد افادیت کا اظہار منظور ہوتا ہے تو آپ اپنا خاص طرز کا کلام فرماتے جس میں حقائق کا بیان اس انداز سے ہوتا کہ سننے والا نافرمانی سے خوف کھائے اور اطاعت پر مائل ہو

صطلاح میں ترغیب و تحریص و تہدید و ترہیب کہتے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا۔

۱۔ جس نے ظالم کو ظالم جانتے ہوئے بھی اس کی مدد کی وہ اسلام سے خارج ہوگیا ۲۔ آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو ۳۔ یا آپ خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔ جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین میں حصہ نہیں ۴۔ یا زیر تفہیم حدیث ہی لے لیجیے۔ جس میں فرمایا کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ جو بات اپنی ذات کے لیے پسند کرے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے ۵۔ یا اسی نوع کی اور متعدد حدیثیں آگے آرہی ہیں۔ جن میں کسی ایک عمل یا فعل کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ایمان دار نہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس نوع کے تمام ارشادات کا مقصد و منشا یہ نہیں ہے کہ جو مسلمان پڑوسی کو ایذا دے یا بد دیانتی کرے یا ظلم میں مدد پہنچائے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ اس طرز کلام سے مقصود صرف اس فعل کی انتہائی قباحت اور اس عمل کی بے حد افادیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ چنانچہ علماء حق اس پر متفق ہیں کہ وہ روایتیں جو ترہیب و ترغیب و تہدید کے سلسلہ میں آئی ہیں وہ ظاہری معنی پر محمول نہیں ہیں اور نہ ان سے کوئی شرعی عقیدہ یا حکم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی حدیث کو لیجیے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو یا فرمایا کہ جس وقت زناکار زنا کرتا ہے، شرابی شراب پیتا ہے، چور چوری کرتا ہے۔ اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا (بخاری) ظاہر ہے کہ اس طرز کلام سے حضور علیہ السلام کا منشا فتویٰ دینا اور قانون شرعی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ پڑوسیوں کو تکلیف پہنچانے، زنا کرنے و شراب پینے کی بدترین قباحت پر متنبہ کرنا ہے تاکہ لوگ برائیوں کو ترک کردیں اور اعمال حسنہ کی طرف راغب ہوں ——— لہٰذا اس نوع کی حدیثوں کو "کفر کے فتوے" اور فیصلے سمجھنا اور اس بنا پر ان گناہوں کے مرتکبین کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا (جیسا کہ معتزلہ و خوارج نے کیا ہے)، دراصل ان حدیثوں کے اصل مفہوم اور حضور علیہ السلام کے طرز کلام کی خصوصیات سے ناواقفی و نادانی کا نتیجہ ہے۔ علماء کا یہ فرض ہے کہ جب وہ اس نوع کی روایات کو بیان کریں تو ان کی حقیقی پوزیشن کو اجمال و تفصیل کے ساتھ ضرور بیان کردیا کریں تاکہ خالی الذہن عوام کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

ضرت قتادہ و انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

اس حدیث کے راویوں میں حضرت قتادہ و حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قابل ذکر ہیں۔ حضرت قتادہ سدوسی، بصری تھے۔ انھوں نے حضرت انس و عبداللہ بن سرجس اور ابوطفیل عامر سے حدیث سنی ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم اور مفسر تھے۔ علم و فضل و شرف والے تھے کہ آپ نے ۱۰ سال کامل حضور علیہ السلام کی خدمت کی اور رسول اللہ مشہور ہوئے۔ آپ کی والدہ نے دربار نبوت میں دعا کے لیے درخواست کی۔ حضور علیہ السلام نے دعا الٰہی! انس کی عمر، مال اور اولاد میں برکت عطا فرما۔ حضور علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی۔ آپ کافی مالدار ے۔ آپ کے باغ میں ایک پودا تھا جس کے پھولوں سے مشک و عنبر کی خوشبو آتی تھی۔ آپ نے کنواں کھودا تو

پانی کھارا نکلا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کی۔ حضور علیہ السلام نے اپنا لعاب دہن مبارک ڈ کنویں کا پانی مدینہ کے تمام کنوؤں سے زیادہ میٹھا ہوگیا (خصائص کبریٰ سیوطی) اولاد کی کثرت کا یہ حال ہی فرماتے ہیں کہ اپنے بیٹے پوتے وغیرہ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے دفن کیا ان کی تعداد دو کم سو تک پہنچ کی عمر شریف ایک سو سال کی ہوئی۔ صحابہ کرام میں سب سے آخر میں آپ کا ہی وصال ہوا۔ آپ نے بصرہ میں پائی۔ حضرت محمد بن سیرین نے آپ کو غسل دیا۔ ۹۳ھ میں حجاج کے زمانہ حکومت میں بمقام بصرہ آپ کا وص حجاج کے محل کے قریب آپ کو دفن کیا گیا۔ رضی اللہ تعالے عنہم۔ حضرت انس رضی اللہ تعالے عنہ سے بکثرت مروی ہیں۔ صحاحِ ستہ میں آپ سے ۲۲۸۶ حدیثیں مروی ہیں ——— بخاری ومسلم نے ۱۶۸ حدیثوں پر ۸۳ حدیثوں کو صرف بخاری نے اور ۹۱ حدیثوں پر صرف مسلم نے اتفاق کیا ہے۔

بَابٌ حُبُّ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شرطِ ایمان ہے

۱۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ

(بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول ال علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے اس ذاتِ مقدس کی ق جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ تم کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنے اولاد سے زیادہ محبوب نہ جانے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام مسلم ونسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ نسائی کی روایت میں وَاَهْلِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں ۲۔ الرسول میں الف ہے اور اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے محبت رکھنا توقیر کرنا اور ان کی نبوتوں پر ایمان لانا واجب ہے۔ بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا انبیاء کرام علیہم محبت کو مستلزم ہے بلکہ حضور علیہ السلام سے محبت تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین سے محبت کو بھی وَالَّذِیْ میں واو قسم کے لیے ہے۔ حَتّٰی غایت کے بیان کے لیے ہے۔ اَحَبُّ اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے اور قسم تاکید اور قوت پیدا کرنے کے لیے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی اہم امر کو بیان کرنے کے لیے قسم کا استعم بِيَدِهٖ اللہ تعالے ہاتھ وغیرہ سے پاک ہے اور یہ لفظ متشابہات سے ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ عزوجل طرف ید وغیرہ کی نسبت کی ہے۔ متشابہات سے متعلق علما کی دو رائیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ پر ہمارا ایمان ہے اور اس کے اصل مفہوم کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ دوسرا طبقہ مؤولین کا ہے جو اس قسم کے ایسا معنیٰ کرتے ہیں جو خدا تعالے کے شایانِ شان ہو۔ مثلاً جہاں ید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا مراد وہ طاقت وحکومت اور اختیار لیتے ہیں تو اب حدیث کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے

یان ہے۔

ضور اکرم علیہ السلام کی محبت عین ایمان ہے

لا یؤمنُ۔ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ اس کا قطعاً یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بغیر ایمان کا پایا جانا ناممکن ہے۔ ہر شخص جس کو اللہ تعالےٰ نے ن کی دولت دی ہے وہ یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ جس کے ساتھ عقیدت و نیازمندی ایمان میں داخل ہو اور بغیر اسکے ہوئے آدمی مومن نہ ہو سکے۔ اس کی محبت ساری کائنات سے زیادہ ضروری ہوگی۔ ماں باپ اولاد عزیز و اقارب سان پر حقوق ہیں اور ان کا ادا کرنا لازم ہے لیکن اگر کوئی شخص ان سب کو بھول جائے اور اس کے دل میں ان کے ل محبت و اُلفت باقی نہ رہے اور ان سب سے بے تعلق ہو جائے تو اس کے ایمان میں خلل نہ آئیگا کیونکہ ایمان یں ماں باپ عزیز و اقارب کا ماننا ضروری نہیں ہے لیکن رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ماننا مومن ہونے کے روری ہے۔ جب تک لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا معتقد نہ ہو ہرگز مومن نہیں ہو سکتا۔ تو اگر اس کا بت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹا تو یقیناً ایمان سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ تصدیقِ رسالت محبت کے بغیر یں سکتی۔ اس لیے اسلام میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کو سارے عالم سے زیادہ ضروری اور اسلام و ی شرطِ اوّل قرار دیا گیا ۲۔ محبت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ محبت اجلال و احترام جیسے والدین سے محبت، رحمت و شفقت رے محبت (رحمت و شفقت جیسے اولاد سے محبت) محبتِ احسان کہ کسی نے آپ پر احسان کیا تو آپ کا دل اس ف مائل ہو گیا تو اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ تمام قسم کی محبتوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہونی چاہیئے وقات میں آپ سے زیادہ شفیق مہربان، فیاض، محسن اور محترم ہستی اور کون ہے۔

عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ للّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ كُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ اسِ اَجْمَعِيْنَ

حضرت انس سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک میں اس سے اس کے والد، اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا اور محبوب نہ ہوں۔

و مسائل

مسلم اور نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث اور اس حدیث کا مضمون ایک ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلی حدیث میں وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ کا لفظ نہ تھا۔ لہٰذا اصل مفہوم دونوں کا یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک سارے جہان سے پیارے و محبوب نہ ہوں اس وقت تک ص مومن نہیں ہو سکتا۔ احادیث میں والد اور ولد کا ذکر محض اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ن سے لامحالہ محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان احادیث کی توثیق و تائید قرآن پاک کی متعدد آیات سے ہوتی ہے۔ فرماتا ہے۔ اگر تمہارے باپ، بیٹے، عورتیں، کنبہ، کمائی کا مال، تجارت جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہاری مکان یہ چیزیں تمہیں (اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام اور اس

کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ یہ اور اس مضمون کی متعدد آیات میں یہ بتایا گیا
تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آباؤ اجداد، اولاد، عزیز و اقارب، دوست، احباب، مال و دولت
حکومت، مسکن وطن سب چیزوں کی محبت سے اور خود اپنی جان کی محبت سے زیادہ ضروری و لازم ہے۔ اگر ماں، باپ یا
رشتہ دار اللہ و رسول کے ساتھ رابطہ عقیدت و محبت نہ رکھتے ہوں تو ان سے دوستی و محبت جائز نہیں۔

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيْمَانِ

باب حلاوتِ ایمان کے بیان میں

۱۵۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَّكْرَهَ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین چیزیں جس میں
ایمان کی لذت اور شیرینی کو پا لیتا ہے ۱۔ جس کو
رسول سارے عالم سے پیارے ہوں ۲۔ اور جو
کو خاص اللہ کے لیے محبوب رکھتا ہو ۳۔ جو اسلا
کرنے کے بعد اس سے پھرنے کو ایسا بُرا جانے جیسے
آگ میں ڈالے جانے کو بُرا جانتا ہے۔

اللہ و رسول سارے عالم سے پیارے ہونے چاہئیں

اس حدیث کو امام مسلم و ترمذی و نسائی نے بھی ر
ہے ۲۔ حلاوۃ مصدر ہے اس کے معنی شیر
ہیں۔ یہ (مُرا) کڑوے کی ضد ہے۔ حلاوۃ الایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ایمان کی ایسی لذت حاصل ہو جائے
خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ غالب ہو کہ خدا و رسول کی اطاعت میں لذت محسوس
یکرہ جیسے کہتے ہیں کرھت الشي۔ میں نے فلاں چیز کو بُرا جانا یعنی اس سے میں راضی نہیں۔ یُقْذَفَ
سے مشتق ہے اس کے معنی پھینکنے کے ہیں۔ خاذف اور قاذف دونوں کے معنی پھینکنے والے کے ہیں۔ لیکن اگر پتھ
جائے تو قذف بولیں گے اور اگر کنکریاں پھینکی جائیں تو خذف بولیں گے۔

۵۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ یہ حدیث اصولِ اسلام سے ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالےٰ کی محبت
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بیان ہے۔ جو اصل ایمان بلکہ عین ایمان ہے اور اللہ و رسول سے محبت اور
اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ انشراحِ صدر ہو جائے اور ایمان خون اور گوشت میں رس بس جائے تو وہ شخص
حلاوت کو پا لیتا ہے اور کسی سے اللہ تعالےٰ کے لیے محبت رکھنا (اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ) یہ اللہ سے محبت کرنے کا
نتیجہ ہوتا ہے۔

۶۔ شارحین کرام نے محبت اللہ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسکے احکام کی اطاعت اور اسکے منہیات سے پرہیز کیا جائے
نے اس کو یوں ادا کیا کہ محبت اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دل ان کو پسند کرے جو اللہ کو پسند نہیں

یز کیا جائے۔ بعض نے اسی کو یوں ادا کیا۔ محبۃ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ تعالےٰ کو پسند ہے دل ان کو پسند کرے۔ شر کو ناپسند ہیں دل ان کو ناپسند کرے۔ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا محبۃ اللہ کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ طاعت میں استقامت اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام ہو۔ محبت میلانِ قلب کا نام ہے۔ حسن، اخلاق، سان پہ محبت کرنے کا سبب بنتے ہیں اور یہ تمام امور حضور علیہ السلام میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام محسن عالم ظاہری و باطنی حسن کے مجسمہ ہیں۔ اخلاقِ عالیہ اور محاسن غیر متناہیہ کے پیکر ہیں۔

۷۔ ان یحب المرء میں الحب فی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھائی بھائی قرار دیا ۔ فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ لہذا حلاوتِ ایمان کا درجہ اسی مسلمان کو حاصل ہوگا جو دوسرے مسلمان محض اللہ تعالےٰ کے لیے محبت کرے اور اس میں کسی دنیاوی غرض کو دخل نہ ہو۔ و ان یکرہ یعنی جس کے دل میں ایمان جائے اور اسلام کے محاسن اور کفر کے خباثت سے اچھی طرح واقف ہو جائے تو پھر اس کو کفر دوبارہ اختیار کرنا ایسے ہی مکروہ ندیدہ ہوگا جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

۸۔ اس حدیث میں ایمان کو شہد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مشبہ ایمان ہے مشبہ بہ عسل ہے۔ وجہ شبہ دونوں میں لذت ہے۔ تعارہ بالکنایہ ہوا۔ پھر مشبہ بہ کو ذکر کیا اور خواص ولوازم مشبہ بہ کی طرف اس کی اضافت کر دی۔ یہ استعارہ تخییلیہ ہوا۔ گویا جیسے کے ذائقے سے جو واقف ہو جاتا ہے تو شہد جیسی مٹھاس اور ذائقہ اور مزہ کسی دوسری چیز میں نہیں پاتا۔ اسی طرح جو مسلمان ن کی حلاوت پالیتا ہے تو اس پر چند اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن میں سے تین اس حدیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ تعالےٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم سے زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ الحب فی اللہ اس شخص کی طبیعت ن جاتی ہے اور اسلام سے بغاوت اس کے لیے ایسے ہی دشوار ہوتی ہے جیسے آگ میں اپنے جسم کو ڈالنا۔

۹۔ امام مسلم نے حدیث کے اس ٹکڑے ان یقذف فی النار سے اس مومن کی فضیلت کا استدلال کیا ہے۔ جسے کلمۂ کفر پر مجبور کیا جائے اور وہ تقیہ نہ کرے بلکہ جان دیدے۔ نوٹ۔ حدیث نمبر ۲۰ کا بھی یہی مضمون ہے۔

باب علامۃ الایمان حب الانصار

باب ایمان کی علامت انصار سے محبت ہے

۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
آيَةُ الْإِيْمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ وَ
النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انصار سے محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے۔

د و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے فضائل الانصار میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ آیت کے معنی علامت کے ہیں ۔ ۳۔ انصار ناصر کی جمع ہے۔ انصار کو انصار لیے کہتے ہیں کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی اور آپ کا ساتھ دیا تھا اور اسلام کی سربلندی کے لیے نہایت ایثار سے کام لیا تھا۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالےٰ نے ان افراد کو ناصر اور مومن فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ نفاق کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے اسلا
اظہار کرنا اور دل میں کفر چھپانا ۳۔ اس حدیث میں انصار کے ساتھ محبت رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یوں تو ہر مومن سے محبت رکھ
ضروری ہے۔ مگر انصار کی اسلامی خدمات اور دوسری خصوصیات کی وجہ سے ان سے محبت رکھنے کو خاص طور پر بیان کیا گیا
کے ساتھ انصار سے محبت رکھنے کی تاکید فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی
ہوں گے جو مہاجرو انصار و صحابہ کرام کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے۔ اسی لیے دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا
اصحاب کے حق میں اللہ سے ڈرو جس نے ان کو محبوب رکھا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھ
نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے بیشک خدا کو ایذا دی اور جس نے خدا کو ایذا دی تو خدا اس
باز پرس فرمائیگا (ترمذی)۔ ۴۔ اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں۔ جن سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام انص
مہاجرین سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم و توقیر کرنا ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے بلا واسط
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل کیا اور آپ پر جان و مال قربان کیا اور دین اسلام کو اپنے خون سے سینچا اور اسلام کے لیے
بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ افراد ساری قوم مسلم کے محسن اور مخدوم ہیں اور ان سے محبت رکھنا یقیناً اسلام ہے اور ان سے بغض
عداوت منافقت ہے ۵۔ حدیث ہذا میں ایۃ الایمان مبتدا ہے اور حب الانصار اس کی خبر ہے اور جب مبتدا اور خ
دونوں معرفہ ہوں تو حصر کا فائدہ دیتے ہیں تو اگر حصر حقیقی مراد لیا جائے جیسا کہ حدیث کا اقتضا بھی ہے تو اس کا صاف و صر
یہی ہوگا کہ انصار و مہاجرین و صحابہ کرام سے محبت رکھنا اس لحاظ سے کہ وہ صحابی رسول اللہ ہیں یا انصار رسول اللہ ہیں ایمان
ان حضرات سے اس لحاظ سے بغض و عداوت رکھنا کہ یہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یقیناً نفاق ہے کیونکہ حضور اکرم
علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کے ساتھ بغض صحابہ کرام کا جمع ہونا ناممکن ہے۔

بَابٌ اِنَّ عِبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ وَكَانَ شَهِدَ

باب حضرت عبادہ بن صامت جو بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے

بَدْرًا وَّاَحَدَ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ
۱۷۔ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ
بَايِعُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا
وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ
وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ
وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى
مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ
ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ

اور لیلۃ العقبہ میں نقیب بنائے گئے تھے
روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
آپ کے ارد گرد صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ مجھ
بیعت کرو (ان امور پر) کہ ۱۔ اللہ کے ساتھ کسی ک
نہ بناؤ گے ۲۔ چوری نہیں کرو گے ۳۔ زنا نہیں ک
۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے ۵۔ کسی پر بہتان
باندھو گے جس کو تم ہاتھ اور پاؤں کے درمیان سے
ہو ۶۔ معروف میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پس جس نے
عہد و پیمان کو پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو

كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَآءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ

(بخاری)

گناہوں میں سے کچھ کر بیٹھے اور اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائے تو یہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کے گناہوں کو چھپائے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے چاہے تو اس کو معاف فرما دے یا محاسبہ فرمائے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے پانچ جگہ بخاری میں ذکر کیا ہے۔ مغازی، وفود الانصار، حدود اور احکام میں نیز مسلم نسائی و ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

شھد۔ حضر کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے قرآنِ حکیم میں حضور اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شاہد قرار دیا گیا ہے جس کے معنی حاضر کے ہیں۔ اصل الشہود الحضور (عینی جلد ۱ صفحہ ۱۵۱) یہ باب علم یعلم سے ہے جیسے بولتے ہیں قوم شھود ای حضور شہود مصدر ہے اور شہادت کے معنی یقینی خبر کے ہیں جیسے بولتے ہیں شھد الرجل علیٰ کذا یہاں شھد بدرا کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عبادہ بن صامت بدر کی لڑائی میں حاضر تھے ۳۔ بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا۔ یہ مدینہ منورہ سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بدر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بدر ایک شخص کا نام تھا جس نے کنواں کھدوایا۔ اسی کے نام سے اس کا نام بدر ہو گیا۔ ۴۔ احد النقباء یعنی حضرت عبادہ بن صامت بارہ نقیبوں میں سے ایک ہیں۔ نقیب قوم کے سردار اور منتظم یا قوم کے ذمہ دار کو کہتے ہیں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے موسم میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ رجب ۱۱ھ میں آپ نے عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد عقبہ ہے۔ خزرج کے چند اشخاص کو دعوت اسلام دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے یہود سے سن رکھا تھا کہ ایک نبی پیدا ہونے والے ہیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا یہ وہی نبی ہیں اور یہ بھی کہا کہ دیکھو یہود ہم سے اسلام لانے میں سبقت نہ لے جائیں۔ یہ کہہ کر ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ اشخاص تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ ابو الہیثم بن تیہان ۲۔ اسعد بن زرارہ جنہوں نے ۱ھ میں وفات پائی ۳۔ عوف بن حارث ۴۔ رافع بن مالک بن حارث جنگ احد میں شہید ہوئے ۵۔ قطبہ بن عامر یہ یمامہ میں شہید ہوئے ۶۔ جابر بن عبد اللہ۔ اسلام لانے کے بعد یہ لوگ اپنے گھروں میں چلے گئے اور انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ دوسرے سال موسم حج میں بارہ اشخاص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی۔ اور اس کے ساتھ یہ خواہش کی کہ احکام اسلام سکھانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ پھر اگلے سال ۷۰ یا ۷۲ شخص حج کے زمانہ میں آئے اور انہوں نے مقام منیٰ عقبہ حضور علیہ السلام کے دستِ اقدس پر بیعت کی اور آپ نے اس گروہ میں سے ۱۲ شخص نقیب منتخب فرمائے ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے۔ انہیں میں ایک نقیب حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالےٰ عنہ تھے اور یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت بیعتِ رضوان میں بھی شریک تھے جو ہجرت کے بعد ہوئی۔ جب کہ حضور علیہ السلام عمرہ کے لیے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ حضور علیہ السلام نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی تھی ان کا ذکر اس حدیث میں ہے۔

---

[1] بیعت عقبہ ۱۱، ۱۲ نبوت

۷۔ عصابہ کے معنیٰ جماعت کے ہیں (ع کے زیر کے ساتھ) اس کا اطلاق دس افراد سے لے کر چالیس افراد ہوتا ہے۔ عصابہ اس پٹی کو بھی کہتے ہیں جو ماتھے پر باندھی جاتی ہے۔ اس کے معنیٰ احاطہ کرنے کے بھی ہیں ۸۔ مبایع مبایعت کے معنیٰ خرید و فروخت کے ہیں۔ مبایعۃ علی الاسلام کا مطلب عہد و پیمان ہے۔ اس عہد و پیمان کو جو حضو نے صحابہ کرام سے لیا۔ بیع سے تشبیہ دی گئی۔ کیونکہ ہر ایک نے جو اس کے پاس تھا اس کو بیچا۔ صحابہ کرام نے عہد کیا کہ ہم احکا کی اطاعت کریں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے عوض ان سے ثواب کا وعدہ فرمایا۔ ۹۔ بہتان ۔ اس جھوٹ کہتے ہیں جس کو سن کر انسان حیران ہوجائے۔ کسائی نے کہا۔ بہتان کے معنیٰ جھوٹ کے ہیں۔ بہتان کے اصل معنی حیرانی بہتان کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی شخص کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس میں نہیں ہے۔ خطابی نے کہا کہ یہاں بہتان کے پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگانے کے ہیں ۱۰۔ عصیان یہ ضد ہے اطاعت کی ۱۱۔ معروف ۔ ہر نیک کام کو کہتے علامہ بیضاوی نے فرمایا۔ معروف اس کام کو کہتے ہیں جس کو شارع علیہ السلام نے نیک قرار دیا ہو۔ معروف اللہ تعالے احکام کو بھی کہتے ہیں۔ معروف کے عمومی معنیٰ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے ہیں۔

مسائلِ حدیث

اس سے پہلی حدیث میں انصار سے محبت رکھنے کا بیان تھا اور یہ کہ انصار کو یہ فضیلت اسلیے ہوئی کہ انھوں نے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اور آپ کی جان و مال مدد کی۔ جب کہ ساری دنیا آپ کے خلاف تھی۔ اس میں انصار کی وجہ تسمیہ کا بیان ہے کہ پہلے اس قوم کو بنی قیلہ کہتے جب ان کے سرداروں نے اسلام قبول کیا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی تو ان کا لقب ہوگیا یعنی دین کے مددگار۔

انصار نے جن امور پر بیعت کی وہ یہ ہیں۔

۱۔ شرک نہیں کریں گے ۲۔ زنا کے قریب نہ جائیں گے ۳۔ چوری نہیں کریں گے ۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے تو مسلمان کو ناحق قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے مگر قتلِ اولاد کی قید اس لیے ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی اولاد کو مفلس کے خوف سے قتل کردیا کرتے تھے یا یہ کہ اولاد کو قتل کردینا بہ نسبت دوسروں کے اشد کبیرہ ہے کیونکہ اس میں قطیعۃ رحم بھی ۵۔ بہتان نہیں باندھیں گے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی۔ وہ ان میں سے کسی ایک کی بچہ کو منسوب کردیا کرتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف منسوب کردیا کرتی تھی۔ عام مردوں کی یہ حالت تھی کہ پاک عورتوں پر زنا کی تہمت لگایا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان لوگوں کو بیعت فرمایا تو ان لوگوں سے کہ آئندہ کسی پر افتراء و بہتان نہیں باندھیں گے۔ حدیث ہٰذا میں بہتان کی نسبت ہاتھ اور پاؤں کی طرف کی گئی ہے کے لفظ یہ ہیں ـــــ "بہتان نہ باندھیں گے۔ جن کو ہاتھ اور پاؤں کے درمیان سے افترا کرتے ہیں"۔ شراح احا نے اس کے متعدد معنیٰ کئے ہیں۔ بعض نے کہا۔ "ہاتھ اور پاؤں" کنایہ ہے نفس سے اور عبارت یہ ہوگی۔ لا تات ببہتان من قبل انفسہم یعنی اپنی ذات سے اور دل سے کسی پر بہتان نہ باندھیں گے کیونکہ دل ہاتھ کے درمیان ہوتا ہے۔ محمد بن جمرہ نے فرمایا کہ بین ایدیکم کے معنیٰ یہ ہیں کہ فی الحال کسی پر بہتان نہ باندھیں گے اور

ے معنی یہ ہیں کہ زمانہ آئندہ میں کسی پر بہتان نہ باندھیں گے۔

۔ ولا تعصوا فی معروف اور اچھی بات میں نافرمانی نہیں کریں گے۔ اچھی بات کی قید صرف ان کے نفوس جب کے لیے ہے ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معروف ہی کا حکم فرماتے ہیں۔

اصی کو سزا دینا اور مطیع کو ثواب عطا فرمانا اللہ پر واجب نہیں ہے

واضح ہو کہ اللہ رب العزت جل مجدہٗ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے مطیع خشنا اور عاصی کو سزا دینا یہ بھی اللہ پر واجب نہیں ہے وہ فعال لما یرید ہے۔ چنانچہ حدیث ہذا کے اس ٹکڑے سے س نے گناہ کیا تو اگر خدا چاہے تو اس کو بخش دے اور چاہے تو سزا دیدے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت ل مجدہٗ پر عاصی کو سزا دینا واجب نہیں ہے۔ جب عاصی کو سزا دینا اس پر واجب نہیں ہے تو مطیع کو ثواب عطا فرمانا ی اس پر واجب نہیں ہے۔ لہذا مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ رب العزت جل مجدہٗ مطیع کو جو ثواب عطا ائے گا وہ محض اس کا فضل وکرم ہوگا یعنی ؎

اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا   سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

۲- فھو الی اللہ یعنی مومن کو ثواب عطا فرمانا اور عاصی کو عذاب دینا خدا کے قبضہ میں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا ل کبائر سے جو شخص بغیر توبہ کیے مرگیا تو اللہ تعالے چاہے تو اول مرتبہ ہی اس کو جنت میں داخل فرمادے اور اگر چاہے سزا دینے کے بعد جنت میں داخل فرمائے۔ یہی عقیدہ اہل سنت وجماعت کا ہے کہ اجر وعتاب مفوض الی اللہ ے۔ اسی حدیث سے معتزلہ اور خوارج کے خیال کی تردید کی گئی ہے۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اگر بغیر توبہ کیے مر یا تو اللہ تعالے پر اس کو عذاب دینا واجب ہے اور اگر توبہ کرکے مرا ہے تو اللہ تعالے پر اس کو معاف کر دینا واجب ہے۔ ی طرح اس حدیث سے خوارج کے اس خیال کی بھی تردید ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے۔ کیونکہ اگر مرتکب بیرہ کافر ہوجاتا تو اس کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳- نیز فھو الی اللہ یعنی گنہ گار کا معاملہ اللہ تعالے کے سپرد ہے چاہے بخشے اور چاہے تو سزا دے۔ اس میں بہ کرکے مرنے والے اور بغیر توبہ کیے مرنے والے دونوں شامل ہیں۔ نیز اسی جملہ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی جہنمی یا جنتی ہونے کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بخشنا یا سزا دینا یہ اللہ تعالے کی مشیت پر موقوف ہے۔ البتہ جن ن افراد کے جہنمی یا جنتی ہونے پر نص وارد ہوچکی ہے ان کے جہنمی یا جنتی ہونے کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔

اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ حدیث ہذا میں عموم ہے۔ لفظ حدیث یہ ہیں۔ من اصاب من ذالک شیئًا۔ س میں شرک، زنا، قتل، بہتان وغیرہ تمام گناہ داخل ہیں۔ تو اب عموم حدیث کا منشا یہ ہوگا کہ اگر کوئی شرک کرکے مرتد گیا اور اس کو حدًا قتل کر دیا گیا تو یہ قتل اس کے لیے کفارہ ہوجائے گا۔ حالانکہ یہ بات قرآن مجید کی اس آیت کے ف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالے مشرک کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔ لہذا حدیث ہذا کا عموم آیت ان اللہ یغفر ان یشرک بہ سے مخصوص ہے اور معنی حدیث یہ ہے کہ جس نے شرک کے علاوہ کوئی گناہ کیا اور اس پر قائم

ہوگئی تو یہ کفارہ ہوگا۔

۳۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ذٰلک کا لفظ اشارہ ہے۔ غیر شرک کی طرف اور لفظ ستر اس
ہے۔ کیونکہ ستر اس چیز کا ہوتا ہے جس کا اظہار اور اخفا ہو سکے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کفر و شرک امور باطنہ سے ہیں کیونکہ
تصدیق قلبی کا نام ہے لہٰذا اس تقدیر پر حدیث میں خصوص کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

۴۔ علامہ طیبی نے فرمایا کہ شرک سے مراد ہی یہاں شرک خفی، ریا، سمعہ وغیرہ ہے مگر ان کا ایسا فرمانا کئی وجہ سے
اول اس لیے کہ جب مطلقاً شرک کا لفظ بولا جائے تو اس سے توحید کا مقابل ہی مراد ہوتا ہے یعنی شرک جلی۔ دوم
کہ جس زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی۔ یہ اوائل بعثت کا زمانہ تھا اور اس دور میں کثرت سے
ہوتی تھی۔ ان دو قرینوں کے ہوتے ہوئے شرک خفی مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ سوم، یہ کہ فعوقب لفظ بھی اس
کرتا ہے کیونکہ ریا سمعہ جو شرک خفی ہے اس پر کوئی حد نہیں ہے۔ فافہم

کیا حُدودِ شرعیہ گناہ کا کفارہ ہیں

حدود و کفارات گناہ کا کفارہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم کا مسلک یہ ہے کہ حدود شرعیہ
کفارہ ہیں یعنی جس پر حد قائم ہو گئی اس کا گناہ معاف ہو گیا یہ حضرات اپنے مسلک پر حدیث ہٰذا کے اس جملے
پڑھتے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ

جس سے کوئی گناہ ہوا پھر دنیا میں اس کو سزا دی گ
پر حد قائم کر دی گئی تو یہ حد آخرت کے گناہ کا کفارہ

چنانچہ اس مسلک کی تائید میں وہ اور بھی حدیثیں پیش کرتے ہیں جو متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ حضرت
تعالےٰ وجہہ الکریم سے ترمذی و حاکم نے، ابو تمیم یمنی سے طبرانی نے (باسناد حسن) اور حضرت خزیمہ بن ثابت نے امام
(باسنادِ حسن) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے طبرانی نے مرفوعاً اس مضمون کی حدیث روایت کی:۔

مَنْ اَصَابَ ذَنْبًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَاللّٰهُ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يُّثَنِّيَ بِالْعُقُوْبَةِ عَلٰى عَبْدِهٖ فِي الْاٰخِرَةِ (عینی جلد ۱ صـ۱۶۸)

جس نے کوئی گناہ کیا پھر دنیا میں اس کی پاد
حد لگائی گئی تو اللہ تعالےٰ سے یہ امید نہیں
کہ وہ اپنے بندہ کو آخرت میں دوبارہ سزا د

لیکن احناف کا مسلک یہ ہے کہ حدود و کفارات امن عالم کے قیام کے لیے ہیں۔ حد سے اُخروی سزا کی مع
ہو سکتی تاوقتیکہ مجرم اسی دنیا میں توبہ نہ کرے۔ احناف اپنے مسلک پر حدیث ابو ہریرہ سے استدلال کرتے ہیں
حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

لَا اَدْرِي الْحُدُوْدُ كَفَّارَةٌ لِاَهْلِهَا اَمْ لَا

میں اٹکل سے نہیں کہتا کہ حدود اس کے اہل
کفارہ ہوتے ہیں یا نہیں۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ بلاشبہ صحیح ہے اور شرط شیخین پر ہے اس

یت معمر ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی ہریرۃ روایت کیا ہے اور امام احمد نے عبد الرزاق سے انہوں نے ے روایت کیا ہے۔ لہذا احناف حدیث ابی ہریرہ سے حجت پکڑتے ہوئے اس معاملہ میں توقف فرماتے ہیں۔

ں یہ امر قابلِ ذکر ہے

کہ جو اہلِ علم حدیث عبادہ بن صامت سے استدلال کرتے ہوئے اس امر کے قائل ہیں کہ حدود وکفارہ ہیں وہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ کو بھی صحیح مانتے ہیں اور دونوں یں تطبیق یہ دیتے ہیں کہ حدیث ابوہریرہ سابق ہے یعنی یہ بات کہ حد کے قائم ہوجانے سے گناہ معاف ہوجاتا ہے ں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا تھا جب کہ اس کے متعلق اللہ عزوجل کی طرف سے کوئی ہدایت نہ آئی یکن جب اللہ تعالے نے آپ کو مطلع فرمادیا تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ حد کے قائم ہوجانے سے آخرت کا گناہ ت ہوجاتا ہے جس کا بیان حدیث عبادہ میں ہے۔ ان کی اس تقریر پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث ابوہریرہ سابق ہو سکتی کیونکہ حدیثِ عبادہ اس وقت کی ہے جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو مکہ معظمہ میں بیعت فرمایا یہ بیعت اولیٰ کہلاتی ہے اور حضرت ابوہریرہ اس بیعت کے سات سال بعد عام خیبر میں ایمان لائے تھے لہذا یث ابوہریرہ سابق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابوہریرہ عام خیبر میں بیعت ے سات سال بعد ایمان لائے مگر پھر بھی تو ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے خود حضور علیہ السلام سے حدیث نہ سنی ہو بلکہ ر صحابی سے سن کر بیان کی ہو۔ جس نے قدیم سے حضور علیہ السلام سے یہ حدیث سن رکھی ہوگی۔ حافظ ابن حجر نے جواب بھی تو ممکن ہے کہ حدیث عبادہ میں وہ بیعت مراد نہ ہو جو لیلۃ العقبہ میں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے بعد بھی کئی بیعتیں جن میں حضرت عبادہ شریک ہوئے تھے ان میں سے کوئی بیعت مراد ہو۔ لیکن میری گزارش یہ ہے کہ اس تمام گفتگو یاد محض امکان پر ہے یعنی یہ حضرات یہی تو کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس بیعت سے بیعت لیلۃ العقبہ مراد نہ ہو۔ ممکن ہے ت ابوہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ نے خود حضور علیہ السلام سے حدیث نہ سنی ہو اور اس امکان پر ان کے پاس کوئی دلیل یں ہے۔ لہذا صحیح یہ ہے کہ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابق ہی ہے اور حدیث عبادہ بن صامت سے یہ ت ہی نہیں ہوتا کہ حدود سے آخرت کا گناہ معاف ہوجاتا ہے کیونکہ بیعت لیلۃ العقبہ کے زمانہ میں حدود وقصاص کے ہیں نازل ہوئے تھے اس لیے عقوبت سے حد مراد ہی نہیں ہے۔

اس کے برعکس حدیث ابوہریرہ میں حدود کا لفظ موجود ہے۔ لہذا حدیث ہذا میں فعوقب کے لفظ سے عقوبات قدرۃ صائب والآلام مراد ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو جو رنج وغم پہنچتا ہے حتیٰ کہ جو کانٹا اس کو چبھتا ہے اللہ ے اس کو بھی اس کے گناہوں کا کفارہ بنادیتا ہے۔ لہذا جب عقوبت سے مصائب وآلام مراد ہوئے تو اب مسلک امام ظم ہی ثابت رہا ۲۔ نیز طحاوی میں حدیث موجود ہے کہ دربار نبوی میں ایک چور پکڑ کر لایا گیا۔ آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ ے بعد وہ پھر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اپنے گناہوں سے توبہ کر لی۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اگر حد کے جاری ہونے ں گناہ معاف ہوجاتا ہے تو پھر حضور علیہ السلام حد جاری فرمانے کے بعد توبہ کراتے ۳۔ اب رہی وہ حدیث جس میں یہ ہے ے کہ کوئی گناہ ہوا اور اس پر حد قائم ہوگئی تو اللہ بہت عادل ہے کہ اس کو دوبارہ آخرت میں سزا دے۔ یہ حدیث ترمذی کی

ہے اور اس کے اصل لفظ یہ ہیں ۔ فاللّٰہُ اعدل من ان یثنّیٰ علی عبدہ العقوبۃ فی الاخرۃ ۔
ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا قطعی حکم لگانا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالے جو عادلِ
رحمٰن ورحیم ہے اس کی بارگاہ سے اس امید کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ اپنے فضل سے اس شخص سے آخرت میں دوبارہ مواخذ
جس پر دنیا میں حدِ شرعی قائم ہو چکی ہے ۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ قطعی طور پر ثابت نہیں ہوا کہ جس پر حدِ شرعی لگ گئی
گناہ بھی معاف ہو گیا ۔

ضروری نوٹ :۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں تقویٰ و خوف و خشیت کا یہ عالم
ان سے باقتضائے بشریت کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو فوراً نادم ہوتے ۔ حتیٰ کہ بحضورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آکر عرض کرتے کہ
ہو گیا ہے پاک کر دیجئے (حد لگا دیجئے) ظاہر ہے کہ جن کی خشیت کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی ذات کو خود سزا کے لیے پیش
کئے پر منفعل ہوں تو ان کا نادم ہونا اور خود حاضر ہو کر جرم کا اقرار کرنا ہی توبہ ہے ۔ چنانچہ حضرت ماعز اسلمی نے خود حاضر
جرم کیا اور ان پر حد لگی ۔ اسی طرح ایک خاتون نے اعترافِ جرم کیا ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تو حاملہ ہے ۔ وضع
بعد آنا ۔ وہ وضعِ حمل کے بعد پھر آئیں تو فرمایا ابھی بچہ کے دودھ پینے کا زمانہ ہے جب وہ ختم ہو جائے تو پھر آنا ۔
خاتون مدتِ رضاعت پورا کرنے کے بعد پھر آئیں اور بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا ۔ جس سے انھوں نے
اظہار کیا کہ اب بچہ میرے دودھ کا محتاج نہیں ہے ۔ حضور علیہ السلام نے حد لگانے کا حکم دیا اور اس خاتون رضی اللہ
کے متعلق فرمایا :۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَۃً
لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَکْسٍ لَغُفِرَ لَہٗ

مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں
جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ناجائز
لینے والا بھی اگر توبہ کرے تو بخشا جائے ۔

اور حضرت ماعز رضی اللہ تعالے کے متعلق فرمایا ۔

اِسْتَغْفِرُوْا لِمَاعِزِ بْنِ مَالِکٍ لَقَدْ تَابَ تَوْبَۃً
لَوْ قُسِمَتْ بَیْنَ اُمَّۃٍ لَوَسِعَتْھُمْ
(مشکوٰۃ شریف کتاب الحدود)

ماعز بن مالک کے لیے مغفرت چاہو ۔ اس
کی ہے کہ اگر پوری اُمّت میں تقسیم کی جائے تو

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدِ شرعی ان کے گناہ کا کفارہ ہو گئی بلکہ
تو ان کے منفعل ہونے سے ہوئی ہے ۔ فافہم

۲۔ حضرت ملا علی قاری نے عقوبت کی ایک اور تفسیر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ
کوئی جرم کیا اور اللہ تعالے نے دنیا میں اس کو سزا دیدی تو اس جرم کی سزا آخرت میں اس کو نہیں دی جائیگی ۔
کرنے کی سزا اس کو ضرور ملے گی کیونکہ ترکِ توبہ ایک علیحدہ جرم ہے ۔ قرآن پاک میں ہے ۔ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ
ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مرقات ج ۱ ص [illegible]) (واللہ اعلم)

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں حضرت عبادہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ حسین و جمیل، قدآور، نہایت مضبوط بدن کے صحابی تھے۔ عقبہ اولیٰ و ثانیہ، بدر و بیعت الرضوان اور تمام مشاہد میں شریک ہوئے۔ سب سے پہلے فلسطین کے حاکم یہی بنائے گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا قاضی بھی بنایا تھا۔ یہ حمص میں مقیم ہو گئے پھر فلسطین میں آ گئے اور وہیں ۳۴ھ میں انتقال فرمایا بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ عبادہ بن صامت نامی صرف ایک ہی صحابی ہیں لیکن صرف عبادہ نامی بارہ صحابی ہو گئے ۔ حضرت عبادہ بن صامت سے ۱۸۱ احادیث مروی ہیں جن میں سے صرف ۶ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے او کو صرف مسلم نے اور دو ہی کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا۔

بَابٌ مِّنَ الدِّيْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

باب فتنوں سے بچنا بھی دینداری ہے

۱۸- عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهٗ قَالَ
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وْشِكُ اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ
نَمٌ يَّتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ
طْرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ (بخاری شریف)

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئیگا کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں قرار پائیں گی۔ جن کو ساتھ لے کر اپنے دین کو فتنے سے بچانے کے لیے وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات پر چلا جائیگا۔

ائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے ان ابواب میں ذکر کیا ہے۔ فتن، رقاق، علاماتِ نبوت اور ابوداؤد، نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ یوشک کے معنیٰ قریب کے ہیں۔ وشک کے معنیٰ رعت کے بھی آتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ اوشک فلان ای اسرع۔ غنم۔ اسم مونث ہے۔ جنس کے لیے مرضوع ۔ نر و مادہ دونوں کے لیے غنم کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یتبع باب افتعال سے یا فتح یفتح سے ہے۔ اس کے معنےٰ پیچھے چلنے ے ہیں شعف۔ شعاف، پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ فتن فتنہ کی جمع ہے۔ عام طور پر فتنہ کا لفظ مکروہ چیزوں کے لیے ستعمال کرتے ہیں۔ فتنہ کا لفظ مندرجہ ذیل امور کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کفر کے لیے جیسے اس آیت میں والفتنة من القتل۔ گناہ کے معنیٰ میں جیسے اس آیت میں الا فی الفتنة سقطوا جلانے کے معنیٰ میں ان الذین تنوا المؤمنین اس آیت میں فتنہ کا لفظ جلانے کے معنیٰ میں آیا۔ پھیرنے کے معنیٰ میں جیسے اس آیت میں وان و لیفتنونک۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ جب ایسا زمانہ آ جائے کہ دین و ایمان خطرہ میں پڑ جائے تو پھر گوشہ نشین ہو کر ے ایمان کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بکری کو خیر مال اس لیے قرار دیا کہ یہ ایسا مال ہے جو بابرکت ہے اور حلال روزی س میں حرام کو دخل نہیں ہے۔ گوشہ نشینی کے لیے پہاڑ کی چوٹی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایسے مقامات فتنہ و فساد سے ں ہوتے ہیں اور وہاں رہ کر آدمی فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

سائل حدیث

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔ جب فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو۔ حق کا

کہنا اور حق پر چلنا مشکل ہو جائے تو ایسے وقت میں صرف اپنے دین و ایمان کی سلامتی کے لیے گوشہ نشین ہو جانا
لیکن جو شخص فتنہ کے مٹانے پر قادر ہو اس کو گوشہ نشینی جائز نہیں ہے۔ اس پر تو واجب ہے کہ حق پر ر
لوگوں کو چلائے۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب فتنہ نہ ہو تو ایسی صورت میں گوشہ نشین ہونا جائز ہے یا نہیں
شافعی فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں گوشہ نشین نہیں ہونا چاہیے کیونکہ گوشہ نشینی کی صورت میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ ب
رہے گا اور اس کے وجود سے حق کی جو اشاعت ہوتی تھی اور خود اس کو جمعہ و جماعات میں شرکت نصیب ہوتی تھی و
جائے گی۔ حضرت امام غزالی نے عزلت اور صحبت دونوں کے فوائد و نقصان پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے اور اہل علم
باب میں مختلف رائیں ہیں۔ بہرحال حدیث ہذا سے اتنی بات ہی ثابت ہوتی ہے کہ فتنہ و فساد عام ہو جائے اور دی
رہنا مشکل ہو جائے تو ایسے نازک وقت میں گوشہ نشین ہو جانا بہتر ہے تاکہ انسان اپنے دین کو سلامت رکھ سکے۔ اس
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کی خبر دی ہے۔ جو آپ کا معجزہ ہے یعنی ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ مومن کو دین کی حفا
لیے پہاڑوں کی چوٹی پر پناہ گزین ہونا پڑے گا۔

ابوسعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ آپ جلیل القدر صحابی ہیں۔ تیرہ غزوات میں حضور علیہ السلام کے ہمر
ایک جماعت صحابہ سے یہ روایت کرتے ہیں۔ جن میں خلفائے اربع
کے والد مالک بھی شامل ہیں۔ صحابہ کرام حضرت عمرو ابن عباس اور کثیر تابعین کرام نے ان سے روایت کی ہے۔ آپ
ہیں سنہ ۶۴ھ یا سنہ ۷۴ھ میں وفات پائی۔ آپ نے ۱۱۷۰ حدیثیں روایت کی ہیں جن میں سے ۴۶ حدیثوں پر بخاری ومسل
کیا اور ۱۶ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۵۲ حدیثیں صرف مسلم نے ذکر کیں۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جانتا ہوں

وَاَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ
(بخاری)

اور معرفت دل کا فعل ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ
اسی پر مواخذہ فرمائے گا جو تمہارے دلوں نے کما
چیز کا تمہارے دل نے اعتقاد کیا۔

۱۔ فرقہ کرامیہ کا خیال ہے کہ ایمان مجرد اقرار کو کہتے ہیں۔ لہٰذا منافق ظاہر میں مومن ہے اور باطن میں
یہ کہ دنیا میں منافق پر مسلمانوں کے احکام جاری کیے جائیں گے۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے ان المعرفۃ فع
کا عنوان قائم کر کے کرامیہ کے اس خیال کی تردید کی ہے اور آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کسب
عزم و ارادہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسی پر مواخذہ فرماتا ہے جس کو آدمی دل سے قبول کر لے۔ لہٰذا مومن ہونے کے لیے
کہ ضروریات دین کو دل سے قبول کیا جائے۔ محض زبان سے اقرار کافی نہیں۔

وسوسے منافی ایمان نہیں ۲۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور اسی آیت
کے منافی ایمان نہ ہونے کی دلیل بھی ملتی ہے۔ آدمی کا دل افکار و خیالات کو

ہے۔ ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر دل میں طرح طرح کے خیالات آیا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسے خیالات وخطرات بھی آدمی کے دل ودماغ کو پریشان کرتے ہیں جو شرعی نقطہ نظر سے کافرانہ وملحدانہ ہوتے ہیں۔ ایسے خیالات وخطرات کے متعلق حکم یہ ہے کہ جب تک یہ خیالات وسوسہ کی حد تک رہیں۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان پر مواخذہ ومحاسبہ نہیں ہوتا لیکن جب یہی خیالات وخطرات وسوسہ کی حد سے بڑھ کر اس شخص کا قول وعمل اور عقیدہ بن جائیں تو پھر ان پر مواخذہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری، ابوداؤد ومسلم کی مندرجہ ذیل احادیث کو پیشِ نظر رکھ لیجئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ (رواه البخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے دل کے بُرے خیالات اور وسوسوں کو معاف کر دیا ہے۔ ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جب تک ان پر عمل نہ ہو اور زبان سے نہ کہا جائے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِیْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ؟ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ! قَالَ ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے بُرے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے کہنا بھی بہت بُرا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا واقعی تمہاری یہ حالت ہے؟ انھوں نے عرض کیا۔ ہاں یہی حال ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تو خالص ایمان ہے۔

یعنی اگر کسی شخص کی یہ کیفیت ہو کہ وہ دین اور شریعت کے خلاف وساوس سے اتنا گھبرائے اور ایسا پریشان ہو کہ زبان سے ادا کرنا بھی اس کو گراں ہو تو یہ خالص ایمانی کیفیت ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّیْ اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْءِ لَاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَى الْوَسْوَسَةِ (رواه ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ کبھی کبھی میرے دل میں ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کو زبان سے نکالوں؛ اس پر آپ نے فرمایا اللہ کے لیے حمد ہے جس نے اس کے معاملہ کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا یہ حال ہے کہ تم کو خلافِ اسلام خیالات وخطرات اس قدر تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس پر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے رب کریم کا شکر ادا کرو کہ اس کے فضل وکرم اور اس کی دستگیری نے تمہارے دل کو ان بُرے خیالات کے قبول کرنے سے بچا لیا اور بات وسوسہ کی حد سے آگے نہ بڑھنے دی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَ
كُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ
مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ
رَبَّكَ فَاِذَا بَلَغَهٗ فَلْيَسْتَعِذْ
بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ (رواہ البخاری ومسلم)

علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کسی کے پاس شیطان
ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فل
کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ یہی سوال وہ ذات
متعلق بھی دل میں ڈالتا ہے کہ جب ہر چیز کا کوئی پی
والا ہے تو پھر اللہ کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ پس
سلسلہ جب یہاں تک پہنچے تو چاہیے کہ بندہ اللہ سے پناہ مانگے اور رک جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے وسوسے اور سوالات شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور جب شیطان اس قسم کے
سوالات دل میں ڈالے تو اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ شیطان کے شر سے پناہ مانگے اور اس مسئلہ کو قابلِ توجہ ولائقِ غو
سمجھے ایک اور حدیث جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰے عنہ ہی سے مروی ہے اس میں فرمایا:۔

لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ
هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟
فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ
اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ
(رواہ البخاری ومسلم)

لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چون وچرا کا سلس
رہیگا۔ یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گ
تعالٰے نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے تو پھر اللہ کو کس
کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے وہ یہ کہہ کر
ختم کر دے کہ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان

مطلب یہ کہ بعض اوقات یہی سوالات ملحدانہ نظریات رکھنے والے افراد کی طرف سے ہوتے ہیں اور مومن
کہ جب اسے ایسے لوگوں اور ایسے سوالوں سے سابقہ پڑے تو بات یہ کہہ کر ٹال کر دے کہ اللہ اور اس کے رسولوں پ
ایمان ہے اس لیے تمہارے لایعنی اور مہمل سوالات بالکل قابلِ غور نہیں۔ جس طرح کسی آنکھ والے کے لیے یہ سو
غور نہیں ہے کہ سورج میں روشنی ہے یا نہیں؟ ——— ۲۔ امام بخاری نے یہ جو فرمایا ہے کہ معرفت دل کا فع
اس سے معرفتِ اختیاری مراد ہے کیونکہ معرفتِ اضطراری کو اہلِ لغت فعل سے موسوم نہیں کرتے۔ نیز مومن ہونے
معرفتِ اختیاری کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن نے کہا۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناھم۔ یہ کافر حضور اکرم ص
علیہ وسلم کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں حضور علیہ السلام کی معرفت کے باوجود ان کو کافر کہا گیا
اس لیے کہ ان میں معرفتِ اضطراری پائی گئی ہے اختیاری نہیں اور شریعت میں جس معرفت کا نام ایمان ہے وہ معرف

۱۹- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَرَهُمْ
اَمَرَهُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا يُطِيْقُوْنَ
قَالُوْا اِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُوْلَ
اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
صحابہ کو جب کوئی حکم دیتے تو انہیں کاموں کا حکم دیت
کو وہ کر سکتے۔ صحابہ کرام عرض کرتے یا رسول اللہ ہم آپ
طرح نہیں ہیں آپکے صدقے تو اللہ نے آپکے اگلے اور پچھ
گناہ بھی بخش دیئے ہیں تو حضور ناراضگی کا اظہار فرمات

ذنبك وما تاخر فيغضب حتى رف الغضب في وجهه ثم يقول ان كم و اعلمكم بالله انا (بخاری)

اثر آپ کے چہرۂ مبارک پر ظاہر ہوتا پھر فرماتے میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور اس کی معرفت رکھتا ہوں۔

مدو مسائل

۱- یہ حدیث افراد بخاری میں سے ہے اور مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۲- اذا امرھم کا معنی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ کو انہیں کاموں کا حکم فرماتے تھے جو ی الدوام کر سکیں۔ انا لسنا۔ اس پر صحابہ کرام عرض کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام آپ تو مغفور ہیں۔ آپ کو عمل کی ت نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ اعمال خیر پر مواظبت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم معصوم نہیں ہیں اس لیے ہمیں عبادت اور زیادہ سے زیادہ اعمال خیر میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یا اور فرمایا میں عمل کا زیادہ سزاوار ہوں کیونکہ اعلم و اتقی ہوں اور تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ میں جس بات کا حکم دوں اس یں کرو۔

عصمت انبیاء

اتقی و اعلم اسم تفضیل کے صیغے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی قوت علمیہ و عملیہ سب سے برتر و افضل ہے۔ حضور علیہ السلام تمام اقسام تقویٰ کے جامع عبادت اللہ کی رضا کے مطابق عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوگا۔ اس کی ت بھی سب سے افضل و اکمل ہوگی۔ لہٰذا امتی کا کثیر سے کثیر عمل بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے قلیل سے قلیل عمل کی نہیں کر سکتا۔ نبی کا ایک سجدہ امتی کے کروڑوں سجدوں سے افضل و برتر ہے۔ واضح ہو کہ جمہور مفسرین و محدثین دین اس امر پر متفق ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں۔ تفسیرات احمدیہ میں آیت لاینال عہدی لمین کے تحت لکھا ہے کہ:-

ت لاحد فی ان نبینا صلی اللہ علیہ سلم لم یرتکب صغیرۃ ولا کبیرۃ عین قبل الوحی و بعدہ کما بو حنیفۃ فی الفقہ الاکبر

اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لمحہ کے لیے بھی قبل نبوت و بعد نبوت کسی صغیرہ و کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ جیسا کہ فقہ اکبر میں سیدنا امام اعظم علیہ الرحمہ نے تصریح فرمائی ہے۔

نیز علامہ قاضی عیاض، ابو اسحاق و علامہ تقی الدین سبکی و دیگر علماء و ائمہ دین نے تصریح کی ہے کہ حضور علیہ السلام ی گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ سہواً ہو یا عمداً صادر نہیں ہوا۔ چنانچہ آیت۔ لیغفر لک اللہ ما تقدم من وما تاخر کے علماء نے متعدد معنی کیے ہیں۔

علامہ سبکی و شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ نے اس معنی کی تحسین و تعریف کی کہ آیت کسی لغزش یا گناہ کے اطلاع نہیں دیتی بلکہ ازراہ تکریم و تشریف یہ فرمایا گیا کہ اگر کسی گناہ کا امکان بھی فرض کر لیا جائے تو وہ بھی بخش دیا گیا ہیں۔ مقصود کلام اثبات ذنب اور اس کا غفران نہیں بلکہ اس جگہ مطلقاً نفی ذنب مراد ہے۔

۲۔ صاحبِ رُوح البیان نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ازلی و ابدی طور پر گناہوں سے پاک و منزہ ہیں۔

۳۔ بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں حضور علیہ السلام کے صدقہ میں امت کے گناہوں کی بخشش کا اعلان (عینی جلد ۱ ص ۱۹۵)

۴۔ بعض نے کہا کہ ذنب سے مراد ترکِ اولیٰ ہے یعنی افضل کی بجائے فاضل کو اختیار کرنا اور یہ بات انبیاء ک شان کی وجہ سے ان کے حق میں گویا ذنب ہے آیت میں اسی کی بخشش کا اعلان ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین (عینی جلد ۱ ص ۱۹۵)

۵۔ علامہ قاضی عیاض نے لفظِ مغفرت کو تبریہ از عیوب کے معنیٰ میں لیا۔ انا فتحنالك فتحا مُبینا لیغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ویتم نعمته علیك ویھدیك صر مُستقیما وینصرك الله نصرا عزیزا ۱۔ یہ آیت سورۃ فتح کی ہے جس میں فتح مبین کی خبر ہے اور اس فتح مبین کے نتائج بیان کیے گئے ہیں یعنی ۲۔ مقدم و موخر ذنب کا غفران ۳۔ اتمام نعمت ۴۔ صراط کی ہدایت ۵۔ نصرتِ عزیز کی یاوری و معیت۔

احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ و بیعت الرضوان ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انا فتحنالك کا نزول صلح حدیبیہ کے انجام پر ہوا۔ حضرت براء ب سے روایت ہے کہ گروہِ صحابہ معاہدۂ حدیبیہ و بیعت الرضوان کے دن کو یوم الفتح قرار دیا کرتے تھے (بخاری)

سب کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ جن شرائط پر ہوئی وہ انتہائی دبی ہوئی شرطیں تھیں۔ خود صحابہ کرام کو بھی اس کا تھا مگر اس کے باوجود قرآنِ حکیم نے اسی صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر کیا۔ کیونکہ اس معاہدہ سے جانبین کی آمد کی راہ کھلی۔ مسلمانوں کو کفار میں تبلیغ کا موقع ملا۔ دس سال تک قریش نے جنگ نہ کرنے کا عہد کیا۔ اسلام کے لیے مبین تھی کہ اشاعتِ اسلام کی دشواریاں دور ہوئیں اور جھوٹے شکوک زائل ہوئے۔

یہ تو ہے فتح مبین کا پس منظر۔ اب آیت کے لفظ ذنب پر غور کیجئے۔

معصیۃ۔ اس نافرمانی کو کہتے ہیں جس میں قصد و ارادہ ہو۔ المعصیة عدول عن الحکم ال من الطاعة مخالفة الامر۔ خطا صواب کی ضد ہے۔ اس کے معنیٰ نادرست کے ہیں اور ذَنب جس دُم ہیں تو اشتقاقِ اوسط کے اصول پر ذنب بفتح و سکون ثانی کے معنیٰ بھی تبادلہ ہو جاتے ہیں یعنی ہر وہ الزام جو لگا دیا جائے۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ	انہوں نے مجھ پر ایک الزام لگایا ہوا ہے۔ میں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

یہاں ذنب بمعنی الزام ہے اور غفر کے معنیٰ مٹانے اور چھپانے کے آتے ہیں۔ لہٰذا جب آیت مذکورہ

ـصیۃ نہیں ہے تو ایسی صورت میں کیا ضروری ہے کہ یہاں ذنب کے معنی گناہ کے لیے جائیں۔ پس اس تشریح کی روشنی ـب کے معنیٰ الزام قوم کے ہیں۔ غفر کے معنی مٹانے کے۔ ماتقدم سے مراد وہ الزامات ہیں جو کفار نے حضور علیہ السلام پر ـجرت لگائے یعنی یہ کاہن ہیں۔ شاعر و ساحر ہیں وغیرہ وغیرہ اور ماتاخر سے مراد وہ اتہامات ہیں جو انہوں نے بعد ـت لگائے کہ یہ فسادی ہیں۔ کہ کو اجاڑنے والے اور بھائی بھائی میں جدائی ڈالنے والے ہیں وغیرہ وغیرہ (مصباح القدر) ـب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حدیبیہ کی فتح مبین کا پہلا ثمرہ یہ ہوگا کہ وہ اگلے پچھلے تمام الزامات مٹ جائیں گے جو آپ پر ـ نے لگا رکھے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ نتائج اس صلح سے بہت جلد مرتب ہو گئے۔

صلح حدیبیہ کے انعقاد کے بعد جو تبلیغ قریش اور خلفاء قریش میں رکی ہوئی تھی۔ وہ موانعات دور ہو گئے۔ لوگ اسلام ـ لگے۔ بصارت کھلی، بصیرت بیدار ہوئی اور ان تمام الزامات و اتہامات کی لغویت کا خود ان لوگوں کو بہ ندامت ـ اقرار کرنا پڑا۔

آیت کی یہ توجیہ بہت ہی نفیس ہے اور اس توجیہ پر فتح مبین اور مغفرت ذنب کے درمیان نہایت نفیس ـبت پیدا ہو جاتی ہے کہ مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم یہ ہے:۔

ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی۔ اس کے ذریعے اللہ نے آپ کے لیے پہلے اور پچھلے الزامات و اتہامات کو مٹا دیا۔

بَابُ تَفَاضُلِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ فِي الْاَعْمَالِ

باب اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل کے بیان میں

ـ حدیث نمبر ۲۰ کا وہی مضمون ہے جو کہ حدیث نمبر ۱۵ کا ہے جو مع تفہیم و ترجمانی اوپر گزر چکی ہے اس لیے یہاں نہیں ـ یعنی اس باب میں اعمال صالحہ کی وجہ سے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر فضیلت ہوتی ہے اس کا بیان ہے۔ ـ میں دولت و حکومت مدار فضیلت نہیں ہے۔ مدار فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ ـ اکرم و افضل وہ ہے جو تقویٰ کو اختیار کیے ہوئے ہے

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ
ـلّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَدْخُلُ
ـلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَاَهْلُ النَّارِ النَّارَ
ـ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَخْرِجُوْا مَنْ كَانَ فِيْ
ـ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ
ـرَجُوْنَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوْا فَيُلْقَوْنَ
ـنَهَرِ الْحَيَاءِ اَوِ الْحَيٰوةِ يَشُكُّ مَالِكٌ
ـبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِيْ
ـبِ السَّيْلِ اَلَمْ تَرَ اَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ

حضرت ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت جنت میں اور اہل نار دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اللہ عزوجل فرمائیگا کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکال لو۔ پس وہ نکالے جائیں گے (اور وہ جل کر کوئلے کی طرح) کالے ہو گئے ہوں گے۔ پھر ان کو نہر حیا۔ یا نہر حیوۃ میں ڈالا جائیگا (مالک کو جو اس حدیث کے راوی ہیں۔ اس میں شک ہے کہ حضور نے حیا فرمایا یا حیوۃ فرمایا) پھر اُگے گا ان کے جسم پر گوشت (جیسے سیل آب کے کنارے جنگلی دا

مُلْتَوِيَةً قَالَ وُهَيْبٌ حَدَّثَنَا عَمْرٌو الْحَيَاةِ
وَقَالَ خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ

(بخاری)

آگ آتا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ دانا پہلے نکلتا ہے پیٹا ہوا۔ وہیب نے کہا روایت عمرو میں لفظ حیا ہے اور خردل من ایمان کی جگہ خردل من خیر وارد ہ

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے باب صفۃ الجنۃ والنار میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم ون کتاب الایمان میں درج کیا ہے ۲-اسی مضمون کو ایک حدیث باب زیادۃ الای نقصانہ میں بھی آئی ہے۔ قارئین اس کی تفہیم و ترجمانی کو بھی بغور پڑھیں۔

الفاظِ حدیث کی لغوی تفہیم

مثقال۔ ثقل سے ہے۔ اس کے معنیٰ مقدار اور وزن کے ہیں جی پاک میں آیا۔ مثقال ذرۃ۔ ای زنۃ ذرۃ۔ مثقال فقہی حس فقہاء ایک سو بعد جو یعنی چار ماشہ چار رتی کا ہوتا ہے۔ حیا بالمد کے معنیٰ ندامت و شرمندگی کے ہیں ا بالقصر کے معنیٰ بارش ہیں جس سے کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ روایت کریمہ میں یہ لفظ بالقصر مروی ہے مناسب بھی ہے۔ نہر الحیاۃ وہ نہر ہے جس میں غوطہ کھانے والے کو زندگی مل جائے۔ حبۃ کی جمع حب اس کے معنیٰ بیج ہیں۔ حبۃ کا لفظ گندم کے دانے اور ہر قسم کی ترکاریوں وغیرہ کے بیج پر بولتے ہیں۔ امام ک پھولوں کے بیج مراد لیے ہیں۔

تفہیم حدیث۔ ظاہر ہے کہ ایمان کیفیت نفسانیہ کا نام ہے۔ یہ جسم نہیں کہ ناپا تولا جائے لیکن کو محسوسات سے تشبیہ دے کر سمجھایا کرتے ہیں۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ جس شخص میں اصل ایمان موجود ہوگا کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائیگا۔ حبہ سے تشبیہ محض اس امر میں دی جیسے جڑی بوٹیوں کے بیج نہر کے کنارے ذرا سے وقت میں اُگ آتے ہیں اور یہ جڑی بوٹیاں پھول وغیرہ نہایت ص شفاف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی نافرمان مسلمانوں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا دینے کے بعد جب جہنم سے نکال کر نہر حیا دیا جائیگا تو ان کے جلے بھنے جسم اور جھلسے ہوئے بدن انتہائی سرعت کے ساتھ اپنی اصلی حالت پر آجائیں گے اور تازہ ہو جائیں گے۔ اس حدیث سے اہل سنت و جماعت کے اجماعی عقائد نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے

اوّل۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو باوجود مومن ہونے اور کلمہ پڑھنے کے اپنی بداعمالیوں کے سبب جہنم جائیں گے۔ **دوم**۔ جس کے دل میں اصل ایمان ہوگا وہ بالآخر دوزخ سے ضرور نکالا جائیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ک کا مومن خواہ وہ کیسا ہی فاسق فاجر گنہگار کیوں نہ ہو۔ کافروں اور مشرکوں کی طرح ہمیشہ دوزخ میں رہے۔

سوم۔ مرجیہ کے اس خیال کی تردید ہو گئی کہ مومن خواہ کتنا ہی گنہگار ہو دوزخ میں ایک لمحے کے لیے بھی

چہارم۔ اس حدیث نے معتزلہ کے اس خیال کی بھی تردید کر دی کہ گنہگار ہمیشہ دوزخ میں رہیں گ

پنجم۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مومنین اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فضی

حضرت عمرؓ کی فضیلت

۲۲۔ عَنْ اَبِیْ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انھوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عن

امَةَ ابْنِ سَهْلِ ابْنِ حُنَيْفٍ اَنَّهُ سَمِعَ
سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيَّ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
لّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَيْتُ
سَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ
مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ وَمِنْهَا مَا دُوْنَ ذٰلِكَ
ضَ عَلَيَّ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ
هُ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ
الدِّيْنَ

یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بحالتِ خواب لوگ میرے سامنے لائے گئے۔ وہ قمیص پہنے ہوئے تھے۔ کسی کا قمیص سینہ تک اور کسی کا اس سے نیچے تھا۔ عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالےٰ) جب لائے گئے تو وہ ایسا کرتہ پہنے ہوئے تھے جس کو وہ گھسیٹ رہے تھے (یعنی بہت نیچا) صحابہ نے عرض کی آپ نے اس سے کیا تعبیر کی۔ فرمایا۔ دین (بخاری)

شریح وتوضیح

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التعبیر اور باب فضلِ عمر میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم ونسائی وترمذی نے فضائل میں۔

۱- یُعْرَضُوْنَ کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ قُمُص۔ قمیص کی جمع ہے۔ ثُدِیّ دال کے زیر اور ی کی ید کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ ۲- اَوَّلْتَ تاویل سے مشتق ہے۔ یہاں اس کے معنی تعبیر کے ہیں ۳- حدیث ہذا سے ت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تمام صحابہ کرام پر ماسوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے فضیلت ثابت ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا کرتہ حضرت فاروقِ اعظم سے بھی زیادہ و۔ دوسرے حضرت ابوبکر کا تمام صحابہ سے افضل ہونا اجماعی مسئلہ ہے اور آپ کی فضیلت میں وارد شدہ احادیث ہیں اور یہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد متواتر کے معارض نہیں ہوسکتی ۴۔ اس حدیث میں تفاضل فی الایمان سے ت ایمان میں تفاضل مراد نہیں ہے بلکہ اعمال میں تفاضل مراد ہے جس سے نور ایمان زیادہ ہوتا ہے ۵- حدیث ہذا میں یا۔ بہت افراد میرے سامنے پیش ہوتے قمیص پہنے ہوتے تھے۔ مگر فاروقِ اعظم کا قمیص سب سے نیچا تھا۔ اور اس کی ور علیہ السلام نے دین فرمائی یعنی حضرت فاروق اعظم سب سے زیادہ کامل الایمان اور صاحبِ خیر کثیر ہیں ۶- اس حدیث ین کو قمیص سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وجہ تشبیہ ستر ہے۔ جیسے قمیص بدنِ انسان کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اسی طرح دین د تش دوزخ سے بچانے کا سبب ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا۔ خواب میں قمیص پہنے ہوئے دیکھنا اس سے دین مراد ہوتا ر قمیص کا نیچا ہونا کہ پہننے والا اس کو گھسیٹ کر چلے اس کی تاویل یہ ہے کہ صاحبِ قمیص کے آثار جمیلہ اور سُننِ حسنہ اس کی کے بعد باقی رہیں گے تاکہ مسلمان اس کی اقتدار کریں ۷- اس حدیث سے خواب کی تعبیر لینے کا جواز ثابت ہوا ۸- امام س حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے قمیص کے چھوٹے بڑے ہونے سے تعبیر کیا یعنی جس کا قمیص چھوٹا تھا اس میں ایمان کم تھا جس کا لمبا تھا اس میں ایمان زیادہ تھا۔

علامہ عینی نے جواب دیا۔ حدیث ہذا میں نفسِ ایمان میں تفاضل کا بیان نہیں ہے بلکہ اعمالِ حسنہ میں تفاضل کا بیان صود ہے جس سے نور ایمان زیادہ ہوتا ہے۔

۹۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر بسببِ اعمال فضیلت ہے۔

بَابُ الْحَيَاءِ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب اس امر کے بیان میں کہ حیار بھی ایمان کی نشانی ہے

۲۳ - عَنْ سَالِمِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَ هُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِى الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ

سالم بن عبداللہ وہ اپنے والد سے راوی ہیں کہ حضو
علیہ وسلم ایک انصاری کے قریب سے گزرے۔
بھائی کو حیار کے متعلق نصیحت کر رہے تھے ایعنی
سے منع کر رہے تھے) اس پر حضور علیہ السلام نے
جانے دو (یعنی حیا کرنے سے منع نہ کرو) کیونکہ حیار بھی
کی نشانی ہے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل امام نے اس حدیث کو کتاب البر والصلہ میں بھی ذکر کیا ہے اور ابوداؤد، نسائی و ترمذی
اس حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ وعظ کے معنے نصیحت کرنے یا دلانے۔ کسی چیز
سے آتے ہیں وہ انصاری اپنے بھائی کو حیار نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔
کرو۔ کیونکہ حیار ایمان کی نشانی ہے یعنی جیسے ایمان معاصی سے روکتا ہے۔ اسی طرح حیا بھی روکتی ہے۔ حیار
کیفیت کا نام ہے جو انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کوئی اسے عیب
یا اس کی مذمت کریگا اور ترکِ فعل حیار کے لوازم سے ہے۔ غالباً اسی لیے بعض علمار نے ترکِ فعل کا نام حیا ر
طبیعتیں اس کام کے کرنے میں حیار کرتی ہیں۔ جو قبیح ہوتے ہیں۔ لیکن جاہل لوگ نیک کاموں کے کرنے میں
ہیں اور اب تو زمانہ کا یہ عالم ہے کہ لوگ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں حیار کرنے لگ گئے ہیں۔ بہر حال جس حیا
ایمان قرار دیا گیا ہے وہ وہی حیا ہے جو آدمی کو برائیوں کے اختیار کرنے سے روکے۔ مومن حق کہنے اور حق
نہیں کرتا۔ (من الایمان) میں لفظ من تبعیضیہ ہے اور اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے گزر چکی ہے
ہیں۔ الحیاء شعبۃ من الایمان۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب حیار ایمان کا جزء ہے تو جس میں
میں بعض ایمان بھی نہ ہوگا اور جب بعض ایمان نہ رہے گا تو حقیقتِ ایمان کی نفی ہو جائے گی اور ایمان کی
ان مقدمات سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس میں حیار نہ ہو وہ کافر ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حیار حقیقت
سے ہے بلکہ حیار تو مکملاتِ ایمان سے ہے اور نفی کمال کی مستلزم نفی حقیقت نہیں ہوتی۔ فافہم

بَابٌ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

باب کہ اگر یہ کافر توبہ کریں اور نماز قائم کریں

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

اور زکوٰۃ دیں تو ان سے تعرض نہ کرو۔

۲۴ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم

وَسَلَّمَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ
حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ
حَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا
زَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ
مَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ
حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

(رواہ مسلم و بخاری)

نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کہ وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں تو جب وہ ایسا کرلیں تو مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ پائیں گے۔ مگر اسلام کے حق سے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (یعنی ان کی فرضیت کے قائل ہوجائیں۔

ضیح مرجیہ فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس باب میں ایک آیت اور حدیث کو ذکر فرما کر مرجیہ کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ آیت میں تین باتوں کا ذکر ہے۔ کفر سے توحید کی رجوع، نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ دینا۔ حدیث میں بھی انہی تین امور کا بیان ہے۔ پھر جس طرح آیت میں اس امر کا بیان ہے ان مذکورہ بالا امور کو بجا لائے گا۔ اس کا جان و مال محفوظ ہوجائیگا۔ اسی طرح حدیث میں اسی کا بیان ہے۔ یہ حدیث مبارکہ کی تفسیر بھی ہے۔ مگر امام بخاری نے حدیث کو آیت کی تفسیر کرنے کی غرض سے ذکر نہیں کیا۔ ان کا مقصد مرجیہ خیال کی تردید ہے اور یہ بتانا ہے کہ اعمال بھی ایمان کا شعبہ ہے۔ کیونکہ حضرت انس سے مروی ہے کہ باعتبار نزول کے سے آخری آیت قرآن ہے اور حضور علیہ السلام نے قتال کا جو حکم دیا تھا وہ ابتداء بعثت میں دیا تھا اور متقدم متأخر یے تفسیر نہیں ہوتا ۲۔ اُمِرْتُ بصیغہ مجہول امر کا صیغہ ہے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالےٰ کے کوئی آمر اور حاکم نہیں ہے۔ اس لیے جب حضور علیہ السلام یہ فرمائیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے تو اس سے مراد اللہ رب العزت دہ کی ذات اقدس ہوگی۔ کیونکہ حضور علیہ السلام دین کے شارح اور امت کے حاکم آمر اور ناہی ہیں اور آپ کے کوئی اور شارح نہیں ہے اور جب صحابی یہ کہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے تو اس سے مراد حضور علیہ السلام کا حکم ہوگا، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کا مطیع رسول ہونا بدیہی بات ہے۔ لہٰذا جب صحابی یہ کہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے تو اس سے ر علیہ السلام ہی مراد ہونے چاہئیں ۲۔ امرت ان اقاتل الناس میں الف لام جنسی ہے۔ مشرک اور کتاب بھی اس میں داخل ہیں۔ جو لوگ جزیہ قبول کریں وہ اس میں شامل نہیں رہیں گے۔ نسائی کی روایت مِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ الْمُشْرِكِيْنَ کا لفظ آیا ہے۔ اسی بنا پر اکثر شراح حدیث نے الناس سے صرف مشرک یے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب جزیہ قبول کرلینے کی وجہ سے اس حکم سے خاص ہوگئے۔ مطلب حدیث یہ ہے وگ توحید و رسالت پر ایمان لے آئیں وہ بھی اور جو کفر پر قائم رہتے ہوئے جزیہ قبول کرلیں وہ بھی اپنے جان و مال کو ظ کرلیں گے اور اگر دونوں باتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں تو پھر ان سے جہاد کیا جائے گا۔ اقامۃ الصلوٰۃ کا مطلب پر مداومت اور اس کو اس کے پورے ارکان و واجبات کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں۔ یؤتوا الزکوٰۃ یعنی مال کا مخصوص شریعت کی مقرر کردہ ہدایت کے مطابق مستحقین کو دینا۔ یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ کا دیگر دلائل شرعیہ پر

پر نظر رکھتے ہوئے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ توحید و رسالت پر ایمان لانے کے بعد نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کو بھی تسلیم
عصموا۔ عصم کے معنیٰ اصل لغت میں روک کے ہیں۔ اسی لیے عصام اس رسی کو کہتے ہیں جو مشک کے منہ
جاتی ہے تاکہ پانی باہر نہ نکل سکے۔ یہاں اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ جب وہ ان امور پر ایمان لے آئیں گے تو ان
جان و مال محفوظ ہو جائیگا۔ الا بحق الاسلام کا مطلب یہ ہے کہ باوجود مسلمان ہونے کے اگر کوئی کسی کو ناحق
دے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوگا تو اس کو سزا دی جائے گی۔ یہ نہیں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کو کھلی چھٹی
جائے کہ جو چاہے کرے۔ حتی یشھدوا سے واضح ہوا کہ کسی کو مسلمان اسی صورت میں قرار دیا جائیگا۔ جب کہ وہ ز
کلمہ پڑھے اور تمام ضروریاتِ دین کو تسلیم کرے۔ حسابھم علی اللہ کا معنیٰ یہ ہے کہ ظاہر پر حکم لگائیں گے
کی کیفیت کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا۔ ایک معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ عصمت احکام دنیوی سے متعلق ہوگی
کا ثواب دینا یا بداعمالیوں کی سزا دینا یہ اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔

فائدہ اس حدیث میں توحید و رسالت کے ساتھ نماز و زکوٰۃ پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ باقی ارکانِ اسلا
نہیں ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نماز و زکوٰۃ کی اہمیت کی وجہ سے ان دونوں کا ذکر کر دیا ہے
ہونے کے لیے ان تمام باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کی طرف سے
چنانچہ اسی مضمون کی بخاری میں جو حدیث ہے اس کے لفظ یہ ہیں۔ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا
یُؤْمِنُوْا بِیْ وَ بِمَا جِئْتُ بِہٖ کہ لوگوں کے جان و مال اس وقت محفوظ ہوں گے۔ جب کہ وہ توحید کے
بعد مجھ پر ایمان لائیں اور جو چیز میں لایا ہوں اس پر بھی ایمان لائیں۔ بما جئت بہ میں تمام امورِ اسلامیہ آ

تارکِ صلوٰۃ عمداً کا حکم

یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ سے امام شافعی یہ اس
کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی فرضیت کے قائل ہونے کے باوجود قصداً عمداً نماز ترک
کو تلوار سے حداً قتل کر دیا جائیگا۔ اب یہ کہ فی الفور قتل کر دیا جائے یا اس کو تین دن کی مہلت دی جائے۔ اس میں
شافعی کا اختلاف ہے (کما قالہ النووی) لیکن جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس کے متعلق وہ قتل کا حکم نہیں دیتے
اس سے زکوٰۃ وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن ان کے اس استدلال پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیثِ مذکورہ میں صلوٰۃ
دونوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں کا ایک ہی حکم ہونا چاہیے۔ لیکن آپ (شافعی) تارکِ صلوٰۃ کو حداً قتل کر دینے کا حکم
ہیں مگر تارکِ زکوٰۃ کے لیے یہ حکم نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں۔ حدیثِ ہذا میں اُقَاتِلُ کا لفظ آیا ہے جو بابِ مفاعلہ سے ہے اور اس کی خ
یہ ہے کہ اس میں فعل جانبین سے ہوتا ہے اور حدیث میں قتال کا لفظ آیا ہے قتل کا نہیں۔ لہٰذا اباحۃ قتال سے ا
کیسے ثابت ہوگا۔

پس تارکِ صلوٰۃ عمداً کی تعزیر یہ ہونی چاہیے کہ اس کو قید کر دیا جائے یہاں تک کہ و
کرے اور نماز کا پابند ہو جائے۔

بَابُ مَنْ قَالَ الْاِيْمَانُ هُوَ الْعَمَلُ

باب اس امر کے بیان میں جنہوں نے یہ کہا کہ ایمان عمل کا نام ہے

قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْ
ثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ وَقَالَ
عِدَّةٌ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى فَوَ
بِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا
مَلُوْنَ عَنْ قَوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا یہ جنت جس کے تم وارث ہوئے ہو اپنے اعمال کی وجہ سے اور بعض اہلِ علم نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تیرے رب کی قسم ضرور سوال کرے گا۔ اللہ تعالیٰ جو وہ عمل کرتے ہیں۔ عمل کی تفسیر انہوں نے لا الٰہ الا اللہ سے کی ہے۔

امام بخاری نے یہ باب بھی فرقہ مرجیہ کے اس خیال کی تردید کے لیے باندھا ہے کہ "ایمان کے لیے عمل کی ضرورت یں ہے" اور آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایمان عمل کو کہتے ہیں جس کی تقریر یہ ہے کہ ایمان دخولِ جنت سبب بنتا ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ تم جنت کے مستحق عمل کی وجہ سے ہوئے۔ اس سے ثابت ہوا یمان عمل کو کہتے ہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں یعملون کے لفظ کی تفسیر بعض مفسرین نے لا الٰہ الا اللہ سے کی۔ گویا پر عمل کا اطلاق آیا اور یعملون کے معنی ہوئے یؤمنون تو اس سے واضح ہوا کہ ایمان عمل ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس یں تو شک نہیں کہ مرجیہ کا یہ کہنا کہ ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت نہیں ہے باطل محض ہے۔ دلائلِ شریعہ سے صریح ور پر ثابت ہوتا ہے کہ نجاتِ کامل کے لیے ایمان کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو ان آیات سے ستدلال فرمایا کہ اعمال حقیقتِ ایمان میں داخل ہے قابلِ نظر ہے کیونکہ آیت عما کانوا یعملون کے عموم میں عقائد و اعمال دونوں داخل یں۔ معنی آیت یہ ہے کہ قیامت کے دن عقیدہ و عمل دونوں کے متعلق سوال ہوگا۔ ایسی صورت میں یعملون کی تفسیر صرف قیدے کی تخصیص بلا دلیل ہے۔ ثانیاً عمل کا اطلاق ایمان پر اس حیثیت سے تو صحیح ہے کہ ایمان عملِ قلب ہے یعنی صدیق۔ لیکن جب عمل کا اطلاق ایمان پر اس حیثیت سے کیا جائے کہ اس سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ عمل حقیقتِ مان میں داخل ہے یا اس کا جزو ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے عما کانوا یعملون سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی اسناد میں لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے ذا اس کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

الَ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ

اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ایسے عمل کریں عمل کرنے والے

اس آیت سے بھی امام یہی استدلال کرتے ہیں کہ یہاں عمل سے مراد ایمان ہے لیکن یہ دعویٰ تخصیص بھی بلا دلیل ہے۔

۲۵ - عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَيُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ
لَ اِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ قِيْلَ ثُمَّ مَا
الَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قِيْلَ ثُمَّ مَا

حضرت ابوہریرہ سے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پھر پوچھا گیا۔ اس کے بعد فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا۔ اس کے بعد فرمایا۔

ذَا قَالَ حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ | حج مبرور

فوائد ومسائل اس حدیث کو مسلم، ترمذی ونسائی نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ اَفْضَلُ ۔ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنیٰ یہ ہوں گے کہ سب سے زیادہ ثواب والا افضل ای یہاں استفہامیہ ہے۔ ثُمَّ مَاذَا میں ثُمَّ عطف ۔ رتیب کے لیے ہے اور مَا استفہامیہ ہے اور ذَا اسم ہے۔ عبارت یوں بنے گی۔ اَیُّ شَیْءٍ اَفْضَلُ بَعْدَ ا یمَانِ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ جِهَادٌ جَهْدٌ سے کے زبر کے ساتھ۔ اس کے معنیٰ لغت میں مشقت کے ہیں ۔ اصطلاح شرع میں کافروں سے اللہ تعالےٰ کے کلمہ کو کے لیے لڑنے کا نام جہاد ہے۔ حج کے معنےٰ لغت میں قص ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں مکانِ مخصوص کی زمانِ مخصو فعلِ مخصوص کے ساتھ زیارت کرنے کو حج کہتے ہیں۔ مَبْرُوْرٌ ۔ بر۔ ب کے زیر کے ساتھ اس کے معنیٰ قبو کے ہیں جیسے بولتے ہیں۔ برّ اللہ حجك ۔ اللہ تعالیٰ تیرا حج قبول کرے۔ اصل لغت میں بر کے معنیٰ خیر ہونے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے مبرور مختلف معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ وہ کام جس میں گناہ نہ ہو۔ برت یمینہ اس نے اپنی قسم کو پورا کر دیا جس میں ریاء نہ ہو۔ ہر عملِ صالح کو بھی بر کہتے ہیں۔ لبید شاعر نے بر کو تقویٰ کے معنیٰ میں کیا ہے۔

وما البر الا مضمرات من التقیٰ   وما المال الا معمرات ودایع

بر بھی تقویٰ کے مضمرات سے ہے اور مال مدتِ عمر میں تو ودیعت ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وارثوں ہے۔ بر کے معنیٰ نیکی کے بھی آتے ہیں جیسے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ میں اور لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ میں جنت کے معنیٰ میں بھی بعض نے لیا ہے۔ بر احسان وصلہ کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جیسے بولتے ہیں۔ بَرَرْتُ وَالِد مَبْرُوْرٌ کے معنی وہ کام جو گناہ سے پاک ہو، جو مقبول عند اللہ ہو، جو شبہات سے پاک ہو۔ جس میں ریاء نہ ہو۔ بعض کہا کہ حجِ مبرور کی علامت یہ ہے کہ آدمی پہلے سے زیادہ پابندِ شریعت ہو جائے۔

توضیح حدیثِ ہذا میں عمل پر ایمان کا اطلاق بایں معنےٰ ہوا ہے کہ ایمان فعلِ قلب ہے یعنی ع اس لیے ایمان کو بھی عمل کہہ دیا گیا ورنہ حقیقتِ ایمان مجرد تصدیق ہے اور افضل الاعم کو قرار دینا بایں معنیٰ ہے کہ ایمان اصل ہے اور عمل اس کی فرع ۲۔ اس حدیث میں ترتیب یہ ہے سب سے ایمان باللہ ورسولہ۔ اس کے بعد جہاد، اس کے بعد حج مبرور۔ لیکن حدیث ابنِ مسعود میں افضل عمل نماز سے نیکی کرنا۔ اس کے بعد حج مبرور کا ذکر ہے۔ حدیثِ ابنِ عمر میں افضل اسلام کھانا کھلانا اور سلام کرنے کو قرار د حدیثِ ابی موسیٰ میں افضل اسلام اس بات کو بتایا گیا ہے کہ جس کی زبان سے اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں حدیثِ ابوذر میں افضل عمل ایمان باللہ اور جہاد کو بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد غلام آزاد کرنے کو۔ اس میں ح ہے تو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث متعارض ہیں۔ کہیں کسی عمل کو افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے اور کہیں کسی ہے کہ اس مضمون کی احادیث کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ

بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ آپ صاحبِ حکمت ہیں اور حکمت کے معنی ہیں کہ اشیاء کو ٹھیک اپنے محل میں رکھنا تو یہ جو بظاہر ختلاف سا نظر آرہا ہے۔ یہ بوجہ اختلاف احوال و اشخاص کے ہے یعنی جب حضور علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ بہترین عمل نماز ہے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ بہترین عمل جہاد ہے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ بہترین عمل سلام کو پھیلانا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لام من جمیع الوجوہ تمام حالات اور تمام اشخاص کے لیے ہر ایک سے بہترین ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک حال میں یہ عمل سب سے تر ہے اور دوسرے وقت میں دوسرا عمل اس سے بہتر ہے۔ دیکھئے نماز بہتر عمل ہے لیکن ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور ایک ا کنوئیں میں گرا چاہتا ہے تو ایسے وقت میں اس نماز پڑھنے والے کے لیے بہترین عمل یہ ہے کہ نماز کو توڑ دے اور اندھے ن بچالے۔ تو یہی مطلب مذکورہ بالا احادیث میں کسی ایک عمل کو افضل الاعمال قرار دینے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث زیر بحث ج سے پہلے جہاد کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ حج سے صرف ایک شخص کو نفع پہنچتا ہے اور جہاد سے پورے اسلام کی شادابی ہوتی ہے کہ حج رکن اسلام سے ہے اور جہاد رکن اسلام سے نہیں ہے۔ خلاصہ جواب یہ ہوا کہ احادیث مذکورہ بالا میں قطعاً تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ یہی بات ہے کہ ہر عمل اپنے موقع و محل احوال و اشخاص کی بنیاد پر افضل الاعمال کہلایا جا سکتا ہے اور اس کی ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضور علیہ السلام کو مختلف قسم کے اشخاص سے واسطہ پڑتا تھا تو آپ اپنے نورِ نبوت سے جس عمل کی کمی یا اس پرواہی ملاحظہ فرماتے تھے۔ اس کے لیے خصوصیت کے ساتھ اسی عمل کو افضل الاعمال قرار دیتے تھے تاکہ اس شخص کے دل اس عمل کی اہمیت جاگزیں ہو جائے اور یہی حکمت کا تقاضا بھی تھا۔

بَابُ إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيْقَةِ

باب اس امر کے بیان میں کہ جب اسلام حقیقۃً نہ ہو بلکہ (ظاہر میں)

ن عَلَى الْإِسْلَامِ أَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ قَوْلِهِ تَعَالٰى قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا فَإِذَا عَلَى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلٰى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ الْآيَةَ

(بخاری)

جان کے ڈر سے ہو (تو وہ آخرت میں کچھ فائدہ نہ دے گا) اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے (ایسے لوگوں کے حق میں فرمایا) کہ یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے تو اے محبوب ان سے فرما دو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ بظاہر اسلام کے تابعدار ہو گئے اور اگر اسلام حقیقی طور پر ہو تو یہی مراد ہے اس آیت میں کہ دین تو اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے۔

سلام معتبر اور اسلام غیر معتبر کا بیان

۱۔ واضح ہو کہ نفس الامر میں جو اسلام اللہ کے نزدیک معتبر و مقبول ہے وہ یہی ہے کہ آدمی خلوصِ دل کے ساتھ ضروریاتِ دین پر ایمان لائے س کی حقانیت کا اعتراف کرے۔ چنانچہ اس کا بیان آیۂ مبارکہ إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ میں ہے ۲۔ اور سلام یہ ہے کہ دل سے تو اس کی حقانیت کا اعتراف اور تصدیق نہ کی جائے محض رسمی طور پر یا صلح کے طور پر یا حکایۃً کے خطرہ کی بنا پر اسلام قبول کیا جائے۔ یہ اسلام غیر معتبر ہے اور اس کا بیان آیۂ مبارکہ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا... ں ہے۔ چنانچہ یہ آیت قبیلہ بنی اسد بن خزیمہ کے ان افراد کے حق میں نازل ہوئی جو قحط سالی کے زمانہ میں مدینہ آئے

اسلام قبول کیا اور حضور علیہ السلام سے کہنے لگے ہم بغیر لڑے آپ کے مطیع ہو گئے ہیں۔ اس لئے آپ ہمارا زیادہ
جس پر انہیں کہا گیا کہ تم صرف زبانی طور پہ دعویٰ اسلام کرتے ہو۔ صمیم قلب کے ساتھ تم نے اسلام کی حقانیت کو تسلیم
کیا ہے۔ اس لیے تم مومن نہیں ہو۔ البتہ مسلم بایں معنے ہو کہ تم نے ظاہری طور پہ اطاعت قبول کی ہے ۳۔ امام
نے یہ باب محض اسلام معتبر و اسلام غیر معتبر میں فرق کو بیان کرنے کے لیے باندھا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نفس
میں وہی اسلام خدا کے نزدیک مقبول و معتبر ہے جو صمیم قلب کے ساتھ قبول کیا جائے اور اس کی حقانیت کا اعتر
کیا جائے ۴۔ اِذَا لَمْ یَکُنِ الْاِسْلَامُ عَلَی الْحَقِیْقَةِ میں حَقِیْقَة مجاز کے مقابل نہیں ہے بلکہ اس کے معنی
کے ہیں ۵۔ اَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ کے معنی بعض شارحین نے یہ کئے ہیں کہ امام بخاری کے نزدیک حالتِ خوف میں
ہوا اسلام معتبر نہیں ہے لیکن یہ بات غلط ہے اور امام بخاری کی شان سے بعید ہے کیونکہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور
تعالے علیہ وسلم نے ان افراد کے اسلام کو قبول فرمایا جنہوں نے جان کے خطرہ کی بناء پر اسلام قبول کیا تھا۔ بلکہ وہ لوگ
یہ کہنا پسند نہیں کیا تھا کہ ہم اسلام لائے بلکہ انھوں نے یہ کہا تھا (صبانا صبانا) اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان
اسلام کو رد کرتے ہوئے ان کو قتل کر دیا تھا۔ جس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ الٰہی میں خالد کے فعل سے بری ہوں
ہوا کہ مطلقاً خوف کی حالت میں قبول کئے ہوئے اسلام کو غیر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا ۶۔ اسلام لانے کی متعدد
یہ کہ جبراً اسلام قبول کرے مگر دل سے بُرا جانے۔ یہ اسلام معتبر نہیں کیونکہ ایسے شخص نے خلوصِ قلب سے اسلام کی
کی تصدیق نہیں کی۔ دوم یہ کہ اس کے نزدیک کسی بھی دین میں رہنا جائز ہو اور وہ اسی بنیاد پر اسلام قبول کرے۔ اس
نہیں کہ اسلام حق ہے یہ اسلام بھی غیر معتبر ہے اور لَمْ یَکُنِ الْاِسْلَامُ عَلَی الْحَقِیْقَةِ سے امام بخاری کی یہی
شکل یہ ہے کہ خوفِ جان کے وقت اسلام قبول کر لیا اور پھر اس کی حقانیت کی تصدیق کرے۔ گویا اس نے خوف
وقت صمیم قلب کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام معتبر ہے اور ایسا شخص مومن ہے اور امام بخاری نے ایسے شخص
اسلام کو غیر معتبر قرار نہیں دیا ہے ۷۔ اَوْ کَانَ عَلَی الْاِسْتِسْلَامِ یہ سَلَمٌ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی صلح کے ہیں
کے طور پر مجبوراً اسلام لے آئے مگر اس کی حقانیت کا قائل نہ ہو۔ یہ اسلام بھی غیر معتبر ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بحالتِ خوف جو اسلام قبول کرے اور دل سے اس کی حقانیت کا معترف ہو تو وہ
مقبول ہے اور اگر تصدیقِ قلبی نہ ہو تو پھر نامعتبر ہے ۲۔ اس آیت سے کرامیہ اور مرجیہ کے اس قول کی تردید ہوتی ہے
صرف زبان سے اقرار کا نام ہے اور تصدیقِ قلبی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اعراب کو غیر مومن اسی بناء پر قرار دیا
میں تصدیقِ قلبی نہ تھی۔

۲۶۔ عَنْ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى رَهْطًا وَّسَعْدٌ جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا هُوَ اَعْجَبُهُمْ اِلَيَّ فَقُلْتُ

حضرت سعد سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی
وسلم نے کچھ مال لوگوں میں تقسیم فرمایا اور سعد وہاں بیٹھے
اور آپ نے ایک شخص کو چھوڑ دیا (کچھ نہیں دیا)
شخص مجھے بہت پسند تھا تو میں نے عرض کی یا رسول

رَسُوْلَ اللهِ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللهِ اِنِّيْ لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيْلًا غَلَبَنِيْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُّ مَقَالَتِيْ فَقُلْتُ مَالَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللهِ اِنِّيْ لَاَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ اَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُّ قَلِيْلًا ثُمَّ غَلَبَنِيْ مَا اَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُّ مَقَالَتِيْ وَ عَادَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اِنِّيْ لَاُعْطِي الرَّجُلَ وَغَيْرُهٗ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةَ اَنْ يَّكُبَّهُ اللهُ فِي النَّارِ (بخاری)

نے اس شخص کو کیوں نہیں عطا فرمایا۔ خدا کی قسم میں تو اس کو مومن ہی جانتا ہوں۔ آپ نے فرمایا مسلمان؟ حضرت سعد کہتے ہیں پھر میں تھوڑی دیر خاموش رہا لیکن جو حال اس کا مجھے معلوم تھا اس نے مجھے پھر سوال کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے عرض کی۔ حضور اس کو آپ نے کیوں نہیں عطا فرمایا۔ خدا کی قسم میں تو اس کو مومن سمجھتا ہوں۔ حضور نے فرمایا اور مسلمان! پھر میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ لیکن جو حال مجھے اس کا معلوم تھا اس نے مجھے پھر سوال کرنے پر مجبور کیا اور میں نے وہی سوال پھر دُہرا دیا۔ جس پر آپ نے فرمایا اے سعد! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں حالانکہ دوسرا (شخص جس کو نہیں دیتا) مجھے زیادہ عزیز ہوتا ہے (میں جس کو دیتا ہوں) تو اس خوف سے کہیں اللہ تعالے اس کو جہنم میں اوندھا نہ گرا دے۔

فوائد و مسائل

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الزکوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ نیز ابو داؤد و ابو نعیم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ۲- ابتدائے اسلام میں یہ قاعدہ تھا کہ جو لوگ نئے نئے اسلام لاتے تھے۔ ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو کچھ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے چند افراد تھے جن کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مالی امداد فرما رہے تھے۔ آپ نے ان میں سے ایک شخص کو کچھ نہ دیا۔ جس پر حضرت سعد نے عرض کی! حضور! بخدا میں تو اس کو بھی مومن سمجھتا ہوں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس معروضہ کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ بھی مومن ہے تو حضور اس کو کیوں نہیں عطا فرماتے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل حقیقت سے ان کو آگاہ کیا کہ جن کو میں کچھ دے رہا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ضعیف الایمان ہیں۔ اگر ان کی تالیف نہ کی گئی تو ممکن ہے یہ اسلام سے پھر جائیں اور اللہ ان کو دوزخ میں ڈال دے۔ لیکن جن کو میں نہیں دیتا وہ اسلام کی لذت کو پا چکے ہیں اور ان کے اسلام سے پھر جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس حکمت کی بنا پر میں ان کو دے رہا ہوں اور جس کی تم نے سفارش کی ہے اس کو نہیں دیا۔ حالانکہ یہ مجھے ان سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ کامل الایمان ہے۔

۱- ابتدائے اسلام میں مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ کو زکوٰۃ سے دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بہ اجماع صحابہ ساقط ہو گئے کیونکہ جب اللہ تعالےٰ نے اسلام کو غلبہ دیا تو اب اس کی حاجت نہ رہی۔ یہ اجماع صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں منعقد ہوا۔

۲- اس حدیث سے گمانِ غالب پر قسم کھانے کا جواز ثابت ہوا کیونکہ حضرت نے اپنے گمانِ غالب پر ہی اس شخص کے مومن ہونے کی قسم کھائی تھی۔

۳- جائز سفارش کا جواز ثابت ہوا۔ حضرت سعد نے اس کے لیے سفارش کی۔

۴- یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر سفارش خلافِ مصلحت ہو تو اسے قبول نہ کیا جائے جیسے حضور علیہ السلام نے قبول نہیں فرمائی۔

۵- یہ بھی ثابت ہوا کہ جب تک دل سے اعتقاد نہ ہو زبانی اقرار کافی نہیں ہے اور مومن ہونے کے لیے تصدیق قلبی ضروری ہے۔

۹۔ حضرت سعد نے عرض کی واللہ میں اس کو مومن جانتا ہوں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ او مسلماً
ہمزہ استفہامیہ ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ اتقول کذا و هو مسلم یعنی تم
پر جزم ویقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو؟ اور وہ مسلم ہو تو حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا مقصد نہ تو اس شخص کے ایمان
کرنا ہے اور نہ حضرت سعد کی مذمت بلکہ صرف ایک اصول بتانا ہے کہ امورِ باطنہ کا جب تک علم نہ ہو جائے اس وقت
یقین کے ساتھ حکم نہیں لگانا چاہئے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جب ایک انصاری کے چھوٹے بچے کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہ
تعالےٰ عنہا نے فرمایا:۔

طُوْبٰی لَهٗ عُصْفُوْرٌ مِّنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ	خوشخبری ہو یہ تو جنت کے پرندوں میں سے ایک
اس پر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ مَهْلًا يَا عَائِشَةُ !	عائشہ! ٹھہر جاؤ!!

حالانکہ وہ بچہ مسلمان تھا اور اولادِ مسلمین کا جنت میں ہونا معلوم ہے۔ تو اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ
حضرت سعد کو ایک اصول بات بتائی کہ امورِ باطنہ پر جزم ویقین کے ساتھ حکم نہ لگایا جائے۔ صحابہ کرام کی یہ حالت
حضور علیہ السلام ان سے سوال فرماتے تو عرض کرتے۔

اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ	اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ
عنہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ قدیم
ہیں۔ چودہ برس کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بدر اور اس کے بعد کے تمام مشاہد میں شریک ہوئے آپ
تھے۔ لوگ آپ سے دعائیں کراتے تھے اور قبول ہوتی تھیں۔ آپ کا لقب فارس الاسلام ہے۔ اسلام کے لیے
نیزہ پھینکنے والے اور سب سے پہلے خون بہانے والے آپ ہیں۔ آپ ان مہاجرین میں سے ہیں جنھوں نے حضور علیہ
مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے مدینہ ہجرت کی۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے آپ نے ہی انتقال فرمایا۔ حضرت عمر کے
نے مدائنِ کسریٰ کو فتح کیا اور حضرت عمر نے آپ کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ آپ نے قصرِ عقیق میں جو مدینہ سے دس میل کے
۵۵ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کی عمر شریف ستر سال کے قریب ہوئی۔ آپ کو مدینہ لاکر جنت البقیع میں دفن کیا گیا
کم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ سے ۲۷۰ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۱۵ حدیثوں پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا
صرف بخاری نے) ۱۹ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۱۹ حدیثیں صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بَابُ اِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب سلام کرنا علاماتِ اسلام سے ہے

وَقَالَ عَمَّارٌ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الْاِيْمَانَ الْاِنْصَافُ	حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ تین جس نے جمع کر لیں اس نے ایمان کو جمع کر لیا

نَفْسِكَ وَ بَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ وَ الْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ

(بخاری)

تین باتیں علامات ایمان سے اس نے اپنے اندر جمع کرلیں ١- اپنے نفس سے انصاف کرنا ٢- ہر ایک کو سلام کرنا ٣- باوجود احتیاج کے خرچ کرنا

ئد و مسائل

١- انصاف عدل کو کہتے ہیں۔ بذل کے معنے خرچ کرنے کے ہیں۔ عالَم سے مراد تمام لوگ ہیں ویسے عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں۔ اقتار کے معنیٰ غریبی و تنگدستی کے ہیں۔

٢- معنیٰ حدیث یہ ہیں کہ جس میں یہ صفات پائی جائیں وہ کامل الایمان ہے۔ اوّل یہ کہ اپنے نفس کے ساتھ عدل کرنا۔ فس کے ساتھ عدل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اللہ و رسول کے احکام کے مطابق گزارے۔ یعنی نفس کی خواہشات کو ریا کے بغیر پورا کرے۔ بَذْلُ السَّلَامِ یعنی ہر مسلمان کو سلام کرنا۔ گو عالم کے لفظ میں کافر بھی داخل ہیں حدیث میں کافر کو سلام کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ اس لیے یہاں عالم سے مراد مسلمان ہوں گے۔

٣- باوجود احتیاج و تنگدستی کے خرچ کرنا۔ یعنی مفلسی و محتاجی کے عالم میں مہمان کی تواضع کرنا اور دوسروں کی حتوں کو اپنی حاجت پر مقدم رکھنا۔ یہ احسان و کرم کی انتہا ہے اور مسلمان میں ان صفات کا پایا جانا کامل الایمان ہونے کی علامت ہے۔

نوٹ :- اس عنوان کے ماتحت امام نے حدیث ۱۱ لکھی ہے جو باب اطعام الطعام من الاسلام میں گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمار جلیل القدر صحابی ہیں۔ اسلام کے لیے آپ نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ان کو کفار اسلام لانے کے سخت سے سخت تکلیف دیا کرتے تھے۔ انہیں کے حق میں قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُ… ایک دن کفار نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو آگ میں ڈال دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ کے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور یہ فرماتے تھے۔ يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰى عَمَّارٍ یعنی "اے آگ پر ٹھنڈی ہو جا"۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی (عینی جلد ۱ صفحہ ۲۳۰)

آپ بدر اور اس کے بعد کی تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور حبشہ و مدینہ کی طرف ہجرت کی اور جنگ صفین کے زمانہ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے ساتھ ہو کر شہید ہوئے۔ آپ سے ۶۲ حدیثیں مروی ہیں ان میں تین حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور تین کو بخاری نے اور ایک حدیث مسلم نے منفرداً ذکر کی۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيْرِ وَكُفْرٍ دُوْنَ كُفْرٍ فِيْهِ

یہ باب خاوند کی ناشکری کے بیان میں ہے اور یہ کہ ایک کفر دوسرے کفر سے کم ہوتا ہے

أَبِيْ سَعِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس باب میں حضرت ابو سعید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

کفر کے لغوی معنیٰ اور اس کی قسمیں

لغت میں کفر کے معنیٰ چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ کافر اس کافر کہتے ہیں کہ وہ توحید کو چھپاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپ کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین میں بیج کو چھپاتا ہے۔ کفر کا لفظ دین کے متعلق بولا جاتا ہے اور کفران کا لفظ نعمت کے لیے۔ کفر کے معنیٰ انکار کے بھی آتے ہیں۔ کفر شرک کی ضد ہے اور ایمان کی نقیض ہے۔ نیز کفر کے معنیٰ برأت یعنی کسی سے بیزاری کے اظہار کے بھی آتے ہیں جیسے یہ آیۂ مبارکہ :۔

اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ | میں اس سے بیزار ہوں جو تم نے اس سے قبول شرک

یہ مقولہ شیطان کا ہے جو قرآنِ حکیم نے نقل کیا ہے۔ اس میں کفر کے معنیٰ برأت و بیزاری کے آتے ہیں اور عشیر کا خاوند کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۔ کفر مطلق اللہ و رسول سے کفر کرنا۔ اس کی چار قسمیں ہیں :۔

اول : کفر انکار یعنی زبان و دل سے صراحۃً انکار کر دینا جیسے عام کافر کرتے ہیں۔

دوم : جحود یعنی معرفتِ قلب کے ساتھ زبان سے اقرار نہ کرنا جیسے کفر ابلیس و امیہ بن صلت

سوم : عناد یعنی زبان و دل سے معرفت کے باوجود ایمان کو قبول کرنا جیسے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآ کے زمانہ کے اہلِ کتاب جنہوں نے باوجود اسلام کی حقانیت کے اعتراف کے اسلام قبول نہیں کیا۔

چہارم۔ نفاق یعنی دل سے انکار اور زبان سے اقرار جیسے منافقین۔

یہ چار قسم کے کفر وہ ہیں کہ ایک بھی جس میں ہوگا وہ ابدی جہنمی ہے اور اس کی بخشش نہ ہوگی۔

کفر اور کفرانِ نعمت کے معنیٰ

اس کے بعد کفر کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ صدقِ دل سے ایما کے بعد گناہوں میں مبتلا ہو جانا۔ یہ کفر، کفرانِ نعمت (ناشکری) کے معنیٰ اور یہ کفر وہ نہیں ہے جو ایمان کے مقابل ہے اور جس کے پائے جانے سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس تفصیل سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں کتاب و سنت میں تارکِ صلوٰۃ یا زانی و شرابی وغیرہ ذالک کبائر پر کفر کے لفظ کا اطلاق آیا ہے اور اس سے کفر حقیقی جو ایمان کی ضد ہے مراد نہیں ہے بلکہ وہ کفر مراد ہے کو صرف مجرم قرار دیتا ہے اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

۲۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُرِیْتُ النَّارَ فَاِذَا اَکْثَرُ اَھْلِھَا النِّسَآءُ یَکْفُرُوْنَ قِیْلَ اَیَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ قَالَ یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَیَکْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدٰھُنَّ الدَّھْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَاَیْتُ مِنْکَ

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مجھے دوزخ دکھائی گئی تو میں نے عورتیں زیادہ دیکھیں۔ اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتی ہیں کہا گیا۔ کیا وہ خدا سے کفر کرتی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نہیں) بلکہ خاوندوں کی ناشکری کرتی اور احسان نہیں مانتیں تو اگر ان کے ساتھ ایک زمانہ

خَیْرًا (بخاری)

احسان کرے اور پھر وہ تجھ سے کوئی خلافِ مزاج بات یں تو یہ کہیں کہ میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں پائی۔

ئد و مسائل

۱۔ حدیث زیر بحث کو امام نے باب صلوٰۃ الکسوف۔ بدء الخلق و عشرۃ النساء و کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے ۲۔ احسان قبیح کی ضد ہے۔ دھر کے معنی زمانہ کے ہیں دھور اس کی جمع ہے ے معنی مدت دنیا کے ہیں۔ اس حدیث سے متعدد امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے دوزخ دکھائی گئی جس سے ثابت ہوا کہ دوزخ جو دار العذاب ہے ب بھی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرما دیا ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔

۲۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں تشریف رکھتے ہوئے دوزخ کو ملاحظہ فرمایا جو آپ کی خصوصیات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو پایا جو خاوندوں کی احسان فراموشی کے جرم میں دوزخ میں دکھلائی ۔ معلوم ہوا ناشکری و احسان فراموشی (کفرانِ نعمت) کبیرہ گناہ ہے کیونکہ دوزخ کی سزا ارتکابِ حرام کی صورت میں تی ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کسی کے احسان کا اعتراف کرنا واجب ہے۔

۳۔ یہ بھی واضح ہوا کہ کفر کا اطلاق ناشکری پر بھی آتا ہے۔

۴۔ ناشکریوں میں خاوند کی ناشکری کو بیان فرما کر خاوند کے حق کی عظمت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

۵۔ حضرت ابو سعید کی روایت جس کی طرف امام نے اشارہ کیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یا کرو۔ میں نے جہنم میں عورتوں کو کثرت سے پایا ہے۔ مستورات نے عرض کی۔ حضور (علیہ السلام) اس کا سبب کیا ہے؟ م لعنت بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔

ت کے معنی

لغت میں لعنت کے معنی دوری اور پھینکنے کے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں لعنت کے معنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کے ہیں۔ امام نووی نے فرمایا۔ لعنت کرنا معصیت ہے کبیرہ گناہ ہے حضور لی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

ن الْمُؤْمِنِ كَقَتْلِهٖ

مومن پر لعنت بھیجنا اس کے قتل کر دینے کے برابر ہے

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کو معین کر کے اس پر لعنت کرنا خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان جائز نہیں۔ البتہ جن کا ر نص سے ثابت ہے جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ۔ ان پر لعنت کی جا سکتی ہے۔

بَابُ الْمَعَاصِىْ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ

باب اس امر کے بیان میں کہ جاہلیت کے گناہ کے مرتکب

يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا
ا بِالشِّرْكِ بِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ
ـهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ امْرَؤٌ فِيْكَ

کو کافر نہیں کہا جائیگا۔ جب تک وہ شرک نہ کرے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (ابوذر) سے فرمایا۔ تم ایسے شخص ہو کہ تم میں جاہلیت کی بات پائی

جَاهِلِيَّةٌ (بخاری) | جاتی ہے۔

توضیح فرقہ اباحیہ اور بعض خوارج و روافض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مومنِ عاصی کی بخشش نہیں ہوگی اور وہ ہمیـ جہنم میں رہے گا۔ امام بخاری نے اس باب میں ان کی تردید کی ہے اور نصوصِ شرعیہ سے یہ ثابت کیـ کہ مومنِ عاصی کی بخشش بہرحال ہوگی۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ گناہوں کی سزا میں وہ چند روز کے لیے جہنم میں د جائے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کافروں کی طرح ہمیشہ کے لیے جہنم میں رکھا جائے۔

۲۔ معاصی۔ معصیت کی جمع ہے۔ معصیت عرفِ شرع میں شارع کی مخالفت یعنی واجب کو ترک کرنـ فعلِ حرام کو اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ معصیت کا لفظ کبائر و صغائر چھوٹے بڑے تمام گناہوں کے لیے مقرر ہے ے زمانہ فطرۃ مراد ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو ظہورِ اسلام سے قبل تھا۔ اس زمانہ کو زمانۂ جاہلیت اس لیے کہتے ہیں ک ہیں جہالت کی کثرت تھی۔ لَا يُكَفَّرُ یعنی جو مسلمان افعالِ جاہلیت زنا، شراب، چوری وغیرہ کا مرتکب ہو اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ اِلَّا بِالشِّرْكِ مگر یہ کہ وہ شرک کرے یعنی شرک کے ارتکاب پر کافر ہوگا۔ علامہ نو فرمایا۔ ارتکاب کے لفظ نے یہ بتا دیا کہ جو مسلمان حرام کو حلال جان کر اختیار کریگا وہ کافر ہو جائے گا۔

مومن عاصی کافر نہیں

اس کے ثبوت میں امام بخاری نے ایک حدیث اور دو آیتیں لکھی ہیں۔ حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے۔ انہوں نے ایک بار کسی کو ماں کی گالی دیدی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوذر تم میں جاہلیت کی خصلت پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ گالی دینا گناہ جاہلیت کے اخلاق و عادات سے ہے۔ تو اگر گناہ کا مرتکب کافر ہوجاتا تو حضور علیہ السلام ضرور ابوذر کو کافر قرار دیتے ہوا کہ گناہوں کے ارتکاب سے خواہ وہ صغائر ہوں یا کبائر یا جاہلیت کے اخلاق و عادات سے ہوں آدمی کافر نہیں ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت کے اخلاق و عادات سے صرف کفر و شرک ہی ایسا گناہ ہے جو آدمی کو کافر بنا دیتا ہے جاہلیت سے صرف کفر و شرک ہی مراد لینا سخت غلطی ہے۔

وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِيْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے۔ جسے چا فرما دیتا ہے اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ان میں صلح کراؤ (دیکھو لڑنے والوں کو) اللہ تعالےٰ مسلمان فرمایا۔

یہ دونوں آیتیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ پہلی آیت میں اس امر کا بیان ہے کہ جو کفر پر مرے اس نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیشگی کا عذاب ہے اور جس نے کفر نہ کیا ہو وہ خواہ کتنا ہی گنہگار ہو اور بے توبہ بھی مر جا کے لیے خلود نہیں۔ اس کی مغفرت اللہ تعالےٰ کی مشیت میں ہے چاہے معاف فرمائے یا اس کے گناہوں پر عذ پھر اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے۔ دوسری آیت میں لڑنے والوں کو مومن فرمایا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں سے

ہے۔ معلوم ہوا کہ گناہ کرنے والا کافر نہیں ہے۔

۲ - عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ ذَهَبْتُ
نْصُرَ هٰذَا الرَّجُلَ فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرَةَ
أَيْنَ تُرِيْدُ قُلْتُ أَنْصُرُ هٰذَا
رَّجُلَ قَالَ ارْجِعْ فَإِنِّي سَمِعْتُ
سُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ
لْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ
مَقْتُوْلُ فِي النَّارِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ
الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ إِنَّهُ
حَرِيْصًا عَلٰى قَتْلِ صَاحِبِهٖ (بخاری)

حضرت احنف بن قیس نے کہا کہ میں اس شخص (یعنی حضرت علی) کی مدد کو نکلا تو مجھے ابوبکرہ (نفیع بن حارث بن کلاہ صحابی) ملے۔ انھوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا اس شخص کو مدد کرنے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا لوٹ جاؤ! کیونکہ میں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر بڑھیں تو قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ میں نے عرض کی حضور قاتل تو خیر دوزخی ہوگا مگر مقتول دوزخی کیوں؟ فرمایا مقتول اس لیے کہ وہ اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ئد و مسائل

۱- اس حدیث کو امام نے کتاب الفتن میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ۲- احنف بن قیس قبیلہ بنی تمیم کے رئیس تھے۔ آپ اسلام لانے سے قبل حضور علیہ السلام ت سے مشرف ہوئے ہیں (فتح الباری) جنگ جمل کے موقعہ پر یہ اپنی قوم کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ تعالے الکریم کی مدد کے لیے تیار ہوئے تو اس وقت حضرت ابوبکرہ نے ان کو مذکورہ بالا حدیث سنا کر لڑائی میں شریک ے سے روک دیا ۳- علامہ قاضی عیاض نے فرمایا۔ فالقاتل والمقتول فی النار کا مطلب یہ ہے کہ یہ جرم ہے کہ اس کی سزا جہنم ہے۔ خدا چاہے تو سزا دے چاہے تو معاف فرما دے جیسا کہ دوسری روایتوں میں آیا ہے۔ عفا عنهما۔ وان شاء عاقبهما ۴- یہ حدیث اس قتال پر محمول ہے کہ جو بلا وجہ شرعی ہو یا دیانت کے ساتھ تاویل اجتہاد بنا پر ہو یہی وجہ ہے کہ باغی سے خواہ وہ مسلمان ہی ہو لڑنا جائز ہے۔" رہیں صحابہ کرام کی باہم لڑائیاں جیسے جمل وصفین ن میں فریقین کے آدمی مارے گئے۔ ان پر اس حدیث کو چسپاں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ حضرات مجتہد تھے۔ انھوں نے صیت کا قصد نہیں کیا اور نہ محض دنیاوی مفاد کے لیے لڑے بلکہ ہر ایک ان میں مخلص تھا۔ گو ایک فریق حق پر تھا اور سرا ناحق پر تھا مگر مجتہد کو خطاء اجتہادی پر بھی ثواب ملتا ہے اور مجتہد مصیب دوگنے ثواب کا حقدار ہے۔ اس لیے جرات صحابہ پر اس حدیث کو حمل کرنا سخت درجہ کی نادانی ہے۔ نیز الصحابۃ کلھم عدول کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہم مشاجرات ے متعلق کسی فریق پر طعن نہ کریں۔

ت ابوبکرہ

یہ حضور اکرم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان کا اصلی نام نفیع یا مسروح ہے فضلاً صحابہ میں ان کا شمار ہے۔ بڑے عبادت گزار تھے۔ سنہ ۲۵ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ سے احادیثیں مروی ہیں جن میں ۹ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ۵ کو صرف بخاری نے اور ایک کو صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیا ہے۔

عَنِ الْمَعْرُوْرِ قَالَ لَقِيْتُ أَبَا ذَرٍّ

حضرت معرور کہتے ہیں۔ میں مقام ربذہ میں حضرت ابو

بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَّعَلٰى غُلَامِهٖ حُلَّةٌ فَسَاَلْتُهٗ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنِّيْ سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهٗ بِاُمِّهٖ فَقَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَآ اَبَا ذَرٍّ اَعَيَّرْتَهٗ بِاُمِّهٖ اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَّا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ

سے ملا۔ انھوں نے اور ان کے غلام نے (ایک پہنا ہوا تھا۔ تو میں نے ان سے اس کے متعلق ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا میں نے ایک شخص کو ماں کی گالی دی۔ جس پر حضور صلی اللہ نے فرمایا۔ ابوذر! تم نے ماں کی گالی دی۔ تم ایک آدمی ہو جس میں جاہلیت کی بات پائی گئی۔ خدمت گزار تمہارے بھائی کی طرح ہیں۔ ان کو تمہارے قبضہ میں دیا ہے۔ جو تم کھاؤ ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو، ان کو بھی وہی پہناؤ اور مشقت کا کام نہ دو اور اگر دو تو پھر خود بھی

فوائد و مسائل

(۱) اس حدیث کو امام نے عتق و ادب میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے ایمان و نذور میں اور ابوداؤد حدیث کو روایت کیا ہے ۲۔ ربذہ مدینہ شریف سے تین منزل پر ایک جگہ کا نام ہے۔ سابب گالی دینے کے ہیں۔ حُلّہ دو کپڑوں کو کہتے ہیں ایک تہبند اور ایک کرتا۔ فعیرتہ۔ عاربیں۔ اس کے معنی کے ہیں۔ خولکم۔ خول کا اطلاق لونڈی، غلام، نوکر، ملازم پر آتا ہے۔ خول کے اصل معنی کسی چیز کو سنوا سے رکھنے وغیرہ کے ہیں۔

توضیح

حضرت معرور نے یہ دیکھا کہ حضرت ابوذر اور ان کا غلام دونوں ایک جیسا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ طور پر غلام و آقا کا لباس ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس پر انھوں نے اس کی وجہ پوچھی تو حضرت ابوذ حدیث سنادی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ غلاموں سے اچھا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ جو خو پہناؤ.... الخ

۲۔ حضرت ابوذر نے حضرت بلال کو یہ کہہ دیا تھا "او کالی عورت کے بچے"۔ جس پر حضرت بلال نے شکایت کر دی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں جاہلیت کی یہ خصلت ابتک باقی ہے یعنی اسلام کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔ افضل و اعلیٰ وہ ہے جس میں تقویٰ پایا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر نے در اصل یہ لفظ اس وقت کہے تھے جب کہ آپ کو گالی دینے کی حُرمت کا علم نہ تھا۔ ورنہ ان کا ورع اور تقویٰ، زہد و عبادت مسلم ہے۔ یہی حضور علیہ السلام نے ان کو تنبیہ فرمائی تو حضرت ابوذر نے حضرت بلال سے فرمایا۔ میں اپنا رخسارہ زمین پر رکھتا تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک تم میرے رخساروں کو اپنے قدموں سے نہ روند دو۔ ابن ملقن کہتے ہیں کہ حضرت حضرت ابوذر کے منہ پر رکھ دیا۔ تب جا کر حضرت ابوذر کو تسکین ہوئی۔ (قسطلانی)

ملازموں سے نیک سلوک کا حکم

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ مسلمان کو گالی دینا جائز نہیں۔ اسی طرح غلام، لونڈی کو بھی گالی نہ دی جائے۔ ایسے ہی اپنے ماتحت ملازموں سے بھی نیک سلوک روا رکھا جائے۔ احادیث میں غلام اور لونڈیوں سے سلوک اور نرمی کی بڑی تاکید آئی ہے ۲ ان کو اور اپنے ماتحت ملازموں کو ایسا کام نہ سپرد کیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کوئی مشقت کا کام دیا بھی جائے تو خود بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ۳۔ غلاموں اور ملازموں کو ذلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالے کے نزدیک عزت والا اشرف وہ شخص ہے جس میں تقویٰ پایا جاتا ہے ۴۔ غلام اور لونڈیوں کو لباس و خوراک وہی دیا جائے جو آقا خود کھائے مگر یہ امر استحبابی ہے واجب نہیں مگر اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں کو بالکل ردی خوراک دینا ظلم ہے بلکہ ان کو اپنی حیثیت کے مطابق مناسب غذا دینا واجب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابوذر قابل ذکر ہیں۔ بڑے عابد و زاہد، متقی پرہیزگار صحابی ہیں۔ ان کا اصلی نام جندب یا بریر ہے۔ قبیلہ کنانہ سے ہیں۔ متقدمین سے اسلام لانے والوں میں پانچویں شخص تھے جو اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ اپنے قبیلہ میں واپس چلے گئے۔ بدر و خندق کی لڑائی کے بعد پھر مدینہ میں آگئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں موت تک رہے۔ یہ زہد و تواضع میں مشہور ہیں۔ حدیث میں ان کے زہد کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زہد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان کے زہد و اعراض عن الدنیا کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو اپنی حاجت سے زیادہ روپیہ رکھنا ناجائز ہے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا جس کو جمیع صحابہ کرام نے رد کر دیا۔ ان سے کل ۲۸۱ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۱۲ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہے اور ایک حدیث کو صرف بخاری نے اور ۱۷ حدیثوں کو صرف مسلم نے منفردا ذکر کیا ہے۔ ایک خلق کثیر نے ان سے حدیث روایت کی ہے جن میں حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالے عنہم و تابعین کرام شامل ہیں۔ مقام ربذہ ۳۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے نماز جنازہ پڑھائی۔

بَابُ ظُلْمٍ دُوْنَ ظُلْمٍ

باب اس امر کے بیان میں کہ ایک ظلم دوسرے ظلم سے کم درجہ پر ہوتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اَلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ
اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
لَمْ یَظْلِمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ
الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ "وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی ناحق کی آمیزش نہ کی انہیں کے لیے امن ہے" تو اصحاب نبی علیہ السلام نے کہا۔ ہم میں کون ایسا ہے جو گناہ نہیں کرتا تو پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ بیشک شرک ظلم عظیم ہے۔

کے معنی

ظلم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ یہ لفظ قرآن حکیم میں بھی متعدد معنے میں استعمال ہوا ہے جیسے کفر و عصیان کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ب گزشتہ میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ گناہ پر بھی کفر و شرک کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہر گناہ ایسا نہیں جس کے

ارتکاب سے آدمی کافر ہو جاتے تاوقتیکہ کفر و شرک اسے گناہ کو اختیار نہ کرے۔ تو اسی طرح ظلم کا لفظ بھی متعدد معنے
ہوتا ہے۔ عام گناہوں کو بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور کفر و شرک پر بھی ظلم کا لفظ بولا جاتا ہے ۲۔ لَمْ يَلْبِسُوا الـ
کے معنی (اختلاط) ملانے کے ہیں۔ تو جب یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی کہ وہی لوگ امن میں ہیں جو اپنے ایمان کے ساتھ
ملاتے تو صحابہ کرام نے اس عموم پر محمول سمجھا اور کہنے لگے ہم میں کون ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اس سے گناہ نہیں ہوا۔
آیت نازل ہوئی جس میں یہ بتایا گیا۔ آیہ مذکورہ میں ظلم سے مراد عام گناہ نہیں ہے بلکہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ تو اب
مطلب یہ ہوا کہ امن میں وہی لوگ ہیں جو ایمان لاکر شرک و کفر کا ارتکاب نہیں کرتے۔ فافہم

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مومن کے گناہوں پر بالکل مواخذہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ مرجیہ کا خیال ہے بلکہ مطلب
کہ مومن کافروں کی طرح ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا ۳۔ آیت اور حدیث سے ترجمہ باب نکل آیا کہ ایک گناہ دوسرے

بَابُ عَلَامَةِ الْمُنَافِقِ

اس باب میں منافق کی علامتوں کا بیان ہے

۳۲۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ
فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات
جھوٹ بولے جب وعدہ کرے خلاف کرے
کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

فوائد و مسائل (۱) آیۃ کے معنی علامت کے ہیں۔ آیۃ القرآن کو آیۃ اسی لیے کہتے ہیں کہ کلام ختم ہونے
کذب خلاف واقعہ کو کہتے ہیں۔ کذب کے معنی حق سے انحراف کے بھی آتے ہیں۔ کذب
اؤتمن کے معنی کسی شخص کو امین بنانے کے ہیں۔ خان، خیانت کے معنی شے میں ناجائز تصرف کے ہیں اور اصل لغت
معنی نقص کے ہیں ۲ وعد اور عہد میں فرق یہ ہے کہ وعدہ ایک طرف سے ہوتا ہے اور عہد جانبین سے
اس حدیث کو کتاب الوصایا، ادب اور شہادت میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم و ترمذی و ابوداؤد نے بھی اس حدیث
ہے ۴۔ حدیث ہذا میں منافق کی تین خصلتوں کا ذکر ہے۔ جو قول اور عمل اور نیت سے متعلق ہیں۔ کذب فساد قول ہے
عمل ہے اور عہد شکنی فساد نیت ہے ۵۔ اس پر اجماع ہے کہ اگرچہ یہ امور علامات نفاق ہیں۔ لیکن اس کے
مخلص میں یہ علامات نفاق جمع ہو جائیں تو اس کو کافر یا منافق نہیں کہا جائیگا ۶۔ علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث
کی خصلتوں کا ذکر ہے تو اگر یہ عادتیں مومن صادق میں پائی جائیں تو اس کے متعلق یہ کہا جائیگا کہ اس میں منافق
گئیں۔ لیکن یہ نہیں کہیں گے کہ وہ مومن صادق منافق حقیقی ہو گیا۔

۷۔ علامہ قرطبی نے فرمایا۔ نفاق دو قسم پر ہے۔ عملی اور اعتقادی۔ نفاق اعتقادی یہ ہے کہ آدمی
اظہار کرے اور دل میں کفر کو چھپائے۔ یعنی دل سے اسلام کا منکر و مخالف ہو۔ یہی وہ نفاق ہے جو ذلیل ترین قسم

قرآن حکیم نے کہا - اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ - منافق ہی فاسق ہیں یعنی دین سے خارج ہیں اور نفاقِ عملی جیسے کذب، خیانت، بدعہدی ایسے خصائل تو اس حدیث میں نفاقِ عملی کا بیان ہے کہ جس شخص میں مذکورہ بالا خصلتوں کوئی خصلت پائی گئی تو اس میں نفاقِ عملی پایا گیا - گویا ایک نفاق تو ایمان وعقیدہ کا نفاق ہے جو بدترین قسم کا کفر ہے لیکن کے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا منافقوں والی سیرت ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے مگر وہ عقیدے کا نہیں بلکہ سیرت وکردار نفاق ہے - چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے حضرت حذیفہ سے پوچھا تھا کہ کیا تم مجھ میں نفاق پاتے ہو تو اس سے اُن کی مراد نفاق کے متعلق سوال تھا، اعتقادی کے متعلق نہیں -

بعض شارحین نے یہ کہا کہ حدیثِ ہٰذا کا تعلق زمانہ نبوت کے منافقین سے ہے جو اسلام کے دعوے میں جھوٹے تھے دین خیانت کرتے تھے - جو عہد کرتے اس کو پورا نہ کرتے - چنانچہ حضرت ابن عباس وابن عمر وسعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وحضرت ورباح حسن بصری واکثر شراح حدیث کی یہی رائے ہے اور اس سلسلے میں حضرت سعید بن جبیر سے یہ مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضور علیہ السلام سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا - پھر ارشاد فرمایا کہ یہ جو میں نے فرمایا ہے بات کرے جھوٹ بولے - اس کا بیان اس آیت میں ہے - اِذَا جَآءَ الْمُنَافِقُوْنَ ..... الخ اور یہ جو میں نے فرمایا ہے جب وعدہ کرے اس کا خلاف کرے - اس کا بیان اس آیت میں ہے - وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فضلہ اور یہ جو میں نے فرمایا ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے تو اس کا بیان اس آیت میں ہے - عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ..... الآیہ - تو ہر آدمی دین کا امین ہے اور ظاہر وباطن نماز پڑھتا روزہ رکھتا ہے لیکن منافق صرف ظاہری طور پر نماز پڑھتا ہے تو کیا تمہاری بھی یہی حالت ہے - ہم نے عرض کی نہیں - آپ نے فرمایا :-

اَنْتُمْ مِنْ ذٰلِكَ بَرِیٌّ (عینی ج ۱ ص ۲۵۹) | یہ تمہارے متعلق نہیں ہے تم اس سے بری ہو

تو گویا مطلب حدیث یہ ہوا کہ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے منافقوں کی نشانیاں بتائی ہیں کہ ان کی کذب، عہد شکنی، بدزبانی ایسی بدعادتیں اور خصلتیں تھیں - مزید تفصیل کے لیے عینی وفتح الباری دیکھیے -

ت نفاق

۳۲ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ

(بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - جس میں یہ چار باتیں ہوں گی وہ منافق خالص ہے (یعنی منافقِ عملی ہے) اور جس میں ان خصائل میں سے ایک ہوگی - اس میں ایک خصلت نفاق عملی کی پائی جائے گی - تاآنکہ اس کو ترک کر دے - جب امانت رکھی جائے خیانت کرے - جب بات کرے جھوٹ بولے جب عہد کرے بے وفائی کرے اور جب جھگڑے تو گالی دے -

نفاقِ حقیقی کی تعریف

اما اس حدیث کو امام نے کتاب الجزیہ میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الایمان میں
ہو کہ نفاق دو قسم پر ہے۔ نفاقِ اصلی و حقیقی جس کو نفاقِ اعتقادی بھی کہتے ہیں۔
کہ زبان سے تو اسلام کا اظہار ہو اور دل میں کفر کو چھپایا جائے یعنی آدمی دل سے تو اسلام قبول نہ کرے بلکہ دل سے اس کا مخ
منکر ہو لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے کو مومن ظاہر کرتا ہو جیسا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عبد اللہ بن ابی وغیرہ مش
کا حال تھا کہ یہ لوگ بظاہر کلمہ پڑھتے تھے اور نماز و روزہ کی پابندی بھی کرتے تھے مگر دل سے اسلام کے منکر اور دین کے دشمن تھے۔
ایمان و عقیدے کا نفاق ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے اور اسی کے بارہ میں قرآنِ حکیم نے اعلان کیا ہے۔

۱۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	منافق ہی فاسق ہیں (یعنی دین سے خارج ہیں
۲۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ	تحقیق منافق جہنم کے بدترین گوشہ میں ڈ گے۔

نفاقِ عملی

دوسری قسم نفاقِ عملی ہے جس کا تعلق ایمان و عقیدہ سے نہیں بلکہ عمل و کردار سے ہوتا ہے یعنی نفاقِ عملی وہ ہے ج
عقیدہ میں تو خرابی نہیں ہوتی مگر سیرت و کردار میں نفاق ہوتا ہے اور وہ منافقوں کی سی عادتیں اور خصلتیں
ہے۔ پس نفاقِ اعتقادی کفر کی ذلیل ترین قسم ہے اور نفاقِ عملی معصیت اور گناہِ کبیرہ ہے اور ایک مسلمان کے لیے جیسے یہ ض
وہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ منافقانہ سیرت اور منافقانہ اعمال و اخلاق کی گند
اپنے کو محفوظ رکھے۔

بعض منافقانہ اعمال و افعال

کچھ بری عادتیں اور خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقین کے ساتھ خاص نسبت
ہے۔ اسلام چونکہ سچائی، امانت، دیانت، ایفائے عہد اور حق پسندی ایسے
کرنے کی تاکید کرتا ہے اس لیے کتاب و سنت میں منافقانہ اعمال و کردار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ مسلمان منافقانہ اعمال و ا
اپنے آپ کو بچائیں۔ مثلاً سورۂ توبہ رکوع ۱۳ میں جن منافقانہ اعمال و کردار کا بیان ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ جہاد یعنی اقامتِ دین کی جد و جہد کو ٹھنڈا کر کے گریز کرنا ۲۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کراہت کرنا۔ صراطِ مستق
روکنا اور باطل کی راہوں پر چلنے کا مشورہ دینا ۳۔ نماز کی ادائیگی میں تساہل برتنا ۴۔ دین کے دشمنوں سے مل کر سازشیں کرنا ۵
کو توڑ دینا ۶۔ جھوٹے وعدے کرنا ۷۔ جھوٹی قسمیں کھانا ۸۔ دین کے دشمنوں سے دوستی اور رابطہ قائم کرنا وغیرہ۔ ان سب کو ن
وخصائل قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث میں نفاقِ عملی سے بچنے کے لیے متعدد امور کی نشاندہی کی گئی۔

حدیثِ زیرِ تفہیم میں خصائلِ نفاق میں سے چار کا ذکر فرمایا۔ خیانت، جھوٹ، عہد شکنی، بدزبانی اور ارشاد فرمایا کہ ج
ان میں سے کوئی ایک خصلت ہو اس کو سمجھنا چاہیے کہ اس میں ایک منافقانہ خصلت ہے اور جس میں چاروں خصلتیں ہو
سیرت میں خالص منافقِ عملی ہے۔

۱۔ جھوٹ میں ہر بات داخل ہے جو حق جاننے کے بعد اس کے خلاف کہی جائے اور سنی ہوئی بات بغیر تحقیق
روایت کر دی جائے جیسے وہ تحقیق شدہ ہے۔

۲۔ دوسری علامتِ نفاق "خیانت" ہے۔ اس سلسلہ میں ملحوظ رہنا چاہیئے کہ امانت میں ہر وہ چیز داخل ہے جو کسی مالک کی نیا دوسرے کے قبضہ واختیار میں بغرضِ حفاظت دی جائے اور وہ باوجود اس پر اختیار رکھنے کے مالک کے منشا کے خلاف یا اسکی اجازت یر استعمال کا کوئی حق نہ رکھتا ہو۔ پس جس طرح انسان ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھتے ہیں۔ اسی طرح کچھ امانتیں لتہ بندوں کے پاس رکھی ہیں اور یہ مال و دولت، یہ عقل و فہم یہ جسمانی قوت واختیار وغیرہ یہ سب اللہ ہی کی تو ملکیت ہیں جنہیں اس بندوں کے پاس رکھا ہے اور وہ تمام صورتیں متعین کردی ہیں جن میں ان امانتوں کا استعمال جائز یا ناجائز ہو سکتا ہے۔

بالخصوص مومنین سے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ اس رُو سے اللہ ہی ان کی دولت و و فہم کا مالک ہے۔ پس جس طرح دنیاوی معاملات میں امانت رکھنے والا امانت رکھی ہوئی شے کو مالک کے منشاء کے خلاف استعمال کے خائن بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن اپنے مال، عقل، فہم، صلاحیت و اختیار کو مالک کے منشاء کے خلاف استعمال کے خائنین کی فہرست میں داخل ہوسکتا ہے۔ غرضیکہ خیانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مال میں خیانت ہو یا کسی کے راز کو افشا دیا جائے یا کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو کر ظلم کیا جائے۔ یہ سب خیانت کی صورتیں ہیں۔

تیسری علامت عہد شکنی ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں۔ اول یہ کہ مکروہ تحریمیہ ہے۔ دوم یہ کہ مکروہ تنزیہیہ ہے۔ کما قال ووی۔ لیکن حدیث ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اپنے مسلمان بھائی سے اس نیت کے ساتھ عدہ کیا کہ اس کو پورا کریگا۔ پھر پورا نہ کرسکا تو اس پر گناہ نہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں مسئلہ یہ ہوا کہ وعدہ کرتے وقت عہد شکنی کا م ہو تو یہ ممنوع ہے لیکن صدقِ دل کے ساتھ وعدہ کیا جائے اور اس عزم کے ساتھ عہد کیا جائے کہ پورا کروں گا۔ پھر غفلت یا بھول یا ی مانع کی وجہ سے پورا نہ کرسکا تو اُمید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا۔

چوتھی بدزبانی ہے۔ پھر بدزبانی بھی مومن کے ساتھ ہو تو اس کی قباحت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے جہاں مسلمان بھائی کو کر مسکرانا عبادت ہو۔ وہاں اس کے ساتھ بدزبانی سے پیش آکر اس کا دل دکھانا اس کی بُرائی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اہ خدا میں جہاد

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ (رواہ مسلم)

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا اور نہ کبھی جہاد کی تجویزیں سوچیں اور تمنا کی تو وہ نفاق کی ایک صفت پر مرا۔

مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان کے دعویٰ کے باوجود نہ تو جہاد کیا اور نہ کبھی اس کے دل میں جہاد کا شوق اور اس کی تمنا پیدا ہوئی تو وہ منافق کی زندگی ہے۔ اور جو اس حال میں مرگیا تو نفاق کی ایک صفت کے ساتھ دنیا سے گیا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا۔

از میں سستی

تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى إِذَا اصْفَرَّتْ وَكَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا إِلَّا قَلِيْلًا (رواہ مسلم)

یہ تو منافق کی سی نماز ہے کہ بے پرواہی سے بیٹھا آفتاب دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ زرد ہوگیا تو نماز کے لیے کھڑا ہوگیا (اور چڑیا کی) طرح چار چونچیں مار کر نماز ختم کردی اور اللہ کا ذکر بھی اس میں بہت کم کیا۔

اس حدیث میں یہ بتایا گیا کہ مومن کی شان تو یہ ہے کہ شوق کی بے چینی سے نماز کے وقت کا منتظر رہے اور جب وقـ تو خوشی و مستعدی سے نماز کے لیے کھڑا ہو اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس وقت مجھے مالک الملک کے حضور حاضری نصیب ہے۔ پور اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرے۔ قیام قعود رکوع و سجود میں خوب خوب اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس سے اپنے دل کو شاد یہ تو ہے مومن کے نماز پڑھنے کی شان ——— لیکن منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز کو بوجھ سمجھتا ہے۔ وقت آجانے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً عصر کی نماز کے لیے اس وقت اٹھتا ہے جبکہ سورج بالکل ڈوبنے کے قریب ہو جاتا ہے ا جلدی جلدی چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کر نماز پوری کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی بس برائے نام ہی کرتا ہے۔ پس یہ نماز مناف نماز ہے۔ جو کوئی مسلمان اس سستی و کاہلی سے نماز ادا کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے مومنوں والی نہیں بلکہ منافقوں نماز پڑھی ہے۔

اذان کے بعد مسجد سے نکلنا ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے اور وہ اذان کے بعد خاص ضرورت کے مسجد سے باہر چلا جائے۔

وَهُوَ لَا يُرِيدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ (ابن ماجہ)

اور نماز میں شرکت کے لیے واپسی کا ارادہ بھی نہ رکھ تو وہ منافق ہے۔

مطلب یہ کہ اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکل جانا اور شرکت نماز کے لیے واپسی کا ارادہ نہ رکھنا منافقانہ طرز اور ایسا کرنے والا گو منافق حقیقی تو نہیں مگر منافق عملی ضرور ہے۔ الغرض حدیث میں نفاق عملی کی کثیر مثالیں موجود ہیں چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ہر قسم کے نفاق سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بَابٌ قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب لیلۃ القدر میں قیام ایمان کی علامت

۳۳۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صل علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لیلۃ القدر میں احتساب کے ساتھ قیام فرمایا۔ اس کے گز معاف کر دیئے جائیں گے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصیام میں مکرر ذکر کیا۔ اسی طرح ابوداؤد، نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ۲۔ واضح ہو کہ مقصود ان ابواب کا چونکہ ایمان اور خلاف کا بیان کرنا تھا۔ اس لیے اب پھر امام نے ان امور کے بیان کا سلسلہ جاری فرما دیا جو ایمان کے اثرات و ثمرات ہیں یعنی قیام جہاد، صوم رمضان وغیرہ وغیرہ۔

قیام کے معنیٰ۔ قیام کے معنی ایک تو قیام فی الصلوٰۃ کے ہیں یعنی لیلۃ القدر میں نماز پڑھنا کے مقابل ہے۔ یعنی لیلۃ القدر کو جاگ کر گزارنا خواہ نماز کے ساتھ یا اذکار کے ساتھ۔ قیام سے مراد رات کا قیام ہے یا بعض

شارحین نے اس سے بعض حصہ رات کا قیام مراد لیا ہے لیکن علامہ عینی فرماتے ہیں کہ جب مَنْ یَّصُمْ یومًا کہا جائے تو اس سے بعض یوم کا روزہ مراد نہیں ہوتا۔ اسی طرح مَنْ یَّقُمْ کا لفظ آیا ہے تو یہاں بھی تمام رات کا قیام مراد ہونا چاہیے اور یہ اس لیے بھی کہ "لیلۃ القدر" مَنْ یَّقُمْ کا مفعول واقع ہوا ہے اور مفعول کی شان یہ ہے کہ وہ فاعل کے فعل کو شامل ہوتا ہے لہٰذا قیام کو تمام رات کے ساتھ متصف ہونا چاہیے۔

ایمان واحتساب کے معنیٰ ۔ احادیث میں احتساب کے لفظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے ہر عمل کا مدار ایمان پر ہے اور اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے لیکن نیت مرتبہ علم کا ہے اور احتساب علم الحق کا مرتبہ ہے یعنی احتساب نیت سے بھی اوپر ایک درجہ ہے اور مراد اس سے نیت کا استحضار اور نیت کی زیادتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال شارع نے ذہول ومشقت کے موقع پر کیا ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس کا بچہ مرجائے تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور احتساب کرے۔ اب دیکھئے بچہ کا مرجانا آفتِ سماوی ہے۔ اس میں انسان کے اختیار کو کچھ دخل نہیں ہے اور یہ کہ اس مصیبت کے وقت آدمی کو وہم بھی نہیں ہوتا کہ مجھے ثواب مل سکتا ہے تو یہ ذہول کی جگہ تھی اس لیے شارع نے فرمایا کہ اگرچہ یہ آفتِ سماوی ہے لیکن خلوص نیت کے ساتھ اگر کوئی اس مصیبت پر صبر کرے تو اس کا ثواب مل جائیگا۔

مشقت ومجاہدہ کے موقع پر بھی شارع نے اس کا استعمال فرمایا جیسے قیام لیلۃ القدر میں جب انسان عبادت میں محو ہوجاتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہے تو ایک جہت سے اس کو ذہول ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری یہ عبادت وطاعت ہے اور اس وقت وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس طاعت کی توفیق بھی خدا ہی نے دی ہے تو ایسے موقع پر اس کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ نیت میں زیادتی پیدا کرے اور خلوص کو اور زیادہ بڑھائے تاکہ اجر میں اضافہ ہو

اسی طرح اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا یا نماز کے لیے دور سے چل کر آنا یہ ایسے نیک کام ہیں جن کو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ان کے کرنے کا کیا ثواب ہوگا کیونکہ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ بیوی بچوں پر خرچ کرنا ایک طبعی چیز ہے۔ اس موقع پر بھی احتساب کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کیا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ خلوص ہو۔ چنانچہ حدیث مسند احمد سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ اِذَا اَشْعَرَ بِهٖ قَلْبَهٗ وَحَرَصَ (مسند احمد)	جس نے ایک نیکی کی تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ جب کہ اس کے دل میں اس کا شعور اور حرص ہو (یعنی استحضار نیت)

حدیث ہذا سے واضح ہوا کہ خلوص نیت سے اوپر بھی ایک درجہ ہے جس کو خلوص در خلوص سے تعبیر کیجیے۔ غفر کے معنی چھپانے کے ہیں مغفر اسی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اس سے سر چھپ جاتا ہے اور آدمی تلوار کی ضرب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معنی حدیث یہ ہیں کہ جس نے لیلۃ القدر میں اس کے حق ہونے کے اعتقاد کے ساتھ صرف اللہ عزوجل کی خوشنودی کے لیے عبادت کی تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجائیں گے۔

لیلۃ القدر کے احکام صراحۃً کسی حدیث میں شب قدر کی تاریخ متعین نہیں فرمائی گئی۔ علماء نے فرمایا کہ

اس شب کے اخفاء میں حکمت یہ ہے کہ مسلمان ہر رات اس خیال سے عبادت میں گذاریں کہ شاید یہی رات شب قد
اسی طرح عشرۂ آخر کی راتیں خصوصیت کے ساتھ عبادت و ریاضت تسبیح و تہلیل میں گذاریں۔ البتہ حضور اکرم صلی ال
نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور علی

تحروا لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر من رمضان (بخاری)	شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں تلاش کرو۔

جس سے اتنا معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان مبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آیا کرتی ہے۔ بعض
نے اپنے کشف و علم کے اعتبار سے مختلف تاریخیں بیان کی ہیں مثلاً

سید المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات
سورۂ قدر میں اس کی جانب دو طرح اشارہ فرمایا۔ اوّل یہ کہ سورہ قدر تیس کلموں پر مشتمل ہے۔ ان میں ستائیسواں کلم
ہے جو لیلۃ القدر کی تعبیر ہے۔ دوسرے یہ کہ لیلۃ القدر میں نو حروف مکتوبی ہیں اور لفظ لیلۃ القدر کو سورہ قدر میں تی
بیان فرمایا۔ نو کو تین میں ضرب دینے سے ستائیس حاصل ہوئے۔

ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ وہ رمضان المبارک ہی میں ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر
کی آخری دس تاریخوں میں۔ حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے بالغ ہوا ہوں رمضان میں شب قد
میرا تجربہ ہے کہ اگر پہلی تاریخ رمضان المبارک کی اتوار یا بدھ کو ہوتی ہے تو شب قدر انتیسویں رات کو ہوتی ہے
پیر کو پہلی ہوتی ہے تو اکیسویں شب کو شب قدر ہوتی ہے اور جمعہ یا منگل کی پہلی ہو تو ستائیسویں رات کو شب ق
اور جب جمعرات کی پہلی ہوتی ہے تو پچیسویں کو لیلۃ القدر ہوتی ہے اور جب ہفتہ کی پہلی ہوتی ہے تو تیئیسویں شب
ہوتی ہے ——— مگر ظاہر ہے کہ شب قدر کی تاریخ سے متعلق بزرگوں سے جو کچھ منقول ہے وہ ظن و تخمین کے
ہے۔ کوئی حتمی و قطعی بات نہیں ہے۔ اگر اس مقدس رات کی تلاش میں رمضان کے عشرۂ آخر کی تمام راتوں میں شب بید
تو کچھ عجب نہیں کہ وہ رحمٰن و رحیم خدا اس عشرہ کی برکت سے ہر رات کی عبادت کا ثواب شب قدر کے برابر ہی عطا فرم
واللہ واسع علیم ؎ ہر شب شب قدر است اگر بدانی

اور شب قدر میں عبادت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ احادیث صحاح میں تو ہے کہ رات کو قیام کرو یعنی نوافل
ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ نے عرض کی یارسول اللہ اگر میں شب قدر کو جان لوں تو اس
پڑھوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ وظیفہ پڑھا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ

ویسے بزرگان دین و صلحائے امت سے ذکر اور نوافل کے متعدد طریقے منقول ہیں۔ مثلاً امام ابواللیث رحم
علیہ فرماتے ہیں کہ شب قدر کی نماز تین قسم پر ہے۔ اقل، اوسط، اکثر۔ اقل دو رکعتیں، اوسط
اکثر ایک ہزار رکعت۔ جو قسم چاہے اختیار کرے۔ ہر رکعت میں سورہ الحمد شریف کے بعد سورہ انّا انزلناہ ایک

قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھے اور ہر رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد بارگاہِ رسالت میں ہدیۂ درود پیش کرے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اس شب میں چار رکعت اس طرح ادا کرے کہ ہر رکعت میں سورۃ الحمد شریف کے بعد سورہ الہاکم التکاثر ایک مرتبہ اور سورہ قل ھو اللہ تین مرتبہ پڑھے۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالے وجہہ الکریم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر میں بعد نمازِ عشا سات مرتبہ سورہ اِنَّآ اَنْزَلْنَا پڑھے گا تو اللہ تعالے اس کو بلاؤں سے محفوظ رکھے گا اور ستر ہزار فرشتے اس کے لیے جنّت کی دُعائیں کریں گے اور جو شخص جمعہ کے دن نماز سے پہلے اس کو تین مرتبہ پڑھے گا تو اس کے نامۂ اعمال سے ان لوگوں کی تعداد کے برابر نیکیاں لکھی جائیں گی جنھوں نے اس دن نمازِ جمعہ ادا کی۔ اس سے مقصد ان بزرگانِ دین کا یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس رات میں ذکر الٰہی میں مشغول و مصروف رہے۔ خواہ مذکورہ بالا نماز ادا کرے خواہ درود شریف یا تسبیح یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ یا تہلیل یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا تکبیر یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ یا استغفار یعنی اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ جب تک ممکن ہو پڑھتا رہے۔

۲ - سورہ قدر میں شب قدر کے مندرجہ ذیل خصائص کا بیان ہے۔

ا - اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ بے شک ہم نے اسے شب قدر میں اُتارا یعنی قرآن مجید کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف یکبارگی اس شب میں اُتارا گیا۔

ب - لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی شب قدر میں نیک عمل کرنا ہزار راتوں کے عمل سے بہتر ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اس رات میں ایمان و اخلاص کے ساتھ شب بیداری کی اللہ تعالیٰ اس کے سال بھر کے گناہ بخش دیتا ہے (مسلم شریف) نیز حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمم سابقہ کے ایک صالح شخص کا ذکر فرمایا۔ جو تمام رات عبادت کرتا تھا اور تمام دن جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اس نے ہزار مہینے گزارے تھے۔ مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا۔ اس پر اللہ عزوجل نے حضور علیہ السلام کو شب قدر عطا فرمائی اور یہ آیت نازل کی شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (ابن جریر عن طریق مجاہد) یہ حضور علیہ السلام پر اللہ عزوجل کا کرم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی شب قدر کی ایک رات عبادت میں گزاریں تو ان کا ثواب پچھلی امت کے ہزار ماہ عبادت کرنے والوں سے زیادہ ہو۔

ج - تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا ۔۔۔۔ الخ اس میں فرشتے اور جبریل اُترتے ہیں۔ اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے اور سلامتی ہے صبح چمکنے تک۔ یعنی اس رات زمین پر جو بندہ کھڑا یا بیٹھا عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو تو فرشتے اس کو سلام کرتے ہیں اور اس کے حق میں دُعا و استغفار کرتے ہیں۔ بیہقی کی حدیث میں ہے کہ جب شب قدر ہوتی ہے تو جبریل امین ملائکہ کی جماعت کے ساتھ اُترتے ہیں۔

يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ (بیہقی)

تو ہر قیام وقعود کرنے والے بندے کے لیے جو ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول ہو دُعا کرتے ہیں۔

د - مِنْ كُلِّ اَمْرٍ یعنی اس شب میں سال بھر کے احکام نافذ کیے جاتے ہیں اور ملائکہ کو سال بھر کے وظائف خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔

بَابُ الْجِهَادُ مِنَ الْاِيْمَانِ عَنِ النَّبِيِّ

باب اس امر کے بیان میں کہ جہاد بھی اسلام کے کاموں سے ہے

۳۵۔ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنْتَدَبَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِيْ سَبِيْلِهٖ لَا يُخْرِجُهُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِيْ اَوْ تَصْدِيْقٌ بِرُسُلِيْ اَنْ اَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ اَوْ اُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَلَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ وَلَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالےٰ اس شخص کے لیے جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے اور اس کو مجھ پر ایمان لانے اور تمام پیغمبروں کی تصدیق نے نکالا ہو۔ اس امر کا ذمہ دار ہو گیا ہے کہ یا تو یا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس کرے (جو اس نے پایا) یا اس کو شہید بنا کر جنت میں داخل کر دے۔ اگر اپنی امت پر دشوار نہ سمجھتا تو کسی سریہ سے پیچھے اور میں اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ راہِ خدا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔

فوائد و مسائل

مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ میں اَوْ تردید احد الامرین کے لیے ہے اور معنی یہ ہوں گے اگر شہید ہو گیا تو اس کو اجر و ثواب ملے گا اور زندہ رہا تو اس کو غنیمت ملے گی حالانکہ اصل مسئلہ یہ مجاہد کو ہر صورت میں ثواب ملتا ہے اس لیے علامہ طیبی نے فرمایا کہ اصل عبارت حدیث یوں ہو گی۔ مِنْ اَجْرٍ اَوْ اَجْرٍ وَّغَنِيْمَةٍ کہ مجاہد اگر شہید ہو جائے تو اس کو ثواب ملتا ہے اور اگر زندہ رہے تو ثواب ساتھ اس کو مالِ غنیمت بھی ملتا ہے۔ گویا مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِيْمَةٍ کا لفظ محض اختصار کے لیے فرمایا گیا اور سامع پر کیا گیا ہے کہ وہ اصل مفہوم کو خود سمجھ لے گا۔ فافہم

مجاہد کو بہر صورت ثواب ملتا ہے

الجہاد من الایمان کے معنی یہ ہیں کہ جہاد بھی ایمان کی نشانی ہے اللہ کے معنی دعا کی قبولیت کے ہیں گویا جب ایک مسلمان جہاد فی سبیل کے لیے نکلتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کے جہاد کو قبول فرما کر ثواب جزیل عطا فرماتا ہے۔

سریہ۔ لشکر کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔ خیر السرایا اربعۃ مائۃ رجل یعنی بہترین سریہ ہیں چار سو فوجی ہوں واقعدت خلف سریۃ حضور علیہ السلام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری آرزو تو یہی کہ ہر جہاد میں شریک ہوں مگر امت پر شفقت کی وجہ سے بعض سرایا میں شرکت نہیں فرماتا کیونکہ میری وجہ سے جہاد میں شریک ہونا پڑتا ہے۔

اس حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت کا اظہار فرمایا گیا ہے اور یہ کہ جہاد کی تمنا کرنا، شہادت فی سبیل اللہ کی رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ اسی لیے فرمایا:-

نیۃ المؤمن ابلغ من عملہ | مومن کا کسی نیک کام کرنے کی نیت کرنا اس کے عمل

ایماناً و احتساباً کی قید لگا کر یہ بتا دیا گیا کہ جہاد فی سبیل اللہ صرف یہ ہے کہ آدمی خلوصِ نیت کے ساتھ محض اللہ کی بلندی کے لیے جہاد کرے اور اس میں کوئی دنیاوی غرض نہ ہو۔

مسائل حدیث جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ فرضِ عین نہیں ہے۔ جب دو مصلحتیں متعارض ہوں تو اہم کو اختیار کرنا چاہیے اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض سریوں میں اس لیے شمولیت نہیں فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ ب کو شامل ہونا پڑتا ۲۔ جنت میں تو بہرحال تمام مسلمان داخل کئے جائیں گے لیکن شہید کو خصوصیت کے ساتھ حق اس فرمایا کہ وہ بلا حساب کتاب سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ شہادت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی جیسا کہ مسلم ریف کی حدیث میں ہے کہ شہادت تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے مگر قرض کا نہیں یا یہ کہ مجاہد کی دو حالتیں ہوتی ہیں ادت اور سلامت۔ شہادت کا ثواب جنت ہے اور سلامتی کی صورت میں اس کو غنیمت ملتی ہے اور لفظ او بیان اس کی میں ہے کہ جو شخص جہاد میں سلامت رہے تو اس کو ثواب ملے گا یا غنیمت ملے گی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غنیمت بھی ملے اور اب بھی یعنی لفظ او امتناع الخلو مع امکان الجمع کے لیے ہو (عینی) ۳۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الجہاد میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم سائی نے بھی کتاب الجہاد میں ذکر فرمایا ہے۔

بَابٌ تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيْمَانِ

باب رمضان کی راتوں میں نفل پڑھنا ایمان کی خصلت ہے

۳۹۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا
غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رمضان میں قیام کیا ایمان اور خلوصِ نیت کے ساتھ تو اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے

یہ گناہوں کی مغفرت اس شخص کے ہے جو رمضان کے مہینہ کے تمام روزے رکھے۔ کیونکہ جو رمضان کا ایک روزہ رکھ اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے رمضان کے روزے رکھے ہیں۔ یہ خوشخبری اس شخص کے لیے بھی ہے جو بوجہ عذر رعی رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھ سکا۔ لیکن نیت اس کی یہی ہے کہ جب بھی اللہ تعالےٰ نے اس کو شفا دی و رور چھوڑے ہوئے روزے رکھے گا۔ کیونکہ وہ مریض جو مرض کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے ثواب مل جاتا ہے (واللہ واسع علیم)

بَابٌ الدِّيْنُ يُسْرٌ

باب دین آسان ہے

قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَى اللّٰهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ

حضور صلی اللہ علیہ نے فرمایا اللہ کو وہ دین پسند ہے جو حنیف اور سمح ہو۔ (بخاری)

فوائد و مسائل احب الدین کلام اضافی مبتدا ہے اور حنیفہ اس کی خبر ہے۔ حنیف کے معنی باطل سے حق کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حنیف اسی لیے کہتے ہیں آپ نے باطل

ے حق کی طرف میل فرمایا۔ ملت حنیفیہ سے ملت ابراہیمی مراد ہے جو آیہ مبارکہ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا سے ماخوذ
کے معنی آسان کے ہیں۔ مِلَّةً سَمْحَةً یعنی وہ دین جس میں حرج نہ ہو اور جس کے احکام پر چلنا انسان کے اختیار
علامہ عینی فرماتے ہیں۔ احب بمعنی محبوب ہے اور اگر الف لام جنسی مانا جائے تو تقدیر عبارت یہ ہوگی۔ اَحَبُّ الْاَدْ
اِلَى اللّٰهِ الخ اور ادیان سے شرائع ماضیہ مراد ہوں گی تو اب اَحَبُّ الدِّيْنِ کے معنی یہ ہوں گے کہ گزشتہ شریعتوں میں ان
نسخ وتبدیل سے قبل دینِ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اگر الف لام عہدی لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کو تمام
دینِ اسلام محبوب ہیں یعنی دینِ اسلام کے تمام کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں مگر ان میں وہ کام تو بہت پسند ہیں جو آسان

۲۔ واضح ہو کہ قرآن نے یہودیت ونصرانیت کو حنیفیہ کا مقابل ٹھہرا دیا ہے چنانچہ فرمایا:

قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا
قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا
(قرآن حکیم)

انھوں نے کہا یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا
تم کہو نہیں بلکہ ملت ابراہیم حنیف کو اختیار کرو تو
پاؤ گے)

قرآن نے محرف عیسائیت ونصرانیت کی مذمت کی ہے

اس موقع پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ تور
ماننے والے یہودی کہلاتے ہیں ا
کو ماننے والے نصرانی۔ یہ دونوں کتابیں آسمانی ہیں وحی الٰہی ہیں تو پھر قرآن نے یہودیت ونصرانیت کی مذمت کیوں کی ہے
کے مقابل دینِ حنیف اسلام کو قبول کرنے کی تاکید کی ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہود نے توریت میں اور نصاریٰ نے انجیل میں تغیر وتبد
تھا۔ اس کے احکام میں کتربیونت کر دی تھی۔ اس لحاظ سے یہودیت ونصرانیت نام ہے توریت محرف اور انجیل محرف
متبعین کا اور قرآن شریف نے اسی مسخ شدہ نصرانیت ویہودیت کی مذمت فرمائی ہے۔ توریت وانجیل میں حضور سید عالم
علیہ وسلم کا ذکر پاک، آپ کی تشریف آوری، آپ کی نبوت ورسالت کا ذکر تھا اور یہ ہدایت بھی موجود تھی کہ جب وہ آخری
علیہ السلام تشریف لے آئیں تو ان پر ایمان لے آنا اور ان کی شریعت کو قبول کر لینا لیکن یہود ونصاریٰ نے نہ صرف ان
کو ان کتابوں سے خارج کر دیا بلکہ ان کتب میں مسطور احکام کو بھی بدل دیا اور اب یہ لوگ نرے توریت محرف اور انجیل محرف
متبع رہ گئے۔ قرآن نے ایسی محرف دین کی مذمت فرمائی ہے اور پھر اس حقیقت کا اعلان بھی کیا کہ یہ تمام انبیا۔ اس دین
اسلام کے پیرو تھے اور اسی کی تبلیغ فرماتے تھے۔

۳۸۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَّلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ
اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَ
اَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ
وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ
نے فرمایا بیشک دینِ اسلام آسان دین ہے اور جو
میں سختی کرے گا تو یہ اس پر غالب آجائے گا تو میا
اختیار کرو اور نزدیک رہو اور ثواب کی بشارت د
اور غدوہ، روحہ اور دلجے سے مدد لو۔

فوائد ومسائل حدیث

۱۔ امام نے اس حدیث کو کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے بھی اس کو ر

۲۔ یشاد، مشادہ۔ اس کے معنی مبالغہ یعنی ایک دوسرے پر غالب آنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ اس قدر غلو اور زیادتی نہ کی جائے کہ آدمی پر بوجھ بن جائے اور اس طرح وہ اعمالِ صالحہ جاری نہ رکھ سکیں۔ فسددوا، سدید کے معنی میانہ روی کے ہیں یعنی صحیح طریقہ پر کسی کام کا کرنا اور عبارت میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ افراط و تفریط سے بچا جائے۔ ربوا کے معنی یہ ہیں کہ آخری حد تک نہ جاؤ بلکہ وسط کو اختیار کرو وابشروا کے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر جو ثواب مقرر ہے اگرچہ کم ہی اس کی لوگوں کو بشارت دو۔ غدوہ صبح کے وقت چلنا۔ روحہ شام کے وقت چلنا۔ دلجہ رات کے آخری حصہ میں کو کہتے ہیں۔ تو جیسے مسافر اگر کچھ صبح کے وقت چلے پھر شام کو پھر سحر کے وقت چلے تو ایسی معتدل رفتار سے وہ اپنا سفر بھی آسانی سے پورا کرے گا اور منزل پر بھی پہنچ جائیگا۔ برخلاف اس مسافر کے جو دن رات چلنا شروع کردے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ تھک کر بیٹھ جائیگا نہ اس کا سفر پورا ہوگا اور نہ اس کو منزل ہاتھ آئیگا۔ یہی حال عبادات کا ہے۔ اس کو میانہ روی کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔

مفہوم حدیث یہ ہے کہ جو فرائض و واجبات اللہ تعالے نے مقرر فرمادیے ہیں وہ تو بہرصورت ادا کرنے ہی ہیں لیکن اس سے زائد عبادات اور نیک کام کوئی شخص کرنا چاہے تو اس میں شدت و سختی کو اختیار نہ کرے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بوجھ بن جائیگا اور زیادہ عمل کے شوق میں کم سے بھی دستبردار ہونا پڑیگا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ نیک کاموں کے کرنے میں میانہ روی اختیار کرے تاکہ وہ جاری رہیں۔ اللہ تعالے کا حق بھی ادا کرے اور بندوں کے حقوق کا بھی خیال رکھے۔ اسی لیے دوسری حدیث میں فرمایا۔ کلفوا من العمل ما تطیقون نیک کام اتنے ہی کرو جس کی تم میں طاقت ہو اور ہدایت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے جس کے لفظ یہ ہیں۔ احب الدین الی اللہ دومہ جو آگے آرہی ہے۔

وضیح

اس موقع پر یہ کہنا کہ حدیثیں دو ہیں۔ ایک وہ جس کو امام بخاری نے عنوان کے طور پر ذکر کیا ہے۔ جس کے لفظ یہ ہیں احب الدین الی اللہ الحنیفۃ السمحۃ اور دوسری حدیث وہ ہے جو الدین یسر سے شروع ہوتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ دوسری حدیث کا ترجمۃ الباب والی حدیث سے تعلق نہیں ہونا چاہیے اور دونوں کا مفہوم و معنی جدا جدا ہے۔ احب الدین میں الف لام جنسی ہے اور احب اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی حدیث یہ ہیں کہ تمام شرائع سابقہ میں ان سے قبل اللہ تعالے کو سب سے زیادہ دینِ حنیف اسلام ہی پسند ہے اور دوسری حدیث الدین یسر میں الف عہدی ہے اور اس سے مراد صرف دینِ اسلام ہے اور معنی حدیث یہ ہیں کہ دینِ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے احکام کی وسعت و اختیار کے مطابق ہیں۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو انسان کی قدرت سے باہر ہو۔ لہذا جب بات یہ ہے میں سختی نہیں کرنی چاہیے اور جس امر میں شارع نے رخصت دی ہے۔ اس کو قبول کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر بوجہ مرض کھڑے ہو نہیں پڑھی جاسکتی تو بیٹھ کر پڑھ لینی چاہیے۔ یہ نہ کیا جائے کہ چاہے مرض زیادہ ہو۔ تکلیف انتہا کو پہنچ جائے۔ پھر بھی کھڑے نماز پڑھی جائے۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا۔ لن یشاد الدین جو شخص شارع کی دی ہوئی رخصت سے کام نہیں لیتا میں سختی کرتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ احکام شریعت اس پر بار ہوجائیں گے۔

بَابُ الصَّلٰوةِ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب نماز بھی ایمان سے ہے

وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ
اِيْمَانَكُمْ يَعْنِيْ صَلٰوتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ
(بخاری)

اور اللہ عزوجل نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان
کرنے والا نہیں۔ ایمان سے مراد وہ نماز ہے جو بیت
پاس اور بیت المقدس کی طرف پڑھی جاہے

۱۔ نماز بھی ایمان ہے۔ یعنی نماز دینِ اسلام کا ایک رکنِ عظیم ہے۔ آیت میں جو نماز پر ایمان کا اطلاق آیا ہے
یہ ہے کہ نماز ایمان کا شعبہ اور اس کی نشانی ہے ۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کعبہ ابراہیمی
ہوگیا تو سوال ہوا کہ جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ان کی نمازوں کا کیا ہوا؟ جواب میں یہ آیہ مبارکہ
جس میں بتایا گیا کہ ان کی نمازیں بھی ضائع نہیں ہوئیں؛

قیامِ مکہ کے دوران قبلہ کس سمت تھا؟

اس میں اختلاف ہے کہ مکہ کے قیام کے دوران حضور
علیہ وسلم نماز کس طرف پڑھتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ
دوران بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی۔ پھر جب آپ مدینہ ہجرت کرکے تشریف لائے تو کعبہ ابراہیمی ہمیش
قبلہ مقرر ہوگیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قیامِ مکہ میں کعبہ کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی۔ پھر جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ آگئے
کی طرف نماز پڑھی گئی۔ اس کے بعد کعبہ ابراہیمی مقرر ہوا۔ علماء فرماتے ہیں۔ یہ دوسرا قول ضعیف ہے۔ نیز اس قول
دوبارہ نسخِ قبلہ لازم آتا ہے۔ لہٰذا صحیح قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قیامِ مکہ کے دو
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے مگر کعبہ ابراہیمی کی طرف پیٹھ نہیں کرتے تھے بلکہ کعبہ
اور بیت المقدس کے بیچ میں کر لیتے تھے۔ امام بخاری نے عند البیت کہہ کر اسی قول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ معنی یہ
کعبہ ابراہیمی کے پاس اور بیت المقدس کی طرف تھیں اور امام بخاری کا عند البیت پر اکتفا فرمانا اس لیے اولیٰ ہے
یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نماز جو بیت اللہ کے پاس اور بیت المقدس کی طرف تھی ضائع نہ ہوئی تو وہ بطریقِ او
ہوں گی جو بیت اللہ سے دور اور اس کی طرف پڑھی جائیں۔ تقدیرِ عبارت یوں ہوگی۔

صَلٰوتُكُمُ الَّتِيْ صَلَّيْتُمُوْهَا اِلٰى
بَيْتِ الْمَقْدِسِ عِنْدَ الْبَيْتِ اَيِ الْكَعْبَةِ (عینی جلد ص ۲۴۹)

وہ نمازیں جو بیت اللہ (کعبہ) کے پاس او
کی طرف پڑھی گئیں ضائع نہیں ہوئیں۔

تحویلِ قبلہ کی حکمت

واضح ہو تحویلِ قبلہ میں متعدد حکمتیں تھیں۔ لیکن قرآن نے اس کی تین حکمتیں بڑی
بیان کی ہیں۔ پہلی حکمت قرآن نے یہ بیان کی کہ اللہ تعالیٰ حاکمِ مطلق ہے اور
یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کو بجا لائے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے قبلہ بدل دیا تو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش؟ دوسری
بتائی کہ قبلہ میں تبدیلی اس وجہ سے بھی ہوئی تاکہ مومن و کافر میں فرق ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ کون رسول کری
علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے اور کون نہیں کرتا جس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے اتباعِ نبوی کے عقیدہ کو کفر و

ایت ہے یعنی جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اطاعت کو ضروری جانتے ہیں اور حضور علیہ السلام کے اقوال و ال کی پابندی کو اسلام سمجھتے ہیں وہی مومن ہیں اور جن کا عقیدہ یہ نہیں ہے وہ کافر و منافق ہیں۔ تیسری حکمت قرآن شریف نے ئی کہ تحویلِ قبلہ سے نبوت کی عظمت اور حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کا اظہار مقصود ہے کہ یہ وہ ہستی مقدس ہیں جن ضا جوئی اللہ عزوجل کو مطلوب ہے۔ یہ تینوں حکمتیں قرآن نے واضح لفظوں میں بیان کی ہیں۔

۱۔ سیقول السفہاء من الناس ما ولّٰھم الخ اس آیت میں تحویلِ قبلہ پر نکتہ چینیاں کرنے والوں کو بتایا ہے کہ تمہاری یہ نکتہ چینی بے وقوفی ہے کیونکہ اللہ عزوجل حاکم مختار ہے جسے چاہے قبلہ بنائے کسی کو کیا جائے اعتراض ہے ے کا کام فرمانبرداری ہے۔

۲۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا الخ اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ تحویلِ قبلہ کی حکمت یہ ہے کہ کافر و مومن میں ز ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ کونسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور کون اتباعِ نبوی سے انکار کرتا ہے۔ ی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا اعتقاد رکھے وہ مومن ہے اور جو اتباعِ نبوی کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ چنانچہ یسا ہی ہوا۔ جو مومن تھے انہوں نے حضور علیہ السلام کا اتباع کیا اور کفار و مشرکین و منافقین نے اتباع کی بجائے اعتراضات روع کردیئے۔

۳۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ الخ اس میں یہ بتایا گیا کہ کعبہ ابراہیمی کو قبلہ اس لیے مقرر کیا کہ ہمارے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قبلہ بنائے جانے کو پسند فرماتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے محبوب رسول رضی پوری کردی اور کعبہ ابراہیمی کو قبلہ بنادیا تاکہ محبوب کی مرضی پوری ہو۔

یاد رہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی اپنی مرضی کا اظہار زبان سے نہیں فرمایا تھا بلکہ صرف قلبِ مبارک میں یال پیدا ہوا کہ کعبہ ابراہیمی قبلہ ہوجائے اور اللہ عزوجل نے فرمایا۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔ ہم تمہیں پھیر ے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے۔ پھر مسجد حرام کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا وحیث ما کنتم فولوا جوھکم شطرہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف (کعبہ کی طرف) کرو۔ کیونکہ اسی میں میرے محبوب ل کی خوشی ہے اور اس کی خوشی میری خوشی ہے۔

۳۹ - عَنِ الْبَرَآءِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ يْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ لَ عَلٰى اَجْدَادِهٖ اَوْ قَالَ اَخْوَالِهٖ مِنَ الْاَنْصَارِ نَّهٗ صَلّٰى قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ شَرَ شَهْرًا اَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا وَّ ن يُعْجِبُهٗ اَنْ تَكُوْنَ قِبْلَتُهٗ قِبَلَ الْبَيْتِ نَّهٗ صَلّٰى اَوَّلَ صَلٰوةٍ صَلَّاهَا صَلٰوةَ الْعَصْرِ

حضرت براء سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے پہل مدینہ تشریف لائے تو آپ نے انصار میں سے اپنے ننہیال یا ماموؤں کے ہاں قیام فرمایا اور حضور علیہ السلام نے نماز پڑھی۔ سترہ مہینہ یا سولہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہو اور سب سے پہلی نماز جو آپ نے کعبہ ابراہیمی کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی جو آپ کے ساتھیوں نے بھی آپ کے ساتھ پڑھی

وَصَلَّى مَعَهٗ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِّمَّنْ صَلّٰى مَعَهٗ فَمَرَّ عَلٰى اَهْلِ مَسْجِدٍ وَّهُمْ رَاكِعُوْنَ فَقَالَ اَشْهَدُ بِاللهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ مَكَّةَ فَدَارُوْا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ وَكَانَتِ الْيَهُوْدُ قَدْ اَعْجَبَهُمْ اِذْ كَانَ يُصَلِّيْ قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَاَهْلُ الْكِتٰبِ فَلَمَّا وَلّٰى وَجْهَهٗ قِبَلَ الْبَيْتِ اَنْكَرُوْا ذٰلِكَ قَالَ زُهَيْرٌ حَدَّثَنَا اَبُوْ اِسْحٰقَ عَنِ الْبَرَآءِ فِيْ حَدِيْثِهٖ هٰذَا اَنَّهٗ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ اَنْ تُحَوَّلَ رِجَالٌ وَّقُتِلُوْا فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُوْلُ فِيْهِمْ فَاَنْزَلَ اللهُ تَعَالٰى (بخاری)

تو ان میں سے ایک شخص ایک مسجد پر گزرے (جس میں بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ رہے تھے وہ رکوع میں تھے) تو انہوں نے کہا خدا کی قسم میں صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کرکے پڑھی ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے نماز ہی میں کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کر لیا اور حضور علیہ السلام کا بی کی طرف نماز پڑھنا یہود و نصاریٰ کو بھی پسند تھا آپ نے قبلہ ابراہیمی کو قبلہ بنالیا تو یہود اہل کتاب ہوا۔ زہیر نے کہا ہم نے حدیث بیان کی۔ ابو اسحا انہوں نے براء سے سنا کہ تحویل قبلہ سے بیشتر کچھ لو پا گئے اور شہید ہو گئے تھے تو ہم نہیں جانتے تھے حق میں کیا کہیں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے تفسیر اور صلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مسلم، ترمذی و نسائی تفسیر اور صلوٰۃ کے باب میں اس حدیث کو درج کیا ہے۔ ۲۔ یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ کوئی خفا نہیں تھا کسی کام کو اس کے منسوخ ہونے سے قبل کیا جائے تو وہ مقبول ہے۔ پھر صحابہ کرام نے یہ سوال جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ان کا کیا حکم ہے جواب یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ اسلام میں سب سے پہ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام اس مسئلے سے واقف نہ تھے۔ اس لیے انہوں کیا ۳۔ قیامِ مکہ کے دوران حضور علیہ السلام بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے۔

۔ پھر جب آپ مدینہ شریف ہجرت فرما کر تشریف لے آئے تو آپ کی حسبِ خواہش کعبہ ابراہیمی

کعبہ ابراہیمی قبلہ

۴۔ سب سے پہلی نماز جو آپ نے کعبہ ابراہیمی کی طرف مکمل طور پر پڑھی۔ وہ عصر کی نماز تھی جو مسجد نبوی میں پڑھی گئی کی روایات میں جو آیا ہے کہ سب سے پہلی نماز کعبہ ابراہیمی کی طرف ظہر پڑھی گئی۔ لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ آپ نے رکعتیں ہی پڑھی تھیں کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آگیا اور آپ نے نماز ہی میں کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کر لیا۔ گویا ظہر کی نماز کی بیت المقدس کی طرف اور دو رکعتیں کعبہ ابراہیمی کی طرف پڑھی گئیں۔ وہ ظہر کی نماز تھی (بیضاوی شریف)

دو قبلوں والی مسجد "مسجد بنی سلمہ" تھی (کما فی البیضاوی)

۲۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ احکام میں نسخ کا جواز ثابت ہوا ۲۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن حکیم سے سنت کا نسخ ہو سکتا ہے ۳۔ یہ ہوا کہ نماز میں کعبہ ابراہیمی کی طرف منہ کرنا ضروری ہے ۴۔ یہ کہ خبرِ واحد واجب العمل ہے۔ چنانچہ عبادہ بن صا

صحابہ کرام نے اعتماد کیا اور جب انھوں نے کہا کہ میں حضور علیہ السلام کے ساتھ کعبہ ابراہیمی کی طرف نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔ تو وہ نماز ہی میں کعبہ ابراہیمی کی طرف پھر گئے۔ خبر واحد کے مقبول ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کو کسی قبیلہ کی طرف احکامِ اسلامیہ کی تبلیغ کے لیے روانہ فرماتے تھے اور لوگ صرف ایک مبلّغ سے احکام اسلامیہ سُن کر اس پر عمل کرتے تھے ۵۔ یہ کہ اگر نماز میں یہ معلوم ہو جائے کہ قبلہ دوسری طرف ہے تو اسی طرف پھر جانا چاہیئے ۶۔ یہ کہ اگر قبلہ معلوم نہ ہو تو پھر انسان خود اپنے دل سے فیصلہ کرے اور جدھر دل جم جائے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے۔ پھر اگر نماز کے بعد غلطی معلوم ہو جائے تو نماز کے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ۷۔ یہ کہ قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں اگر اجتہاد کی بنا پر چاروں سمتوں کی طرف بھی نماز پڑھی تو وہ ہو گئی۔ اس لیے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ۸۔ اسی حدیث سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے فضل و شرف اور آپ کے مرتبہ و مقام پر روشنی پڑتی ہے کہ ابھی آپ نے اپنی خواہش کا زبان سے اظہار نہ فرمایا تھا کہ اللہ عزوجل نے آپ کی خواہش کو پورا کر دیا اور کعبہ ابراہیمی کو حضور علیہ السلام کی رضا جوئی کے لیے ہمیشہ کے لیے قبلہ مقرر فرما دیا ۹۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھیں اور وہ وفات بھی پا چکے ان کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟ تو اس پر آیہ مذکورہ بالا نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ ان کی نمازیں مقبول ہیں۔ یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ سوال میں صرف اموات کو کیوں خاص کیا گیا۔ حالانکہ یہ سوال زندہ و مردہ سب کے ساتھ متعلق ہے۔ جواب اس کا مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگرچہ اس سوال کا تعلق زندہ و مردہ دونوں سے ہے۔ مگر اموات کے متعلق شاید اس خیال سے کیا گیا کہ وہ اب مکلف نہیں رہے اور جو نمازیں انھوں نے بیت المقدس کی طرف پڑھیں اگر وہ نامقبول ہوئیں تو اس کی تلافی اب ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف زندوں کے کہ وہ نمازوں کا اعادہ کر کے بھی اس کی تلافی کر سکتے تھے اس لیے صرف اموات کے لیے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سوال اُٹھا۔

حضرت براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس نام کا صحابہ میں اور کوئی ان کے سوا نہیں آیا۔ آپ جلیل القدر صحابی ہیں۔ خندق اور اس کے بعد کے تمام مشاہد میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ رہے۔ آپ نے ۲۴ھ میں رے کو فتح کیا اور حضرت ابوموسیٰ کے ہمراہ غزوہ تستر میں شریک ہوئے۔ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ہمراہ بھی مشاہد میں شریک ہوئے۔ آپ نے کوفہ میں بزمانہ مصعب بن زبیر وصال فرمایا۔ آپ سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔ آپ کے والد عازب بھی صحابی ہیں۔ آپ سے ۳۰۵ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۲۲ حدیثوں پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور ۱۵ حدیثیں صرف بخاری نے اور ۱۲ حدیثوں کو صرف مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔

بَابُ حُسْنِ الْاِسْلَامِ الْمَرْءِ

باب اسلام کے حُسن کے بیان میں

۴۰۔ اَنَّ اَبَا سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیَّ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ یُكَفِّرُ اللّٰهُ كُلَّ سَیِّئَةٍ

ابوسعید خدری نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جب آدمی اسلام قبول کرے اور پھر اس کا اسلام اچھا ہو (یعنی وہ احکام اسلامیہ پر عمل کرے) تو ہر وہ گناہ جو اسلام سے قبل اس نے کیے اللہ تعالےٰ معاف

كَانَ زَلَفَهَا وَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ
الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى
سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا
اِلَّا اَنْ يَّتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا (بخاری)

فرمادے گا۔ اس کے بعد حساب شروع ہوگا۔ ایک
کے بدلے دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ سات سو
بلکہ اس سے بھی دوچند اور ایک برائی کے بدلے ایک
لکھی جائے گی الا یہ کہ اللہ تعالے اپنے فضل سے
کو بھی معاف فرمادے (یعنی جو گناہ اللہ تعالے معاف فرمادے وہ لکھا ہی نہ جائیگا)

لُغاتِ حدیث

فحسن اسلامہ۔ حسن اسلام کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ظاہراً و باطناً ہر طرح اسلام ک
یعنی حقیقی معنوں میں مسلمان ہوگیا یا اس کے معنی وہ ہیں جو حدیث جبریل میں آئے ہیں۔ الاح
تعبد اللہ کانک تراہ۔ احسان یہ ہے کہ تو خدا کو اس تصور سے پوجے کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ جس
یہ ہے کہ عبادات وطاعات میں انتہائی خلوص ہو اور احکام شرعیہ پر کاربند ہوجائے۔ یکفر اللہ تکفیر کے معنی
ہیں یعنی گناہوں کو مٹا دینا اور اس کی جگہ ثواب عطا فرمانا۔ کان زلفا۔ زلف کے معنی تقدیم کے ہیں۔ معنی یہ
گناہ اس نے اسلام لانے سے پہلے کیے۔ القصاص کے معنی شے کا مقابلہ شے کے ساتھ۔ یعنی ہر عمل کی جزا دی
اچھے ہوں گے تو ثواب دیا جائیگا۔ برے ہوں گے تو اس کے مقابل میں عذاب ہوگا۔ جوہری نے کہا کہ ضعف کے معنی
ضعف الشیء مثلہ لیکن ازہری کہتے ہیں ضعف کے معنی کم از کم دگنے کے ہیں اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن
چارگنا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں آیا۔ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا۔ یہاں ضعف سے
ہے تو معلوم ہوا کہ کم از کم ضعف کے معنی دگنے کے ہیں اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

مسائل حدیث

حدیث ہذا سے ذیل کے مسائل پر روشنی پڑتی ہے ۱۔ اسلام لانے کے بعد گذشتہ گناہ معا
ہیں ۲۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا ۳۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ گناہ کی سزا
فرمادے ۴۔ مومن سے اگر گناہ ہوجائے تو اس کے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی گناہ لکھا جائیگا۔ الا یہ کہ گناہ اللہ
فضل سے معاف فرمادے ۵۔ مومن جب ایک نیکی کرے گا تو اس کے نامہ اعمال میں ۱۰ سے لے کر ۷۰۰ تک نیکیاں
بلکہ اس کا بھی دگنا ثواب عطا کیا جائیگا۔

ایک نیکی کا اجر دس گنا ملتا ہے

یہ بات قرآن حکیم کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشا
جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ جو اللہ تع
ایک نیکی لے کر آئیگا اس کے لیے ۱۰ گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئیگا تو اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائیگا جتنا ک
ہے (سورہ انعام) سورہ نساء میں فرمایا۔ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْ
اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ تعالے اسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ ظاہ
کوئی خاص نیکی مراد نہیں بلکہ اس کو مطلق رکھا گیا ہے کہ کم سے کم درجہ کی نیکی کا ثواب بھی اللہ تعالے اپنے فضل
فرماتا ہے بلکہ اتنا عطا فرماتا ہے کہ بندے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پ

ے۔ اللہ تعالےٰ رب کریم ہے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ اپنے بندوں کی جس نیکی کا چاہے ثواب عظیم عطا فرمائے۔ منکرین حدیث ین احادیث پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملے دراصل قرآن پاک پر اعتراض ہے۔ حدیث نے ی بات بیان کی ہے جس کا اظہار قرآنِ پاک نے کیا ہے۔

نوٹ: ۱۔ اس حدیث کے بعد امام نے جو حدیث ذکر کی ہے گو دونوں کے متن اور اسناد میں فرق ہے مگر مفہوم دونوں ں کا ایک ہے اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی ۲۔ اس حدیث کو مسلم و بزار و بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

بَابٌ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَى اللّٰهِ

باب اس امر کے بیان میں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل بہت

۔ اَدْوَمُهُ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَاَةٌ مَنْ هٰذِهٖ قَالَتْ فُلَانَةٌ تَذْكُرُ صَلَاتِهَا قَالَ مَهْ عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيْقُوْنَ اللّٰهِ لَا يَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوْا وَكَانَ بُّ الدِّيْنِ اِلَيْهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهٗ۔

(بخاری)

پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کون ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا یہ فلاں عورت ہے۔ پھر انہوں نے اس عورت کی عبادت کا حال بیان کیا (یہ نوافل بہت پڑھتی ہے) اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا چھوڑو۔ تم اتنا ہی عمل کرو جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔ بخدا اللہ تعالےٰ عطا فرمانے سے تھکتا یں۔ حتیٰ کہ تم خود ہی تھک جاؤ گے اور حضور علیہ السلام کو وہ عمل بہت پسند تھا جس کا ذکر کرنے والا اسے ہمیشہ کرے۔

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و مالک نے بھی اس کو روایت ہے۔ ۲۔ احب الدین میں دین سے مراد طاعات ہیں یعنی بہترین طاعت وہ ہے جو ہمیشہ کی جائے۔ لا یمل۔ ملال کے معنے گھبراہٹ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ گھبراہٹ سے پاک ہے۔ دراصل یہاں ملال کا اطلاق بطور مقابلہ مجاز آیا ہے جیسے ۔ جزاء سیئة سیئة مثلها۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی نیکیاں کرے۔ رب العزت جل مجدہٗ س کی ان نیکیوں کے ثواب عطا فرمانے میں کوئی دقت نہ ہوگی مگر اپنی طاقت سے زیادہ عمل کرنے والا بالآخر خود ہی گھبرا جائیگا۔ س کو جاری نہ رکھ سکے گا۔ مفہوم حدیث یہ ہے کہ آدمی کو چاہیئے کہ عبادت میں میانہ روی اختیار کرے اور اتنا ہی عمل کرے جس کو ی کے ساتھ ہمیشہ کر سکے کیونکہ تھوڑا عمل جو ہمیشہ کیا جائے وہ اس عمل سے بہتر ہے جو انسان ہمیشہ نہ کر سکے کیونکہ زیادہ کے لالچ وڑے کو بھی چھوڑنے پر مجبور ہو جائیگا۔ اسی کو امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مثال دے کر یوں سمجھایا ہے کہ جب پتھر پر پانی طرہ ٹپکتا ہے تو سوراخ کر دیتا ہے۔ برخلاف یکدم اگر پانی گر جائے تو اثر تک بھی نہیں ہوتا۔

بَابُ زِيَادَةِ الْاِيْمَانِ وَنُقْصَانِهٖ

باب اس امر کے بیان میں کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے

وْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ زِدْنَاهُمْ هُدًى

(کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۱۔ ہم نے ان کو ہدایت زیادہ کی

وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا وَقَالَ
اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ فَاِذَا تَرَكَ
شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ (بخاری)

۲۔ اور فرمایا زیادہ ہو ایمان والوں کا ایمان ۳۔ اور فر
کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا)
جب کمال میں سے کوئی چیز چھوڑی تو وہ ناقص ہے

توضیح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ پہلی دو آیتوں سے وہ یہ ا
ہیں کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور تیسری آیت سے ان کا استدلال یہ ہے کہ ایمان کم بھی ہوتا ہے لیکن
ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ ایمان محض تصدیقِ قلبی کا نام ہے اور یہ کمی و زیادتی کو قبول نہیں کرتا جس کی
تفصیل کتاب الایمان میں گزر چکی ہے۔ قارئین وہاں مطالعہ کریں۔

آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی تفسیر

یہ عرفہ کے روز جو جمعہ کو تھا بعد عصر نازل ہوئی۔ آ
اَکْمَلْتُ لَکُمْ سے متعلق مفسرین کے متعدد ق
۱۔ یہ کہ دین کے اکمال کے معنیٰ یہ ہیں کہ دین پچھلی شریعتوں کی طرح منسوخ نہ ہوگا اور قیامت تک باقی رہے گا ۲۔ یہ ک
تکلیفیہ میں حرام و حلال کے جو احکام ہیں وہ اور قیاس کے قانون سب مکمل کر دیئے۔ اسی لیے اس آیت کے بعد
حرام کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی ۳۔ یہ کہ اکمالِ دین کے معنیٰ دین اسلام کو غالب کرنا ہے۔ جس کا اثر یہ ہے کہ حجۃ الود
یہ آیت نازل ہوئی۔ کوئی بھی مشرک مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک نہ ہو سکا۔

۴۲۔ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِىْ قَلْبِهٖ وَزْنُ شَعِيْرَةٍ
مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ
قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِىْ قَلْبِهٖ
وَزْنُ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَ
يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَفِىْ قَلْبِهٖ وَزْنُ ذَرَّةٍ
مِنْ خَيْرٍ (بخاری)

حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ
نے فرمایا دوزخ سے وہ سب لوگ نکالے جا
جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل
برابر بھی خیر ہے۔ پھر وہ لوگ بھی نکال لیے
گے جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے
ہیں گیہوں کے دانے کے برابر بھی خیر
اور اس کے بعد وہ لوگ بھی نکال لیے
جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل
ذرہ برابر بھی خیر ہے۔

توضیح و تشریح حدیث ہٰذا کو امام نے کتاب التوحید میں بھی ذکر کیا اور امام نے ایمان میں اور ترغ
صفۃ الجنۃ میں ذکر فرمایا ۲۔ چار ذرے رائی کے ایک دانہ کے برابر ہوتے ہیں۔ خو
کہ ذرہ کے معنیٰ بعض لوگوں نے ایسے لفظوں سے کئے ہیں کہ پڑھنے والا اس شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ذرہ کا کوئ
ہے بلکہ وہ محض ایک ہوائی اور موہوم مقدار ہے۔ جیسے بعض نے لکھا ہے کہ ذرہ جَو کے ایک ہزار چوبیسویں حصہ
لیکن درحقیقت ان تعبیرات سے ان کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ذرہ شی کے قلیل و صغیر حصہ کو کہتے ہیں۔

جس کا تعین و تصور اور مشاہدہ ذہنِ انسانی کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ سوئی کی نوک مقابلۃً کتنی ہی صغیر ہے مگر ذہن و قلب کے لیے اس کے وجود کا احساس اور بصیرت کے لیے اس کا مشاہدہ ممکن ہے۔ رائی کا دانہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہی مگر وجود کا ایک غیر مشکوک اور ٹھوس تصور رکھتا ہے۔ اسی طرح ذرہ ایک ہوائی مقدار کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ فافہم۔

حضرت انس رضی اللہ تعالٰے عنہ کی روایت میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے۔ نیز دیگر روایات میں مَا يَزِنُ ذَرَّةً مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ الخَيْرِ مَا يَزِنُ بُرَّةً کے الفاظ بھی آتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا ۲۔ گیہوں کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا۔ رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اس کی بالآخر نجات ضرور ہوگی ۳۔ نے اس حدیث کے ظاہری الفاظ لے کر یہ استدلال فرمایا ہے کہ جو کا وزن گیہوں کے دانے سے اور گیہوں کے دانہ کا وزن ذرہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہی حال ایمان کا ہے کہ کم سے کم ذرہ کے برابر ایمان کا ہونا نجات کے لیے کافی ہوگا۔ لہٰذا ایمان میں کمی و بیشی کا ہونا ثابت ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اگر ثمراتِ ایمان یا ایمانِ تفصیلی میں کمی و بیشی مراد ہو تو یہ بات مسلّم بین الفریقین ہے نفسِ تصدیق کا معاملہ تو اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ کتاب الایمان میں اس امر پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔

جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا اسکی نجات ہوگی اسکا کیا مطلب ہے

واضح ہو کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جس کا کام ہی دین میں نت نئے فتنے اٹھانا اور آیات و احادیث کی تحریفِ معنوی کرنا ہے۔ وہ اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب رائی کے دانے کے برابر ایمان بھی نجات کے لیے کافی ہے تو دنیا کی اکثر غیر مسلم قومیں بھی خدا اور آسمانی کتب اور بعض انبیاء و رسل پر ایمان رکھتی ہیں اس ایمان میں اسلام کے بالمقابل کمی اور نقص ہی سہی لیکن رائی کے دانے سے تو یہ بہرحال کم نہیں ہے۔ لہٰذا ان سب کی نجات ہوگی اور ہر مذہب جس میں کم از کم خدا پر ایمان کا وجود ہو آخرکار جنتی بنا دینے کا ضامن ہے اور منکرینِ خدا کے سوا تمام انسان دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔ مستشرقینِ یورپ سے متاثر ہونے والے مسلمان یا منکرینِ حدیث کی جماعت اگر اس مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالے اور وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے کا نعرہ بلند کرے تو کوئی حیرانی کی بات نہ تھی مگر حیرت ہے کہ دیوبندی حضرات میں بھی ایسے لوگ بھی ہیں جو مشرک اور اعلیٰ درجہ کے کافر کے لیے بھی بالآخر جہنم سے نجات پانے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سیرۃ النبی جلد چہارم مولوی سلیمان ندوی نے اپنا مسلک یہی لکھا ہے کہ کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہوگی اور وہ بالآخر جنت میں داخل کیا جائیگا۔

اگر ندوی صاحب نے بالتصریح ”وحدتِ ادیان اور ہر مذہب حق ہے“ کا نعرہ بلند نہیں کیا مگر ان کے اس نظریہ کا نتیجہ و ثمرہ تو یہی نکلے گا کہ ہر مذہب میں رہ کر نجات ہو سکتی ہے کیونکہ جب کافر و مشرک کی بھی بالآخر نجات ہو جائے گی اور انہیں اپنے جرموں کی سزا پا کر جنت میں داخل کر دیا جائیگا تو پھر اسلام کا یہ دعوٰے تو ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائیگا کہ نجات و مغفرت اور حصولِ فردوس کا واحد ذریعہ و وسیلہ میں ہی ہوں۔ بہرحال اس مضمون کی احادیث سے مذکورہ بالا نتیجہ نکالنا بالکل غلط اور اسلام کو مشکوک کرنے کے مترادف ہے اور سخت قسم کی جاہلانہ تحریف ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ قرآن حکیم سے کسی بات کو اخذ کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ پورے قرآن شریف کی نصوص کو جو اس مسئلہ سے متعلق ہوں پیشِ نظر رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یا تو قرآن

میں تناقص وتصادم نظر آئیگا یا پھر متناقض و متصادم نظریے اس سے اخذ ہوں گے۔ اسی لیے قرآن نے پورے قرآن پر ایمان لانے کی تاکید کی ہے اور جو بعض آیاتِ قرآنیہ پر ایمان لائیں اور بعض آیات کو نظر انداز کر دیں تو ان کے لیے جہنم کی سائق۔ یہی حال سنتِ رسول اللہ کا ہے کہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلاۃ والتسلیم کی کسی ایک حدیث یا اس کے کسی ایک سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لیے ہمیں دین سے متعلق حضور علیہ السلام کی عمومی تعلیم اور اس باب کی دیگر احادیث کو بھی پیش رکھنا پڑے گا تب جا کر کہیں صحیح مفہوم و مطلب واضح ہوگا۔

کتاب وسنت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فلاح فوزِ اخروی کا ضامن صرف اسلام ہے اور اسلام نام ہے سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی دینی دعوت کو قبول کرنے کا۔ حضور علیہ السلام کی دینی دعوت کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان سے متعلق جو کچھ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے اس کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار مثلاً ایمان کے متعدد اجزاء ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر وغیرہ وغیرہ۔ تو ایمان کے ت اجزائے ضروریہ پر ایمان لانے والا مومن ہے اور اس کے کسی ایک جزء کا بھی انکار کرنے والا کافر ہے۔ مثلاً ایک شخص سب کچھ مانے مگر ملائکہ کے مخلوقِ الٰہی ہونے کا منکر ہو یا ایک شخص ملائکہ اور ایمان کے دوسرے اجزاء کا تو قائل ہو مگر علیہ السلام کے ختم الرسل ہونے کا انکار کرے۔ تو ایسا شخص ایمان کے تمام اجزاء پر ایمان رکھنے کے باوجود صرف اس کے کے انکار کرنے کی وجہ سے بالاتفاق کافر قرار پائے گا اور نجات کا ہرگز ہرگز حقدار نہ ہوگا۔ جب یہ قاعدہ ہمیں کتاب وسنت کے صریحہ سے معلوم ہوگیا تو اب وہ احادیث جن میں ایمان کے کسی ایک جزء کا بیان ہوگا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت کو قبول کرنا اور تمام ضروریاتِ دین پر ایمان لانا مراد لیا جائیگا۔

زیر بحث حدیث ہی کو لیجیے اس میں صرف یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھنے والا نجات پائے گا لیکن مراد اس سے توحید پر ایمان لانا نہیں بلکہ پورے کلمہ پر ایمان لانا ہے اور یہاں کلمہ کے جزءِ اول لا الٰہ الا اللہ کو جزء ثانی محمد رسول اللہ کا عن دیا گیا ہے جیسے کہتے ہیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ تو اس سے مقصود صرف اتنے ہی لفظ نہیں بلکہ پوری سورۃ پڑھ ہے۔ ایسے ہی یہاں توحید پر ایمان لانے سے مراد رسالت پر ایمان لانا بھی ہے اور اللہ ورسول پر ایمان لانے کے بع بلا ریب یہ طے ہوجاتا ہے کہ جو کتاب وسنت سے ثابت ہو اس کا اقرار وتصدیق کی جائے۔

یہی حال حدیثِ زیرِ بحث کے اس جملہ کا ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اس کی نجات ہوگی۔ یعنی ج دل میں تمام ضروریاتِ دین تمام اجزاءِ دین کی نفسِ تصدیق پائی جائے گی اور اصلِ ایمان موجود ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بے عمل فاسق وفاجر کیوں نہ ہو اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے بعد بہر صورت جہنم سے نکال لیا جائیگا۔ "ذرہ برابر ایمان ہوگا" نہیں ہے کہ جو شخص اجزاءِ ایمان میں سے کسی جزء کا منکر ہوگا وہ بھی نجات پائے گا۔ حدیث کے خط کشیدہ جملوں کو یہ مطلب انتہائی درجہ کی جاہلانہ تحریف ہے اور اسلام سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

ایمان میں کمی یا ضُعف کا کیا مطلب ہے؟

خوب یاد رکھیے کہ ایمان کا ضعف اور ایمان کا نقص یہ دو الگ چیزیں ہیں۔ جس کے ایمان میں ضعف ہو وہ مومن ہے اور جس ک

یں نقص ہو وہ یقیناً کافر ہے۔ نقص اور ضعف کے اس فرق کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایمان کے متعدد اجزا ہیں۔ توحید، رسالت، ملائکہ، آخرت، تقدیر، ان تمام اجزا کا ایمان لانے والا اور کسی ایک کا بھی نکار نہ کرنے والا مسلمان ہے۔ اب جو شخص اجزاء ایمان میں سے کسی ایک جز کا بھی انکار کرے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے کہ اس کا ایمان ناقص ہے، ادھورا ہے۔ ادھورے ایمان کو قرآن و سنت اور اجماعِ اُمّت کسی درجہ میں بھی ایمان نہیں تے بلکہ کفر و ارتداد قرار دیتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر صراحت کی کہ بعض پر ایمان اور بعض کی تکذیب کل تکذیب ہے۔ اس لیے تمام اجزاء ایمان پر ایمان لانے کے باوجود کسی ایک جز پر ایمان لانے کا مطلب ہوگا " ذرہ برابر یمان نہ لانا"۔ رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان کا نہ ہونا اور ایسا شخص جس کا ایمان ادھورا ہے بلاشبہ کافر ہے اور اس کی ی صورت نجات ممکن نہیں ہے۔

اس کے برعکس " ایمان کا ضعف " یہ ایک علیحدہ مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ ایمان ہو۔ یعنی بلا استثناء ایمان کے تمام اجزائے ضروریہ کا اعتقاد ہو۔ مگر اس تمام اجزاء ایمانی کے مجموعی اعتقاد کے ین و اذعان میں ضعف ہو۔ اس کو کمی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی ضعف کے تناسب سے ایمان کی مقدار کا فیصلہ ہوگا۔

بعض وہ لوگ ہوں گے جن کے تمام اجزاءِ ایمانی کے مجموعی اعتقاد میں یقین و اذعان کا ضعف بالکل ہوگا ہی نہیں۔ بعض ہ ہوں گے جن کے اذعان و یقین میں ذرا سا ضعف ہوگا اور بعض وہ ہوں گے جن میں یہ ضعف انتہا کو پہنچا ہوگا۔ مگر اس کے جود تمام اجزائے ایمانیہ کسی جزوِ ایمان سے انکار و تکذیب کی نوبت نہیں پہنچی ہوگی تو ایسے افراد کو بھی مومن ہی مانا جائے ۔ اگرچہ یہ ضرور کہا جائیگا کہ ان کا ایمان کم ہے یا ان کا ایمان ضعیف ہے۔ اس کمی اور ضعف کے اظہار کے لیے احادیث میں کے دانے یا ذرّے کی تمثیل دی گئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ایمان کا نقص یہ ہے کہ اجزاء ایمان میں سے کسی ایک کا بھی انکار و تکذیب کی جائے۔ جن کے ایمان یں نقص ہوگا وہ کافر ہیں۔ ان کا ایمان ادھورا ہے۔ ظاہر ہے عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب کے پیرو اگر توحید کے قائل ہوں ض کتبِ سماویہ اور بعض انبیاءؑ پر بھی ایمان رکھیں لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلامی کو قبول نہ کریں تو ان ے ایمان میں نقص ہے اور وہ کافر ہی قرار پائیں گے اور کسی حال میں بھی نجات نہ پائیں گے۔

اور ایمان کا ضعف اور اس کی کمی کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اجزائے ایمانی کے مجموعہ کا اعتقاد ہے۔ کسی ایک بھی جز کی تکذیب انکار نہیں ہے۔ مگر اس مجموعی اعتقاد کے اذعان و یقین میں ضعف ہے اور یہ ضعف جب انتہا کو پہنچ جائے تب بھی ایسا ص مومن ہے کیونکہ وہ اجزائے ایمانی میں سے کسی جز کا منکر نہیں ہے۔ ایسے ہی ضعیف الایمان افراد کے متعلق وحیِ نبوّت نے ن کیا کہ " جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان ہوگا۔ وہ بالآخر جہنّم سے نجات پائے گا۔" فافہم

شریحی وضاحت

واضح ہو کہ حدیثِ ہٰذا سے خیر سے مراد ہم نے ایمان لیا ہے۔ جس کے چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ حدیث کے لفظ یہ ہیں۔ وَ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِنَ الْخَيْرِ۔ قلبہ کا قرینہ بتا رہا ہے کہ سے مراد ایمان ہے۔ کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے دوسری روایت

میں خیر کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے اسی لیے یہاں خیر سے مراد نورِ ایمان ہی لینا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہ خیر کا لفظ آئے وہاں اس کے معنی ایمان ہی کے لیے جائیں۔ کیونکہ خیر کے لفظ سے جس طرح ایمان مراد لیا جاتا ہے۔ ا عمل بھی مراد لے سکتے ہیں۔ بلکہ بعض احادیث میں تو ایسے مقام بھی ہیں جہاں خیر سے ایمان مراد لینا قطعاً حتماً غلط ہے۔ چ بخاری و مسلم ہی میں یہ حدیث موجود ہے کہ جب سب لوگ سفارش کر چکیں تو اس کے بعد ارشادِ باری ہو کہ فرشتوں کی کی اور مومنین کی سفارش ہو چکی اور ان کی سفارش قبول ہو گئی۔

اِلَّا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ فَيَقْبِضُ قَبْضَةً فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا مَّا لَمْ يَعْمَلُوْا خَيْرًا قَطُّ (بخاری و مسلم)

بس اب ارحم الراحمین ہی باقی ہے۔ پھر اللہ تع خود اپنی مغفرت و رحمت کے ہاتھ سے نکال ل جنھوں نے کبھی کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا۔

اس حدیث میں خیر سے مراد عمل ہے ایمان نہیں۔ اگر یہاں بھی خیر سے مراد ایمان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا ک لوگ بھی بخش دیئے جائیں گے۔ جن کے دل میں قطعاً ایمان ہوگا ہی نہیں۔ حالانکہ یہ بات نصوصِ قرآن کے خلاف ہے یَعْمَلُوْا کا لفظ بھی یہاں قرینہ ہے کہ خیر سے مراد یہاں عمل ہے۔ نیز اس حدیث کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

هٰٓؤُلَآءِ عُتَقَآءُ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اَدْخَلَهُمُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ عَمَلٍ عَمِلُوْهُ وَلَا خَيْرٍ قَدَّمُوْهُ (بخاری و مسلم)

یہ لوگ ہیں اللہ کے آزاد کردہ۔ اللہ نے ان کو جنت داخل فرمایا بغیر عمل کے جو انھوں نے کیا اور بغیر خیر ک انھوں نے پیش کیا۔

یہاں بھی خیر سے مراد عمل ہی ہے۔ یعنی یہ لوگ وہ ہوں گے جن کے پاس سوائے ایمان کے کوئی عملِ صالح ان کو بھی اللہ عزوجل اپنی رحمتِ کاملہ سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ کے نزول کا بیان

۴۳۔ لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُوْدِ نَزَلَتْ لَاتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا قَالَ اَيُّ اٰيَةٍ قَالَ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ

حضرت عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ آپ یہودی نے کہا اے امیر المومنین! آپ کی کتاب قرآن ایک آیت ہے اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم کو عید ٹھہرا لیتے۔ آپ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے کہا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ۔ آپ فرمایا میں اس دن کو جانتا ہوں اور اس جگہ کو بھی ہوں جہاں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ وہ مقام عرفات جمعہ کا دن تھا اور حضور علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے

اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب المغازی، کتاب التفسیر اور کتاب الاعتصام میں بھی ذکر کیا ہے۔ نسائی

اس حدیث کو لیا ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

نزولِ نعمت کو عید منانے کا ثبوت

جس یہودی نے یہ سوال کیا۔ وہ کعبؓ احبار تھے اس نے سوال کیا کہ یہ آیت جس میں اسلام کے غلبہ کی بشارت تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کا دن ہے۔ مسلمان اس دن کو عید کیوں نہیں مناتے۔ اس پر حضرت فاروقِ اعظم نے فرمایا۔ ہم اس سے غافل نہیں ہیں۔ ہم اس دن کی عظمت کو بھی سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ پر کس موقع پر اور دن نازل ہوئی تھی اور اس وقت ہمارے حضور علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے یعنی ہم مسلمان اس دن کو معظم سمجھتے ہیں اس کو عید کی طرح مناتے ہیں یعنی ہم نے تو اس دن کو عید کا دن کر لیا ہے۔

علامہ نووی نے فرمایا۔ مَعْنَاہُ مَا تَرَکْنَا تَعْظِیْمَ ذٰلِكَ الْیَوْمِ وَالْمَکَانِ اَمَّا الْمَکَانُ فَھُوَ فَاتٌ وَھُوَ مُعْظَمُ الْحَجِّ الَّذِیْ اَحَدُ اَرْکَانِ الْاِسْلَامِ وَاَمَّا الزَّمَانُ فَھُوَ یَوْمُ جُمُعَۃٍ وَیَوْمُ عَرَفَۃَ وَھُوَ یَوْمٌ اِجْتَمَعَ فِیْہِ فَضْلَانِ وَشَرَفَانِ مَعْلُوْمٌ تَعْظِیْمُ وَاحِدٍ مِنْھُمَا فَاِذَا اجْتَمَعَا زَادَ التَّعْظِیْمُ فَقَدِ اتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْیَوْمَ عِیْدًا وَ عَظَّمْنَا مَکَانَہٗ اَیْضًا (عینی ج ۱ صــ۲۶۶)

بلکہ اس دن کے ساتھ اس مکان کی عزت کرتے ہیں۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ آپ سے ایک یہودی نے ایسا ہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ جس روز یہ آیت نازل ہوئی۔ اس دن دو عیدیں تھیں۔ جمعہ و عرفہ۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی دینی کامیابی کے دن کو خوشی کا دن منانا اور اس کی یادگار قائم کرنا جائز ہے۔ صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ورنہ حضرت عباس اور حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہم صاف فرما دیتے کہ جس دن کوئی خوشی کا واقعہ ہو اس کی یادگار قائم کرنا اور اس روز عید منانا ہم بدعت جانتے ہیں۔ اس سے عید میلاد النبی کا جواز بھی ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ تو صرف قرآنِ پاک کی ایک آیت نزول کا دن تھا اور ماہ فاخر ربیع الاول صاحبِ قرآن کے ظہور کا مہینہ ہے۔ لہٰذا عید میلاد کہ اعظم نعم الٰہیہ کی یادگار اور گزاری ہے اور حتماً جائز ہے۔

شل فارس زلزلے ہوں نجد میں
ذکرِ آیاتِ ولادت کیجیے

بَابٌ اَلزَّکٰوۃُ مِنَ الْاِسْلَامِ

باب اس امر کے بیان میں کہ زکوٰۃ بھی اسلام کا ایک شعبہ ہے

قَوْلُہٗ تَعَالٰی وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا عْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ نَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا زَّکٰوۃَ وَذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا خالص اللہ ہی کی بندگی کی نیت سے اس کو پوجیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ ہی دینِ حق ہے۔

گزشتہ باب میں ایمان کی کمی وبیشی کا بیان تھا اور اعمالِ صالحہ سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور اس میں کی مذکرہ بالا عنوان قائم کرکے امام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو شخص زکوٰۃ ادا کرے اس کا اسلام کامل ہے اور جو زکوٰۃ نہیں اسلام ناقص ہے۔

۴۴- جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّاسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَا فَاِذَا هُوَ يَسْاَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوٰتٍ فِى الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا اِلَّآ اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ قَالَ لَآ اِلَّآ اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا اِلَّآ اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَآ اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَآ اَنْقُصُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ [illegible] (بخاری)

ایک شخص اہلِ نجد سے جن کے بال پراگندہ تھے میں حاضر ہوئے۔ ہم ان کی آواز کی گونج کو سنتے کی بات ہمیں سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قر (تو معلوم ہوا) کہ وہ اسلام کے متعلق حضور علیہ سوال کر رہے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ ۵ نمازیں نے دن اور رات میں فرض کی ہیں۔ اس نے کے سوا بھی مجھ پر کوئی نماز فرض ہے۔ آپ مگر یہ کہ تو نفل پڑھنا چاہے۔ پھر حضور صلی اللہ نے فرمایا۔ رمضان کے روزے۔ اس نے عرض کے روزوں کے سوا بھی مجھ پر واجب تو نہیں۔ فر یہ کہ تو نفلی روزے رکھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ۔ اس نے عرض کی کہ زکوٰۃ کے سوا تو اور مجھ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں مگر دینا چاہے۔ پھر یہ شخص واپس ہوئے اور کہتے کی قسم اس پر زیادہ کروں گا اور نہ کم۔ جس پر حضور علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر یہ سچ کہتا تو فلاح پاتا۔

فوائد ومسائل

اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الشہادات اور صوم اور باب ترک الحیل میں اور مسلم نے ایمان میں اور ابوداؤد ونسائی نے صلوٰۃ وصوم میں۔ حدیث ہٰذا کے راوی حضرت امام مالک وہ اپنے چچا ابوسہیل سے وہ اپنے والد مالک بن ابی عامر سے انہوں نے حضرت طلحہ سے سنا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

آپ جلیل القدر صحابی عشرہ مبشرہ سے ہیں۔ ان کے والد کا نام عثمان قرشی ہے۔ بدر کے سوا تمام مشاہد میں حضور علیہ السلام کے احد میں حضور علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق ثابت قدم رہے اور حضور علیہ السلام کو کفار کے حملوں سے بچا ے ۷۵ زخم آئے۔ چھنگلی انگلی بھی کٹ گئی۔ آپ کا نام حضور علیہ السلام نے طلحۃ الخیر وطلحۃ الجواد رکھا ہے۔ آپ مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری ومسلم کا اتفاق ہے۔ دو حدیثوں کو بخاری نے اور تین کو مسلم نے

جمل کی لڑائی میں کسی نامعلوم تیر سے دسویں جمادی الاولی ۳۶ھ میں شہید ہوئے اور بصرہ میں مدفون ہوئے۔ کہتے ہیں کہ در اصل ان کو مقام قنطرہ میں دفن کیا گیا تھا۔ مگر تیس سال بعد آپ نے اپنی صاحبزادی کو خواب میں سیل کی شکایت کی تو آپ کو قبر سے نکالا گیا۔ جسم مبارک بالکل تر و تازہ تھا۔ آپ کو بصرہ میں دفن کیا گیا (عینی جلد) نجد کے متعلق متعدد قول ہیں۔ وہ بلند زمین جو یمامہ سے ارضِ عراق تک ہے نجد ہے ۳۔ حجاز و عراق کے درمیان نجد ہے ۴۔ عراق اور جدہ عمرۃ اور طائف کے درمیان کی جگہ نجد ہے۔ لغت میں نجد بلند زمین کو کہتے ہیں۔ ثائر منتشر کے ہیں جیسے کہتے ہیں ثار الغبار۔ حاصل یہ ہے کہ اس شخص کے بال پراگندہ تھے۔ دوی۔ دال کے زبر اور واؤ کے ساتھ بلند اور مکرر آواز کو کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔ فلاح کے معنی کامیابی اور رستگاری کے ہیں۔ بعض نے فلاح چار امور سے مرکب ہے بقا بلا فنا۔ تونگری فقر کے بغیر، عزت ذلت کے بغیر، علم جہالت

حدیث

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکانِ اسلام بتائے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ یہ ارکانِ اسلام سے ہیں۔ دن میں پانچ وقت نماز فرض ہے۔ کے روزے فرض ہیں اور مال کے نصاب پر پہنچنے اور سال گزرنے پر صرف زکوٰۃ فرض ہے ۲۔ جو شخص ان امور سے وہ فلاح یافتہ ہے ۳۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف مسائلِ دینی معلوم کرنے کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔

شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا ہے کہ نفل شروع کرنے سے واجب نہیں ہوتا۔ البتہ جیسے نفل کا شروع ب ہے اسی طرح نفل کا پورا کرنا بھی مستحب ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ میں استثنا منقطع مانتے ہیں اور فرماتے ث کا مطلب یہ ہے کہ ان فرائض کے علاوہ یہ مستحب ہے کہ تو نوافل میں مشغول ہو جائے۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ل روزہ شروع کیا تو اس کے لیے اس روزہ کو پورا کرنا مستحب ہے اور اس کا افطار جائز ہے اور نوافل شروع کرنے ب نہیں ہوتے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں امام شافعی ان احادیث کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں یہ آیا ہے کہ حضور للہ علیہ وسلم نے نفلی روزہ رکھا اور پھر اس کو پورا نہیں فرمایا بلکہ افطار فرمالیا۔ لہٰذا باقی نفلی عبادات کا بھی یہی حکم ہوا حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ یہ فرماتے ہیں۔

تطوع میں استثنا متصل ہے اور استثنا میں اتصال ہی اصل ہے۔ لہٰذا مطلب حدیث یہ ہوگا کہ نفلی روزہ یا نماز نے اس کا اتمام واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآنِ پاک میں لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ کے علاوہ اگر کسی نے نفل شروع کر دیئے تو اس کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر اس نے نفلی روزہ شروع کر کے توڑ دیا قضا واجب ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں۔ میں نے اور حضرت حفصہ ہم نفلی روزہ سے تھیں کہ اتنے میں ایک بکری بطور ہدیہ ہمیں دی گئی تو ہم نے روزہ افطار کر لیا اور بکری کا گوشت ور علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو فرمایا:

یَوْمًا مَکَانَہٗ (احمد) | تم دونوں اس روزہ کی جگہ ایک روزہ رکھو

نیز دار قطنی میں ہے کہ حضرت جویریہ نے نفلی روزہ رکھ کر توڑ دیا۔ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کی قضا کرو۔ اس سے واضح ہوگیا کہ نفلی روزہ شروع کرنے سے اس کا اتمام واجب ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اس کو فاسد کر دیا تو اس کی قضا ہے۔ رہیں وہ احادیث جن میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نفلی روزہ رکھ کر افطار کر لیا، اس سے صرف قدر ثابت ہوتا ہے کہ نفلی روزہ رکھ کر کسی عذر معقول کی وجہ سے اس کو افطار کر لینا جائز ہے۔ مگر جب کر دیا تو اسکی قضا واجب نہیں ہے۔ حدیث مذکورہ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ جو احادیث ہم نے ذکر کیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفلی کو فاسد کرنے کی صورت میں اس کی قضا واجب ہے۔ نیز اس کے علاوہ اجماع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور حج سب کا اتفاق ہے کہ نفلی حج شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔ اگر فاسد ہو جائے تو حج، اس کے ارکان کا پورا

۱۔ وَاللّٰهِ لَا أَزِيْدُ وَلَا أَنْقُصُ عَلٰى هٰذَا یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ارکانِ اسلام دیئے تو سائل نے عرض کی خدا کی قسم نہ میں اس پر زیادہ کروں گا اور نہ کم کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا اس جملہ سے ثابت کہ وتر واجب نہیں ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ سائل کے ان کلمات سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ تو محاورہ ہے یعنی یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضور آپ نے جو فرائض بیان کیے ہیں۔ ان میں نہ میں اپنی طرف سے کچھ زیادتی کروں گا اور نہ کمی کروں گا جو کچھ میں نے سنا ہے اس کو من وعن دوسروں تک پہنچا دوں گا۔ چنانچہ اس کی تائید بخاری کتاب الصوم کی حدیث سے ہوتی ہے کہ سائل نے عرض کی۔ وَالَّذِيْ أَكْرَمَكَ لَا أَتَطَوَّعُ شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ مِمَّا فَرَضَ اللّٰهُ شَيْئًا۔ فافہم ——— اس کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ شخص کامیاب ہوگیا۔ اگر اس نے سچ کہا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف ان دو ارکانِ اسلام کی ادائیگی کی بنا پر اس کے لیے فلاح کا حکم کیسے دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے۔ بخاری میں جو دوسری حدیث ہے۔ اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ حضور اکرم علیہ وسلم نے باقی احکام شرعیہ بھی اس کو ارشاد فرما دیئے۔ الفاظِ حدیث یہ ہیں:۔ فاخبره بشرائع الاسلام فادبر الرجل وقال الخ

بَابُ اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْاِیْمَانِ

باب جنازہ کے ساتھ جانا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے

۴۵۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا وَكَانَ مَعَهٗ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ أُحُدٍ وَمَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ فَإِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيْرَاطٍ

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں۔ حضور سید عالم صلی علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو کسی مسلمان کے جنازہ کے ساتھ اور اس کے ساتھ رہے۔ حتی کہ نماز پڑھے اور اس سے فارغ ہو تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا۔ ہر پہاڑ کے برابر ہوگا اور جس نے صرف نماز جنازہ پڑھی دفن سے قبل واپس ہوگیا تو وہ صرف ایک قیراط لے کر لوٹے گا۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو نسائی نے کتاب الایمان میں درج کیا ہے ۲۔ جنازہ ۔ ج کے زبر و زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ میت کو کہتے ہیں ۔ جوہری نے کہا۔ جنازہ اس نعش کو کہتے ہیں جو پائی پر ہو ۔ عباب میں ابن عربی نے کہا ۔ جنازہ بالفتح میّت ۔ بالکسر سریر ۔ اصمعی نے اس کا عکس کیا ہے ۔ بہرحال م طور پر جنازہ اس لاش کو کہتے ہیں جس کو نہلا دھلا کر کفن پہنا کر پلنگ پر ڈال دیا جائے (اتبع) اس کے معنی پیچھے ے چلنے کے ہیں ۔ قرآن پاک میں ہے ۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ ۔ فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ حضرت سیٰ علیہ السلام کا پیچھا کیا ۔ بہرحال اتباع کا لفظ اسی وقت تک کے لیے بولا جاتا ہے ۔ جب تک کسی کے پیچھے رہا جائے اس کے تعاقب کے لیے یا حملہ کے لیے اور جب ساتھ مل جائے تو آگے نکل جائے تو اس کے لیے اتباع کا لفظ نہیں بولتے قیراط ۔ حدیث ہٰذا میں قیراط سے جو مراد ہے وہ خود زبان نبوت نے بیان فرما دیا ۔ یعنی اُحد پہاڑ کے برابر ثواب ۔ یہ محض ب کی زیادتی کی تمثیل ہے ۔ اُحُد ۔ یہ مدینہ کے پہلو میں دو میل شمال کی طرف ایک پہاڑ ہے ۔ اُحد کو اُحد توحد کی وجہ ے کہتے ہیں ۔ یہ الگ تھلگ اس گوشہ میں ایک ہی پہاڑ ہے ۔ اس مقدس پہاڑ کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ حضور علیہ السلام نے یا ۔ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اُحد پہاڑ میں سیّدنا ہارون علیہ السلام کی قبر مبارک بھی ۔ ۳۔ حدیث ہٰذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۔ ۱۔ جنازہ کے ساتھ شریک ہونا اور دفن تک وہاں رہنا اور نماز پڑھنا بڑے ثواب وجب ہے ۔ دو قیراط ثواب اُحد پہاڑ کے برابر ملتا ہے ۔ حدیث ہٰذا میں یہ ثواب، اس شخص کے لیے بیان ہوا ہے جو جنازہ ساتھ چلے ۔ دفن تک وہاں رہے اور نماز بھی پڑھے اور اگر صرف نماز جنازہ کے ساتھ شرکت کرے تو ایک قیراط کا ثواب ہے اتباع کے لفظ نے یہ بتایا کہ جنازہ کے پیچھے پیچھے چلنا اولیٰ و افضل ہے اور اس میں میّت کی تعظیم بھی ہے ۔ جیسا کہ حضرت کرم اللہ وجہہ الکریم اور امام اوزاعی علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے اور حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے ۔ حضرت امام شافعی ۔ ان جنازہ کے آگے چلنا اولیٰ ہے ۔ لیکن لفظ اتبع حضرت امام اعظم کے مسلک کی زبردست تائید کرتا ہے ۔ فافہم

بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ اَنْ يُّحْبَطَ عَمَلُهٗ

باب مومن کا اس سے ڈرنا کہ اعمال حبط نہ ہو جائیں

هُوَ لَا يَشْعُرُ (بخاری) | اور اس کو خبر بھی نہ ہو

د و مسائل

یہ عنوان آیت اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ سے ماخوذ ہے ۔ حَبِطَ يَحْبَطُ باب عَلِمَ يَعْلَمُ سے ہے ۔ حبط کے معنی مٹنے، ضائع ہونے کے ہیں ۔ اصطلاح شرع میں اعمال کا معنی یہ ہے کہ اعمال کا ثواب ضائع کر دیا جائے ۔ علماء فرماتے ہیں کہ حبط عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ آدمی اسلام سے خارج ہو جائے لیکن امام بخاری کا مقصد اس عنوان کے قائم کرنے سے مرجیہ کے اس قول کی تردید مقصود ہے صدیق قلبی (ایمان) کے ہوتے ہوئے گناہ کوئی نقصان نہیں دیتا ۔ امام نے یہ باب قائم کر کے بتایا ہے کہ عدم اخلاص اور کفر ش کا موجب ہوتے ہیں ۔

ل اِبْرَاهِيْمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِيْ | ابراہیم تیمی نے فرمایا ۔ جب میں نے اپنے قول کا

عَلٰی عَمَلِیْ اِلَّا خَشِیْتُ اَنْ اَکُوْنَ مُکَذِّبًا

(بخاری)

مقابلہ عمل سے کیا تو مجھے ڈر ہوا کہ لوگ کہیں مجھے جھُٹلا نہ دیں۔

حضرت ابراہیم تیمی

حضرت ابراہیم تیمی اپنے وقت کے نہایت پاکباز متقی، پرہیزگار بزرگ تھے۔ حجاج نے حضرت امام نخعی کی گرفتاری کا حکم دیا تو سپاہی غلطی سے ابراہیم تیمی کو پکڑ لائے اور ان کو جیل میں بند کر دیا۔ آپ سے بھی کہا گیا کہ آپ کو غلطی سے پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ایک بے گناہ کی جگہ میں جیل میں رہوں تو یہ بہتر ہے۔ چنانچہ آپ کا جیل ہی میں انتقال ہوا۔ آپ بہت زبردست واعظ بھی تھے۔ یہ جملے آپ نے از راہِ انکساری فرمائے ہیں۔ امام بخاری کا مقصد ان جملوں سے یہ بتانا ہے کہ مومن ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں میرا عمل میرے قول کے مخالف نہ ہو جائے یا میرے عمل میں خلوص نہ رہے اور اس کی جگہ ریا و سمعہ آ جائے۔ لہٰذا واعظ کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے۔

قَالَ ابْنُ اَبِیْ مُلَیْکَۃَ اَدْرَکْتُ ثَلٰثِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّھُمْ یَخَافُ النِّفَاقَ عَلٰی نَفْسِہٖ مَا مِنْھُمْ اَحَدٌ یَقُوْلُ عَلٰی اِیْمَانِ جِبْرَائِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ

(بخاری)

عبداللہ بن ابی ملیکہ نے کہا۔ میں نے حضور علیہ السلام کے تیس صحابیوں سے ملاقات کی۔ وہ سب کے سب اپنے نفس پر نفاق کے واقع ہونے سے ڈرتے تھے۔ کوئی ان میں ایسا نہ تھا جو یہ کہتا ہو کہ میرا ایمان جبرائیل و میکائیل کا سا ہے۔

ابن ابی ملیکہ

یہ تابعی ہیں۔ انہوں نے عبادلہ اربعہ، حضرت عائشہ و حضرت اسماء حضرت ام سلمہ و ابوہریرہ و دیگر صحابہ کرام سے یہ حدیث سُنی ہے۔ یہ حضرت ابن زبیر کے قاضی و مؤذن تھے۔ وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابیوں سے ملاقات کی ہے۔ یہ تمام صحابی اس امر سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہم میں نفاق پیدا نہ ہو جائے۔ یخاف النفاق۔ خوف آئندہ کے غم و اندیشہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن ابی ملیکہ کے اس قول کا مطلب جو صرف لفظی ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ صرف اسقدر ہے کہ جن تیس صحابہ سے ان کی ملاقات ہوئی وہ سب اپنے نفسوں کو معصوم نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنے نفس پر نفاق کے واقع ہونے سے ڈرا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ہر مومن مسلمان کفر و شرک اور نفاق میں مبتلا ہونے سے ڈرتا ہے اور ہمیشہ بحضور رب العالمین یہ دُعا کرتا رہتا ہے کہ الٰہی صراطِ مستقیم پر چلانا اور یہ بات خود ایمان کی نشانی ہے۔

ایک مغالطہ کا جواب

ابن ملیکہ کے اس قول اور اسی قسم کے اور اقوال سے مخالفین صحابہ جہلاء کو سخت مغالطہ دیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ دیکھو بخاری میں ہے کہ صحابہ نفاق سے ڈرا کرتے تھے۔ ثابت ہوا کہ معاذ اللہ، صحابہ میں نفاق تھا جبھی تو ڈرتے تھے۔ مخالفین صحابہ کا اس قول سے یہ نتیجہ نکالنا انصاف و دیانت کا خون کرنا ہے۔ کیونکہ کفر و شرک اور نفاق میں مُبتلا ہونے سے ڈرنا ایمان و اخلاص کی نشانی ہے۔ ہر مخلص مومن کفر و نفاق سے پناہ مانگتا ہے اور اپنے حُسنِ خاتمہ کی دُعائیں کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ جو نفاق سے ڈرے اس میں نفاق پایا بھی جاتا ہے خود سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد امور سے پناہ مانگی ہے۔ حالانکہ حضور سید المعصومین ہیں۔ مگر تعلیم اُمّت کے لیے آپ نے

بھی متعدد باتوں سے پناہ مانگی ہے تو کیا مخالفینِ صحابہ اپنی اُلٹی منطق کی رُو سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی یہی کہیں گے؟ الغرض یہ بدیہی بات ہے کہ کسی بُری چیز سے پناہ مانگنا یا اس سے ڈرنا یا اس سے بچنے کی اللہ سے دعا کرنا یہ ایمان و اخلاص کی اعلیٰ نشانی ہے اور مخالفینِ صحابہ کا اس قول سے صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) منافق ثابت کرنا صرف ہٹ دھرمی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ فافہم

چنانچہ اس قول کے آخری جملہ کہ "وہ صحابی اپنے ایمان کو جبریل کے ایمان کی طرح نہیں سمجھتے تھے"۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جبریل معصوم ہیں۔ ان کے ایمان میں نفاق کا آنا ممکن ہی نہیں ہے اور مومن چونکہ معصوم نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ کفر و نفاق سے ڈرتا ہے اور ہمیشہ بارگاہِ خداوندی میں اپنے حُسنِ خاتمہ کی دُعائیں کرتا ہے حضرت حسن بصری کا ارشاد ہے کہ

وَيُذْكَرُ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ (بخاری)

حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا مومن ہی نفاق سے ڈرتا ہے اور منافق نفاق سے نہیں ڈرتا۔

ابنِ تین نے اس قول کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور مُنافق اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔ گو یہ ترجمہ بھی صحیح ہے مگر امام بخاری کے مقصد کے خلاف ہے۔ بہرحال ان دونوں قولوں کا مطلب و منشا یہ ہے کہ مومن کو اپنی ذات کو معصوم نہیں سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ خلافِ شرع امور کفر و شرک سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے اور بحضور رب العالمین حُسنِ خاتمہ کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

وَمَا يُحَذَّرُ مِنَ الْإِصْرَارِ عَلَى النِّفَاقِ وَالْعِصْيَانِ مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

(اس باب میں بیان ہے) ان چیزوں کا جن سے ڈرایا جاتا ہے۔ یعنی اصرار علی النفاق اور عصیانِ بلا توبہ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وہ گناہ میں جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

۱۔ واضح ہو کہ امام بخاری نے دو عنوان باندھے تھے اوّل: الخوف من حبط العمل ثانی: الحذر من الاصرار علی النفاق۔ پہلے عنوان کے تحت امام نے تین آثار ذکر فرمائے یعنی اثر ابراہیم تیمی و ابن ملیکہ و حسن بصری۔ یہ تینوں آثار عنوانِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عنوانِ ثانی جو زیرِ تبصرہ ہے اس کے ماتحت امام نے ایک آیت اور دو مرفوع حدیثیں ذکر فرمائی ہیں آیت اور حدیثِ اوّل کا تعلق عنوانِ ثانی سے ہے لیکن دوسری حدیث جو حضرت عبادہ سے ہے اس کا تعلق عنوانِ اوّل سے ہے گویا لف و نشر غیر مرتب ہے۔ امام نے یہ آیت فرقہ مرجیہ کی تردید کے لیے ذکر فرمائی۔ جو یہ کہتے ہیں۔ ایمان ہو تو گناہ کچھ نقصان نہیں دیتا۔ چنانچہ آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گناہ کر کے توبہ نہ کرنے والا سخت خطرہ میں ہے اور ایمان کے ساتھ اگر گناہ ہو جائے تو وہ نقصان دیتا ہے۔

گناہ پر اصرار کے معنی

یہ آیت سورہ آلِ عمران کی ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ

مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ الخ

روایتِ کلبی میں اس آیت مبارکہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک انصاری اور ثقفی دونوں کے درمیان حضور علیہ السلام مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمادیا تھا۔ یہ دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ اتفاق سے حضور علیہ السلام ایک غزوہ میں تشریف لے تو ثقفی بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ چلے گئے اور ثقفی نے انصاری کو اپنے اہل وعیال کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کردیا۔ اس انصاری کی نظر ثقفی کی بیوی پر پڑ گئی جو نہا کر بال سنگھار رہی تھی۔ اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر ان کی نیت بدل۔ اس کو بلایا اور اس نے انکار کیا۔ انہوں نے اس کے رخسار پر زبردستی ہاتھ رکھ کر ہاتھ چوم لیا۔ اس کے فوراً بعد نادم ہو گھر سے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف چلے گئے جہاں اللہ تعالےٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگے۔ اس عرصہ ثقفی بھی آگئے۔ بیوی نے سارا ماجرا ان کو سنا دیا۔ وہ انصاری کی تلاش میں پہاڑ کے قریب پہنچے تو دیکھا انصاری گرا ہوا ہے۔ آنسوؤں سے چہرہ تر ہیں اور یہ کہہ رہا ہے ——— رَبِّ ذَنْبِيْ ذَنْبِيْ قَدْ خُنْتُ أَخِيْ۔ گناہ، میرا گناہ۔ میں نے اپنے بھائی کی اہل میں خیانت کی ہے ——— انہوں نے جب یہ حال دیکھا تو کہنے لگے۔ سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلیں۔ ممکن ہے تمہاری توبہ کا کوئی راستہ نکل آئے۔ یہ دونوں عصر کے وقت میں حاضر ہوئے۔ سارا واقعہ سنایا۔ جبریل امین مذکورہ بالا آیات لے کر نازل ہوئے۔ جس میں فرمایا گیا۔ جو لوگ گناہ کریں نادم ہوں اور وہ اس پر اصرار نہ کریں اور توبہ کرلیں تو اللہ تعالےٰ غفور رحیم ہے۔ ان کے گناہ معاف دیتا ہے۔ حضرت وجہہ الکریم نے عرض کی۔ حضور (علیہ السلام)! یہ آیت اسی انصاری کے لیے خاص ہے یا سب کے لیے ہے۔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا جو گناہ کرکے توبہ کرنے اس کے ہو جاتے ہیں۔ جو توبہ نہ کرے وہ سخت خطرہ میں ہے اور وہی گناہ پر اصرار کرنے والا ہے۔ معلوم ہوا گناہ پر اصرار کرنے جو گناہ کرکے نادم نہ ہو اور توبہ نہ کرے لیکن جس سے بمقتضاءِ بشریت گناہ ہو جائے اور وہ نادم ہو اور توبہ کرلے تو وہ پر اصرار کرنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ ترمذی میں باسنادِ حسن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو روایت ہے مضمون ہے کہ جو شخص گناہ کرکے توبہ کرے اگرچہ ستر مرتبہ گناہ کرکے توبہ کرے وہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہیں ہے۔ اس خصوص میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قابلِ ذکر ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ سے بمقتضائے بشریت اگر گناہ تو فوراً نادم ہوتے اور توبہ کرلیتے۔ چنانچہ امت نے اجماع کیا کہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسق نہیں ہوسکتا

۴۶۔ وَعَنْ زُبَيْدٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجِئَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ

(بخاری)

زبید سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے ابا مرجیہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا مجھ سے بیان کی عبداللہ بن مسعود نے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ نے فرمایا۔ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے (یعنی اس کو حلال جاننا) کفر ہے۔

فوائد و مسائل | ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ادب میں اور مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

گی اس حدیث کو لیا ہے۔ ۲- سباب کے معنی آدمی کے ناموس کو عیب لگانے کے ہیں یعنی گالی دینا۔ فسوق۔ فسق و ور۔ اس کے اصل معنی نکلنے کے ہیں۔ جیسے بولتے ہیں۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ کھجور اپنے چھلکے سے نکل گئی لیکن اصطلاح شرع میں فسق کے معنی حق سے نکلنے' اللہ تعالےٰ کے حکم کے خلاف جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں شیطان کے متعلق ہے۔ فَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ یعنی شیطان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گیا اور اللہ کا حکم اس نے نہیں مانا۔ واضح ہو کہ فسق کا معنی کفر، شرک اور گناہ پر آتا ہے۔ یعنی کبھی فسق سے مراد کفر و شرک ہوتا ہے اور کبھی وہ گناہ جو کفر و شرک نہ ہو۔ ہر جگہ سیاق و باق اور دلائلِ شرعیہ کو نظر میں رکھتے ہوئے معنی متعین کیے جائیں گے۔

زبید تابعی نے حضرت ابا وائل سے سوال کیا تھا کہ مرجیہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ کچھ نقصان نہیں دیتا۔ کیا یہ درست ے؟ اس پر حضرت ابا وائل نے مذکورہ بالا حدیث سُنا کر مرجیہ کے خیال کی تردید فرمائی۔

وقتالہ کُفر۔ مسلمان کو گالی دینا کفر ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔ یہاں کفر سے وہ اصطلاحی کُفر مراد نہیں جو آدمی کو رہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے بلکہ کفر کا اطلاق گناہ پر تغلیظاً و تنبیہاً کیا گیا ہے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ مسلم کا مسلم پر ق یہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت و اتفاق کے ساتھ رہے اور جو شخص بلاوجہ شرعی مسلمان سے جنگ کرتا ہے وہ حق مسلم کو تلف کرتا ہے فر سے مراد کفرانِ حقوقِ مسلم ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمان سے جنگ کرنا اس کو گالی دینے سے زیادہ اشد ہے تو اسی شدت کے اظہار یے قتالِ مسلم پر (جو اشد کبیرہ ہے) کفر کا اطلاق کیا گیا اور ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بلاوجہ شرعی قتل و قتالِ مسلم کو حلال جاننا فر ہے۔

م -عَنْ اَنَسٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُبَادَۃُ بْنُ صَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ سَلَّمَ خَرَجَ یُخْبِرُ بِلَیْلَۃِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰی جُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَقَالَ اِنِّیْ خَرَجْتُ خْبِرَکُمْ بِلَیْلَۃِ الْقَدْرِ وَاِنَّہٗ تَلَاحٰی لَانٌ وَّفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰی اَنْ کُوْنَ خَیْرًا لَّکُمْ فَالْتَمِسُوْھَا فِی السَّبْعِ تِّسْعِ وَالْخَمْسِ (بخاری)

حضرت انس کہتے ہیں مجھے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب قدر کی اطلاع دینے کے لیے باہر تشریف لائے۔ اتنے میں دو مسلمان جھگڑنے لگے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا میں شب قدر کی تاریخ بتانے آیا تھا لیکن فلاں فلاں جھگڑ رہے تھے اس لیے وہ اُٹھالی گئی اور شاید لیلۃ القدر کی تاریخ کا اُٹھا لیا جانا تمہارے لیے بہتر ہو (اب تم لیلۃ القدر کو رمضان کی ۲۷-۲۹-۲۵ تاریخ کو تلاش کرو۔

ت و مسائل

فَتَلَاحٰی: باب تفاعل سے ہے۔ اس کے معنی جھگڑنے کے ہیں۔ ملاحاۃ: جھگڑنے اور گالی دینے کو کہتے ہیں۔ التمسوھا: التماس کے معنی طلب کرنے کے ہیں۔ رجلان: سے مراد اللہ بن ابی حدرد اور کعب بن مالک ہیں۔ کعب کے عبداللہ قرضدار تھے۔ اس قرض کے مطالبہ میں ان کے درمیان جھگڑا ور ان کی آوازیں حضور علیہ السلام کی موجودگی میں بلند ہوگئیں جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس لیے ریف لایا تھا کہ تم کو شب قدر کی تاریخ بتاؤں مگر تمہارے جھگڑنے اور آواز بلند کرنے کی وجہ سے شب قدر اُٹھالی گئی۔

یعنی اب اس تاریخ کے بتانے سے مجھے روک دیا گیا۔ رُفِعَتْ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب رمضان کے مہینہ میں شب قدر کے
ہی کو ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا تو پھر حضور علیہ السلام یہ نہ فرماتے کہ اب تم رمضان کی ۲۷، ۲۹ یا ۲۵ تاریخ کو
تلاش کرو بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اس کی صحیح تاریخ اٹھا لی گئی ۲۔ حضرت کعب اپنے قرض کے سلسلہ میں جھگڑ رہے تھے
ظاہر ہے کہ اپنے حق کی وصول کے لیے جھگڑنا بلکہ مسجد میں جھگڑنا کوئی بری بات نہ تھی مگر چونکہ بحضور نبوی علیہ السلام وہ جھگڑے
آوازیں بلند ہو گئیں جو اگرچہ بے اختیار بلند ہوئیں مگر پھر بھی یہ امر اللہ رب العزت کو ناگوار ہوا اور ان کے جھگڑنے کی وجہ
شبقدر کی تاریخ اٹھا لی گئی مگر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت نے اس موقعہ پر بھی ساتھ دیا اور آپ نے فرمایا کہ
تمہارے جھگڑنے کی وجہ سے تاریخ تو اٹھا لی گئی ہے مگر شب قدر کی تاریخ کا اُٹھ جانا یہ بھی تمہارے لیے خیر ہے اور خیر اس
ہے کہ اب جبکہ تمہیں اصل تاریخ معلوم نہیں ہے تو رمضان کی ان تاریخوں میں ضرور قیام کرو گے اور اس کی تلاش کی
کرو گے۔ پھر اگر واقعی شبقدر کو پالو گے تو اس نعمتِ عظمےٰ کو حاصل کرو گے اور اس کے ساتھ ساتھ شبقدر کی تلاش میں
وقت صرف ہوا ہے اور شبقدر کے پانے کے لیے ہر رات میں جو عبادتیں کی ہیں ان کا اجر علیحدہ مل جائیگا واللہ وا

۳۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الصوم میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے اعتکاف میں۔ یہ حدیث عنوان
سے تعلق رکھتی ہے مگر اس سلسلہ میں شارحین نے عنوان سے اس حدیث کی جو مناسبت بیان کی ہے وہ میری سمجھ میں

بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عَنِ الْإِيْمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ وَ
عِلْمِ السَّاعَةِ وَبَيَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
لَهٗ ثُمَّ قَالَ جَآءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ
يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ فَجَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهٗ دِيْنًا وَ
مَا بَيَّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِوَفْدِ
عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الْإِيْمَانِ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ
مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ
مِنْهُ (بخاری)

باب حضرت جبریل علیہ السلام کا حضور علیہ السلام سے ایمان، اسلام، احسان اور
قیامت کے متعلق سوال کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ
کا جواب دینا۔ پھر یہ فرمانا۔ یہ جبریل تھے تمہیں
سکھانے آئے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
سب باتوں کو دین فرمایا (اور اس باب میں اس کا
ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبدالقیس
امور ایمان بتائے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین چاہے تو ہرگز
نہ ہوگا۔"

واضح ہو کہ ان عنوانات سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اسلام، ایمان، احسان، قیامت کا اعتقاد وغیرہ یہ سب
اور یہ کہ اسلام اور ایمان دونوں ایک چیز ہیں۔ حالانکہ حدیث ہذا سے اسلام و ایمان میں مغایرت ثابت ہوتی ہے
طرح اس آیت سے بھی امام نے یہ استدلال کیا ہے کہ اسلام اور دین ایک چیز ہے۔

۴۷۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ

حضرت ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت
ایک روز حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف

تَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْإِيْمَانُ قَالَ الْإِيْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ
هٖ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَبِلِقَآئِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ
ؤْمِنَ بِالْبَعْثِ قَالَ مَا الْإِسْلَامُ قَالَ الْإِسْلَامُ
نْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهٖ وَتُقِيْمَ
صَّلٰوةَ وَتُؤَدِّيَ الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَ
صُوْمَ رَمَضَانَ قَالَ مَا الْإِحْسَانُ قَالَ أَنْ
بُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ
نَّهٗ يَرَاكَ قَالَ مَتَى السَّاعَةُ قَالَ
لْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَ
خْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا إِذَا وَلَدَتِ
مَةُ رَبَّهَا وَإِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْإِبِلِ
بُهْمُ فِي الْبُنْيَانِ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ
للّٰهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
سَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ
يَةَ ثُمَّ أَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ يَرَوْا
ذَا جِبْرِيْلُ جَآءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِيْنَهُمْ

(بخاری)

(ظاہر ہوئے مجمع صحابہ میں) تو ایک آدمی آیا اس نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اللہ تعالیٰ کی لقاء پر، اس کے رسول پر اور مرنے کے بعد اُٹھنے پر ایمان رکھے۔ اس نے سوال کیا۔ اسلام کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہ تو خاص اللہ کی عبادت کرے۔ اس کا کسی کو شریک نہ بنادے نماز قائم کرے۔ زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اس نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس طرح گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا۔ قیامت کب آئے گی؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس سے قیامت کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں میں تجھ کو قیامت کی نشانیاں بتاتا ہوں (جو یہ ہیں) جب کہ عورت اپنے سردار کو جنے اور جب سیاہ اونٹ چرانے والے بڑی بڑی عمارتوں میں رہیں (اور تکبر و تفاخر کا اظہار کرنے لگیں) اور پانچ امور ہیں جن کو (بالذات) کوئی نہیں جانتا۔ سوائے خدا کے۔ پھر ضور علیہ السلام نے آیت إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پڑھی جس میں امورِ خمسہ کا ذکر ہے۔ قیامت وغیرہ کا رہے۔ پھر وہ سائل چلا گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اس کو بلا لاؤ تو صحابہ کو کچھ نظر نہ آیا۔ اس پر حضور نے فرمایا یہ جبریل ے لوگوں کو ان کا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

ئد و مسائل

اس حدیث کو علماء محدثین نے ام السنہ بھی کہا ہے۔ گویا جس طرح قرآن مجید کے تمام اہم مطالب و مضامین پر بالاجمال حاوی ہونے کی وجہ سے سورہ فاتحہ کا نام ام الکتاب ہے۔ اسی طرح یہ حدیث اپنی جہ سے ام السنہ کہے جانے کی مستحق ہے۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے امام مسلم نے مسلم کو اسی حدیث سے شروع کیا ہے ام بغوی نے اپنی دونوں تالیفوں مصابیح اور شرح السنۃ کا آغاز اسی مضمون کی حدیث سے کیا ہے۔ علامہ قاضی عیاض نے یا۔ یہ حدیث تمام وظائف و عبادات ظاہریہ و باطنیہ کو حاوی ہے۔ حتیٰ کہ تمام شریعت کے علوم کا ماخذ ہے۔ امام بخاری نے سیر و زکوٰۃ میں بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ مسلم نے ایمان میں۔ ابن ماجہ نے سنن و فتن میں۔ ابوداؤد نے سنت میں اور سائی نے ایمان میں۔ ترمذی، احمد، بزار ابن عوانہ وغیرہم محدثین نے بھی اس حدیث کو اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ بارزاً کے معنیٰ ظاہر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً تو زمین کو ظاہر دیکھ
یعنی اس پر کوئی سایہ وغیرہ نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ حضور علیہ السلام بھی ایک دن مجمع صحابہ میں ظاہر ہوئے فَاَتَاهُ رَجُ
رجل سے مراد جبریل ہیں جو بصورت رجل آئے۔ ملائکہ کی جمع ملائک ہے۔ اصل اس کی مَلْأَكٌ ہے مَفْعَلٌ کے وز
ملائکہ اجسام نوری ہیں جن کو اللہ تعالے نے یہ طاقت دی ہے کہ جو شکل چاہیں بن جائیں۔ وَرُسُلِهٖ یہ جمع ہے رسول کی
رسول وہ ہے جس پر کتاب نازل ہوئی یا فرشتہ اُترا ہو اور نبی وہ ہے جس پر کتاب یا فرشتہ نازل نہ ہوا ہو۔ اس لحاظ سے
نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ بِالْبَعْثِ اس سے مراد قبروں سے اٹھنا یعنی مرنے کے بعد زندہ کیا جانا ہے۔ تَعْبُدَ
عبادت غایت خضوع اور انتہائے تذلل کو کہتے ہیں اور اس میں یہ شرط ہے کہ جس کی عبادت کی جائے اس کی اُلوہیت
اعتقاد بھی ہو۔ اللہ رب العزت جل مجدہٗ کا علم ذاتی ہے۔ جس میں شرکت نہیں ہوتی۔ اللہ وہ ذات مقدس ہے جو
ہے متصرف بالذات ہے۔ تمام خوبیوں کا جامع اور عیبوں سے پاک ہے اور ساری کائنات کا خالق و رازق ہے۔ خدا کی
کو عبادت کہتے ہیں۔ احسان کے لغوی معنیٰ نیکی کے ہیں۔ یہ ضد ہے بُرائی کی۔ اشراط۔ یہ شرط کی جمع ہے۔ اس کے معن
(نشانی) کے ہیں۔ رب کے معنیٰ مالک، سردار، تربیت دینے والا، پالنے والا (مربّی و مصلح) کے آتے ہیں۔ یہ اللہ عزوج
بھی ہے۔ جب بغیر اضافت کے رب کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد اللہ عزوجل ہوتا ہے اور اضافت کے ساتھ تو
پر بھی اس لفظ کا استعمال جائز ہے جیسے اس حدیث میں رب بمعنی سردار آیا ہے یا جیسے ماں باپ کو رب کہتے ہیں کیو
بچے کی تربیت کرتے ہیں۔ گھر کے مالک کو، آقا کو، حاکم کو بھی رب کہتے ہیں۔ بہرحال غیر اللہ پر اس کا اطلاق اضافت کے
کرنا جائز نہیں ہے۔ اِذَا تَطَاوَلَ کے معنیٰ فخر و تکبر کے ہیں یعنی یہ قیامت کی علامت ہے کہ ذلیل اور کمینے لوگ او
محلوں میں رہیں اور تکبر و غرور کریں۔ بُهْمِ، ب کے پیش کے ساتھ وہ چیز جو بالکل سیاہ ہو۔

ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کا بیان

حدیث زیر بحث کو امام بخاری نے کتاب الزکوٰۃ وکتاب
میں بھی ذکر کیا ہے۔ محدثین کرام اس حدیث کو امام
موسوم کرتے ہیں۔ جیسے سورہ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے۔ ایسے ہی یہ حدیث علوم سنت کا خلاصہ ہے اور اس کی جز
۲۔ حدیث ہذا میں ایمان، اسلام، احسان، قیامت اور اس کی علامات کا ذکر ہے ۳۔ ایمانیات میں ایمان باللہ
انبیاء کرام، لقاء الٰہی اور بعث کا ذکر ہے اور اسلام میں عبادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ کا ذکر ہے۔ یہ حدیث دراصل مخت
مفصل میں ایمانیات میں کتب سماویہ، روز قیامت اور ہر خیر و شر کی تقدیر کا بھی ذکر ہے اور اسلام میں حج بیت الل
توحید خداوندی و رسالت محمدی کا بھی ذکر ہے۔ یہاں ہم حدیث ہذا میں جن امور کا ذکر ہے بیان کرتے ہیں۔

ایمان کے معنیٰ

ایمان کے اصل معنیٰ کسی کے اعتبار و اعتماد پر کسی بات کو سچ ماننے کے ہیں۔ کما فی القرآن
اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ (سورہ یوسف ع ۳) —— لیکن اص
شرع میں ایمان یہ ہے کہ جو علم اور ہدایت اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائیں، اس کی تصدیق کرنا اور ان کو حق جان
کرنا۔ پیغمبر کی اس قسم کی کسی بات کو نہ ماننا ہی اس کی تکذیب ہے جو انسان کو کافر کر دیتی ہے۔ لہٰذا مومن ہونے کے لیے

ماجآءَ بِہِ الرَّسُوْلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ان تمام چیزوں اور حقیقتوں کی جو اللہ کے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائے تصدیق کی ے۔ لیکن ان سب چیزوں کی پوری تفصیل معلوم ہونی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ایمانیات سے متعلق حضور سید عالم صلی اللہ یہ وسلم نے جس قدر تشریح خود فرمادی ہے اس کو اسی قدر تشریح کے ساتھ ماننا ضروری ہے اور ایمان کی جن باتوں کو حضور نے مل رکھا، ان کو اسی اجمال کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔ غرضیکہ جن امور کا ثبوت حضور علیہ السلام سے ایسے قطعی و یقینی طریقہ ے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو دین کی ایسی باتوں کو اصطلاحِ شرع میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں۔ ان سب پر یمان لانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی کا انکار کرے مومن نہیں رہے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یمان کی جو ضروری باتیں بیان فرمائی ہیں۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ان کا اسی تشریح و تعین کے ساتھ بیان آیا ہے مثلاً سورہ بقرہ کے رکوع ۱، ۲۲ و ۴۰ ہیں اور سورہ نسا کے رکوع ۲۰ ہیں۔

یمان باللہ

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے موجود وحدہٗ لاشریک خالقِ کائنات متصرفِ موجودات اور رب العالمین ہونے پر یقین کیا جائے۔ عیب و نقص کی ہر بات سے پاک اور ہر صفتِ کمال سے اس تصف سمجھا جائے اور اس کی تمام صفاتِ علم و قدرت اور کلام، سمع و بصر و حیات پر ایمان لایا جائے۔

یمان بالملائکہ

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات میں ایک مستقل نوع کی حیثیت سے ان کے وجود کو حق مانا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ و محترم مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ یاء ع ۲) —— جن میں شر، شرارت، عصیان اور بغاوت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ وہ چھوٹے بڑے گناہوں سے ب ہیں۔ اللہ کے حکم کے خلاف نہ بھول کر کھاتے ہیں اور نہ قصداً۔ ان کا کام صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے یعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (تحریم ع ۲) —— فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت، ان کو انا، یا ان کی ادنیٰ توہین کرنا، یا ان کے وجود سے انکار کرنا یا یہ کہنا کہ نیکی کی قوت فرشتہ ہے یہ سب باتیں کفر ہیں۔ شتوں کے متعلق مختلف فرائض ہیں جو یہ بحکمِ الٰہی ادا کرتے ہیں۔ مثلاً پانی برسانا، جان نکالنا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کی صورت یرہ وغیرہ۔ قرآنِ حکیم نے فرشتوں کے فرائض اور ان کی صفات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض آیاتِ قرآنیہ کا رجمہ ہم یہاں ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان پیام رسانی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ الحج ع ۱۰

۲۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی لانے کی خدمت بھی انہی کے سپرد ہے۔ شوریٰ ع ۵

۳۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں۔ حضرت زکریا و مریم کو بشارت دینے کے لیے اور حضرت لوط علیہ السلام م پر عذاب لے کر آئے۔ مریم ع ۲، ہود ع ۷

۴۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو لکھتے ہیں۔ انفطار ع ۱، انعام ع ۸، ق ع ۲۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا تعالیٰ کی رحمت یا لعنت لے کر نازل ہوتے ہیں۔ انبیاء ع ۷، الصّفّت ع شوریٰ ع ۱،

۶- اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں اور مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ آلِ عمران ع ۹

۷- جنت و دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیرِ اہتمام ہوگا۔ زمر ع ۸، رعد ع ۳، مدثر ع ۱

۸- قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل ہوں گے۔ حاقہ ع ۱، انبیاء ع ۲

۹- فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف ہیں اور بحکمِ الٰہی پوری مملکتِ الٰہیہ میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کرتے ہیں۔ شوریٰ ع ۱ والمدبرات امرا ۱

قرآنِ حکیم کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے انسانوں اور جنوں سے ایک علیحدہ مستقل مخلوق ہیں۔ چنا کے وجود پر اور اس پر کہ وہ ذوات قائمہ بانفسہا ہیں۔ تمام عقلاء کا بھی اتفاق ہے۔ البتہ ان کی حقیقت میں اختلاف کے نزدیک یہ نفوسِ ناطقہ کے علاوہ جواہرِ مجردہ قائمہ بانفسہا ہیں۔ نصاریٰ کی ایک جماعت انہیں نفوسِ بشریہ مفارقہ اکثر اہلِ اسلام کے نزدیک ملائکہ، اجسامِ لطیفہ نورانیہ ہیں۔ ایک فرماں بردار معصوم مخلوق ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے مختلف و صورِ متغایرہ میں متشکل ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔

ملائکہ کے متعلق ایک شبہ اور اس کا جواب

جو لوگ وجودِ ملائکہ کے منکر ہیں یا اس کو بھی یا خیالی چیز وہ ان کے عدمِ وجود پر سب سے اہم دلیل صرف یہ دیتے وہ موجود ہوتے تو نظر آتے۔ لیکن یہ سخت جاہلانہ شبہ ہے۔ دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے وجود کو تسلیم کیا جا وہ نظر نہیں آتیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جبکہ خوردبین کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ہوا، پانی، خون کے قطرہ میں جراثیم کیا دیکھے جاتے؟ لیکن آج خوردبین کے ذریعے ہر آنکھ والا ان جراثیم کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح رُوح کو لیجیے کیا یہ نظر آتی اقلیمِ بدن میں جو چیز جان کے نام سے موسوم ہے اور جس کے وجود کو ایک دہریہ بھی تسلیم کرتا ہے کسی آلہ سے دیکھی ہے تو جیسے ہماری آنکھیں خود اپنی روح یا جان کو دیکھنے سے عاجز ہیں۔ اسی طرح وہ فرشتوں کے دیکھنے سے بھی اس لیے یہ کہنا کہ جو چیز نظر نہ آسکے اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ سخت جاہلانہ خیال ہے۔

لقاءِ الٰہی پر ایمان

لقاءِ الٰہی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ آخرت میں عزوجل کا دیدار ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے لقاءِ الٰہی کو مومن کے لیے بہترین نعمت قرار فرمایا ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ کہ جو شخص آخرت میں دیدارِ باری تعالیٰ کی تمنا رکھتا ہے اس کو چاہیے عملِ صالح کو اختیار کرے اور اللہ کی عبادت کسی کو شریک نہ کرے۔ غرضیکہ یہ یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور آخرت میں اللہ کے نیک بندوں کو اللہ کا

یہ بھی ایمانیات میں داخل ہے۔

ایمان بالرسل

رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ اللہ عزوجل نے مخلوق کی ہدایت کے انبیاء و مرسلین مبعوث فرمائے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور پیغمبر نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا وہ حق ہے اور انہوں نے اپنے فرضِ نبوت کو کما حقہٗ ادا فرمایا۔ قرآن پاک میں ہے

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ۚ
سُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ
سُلِهٖ (البقرہ ۴۰۶)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔ ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

نیز سورہ نساء کے رکوع ۲۰ میں فرمایا۔ جس نے خدا کا اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کار کیا وہ سخت گمراہ ہوا۔ نیز سورۂ نساء کے رکوع ۲۱ میں فرمایا کہ ماننے کے معاملے میں خدا اور رسول میں کچھ فرق نہیں ہے اور تعالیٰ کے بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ وہ یقیناً کافر ۔ گویا یہ عقیدہ صرف اور صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس میں مومن ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء کی نبوت سالت کی تصدیق کی جائے۔ اس کے برعکس دنیا کے کسی مذہب میں یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایک یہودی کے لیے حضرت علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ہے۔ ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کرکے بھی عیسائی رہ سکتا ہے۔ ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر، چنڈال، ناپاک وغیرہ کہہ کر بھی ہندو رہ سکتا ہے۔ لیکن حضور سید المرسلین صلی اللہ وسلم نے یہ ناممکن کردیا کہ کوئی ان کی پیروی کے دعوے کے ساتھ ان سے پہلے کسی پیغمبر کا انکار کرسکے۔ غرضیکہ اسلام میں تمام بروں کی نبوت کی تصدیق کرنا اور ان کا پورا احترام کرنا ایمانیات میں داخل ہے۔ پھر نبوت و رسالت کے متعلق مندرجہ ذیل کو ماننا بھی ضروری ہے۔

۱۔ ہر نبی مستقل طور پر نبی ہے۔ نبوت کی کوئی قسم نہیں ہے۔ تمام انبیاء کرام نفسِ نبوت میں برابر ہیں۔ کسی نبی کی نبوت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ظل یا عکس یا پرتو نہیں اور نہ یہ کہ حضور علیہ السلام کی نبوت قدیم ہے اور باقی کی حادث۔ نبوت میں گو تمام انبیاء کرام برابر ہیں مگر مرتبہ و مقام میں فرق ضرور ہے۔ ہمارے حضور علیہ السلام تمام انبیاء کے سردار امام المرسلین تم النبیین ہیں اور آپ کا درجہ تمام انبیا علیہم السلام سے بلند و بالا ہے ۳۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ سلام تک نبوت کا سلسلہ جاری رہا اور حضور اکرم آخری نبی ہیں۔ آپ پر نبوت و رسالت کو ختم کردیا گیا اور دین کامل ہوگیا۔ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے نجات و فلاح صرف آپ ہی کے اتباع اور آپ کی ہی ہدایات کی پیروی ہے ۴۔ انبیاء کرام کے خصائص و فضائل و معجزات کو ماننا بھی ضروری ہے اور ان کی تعظیم فرض عین بلکہ تمام فرائض کی اصل ن کی ادنیٰ توہین کفر و ارتداد ہے ۵۔ انبیاء کرام چھوٹے بڑے گناہ سے قبلِ نبوت و بعدِ نبوت پاک ہیں اور تمام انبیاء معصوم ۔ انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ایک آن کے لیے ان پر وعدہ الٰہی کے مطابق موت آئی اور پھر وہ زندہ ہوگئے۔ ان شہیدوں کی زندگی سے بڑھ کر ہے (تکمیل الایمان شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ۷۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو غیوب پر مطلع کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیوب کثیرہ وافرہ کا عالم بنایا اور زمین و آسمان کا ہر ذرہ آپ کے پیش کردیا (حدیث طبرانی)۔ رے حضور افضل الخلق اور اللہ عزوجل کے نائب مطلق ہیں۔ آپ تمام انبیاء علیہم السلام کے نبی ہیں اور تمام جہان ئی کسی خوبی میں آپ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے قاسم ہیں۔ آپ کو مرتبہ معراج عطا ہوا حضور سلام نے بچشم خود رب العزت جل مجدہٗ کے دیدار کا شرف حاصل کیا اور عرش و فرش کے تمام عجائب و غرائب کا شبِ معراج

مشاہدہ فرمایا۔

نوٹ:۔ یہ چند ضروری باتیں یہاں لکھ دی ہیں۔ عقائد کی تفصیل کے لیے بہارِ شریعت حصہ اوّل کا مطالعہ کیجے

اسلام کے معانی اور اس کی حقیقت

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایمانیات کو بیان فرما چکے تو پھر سا
آپ سے اسلام کے متعلق سوال کیا۔ واضح ہو کہ اسلام کے مع
کہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور بالکل اسی کے تابع فرمان ہو جانا۔ انبیاء کرام کے لائے ہوئے دین کو اسلام اسی لیے
کہ اس میں بندہ اپنے کو بالکل اللہ تعالے کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کی مکمل اطاعت کو اپنی زندگی کا دستور بنا لیتا ہے
میں ارشاد ہے:۔

۱۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا (ج ع ۵)	تمہارا اللہ وہی الٰہ واحد ہے لہٰذا تم اسی مطیع (مسلم) ہو جاؤ۔
۲۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ (نساء ع ۱۷)	اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنے خدا سپرد کر دیا (یعنی وہ بندہ مسلم ہو گیا)
۳۔ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران ع ۹)	اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے وہ قبول نہ ہوگا اور وہ آدمی آخرت میں سخت نقصان رہے گا۔

غرضیکہ اسلام کی روح یہی ہے کہ آدمی اپنے کو کلی طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور ہر پہلو سے اس کا مطیع
انبیاء کرام جو شریعتیں لائے۔ اس میں اسلام کے لیے انہوں نے چند ارکان کی نشاندہی فرمائی۔ جن کی حقیقت اس
اسلام" کے پیکرِ محسوس کی سی ہے اور اس حقیقت کا نشوونما اور اسکی تازگی انہیں ارکان سے ہوتی ہے جو تعبدی امو
ہیں اور ظاہری نظر انہیں ارکان کے ذریعہ ان لوگوں میں فرق و امتیاز کرتی ہے۔ جنہوں نے اپنا دستورِ حیات اس
ہے اور جنہوں نے نہیں بنایا۔ بہر حال حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا جو آخری اور مکمل دستورِ حیات ہما
رکھا اس میں آپ نے عبادتِ الٰہی، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کو قرار دیا اور مفصل حدیث میں توحید خداوندی اور رسالت
کی شہادت نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کو ارکانِ اسلام قرار دیا (مسلم شریف) اور فرمایا اسلام کی بنیاد پا

۱۔ کلمہ شہادت ۲۔ نماز ۳۔ روزہ ۴۔ زکوٰۃ اور ۵۔ حج

عبادت کے معنیٰ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ کی عبادت
عبادت کے معنی انتہائے تذلل اور غایتِ خضوع کے ہیں۔ یعنی انسان اپنے آپ کو کس
ذلت و پستی کے اس آخری درجے میں سمجھے کہ جس کے بعد عاجزی اور ذلت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو۔ اس قسم کی عاجزی کر
ہے اور ایسی عاجزی عبادت ہے۔ عبادت کا تعلق نہ تو ما فوق الاسباب امور سے ہے اور نہ غائبانہ ندا سے ہے
کا تعلق محض اعتقاد سے ہے اور ظاہر ہے ایسی عاجزی اور ایسی ذلت و پستی کا اظہار اسی ہستی کے لیے کیا جا

ے متعلق صفاتِ مستقلہ کا اعتقاد رکھا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں (خود بخود اس میں موجود ہیں۔ کسی نے اس کو کوئی صفت دی نہیں) اور یہ صفاتِ ذاتیہ استحقاقِ عبادت کا مناط و مدار ہیں۔ ان صفاتِ ذاتیہ کا کسی میں ثابت کرنا ستحقاقِ عبادت و الوہیت کا ثابت کرنا ہے اور جو صفت استحقاقِ عبادت کا مناط ہے۔ خواہ وہ علم ہو یا قدرت، تصرف ہو یا خالقیت، ان کا ذاتی اور مستقل ہونا ضروری ہے ورنہ افرادِ ممکنات کا مستحقِ عبادت ہونا لازم آئیگا۔ کیونکہ عطائی غیر مستقل ادت صفات" افرادِ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ استحقاقِ عبادت کے لیے صفاتِ مستقلہ لازم ہیں اور صفاتِ مستقلہ کے لیے استحقاقِ عبادت لازم ہے۔ کسی کو مستحقِ عبادت کہنا اس کے لیے استقلالِ ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مستقل بالذات ماننا مستحقِ عبادت قرار دینا ہے۔

عبادت و تعظیم میں فرق

یہیں سے عبادت و تعظیم میں فرق معلوم ہوگیا۔ عبادت میں تعظیم بھی ہوتی ہے اور جس کی تعظیم کی جائے اس کے واجب الوجود اور مستحقِ عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہوتا ہے ور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا یعنی ہر عبادت تعظیم ہے مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تعظیم شرک نہیں ہے بلکہ جائز بلکہ بعض کی تعظیم فرضِ عین ہے۔ مثلاً قرآنِ پاک کی، انبیاء کرام علیہم السلام و ملائکہ کی تعظیم و توقیر۔ بعض کی تعظیم واجب ہے مثلاً والدین کی۔ بعض لوگ تعظیم و عبادت میں فرق نہیں کرتے یا ان کے مفاہیم سے جاہل ہیں۔ جہاں وہ غیر اللہ کی تعظیم ہوتے دیکھتے ہیں جھٹ شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ بدیہی ہے کہ تعظیم کی وہی صورت شرک قرار دی جائے گی جس میں معظم کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔ اس کے علاوہ تعظیم کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہیں ان میں سے بعض ناجائز و حرام تو ہو سکتی ہیں مگر شرک و کفر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قبر کو سجدہ کرنا اور مقبور کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کا عقیدہ رکھ کر اور اس کے لیے صفاتِ مستقلہ مان کر سجدہ کرنا شرک ہے۔ لیکن یہ اعتقاد نہ ہو اور محض قبور کی تعظیم کے لیے سجدہ کرے تو یہ ناجائز و حرام ہے مگر شرک نہیں ہے۔ غرضیکہ وہ تعظیم جو معظم کی الوہیت و واجب الوجود ہونے کے اعتقاد کے ساتھ نہ کی جائے اس میں تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس تعظیم کی کچھ صورتیں ناجائز و حرام ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اعتقاد کے ساتھ تعظیم کی جائے وہ شرک قرار پا جائے۔ سجدہ ہی کو لیجئے۔ مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگر شرک مان لیا جائے تو پھر تو (معاذ اللہ) تمام ملائکہ اور برادرانِ یوسف علیہ السلام بھی مشرک قرار پائیں گے۔ کیونکہ قرآن پاک نے یہ تصریح کی ہے کہ ملائکہ نے حضرت آدم کو اور برادرانِ حضرت یوسف نے حضرت یوسف کو سجدہ کیا تھا بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ خود اللہ عزوجل نے شرک کا حکم دیا (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اور برادرانِ یوسف کا جناب یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا ان کو واجب الوجود جان کر سجدہ کرنا نہ تھا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کی مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے لیے سجدہ تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تعظیم معظم کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے عقیدے کے ساتھ نہ کی جائے وہ شرک ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ہم اہلِ سنت و جماعت انبیاء کرام و بزرگانِ عظام کی تعظیم ضرور کرتے ہیں۔ ان سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں مگر انہیں الٰہ نہیں مانتے اور نہ استقلالِ ذاتی ان کے لیے ثابت کرتے ہیں اور نہ انہیں مستحقِ عبادت جانتے ہیں اور نہ واجب الوجود لہٰذا ہم پر

محض تعظیم کے جرم میں وہابیہ و دیوبندیہ کا شرک کا فتویٰ دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ ہم تعظیم کی ان صورتوں کو نہیں اپناتے جو ناجائز و حرام ہیں اور جن کے ناجائز ہونے پر دلائل شرعیہ مل جاتے ہیں جیسے سجدہ تعظیمی ہم اس کو حرام و ناجائز سمجھتے ہیں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کے لیے سجدہ تعظیمی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ فافہم

شرک کی تعریف

شرک کے معنی اللہ کے سوا کسی اور کو خدا جاننا یا عبادت کے لائق سمجھنا یا خدا کی صفات جیسی کسی میں ہی کسی اور میں ماننا یعنی اللہ کی تمام صفتیں ازلی، ابدی، قدیم اور ذاتی ہیں۔ مثلاً اس کا ہے۔ اس کا ہر کمال ابدی ہے۔ کسی نے اس کو دیا نہیں۔ وہ خود بخود علیم، عالم الغیب، قادر اور مختار ہے۔ تو بالکل اسی طرح غیر اللہ میں کسی صفت کو مانا جائے تو یہ یقیناً شرک ہے اور اگر اس طرح نہ مانا جائے تو یہ ہرگز ہرگز شرک نہیں۔ شرح عقائد نسفی میں

الاشراك هو اثبات الشريك فى الالوهية
يعنى واجب الوجود كما للمجوس او بمعنى
استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام

شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیت میں شریک ثابت کیا جائے
بمعنی وجوب وجود جیسا مجوس کرتے ہیں یا بمعنی استحقاق
جیسا بت پرست کرتے ہیں (شرح عقائد)

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں "بالجملہ شرک سہ قسم است در وجود و در خالقیت و در عبادت خلاصہ مطلب یہ ہے کہ شرک تین طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ کی طرح کسی کو واجب الوجود جانے ——— دوم یہ کہ اور کو کے سوا خالق جانے ——— سوم یہ کہ غیر خدا کی عبادت کرے (یا اس کو مستحق عبادت سمجھے) جلد اول صفحہ

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۔ واجب الوجود اپنی ذات اور کمالات میں دوسرے سے بالکل بے نیاز اور غنی صرف اللہ عزوجل ہے اور فقط وہی عبادت کا مستحق ہے اور کوئی نہیں ۲۔ اب جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو واجب الوجود مانے یعنی یہ کہے کہ یہ شخص اپنی ذات اور کمالات میں کسی کا محتاج نہیں ہے یا اللہ کے سوا کسی اور کو عبادت کا مستحق ٹھہرائے جیسے ہندوستان کے آریہ روح اور مادہ کو قدیم مانتے ہیں اور واجب الوجود سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ روح اور مادہ کی ذات والے سے بے نیاز ہے یہ مشرک ہیں ۳۔ اسی طرح اگر کوئی کسی کے کمالات کو ذاتی مانے اور اس کے کمال میں اس کو سے غنی اور بے نیاز سمجھے تو شرک ہے خواہ وہ کمالِ علم ہو یا قدرت یا حیات یا سمع یا بصر ہو جیسے ستارہ پرستوں کا خیال ہے کے تغیرات کواکب کی تاثیرات سے ہیں اور کواکب ان تاثیرات میں غنی بالذات ہیں۔ کسی کے محتاج نہیں۔ یہ عقیدہ بھی ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے مشرک ——— اسی طرح اگر کوئی کسی دوسرے کی عبادت کرے جس کو ہندی میں فارسی میں پرستش کہتے ہیں یہ بھی شرک ہے جیسے بت پرست بتوں کو مستحق عبادت سمجھتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں مشرک ہیں۔ لیکن! جو لوگ اللہ کے عطا کیے ہوئے کمالات اس کے بندوں میں مانتے ہیں اور کمالات کو عطاءِ الٰہی جانتے وہ ہرگز مشرک نہیں۔ مثلاً کوئی شخص آدمی کو سمیع و بصیر کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صفتِ سمع و فرمائی ہے تو وہ مومن اور موحد ہے مشرک نہیں۔ مشرک جب ہوتا ہے کہ یہ مانتا ہے کہ آدمی میں سمع و بصر کی صفت یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ عزوجل کی صفات میں سمیع و بصیر ذکر کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان کو بھی بصیر قرار دیا ہے۔ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ اور یہ شرک اس لیے نہیں کہ انسان میں جو سمع و بصر ثابت کی

وہ عطائی ہے خدا میں ذاتی ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں کتب و سنت سے دی جاسکتی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کسی بھی کمال کو جو ممکن البشر ہے غیر اللہ میں عطائی مانا جائے تو شرک نہیں اور ذاتی مانا جائے تو شرک ہے۔ اگر ذاتی و عطائی کا فرق نہ کیا جائے تو پھر تو انسان ہر بات میں مشرک ہو جائے۔ مثلاً یہ کہے، ’میں سنتا ہوں‘ میں دیکھتا ہوں میں موجود ہوں۔ غذا نے قوت دی۔ پانی نے پیاس بجھائی۔ آگ نے جلایا۔ سردی نے نقصان پہنچایا۔ دوا نے فائدہ دیا، یہ سب باتیں شرک ہو جائیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ دوا نے شفا دی تو اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دوا میں شفا دینے کی طاقت اور تاثیر اللہ تعالٰے نے پیدا کی ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو نہ میں دیکھ سکوں اور نہ دوا اپنا اثر دکھا سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی کمال کو غیر اللہ میں اگر ذاتی مان لیا جائے تو وہ شرک ہے اور اگر عطائی طور پر مانا جائے تو وہ ہرگز شرک نہیں ہے۔ جو شخص عطائی کمال کو غیر اللہ میں ماننے کو شرک کہتا ہے وہ جاہل ہے اور اگر جان بوجھ کر کہتا ہے تو خود کافر ہے کیونکہ اس نے عطائی کمال ماننے والے کو مشرک کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ تعالٰی کے کمالات اور صفات عطائی ہیں اور وہ مستغنی اور بے نیاز نہیں ہے۔

احسان کے معنیٰ

ایمان اور اسلام کے بعد سائل نے احسان کے متعلق حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ احسان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ احسان بھی دراصل اسلام اور ایمان کی طرح دینی اور قرآنی اصطلاح ہے ارشادِ ربانی ہے:۔

۱۔ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ	ہاں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ محسن ہے (یعنی وصفِ احسان اس میں موجود ہے) تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔
۲۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ	اور اس سے اچھا دین اور کیا ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دیا اور وہ محسن ہے۔

معلوم ہوا کہ احسان قرآنِ پاک کی ایک خاص اصطلاح ہے اور یہ ایک خاص وصف ہے جو مومن مخلص میں پایا جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ثواب عظیم ملتا ہے۔ ویسے تو احسان کے معنی کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں لیکن حدیث ہذا میں جس احسان کا ذکر ہے۔ اس کی حقیقت خود زبانِ نبوت نے بیان فرما دی ہے یعنی احسان یہ ہے کہ:۔

”خدا کی بندگی ایسے کی جائے کہ وہ قہار و قدوس ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔“

اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے عموماً ان دونوں وقتوں کے طرزِ عمل میں فرق ہوتا ہے اور عام طور پر جس خوش اسلوبی، محنت اور دیانت کے ساتھ وہ آقا کی موجودگی میں کام کرتا ہے۔ مالک کی عدم موجودگی میں اس کا وہ حال نہیں ہوتا تو یہی حال بندوں کا اپنے مالک حقیقی کے ساتھ ہے۔

جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میرا رب میری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ وہ حاضر و ناظر ہے۔ میرے ہر کام کی خبر ہے۔ اس تصور کے ساتھ جب بندہ عبادت کرتا ہے تو اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیاز مندی ہوگی جو اس وقت ہو سکتی۔ جب کہ بندہ کا دل اس احساس سے خالی ہو۔ تو احسان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طریقے سے کی جائے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احسان اور احتساب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ احتساب کے معنیٰ یہ ہیں کہ عمل میں خلوص کو پہنچ جائے اور ریا کا شائبہ بھی نہ رہے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ یہ یقینِ محکم ہر وقت قائم رہے کہ اس قادر و قدیر خدا ہماری کوئی حرکت پوشیدہ نہیں ہے اور جب اس تصور سے عمل کیا جائے تو یقیناً اس میں خلوص ہوگا۔

ہر عمل میں احسان

پھر احسان کا تعلق صرف نماز ہی سے نہیں ہے کہ بس نماز کو پورے خشوع و خضوع سے جائے بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ اسی لیے اس واقعہ کی دوسری کے الفاظ یہ ہیں:۔

۱۔ اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ	احسان یہ ہے کہ تم خدا سے اس طرح ڈرو اس کو دیکھ رہے ہو۔
۲۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ	احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ کے لیے اس طرح گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

ان دونوں روایتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احسان کا تعلق صرف نماز سے نہیں بلکہ تمام اعمالِ خیر سے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی اور اس کے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس مواخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ یہی احسان ہے۔

کیا دُنیا میں دیدارِ الٰہی ممکن ہے؟

بعض لوگ کانک تراہ حدیث کے اس ٹکڑے سے یہ ثابت کرنے کی کرتے ہیں کہ دنیا میں اللہ عزوجل کا دیدار ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اللّٰہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ اشارہ ہے مقامِ فنا کی طرف کہ جب بندہ اپنی ذات کو بالکل فراموش کر دے گا گویا کہ اس کا ہی نہیں ہے تو اس منزل پر پہنچ کر وہ خدا کو دیکھ لے گا لیکن یہ معنیٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کے متعلق تو نصوص کہ دنیا میں خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ مسلم شریف میں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا	جان لو تم اس دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتے حتیٰ کہ مر جاؤ (مسلم شریف)

۱۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دنیا میں دیدارِ باری تعالیٰ ممکن نہیں البتہ آخرت میں ہر مومن کو اس کے دیدار شرف حاصل ہوگا جیسا کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب ہے ۲۔ اس کے بعد قرآن پاک میں ہے:۔

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ	اپنے رب کی موت آنے تک عبادت کرو

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک مکلف ہے جب تک کہ زندہ ہے اور مرجانے کے بعد اس پر کچھ فرض یں رہتا۔ تو اگر عبادت میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوجاتا ہے تو پھر تو دیدار باری کے بعد اس پر نماز فرض ہی نہیں رہے گی کیونکہ یدار باری موت کے بعد ہی ہوتا ہے تو چاہیئے کہ جس کو خدا کا دیدار ہوجائے وہ عبادت ہی ترک کردے حالانکہ یہ بات نہیں ہے یز الفاظِ حدیث بھی اس مطلب کے متحمل نہیں ہیں کیونکہ " كَأَنَّكَ تَرَاهُ " کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم عبادت میں خوب خشوع اور خضوع پیدا کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ فان لم تراه۔ تو اگر چہ تم اس کو دیکھتے نہیں تو وہ تم کو یکھ رہا ہے اور جب وہ تم کو دیکھ رہا ہے تو پھر عبادت و بندگی ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ مالک کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ غرضیکہ یث کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ عبادت میں جب بندہ محو ہوجائے اور اپنی ذات کو فنا کردے تو پھر وہ خدا یکھ لیتا ہے ۔۔ ہاں بعض عرفاء کرام نے حدیث کے اس ٹکڑے کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس میں عبادت کے دو درجوں کی طرف شارہ ہے۔

اول: كَأَنَّكَ تَرَاهُ عبادت کرو اللہ کی گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی عبادت مشاہدہ حق کے ساتھ یہ مقام ہے عرفاء کاملین کا دوم: فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ۔ پس اگر یہ مقام (مشاہدہ) تمہیں حاصل نہ ہو پھر عبادت کرو اللہ کی اس طرح کہ ہم اس کے سامنے ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ مقام ہے درجہ دوم کے عارفوں کا مگر اہر ہے کہ یہاں مشاہدہ حق سے ذاتِ خدا کی رویت مراد نہیں بلکہ تجلیات و انوارِ صمدیہ کی رویت مراد ہے اور یہ بات بالکل ق ہے کہ ہر ایک کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا کہ وہ برکاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرے۔ اس کا مدار تو قلب کی صفائی، باطن کی پاکیزگی تقویٰ کی زیادتی پر ہے۔ جس کا تقویٰ بڑھا ہوا ہوگا وہ یقیناً انوارِ صمدیت اور برکاتِ احدیت کا مشاہدہ کرے گا اور جو س درجہ پر ہوگا وہ نہ کرسکے گا۔ بہرحال اس توجیہ پر احسان کے دو درجے ہوگئے۔

قیامت کا اعتقاد

اس کے بعد سائل نے پوچھا۔ حضور (علیہ السلام) قیامت کب آئے گی اس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے سوال ہورہا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا یعنی قیامت رِ غیب سے ہے اور غیب کا علم بے تعلیم الٰہی بحجابِ عقل کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس میں امور کا ذکر ہے کہ ان کو بالذات خدا ہی جانتا ہے۔ ان الله عنده علم الساعة الخ واضح ہو دینِ اسلام کے ایمانیات خری کڑی قیامت پر ایمان ہے۔ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ یعنی ایک دن ساری کائنات فنا ہوجائے گی۔ اللہ عزوجل کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ دوبارہ مخلوق کو پیدا فرمائے گا۔ قرآنِ پاک میں قیامت سیوں ناموں سے ذکر آیا ہے اور ہر نام اس کے خاص پہلو نمایاں کرتا ہے۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب کہ خداوند عالم کے سب کچھ فنا ہوجائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ اعمال کا مواخذہ ہوگا۔ حساب و کتاب کے نیکیوں کا ثواب ملے گا اور برائیوں پر سزا دی جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل یئے جائیں گے اور حیات و ممات کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔

یامت کی علامتیں

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ حدیث

ہذا میں صرف دو علامتوں کا ذکر فرمایا۔ لیکن دوسری احادیث میں علاماتِ قیامت کا تفصیلی بیان ہے۔ اس حد قیامت کی صرف دو خاص نشانیاں بیان ہوئی ہیں :-

اول : یہ کہ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی —— گو شارحین نے اس جملے کے متعدد مفہوم بیان فرمائے ہیں زیادہ رائج توجیہ جو الفاظ حدیث سے بالکل مطابق ہے۔ یہی ہے کہ قرب قیامت میں ماں باپ کی نافرمانی عام ہو واقعہ کی دوسری روایت میں رَبَّتَهَا کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی یعنی عام طور میں والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے اور جن سے لڑکوں کے بالمقابل والدین سے سرکشی ہی شکل ہوتی ہے وہ بھی قربِ قیامت میں نہ صرف یہ کہ والدین کی نافرمان ہو جائیں گی بلکہ الٹی ان پر حکومت چلائیں گی ایک مالکہ اپنی زرخرید لونڈی پر حکومت کرتی ہے۔ اسی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا کہ عورت اپنی عورت سے جو لڑکی پیدا ہوگی وہ بڑی ہو کر خود اپنی ماں پر حکومت چلائے گی اور جب لڑکیوں کا یہ عالم ہوگا تو لڑکوں کا کیا

دوم : دوسری علامت حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ قربِ قیامت میں کالے اونٹ چلانے والے محل بنوائیں گے اور تکبر و غرور کریں گے۔ عرب میں سیاہ اونٹ حقیر سمجھے جاتے تھے۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ دنیاوی ان کمینوں اور رذیلوں کے ہاتھ آجائے گی جو اس کے اہل نہ ہوں گے۔ یہ شاندار محل بنوانے اور اپنے عیش و آرام کے میں مصروف رہیں گے اور اسی کو سرمایۂ فخر و مباہات جانیں گے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے جوڑ توڑ کرتے رہیں گے میں قوم کا درد نہ ہوگا۔ یہ متکبر اور ظالم ہوں گے اور اسی ظلم و تکبر میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں گے کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے :-

إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ	جب حکومت اور مناصب نااہلوں کے سپرد تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔

کوئی شک نہیں، زبانِ نبوت کی ان پیش گوئیوں کے ظہور کی ابتداء ہو چکی ہے۔

جبریل کی واپسی

جب یہ سوال و جواب ختم ہو گئے تو سائل اٹھ کر چلے گئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ان صحابہ نے تلاش کیا مگر نہ ملے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ جبریل امین تھے آئے تھے تاکہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ ظاہر ہے کہ جبریل علیہ السلام سائل بن کر آئے نہ کہ معلم مگر اس کے با معلم اس لیے فرمایا کہ ان کے سوال کے ذریعہ سے صحابہ کو دین کی تمام ضروری باتوں کا علم ہو گیا اور زبانِ نبوت خلاصہ اور لب لباب بیان فرما کر صحابہ کے علم کی تکمیل کرا دی گئی اور ان کو اس امانت کا امین بنا دیا گیا۔

کیا قیامت کا علم کسی کو نہیں

منکرینِ علمِ غیب نبوی بخاری کی اس حدیث کو بڑے زور شور سے ہیں کہ دیکھو جب جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے قیامت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا اور اسی پر بس نہیں۔ حضور علیہ السلام نے اس کے بعد وہ آیت بھی بطور استشہاد پڑھی جس میں یہ ہے کہ پانچ غیب ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں

ست بھی ہے ۔ لہذا ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کا علم نہیں اور آپ جمیع اشیا کے عالم نہیں ہیں۔

جواب : جو آیہ مبارکہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ باتیں ایسی ہیں علم حقیقی خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور وہ یہ ہیں ۱۔ قیامت کا وقت ۲۔ بارش کب ہوگی ۳۔ پیٹ میں لڑکا ہے یا کل یہ کیا کرے گا ۵۔ اور کس زمین پر مرے گا ——— لہذا ضروری ہے کہ دیانتداری کے ساتھ دلائل شرعیہ پر تے ہوئے یہ غور کیا جائے کہ اس آیت کا صحیح مطلب کیا ہے ۔

۔ یہ پانچ غیب کی باتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالے کسی کو بتانے پر قادر نہیں ہے اگر مطلب یہ لیا جائے تو عقلاً و ل ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے ۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ لہٰذا یہ مان لیا جائے کہ اللہ پانچ امور غیبیہ پر کسی کو مطلع کرنے پر بھی قادر ہے ۔

یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مطلع کر دینے اور بتا دینے سے بھی کوئی ان غیب کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتا تو ایسا کہنا صریحاً جہالت نکہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا علم عطا فرما دیا تو وہ شخص اس چیز کا عالم ہو گیا ۔ عالم کو جاہل کہنا اپنی جہالت کا اعتراف ہے ۔

۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا تو یہ بھی غلط ہے اور ایسا کہنا قرآن اور حدیث کی متعدد نصوص کا انکار ے جو کفر ہے ۔ کیونکہ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر اپنے برگزیدہ رسولوں کو مطلع کرتا ہے ۔ وہ آیت یہ ہے ۔ ظہرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ جس سے قطعی طور پہ یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص ں کو غیب پر مطلع فرماتا ہے ۔

۔ یہ کہ غیب پر مطلع تو فرماتا ہے مگر ان پانچ چیزوں پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا تو ایسا کہنا بھی غلط ہے ۔ کیونکہ احادیث ے ثابت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ امور کا علم بھی عطا فرمایا جیسا کہ ابھی ہم ذکر کر چکے

لہذا اس توضیح سے آیت کا مفہوم صحیح یہ معلوم ہوا کہ یہ پانچ امور غیبیہ بالذات صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ ان کے سوا کوئی جانتا کیونکہ خدا کا علم ذاتی ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی چیز کا بالذات عالم نہیں ہے تو آیت زیر بحث میں جو یہ فرمایا گیا کہ باتوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے ۔ اس علم سے علم ذاتی مراد ہے ۔ اب رہا یہ کہ اللہ تعالے کے بتانے سے بھی کسی کو ان پانچ عطائی نہیں حاصل ہوتا ہے اس میں اس کی ہرگز ہرگز نفی نہیں ہے ۔ چنانچہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے اس سے مراد بھی ذاتی علم کی نفی ہے عطائی کی نہیں اور جب آیت میں ذاتی علم کی نفی ہے تو حضور علیہ السلام کلمات کہ :۔ " جس سے سوال کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے وقت کے متعلق سائل سے زیادہ نہیں جانتا ۔ " میں بھی ذاتی نفی ہے یعنی اٹکل سے یا بالذات نہ تم وقتِ قیامت کو جانتے ہو اور نہ میں ۔ رہا اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے سے جاننا اس یت میں ہے اور نہ حضور علیہ السلام کے ان کلمات میں ۔ چنانچہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشعۃ اللمعات مشکوٰۃ کتاب الایمان میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

راد آنست کہ بے تعلیم الٰہی بحساب عقل ہیچ کس نداند از امور غیب اند کہ جز خدا کسے آں را نداند مگر	یعنی مراد یہ ہے کہ ان امور غیب کو بغیر اللہ کے بتائے ہوئے عقل کے اندازے سے کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ ان کو خدا کے

آں کہ وے تعالیٰ از نزد خود کسے را بوحی و الہام بدانانند	سوا کوئی نہیں جانتا مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی بتادے وحی سے یا الہام سے۔

تفسیراتِ احمدیہ میں اسی آیت کے ماتحت شیخ ملا جیون استاد عالمگیر بادشاہ علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا کہ
پانچوں باتوں کو اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے محبوبوں اور ولیوں میں سے جس
بتادے کیونکہ لفظ خبیر بمعنی مخبر ہے (تفسیراتِ احمدیہ)

یہی مضمون تفسیرِ صاوی زیرِ آیت ماذا تکسب غدا تفسیر عرائس البیان زیرِ آیت یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَ
تفسیر روح البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ ان پانچوں باتوں کا علم بے تعلیمِ الٰہی کسی کو نہیں لیکن اللہ کی تعلیم دینے سے
کو اور ان کے وسیلہ سے اولیاءِ کرام کو بھی حاصل ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیلی معلومات اور مکمل جوابات کے لیے کتاب الکل
مصنفہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب علیہ الرحمۃ مراد آبادی کا دیکھنا مفید ہوگا۔ حدیث چونکہ زیرِ بحث
اس لیے مختصر گفتگو کی گئی۔

اب ہم ان احادیث کو بھی پیش کر دیں جن سے یہ واضح ہوگا کہ حضور علیہ السلام کو "امورِ خمسہ" کا علم بھی عطا ہوا۔
بخاری شریف کی کتاب بدء الخلق و ذکرِ الانبیاء میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور
علیہ وسلم نے ابتدائے آفرینش سے تا قیامِ قیامت کی خبر دیدی۔ حتیٰ کہ اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں
یعنی از روزِ اول تا قیامِ قیامت ایک ایک ذرہ کی خبر حضور علیہ السلام نے دیدی۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔

۱۔ فَاَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مشکوٰۃ باب المعجزات)	ہم کو حضور علیہ السلام نے تمام ان واقعات کی خبر قیامت تک ہونے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے قیامت تک کے تمام ہونے والے واقعات بیان فرما دیے تو اب یہ کیسے
کہ آپ کو قیامت کا علم نہ ہو کیونکہ دنیا ختم ہوتے ہی قیامت ہے اور حضور علیہ السلام کو یہ علم ہے کہ کونسا واقعہ کس کے
تو جو آخری واقعہ ارشاد فرمایا وہی دنیا کی انتہا ہے اور قیامت کی ابتداء۔ تو اس حدیث سے ثابت ہوئی کہ حضور علیہ
قیامت کے وقت کا علم ہے۔

۲۔ ترمذی باب العَلَامَاتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فتنہ یاجوج ماجوج کے
اللہ تعالیٰ عالمگیر مینہ بھیجے گا۔

مشکوٰۃ باب لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى اَشْرَارِ النَّاسِ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا جب
جائیں گے تو بارش ہوگی۔ جس سے آدمیوں کے جسم بحال ہو جائیں گے۔ دیکھئے بارش کب آئے گی؟ اس کی خبر
سینکڑوں برس پہلے دے رہے ہیں۔

۳۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام مہدی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ اس سے واضح ہوا کہ حضور
لڑکا پیدا ہونے کی اس وقت سے ہے جب نطفہ بھی باپ کی پیٹھ میں نہیں۔ ایسے ہی حضور علیہ السلام نے حضرت

حسین علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اطلاع دی۔ (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ کل کی بات کی اطلاع اسی حدیث سے ثابت ہو رہی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے قیامت تک ہونے والے قعات بیان فرما دیئے۔ نیز بوقتِ جنگِ خیبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کل ہم فوج کا نشان ایسے شخص کو دیں گے جس کے ہاتھ خیبر فتح ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ کل کی خبر حضور علیہ السلام نے دی۔

۵۔ خود اپنی وفات شریف کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ معاذ قریب ہے کہ اس سال کے بعد ہماری تمہاری ملاقات اور تم میری اس مسجد اور قبر پر گزرو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ عسیٰ ان لاتلقانی بعد عامی ھذا ولعلک ان س بمسجدی ھذا وقبری۔ اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے نہ صرف اپنی وفات کی اطلاع دی بلکہ اپنی ت کی جگہ اور قبر مبارک کی جگہ بھی بتا دی۔ بہرحال اس قسم کے مضمون کی سینکڑوں حدیثیں ہیں جو اس امر پر دال ہیں کہ حضور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ عزوجل نے ان پانچ باتوں کا علم بھی عطا فرمایا۔ اور مفسر شہیر حضرت علامہ سید محمود آلوسی روح المعانی لکھتے ہیں:۔

یُقْبَضْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تّٰی عَلَّمَ کُلَّ شَیْءٍ یُمْکِنُ الْعِلْمُ بِہٖ
(تفسیر روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۵۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک وفات نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس چیز کا علم نہیں دے دیا۔

جس کا علم آپ کو دینا ممکن تھا —— اور قیامت کے وقت کا علم عطا ہونا محال نہیں ہے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام یامت برپا کرنے کا جب حکم ہوگا تو وقتِ قیامت ان پر ظاہر ہوگا۔ جب حضرت اسرافیل کو قیامت کے وقت کا علم دیا جاتا ہے تو حضور سید العلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیوں ناممکن ہو۔ اسی لیے شارح بخاری علامہ قسطلانی فرماتے ہیں۔

لَا یَعْلَمُ مَتٰی تَقُوْمُ السَّاعَۃُ) اَحَدٌ اِلَّا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یُطْلِعُہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ غَیْبِہٖ والولی التَّابِعُ خُذُ عَنْہٗ

اللہ تعالےٰ کے سوا وقت وقوعِ قیامت کو کوئی نہیں جانتا سوا ان کے جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے جو اللہ کے رسول ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر جس کو چاہتا ہے مطلع فرما دیتا ہے اور اولیاء اللہ جو رسولوں کے تابع ہوتے ہیں وہاں یب کا علم حاصل کرتے ہیں۔

بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور آپ تو تمام کمالاتِ اولین و آخرین کے جامع ہیں۔ امام قرطبی اور علامہ آلوسی اور سیدی احمد بن مبارک تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام کو بھی حضور کے وسیلہ سے علوم کا علم حاصل ہوتا ہے —— امام قرطبی فرماتے ہیں:۔

ن ادَّعٰی عِلْمَ شَیْءٍ غَیْرِ مُسْنَدٍ اِلٰی سُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَاذِبًا دَعْوَاہُ

جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر ان پانچ چیزوں کے علم کا دعویٰ کیا وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔

اور سیدی غوث عبدالعزیز دباغ رضی اللہ عنہ سے جب ان پانچ چیزوں کے علم کے بارے میں پوچھا گیا تو

فَقَالَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَعَنْ سَادَتِنَا الْعُلَمَاءِ وَكَيْفَ يَخْفٰى اَمْرُ الْخَمْسِ عَلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْوَاحِدُ مِنْ اَهْلِ التَّصَرُّفِ مِنْ اُمَّتِهِ الشَّرِيْفَةِ لَا يُمْكِنُهُ التَّصَرُّفُ اِلَّا بِمَعْرِفَتِهَا (ابریز صـ ۲۸۲)

سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں کہ ہمارے نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پانچ کیسے مخفی ہو سکتا ہے جب کہ آپ کی اُمّت کے ان کا علم پوشیدہ نہیں ہے اور اس وقت تک اس کائنات میں تصرف نہیں کر سکتے جب تک کا انہیں علم نہ ہو۔

اہلِ علم و فکر کے لیے یہاں یہ بات خصوصی طور پر غور و فکر کی متقاضی ہے کہ حضرت جبرائیل کے سوال نے وقتِ قیامت کے علم کی نفی نہیں فرمائی۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے وقتِ قیامت کا علم نہیں ہے بلکہ نہایت لطیف یہ فرمایا کہ قیامت کے بارے میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ آپ کا علم تو تھا مگر متعدد حکمتوں کی بنا پر اس کا اظہار اس لیے نہیں فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے دوسروں کو علمِ قیامت سے حضور کو منع فرما دیا تھا جیسا کہ قسطلانی آلوسی اور علامہ صاوی نے تصریح فرمائی۔

نبی علیہ السلام کو تین قسم کے علم عطا ہوئے

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اللہ تعالےٰ نے تین قسم کے ہیں (مدارج ج ۱ صفحہ ۱۶۸) اوّل وہ علم جس کا تعلق تبلیغِ دین سے ہے (یعنی اسلام کے وہ احکام و اعمال جن کی تبلیغ اور انہیں امت تک پہنچانا آپ کا فرضِ نبوت ہے اور جن کی تبلیغ میں کوتاہی آپ کی ذاتِ اقدس نہیں ہے اور جس کے متعلق سورہ مائدہ میں ارشاد ہے۔

يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ: ۶۷)

اے رسول پہنچا دو جو کچھ نازل ہوا تم پر تمہارے سے۔ ایسا نہ ہوا تو تم نے رب کا کوئی پیغام نہ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے۔

دوم، وہ علم جس کے متعلق حضور علیہ السلام کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جسے اس علم کا اہل سمجھیں اُسے بتا دیں خصوصی طور پر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو منافقین کی پہچان کا علم دیا (اسد الغابۃ ج: ۱ صـ ۹۱ وہ علوم جن کے ساتھ حضور نے حضرت ابوہریرہ کو خاص کیا اور انہیں وہ علوم عطا فرمائے۔ چنانچہ جناب ابوہر

حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَاءَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا بَثَثْتُهٗ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ (بخاری ج: ۱ صـ ۲۳)

میں نے نبی علیہ السلام سے دو برتن علم کے ایک تو وہ جس کو میں نے نشر کر دیا اور دو کے علم کو ظاہر کر دوں تو میری دی جائے۔

سوم وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے حضور کو دیا مگر دوسروں پر اس کے انکشاف سے منع فرمادیا۔ جیسے علوم خمسہ (یعنی قیامت کا علم، بارش کب ہوگی، کل کیا ہوگا، کون کہاں وفات پائیگا۔ شکمِ مادر میں کیا ہے) اور سب کا علم بھی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ مگر دوسروں پر اس کے اظہار و بیان سے منع فرمادیا۔

چنانچہ علامہ شیخ احمد صاوی مالکی فرماتے ہیں۔

قَالَ الْعُلَمَاءُ الْحَقُّ اِنَّهٗ لَمْ يَخْرُجْ نَبِيُّنَا مِنَ الدُّنْيَا حَتّٰى اَطْلَعَهُ اللّٰهُ عَلٰى تِلْكَ الْخَمْسِ وَلٰكِنَّهٗ اَمَرَهٗ بِكَتْمِهَا

(تفسیر صاوی ج ۳ ص۲۱۵)

علماءِ کرام نے فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا سے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کے علوم پر مطلع نہیں فرمادیا۔ لیکن آپ کو ان علوم کے مخفی رکھنے کا حکم فرمادیا۔

اب رہا یہ سوال کہ علمِ قیامت کے انکشاف سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیوں منع فرمادیا تھا تو اس کی متعدد وجوہ ہیں جن میں سے دو یہ ہیں۔ سورہ اعراف میں ارشادِ ربانی ہے۔

لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً | قیامت نہیں آئے گی مگر تم پر اچانک

تو اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام قیامت کے وقت کا اظہار فرمادیتے تو تصریحِ قرآنی کے مطابق قیامت بغتۃً (اچانک) نہ رہتی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر قیامت کے وقوع کا وقت معلوم ہوجائے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے اور قیامت کے قریب آنے سے پہلے ہی انسان پر قیامت قائم ہوجائے جو کہ ناممکن ہے اس لیے علمِ قیامت کے اظہار سے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمادیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جبرائیل امین نے قیامت کی علامات سے متعلق سوال کیا تو حضور نے علاماتِ قیامت میں سے چند بیان فرمادیں اور بعض احادیث میں وقوعِ قیامت کا دن، مہینہ، تاریخ تک بیان فرمادی۔ مثلاً یہ کہ محرم کی دس تاریخ جمعہ کے دن قیامت آئے گی۔ صرف سن نہیں بتایا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کو قیامت کا علم نہ تھا۔ بلکہ وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے اظہار و انکشاف سے منع فرمادیا تھا۔ (فافہم)

الغرض حضور علیہ السلام کے جوابی کلمات ما المسئول عنہا اعلم من السائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضور علیہ السلام کو قیامت کا علم نہیں تھا۔ پھر اعلم اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنیٰ ہیں "بہت جاننا"۔ تو حضور علیہ السلام نے اپنے جاننے کی نفی نہیں کی بلکہ زیادہ جاننے کی نفی فرمائی۔ اسی لیے جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے قیامت کی نشانیاں پوچھیں تو آپ نے بتائیں بلکہ کثیر علاماتِ قیامت متعدد دوسری احادیث میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ جس کو قیامت کا علم نہ ہو اس سے قیامت کی نشانیاں پوچھنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ نیز نبی علیہ السلام نے جس انداز سے جبریل امین کو جواب دیا۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ وقتِ قیامت کا علم بالذات اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ کہ ایک مومن کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ قیامت پر ایمان لائے اور قیامِ قیامت کو حق سمجھے اور بس لیکن

وقتِ قیامت کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں حضرت مُلّا علی قاری نے مرقات جلد اول میں اور امام قسطلانی اور علامہ عینی نے تحریر فرمایا ہے:۔

فَمَنِ ادَّعٰى عِلْمَ شَيْءٍ مِنْهَا غَيْرَ مُسْتَنِدٍ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ كَاذِبًا فِيْ دَعْوَاهُ (عینی جلد ۱ ص ۳۳۷)

جو شخص ان پانچ چیزوں میں سے کسی چیز کے علم کا دعویٰ کرے حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کے بغیر وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

یعنی جو شخص یہ کہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر قیامت کے وقت کو جانتا ہوں وہ جھوٹا ہے کہ حضور اکرم علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر کوئی غیب پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ لمعات میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں

اَلْمُرَادُ لَا تَعْلَمُ بِدُوْنِ تَعْلِيْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى

مراد یہ ہے کہ ان پانچ باتوں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر کوئی

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے اسی حدیث کی شرح میں لکھا کہ جب رُوح روشن ہو جائے اس کی نُورانیت اور اثر میں اضافہ ہو جائے اور آئینۂ قلب کدوراتِ نفسانیہ سے پاک ہو جائے اور بندہ علم و عمل پر مواظبت کرے یعنی حضور سیّد عالم صلی علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے اور شریعت کی پابندی کرے۔

حَتّٰى يَقْوٰى النُّوْرُ وَيَنْبَسِطُ مِنْ فَضَاءِ قَلْبِهٖ فَتَنْعَكِسُ فِيْهِ النُّقُوْشُ الْمُرْتَسِمَةُ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ وَيَطَّلِعُ عَلَى الْغَيْبَاتِ وَيَتَصَرَّفُ فِيْ اَجْسَامِ الْعَالَمِ السُّفْلِيِّ بَلْ يَتَجَلّٰى حِيْنَئِذٍ الْفَيَّاضُ الْاَقْدَسُ بِمَعْرِفَتِهِ الَّتِيْ هِيَ اَشْرَفُ الْعَطَايَا فَكَيْفَ بِغَيْرِهَا

حتیٰ کہ اس کا نورُ قوی ہو جائے اور فضا قلب میں پھیل جائے تو پھر قلب پر لوح محفوظ کے نقوش کا عکس آتا ہے اور آدمی مغیبات پر مطلع ہوتا ہے اور اجسام عالم سفلی میں تصرف کرتا ہے بلکہ اس وقت فیاضِ اقدس کی معرفت کا انکشاف ہوتا ہے جو کہ بہترین نعمت ہے تو دیگر نعمتیں کس شمار میں؟

حضرت مُلّا علی قاری کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بندہ تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے لیے لوح محفوظ کے نقوش اور غیوب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ایک مومن و متقی کا یہ حال ہے تو حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مرتبہ ہوگا۔

مسائلِ حدیث

حدیث زیر بحث سے مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کے رسولوں پر اور بعث و نشور پر ایمان لائے۔ یعنی ان حقیقتوں پر ایمان لایا جائے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائیں ۲۔ اسلام یہ ہے کہ بندہ بالکل اپنے کو اللہ کا مطیع و فرماں بردار بنا دے۔ اسی کا نام اسلام ہے اور ارکانِ اسلام عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی کے مظاہر ہیں۔ احسان یہ ہے کہ اللہ کی ہستی کا ایسا استحضار اور دل کو مراقبہ حضور و شہود کی ایسی کیفیت نصیب ہو جائے کہ اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی بندگی اس طرح ہونے لگے گویا کہ وہ پاک، بے نیاز اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے اور ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے دین کی باتیں پوچھو۔ صحابہ کرام سوالات کے لیے ہوئے تو پھر جبریل امین انسانی شکل میں حاضر ہوئے اور انھوں نے مذکورہ سوالات کئے (مرقات، ج ۱ ص ۴۳)

معلوم ہوا کہ جبریل امین کی حاضری اس لیے تھی تاکہ وہ اپنے عمل سے بتادیں کہ نبی (علیہ السلام) کے دربار میں حاضری کے ب کیا ہیں اور نبی سے سوال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سلیمان تیمی کی روایت میں ہے کہ جبریل امین دربارِ نبوت میں ایسے بیٹھے جیسے نمازی نماز میں بیٹھتا ہے۔ کما لس احدنا فی الصلوٰۃ (عینی ج ۱ ص ۳۲۹) مسلم شریف میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو روایت ہے، س یہ بھی ہے کہ جبریل امین حضور علیہ السلام کے دربار میں دو زانو ہو کر بیٹھے اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں کو دیئے۔

حضرت ملا علی قاری اس موقع پر لکھتے ہیں کہ جبریل امین بالکل انسانی شکل میں حاضر ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوری س بشری میں آتے ہیں اور اس میں حکمت یہ تھی کہ لوگوں کا ان سے رابطہ ہو جائے کیونکہ جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ بحضورِ مریم علیہ السلام بھی جبریل انسانی شکل میں آئے تھے۔ قرآن میں ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دربارِ نبوت میں تھے کہ اچانک ایک شخص نے طلوع کیا جس کا تھا۔ بال بہت کالے، کپڑے انتہائی سپید، ان پر سفر کے اثرات بھی نہ تھے۔ پھر انھوں نے حضور علیہ السلام سے ت کیے۔ آپ نے جواب دیئے۔ ان کے جانے کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ جبریل امین تھے تم کو تمہارا دین نے کے لیے آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ نُور جب لباسِ بشریت میں آئے تو اس کے ظاہری لباس کی وجہ سے اس پر بشر لاق ہو جاتا ہے مگر اس لباسِ بشری کے باوجود رہتا نُور ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو لباسِ انسانی میں دیکھا تو ان کو رجل کہا لیکن ان کو بعد میں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔ تو اسی طرح حضور سید عالم نُورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں لباسِ بشریت میں جلوہ گر ہوئے اسی لباسِ بشریت کی وجہ سے آپ پر لفظ بشر کا اطلاق ہوتا ہے یعنی ؎

محمد سرِ وحدت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

جبریل امین نے عرض کی یا رسول اللہ اخبرنی مجھے خبر دیجئے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہاں امر استدعا کے لیے ہے، قطعی بات ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ علویہ سے افضل و اعلیٰ ہیں (مرقات جلد اول ص ۵۹)

علامہ قسطلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جبریل امین حضور علیہ السلام سے صحابہ کی موجودگی میں سوالات کرنا اس لیے تھا کہ معلوم ہو جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علم و معرفت کا خزینہ ہیں۔ حضرت ملا علی نے وتوتی الزکوٰۃ کے تحت لکھا س سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے یعنی جب تک کسی مستحق آدمی کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اس کو نہ بنایا جائے اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

۔ یہاں امام نے حدیث ہرقل لکھی ہے جو مع تفہیم و ترجمہ کے اوپر گزر چکی ہے۔ دیکھئے حدیث نمبر ۶

بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَاَ لِدِيْنِهٖ

باب اسکی فضیلت کے بیان میں جو دین کی حفاظت کیلئے (گناہوں) سے بچے

زہد کے معنیٰ دنیا میں انہماک سے بچنے کے ہیں اور ورع کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی شبہات سے پرہیز کرے۔ عنوان باب کا حاصل یہ ہے کہ دین میں احتیاط کی جائے اور شبہات سے بچنے والا اس شخص سے افضل ہے جو شبہات سے پرہیز نہیں کر اس عنوان کے تحت امام نے جو حدیث درج کی ہے۔ علماء و فضلاء نے اس کی شرح میں مستقل رسالے لکھے ہیں اور اس کو حدیث سے قرار دیا ہے۔

۴۹۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَّبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَّا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الْمُشْتَبِهَاتِ اسْتَبْرَاَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَّقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَّرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يُّوَاقِعَهٗ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (بخاری شریف)

عامر کہتے ہیں میں نے نعمان بن بشیر سے سُنا وہ کہتے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ حلال و حرام دونوں واضح ہیں اور ان دونوں بیچ میں مشتبہات ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے کوئی شبہ کی چیزوں سے بچے۔ اس نے اپنے دین عزت کو بچا لیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو بادشاہ کی محفوظ کے آس پاس اپنے جانوروں کو چرائے تو قریب وہ اس محفوظ زمین میں داخل ہو جائیں۔ سُن رکھو کی ایک محفوظ جگہ ہوتی ہے اور اللہ کا حمی وہ امور نے حرام قرار دیئے۔ خبردار اقلیم بدن میں ایک گوشت لوتھڑا ہے اگر درست ہے تو سارا جسم درست ہے بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا اور وہ دل ہی ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری و مسلم و نسائی نے کتاب البیوع میں بھی ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ الفتن میں ۲۔ حضرت نعمان بن بشیر مشہور صحابی ہیں۔ ان کے والد اور والدہ بھی صحابی تھے کے بعد انصار میں سب سے پہلے مولود ہیں۔ ۶۵ھ میں ان کی شہادت ہوئی۔ ان سے کل ۱۱۴ حدیثیں مروی نامی صحابی تقریباً ۳۰ ہوئے ہیں مگر نعمان بن بشیر یہی ایک ہیں۔

حلال اور حرام شریعت کی مشہور اصطلاح ہے۔ بیّن اس کے معنیٰ ظاہر اور واضح کے ہیں۔ یعنی وہ امور بالکل ظاہر ہو ——— مشتبہات وہ بات ہے جس کا حکم ظاہر نہ ہو ——— استبراء براءت کے اصل معنیٰ کسی ہونے یا زائل کرنے کے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں فلاں اس بات سے بری ہے یا فلاں میں یہ بات نہیں پائی جاتی کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ قلب دل کو کہتے ہیں۔ کبھی قلب سے مراد عقل بھی لی جاتی ہے۔ جیسے اس آیت میں اِنَّ

ذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اس قرآن میں نصیحت ہے اس کے لیے جو قلبِ سلیم رکھتا ہے یعنی عقلِ صحیح رکھتا ہے۔ الحِمٰی۔ ح کے زیر اور م کے زبر کے ساتھ زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو بادشاہ اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے اور کسی اور کو اس میں آنے یا اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ قال الجوهري هذا شي حمٰی ای محصور لا یقرب منه

مطلب حدیث

۱۔ فرمایا حلال و حرام بالکل واضح ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو قرآن و حدیث نے حرام یا حلال قرار دیا ہے ان کی حرمت و حلت بالکل ظاہر و واضح ہے۔ ان میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت و حرمت مشتبہ ہوتی ہے اور دلائل میں تعارض کی وجہ سے بہت لوگ ان کے اصلی حکم کو نہیں جانتے لہٰذا جو شخص مشتبہات سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے چرواہا ایسی زمین کے اردگرد بکریاں چرائے جو زمین بادشاہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی ہے تو لامحالہ ایک دن ایسا آئیگا کہ بکریاں اس محفوظ زمین میں داخل ہو جائیں گی تو یہی حال مشتبہات کو اختیار کرنے والے کا ہے۔ ۲۔ بعض علما نے اس حدیث کے یہ معنیٰ لیے ہیں کہ حدیثِ ہذا میں احکام و مسائل سے حوادث و وقائع کی طرف انتقال ہے لہٰذا معنیٰ حدیث یہ ہے کہ جو شبہ سے بچا اس نے اپنے دین کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور جس نے تہمت کی جگہ سے پرہیز کیا اس نے اپنی عزت و ناموس کو بچا لیا۔

۳۔ علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اشیاء تین قسم پر ہیں۔ اول وہ جن کا حلال ہونا بالکل واضح ہے جیسے پانی، روٹی، میوہ وغیرہ دوم، وہ جن کی حرمت بالکل ظاہر ہے جیسے شراب، خنزیر، خون، زنا، سود وغیرہ سوم، شبہات وہ امور جن کی حلت و حرمت واضح نہیں ہوتی۔ اسی لیے عوام ان کے حکم کو نہیں جانتے تو علما مجتہدین ایسے امور کے احکام بھی نص یا اجماع یا قیاس سے معلوم کر لیتے ہیں اور جب کسی چیز کا حکم واضح نہیں ہوتا تو مجتہد قرآن و حدیث جو دین کی اصل ہے اس میں غور کر کے دلیلِ شرعی کے ساتھ مشتبہات کا حکم معلوم کر کے اس کو حرام یا حلال کی فہرست میں شامل کر دیتے ہیں۔

علامہ خطابی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد لا یدری کثیر من الناس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکثر لوگ (عوام) مشتبہات کے حکم کو نہیں جانتے مگر بعض جانتے ہیں یعنی علماء مجتہدین اجتہاد سے اس کا حکم بھی معلوم کر لیتے ہیں تو یہ چیزیں مشتبہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اجتہادی بصیرت کے مالک نہیں ہیں (عینی جلد اول ص ۳۵۰)

واضح ہو کہ وہ چیزیں اور وہ کام جن کی حلت و حرمت کے متعلق شریعت خاموش ہے یا ان کے کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت نہیں دی گئی ہے ایسی تمام چیزیں یا کام الحلال بیّن میں داخل ہیں کیونکہ مشتبہات سے وہی کام اور چیزیں مراد ہیں جن کے متعلق شریعت سے کوئی واضح حکم نہیں ملتا اور دلائل شرعیہ میں غور کرنے سے اس کے حکم میں شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو حلال قرار دیا جائے یا حرام، ایسے مشتبہ امور سے بچنا چاہیے پھر اس میں بھی دو طبقے ہو جائیں گے۔

۱۔ عام لوگ۔ جو اجتہادی بصیرت نہیں رکھتے ان کے لیے ایسے امور بہر حال مشتبہات ہی رہیں گے۔

۲۔ مجتہدین کرام۔ جو اجتہادی بصیرت کے مالک ہیں وہ دلائل پر غور و فکر کر کے ان کا حکم معلوم کر لیں گے۔ ان کے لیے یہ امور مشتبہ نہ رہیں گے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجتہد باوجود کوشش بسیار کے اور دلائل میں نظر و فکر کے ان کا حکم معلوم نہ کر سکے۔

تو اس صورت میں مجتہد کے لیے بھی یہ امور مشتبہ رہیں گے۔

چنانچہ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ نبیذ تمر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں خود اس کو استعمال نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی ہفت اقلیم کی سلطنت دے اور کہے کہ اس کو حرام قرار دیدو تو میں اس کو حرام قرار دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں اس کی وجہ اشتباہ ہے۔ بہرحال ورع اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ امور مشتبہ سے پرہیز کیا جائے۔

تحقیق لفظ مشتبہات

واضح ہو کہ مشتبہات کا لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن کہیں اس کے معنی التباس کے اور کہیں تصدیق کے اور اصل یہ ہے کہ اگر تشابہ کا صلہ علیٰ ہو۔ اگرچہ محذوف ہی معنی التباس کے ہوں گے۔ جیسے ان دونوں آیتوں میں ۱۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ای اِلْتَبَسَ علینا ۲۔ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ ان دونوں آیتوں میں التباس کے معنی میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب صلوں کے تغایر کی وجہ سے لفظوں کے معنیٰ میں تغایر پیدا ہو جائے تو وہ مشترک معنوی ہو جاتا ہے۔ فافہم۔

بَابٌ اَدَاءُ الْخُمُسِ مِنَ الْاِيْمَانِ

باب مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ دینا علامتِ ایمان ہے

حدیث وفد عبد القیس

اس باب نے امام بخاری نے ایک حدیث ذکر کی ہے۔ جس کے ابتدائی جملوں کا خلاصہ ہے۔ ابی جمرہ سے حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ جب وفد عبد القیس دربار نبوی میں حاضر ہوا تو حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ تم کس قوم سے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ ربیعہ سے۔ آپ نے مرحبا کہا۔ انہوں نے عرض کی حضور ہمارے اور کفار مضر کے درمیان جنگ رہتی ہے۔ اس لیے ہم صرف ان مہینوں میں حاضر ہو سکتے ہیں جن میں لڑائی بند رہتی ہے یعنی شہر الحرم (ذی قعد، ذی الحجہ ومحرم) واضح ہو کہ ان مہینوں کا کفار بھی احترام کرتے تھے اور لڑائی وغیرہ بند کر دیتے تھے)۔ تو حضور (علیہ السلام) ہم کو چند اصولی باتیں بتا دیجئے جس کی وجہ سے ہم جنت میں جائیں۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار باتوں کا حکم فرمایا اور چار باتوں سے منع فرمایا۔ ان کو حکم دیا کہ ایک ایمان لاؤ۔ فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اکیلے خدا پر ایمان لانا کیا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا۔

۵۰ - قَالَ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَ اَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّآءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتِ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقَيَّرِ وَقَالَ احْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْهُنَّ مَنْ

شہادت دینا اس امر کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ (بیت المال اسلامی) میں جمع کرانا اور چار باتوں سے منع فرمایا حنتم و نقیر، مزفت یا مقیر سے

کُمْ

(بخاری شریف)

فرمایا۔ ان باتوں کو یاد کر لو اور دوسروں تک پہنچا دو

وائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے ۱۰ جگہ ذکر کیا۔ زکوٰۃ، صلوٰۃ، خمس، مغازی، خبر واحد، کتاب العلم، ادب و مناقب قریش اور توحید میں اور مسلم نے ایمان میں۔ ابو داؤد نے کتاب الاشربہ میں اور سنت یں اور ترمذی نے سیر اور ایمان میں اور نسائی نے علم اور ایمان اور صلوٰۃ میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ دُبّاء۔ اس برتن کو کہتے ہیں جو طائف کے باشندے کدو کے دو ٹکڑے کر کے سکھا دیا کرتے تھے۔ نقیر، کھجور ڑ کے پیالہ کو کہتے ہیں جو یمامہ کے باشندے بناتے تھے۔ مُزَفَّت، جس برتن پر رال وغیرہ کا پلستر ہوتا ہے۔ اس کو اور قیر بھی کہتے ہیں۔ حَنْتَم، مٹکا سرخ رنگ کا جس کی ٹونٹی ایک جانب ہوتی ہے یا وہ مٹکا جو مٹی اور بال وغیرہ ے بنایا جاتا تھا اور اس میں شراب رکھی جاتی تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے قبیلوں کے وفود اسلامی احکام معلوم کرنے آیا کرتے تھے اور واپس لوٹ کر یہ وفود اپنے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ وفد عبد القیس بھی اسی سلسلہ میں آیا تھا اور حضور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی ضروری باتیں جو حدیث بالا میں مذکور ہیں تعلیم فرمائیں ۲۔ اس حدیث حج کا ذکر نہیں ہے حالانکہ حج بھی فرائض و ارکانِ اسلام سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وفد ۸ھ میں فتح مکہ سے آیا تھا اور حج فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں فرض ہوا۔ کما قالہ القاضی عیاض (عینی ج ۱ ص ۳۶۲)

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دُبّا، حَنْتَمْ، نقیر اور مزفّت نامی برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا کیونکہ ان ن میں شراب استعمال ہوتی تھی۔ یا یہ کہ ان برتنوں میں غیرہ رکھا جائے تو نشہ جلد پیدا ہوتا ہے۔ جب شراب حرام ہوئی پ نے ان برتنوں کے استعمال کی احتیاطاً ممانعت فرمادی تاکہ کسی موقع پر بھی شراب کا خیال نہ آئے (مرقات جلد ۱ ۷۹) یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان برتنوں میں شراب کا اثر باقی تھا اور جب یہ اثر جاتا رہا تو اس کے بعد آپ نے ان کے مال اجازت عطا فرمادی۔ جیسا کہ بخاری کتاب الاشربہ میں اجازت والی حدیث موجود ہے اور مسلم میں بھی ہے۔ واللہ اعلم

بَابُ مَاجَآءَ اِنَّ الْاَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

باب اس امر کے بیان میں کہ اعمال کا ثواب نیت اور اخلاص پر مبنی ہے

لِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَدَخَلَ فِيْهِ الْاِيْمَانُ
وُضُوْءُ وَالصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ
حَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْاَحْكَامُ

(بخاری شریف)

اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو وہ نیت کرے (امام بخاری کہتے ہیں) اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور تمام معاملات داخل ہوئے (یعنی ان میں نیت شرط ہے۔

دومسائل

۱۔ اس باب کے قائم کرنے سے امام کی غرض ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے۔ امام نے یہ بتایا کہ ایمان دل کا فعل ہے اور اس میں نیت شر یسے دیگر اعمال میں نیت شرط ہے ۲۔ گذشتہ باب سے اس باب کا تعلق یہ ہے کہ اس میں ان امور کا ذکر تھا جن

کے کرنے سے آدمی جنت کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اعمال کے لیے نیت شرط ہے۔ کے بعد امام نے سات چیزیں ذکر کی ہیں جو یہ ہیں :-

۱۔ ایمان ۔ وہ کہتے ہیں ایمان کے لیے بھی نیت شرط ہے۔

۲۔ وضو ۔ امام بخاری کے نزدیک اور اسی طرح امام مالک وشافعی واحمد و عامہ اصحاب الحدیث کے وضو میں بھی نیت شرط ہے لیکن احناف کے نزدیک وضو کے لیے نیت شرط نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک نیت کے ساتھ نہ کیا جائے تو اس کا ثواب نہیں ملتا۔

۳۔ نماز۔ اس میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ نماز کے لیے نیت شرط ہے بغیر نیت کے نماز ہوگی ہی نہیں کیو عبادۃ مقصودہ ہے۔

۴۔ زکوٰۃ۔ تمام ائمہ متفق ہیں کہ زکوٰۃ بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتی۔

۵۔۶۔ حج و روزہ ۔ اس میں ائمہ اربعہ کے نزدیک نیت شرط ہے۔ البتہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک روزے کی نیت کافی ہے۔ رمضان کی تخصیص ضروری نہیں ہے۔ لیکن عطاء، مجاہد اور امام زفر کا مسلک یہ ہے کہ کے لیے رمضان میں مطلق نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ رمضان میں نفل روزہ صحیح نہیں ہوتا۔

۷۔ وَالْاَحْكَامُ

یعنی امام بخاری وشافعی کے نزدیک تمام معاملات بیع وشراء، نکاح وطلاق وغیرہ شرط ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے بغیر نیت کے یہ کہہ دیا کہ میں نے بیچا، خریدا، رہن رکھا تو امام بخاری و امام شافعی کے نزدیک واقع نہ ہوگی۔ لیکن معاملات میں امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک نیت شرط نہیں نزدیک صرف عباداتِ مقصودہ میں نیت شرط ہے جیسے نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ اور اعمال کا ثواب نیت سے اور یہ کہ نیت کے بغیر عمل معتبر ہی نہیں ہوتا۔ ان امور کے متعلق تفصیل بحث گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ

اور اللہ تعالٰے نے فرمایا میرے محبوب تم فرما دو اپنی طبیعت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۱۔ امام بخاری نے شاکلۃ کا ترجمہ "نیت" کیا ہے۔ ویسے اصل معنیٰ اس کے "طبیعت" کے ہیں۔ یعنی اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے جو خلقۃً اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یعنی اگر وہ سعید ہے تو اچھے کام اگر شقی ہے تو برے کام کرے گا ۲۔ حضرت حسن بصری، قتادہ، معاویہ بن قرۃ المزنی نے اس کے معنیٰ نیت کے اور بعض مفسرین نے شاکلہ کے معنیٰ دین اور مذہب کے کیے ہیں اور بعض نے طریقہ کے۔

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جہاد نیت باقی ہے۔

یہ اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو فتح مکہ کے وقت حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائی تھی کہ فتح مکہ کے بعد کیونکہ اب مکہ دار السلام ہوگیا ہے لیکن جہاد اور نیت قیامت تک باقی ہیں تو اگرچہ ہجرت منقطع ہوگئی ہے

نیتِ ثواب بھی باقی ہیں۔ ان کے ذریعے آدمی ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

وَنَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰی اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا دَقَةٌ

اور آدمی جو اپنے اہل و عیال پر خرچ (خلوص نیت کے ساتھ) کرتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔

یعنی جیسے صدقہ (باعثِ ثواب ہے) میں ثواب ملتا ہے اسی طرح اس میں ثواب ملتا ہے۔ یہ مضمون آئندہ حدیث آرہا ہے۔

حدیث "اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ" کے چند اہم فوائد و مسائل

۔عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ وْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْاَعْمَالُ يَّةِ وَلِكُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰى الخ .

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال کا ثواب نیت سے ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جو وہ نیت کرے۔

ضیح یہ حدیث ابتدائے کتاب میں مع تفہیم و ترجمانی کے گزر چکی ہے۔ یہاں مزید نئے فوائد ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس حدیث سے جو اصول نکلتا ہے وہ یہ ہے۔ اعمال خواہ وہ فرائض ہوں یا واجبات، مستحبات ہوں یا مباحات، ان کا ثواب اسی ملے گا جب کہ نیت صالح ہو۔ نیز یہ بات یاد رکھیے کہ اس حدیث سے اعمال سے کوئی خاص عمل مراد نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں بھی داخل ہے جس کے متعلق شریعت نے نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور نہ اس سے منع کیا ہے یعنی مباح۔ تواب اس اصول کی روشنی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر وہ کام جو مباح ہو اور جس کے کرنے پر ثواب بھی مقرر نہ ہو۔ اگر اسی کام کو آدمی نیت خیر کے کرے تو وہ عبادت ہو جائے گا اور اس کا ثواب ملے گا۔ چنانچہ علامہ عینی علیہ الرحمہ اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

وَفِيْهِ الْحَثُّ عَلٰى نِيَّةِ الْخَيْرِ مُطْلَقًا نَّهُ يُثَابُ عَلَى النِّيَّةِ
(عینی جلد اول صـ۳۶۹)

اس حدیث میں نیتِ خیر کی ترغیب دی گئی ہے مطلقاً اور یہ کہ آدمی کو اس کے عمل کا ثواب نیت کی وجہ سے مل جائیگا۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں کہ احادیث میں آیا ہے۔ جب ملائکہ بندوں کے اعمال پرلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ ۔ اس صحیفہ کو پھینک دو۔ یعنی یہ ہمیں منظور ہے۔ فرشتے عرض کریں گے۔ الٰہی اس بندے نے نیک کام کیے۔ ہم نے سُنے اور دیکھے اور لکھ لیے ان کو کیسے پھینک دیں۔ لَمْ يُرِدْ بِهٖ وَجْهِيْ ۔ چونکہ اس بندے نے اس عمل کے ساتھ میری رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ اس لیے یہ میرے حضور نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے فرشتے کو حکم ہوگا۔ اُكْتُبْ لِفُلَانٍ كَذَا وَكَذَا ۔ فلاں بندے کے اعمال نامے فلاں عمل لکھ لے۔ فرشتہ عرض کریگا۔ الٰہی یہ کام تو اس نے کیا ہی نہیں؟ ارشاد ہوگا کہ گو وہ کر نہیں سکا مگر اس کا ارادہ نیت تو اس کام کے کرنے کی تھی۔ دیکھئے نیتِ صالح سے عمل کے بغیر ہی ثواب مل گیا اور بُری نیت سے کئے ہوئے اعمال کئے۔

حضرت رومی علیہ الرحمۃ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے مسجد کے پاس اپنا مکان بنوایا اور مسجد کی طرف ایک

کھڑکی رکھ لی۔ اس کے پیر نے پوچھا یہ کھڑکی کیوں رکھی ہے جواب دیا ہوا کے لیے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تو یہ نیت کھڑکی اس لیے رکھتا ہوں تاکہ اذان کی آواز یا جماعت کے کھڑے ہو جانے کا علم ہو جایا کرے تو ہوا تو خود بخود آجا تجھے تیری نیت کا ثواب ملتا۔

۴۔ غریب کی مدد کرنا کارِ ثواب ہے۔ قرآن و حدیث نے اس عمل پر ثواب مقرر کیا ہے تو اب اگر کسی ایسے غریب کرے جو اس کا رشتہ دار ہے اور نیت یہ کرے کہ غریب رشتہ دار کو دینے میں صلہ رحمی بھی ہے تو ایسی صورت میں کی وجہ سے اس کو دو ثواب مل جائیں گے۔ ایک صدقہ کا۔ دوسرا صلہ رحمی کا۔

۵۔ نماز پڑھنا کارِ ثواب ہے لیکن آپ ایک ایسی مسجد میں جاکر نماز پڑھتے ہیں جو ویران ہے اور آپ کی نیت اس ویران مسجد میں جب نماز پڑھوں گا تو میری وجہ سے اور لوگ بھی یہاں آئیں گے اور مسجد آباد ہو جائے گی۔ یہاں بھی نیت کی وجہ سے ڈبل ثواب ملے گا۔ ایک نماز کا۔ دوسرے مسجد کو آباد کرنے کا۔

۶۔ مسجد میں بیٹھنا ایک عمل ہے۔ اگر اس کے ساتھ اعتکاف کی نیت کرے تو ثوابِ اعتکاف مل جائیگا۔ پھر کے ساتھ یہ نیت بھی ہو کہ جماعت کا انتظار رہے تو بحکمِ حدیث جماعت کا منتظر نماز میں ہے نماز کا ثواب ملے گا۔ پھر یہ نیت کرے کہ جتنی دیر مسجد میں ٹھہروں گا تمام اعضاء کی جملہ برائیوں سے حفاظت ہوگی تو یہ ثواب بھی مل جائیگا۔ اسی کے ساتھ درود شریف پڑھنے کی نیت کرے مسجد میں علم کا افادہ یا استفادہ ہوگا یا کوئی دینی بھائی مل جائیگا۔ اس کی زیا یا کوئی سلام کہے گا اس کا جواب دوں گا کسی کو چھینک آئے گی تو یرحمک اللہ کہوں گا الغرض جتنی نیتیں کرے گا۔ سب کا ثو مل جائیگا۔ دیکھئے کام ایک ہی ہے مگر نیتیں متعدد ہیں اور نیتوں کا الگ الگ ثواب مل رہا ہے کیونکہ حدیثِ بالا کے اِنَّ امرءٍ ما نویٰ کا یہی مطلب ہے کہ جو نیت کریگا وہی پائیگا۔

۷۔ ایک شخص اپنی ضرورت سے بازار جا رہا ہے۔ بازار جانا ایک مباح عمل ہے لیکن اگر وہ اس میں یہ نیت کرلے کہ ر میں جو تکلیف دہ چیز ہوگی۔ اس کو ہٹا دوں گا۔ اسلام کی اشاعت کروں گا۔ کسی کو برا کام کرتے دیکھوں گا تو منع کروں مسلمان بھائی کو خوش کرنے کے لیے مسکرا دوں گا۔ جتنی نیتیں کریگا۔ سب کا الگ الگ ثواب مل جائیگا اور یہ بازار ہوگا۔ پھر لطف یہ کہ ارادہ تو ان امور کرنے کا کر لیا مگر کر نہ سکا تو بھی ثواب مل جائے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا۔ نِیَّۃُ الْمُؤْ اَبْلَغُ مِنْ عَمَلِہٖ کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ معتبر ہے۔

۸۔ غرض کہ اس حدیثِ مبارکہ سے یہ اصول نکلتا ہے کہ ہر وہ کام جس کی ممانعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ جب وہ نیک نیتی سے کیا جائے تو وہ کام عبادت ہو جائیگا اور اس پر ثواب ملے گا۔

چنانچہ اس اصول کی روشنی میں اگر دیانت داری سے مسائل کی حیثیت دیکھی جائے تو بہت سے ایسے مسائل حل ہیں جن میں آج بحث و مباحثہ، مکابرہ و مجادلہ کا بازار گرم ہے۔

۱۔ مثلاً مجلسِ میلاد کے قیام و اہتمام کو لیجئے۔ اگر نیت یہ ہے کہ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہو۔ آپ کے فضائل و مناقب بیان ہوں اور آپ کی سیرتِ مبارکہ قوم کے سامنے رکھی جائے تو اس حدیث کی رو

کارِ ثواب ہے۔ اگر مجلسِ میلاد کے قیام کی غرض ریا و سمعہ ہو یا اس کو فرض و واجب سمجھ لیا جائے اور یہ خیال کیا جا ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو ہی یہ مجلس قائم ہو سکتی ہے اور دنوں میں ذکرِ رسول ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نیت غلط ہے اور کی اصلاح کر دینی چاہیے۔

یا مثلاً میت کے تیسرے، ساتویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر مساکین کو کھلایا جائے اور یہ نیت ہو کہ دن مقرر میں آسانی ہوتی ہے۔ مساکین جمع کر لیے جاتے ہیں تو حدیثِ ہذا کی روشنی میں اس کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا لیکن اس کے ساتھ اگر نیت یہ ہو کہ دن مقرر کر کے ہی فاتحہ دینے میں ثواب پہنچتا ہے ویسے نہیں یا کھانا سامنے رکھ کر دینا ضروری ہے تو اس کی اصلاح کر دینی چاہیے اور بتا دینا چاہیے کہ ثواب پہنچانے کے لیے دن مقرر کرنا ضروری ہے جس روز بھی ایصالِ ثواب کیا جائے خواہ کھانا پکا کر غربا میں تقسیم کیا جائے یا قرآن پڑھ کر اس کا ثواب میت پہنچایا جائے ہر طرح جائز ہے ہاں اگر ان قیود میں کوئی مصلحت ہو تو حرج نہیں کیونکہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

اسی طرح میت کے دفن کے بعد لوگ جمع رہتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں۔ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ بیکار بیٹھے رہنے فضول گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ کلمہ طیبہ جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ افضل الذکر ہے پڑھتے رہیں تو یقیناً موجب ہے۔ پھر اگر بعض روایات کے مطابق ستر ہزار بار ہو جائے اور میت کو بخشا جائے تو امیدِ مغفرت ہے۔ لہٰذا اس کی رُو سے ضرور ان کو اجر ملے گا اور پھر وہ میت کو بخشیں گے تو ضرور میت کو پہنچے گا۔ کیونکہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور جب کا مدار نیت پر ہے تو اب مذکورہ بالا کام کرنے والوں کو جب کہ ان کی نیت حسن ہے بدعتی کہنا اور جاہلوں کو یہ کہہ کر مغالطہ دینا یہ کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا کیسا فضول اعتراض اور کس قدر جہالت ہے بہرحال دیانت و امانت ہو اور نیت و ہٹ دھرمی نہ ہو تو اس قسم کے بہت سے مختلف فیہ مسائل اسی حدیث کی روشنی میں حل ہو جاتے ہیں۔ فافہم

النَّصِیحَۃ

اللہ کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات پر ایمان لایا جائے اور ہر نقص اور عیب سے اسے پاک و منزہ مانا جائے اور اس کے منشا و مرضی کے مطابق زندگی گزار دی جائے کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ السلام نے پیش کیا ہے۔ اس کی تصدیق کی جائے اور عمل کیا جائے۔ اس کے اوامر پر عمل کیا جائے اور نواہی سے بچا جائے اور ہر وقت اور ہر آن آپ کا ادب و احترام جائے۔ آپ کی سنتوں کو زندہ کیا جائے اور آپ کے اہلبیت و اصحاب سے محبت کی جائے۔ کتاب اللہ کے لیے نصیحت یہ ہیں کہ قرآنِ پاک کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان لایا جائے اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اس مثل بنایا جانا محال ہے۔ کمی و زیادتی، تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ائمہ کے لیے نصیحت کے معنیٰ یہ ہیں کہ معروف میں ان کی اطاعت کی جائے سے ان پر خروج نہ کیا جائے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔ ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے اور صدقات و زکوٰۃ میں دی جائے۔ عام شارحین نے ائمہ سے اصحابِ حکومتِ اسلامیہ مراد لیا ہے اور بعض علماء کو مراد لیتے ہیں کہ کی جائے اور جو وہ حکمِ شرعی بیان کریں اس کو تسلیم کیا جائے۔ عام مسلمانوں کے لیے نصیحت ہے کے معنیٰ یہ ہیں آپس میں محبت کے ساتھ رہیں نیکی کے ساتھ تعاون کریں اور برائی سے عدم تعاون کریں اور اپنے بھائی مسلمان کے حقوق

ادا کرتے رہیں۔

۵۲-۱- عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰی اَھْلِہٖ یَحْتَسِبُھَا فَھِیَ لَہٗ صَدَقَۃٌ (بخاری)

حضرت ابومسعود سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی اپنے گھر والوں پر ثواب نیت سے خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب پائیگا۔

۵۳-۲- عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَۃً تَبْتَغِیْ بِھَا وَجْہَ اللّٰہِ اِلَّا اُجِرْتَ عَلَیْھَا حَتّٰی مَا تَجْعَلُ فِیْ فَمِ امْرَاَتِکَ (بخاری)

عامر بن سعد نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو جو کچھ خر اور اس سے نیت تیری اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا۔ یہاں تک اس پر بھی جو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے۔

فوائد و مسائل

۱- حدیثِ اول کو ابخاری نے مغازی اور نفقات میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و نسائی نے کتاب ہیں۔ یہ حدیث عنوانِ ثانی یعنی والحسبۃ سے متعلق ہے۔ حدیث دوم کو امام نے مغازی، دعوات طب، فرائض میں بھی درج کیا ہے اور مسلم و ترمذی و ابن ماجہ و ابوداؤد نے کتاب الوصایا میں درج کیا ہے۔ دونو اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں اور ان میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ کسی غریب و محتاج کی مدد کی جائے اپنے اہل و عیال پر خرج کیا جائے اور مقصود اس سے رضائے الٰہی ہو تو اس پر بھی ثواب مل جائیگا۔ حدیث دوم میں ف امْرَاَتِکَ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب اپنی بیوی کے منہ میں ایک لقمہ دینا باعث اجر ہے تو و محتاج کو کھانا کھلانے اور ان کی امداد و اعانت کرنے میں کس قدر ثواب ہوگا۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ وَقَوْلِہٖ تَعَالٰی اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ

(بخاری)

کہ دین نصیحت ہے اللہ کے لیے رسول کے لیے مس حاکموں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے اور اللہ تعا نے سورہ توبہ میں فرمایا جب وہ اللہ اور رسول کی خ میں رہیں۔

فوائد و مسائل

نصیحۃ۔ نصح الرجل ثوبہ سے ماخوذ ہے یعنی کپڑے کو سوئی سے سینا۔ توبۃ النص بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ گناہ سے دین میں خلا پیدا ہوتا ہے تو توبہ اس خلا کو پُر کر دیتی ہے۔ امام نے کہا نصیحۃ مشتق ہے نصحت العسل سے یعنی شہد کو اس کی آلائش سے پاک و صاف کرنا۔ اسی لیے وہ بات جو غش سے پاک ہو اس کو نصیحت کہتے ہیں۔ الدین النصیحۃ کے معنی یہ ہیں کہ معظم ارکانِ دین نصیحت ہے۔ جیسے کہتے الحج العرفۃ۔

۵ -عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِيِّ
ـَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
ـسَلَّمَ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ
ـنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (بخاری)

جریر ابن عبداللہ بجلی کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر شرائطِ ذیل پر بیعت کی۔ اقامۃ الصلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ہر مسلمان کی خیرخواہی۔

ـد و مسائل اس حدیث کو امام نے زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں بھی ذکر فرمایا ہے اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور ترمذی نے بیعت میں ذکر کیا ہے ۲۔ جریر ابن عبداللہ ابن جابر بجلی وفاتِ نبوی سے چالیس دن قبل اسلام لائے
ـت حسین صحابی تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو یوسف کہا کرتے تھے۔ ان کی دیانت وللّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ان
ـے غلام نے تین سو روپے میں ایک گھوڑا خریدا۔ انہوں نے جب گھوڑا دیکھا تو کہنے لگے یہ گھوڑا تو تین سو روپے سے زیادہ
ـے تو سستا لایا ہے۔ فوراً مالک کے پاس گئے اور کہا اس کی قیمت تین سو روپے تو نے کم لی ہے۔ قیمت زیادہ
ـاس نے کچھ روپے اور زیادہ کر دیے۔ مگر انہوں نے اس کو کل رقم نو سو روپے دیے۔ ان سے ایک سو حدیثیں مروی ہیں۔ یہ
ـے قرقیس چلے گئے تھے۔ وہاں ۵۱ھ میں وصال ہوا۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں بیعتیں ہوئی ہیں۔ انہیں میں یہ بیعت ہے۔ جس میں قیامِ نماز،
ـی زکوٰۃ پر بیعت کا ذکر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ ایک مسلمان کا فرض مذہبی یہ بھی ہے کہ حتی المقدور اپنے مسلمان بھائی
ـخیرخواہی کرے۔

۵۵ -عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ سَمِعْتُ جَرِيْرَ
ـعَبْدَ اللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ
ـحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْكُمْ
ـاءِ اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْوَقَارِ
ـسَّكِيْنَةِ حَتّٰى يَاْتِيَكُمْ اَمِيْرٌ فَاِنَّمَا
ـكُمُ الْاٰنَ ثُمَّ قَالَ اسْتَعْفُوْا لِاَمِيْرِكُمْ
ـنَّهٗ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ
ـىْ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
ـتُ اُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ
ـنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهٗ عَلٰى هٰذَا وَ
ـبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ اِنِّيْ لَنَاصِحٌ لَّكُمْ ثُمَّ
ـسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ (بخاری)

زیاد بن علاقہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے جریر ابن عبداللہ سے سُنا۔ جس دن مغیرہ بن شعبہ (حاکم کوفہ) کا انتقال ہوا تو وہ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ کی تعریف بیان کی اور کہا کہ تم پر لازم ہے کہ صرف اللہ سے ڈرو جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وقار و سکینہ کو لازم پکڑو۔ یہاں تک کہ تمہارا دوسرا حاکم آجائے اور وہ اب آتا ہے اور پھر کہا اپنے سابق امیر کے لیے استغفار کرو اس لیے کہ وہ بھی عفو و درگزر کو پسند کرتا تھا۔ پھر کہا۔ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوا اور عرض کی میں اسلام پر بیعت ہوتا ہوں تو آپ نے اسلام کی شرط کے ساتھ النصح لکل مُسلم کی شرط بھی لگا کر مجھے بیعت فرمایا
ـیں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کر لی۔ مجھے اس مسجد کے رب کی قسم میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ پھر آپ نے استغفار کیا اور

اور منبر پر سے اُتر گئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے شروط میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے کتاب الایمان میں اور نسائی نے بیعت میں یہ حدیث حضرت عبداللہ بجلی صحابی کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے اس وقت دیا تھا جب کہ کوفہ کے بن شعبہ کا انتقال ہو گیا تھا اور یہ ان کی جگہ حاکم مقرر ہوتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی وفات ۵۰ھ میں ہوئی امیر معاویہ کوفہ کے حاکم تھے اور ان کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ بجلی کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔

وقار کے معنیٰ صبر و تحمل کے ہیں۔ سکینہ اضطراب کی ضد ہے۔ استعفوا کے معنیٰ عفو و درگزر کے ہیں۔ رب ہذا المسجد مسجد حرام ہے۔ جیسا کہ طبرانی کی حدیث میں مسجد کی جگہ رب الکعبہ کے لفظ آئے ہیں۔ حضرت جریر نے یہ خطبہ زمام حکومت بعد دیا اور اس میں عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور اپنی ذات کے متعلق یہ یقین دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہاری و خیر خواہی میرا فرض منصبی ہے۔

حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث پر کتاب الایمان کو ختم کیا ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ میں بھی خیر خواہ ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی خیر خواہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ہماری فلاحِ دینی و دنیوی کے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو مرتب کر کے ہمیں دیدیا۔ قومِ مسلم پر امام کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس ادا کیا جائے کم ہے۔

اللہ تعالیٰ بطفیل سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حضرت امام بخاری کی رُوحِ مطہر پر اپنی بے پایاں رحمتوں کی فرمائے اور اعلیٰ علیین میں اعلیٰ ترین مراتب و درجات سے سرفراز فرمائے اور آخرت میں ہم نیازمندوں کا انہیں کے حشر فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

کتاب العلم

علم کی تعریف اور اس کے اقسام فلاسفہ کے نزدیک حُصُولُ الصُّوْرَۃِ (یا) الصُّوْرَۃُ الحا کا نام علم ہے اور ماتریدیہ کے نزدیک علم ایک صفت ہے جو قلب میں ہوتی ہے۔ جیسے قوتِ باصرہ آنکھ میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے اشیاء کا انکشاف ہوتا ہے ۲۔ یہاں امام بخاری کا مق ماہیت و حقیقت کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ بات اس فنِ شریف سے تعلق نہیں رکھتی۔ ان کا مقصد علم کے متعلقات کرنا ہے۔ یہاں علم سے وہ علم مراد ہے جس سے اللہ عزوجل کی رضا حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف انبیاء کے ذ حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ وہی یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس بات میں ہے۔ اس لیے ایسے علم کے حصول کے لیے ایمان لانا شرط ہے۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں کہ علم اپنی معلومات کے لحاظ سے متعدد قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک علم ظاہر

یہ مجموعہ ہے تفسیر، فقہ اور حدیث کا اور علامہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے کہا۔ علم صرف ونحو واصول وغیرہ ایسے علوم ہیں حت ہیں مگر ان کا حصول واجب ہے کیونکہ ان کے ذریعے قرآن وحدیث کے معانی ومفاہیم پر آدمی مطلع ہوتا ہے اور علمِ باطن پر ہے اول، علمِ معاملہ یہ فرضِ عین ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دل کو پاک وصاف کرے۔ نفس کو مہذب بنائے اخلاقِ کو ترک کرے اور اخلاقِ حمیدہ صبر، شکر، زہد، تقویٰ، قناعت کو اختیار کرے۔

دوسری قسم علم المکاشفہ ہے جو قلب میں اس کے تزکیہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کے ذریعہ معانی مجملہ کھل جاتے ہیں۔ ت وصفاتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

كَشِفُ لَهُ الْأَسْتَارُ عَنْ مُخَبَّآتِ الْأَسْرَارِ	اور اسرارِ خفیہ سے پردے اُٹھ جاتے ہیں

علمِ مکاشفہ کا انکار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے (قسطلانی جلد اول ص۱۵۴)

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

یہ باب علم کی فضیلت کے بیان میں ہے

اس باب میں امام بخاری نے ذیل کی دو آیتیں ذکر کی ہیں۔ جن میں علم اور علماء کی فضیلت کا بیان ہے۔

فَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ تُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بِيْرٌ وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (بخاری)	اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کا درجہ بلند کیا۔ جو تم میں سے ایمان لائے اور علم والوں کو درجے کی بلندی عطا فرمائی۔ اور قولِ باری تعالےٰ ہے۔ اے اللہ مجھے زیادہ علم دے

شریح پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ مومنِ عالم کے درجے مومنِ غیر عالم سے بلند ہوں گے جس سے علم اور علم والوں کی فضیلت کا اظہار ہوا۔ دوسری آیت میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ اپنے ب سے علم کی زیادتی کی دُعا فرمایا کریں۔ علمِ دین اور علماءِ دین کے احادیثِ نبویہ میں کثیر فضائل وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل کیلئے دفتر درکار ہے۔

بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَهُوَ مُشْتَغِلٌ فِيْ حَدِيْثِهٖ

باب اس امر کے بیان میں جس سے کوئی علم کی بات پوچھی جائے اور وہ

تَمَّ الْحَدِيْثَ ثُمَّ اَجَابَ السَّائِلَ (بخاری)	مصروفِ گفتگو ہو اور پھر اپنی بات کو پورا کرکے سائل کو جواب دے۔
۵ - عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَجْلِسٍ يُّحَدِّثُ الْقَوْمَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ فَمَضٰى لُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَمْ يَسْمَعْ حَتّٰى اِذَا	حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں بیٹھے ہوئے ان سے گفتگو فرمارہے تھے کہ اتنے میں ایک گنوار آیا اور پوچھنے لگا کہ قیامت کب آئے گی۔ آپ اپنی گفتگو میں مصروف رہے۔ حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ آپ نے گنوار کی بات سُنی مگر پسند نہ کی اور بعض یہ کہنے لگے کہ آپ نے اس کی بات سُنی ہی

قَضٰی حَدِیْثَهٗ قَالَ اَیْنَ اَرَاهُ السَّآئِلُ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا اَنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاِذَا ضُیِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ فَقَالَ کَیْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ (بخاری)

نہیں۔ جب آپ گفتگو پوری کر چکے تو فرمایا قیا
پوچھنے والا کہاں گیا۔ گنوار نے کہا میں حاضر ہو
اللہ۔ فرمایا سن لے جب امانت اٹھ جائے تو قیا
انتظار کر۔ اس نے کہا۔ حضور امانتداری کے
کیا معنی ہیں؟ فرمایا جب کام نا اہل کے سپرد کی
تو پھر قیامت کا انتظار کر۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الرقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم و ترمذی وغیرہ نے کو روایت نہیں کیا ۲۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ جب مسائلِ دین کے متعلق سوال ہو تو عالم کا جواب دینا واجب ہے ۲۔ سائل کو چاہیے کہ جب تک عالم بات کر رہا ہے خاموش رہے۔ جب بات ختم ہو جائے تو پھر بات کرے ۳۔ عالم و مفتی کو چاہیے کہ سائلوں کو تر جواب دے ۴۔ عالم کو چاہیے کہ سوالات کے جواب بقدرِ ضرورت دے اور اس میں سائل کے حال کا خیال رکھے ۵۔ قیا نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اقتدار نا اہلوں کے سپرد ہو جائے یا لوگ جاہلوں کو اپنا امام، پیشوا، مفتی اور خلیفہ بنا سنار کا کام اگر لوہار کے سپرد کر دیا جائے۔ ترکھان کا کام حساب کے پروفیسر کو دے دیا جائے۔ انصاف کی خدمت جابر کے سپرد کر دی جائے۔ وزارت و امارت خودغرض، لالچی اور کمینہ افراد کے ہاتھ میں آجائے۔ جاہل اور کو کو شیخ الاسلام اور مفتی اعظم بنا لیا جائے تو قیامت قبل از قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے ۶۔ سوال پیدا ہوتا ہے صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو تاخیر سے جواب کیوں دیا جب کہ وہ ایک امرِ دینی کے متعلق سوال کر رہا تھا۔ جواب یہ تو قیامت کی تاریخ اور وقت کے متعلق بتانا ضروری نہ تھا۔ کیونکہ یہ ان امور سے ہے جن کو مخفی رکھا گیا ہے۔ ثانیاً حضور علیہ السلام کسی اور سائل کا جواب دے رہے ہوں یا کوئی مسئلہ بیان فرما رہے ہوں کہ جس کے بیچ میں جواب دینے سلسلہ کلام کے ٹوٹ جانے سے اس کے مفہوم میں اختلاط پیدا ہونے کا خطرہ ہو یا سائل کے سوال سے بھی زیادہ صحابہ کو سمجھا رہے ہوں۔

بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْعِلْمِ

جو علم کی بات پکار کر کہے اس کا بیان

یعنی بوقتِ ضرورت کسی مسئلہ شرعی کو بلند آواز سے بھی سنایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ لوگ یا ہجوم ہو یا دور ہوں یا کسی امرِ دینی کو کما حقہٗ ادا نہ کر رہے ہوں۔

۵۹۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا فَاَدْرَکَنَا وَقَدْ اَرْهَقْنَا الصَّلٰوةَ

حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ ہم حضور علی
والتسلیم کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ حضور ہم سے
اور اس وقت ہم سے آکر ملے جب کہ عصر کی

حن ونَتَوَضَّأُ فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰى اَرْجُلِنَا
ادٰی بِاَعْلٰی صَوْتِهٖ وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ
النَّارِ مَرَّتَیْنِ اَوْ ثَلٰثًا
(بخاری)

ہوگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے اور پاؤں یونہی سا دھو رہے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا خرابی ہو ایڑیوں کے لیے جہنم سے۔ دو مرتبہ یا تین مرتبہ (یہ جملہ آپ نے) بلند آواز سے فرمایا۔

دو مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب العلم میں مکرر اور طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے کتاب العلم میں اور مسلم نے طہارت میں۔ ویل۔ جہنم کی ایک وادی ہے۔ جس کی حرارت کا یہ عالم ہے پہاڑ اس میں ڈال دیئے جائیں تو پگھل جائیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ویل جہنمیوں کی راد، پیپ کو کہتے ہیں۔ ویسے عموماً ویل کا لفظ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جو ایسا کام کرے جو اس کی شان کے خلاف ہو۔ ویح کا لفظ بھی ویل کے ہم معنی بولا ے اور اس کے اصل معنی ہلاکت اور عذاب کے ہیں۔ حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ وضو میں پاؤں دھونا فرض ہے اور دھونے معنی یہ ہیں کہ پانی عضو پر ایک بار بہہ جائے۔ محض تیل کی طرح چپڑ لینے کو دھونا نہیں کہتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اعضائے وضو سے کوئی ضو ذرا بھی خشک رہ گیا تو وضو درست نہ ہوگا۔

۲۔ اگرچہ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے تسیح کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ ابتدا میں پاؤں کا مسح کیا جاتا تھا۔ پھر یہ منسوخ ہوگیا اور میں پاؤں دھونا فرض قرار پایا لیکن اگر یہ بات ہوتی تو حضور علیہ السلام مسح کی منسوخی کے لیے ویل کا لفظ استعمال نہ فرماتے وعید اس مقام پر سنائی جاتی ہے جہاں لوگ کسی حکم شرعی میں کوتاہی کر رہے ہوں۔ لفظ ویل تو قرینہ ہے اس بات کا ضو کرنے والے پاؤں دھونے میں احتیاط نہیں برت رہے تھے۔ یعنی ایسے دھو رہے تھے کہ ایڑیاں خشک رہ گئی تھیں۔ حدیث مسلم اس کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ وضاحت ہے کہ یہ سفر مکہ سے مدینہ کی طرف تھا۔ راستہ میں نماز کا وقت ہو صحابہ جلدی میں وضو کرنے لگے۔ وھم عجال اور اسی جلدی میں دھونے کی وجہ سے ایڑیاں خشک رہ گئیں۔ اس پر حضور السلام نے وعید سنائی اور فرمایا۔ ویل للاعقاب

بَابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا وَاَنْبَاَنَا

باب محدث کا حدثنا، اخبرنا اور انبانا کہنے کے بیان میں

دو مسائل

اس باب کو قائم کرکے امام بخاری علیہ الرحمۃ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ محدث کبھی حدثنا کہتا ہے، کبھی انبانا کبھی اخبرنا۔ تو ان تینوں جملوں کا حاصل ایک ہے اور ان میں مفہوم و معنی کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

۱۔ وقال الحمیدی کان عند ابن عیینہ حدثنا و اخبرنا وانبانا و سمعت واحدًا
۲۔ وقَالَ ابن مسعود حدثنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وَسَلَّمَ
۳۔ وقَالَ شقیق عن عبداللہ سمعت النبی صلی اللہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
۴۔ وقال حذیفۃ حدثنا رسول اللہ صلی اللہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حدیثین

امام نے ان تین تعلیقوں کو پیش کرکے یہ بتایا ہے کہ دیکھو صحابی کبھی حدثنا (حدیث بیان کی ہم سے) کہتا تھا۔ کبھی اخبرنا

وانبانا (خبردی ہم کو) کہتا ہے اور کبھی سمعت (میں نے سنا) کہتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ ان تینوں کا مطلب

۲۔ اس کے بعد امام نے ذیل کی تین تعلیقیں اور لکھی ہیں۔

۱۔ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ قال ابو ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ قال انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرویہ عن ربہ

ان تین تعلیقوں کو پیش کر کے امام نے یہ بتایا ہے کہ جس روایت میں عن عن ہو تو وہ سماع پر محمول ہوگی بشرط کی ملاقات ثابت ہوجائے۔ یعنی جب راوی حدیث عن عن کے ساتھ روایت کریگا تو یہ سمجھا جائیگا کہ راوی نے حضور سے یا صحابی سے یا تابعی سے سُنی ہے۔ امام نے ان چھ تعلیقات کو دوسرے مقامات پر اسناد سے ذکر کیا کتاب العلم سے اس عنوان کی مناسبت ظاہر ہے کیونکہ محدث کے لیے ضروری ہے کہ ان کلمات کے معنی ومفہوم کو جانے سے اس کی مناسبت یہ ہے کہ اس میں اس امر کا بیان تھا کہ بوقت ضرورت عالم کو بلند آواز سے حاضرین کو خطاب ک شرعیہ سنانا جائز ہے۔ تاکہ حاضرین ان مسائل کو خوب اچھی طرح سن لیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اب ظاہر ہے کہ حا ان مسائل شرعیہ کو روایت کریں گے تو مذکورہ بالا الفاظ میں سے کسی لفظ کو استعمال کرنا ان کے لیے ناگزیر ہوگا۔ یعنی حاضر جو صاحب بھی ان مسائل کو دوسروں تک پہنچائیں گے تو وہ حدثنا، انباءنا یا، سمعت کے لفظ ہی بیان کر اور یوں کہیں گے کہ حضور علیہ السلام نے ہم کو یہ مسئلہ بتایا یا ہم نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ بات سُنی باب میں ان الفاظ کے معنی ومفہوم کو بیان کرنا مناسب ہوا۔

بَابُ طَرْحِ الْإِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلَى

باب بطور امتحان امام کا اپنے

اَصْحَابِهٖ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (بخاری) اصحاب سے سوال کرنا

اس عنوان میں امام بخاری نے جو حدیث درج کی ہے اس میں عنوان کے مطابق لفظ حدثونی ہے۔

۹۰۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَاِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ فَحَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَوَادِيْ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ قَالُوْا حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ

(بخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ر اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ درختوں میں ایک در جس کے پتے نہیں گرتے اور یہ ہی مثال ہے مسلما وہ کونسا درخت ہے۔ یہ سن کر لوگوں کا خیال جنگل کے کی طرف گیا۔ عبداللہ کہتے ہیں۔ میرے دل میں آیا ک کھجور کا ہے۔ لیکن میں نے شرم سے نہ کہا۔ صحابہ نے ع یا رسول اللہ! آپ ہی بیان فرمائیں۔ حضور صلی اللہ نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب العلم میں تین مرتبہ ذکر کیا ہے۔ مسلم نے کتاب العلم میں اور ترمذی و نسائی نے اختلافِ الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے ۲۔ حدیث ہٰذا میں مسلمان کو کھجور کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی جیسے کھجور کا درخت اور اس کے اجزاء و پھل بہت فائدہ مند ہوتے ہیں تو ایسے ہی مومنِ کامل کا وجود معاشرہ کے لیے موجبِ خیر و برکت ہوتا ہے۔ ۳۔ بعض علما نے وجہ تشبیہ یہ بیان کی ہے کہ جیسے کھجور کے درخت کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ باقی نہیں رہتا۔ یہی حال مسلمان کا ہے یا یہ کہ کھجور کے درخت مذکر و مؤنث دونوں ہوتے ہیں یا اس میں بھی انسان کی طرح مادہ ہوتا ہے یا انسان کی طرح اس میں جذباتِ عشق و محبت پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ تمام وجوہ تشبیہ ضعیف ہیں۔ کیونکہ یہ تمام امور کافر میں بھی پائے جاتے ہیں، اور حدیثِ ہٰذا میں صرف مومن کو تشبیہ دی گئی ہے)۔

یہ حدیث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ اُستاد اور عالم کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اصحاب یا شاگردوں کا امتحان لینے کے لیے ان سے سوال کرے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم سے سوال کیا ۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے محض حیاء کی وجہ سے جواب نہ دیا۔ حالانکہ صحیح جواب ان کے خیال میں آچکا تھا جس سے واضح ہوا کہ ایسے مواقع پر حیا کرنا جہاں کسی دینی امر میں خلل واقع نہ ہو جائز ہے لیکن جہاں خلل ہو وہاں حیاء جائز نہیں ہے جیسے مسائل حیض و نفاس نہ بتانا یا عورتوں کا نہ پوچھنا کہ اگر وہ ان مسائل سے واقف نہ ہوں گی تو صوم و صلوٰۃ جو فرائض ہیں ان کی ادائیگی کیسے کریں گی اس لیے حسب موقع و ضرورت عالم کو عورتوں کے مخصوص مسائل بتانے میں حیا کرنا جائز نہیں ۳۔ کھجور اور اس کا پھل برکت والا ہے۔ کھجور کے فوائد اظہر من الشمس ہیں۔ قرآنِ پاک میں شجرہ طیبہ سے مراد اکثر مفسرین نے کھجور کے درخت ہی کو مراد لیا ہے تو جیسے کھجور کے درخت کی جڑیں زمین میں نہایت گہری اور مضبوط ہوتی ہیں۔ اسی طرح مومن کے قلب میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے یا جیسے کھجور کا درخت آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح مومن کے اعمالِ صالحہ کا کثیر ثواب عطا کیا جاتا ہے ۴۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امثال و اشباہ سے مسائل کو سمجھانا مستحب ہے تاکہ سامع خوب اچھی طرح سمجھ جائے ۵۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ تشبیہ میں مشبہ کو سب باتوں میں مشبہ بہ کے مثل ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسے مسلم کو کھجور کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھجور اور مسلمان میں من کل الوجوہ مشابہت و مماثلت ہے یا جیسے بہادر انسان کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے تو صرف وصفِ بہادری میں یا جیسے قرآن پاک میں فرمایا۔

مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ
يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ
اَمْثَالُكُمْ

(کلمہ حصر بھی یہاں موجود ہے اور لفظی ترجمہ آیت کا یہی ہے) یہ جانور اور پرندے وغیرہ تمہاری طرح ایک اُمت ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے جانور اور پرندے مکلف نہیں۔ ان پر انسان کی طرح نماز روزہ وغیرہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ تشبیہ بھی محض اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں ہے کہ جیسے انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ ایسے ہی یہ جانور وغیرہ بھی اسی کے پیدا کئے ہوتے ہیں اس سے ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے جیسا انسان ثابت کرنے کے لیے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی رٹ لگایا کرتے ہیں ۶۔ اسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سوال کرنا عدمِ علم پر دلالت نہیں

کرتا جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا۔ حالانکہ آپ کو جواب معلوم تھا۔ یا جیسے اللہ عزوجل نے
موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ حالانکہ اللہ عزوجل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چیز کا
منکرین علم نبوی اس مضمون کی حدیثیں پیش کرکے کہا کرتے ہیں کہ دیکھو حضور علیہ السلام نے سوال کیا تو آپ کو اگر علم غیب ہوتا تو
سوال کیوں کرتے۔ حالانکہ ایسا کہنا سخت جہالت ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سائل کو جواب معلوم ہوتا ہے
کے باوجود سوال کرتا ہے جیسے کہ اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا یا حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام سے سوال
لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کرنے کو آپ کے عدم علم کی دلیل بنانا ہر طرح باطل ہے۔

بَابُ الْقِرَاۃِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ (بخاری)

باب محدث کے سامنے پڑھنے اور اس پر اسکی کتاب سُنانے کے بیان میں

اس عنوان کے قائم کرنے سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ روایت حدیث کا ایک طریقہ یہ ہے کہ استاد یا شیخ اپنے شاگرد کو
سُنائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شاگرد وہ استاد کی کتاب حدیث کو حفظ کرکے یا ناظرہ استاد کو پڑھ کر سُنائے۔ یہ دونوں طریقے
اعتماد ہیں۔ امام نے اس امر کے ثبوت میں حضرت حسن بصری، حضرت سفیان ثوری و امام مالک وغیرہم کے اقوال
کیے ہیں مثلاً امام مالک، حسن بصری و سفیان ثوری نے شاگرد کے پڑھنے کو جائز کہا اور بعض نے حدیث ضمام
سے اس کے جواز پر استدلال کیا۔ حضرت ضمام خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ عرض کی کیا اللہ تعالے نے آپ کو
کہ ہم لوگ نماز پڑھیں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا! ہاں۔ تو گویا یہ حضور علیہ السلام کے سامنے پڑھنا ہوا۔ پھر
نے انہی امور کو اپنی قوم تک پہنچایا اور انہوں نے ان کی باتوں کو تسلیم کرلیا۔ حضرت امام مالک نے صک سے
یعنی صاحب معاملہ کو دستاویز پڑھ کر سنائی جائے اور اس کا اقرار اور تصدیق کرے اور پھر اس سے روایت
ہوگا تو اس توضیح کے بعد امام بخاری نے اس سوال کے متعلق یہ حدیث لکھی ہے۔

۶۲۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يَقُوْلُ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰى جَمَلٍ اَنَاخَهٗ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهٗ ثُمَّ قَالَ اَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ فَقُلْنَا هٰذَا الرَّجُلُ الْاَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا ابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَجَبْتُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْئَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِيْ نَفْسِكَ فَقَالَ سَلْ عَمَّا

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ
ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اس نے اپنا
اور مسجد میں باندھ دیا۔ پوچھنے لگا تم میں محمد صلی
کون ہیں؟ اور حضور علیہ السلام اس وقت تکیہ
تھے۔ ہم نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔
چٹے تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے تو وہ حضور علیہ السلام
متوجہ ہوکر کہنے لگا۔ عبدالمطلب کے بیٹے! حضور
نے جواب میں فرمایا۔ میں سن رہا ہوں۔ وہ کہنے
سے پوچھنا چاہتا ہوں اور سختی سے پوچھوں گا

بَدَا لَكَ فَقَالَ أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ آللّٰهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ فَقَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ نُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ نَصُوْمَ هٰذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ قَالَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ أَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ تَأْخُذَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَائِنَا فَتَقْسِمَهَا عَلَى فُقَرَائِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ آمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهِ وَأَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَّرَائِيْ مِنْ قَوْمِيْ وَأَنَا ضِمَامُ ابْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُوْ بَنِيْ سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ (بخاری)

دل میں بُرا نہ منائیے گا۔ فرمایا جو تیرا جی چاہے پوچھ۔ اس نے کہا میں قسم دیتا ہوں آپ کو اپنے رب کی اور آپ سے پہلے والوں کے رب کی۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام آدمیوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اللھم نعم (ہاں) اس نے کہا میں آپ کو اپنے آپ کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم دن اور رات میں پانچ نمازیں پڑھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں! اس نے کہا میں آپ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم سال میں ایک مہینے کے روزے رکھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں، اس نے کہا کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے فقراء پر خرچ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں! اس نے کہا جو آپ لائے ہیں اس پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کا قاصد ہوں ضمام ابن ثعلبہ، سعد ابن بکر کی قوم سے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو ابن ماجہ و ابوداؤد نے کتاب الصلوٰۃ اور نسائی نے کتاب الصوم میں ذکر کیا۔ فَلَا تَجِدْ۔ اس کے معنی غضب اور حزن کے آتے ہیں۔ وَجَدَ، یجد، وجدانًا، فَاَنَاخَہٗ یعنی اس نے اونٹ کو بٹھایا اور اس کی ٹانگ کو موڑ کر باندھ دیا۔ ابونعیم احمد و حاکم کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ اس نے اونٹ کو مسجد کے دروازے پر باندھا تھا۔ مسجد میں اونٹ نہیں لایا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے سوال کے جواب میں اللّٰھم نعم فرمایا۔ اللّٰھم کی اصل یا اللہ ہے۔ حرفِ ندا کو حذف کر دیا اور میم کو اس کے بدلے میں لے آئے اللّٰھم ہو گیا۔ اس لفظ کا استعمال تین مقامات پر ہوتا ہے۔ ندا محض کے لیے استثنیٰ کی ندرت کے بیان کے لیے۔ جواب میں قوت اور یقین کو پیدا کرنے کے لیے جیسے کسی نے پوچھا اَزَیْدٌ قَائِمٌ کیا زید کھڑا ہے تو جواب دیا۔ اَللّٰھُمَّ نَعَمْ۔ ہاں کھڑا ہے۔ اب یہاں اللّٰھم کا لفظ جواب میں قوت اور یقین کے پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

۲۔ حضرت ضمام ابن ثعلبہ نے یہ گفتگو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، ایمان لانے سے قبل کی تھی یعنی جب وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور سوال کیے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ورنہ صحابہ کرام کے ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ وہ حضور علیہ السلام سے سوال کرنے میں جلدی نہیں کرتے تھے اور اس کے منتظر رہتے تھے کہ کوئی گاؤں کا گنوار آئے اور حضور علیہ السلام سے بلا تکلف سوال کرے اور ہم بھی سُن لیں۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ خبر واحد واجب العمل ہے اور

ضروریاتِ دین پر اجمالی طور پر ایمان لے آنا کافی ہے۔

بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ وَكِتَابِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى الْبُلْدَانِ

باب مناولہ و مکاتبہ کے بیان میں

مقصودِ باب یہ بتانا ہے کہ مناولہ بھی حجت ہے اور اس کے ساتھ اجازت بھی مقترن ہوجائے تو اس میں قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح مکاتبہ بھی حجت ہے بشرطیکہ اس میں کاتب و مکتوب الیہ کی تعیین ہو۔

مناولہ و مکاتبہ مناولہ کی صورت یہ ہے کہ استاد اپنی کتاب شاگرد کو دے کر یہ کہے کہ اس میں جو حدیثیں ہیں میں نے فلاں سے سنی ہیں اور تم کو میں اجازت دیتا ہوں کہ اس کتاب کی حدیثوں کو تم روایت کرو۔

اس زمانہ میں حدیث کی سندیں دینے کا یہی طریقہ مروج ہے۔

مکاتبہ یہ ہے کہ استاد اپنے ہاتھ سے خط لکھے یا دوسرے سے لکھوائے اور اپنے شاگرد کو بھیج دے اور یہ اجا کہ ان احادیث کو تم روایت کرسکتے ہو۔ امام بخاری علیہ الرحمہ کے نزدیک مکاتبہ بھی قوت میں مناولہ کی طرح ہے علمائے مناولہ کو مکاتبہ سے قوی قرار دیا ہے کیونکہ مناولہ میں بالمشافہ اجازت دی جاتی ہے۔ امام نے مناولہ و مکاتبہ کے ہونے کے ثبوت میں امورِ ذیل کو پیش کیا ہے۔

اوّل، حضرت انس کہتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے متعدد نسخے لکھوا کر مخت میں بھیج دیے تھے۔ ابوحاتم نے کہا آپ نے سات عدد نسخے لکھوائے تھے۔ جنہیں شام، عراق، بحرین، بصرہ، کوف یمن بھیجا تھا۔ **دوم**، اہلِ حجاز نے حدیثِ ذیل سے دلیل لی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر خط لکھ دیا اور فرمایا جب تم فلاں مقام پر پہنچو تو اس خط کو پڑھ کر سنا دینا۔ چنانچہ جب وہ اس مقام پر پہنچے تو انہوں کھولا اور حکمِ نبوی کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ **سوم**، مناولہ و مکاتبہ کے قابلِ قبول ہونے کے متعلق امام نے ذیل کی بھی دلیل لی ہے۔

٦٣- أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بِكِتَابِهِ رَجُلًا وَأَمَرَهُ أَنْ يَدْفَعَهُ إِلَى عَظِيْمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهُ عَظِيْمُ الْبَحْرَيْنِ إِلَى كِسْرٰى فَلَمَّا قَرَأَهُ مَزَّقَهُ فَحَسِبْتُ أَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُمَزَّقُوْا كُلَّ مُمَزَّقٍ (بخاری)

عبد اللہ بن عباس نے خبر دی کہ حضور اکرم علیہ وسلم نے ایک خط عظیم بحرین کی طرف بھجوا عظیم البحرین نے وہ خط کسریٰ تک پہنچایا۔ جب نے اس کو پڑھا تو پھاڑ دیا۔ (ابن شہاب ہیں۔ میرا گمان ہے کہ سعید ابن المسیب نے کہا کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کے لیے بد دعا کی کہ وہ بالکل تباہ برباد ہوجائے۔

توضیح و تشریح امام نے اس حدیث کو مغازی میں اور امام نسائی نے سیر میں ذکر کیا ہے ۲- رجلاً

ضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی ہیں۔ حضرت حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگِ احد میں زخمی ہونے پر وفات پائی تھی۔ ضرت عبداللہ قدیم سے اسلام لائے اور مہاجرینِ اولین سے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے ے۔ زمانہ فاروقی میں رومی نے ان کو قید کرلیا تھا۔ حضرت عثمان کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔

عظیم البحرین ۔ بحرین کے گورنر کا نام منذر بن ساوی ہے۔ حضرت عبداللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہ میرا خط عظیم البحرین کو دے دینا اور بحرین کے رئیس نے وہ خط کسریٰ تک پہنچا دیا تھا۔ کسریٰ نے جب نامہ مبارک تو اس کو چاک کردیا۔ کسریٰ کا نام پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں ہے۔ یہ بڑی شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ عجم کا یہ طریقہ سلاطین کو جو خط لکھتے اس میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط بھیجا اس پہلے اللہ عزوجل کا نام تھا اور اس کے بعد من محمد رسول اللہ کے لفظ تھے۔ پرویز یہ دیکھ کر جل بھن گیا اور اس ی تحقیر سمجھا۔ نامہ اقدس کو غصہ میں چاک کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ کسریٰ نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد یمن کے گورنر باذان کو فرمان بھیجا کہ کسی کو حجاز بھیجو اور س نئے مدعی نبوت سے توبہ کراؤ۔ بصورتِ دیگر اس کا سر کاٹ کر میرے دربار میں پیش کرو۔ جب باذان کے آدمی خدمت یں پہنچے تو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی"۔ (طبری)

اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ باذان کے آدمی خدمتِ نبوی میں پہنچے تو حضور علیہ السلام نے تبسم فرمایا اور فرمایا۔

یْ قَتَلَ کِسْرٰی فِیْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ لِسَبْعِ تٍ مَضَتْ مِنْهَا (عینی جلد اول ص۲۱)

کہ میرے رب نے کسریٰ کو اسی رات قتل کردیا ہے ابھی سات ساعت گزری ہیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابھی باذان کے قاصد یمن پہنچے ہی تھے کہ خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے اپنے باپ پرویز ردیا۔ یہ واقعہ ۷ھ کا ہے اور پھر خلافتِ فاروقی میں ایران کی سلطنت تمام دنیا سے اٹھ گئی اور حضور علیہ السلام کی پیشگوئی بحرف پوری ہوئی ؎

تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی

۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَتَبَ النَّبِيُّ هُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كِتَابًا اَوْ اَرَادَ كْتُبَ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّهُمْ لَا يَقْرَءُوْنَ بًا اِلَّا مَخْتُوْمًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ ةٍ نَقْشُهٗ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

(بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھا یا لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے کہا گیا کہ عجم یا روم کے بادشاہ وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر ثبت ہو تو حضور علیہ السلام نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی۔ اس کے نگینہ پر محمد رسول اللہ لکھا تھا۔

ام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الجہاد واللباس میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم نے لباس میں اور امام نسائی نے م اور کتاب التفسیر میں ذکر فرمایا ہے۔ امام بخاری نے ان دونوں حدیثوں کو مکاتبہ کے ثبوت میں ذکر کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے ذیل کے مسائل معلوم ہوئے۔

۱۔ حدیث کو لکھنا ، کفار کو دعوتِ اسلام دینا ، کفار پر بددعا کرنا ، قاضی یا بادشاہ یا حاکم کا اپنے فرمان یا خط پر لگانا ، انگوٹھی کے نگینہ پر کوئی عبارت یا اپنا نام یا اللہ عزوجل کا نام کندہ کرانا۔ یہ سب امور جائز ہیں۔ واضح ہو کہ مر لیے صرف چاندی کی انگوٹھی جو مردانہ وضع کی ہو اس کا نگینہ ایک ہو اور ساڑھے چار ماشہ سے کم وزن کی ہو، پہننا مگر ترک افضل ہے البتہ بادشاہ ، حاکم و مفتی کو مہر کی غرض سے پہننا سُنّت ہے۔

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ

باب اس امر کے بیان میں کہ جو شخص وہاں بیٹھے جہاں مجلس کی انتہا ہو اور جو شخص وہاں بیٹھ جائے جہاں حلقہ میں جگہ ہو

وَمَنْ رَاٰى فُرْجَةً فِى الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا (بخاری)

یہاں مجلس و حلقہ سے وعظ و تذکیر کی مجلس مراد ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ طالب علم کو علم کی مجلس میں کہاں چاہیے۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس باب میں جو حدیث لکھی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابو وا کا بیان ہے۔ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں صحابہ کرام کے ساتھ جلوہ فرما تھے کہ اتنے میں تین آدمی آ ان میں سے واپس ہو گیا اور دو مجلسِ نبوی میں شریک ہونے کے لیے آپ کے پاس کھڑے رہے۔ پھر ایک نے حلقہ م سی خالی جگہ دیکھی وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھا جب حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم وعظ سے فارغ ہوئے کیا میں تم کو ان تینوں آدمیوں کا حال نہ بتاؤں ؟ آپ نے فرمایا :-

۶۵۔ اَمَّا اَحَدُهُمْ فَاَوٰى اِلَى اللّٰهِ فَاٰوَاهُ اللّٰهُ مِنْهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ وَاَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ (بخاری)

ان میں سے ایک نے اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت پناہ لی تو اللہ نے اس کو جگہ دے دی۔ دوسر اندر گھسنے میں لوگوں سے شرم کی تو اللہ نے بھی اس جزا دی (یعنی ثواب عطا فرمایا) اور دوسرا اس نے اعراض کیا۔ اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے صلوٰۃ میں، مسلم و ترمذی نے استیذان میں اور امام نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا ہے ۲۔ راویوں میں ابو واقد قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا نام حارث بن عوف جنگِ یرموک میں شریک ہوئے۔ مکہ میں وفات پائی اور مقبرۂ مہاجرین میں دفن ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہوں نے ۲۴ حدیثیں روایت کیں۔ صحابہ میں ابو واقد کنیت کے تین اصحاب ہوئے ہیں۔

فاوی الی اللہ سے معلوم ہوا کہ مجالسِ وعظ و نصیحت میں شریک ہونا باعثِ ثواب ہے تو مجلس میں جگہ خالی کو پُر کر دینا بہتر ہے بشرطیکہ لوگوں کو ایذا نہ پہنچے۔ مجمع میں انتشار نہ ہو ورنہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ وعظ و نصیحت میں شریک ہونے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوتا ہے۔ فاوی الی اللہ یہ اس لیے فرمایا جس نے حلقہ جگہ دیکھی تو وہاں جا کر بیٹھ گئے جس سے واضح ہوا کہ اگر مجلسِ وعظ میں جگہ خالی ہو تو اس کو پُر کر دینا بہتر ہے مگر اس ص

ب کہ لوگوں کو ایذا نہ پہنچے اور مجمع میں انتشار نہ پھیلے ورنہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے۔

فاستحی اللہ : یہ دوسرے شخص کے متعلق فرمایا جس نے حلقہ کے اندر آنے میں شرم کی تھی اور لوگوں کے پیچھے ہی بیٹھ ئے۔ مطلب یہ کہ وہ ادباً حلقہ میں نہ آئے تو اللہ تعالےٰ نے ان کے اس فعل پر ثواب عطا فرمایا۔

فاعرض اللہ عنہ : یہ اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے اس مجلس وعظ سے اعراض کیا۔ مطلب یہ کہ وہ مجلس کی خیر و برکت سے محروم رہے۔

علامہ ابن حجر نے فاعرض اللہ کے ماتحت لکھا کہ یہ وعید اس شخص کے لیے بھی ہے جو مجلس خیر میں بلا عذر شریک یں۔ یہ ظاہر ہے کہ عذر ہو یا نہ ہو ہر مجلس وعظ و تذکیر میں حاضر ہونا فرض و واجب کہاں ہے جس پر وعید سنائی جاتی۔ شارحین نے پہلے شخص کو سب سے افضل قرار دیا ہے اور تیسرے کو محروم بلکہ بعض نے منافق تک لکھ دیا ہے حالانکہ بعض یث میں اس کے متعلق اشارہ بھی نہیں ہے۔ حدیث زیر بحث میں تو صرف اس خاص مجلس کے شرکار کے احوال کا ہے اور مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ وہ بھی ——— جو حیا کی وجہ سے آگے نہیں بڑھے اور لوگوں کے پیچھے بیٹھ گئے اور ے جنھوں نے جگہ دیکھی اور وہیں بیٹھ گئے۔ ان دونوں نے اس مجلس کے ثواب کو پالیا اور ان دونوں کو ان کی صحت نیت بق ثواب مل گیا۔ لیکن تیسرے شخص جو اس مجلس میں شامل نہ ہوئے وہ اس خاص مجلس کے ثواب سے محروم رہے اور ہر اس حدیث سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ واعظ و نصیحت کی مجالس میں شریک ہونا باعث اجر و ثواب ہے یک نہیں ہوتا تو وہ اس خاص مجلس کے ثواب سے محروم رہے گا۔ (واللہ اعلم)

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے متعلق

مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ (بخاری) | کہ بعض اوقات مبلَّغ، سامع سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے

مسائل

رب تقلیل کے لیے آتا ہے لیکن تکثیر کے لیے کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مُبَلَّغٍ یعنی الیہ جار و مجرور کو حذف کر دیا۔ اَوْعٰی : افعل التفضیل ہے وعی سے اس کے معنی حفظ و ضبط کے ہیں۔ لفظاً ترجمہ یں مذکور ہے اور بخاری کتاب الحج میں بھی ہے۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ جن کو حدیث پہنچائی جائے۔ ان میں ایسے لوگ یں جو اصل سامع سے زیادہ حافظہ رکھتے ہیں اور فہم و ضبط کا مادہ ان میں زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ دینی مسائل دوسروں تک پہنچا دو تاکہ تبلیغ و اشاعت دین کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔

س باب میں امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے :۔

ضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر اپنے آپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ذکر کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام منیٰ دسویں تاریخ کو اونٹ پر جلوہ فرما ہوئے ایک صاحب نے اونٹ کی نکیل تھامی۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ آج ہم سب خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کا کوئی اور نام لیں گے۔ فرمایا۔

آج یوم نحر نہیں؟ ہم نے عرض کی جی ہاں۔ فرمایا۔ یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم خاموش رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس
اور نام لیں گے۔ پھر

٦٦۔ قَالَ اَلَيْسَ لِذِی الْحِجَّۃِ قُلْنَا بَلٰی
قَالَ فَاِنَّ دِمَآءَكُمْ وَ اَمْوَالَكُمْ وَ
اَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ
هٰذَا فِیْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِیْ بَلَدِكُمْ هٰذَا
لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ
عَسٰی اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰی لَهٗ مِنْهُ (بخاری)

فرمایا۔ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کی
فرمایا۔ تمہارے خون، اموال اور عزتیں
(ایک دوسرے پر) حرام ہیں۔ جیسے اس دن کی
اس مہینہ میں اور اس دن میں۔ پس حاضر کو
وہ غائب کو میرا یہ ارشاد پہنچا دے کیونکہ ہو سکتا
حاضر سے غائب میرے ارشاد کو زیادہ یاد رکھنے

قوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے حج، تفسیر اضاحی میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے دیات میں۔

۲۔ اوعیٰ۔ کے معنی حفظ وفہم کے ہیں۔ فان دماءکم تقدیر عبارت یہ ہے۔
سفك دماءكم واخذ اموالكم وسلب اعراضكم۔ زمانہ جاہلیت میں قتل وقتال، لوٹ مار اور عزت
پر حملے کرنا عربوں کی طبیعت ثانیہ تھی۔ حضور علیہ السلام نے اپنے اس خطبہ میں جو آپ نے مقام منیٰ ذوالحجہ کی ۱۰ تاریخ کو
فرمایا۔ حاضرین کو نہایت حکیمانہ انداز میں مسلمان کی عزت وناموس کی حرمت وعزت کا احساس دلایا اور فرمایا۔
کا مہینہ حرمت والا ہے۔ اس کی حرمت کے تم بھی قائل ہو۔ اسی طرح مکہ کی عزت وعظمت کے بھی تم لوگ قائل ہو
کہ مسلمان کے جان ومال، عزت وناموس کی حرمت اس مہینہ اور اس شہر کی طرح ہے۔

۳۔ حدیث زیر بحث مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عالم کو منبر یا سواری پر بیٹھ کر وعظ کرنا جائز ہے ۲۔ عالم کو
کہ جہاں اور جس وقت جس مسئلہ کے اظہار کی زیادہ ضرورت ہو وہاں اس مسئلہ کو خصوصی طور پر بیان کرے ۳۔ ایک مسلمان
دوسرے مسلمان کی عزت وآبرو کا پاس ولحاظ لازمی ہے اور حتی المقدور اپنے مسلمان بھائی کے جان ومال کی حفاظت
کا فرض اسلامی ہے ۴۔ تمام مسلمانوں کی عزت وناموس کا درجہ مساوی ہے۔ امیر وغریب، شاہ وفقیر حقوق انسانی
مساوی درجہ رکھتے ہیں ؎

عبد مسلم کم تر از احرار نیست
خون شاہ برتر از معمار نیست

۵۔ حضور علیہ السلام اپنی احادیث کی تبلیغ واشاعت کا حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام احادیث نبویہ کو دوسروں
پہنچاتے تھے ۶۔ صحابہ کرام کے ادب واحترام کا یہ عالم تھا کہ جب حضور علیہ السلام ان سے کوئی سوال کرتے تو وہ
ورسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے) کہا کرتے تھے۔

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

باب اس امر کے بیان میں کہ علم قول اور عمل پر مقدم ہے

لِقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جان لو کوئی معبود نہیں

اللهُ فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ (بخاری)

اللہ کے تو اللہ نے علم سے ابتدا فرمائی

یعنی آیت میں پہلے یہ فرمایا کہ اس امر کو جان لو کہ معبودِ حقیقی سوا اللہ تعالےٰ کے اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔ ستغفر لذنبك اور استغفار ایک عمل ہی ہے تو آیت میں عمل کا حکم علم کے بعد دیا گیا جس سے واضح ہوا کہ علم عمل پر مقدم ہے۔

م وعلماء وفضائل

وَاَنَّ الْعُلَمَآءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ
ثُوا الْعِلْمَ مَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ

علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے علم ورثہ میں چھوڑا۔ جس نے علم حاصل کیا۔ اس نے پورا حصہ حاصل کیا۔ (بخاری)

ئد ومسائل

یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جس کو ابن حبان، حاکم، ترمذی وابوداؤد نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص دین کی طلب کے لیے سفر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ طالبانِ علم دین کے ے ملائکہ اپنے پر بچھاتے ہیں اور زمین وآسمان کی مخلوقات اس کے لیے استغفار کرتی ہے، حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی۔ دین کی فضیلت، عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کرام راث میں درہم ودینار نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی میراث علم ہوتی ہے تو جس نے علمِ دین حاصل کیا۔ اسے میراثِ انبیاء کا پورا ل گیا۔ قرآنِ پاک سے بھی اس مضمون کی توثیق ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے۔ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا ن عبادنا ـــــ امام بخاری کا مقصود اس باب سے علم وعلماء کی شان اور فضیلت بیان کرنا ہے تو جب علم ـ کی میراث ہوا تو اس سے علم وعلماء کی فضیلت واضح ہوتی کہ جیسے نبوّت سے کوئی فضیلت زیادہ نہیں ہے۔ اسی ح کوئی شرف وراثتِ نبوت سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور یہ فضیلت نفسِ علم کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ عمل بھی ہو تو سبحان اللہ۔

سَلَكَ طَرِيْقًا يَّطْلُبُ بِهٖ عِلْمًا
هَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ
(بخاری)

اور جو ایسے راستہ کو اختیار کرے جس سے علم دین طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

یہ بھی مذکورہ بالا حدیث کا ایک ٹکڑہ ہے۔ امام مسلم نے اس کو روایت کیا۔ سہل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ علمِ دین کت سے اللہ تعالیٰ حسنِ عمل کی توفیق عطا فرمائے گا۔ جس کی وجہ سے جنّت میں جگہ ملے گی۔

قَالَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اور اللہ جل شانہٗ نے فرمایا۔ اور وہی لوگ اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔

یعنی جو شخص جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی صفات کا عارف ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ خوف وخشیت اس میں ہوگی یے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

وَقَالَ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں جانتے ان کو مگر عالم

یعنی قرآنِ پاک میں جو امثال ہیں۔ ان کے فوائد ونتائج کو عالم ہی جانتے ہیں۔

٥۔ وَقَالَ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھوں نے کہا کہ اگر ہم سنتے عقل رکھتے تو ہم دوزخی نہ ہوتے۔
٦۔ وَقَالَ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (بخاری)	اور اللہ نے فرمایا کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔

۱۔ یعنی جب کفار کو دوزخ میں ڈالا جائیگا تو وہ کہیں گے کہ اے کاش ہم عقل رکھتے اور حق کو قبول کرتے تو حق کو کنایہ اوصافِ علم سے ہے تو مطلب یہ کہ کفار قیامت کے دن کہیں گے کہ اگر ہم علم والے ہوتے تو اپنے فرائض اور جہنم سے نجات پاتے۔

۲۔ دوسری آیت میں عالم اور جاہل میں فرق بتایا گیا ہے کہ علم والوں کا درجہ بہت بڑا ہے اور علم کی مدح اور جہا مذمت کی گئی ہے۔

٧۔ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ	اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے
٨۔ وَاِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ	اور علم وہی ہے جو سیکھنے سے حاصل ہو
٩۔ وَقَالَ اَبُوْ ذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰى هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ اَنِّيْ اُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تُجِيْزُوْا عَلَيَّ لَاَنْفَذْتُهَا	اور حضرت ابوذر نے فرمایا اگر تم تلوار رکھو اس اشارہ کیا اپنی گردن کی طرف اور پھر اس حالت بھی یہ سمجھوں کہ میں ایک بات جو میں نے حضور علیہ سے سنی ہے اس کو لوگوں تک پہنچا سکوں گا گردن سے پہلے تو میں اس کو ضرور پہنچا دوں گا۔
١٠۔ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ حُلَمَاءَ فُقَهَاءَ حُكَمَاءَ	اور حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا۔ ربانیین میں سے ہو جاؤ۔ بردبار، فقیہ اور عالم
١١۔ وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ الَّذِيْ يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهٖ (بخاری)	اور کہا گیا ہے کہ عالم ربانی وہ ہے جو دین کے قوا سے قبل جزئیات مسائل لوگوں کو سمجھائے۔

عالم ربانی۔ یہ نسبت ہے رب کی طرف۔ یعنی وہ شخص جو علم و عمل میں اللہ کے حکم کا خیال رکھے۔ ابن نے کہا کہ عالمِ ربانی اس کو کہیں گے جو خود بھی عامل ہو ــــ حکماء۔ حکیم کی جمع ہے۔ حکمت کے معنیٰ صحیح قول و عمل کے نیز حکمت اشیاء کی حقیقت کے جاننے کو بھی کہتے ہیں ــــ حلماء۔ حلیم کے معنیٰ بردبار کے ہیں یعنی بوقتِ غیظ و غض جو شخص اپنے غصہ کو قابو میں رکھے۔

۳۔ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور اس حالت میں بھی حضور علیہ السلام کی کوئی حدیث بیان کر سکوں تو اس کو ضرور کر دوں گا۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

ی کو دین سمجھتے تھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کو ایک اہم فرض جانتے تھے۔

بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب اس امر کے بیان میں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

تَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْلَا فِرُوْا

وعظ و نصیحت میں لوگوں کی رعایت کرتے تھے تاکہ وہ اُکتا نہ جائیں

بلیغ کا طریق کار

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت پر رحیم و کریم تھے۔ وعظ و نصیحت میں یہ خیال رکھتے تھے کہ لوگ اکتا نہ جائیں اور سلسلہ وعظ اسی وقت تک جاری رکھتے تھے جب تک گ خوشی سے سن سکیں اور موقع و وقت دیکھ کر انہیں سمجھاتے تھے۔

٦٧ - عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى
هُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ
الْاَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ ہمارے نصیحت کرنے کے وقت ڈھونڈتے تھے دنوں میں۔ آپ اس کو بُرا سمجھتے تھے کہ ہم اُکتا جائیں۔

مطلب حدیث یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تبلیغ فرماتے تھے جب کہ لوگ خوش و خرم ں اور اطمینان سے سن سکیں۔ آپ نے وعظ کے دن معین فرما دیے تھے تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں اور وعظ و نصیحت لوگوں کے مزاج کا خیال فرمایا کرتے تھے۔

فائدہ - اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے دعوات میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے توبہ میں ذکر کیا ہے امام ترمذی علیہ الرحمہ نے استیذان میں ذکر فرمایا ہے۔

٩ - عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
الَ يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا
تُنَفِّرُوْا

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر آسانی کرو۔ سختی نہ کرو اور بشارت دو نفرت نہ دلاؤ۔

اس حدیث میں تبلیغ کے اصول ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ عالم کو چاہیے کہ نرمی کے ساتھ لوگوں کو احکام اسلامی تبلیغ کرے۔ سخت کلامی سے کام نہ لے۔ عذابِ الٰہی سے اس قدر نہ ڈرائے کہ لوگ اللہ کی رحمت ہی سے مایوس ہو بلکہ تصویر کے دونوں رُخ ان کے سامنے رکھے۔ جب اللہ عزوجل کی قہاری کا ذکر کرے تو اس کی رحمت و مغفرت کا رہ بھی کرے۔ ف - اس حدیث کو امام بخاری نے ادب میں۔ امام مسلم نے مغازی میں اور امام نسائی نے بھی ذکر کیا۔

بَابُ مَنْ جَعَلَ لِاَهْلِ الْعِلْمِ اَيَّامًا مَّعْلُوْمَةً

باب اس امر کے بیان میں کہ طالبینِ علم کی تعلیم کے لیے دن مقرر کیا جائے

وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللّٰهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ
كُلِّ خَمِيْسٍ - فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا اَبَا

حضرت ابو وائل (شقیق بن سلمہ) سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود ہر جمعرات کو وعظ کہا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے

عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِكَ اَنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّيْ اَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا

کہا اے عبدالرحمٰن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں ہر وعظ کریں۔ عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا وعظ کہنے سے جو بات مجھے روکتی ہے وہ یہ ہے تم کو تنگی میں ڈالنا پسند نہیں کرتا اور میں تمہاری فرصت اور خوشی کا وقت ڈھونڈتا ہوں جیسے صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو وعظ سنانے کے لیے ہماری اور خوشی کا وقت تلاش فرماتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔

جائز کام کے لیے دن مقرر کرنے کا ثبوت

اس حدیث میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وعظ و نصیحت کے لیے لوگوں کے فرصت کا وقت مقرر کیا جائے تاکہ اطمینان سے سن سکیں نیز دن مقرر کرکے وعظ کرنے کا اس سے جواز بھی ثابت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجالس خیر کے لیے وقت و دن مقرر کرنے میں عوام کو آسانی رہتی ہے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن وعظ ہے تو وہ فرصت کا وقت نکال کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ دن کے تقرر سے بہت چڑتے ہیں اور محفل میلاد و اعراس بزرگان دین کو اس لیے بھی بدعت کہتے ہیں کہ یہ دن مقرر کرکے کیے جاتے ہیں حالانکہ اگر ضد و تعصب سے علیحدہ ہو کر غور کیا جائے تو حدیث سے ہی یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی جائز کام کو دن مقرر کرکے کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے۔

بَابُ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ

باب جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے

۷۰۔ مُعَاوِيَةَ خَطِيْبًا يَّقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِيْ وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْاُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ

(بخاری)

حضرت معاویہ نے اپنے خطبہ میں کہا کہ حضور صلی علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور قاسم ہوں اور اللہ عطا فرمانے والا ہے اور میری کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی ان کا خلاف کرے گا وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے حتیٰ کہ اللہ کا امر آجائے۔

امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حدیث ہٰذا کے راویوں میں امیر معاویہ قابل ذکر ہیں۔ جلیل القدر ہیں۔ معاویہ بن ابی سفیان صخر بن حرب الاموی عام الفتح میں ایمان کاتب الوحی تھے۔ رجب ۶۰ھ میں ۷۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان سے کل ۱۳۶ حدیثیں مروی ہیں۔ امام بخاری صرف آٹھ حدیثیں اور مسلم نے صرف پانچ حدیثیں ان سے روایت کیں اور ۴ پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا۔ صحابہ میں

نحو صرف یہی ہیں۔

قہ کی تعریف

لغت میں فقہ کے معنی فہم کے ہیں اور عرف میں فقہ احکام شرعیہ فرعیہ کے اس علم کا نام ہے جو احکامِ مذکورہ کے دلائل تفصیلیہ سے حاصل کیا جاتا ہے ۲۔ احکامِ شرعیہ کی قید سے احکامِ عقلیہ یہ و نحویہ وغیرہ کو تعریف سے خارج کرنا مقصود ہے ۳۔ احکامِ شرعیہ دو قسم پر ہیں۔ اصلیہ و فرعیہ —— وہ احکام عیہ جن کا تعلق اعتقاد سے ہے۔ انہیں اصطلاحِ شرعیہ میں اصلیہ کہتے ہیں —— اور جن کا تعلق عمل سے ہے وہ احکامِ شرعیہ یہ کہلاتے ہیں۔

۴۔ علمِ احکامِ شرعیہ اصلیہ کو "علمِ کلام" کہتے ہیں اور علمِ احکامِ شرعیہ فرعیہ کو فقہ کہتے ہیں ۵۔ احکام خواہ اصلیہ ہوں یا یان کا استخراج و استنباط کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع و قیاس (ادلہ اربعہ) پر موقوف ہے۔ حدیث ہذا میں کیا ہے کہ دین کی فہم و بصیرت یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کو دی جاتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم اس سے علماءِ مجتہدین کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ وہ دین کی اعلیٰ فہم رکھتے ہیں۔

۶۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا کہ دینے والا خدا ہے اور تقسیم کرنے والا میں ہوں یعنی اللہ کی تمام توں کی تقسیم میرے سپرد ہے۔ میرے واسطہ اور وسیلے کے بغیر کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔

۷۔ ولن تزال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ امت آخری امت ہے اور اسی پر قیامت قائم ہوگی اور اس امت کا ایک وہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور کسی مخالف کی مخالفت ان کو حق سے ہٹا نہ سکے گی یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائیگا۔

واضح ہو کہ حدیث ہذا میں حتی یاتی امر اللہ سے مراد وہ ہوا ہے جو قربِ قیامت میں چلے گی اور جس کی وجہ سے ہر مسلمان کی وفات واقع ہوگی اور پھر صرف کفار و مشرکین زندہ رہ جائیں گے۔ جن پر قیامت آئے گی کیونکہ حدیث یف میں آیا ہے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ کہنے والا موجود رہے گا قیامت نہیں آئے گی۔ دوسری حدیث میں یا۔ قیامت شرار الخلق پر قائم ہوگی۔ لہٰذا امر اللہ سے وہ ہوا مراد لی جانی چاہیے جو قربِ قیامت میں چلے گی۔ اس یث سے واضح ہوا کہ چاہے اسلام کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو جائے مگر ہر زمانہ میں ایک جماعت ایسی ضرور موجود رہے جو حق پر قائم رہے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے افراد کثیر ہوں گے یا ان کو دنیاوی غلبہ (حکومت) بھی حاصل بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں صحیح اسلام کو اپنائے ہوئے ایک جماعت ضرور موجود رہے گی۔ خواہ دنیاوی لحاظ ے مجبور و مقہور کیوں نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی جماعت جو حق پر قائم رہے گی وہ کون ہے؟ ظاہر ہے یہ وہ عت ہے جو ما انا علیہ واصحابی کی مصداق ہوگی یعنی اہل سنت وجماعت۔

بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

باب علم کو سمجھنے کے لیے عقل و فراست کی ضرورت

۔ اس عنوان کا مطلب یہ ہے کہ دین کو سمجھنے کے لیے عقل و فراست کی ضرورت ہے یعنی جو شخص عقل و فراست کا ے وہ قرآن و حدیث کی نصوص پر غور و فکر کرتا ہے۔ سیاق و سباق اور اس کے اشارات کو سمجھتا ہے اور پھر صحیح

بات تک پہنچ جاتا ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیدیا (کہ وہ دنیا میں رہے یا آخرت کا سفر کرے) سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے اور لوگوں نے تعجب کیا کہ یہ روتے کیوں ہیں؟ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خداداد فہم و فراست سے یہ جان لیا تھا کہ اس بندے سے مراد خود حضور اکرم علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے اور اب حضور علیہ السلام سفر آخرت اختیار فرمانے والے ہیں اسی لیے صحابہ کہا کرتے تھے کہ صدیقِ اکبر ہم سب میں زیادہ علم رکھتے ہیں۔ امام نے اس عنوان کے تحت وہی حدیث لکھی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے صحابہ سے سوال کیا تھا کہ ایک درخت ایسا ہے جو مسلمان کی طرح ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سمجھ گئے کہ وہ کھجور کا درخت ہے مگر بوجہ اپنی کمسنی کے ادباً و احتراماً خاموش رہے۔ اس سے حضرت عبد اللہ بن عمر کے فہم و ذکاء کا حال معلوم ہوا۔ یہ حدیث مع تفہیم کے گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔ ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۶۰، ۶۷

بَابُ الْاِغْتِبَاطِ فِی الْعِلْمِ وَالْحِکْمَةِ

باب علم و حکمت میں رشک کرنے کے بیان میں

کسی میں کمال کو دیکھ کر رشک کرنا اور یہ تمنا کرنا کہ اے اللہ! یہ کمال مجھے عطا فرما جائز ہے۔ غبطہ اسی کو کہتے ہیں اور حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے فضل و شرف کو دیکھ کر جل جانا اور اس کے زوال کو چاہنا یہ ناجائز و حرام ہے۔ اس باب میں امام بخاری علیہ الرحمۃ نے یہ بتایا ہے کہ اگر رشک کے قابل کوئی چیز ہے تو وہ علم و حکمت ہی ہے کیونکہ علم دین تمام دینی و اُخروی برکات و حسنات کا ذریعہ اور فلاحِ دارین کا وسیلہ ہے۔

وَقَالَ عُمَرُ تَفَقَّهُوْا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوْا (بخاری)

حضرت فاروق اعظم نے فرمایا۔ حاکم (سردار) بننے سے پہلے دین کا علم حاصل کرو۔

مطلب یہ ہے کہ حکومت و سرداری ملنے سے پہلے علمِ دین حاصل کر لو تاکہ نظامِ حکومت کو شریعت اسلامیہ کے مطابق چلا سکو۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حاکم بننے کے بعد عام طور پر آدمی طالب علم کی صف میں بیٹھنے سے جھجکتا ہے اور اس طرح دین کی ضروری باتوں سے جاہل رہتا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ سرداری پر فائز ہونے سے پہلے یہ مرحلہ طے کر لے اور دین کی ضروری باتوں سے باخبر ہو جائے۔

قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ بَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوْا وَقَدْ تَعَلَّمَ اَصْحَابُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ كِبَرِ سِنِّهِمْ (بخاری)

امام بخاری (ابو عبد اللہ) نے کہا حاکم بن جانے کے بعد بھی علمِ دین حاصل کرو اور اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑھاپے میں بھی علمِ دین حاصل کیا۔

مطلب یہ کہ دین کا علم حاصل کرنے میں شرم مت کرو کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا کسی عمر یا کسی درجہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر عمر اور ہر درجہ کے آدمی کو علمِ دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ صحابہ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان بڑھاپے میں بھی علمِ دین حاصل کرتے تھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم عمل رہتے تھے۔

۷۲- قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رشک جائز نہیں مگر دو باتوں میں۔ اول جس کو اللہ نے دولت دی اور وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ دوم۔ جس کو اللہ نے حدیث کا علم دیا اور وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا اور تعلیم دیتا ہے۔

فوائد و مسائل

۱- اس حدیث کو امام نے کتاب الزکوٰۃ، احکام، اعتصام میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے زکوٰۃ میں۔ نسائی نے علم میں اور ابن ماجہ نے زہد میں لکھا ۲- لَا حَسَدَ۔ حسد سے مراد یہاں غبطہ ہے یعنی رشک کرنا۔ حضور سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو باتیں ایسی ہیں جن میں رشک کیا جا سکتا ہے۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی اور وہ اس کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتا ہے۔ وہ شخص جس کو اللہ نے علم دین کی دولت عطا فرمائی اور وہ اس کے مطابق فیصلے دے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو قابلِ رشک و تمنّا ہیں ۳- رشک اگر نیک باتوں پر کیا جائے تو یہ محمود ہے اسی کے متعلق فرمایا۔ فلتنافس المتنافسون اور اگر رشک معصیت اور برائیوں پر کیا جائے تو یہ مذموم ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا۔ لاتنافسوا۔ یعنی کسی کو برائی کرتے دیکھ کر رشک مت کرو اور امر صالح میں رشک کرنا مباح ہے اور حسد حرام ہے۔ احادیث میں اس کی بہت مذمت وارد ہوئی ہے۔ حسد کے یہ معنی ہیں کہ کسی شخص میں خوبی دیکھی اس کو اچھی حالت میں پایا تو اب دل میں یہ آرزو کی جائے کہ یہ نعمت اس سے جاتی رہے اور مجھے مل جائے۔

۱- حدیث زیر بحث میں حسد سے مراد غبطہ ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے جو عنوان باندھا ہے اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔ البتہ بعض علماء نے حدیث زیر بحث کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ حدیث مذکورہ کا معنی یہ ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو باتوں میں جائز ہوتا مگر ان میں بھی جائز نہیں جیسا کہ حدیث لا شؤم اِلّا فی الدار میں اسی قسم کی تاویل کی جاتی ہے۔

۳- یقضی۔ فتویٰ اور قضا میں فرق ہے۔ فتویٰ کا تعلق صرف مسئلہ سے ہوتا ہے۔ واقعہ سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اور قضا کا، علم مسئلہ اور علم واقعہ دونوں سے ہوتا ہے۔ حکمت سے مراد یا تو قرآن حکیم ہے جیسا کہ حدیث ابوہریرہ میں وارد ہوا۔ رجل علمہ القرآن اور حکمت سے مراد حدیث نبوی بھی ہو سکتی ہے۔

بَابُ مَا ذُكِرَ فِيْ ذَهَابِ مُوْسٰى فِي الْبَحْرِ

باب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش

الْخَضِرِ وَقَوْلِهِ تَعَالٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِيْ

میں دریا کے کنارے جانا اور اللہ تعالیٰ کا سورہ کہف میں حضرت موسیٰ کا یہ قول نقل کرنا، هَلْ اَتَّبِعُكَ الخ

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ علم ایک عظیم نعمت ہے اور اس پر رشک کرنا جائز ہے۔ اب اس باب میں امام نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علم دین کے حصول کے لیے مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں اور شوار گزار سفر کرنے ہوتے ہیں۔ نیز علم کے حصول میں شرم نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حضرت

خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرنے میں شرم نہیں فرمائی اور ان سے ملاقات کے لیے سفر کیا ۲- اس باب میں آیت لکھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔ "کیا میں تمہیں ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تم مجھے سکھا دو گے وہ نیک بات جو امام نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ آدمی کو علمِ دین کی طلب میں رہنا چاہیئے چاہے وہ خود کتنا ہی بڑا عالم بھی علم کے مزید حصول کے لیے کوشاں رہے اور یہ کہ جس سے علمِ دین حاصل کرے اُس کے ساتھ ادب و تواضع سے

اس باب میں امام نے جو حدیث لکھی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس اور حر بن قیس کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس کے پاس گئے تھے۔ حضرت ابن ہیں کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں اور حُر بن قیس حضرت خضر کی بجائے کسی اور کا نام لیتے تھے تو حضرت ابی ابن سے گزرے۔ حضرت ابن عباس نے ان کو اپنے اختلاف کا قصہ سنایا اور کہا کیا اس معاملہ میں تم نے حضور سید عالم علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے تو حضرت ابی ابن کعب نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

۷۴- يَقُوْلُ بَيْنَمَا مُوْسٰى فِيْ مَلَإٍ مِنْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ إِذْ جَآءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ قَالَ مُوْسٰى لَا فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلٰى مُوْسٰى بَلٰى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَأَلَ مُوْسَى السَّبِيْلَ إِلَيْهِ فَجَعَلَ اللّٰهُ لَهُ الْحُوْتَ آيَةً وَقِيْلَ لَهُ إِذَا فَقَدْتَ الْحُوْتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ فَكَانَ يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوْتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ لِمُوْسٰى فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَا أَنْسَانِيْهُ إِلَّا الشَّيْطٰنُ أَنْ أَذْكُرَهُ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰى آثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ

ایک دن موسیٰ جماعت بنی اسرائیل میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا کہا۔ آپ ایسے جانتے ہیں جو آپ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ حضرت نے کہا نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی۔ ایک بندہ ہے خضر جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے موسیٰ نے ان سے ملاقات کا راستہ پوچھا تو اللہ مچھلی ان کے لیے نشان مقرر کر دی اور فرمایا جب مچھلی گم ہو جائے تو لوٹ جانا خضر سے ملاقات جائے گی تو حضرت موسیٰ مچھلی کے نشان پر سمندر کنارے چلے۔ ان کے خادم (یوشع) نے کہا جب صخرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا قصہ کنا بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھے بھلایا کہ سے اس کا ذکر کرتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی جگہ کی تلاش میں تھے۔ پس دونوں اپنے نشاناتِ قدم پر واپس ہوئے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات گئی اور وہ معاملہ پیش آیا جس کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بیان فرمایا ہے۔

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام نے بخاری شریف میں دس جگہ ذکر کیا ہے۔ مسلم و ترمذی نے علی ال احادیث الانبیاء و تفسیر میں ذکر کیا ۲- من بنی اسرائیل سے مراد اولادِ یعقوب ہے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ آپ کے بارہ فرزند تھے جن کے نام یہ ہیں۔ ۱- یوسف

دانی ۴- نقیالی ۵- زابلون ۶- وجاد ۷- یستاخر ۸- اشیر ۹- روبیل ۱۰- یہودا ۱۱- شمعون ۱۲- لاوی بارہ کو اسباط کہتے ہیں۔ اسباط عربی میں اس درخت کو کہتے ہیں جو کثیر ٹہنیاں رکھتا ہو کیونکہ یہ بارہ ہر قبیلہ کے ہیں اس لیے ان کو اسباط کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ قصہ خضر علیہ السلام میں موسیٰ سے مراد موسیٰ بن عمران موسیٰ بن عشا نہیں۔

ضرت خضر علیہ السلام سے متعلق ضروری معلومات

۲- خضر بفتح خا و کسر ضاد معجمہ یہ لقب ہے۔ آپ کا نام بلیا یا ابلیا یا ارمیا یا الیسع ہے۔ نے کہا آپ کا نام خضرون ہے اور کنیت ابو العباس ہے۔ آپ نبی ہیں صاحب وحی ہیں۔ قرآنِ پاک میں آپ متعلق فرمایا۔ اٰتینه رحمة رحمت سے مراد نبوت ہے مافعلته امری کے لفظ بھی یہ بتاتے ہیں کہ آپ نبی

۳- حضرت خضر علیہ السلام کو علم باطن حاصل تھا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ السلام سے فرمایا۔ ایک علم مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسا عطا فرمایا ہے جو آپ نہیں جانتے اور ایک علم آپ کو ایسا عطا فرمایا ہیں نہیں جانتا۔ مفسرین و محدثین فرماتے ہیں۔ جو علم حضرت خضر علیہ السلام کے اپنے خاص فرمایا وہ علمِ باطن و شف ہے اور اہلِ کمال کے لیے یہ باعثِ فضل ہے کیونکہ علمِ باطن کی وجہ سے جو افعال صادر ہوں گے وہ حکمت سے گے اگرچہ بظاہر خلاف معلوم ہوں ۵- اکثر علماء، مشائخ و صوفیاء و اہلِ عرفان اس پر متفق ہیں کہ حضرت خضر سلام زندہ ہیں اور یہ ممکن ہے کہ اللہ عزوجل اپنے کسی بندے کو طویل عمر عطا فرمائے —— حضرت امام بخاری، مبارک، ابن الجوزی، ابن المنادی اور علماء کا ایک طائفہ حیاتِ خضر علیہ السلام کا قائل نہیں ہے اور حیاتِ خضر کا ضروریاتِ دین سے بھی نہیں ہے ۶- قرآنِ حکیم میں یہ واقعہ سورہ کہف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۷- بعض جاہل کہا کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰ کو حضرت خضر علیہم السلام سے علم حاصل کرنے کا حکم ہوا حالانکہ وہ ولی ہیں۔ میاں! کا مرتبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ جو علم ولی کے پاس ہوتا ہے وہ نبی کے پاس بھی نہیں ہوتا" (معاذ اللہ) —— ایسا کفر جلی ہے۔ ولی تو نبی پر ایمان لانے اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے سے مرتبہ ولایت کو پاتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ نبی سے بڑھ جائے۔ اس کے علاوہ حق یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی نبی تھے۔ چنانچہ علامہ بدر الدین عینی علیہ الرحمۃ لکھا ہے۔

صحیح انه نبی و جزم به جماعة (عینی جلد ا ص ۲۴۷)	صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر نبی ہیں اور علماء کی ایک جماعت نے اس پر جزم کیا ہے۔

۸- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سائل کے جواب میں فرمایا۔ لا یعنی مجھ سے زیادہ علم کسی کو نہیں ہے۔ آپ کا یہ ب بالکل حق و صواب تھا کیونکہ نبی اپنی امت کے تمام افراد سے قطعاً وحتماً افضل و اعلم ہوتا ہے لیکن آپ کے ان لفظوں تعالیٰ نے مواخذہ فرمایا یعنی آپ کی شان اعلیٰ و ارفع کے زیادہ مناسب یہ تھا کہ آپ اللہ اعلم سے جواب دیتے۔

۹- فجعل اللہ الحوت .... الخ مچھلی کو نشانی اس طرح بنایا گیا کہ آپ کو ہدایت کی گئی کہ ایک مچھلی اپنے تھیلے

یں رکھ لیجیے ۔ جس جگہ وہ گم ہو جائے وہی ملاقاتِ خضر علیہ السلام کا مقام ہے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قتادہ سے مراد حضرت یوشع
ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدمت گار تھے اور آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مسائل حدیث

کسی مسئلہ میں طلبِ حق کے لیے بحث کرنا جائز ہے جیسے حضرت ابن عباس اور حر ابن قیس بحث ہوئی ۲- بوقتِ اختلاف اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیے ۳- اہلِ علم کو مزید حاصل کرنی چاہیئے ۴- سفر کی حالت میں ناشتہ وغیرہ ساتھ لے جانا جائز ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرمایا تو ناشتہ وغیرہ ساتھ لے لیا تھا ۵- استاد کو شاگرد سے خدمت لینا جائز ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت بن نون سے خدمت لیتے تھے ۔ (واللہ اعلم)

بَابُ قَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بیان میں کہ

اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ

اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما۔

۴۷- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَمَّنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے گلے سے لگا فرمایا- الٰہی اس کو کتاب (قرآن) کی سمجھ عطا فر

فوائد و مسائل

امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو فضائلِ صحابہ میں اور طہارت میں بھی ذکر کیا مسلم نے فضائلِ ابن عباس میں، ترمذی نے مناقب میں اور امام نسائی اور ابن ماجہ نے میں ذکر کیا ہے۔ ۲- کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے کیونکہ جنسِ مطلق کامل پر محمول ہوتی ہے۔ یا الکتاب پر الف ہے۔ ویسے عرفِ شرع میں کتاب سے مراد قرآن ہی لیا جاتا ہے ۳- حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ دعائیہ لفظوں سے مروی ہیں علمہ الحکمہ ابن ماجہ علمہ الحکمہ و تاویل الکتاب ترمذی اللھم فقہہ کتاب سے مراد قرآنِ حکیم ہے اور حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہے۔ چنانچہ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ قرآن اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولوں کی تشریح و توضیح ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ ہر دعا مقبول ہے۔ علامہ کرمانی کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابن عباس کے لیے جو دعا فرمائی اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس سید المفسرین ہیں۔ حبر الامۃ، بحر العلم اور ترجمان القرآن ہیں۔ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا تشریف لے گئے تو حضرت ابن عباس نے ایک لوٹا پانی لیے رکھ دیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کس نے رکھا۔ لوگوں نے عرض کی ابن عباس نے۔ اس پر حضور علیہ ان کو گلے سے لگایا اور مذکورہ بالا دعا دی ۴- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معانقہ کرنا جائز ہے۔
علامہ عینی نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو منصور ماتریدی اس جواز کے قائل ہیں
مکروہ ہے جو علی وجہ الشہوۃ ہو (عینی جلد اول صـ۳۵۶)

بَابُ مَتٰی یَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِیْرِ

باب اس امر کے بیان میں کہ بچہ کا حدیث سننا کب معتبر ہے

اس باب میں امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حدیث کے تحمل (سُننے وغیرہ) میں بالغ ہونا شرط نہیں ہے بلکہ بچہ اس قابل ہو جائے کہ بات سمجھ لے تو اس کی کہی ہوئی حدیث معتبر ہو گئی ۔ یحییٰ بن معین کا مسلک یہ ہے حدیث کے لیے کم از کم پندرہ برس کی عمر ہونا ضروری ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے احد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شریک نہیں کیا ۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں حضرت براء وغیرہ کو نہیں کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں ۔ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا کہ غزوۂ احد میں پندرہ برس سے کم عمر بچوں یں کرنا تو اس امر پر مبنی تھا کہ یہ حضرات لڑائی کی قوت اور تجربہ نہیں رکھتے تھے اور حدیث کے تحمل کے لیے ضرورت نہیں ۔ اس کے علاوہ متعدد حدیثیں ایسی ہیں جو بحالتِ بچپن صحابہ نے سُنیں اور بالغ ہو کر ان کو بیان وہ روایتیں مقبول ہوئیں ۔ امام اوزاعی نے فرمایا کہ نابالغ جب کہ بات سمجھے اور اس کو یاد رکھنے کی صلاحیت اس کی سُنی ہوئی حدیث اس لیے بھی معتبر ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو نماز پڑھنے کا حکم دو ۔ نیز تحمل حدیث کے باب میں فہم وضبط اس لیے بھی کافی ہے کہ اگر آدمی ۵۰ برس کا بھی فہم وضبط نہ رکھے تو اس کی حدیث نامقبول ہے ۔

— عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلْتُ عَلٰی حِمَارٍ اَتَانٍ وَّ اَنَا یَوْمَئِذٍ قَدْ تُ الْاِحْتِلَامَ وَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ سَلَّمَ یُصَلِّیْ بِمِنًی اِلٰی غَیْرِ جِدَارٍ تُ بَیْنَ یَدَیْ بَعْضِ الصَّفِّ وَ تُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَ دَخَلْتُ الصَّفَّ کَرْ ذٰلِکَ عَلَیَّ اَحَدٌ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا ۔ میں بلوغ کے قریب تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں بغیر آڑ کے نماز پڑھ رہے تھے ۔ میں بعض صفوں کے سامنے سے گزرا اور گدھی کو چھوڑ دیا وہ چرنے لگی اور میں صف میں شریک ہو گیا تو میرے اس فعل پر کسی نے اعتراض نہ کیا ۔

مسائل امام نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا اور مسلم و ترمذی و ابن ماجہ نے بھی کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا ۔ ۲۔ حمار اتان مادہ خر کو کہتے ہیں ۔ ناھزتُ کے معنیٰ قاربت کے ہیں مطلب وقت میں بالغ ہونے کے قریب تھا ۔ منیٰ ، مکہ سے ۴ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جہاں مناسکِ حج تے ہیں اور قربانی ادا کی جاتی ہے ۳۔ اس حدیث کو ذکر کرکے امام نے یہ بتایا کہ تحملِ حدیث کے لیے بالغ ہونا ہے ۔ حضرت ابن عباس اس وقت بالغ نہ تھے مگر بایں ہمہ ان کی بیان کی ہوئی حدیث تسلیم کی گئی ۔ فقہا نے ت برس کی عمر میں فہم وضبط کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ الی غیر جدار یعنی حضور علیہ السلام بغیر سُترہ کے نماز تھے ۔ جس سے واضح ہوا کہ نمازی کے آگے سے اگر آدمی جانور یا کوئی چیز گزر جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی ۔

حضرت ابن عباس صف کے آگے سے گزرے۔ ظاہر ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا گناہ ہے مگر گزرنے کا معـ کہ گزرنے والے کے اعضا نمازی کے محاذی بن جائیں۔ اور جب کہ ابن عباس سواری پر تھے تو ایسا نہ ہوا کہ صف میں شامل ہونے کے لیے آگے سے گزرنا ضروری ہوا ہوگا۔ اس کے بعد امام نے مزید ثبوت کے لیے کے لیے بلوغ شرط نہیں صرف فہم وضبط کافی ہے۔ یہ اثر ذکر کیا ہے۔

٧٦ - عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَجَّةً مَجَّهَا فِيْ وَجْهِيْ وَاَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِيْنَ مِنْ دَلْوٍ (بخاری)

محمود ابن ربیع بن سراقہ انصاری کہتے ہیں۔ اس امر کا شعور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ڈول سے پانی لے کر مجھ پر کلی فرمائی۔ میں پانچ سال کا تھا۔

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام نے طہارت میں بھی ذکر کیا۔ نسائی وابن ماجہ نے بھی اس حدیث کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سماع صغیر صحیح ومعتبر ہے ۲- حضور صلی اللہ علیہ پہنچانے کے لیے تحنیک فرمایا کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا کلی فرمانا برکت کے لیے تھا۔ جس سے اتنی بات ہے کہ بزرگانِ دین کے پس خوردہ میں برکت ہوتی ہے اور تحنیک سنت ہے۔

بَابُ الْخُرُوْجِ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ

باب علم کے طلب کرنے کے سفر کرنا

یعنی علم دین کے حصول کے لیے سفر کرنا خواہ بری ہو یا بحری۔ مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فر علم دین کے حاصل کرنے کے لیے سفر کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ اِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ فِيْ حَدِيْثٍ وَاحِدٍ (بخاری)

اور جابر بن عبداللہ نے حضرت انیس سے ایک حدیث حاصل کرنے کے لیے ایک مسافت کا سفر کیا۔

٧٧ - امام نے اس کے بعد ٧٣ حدیث ذکر کی ہے جس میں حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ مذکـ تفہیم کے گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے ملاحظہ ہو۔ اسی لیے ہم نے یہاں درج نہیں کی۔ امام نے حدیث یہ بتایا ہے کہ دیکھو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے علم حاصل کرنے کے لیے ایک طویل سفر اختیار فرمایا۔

بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

باب علم حاصل کرنا اور دوسروں کو سکھانے کی فضیلت

فوائد و مسائل واضح ہو کہ احادیث نبویہ میں جب علم کا لفظ بلا کسی اضافت وتشریح کے آ مراد علم دین ہوتا ہے یعنی وہ دین جس کے اصول اور کچھ فروع قرآن پاک نے اس کے اصولوں کی تشریح وتوضیح حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے فرمائی۔ جس

ے جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات میں کیا ہے۔ خالق کی طرف سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی یں اور اس دنیا میں اسے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے اور اپنے عقائد و اعمال کی گاڑی کو کن لائنوں پر چلانا چاہیئے۔

ی طرح جب عالم کا لفظ احادیث میں بلا کسی تخصیص و تشریح کے آتا ہے تو اس سے مراد وہ افراد ہوتے ہیں جو علمِ دین ے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری حد تک اس پر عمل کرتے ہوں۔ ورنہ وہ لوگ جو دین کا علم تو رکھتے ہیں مگر خود مل نہیں کرتے یا جنہوں نے دین کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے ان کے لیے تو احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔

ین کی تبلیغ کی اہمیت

پھر اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں علمِ دین حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور علم و علماء کے عظیم فضائل ارشاد فرمائے ہیں وہاں اس سے کہیں زیادہ دین کی تبلیغ و اشاعت پر زور دیا ہے اور مبلغینِ دینِ اسلام کی عظمت و رفعت کے خطبے اپنی زبانِ فیض ترجمان ے ارشاد فرمائے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا:-

۱۔ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي ى أَدْنَاكُمْ (ترمذی)	عالمِ دین کی برتری اور فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری برتری تم میں سے کسی ادنیٰ پر
إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ وَأَهْلَ السَّمٰوٰتِ الْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَ تَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ خَيْرَ (ترمذی) (عینی ج ۱)	اللہ عز وجل رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے ساکنانِ زمین و آسمان یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں تک دعائے خیر کرتی ہیں اس شخص کے لیے جو دین کی تعلیم دیتا ہے۔

اس حدیث میں عالم سے مراد وہ شخصیت ہے جو اپنے علم کو چھپاتے نہیں بلکہ مخلوقِ خدا تک پہنچاتے ہیں اور عابد ے مراد وہ لوگ ہیں جو فرائض و واجبات کے علاوہ عباداتِ نافلہ میں اپنے لیل و نہار بسر کرتے ہیں اور منکرات و معاصی ے علاوہ مشتبہات تک سے بچتے ہیں لیکن اس کے باوجود فرمایا جاتا ہے کہ مبلغِ اسلام کا درجہ اور رتبہ اس عابد سے ر صورت زیادہ ہے تو اس فضلِ عظیم کی بنیاد و علت یہی ہے کہ عابد عبادت میں اپنے لیل و نہار کو صرف کرکے صرف اپنی ت کے لیے سامانِ فلاح و نجات مہیا کرتا ہے مگر مبلغِ اسلام اپنے علم کو پھیلا کر سینکڑوں کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔ اس کے نع علم سے بے علموں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دین کی تبلیغ و اشاعت کرکے معاشرہ میں پھیلی ہوئی تاریکی چھانٹتا ہے۔ غرضکہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا جو اعمال انفرادی تزکیہ و فلاح کا ذریعہ ہوں وہ اپنی مقدار کے اعتبار ے کتنے ہی کثیر ہوں مگر ان سے بدرجہا بہتر وہ اعمال و افعال ہیں۔ جن سے اجتماعی و عمومی منافع حاصل ہوں۔ امام ری قدس سرہ العزیز نے فضل من علِم وعلّم کا عنوان باندھ کر تبلیغ دین کی اہمیت اور اس کی افادیت کی ف توجہ دلائی ہے۔

۔ عَنْ أَبِي مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ هِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ	حضرت ابی موسیٰ اشعری سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت اور علم کو دے

بِهٖ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَاَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً اُخْرٰى اِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَآءً وَّلَا تُنْبِتُ كَلَاً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي الدِّيْنِ وَنَفَعَهٗ بِمَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاْسًا وَّلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ

(بخاری)

کر مجھے مبعوث کیا۔ اس کی مثال زور کے مینہ کی جو زمین پر برسا۔ اب زمین میں بعض زمین عمدہ نے پانی چوس لیا۔ اس نے گھاس اور سبزی خوب بعض سخت تھی (پتھریلی) اس نے پانی کو روک لیا تعالیٰ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا تو لوگوں نے پانی پیا اور پلایا اور کھیتی کی اور بعض ایسی زمین پر برسا جو صاف چٹیل تھی نہ تو اس نے پانی روکا نے گھاس اگائی۔ پس یہی مثال ہے اس شخص کی دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے ہے اس سے اس کو فائدہ ہوا۔ اس نے خود سیکھ کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے اس اٹھایا ہی نہیں اور اس ہدایت کو قبول نہیں کیا ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے صرف ایک بار اسی باب میں ذکر کیا اور مسلم نے فضائل النبی میں اور نسائی میں ذکر کیا ہے۔ علم سے مراد یہاں ادلہ شرعیہ ہیں۔ غیث بارش کو کہتے ہیں۔ نقیہ کے معنی صاف عمدہ۔ اجادب، جدیب، جدب قحط کو کہتے ہیں۔ جس زمین پر بارش نہ ہو اس کو ارض جدبہ کہتے ہیں۔ یہاں اس ایسی سخت زمین ہے جو بارش کے پانی کو قبول نہ کرے (پتھریلی زمین) قیعان۔ قاع کی جمع۔ وہ زمین جو ایسی چکنی اس پر ٹھہر نہ سکے بہ جائے۔ قرآن پاک میں قاع کے لفظ کے ساتھ صفصف کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہموار زمین

اس حدیث میں دینِ اسلام کو زوردار بارش سے تشبیہہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ جیسے بارش سے مُردہ زمین ہے اسی طرح دین سے مُردہ دل زندگی پاتے ہیں۔ پھر زمین کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ایک زمین وہ جس پر بارش ہو تو وہ کے اثر کو قبول کرتی ہے، خود سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور دوسروں کو اپنی سبزی و میوہ جات و اناج سے فائدہ یہ مثال ہے اس شخص کی جو دینِ اسلام کا علم حاصل کرتا ہے خود بھی اس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی دیتا ہے۔ دوسری قسم زمین کی وہ ہے جو اجادب ہے۔ سخت زمین کا یہ حال ہے کہ خود پانی کے اثر کو قبول کرکے شاداب نہیں ہوتی مگر اس کے جمع کئے ہوئے پانی سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مثال ہے اس شخص دین کا علم سیکھا۔ خود تو اس پر پورا پورا عمل نہیں کیا مگر دوسروں تک پہنچایا اور اس کی تعلیم دی۔ تیسری قسم قیعان ہے جس پر نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ سبزہ وغیرہ اگتا ہے۔ گویا اس پر نسیم سحری کے جھونکے آتے ہیں ہے مگر بہہ جاتا ہے۔ اس زمین میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہوتی جو پانی کو روکے رکھے تاکہ دوسرے ہی اس

ندہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے دین کے سیکھنے اور سکھانے کی طرف توجہ ہی نہ دی اور آفتاب ایت و مہتاب نبوت سے فیض لینے کی کوشش ہی نہ کی۔

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُوْرِ الْجَهْلِ

باب علم کے اٹھنے اور جہل کے پھیلنے کے بیان میں

یہاں علم سے مراد علم دین ہے کہ آخر زمانہ میں دینی علوم سے عام بے رغبتی ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہل و جہالت کا دور دورہ ہو جائے گا۔

قَالَ رَبِيعَةُ لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ اَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهٗ

حضرت ربیعہ نے فرمایا جس کے پاس تھوڑا سا بھی علم ہو تو اس کو ضائع نہ کرے۔

یعنی جس کے پاس قرآن پاک و حدیث شریف کا تھوڑا علم ہو تو وہ بھی اس کے تعلیم و تعلم میں اپنے نفس کو مشغول رکھے اور بیکار نہ بیٹھا رہے۔ حضرت ربیعہ بن ابی عبد الرحمن مدنی تابعی حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کے استاد ہیں انہوں نے اپنے اس ارشاد میں علم دین کی تبلیغ و اشاعت پر زور دیا ہے۔

۷۹۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا (بخاری)

۸۰۔ يَقُوْلُ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا وَتَكْثُرَ النِّسَآءُ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ حَتّٰى يَكُوْنَ الْخَمْسِيْنَ امْرَاَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اٹھ جائیگا اور جہل اس کی جگہ پائیگا۔ لوگ شراب پئیں گے اور زنا عام ہو جائیگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم کم ہو جائے گا۔ جہل اور زنا کی کثرت ہو جائے گی۔ عورتیں زیادہ اور مرد کم ہو جائیں گے حتیٰ کہ پچاس عورتوں کا نگہبان (قیم) ایک مرد ہوگا۔

(بخاری)

۱۔ حدیث ۷۹ کو امام مسلم نے قدر میں اور امام نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا اور حدیث ۸۰ کو مسلم نے قدر میں ترمذی نے فتن میں۔ نسائی نے علم میں اور ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے ۲۔ ان دونوں حدیثوں میں قرب قیامت کی چند نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں ۳۔ علم کے اٹھ جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علماء کے سینہ سے علم سلب کر لیا جائیگا بلکہ اس کی وضاحت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی کہ قرب قیامت میں علمائے دین اٹھا لیے جائیں گے اور ان کے ساتھ علم دین بھی اٹھ جائے گا اور پھر جب دین کے عالم نہ رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو اپنا مفتی بنالیں گے۔ ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ جہالت کا دور دورہ ہوگا۔ شراب عقل میں فتور ڈالے گی۔ زنا نسب میں خلل انداز ہوگا۔ قتلوں کی کثرت مال و

نفس میں فساد پیدا کرے گی۔ عورتیں مردوں سے زیادہ ہو جائیں گی۔ بعض روایات میں یکثر العلم کے لفظ بھی آ
یعنی قرب قیامت میں علم و علماء کی کثرت ہو جائے گی۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علماء کی تو کثرت
ہوگی مگر تبلیغ کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائیگا اور دین میں اسقدر زیادہ فتنے پیدا ہو جائیں گے کہ مبلغین اسلام کی کثیر
اس پر قابو نہ پا سکے گی۔ چنانچہ فی زمانہ یہی حالت ہے یا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ علماء کی تو کثرت ہوگی۔ علم کا چرچا
ہوگا۔ دینی درسگاہوں کی بہتات ہوگی۔ مگر علماء میں خلوص و للّٰہیت کی کمی آجائے گی اور اس طرح گمراہی و بے دی
کے سیلاب آتے چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

باب فضلِ علم کے بیان میں

یہاں فضل بمعنی فضیلت بھی ہو سکتا ہے اور مناسبت یہ ہوگی کہ گزشتہ باب میں عالم کی فضیلت کا بیا
اور اب علم کی فضیلت کا بیان ہے کہ علم دین انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث ہے یا فضل بمعنی ما بقی کے ہیں جیسے
ہیں فضل الوضوء، وضو کا بچا ہوا پانی۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علم، تعلیم و تعلم سے کم نہیں ہوتا۔ جیسے کہ حضو
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچا ہوا دودھ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا مگر حضور علیہ السلام کے علم میں کمی
یعنی دیگر اشیاء کا یہ حال ہے کہ اس میں سے اگر کسی کو کچھ دے دیا جائے تو وہ کم ہو جاتی ہیں۔ مگر علم ایسی دولت
جسے نہ آگ جلا سکتی ہے اور نہ چور چرا سکتا ہے اور نہ خرچ کرنے سے اس میں کمی آتی ہے۔

۸۱ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا نَائِمٌ اُتِيْتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتّٰى اِنِّىْ لَاَرَى الرِّىَّ يَخْرُجُ فِىْ اَظْفَارِىْ ثُمَّ اَعْطَيْتُ فَضْلِىْ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ قَالُوْا فَمَا اَوَّلْتَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْعِلْمُ

(بخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے حضو
علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ میں سو رہا تھا کہ میر
دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا۔ میں نے پیا تو میں نے دیکھ
کہ تازگی میرے ناخنوں سے بہہ رہی ہے۔ پھر میں
اپنا بچا ہوا (دودھ) حضرت عمر کو دے دیا۔ صحابہ
عرض کی اس کی تعبیر کیا ہوئی۔ فرمایا۔ علم (دودھ
علم مراد ہے)

فوائد و مسائل امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التعبیر میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم نے فضائل میں
نے رؤیا میں اور امام نسائی نے مناقب عمر میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ دودھ سے حضور اکرم صلی
وسلم نے علم مراد لیا۔ جس سے سیدنا فاروق اعظم کی فضیلت ثابت ہوئی کہ وہ علمِ نبوت کے وارث ہیں۔ ان کا علم
اور فطرت [illegible] ہے ۳۔ علامہ عینی نے فرمایا چونکہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں اس لیے اس کو
نہیں بلکہ واقعہ [illegible] سمجھنا چاہیے ۴۔ علم کو دودھ سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ جیسے مربّی بدن ہے اور اعلیٰ درجہ کا
سی طرح علم [illegible] ہے یا جیسے بچہ کی حیات دودھ سے ہوتی ہے۔ ایسے قلوب کی حیات کا مدار علم دین پر ہے۔

ـث سے علم کی فضیلت نکلتی ہے کہ علمِ دین حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا فضلہ ہے۔

بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ

باب اس امر کے بیان میں

ـى ظَهْرِ الدَّآبَّةِ اَوْ غَيْرِهَا

۸۳- عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ
رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
ـفَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ
ـئَلُوْنَهٗ فَجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ
ـشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ قَالَ
ـبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ
اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ
ارْمِ وَلَا حَرَجَ قَالَ فَمَا سُئِلَ النَّبِيُّ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ
اُخِّرَ اِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ

(بخاری)

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر فتویٰ دینا جائز ہے

حضرت عبداللہ بن عمر ابن العاص سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں ٹھہرے لوگوں کے لیے —— لوگ آپ سے سوال کرتے تھے۔ ایک شخص آیا۔ اس نے عرض کی میں نے بھول کر قربانی سے پہلے سر منڈا لیا ہے۔ آپ نے فرمایا قربانی کر کچھ حرج نہیں۔ ایک اور شخص آیا کہنے لگا مجھے خیال نہیں رہا۔ میں نے کنکریاں مارنے قبل قربانی کر لی۔ آپ نے فرمایا۔ کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امورِ حج کے متعلق پہلے یا پیچھے کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔

ـد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب العلم اور مندر میں بھی ذکر کیا اور مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی و ابن ماجہ نے کتاب الحج میں ذکر فرمایا —— ۲- عنوانِ باب سے یہ حدیث مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر ہونا مذکور نہیں ہے لیکن امام کی عادت یہ ہے کہ ایک حدیث ذکر کرتے ـر اس کے دوسرے طریق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث کو کتاب الحج میں امام نے روایت کیا ہے۔ صاف تصریح ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اونٹنی پر سوار تھے۔ عنوان میں او غیرھا کا لفظ امام نے یہ بتانے ـے لکھا ہے کہ حدیث میں اونٹ پر سوار ہو کر سائل کو جواب دینے کی تخصیص نہیں ہے —— بلکہ یہ بات عام ہے ـنٹ پر سواری کی حالت میں جواب دیا جائے یا کسی اور چیز میں بیٹھ کر ہر طرح جائز ہے۔

الوداع ح کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یہ حج حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی عمر مبارک کا آخری حج تھا اور اس موقع پر حضور علیہ السلام نے ایک لاکھ صحابہ کو قصوی نامی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب فرمایا۔ اس زمانہ میں آواز پہنچانے کے لیے لاؤڈ سپیکر تو تھے نہیں مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اعجاز تھا کہ پورے آواز برابر پہنچ رہی تھی۔ حتیٰ کہ دورانِ خطبہ حضور علیہ السلام نے کسی صحابی سے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ —— حضرت عبداللہ کہتے ہیں "بیٹھ جاؤ" —— کی آواز میں نے اپنے گھر پر سنی اور وہیں حکم نبوی کی تعمیل میں تعظیماً بیٹھ گیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس مضمون کی متعدد حدیثیں خصائص کبریٰ میں ذکر کیں کہ خطبہ مبارکہ کی آواز پردہ کو گھروں میں پہنچ رہی تھی —— منیٰ مکہ سے ۵-۲ میل کے فاصلہ پر ایک قریہ ہے جہاں حاجی قربانی کرتے جمرات کو رمی کرتے ہیں —— ۴- حدیث ہذا سے ذیل کے مسائل معلوم ہوتے ہیں:-

۱- بوقت ضرورت عالم سے سوال کرنا جائز ہے۔ خواہ وہ سوار ہو یا مقیم ہو یا پیدل سفر کر رہا ہو —— ۲- عا کی حالت میں جواب دینا جائز ہے —— ۳- کسی اونچی چیز پر بیٹھ کر وعظ کرنا جائز ہے تاکہ لوگ خطیب کو دیکھ اچھی طرح متوجہ ہو کر سن سکیں —— ۴- اس حدیث سے امام شافعی و احمد، مجاہد، طاؤس اور عطاء نے یہ استدلال اعمال حج میں ترتیب سنت ہے واجب نہیں تو اگر کسی نے ترتیب سے یہ مناسک ادا نہ کیے تو اس پر دم کہتے ہیں لاحرج کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ ایسے شخص پر نہ ترتیب ہے نہ فدیہ اور نہ گناہ کیونکہ سائل کے جواب میں صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کوئی حرج نہیں۔ کفارہ وغیرہ کا حکم نہیں دیا اگر مناسک حج میں ترتیب واجب ہوتی پر کفارہ کا حکم دیا جاتا لاحرج نہ فرمایا جاتا —— حضرت امام اعظم ابو حنیفہ و امام مالک علیہما الرحمۃ فرماتے ہیں حج میں ترتیب واجب ہے اور لاحرج کا مطلب یہ ہے کہ تو نے چونکہ بھول کر ایسا کیا ہے اس لیے تجھ پر گناہ نہیں ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں نَسِیْتُ کا لفظ موجود ہے جس کو امام طحاوی نے باسناد صحیح روایت گویا لاحرج سے کفارہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ گناہ کی نفی ہوتی ہے —— رہا کفارہ تو حضرت ابن عباس سے کہ جس نے حج کے امور سے کسی چیز کو پہلے یا بعد میں ادا کیا تو اس پر دم لازم ہے۔ یہ مسائل تفصیل کے ساتھ کتاب الحج میں آجائیں گے۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ الْفُتْیَا بِاِشَارَۃِ الْیَدِ وَالرَّاسِ

باب اس امر کے بیان میں جو ہاتھ کے اشارہ یا سر کے اشارہ سے سوال کا جواب دے

٨٣- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِیْ حَجَّتِہٖ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِیَ قَالَ فَاَوْمَا بِیَدِہٖ قَالَ وَلَا حَرَجَ وَقَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَاَوْمَا بِیَدِہٖ وَلَا حَرَجَ

(بخاری)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی صلی سے کسی نے حج میں سوال کیا کہ میں نے رمی ذبح کیا تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ نہیں فر نہیں (دوسرے صاحب نے سوال کیا میں پہلے سر منڈایا۔ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا حرج نہیں۔

٨٤- عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یُقْبَضُ الْعِلْمُ وَیَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ وَیَکْثُرُ الْهَرْجُ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے لیا جائے گا۔ جہل پھیل جائے گا اور فتن ہو جائے گی۔ پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ!

ما الهرج فقال هكذا بيده فحرفها
نه يريد القتل (بخاری)

تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا (اسی طرح ہاتھ خم کر کے) گویا اس سے آپ کی مراد قتل تھی۔

ئدو مسائل ھرج کے معنی فتنہ شے کی کثرت اختلاط کے آتے ہیں۔ ھراج جماعت کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا لغتِ حبشہ میں ھرج کے معنی قتل کے ہیں لیکن اصل لغتِ عرب میں ھرج فتنہ کے معنی میں آتا ہے۔ ۲۔ ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ سوال کا جواب اشارہ سے دینا بھی جائز ہے ۳۔ علامہ طحاوی نے لکھا ہے کہ نفی حرج مذہب حنفی کے مخالف نہیں کیونکہ لاحرج کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ تم نے بھول کر ایسا کیا ہے اس تم پہ گناہ نہیں ہے لیکن یہ بات کہ اس فعل سے کفارہ نہیں آتا لاحرج کے جملہ سے اس کی نفی نہیں ہوتی (فافہم)

٨٥۔ عن أسماء قالت أتيت عائشة
وهي تصلي فقلت ما شأن الناس
فأشارت إلى السماء فإذا الناس
قيام فقالت سبحان الله قلت آية
فأشارت برأسها أي نعم فقمت
حتى علاني الغشي فجعلت أصب على
رأسي الماء فحمد الله النبي صلى الله
عليه وسلم وأثنى عليه ثم قال ما
من شيء لم أكن أريته إلا رأيته في
مقامي هذا حتى الجنة والنار فأوحي
إلي أنكم تفتنون في قبوركم مثل أو
قريب لا أدري أي ذلك قالت أسماء
من فتنة المسيح الدجال يقال ما
علمك بهذا الرجل فأما المؤمن أو
الموقن لا أدري أيهما قالت أسماء
فيقول هو محمد رسول الله جاءنا
بالبينات والهدى فأجبناه واتبعناه
محمد ثلاثا فيقال نم صالحا قد
علمنا إن كنت لموقنا به وأما المنافق
المرتاب لا أدري أي ذلك قالت أسماء

حضرت اسما کہتی ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا لوگوں کا کیا حال ہے (یعنی لوگ گھبرائے ہوئے کھڑے ہیں) حضرت عائشہ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا (یعنی اشارہ سے بتایا کہ سورج گہن ہوا ہے) پس لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ سبحان اللہ! میں نے کہا کوئی نشانی ہے؟ (یعنی کوئی قیامت یا عذاب کی نشانی ہے؟) حضرت عائشہ نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں! تو میں بھی نماز کے لیے کھڑی ہوئی یہاں تک کہ مجھ کو غش آنے لگا۔ میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ پھر نماز کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا ہر وہ شے جو مجھے نہیں دکھلائی گئی تھی میں نے اس کو اپنے اس مقام سے دیکھ لیا۔ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے مثل فتنہ مسیح ودجال کے ______ نہیں معلوم اسما نے مثل کا لفظ کہا یا قریب کا۔ قبر میں میت سے پوچھا جائیگا کہ یہ جو شخص کریم ہیں۔ ان کی نسبت تیرا کیا اعتقاد ہے تو مومن یا موقن (نہیں جانتے کہ حضرت اسما نے مومن کا لفظ کہا یا موقن کا) جواب دے گا وہ محمد ہیں وہ رسول اللہ ہیں۔ ہمارے پاس معجزات یا اور ہدایت لے کر آئے۔ ہم نے قبول کیا اور ان کا اتباع

فَيَقُوْلُ لَا أَدْرِيْ سَمِعْتُ النَّاسَ
يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهٗ

(بخاری)

کیا وہ محمد ہیں تین بار ایسا ہی کہے گا۔ پس قبر
ے کہا جائیگا کہ سو جا آرام سے۔ ہم پہلے ہی
مجھتے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے لیکن منافق یا مرتاب
(نہیں معلوم اسماء نے مرتاب کا لفظ کہا یا منافق کا) وہ فرشتوں کے سوال کے جواب میں کہے گا میں نہیں
کہ جو کہتے سنا میں نے بھی وہی کیا۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے ابواب ذیل میں ذکر کیا ہے۔ طہارت، الاعتصام، خسوف
جمعہ، کتاب السہو، خطبہ ۲۔ باب سے مناسبت یہی ہے کہ حضرت اسماء کے سوال
عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سر کے اشارہ سے جواب دیا ۳۔ علائی الغشی اہل طب کے نزدیک
حساسہ کا ضعفِ قلب کی وجہ سے معطل ہو جانے کو غشی کہتے ہیں۔ لغت میں تغشی کے معنے ڈھانپنے کے
اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقصود یہ بتانا ہے گرمی میں لمبے قیام کی وجہ سے مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ تفتنون
امتحان لیے جاتے کے ہیں۔ جوہری نے کہا الفتنۃ الامتحان۔ سونے کو جب پگھلا کر پرکھتے ہیں تو
الذہب بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جیسے فتنۂ دجال کے ذریعے آزمائے جاؤ گے اور تمہارے ایمان وا
علی الحق کا امتحان ہوگا۔ اسی طرح قبر میں بھی امتحان لیا جائے گا۔
دجال، فعّال کے وزن پر دجل سے ہے۔ اس کے معنیٰ حق و باطل کے ملانے کے ہیں۔ اس کو مسیح اس لیے
ہیں کہ دجال روئے زمین کا چالیس راتوں میں چکر لگائے گا۔ یا اس لیے کہ اس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہوگی
ص ۴۸۶) دجال کا نکلنا اور دنیا میں فساد ڈالنا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کا امتحان ہونا یہ سب حق ہے۔
میں حضور علیہ السلام نے دجال کے متعلق مندرجہ ذیل امور بیان فرمائے ہیں:۔

دجال کے متعلق حدیث کی تصریحات

۱۔ حضرت نواس ابن سمعان کہتے ہیں کہ ایک دفعہ
علیہ السلام نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اگر
موجودگی میں نکل آئے تو میں اس کا مقابل تمہاری طرف سے ہوں گا۔ مگر میری عدم موجودگی میں اس کا ظہور
وقت ہر شخص اپنے نفس کی طرف سے اس کا مقابلہ کرے۔ خدا تعالیٰ ہر مسلمان کا مددگار ہے۔
دیکھو! دجال جوان ہوگا۔ اس کے بال گھنگھریالے ہوں گے۔ اس کی آنکھیں ناخونہ ہوگا۔ میں اس
ابن قطن کے ساتھ تشبیہ دیتا ہوں ——— ایک دوسری روایت میں ہے۔ اس کا خروج شام اور عراق کے
ایک راستہ میں ہوگا۔ پس دائیں بائیں فساد کرتا پھرے گا۔ اللہ کے بندو! تم ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا یا
وہ زمین میں کب رہے گا۔ فرمایا چالیس روز تک رہے گا۔ (جس میں) ایک سال کا ایک روز ہوگا۔ ایک ماہ کا
ہوگا۔ ایک ہفتہ کا ایک روز ہوگا۔ باقی ایام اپنے معمول طریقہ پہ ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جو دن
کے برابر ہوگا۔ اس دن ہماری ایک روز کی نماز کافی ہوگی۔ نہیں اس میں اندازہ کرکے پڑھنا۔ ہم نے عرض

زمین میں چلنا پھرنا کس صورت پر ہوگا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ چلنا پھرنا اُس کا بارش کی طرح ہوگا۔ جس کو ہوا اُڑا کر لاتی ہے۔ وہ ایک قوم کے پاس آ کر اپنی عبادت کی طرف بُلائے گا۔ یہ لوگ اس کے قول پر ایمان لائیں گے۔ وہ آسمان سے کہے گا تو وہ پانی برسائے گا۔ زمین اس کے حکم سے سبزہ اُگائے گی۔ اُس وقت اُن کے مویشی خوب موٹے تازے کوکھیں بھرے ہوئے موٹے موٹے تھنوں والے ہو کر آئیں گے۔ پھر وہ ایک دوسری قوم کے پاس آئیگا لیکن وہ اس کی بات اس کے منہ پر مار دیں گے۔ وہ وہاں سے واپس چلا آئیگا۔ لیکن یہ لوگ صبح ہوتے ہی مفلسی کی حالت میں ہو جائیں گے۔ یہاں ایک ویرانہ میں آ کر کہے گا۔ اپنے خزانے نکال زمین اپنے خزانے نکال دے گی۔ یہ خزانے اس کے پیچھے شہد کی مکھیوں کی طرح چلیں گے۔ پھر وہ ایسے شخص کو بلائے گا جو جوانی میں بھرا ہوا ہوگا۔ اس کو تلوار سے مار کر دو ٹکڑے کر دیگا پھر اس کو جلائیگا۔ وہ شخص ہنستا ہوا اس کے پاس آئیگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بہت رونق ہوگی۔

الغرض یہ افعال کرتا پھرے گا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو روانہ فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق جانب کے سپید مناروں پر دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے نازل ہوں گے۔ جس وقت سر جھکائیں گے تو پسینہ کے مانند ان کے سر سے پانی ٹپکے گا اور وہ جب سر اُٹھائیں گے تو موتی اور چاندی کے دانوں کی طرح وہ قطرے گریں گے۔ جس کافر کو اس کی ان کی سانس پہنچے گی وہ کافر مر جائے گا۔ ان کی سانس انتہائے نظر تک جائے گی۔ وہ آ کر دجال کو تلاش کرتے کرتے باب لُد کے قریب گھیر لیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے پھر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک قوم آئے گی جس کو اللہ تعالیٰ نے دجال کے فتنوں سے محفوظ رکھا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اس قوم کے چہروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے سامنے درجاتِ جنت بیان فرمائیں گے۔ وہ اب ایسی حالت میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوگی کہ میں اپنے ایسے بندوں کو نکالتا ہوں۔ جن سے لڑائی کی کسی میں طاقت نہیں۔ لہٰذا تم میرے ان بندوں کو لے کر کوہِ طور پر محفوظ ہو جاؤ۔ حضرت عیسیٰ ہمراہیوں کو لے کر کوہِ طور پر محفوظ ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو باہر نکالے گا وہ ہر مقام پر دوڑ پڑیں گے۔

۲۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ دجال کے ہمراہ اصفہان کے ستر ہزار یہودی ہوں گے ان کا لباس ریشمی چادروں کا ہوگا۔

۳۔ حضرت فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں تمیم داری نے بیان کیا۔ جب ہم جزیرہ میں داخل ہوئے تو ہم کو ایک عورت نظر آئی جس کے جسم پر بال بہت کثرت سے تھے وہ اپنے بالوں کو گھسیٹتی چلی جاتی تھی اور مثل جانوروں کے معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے اس سے کہا تو کون ہے؟ تو اس نے کہا جساسہ ہوں۔ تم اس مکان کی طرف جاؤ۔ جب میں اس مکان میں گیا تو ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے پایا جو اپنے بال گھسیٹ رہا تھا اور آسمان اور زمین کے درمیان کودتا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے کہا۔ میں دجال ہوں۔ عنقریب مجھے نکلنے کی اجازت دی جائے گی۔ میں نکل کر تمام روئے زمین پر چالیس راتوں میں پھر لوں گا۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب تین باتیں ظہور پذیر ہو جائیں گی تو اس

وقت کسی نفس کو اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ نہ ایمان کی حالت میں کسی نفس کی بہتری کرنا اس کے واسطے
وہ تین باتیں یہ ہیں۔ مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا ۔ دابۃ الارض کا ظاہر ہونا ۔ دجال کا خروج

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا سب سے پہلی جو نشانی قیامت کی ہوگی وہ مغرب
آفتاب کا طلوع ہونا ، پھر چاشت کے وقت دابۃ الارض کا نکلنا اور جو علامت پہلے ظاہر ہوتی جائے گی۔ اس کی
دوسری علامات اس کے پیچھے قریب ہی ہوتی چلی جائے گی۔

مندرجہ صدر احادیث کے ملاحظہ کے بعد ہمارے سامنے حسب ذیل امور آتے ہیں :۔

قیامت کی پہلی نشانی آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ پھر دابۃ الارض کا نکلنا۔ پھر دجال کا خروج
ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ شام اور عراق کے درمیان ظاہر ہوگا۔ دجال ایک جوان شخص ہوگا۔ اس کی آنکھ
ہوگا۔ اس کی صورت عبدالعزیٰ بن قطن (یہ شخص بہ زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھا) کی سی ہوگی
پر چالیس روز رہے گا۔ وہ اُلوہیت کا دعوے کریگا۔ ایک قوم اس پر ایمان لاکر اس کے ذریعے دُنیاوی تمتع
گی اور ایک قوم اس سے انکار کرکے دنیاوی خسارہ مول لے گی۔ وہ آسمان سے بارش برسائے گا۔ وہ ویرانہ میں
حکم سے خزانے نکالے گا۔ وہ نہایت تیز رفتار ہوگا۔ اسی اثنا میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ اس
کرتے ہوئے بابِ لُد کے قریب گھیر کر اس کو قتل کر ڈالیں گے۔ پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پناہ لیں گے۔
ماجوج زمین میں پھیل جائے گی اور فتنہ عام کا ظہور ہوگا۔

الغرض ایسے ہی واقعاتِ نادرہ کا تواتر جاری رہے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ یہ ہے حقیقتِ دجال اور اس
کی جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ساری کائنات کا مشاہدہ فرمایا

اس حدیث میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ
فرمایا۔ مَا مِنْ شَیْءٍ جو چیز بھی مجھے نہیں دکھائی
وہ میں نے آج اس جگہ کھڑے کھڑے دیکھ لی۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ یہاں رویت سے یا تو آنکھ سے
ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے اور حضور علیہ السلام نے مشاہدہ فرمالیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ رویت سے
علم مراد ہو یعنی اللہ عزوجل نے :۔

وَحْیٌ بِاطِّلَاعِہٖ وَتَعْرِیْفِہٖ مِنْ اُمُوْرِھِمَا
تَفْصِیْلًا مَا لَمْ تَعْرِفْہُ قَبْلَ ذٰلِکَ
(عینی ج ۱ صفحہ ۴۸۹)

ان تمام امور کی اطلاع بذریعہ وحی تفصیلی طو
آپ کو دے دی جن کو آج سے پہلے حضور علیہ
نہیں جانتے تھے۔

عالم میں کیا ہے جس کی تجھ کو خبر نہیں
ذرہ ہے کونسا تری جس پر نظر نہیں

واضح ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف رکھتے ہوئے جن عجائب وغرائبِ قدرت
ومعائنہ فرماتے تھے صحاح میں اس کے متعلق کثیر حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ جن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب

یں ہم چند احادیث پیش کیے دیتے ہیں۔ حضور سیّد عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّةَ وَ اُرِیْتُ النَّارَ	میں نے جنت کو دیکھا اور دوزخ مجھے دکھائی گئی
لَقَدْ جِیْئَ بِالنَّارِ ثُمَّ جِیْئَ بِالْجَنَّةِ (بخاری ومسلم باب الکسوف)	میرے پاس جنت اور دوزخ لائی گئی (یعنی مجھے دکھائی گئی)

ایک بار سورج گرہن ہوا۔ آپ صحابہ کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور بہت دیر تک قرأت، رکوع اور سجود میں وف رہے۔ صحابہ کرام نے دیکھا کہ آپ نے نماز میں ایک بار ہاتھ کو آگے۔ پھر دیکھا کسی قدر پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد صحابہ کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا:۔

اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا قُوْدًا لَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَکَلْتُمْ مِنْهُ مَا یَتِ الدُّنْیَا۔ (ابوداؤد ص ۲۲۶)	میں نے ابھی جنت کو دیکھا (جنت میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے) چاہا کہ توڑ لوں۔ اگر میں ان کو توڑ لیتا تو تا قیامت تم اس کو کھاتے۔ (بخاری کتاب الاذان، باب رفع الیمہ)

پھر میں نے دوزخ کو دیکھا۔ جس سے زیادہ بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں۔ صحابہ نے عرض کی حضور اس کی وجہ؟

فرمایا، اپنے خاوندوں کی ناشکری کے سبب۔ اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو۔ پھر ایک دفعہ وہ تمہارے کسی فعل زردہ ہو جائے تو وہ کہے گی۔ میں نے کبھی تمہارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا۔

وَرَاَیْتُ فِیْهَا اَخَابَنِیْ دَعْدَعٍ سَارِقَ حَجِیْجَ (ابوداؤد باب القراءۃ فی الصلوۃ الکسوف)	(میں نے دوزخ میں) اس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چرایا کرتا تھا۔

یں نے دوزخ میں اس یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لیے عذاب ہو رہا تھا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا تھا کھانے کو کچھ نہ دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے۔ آخر اسی بھوک سے مر گئی۔

یک اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا۔

قَالَ اِطَّلَعْتُ فِی الْجَنَّةِ	میں جنت میں جا نکلا (بخاری جلد ۲ ص ۹۶۹)

دیکھا کہ یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد ان کی ہے جو دنیا میں غریب تھے اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو اس میں بڑی ورتوں کی پائی (بخاری باب صفۃ الجنۃ)

مبارک کے اخیر سال میں آپ شہدائے احد کے مزارات پر تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آ کر آپ نے ایک یا جس میں یہ بھی فرمایا ——— میں اپنے حوض کوثر کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں میرے ی گئی ہیں (بخاری کتاب الجنائز و باب ما یحذر زہرۃ الدنیا)

س خطبہ میں یہ بھی فرمایا۔ مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے لیکن میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ

اس دُنیا کی دولت میں پڑکر آپس میں رشک وحسد نہ کرنے لگو۔

۷۔ ایک دن آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک ٹیلے پر چڑھے پھر فرمایا:۔

هَلْ تَرَوْنَ مَا أَرَى قَالُوا لَا قَالَ فَإِنِّي لَأَرَى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوتِكُمْ كَوَقْعِ الْمَطَرِ (بخاری جلد ۲ ص۱۰۴۲ و مسلم باب الفتن)	(اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں) وہ تم بھی دیکھ ر ہو؟ لوگوں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا میں تمہارے گھرو درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں۔

۸۔ ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف سے ایک آدمی مارا گیا۔ لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا۔ آپ نے فرمایا:۔

قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ فُلَانًا قَدِ اسْتُشْهِدَ قَالَ كَلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ بِعَبَاءَةٍ قَدْ غَلَّهَا (ترمذی باب ما جاء فی الغلول ص۱۹۱)	ہرگز نہیں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے ک اس نے مال غنیمت میں سے ایک عبا چرائی تھی

۹۔ ایک دفعہ آپ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپ کے کانوں میں ایک آواز آئی تو فرمایا:۔

فَسَمِعَ صَوْتًا فَقَالَ يَهُودُ تُعَذَّبُ فِي قُبُورِهَا (بخاری کتاب الجنائز ص۱۸۴ ج۱)	یہود کو ان کی قبروں میں عذاب دیا جا رہا ہے

علامہ قسطلانی نے طبرانی کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا۔ یہود کو ان کی قبروں

ہو رہا ہے اس کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں۔

۱۰۔ بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے جہنم کو دیکھ کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں —— اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا جو اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے۔

۱۱۔ حضرت ورقہ بن نوفل کے متعلق حضرت ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ حضور! ورقہ جنت میں دوزخ میں۔ انہوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی مگر آپ کے اظہارِ نبوت سے پہلے وفات پا گئے۔ فرمایا:۔

أُرِيتُهُ فِي الْمَنَامِ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيضٌ وَلَوْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَكَانَ عَلَيْهِ لِبَاسٌ غَيْرُ ذَلِكَ (ترمذی و احمد، مشکوٰۃ، کتاب الرؤیا)	مجھے ان کو خواب میں دکھایا گیا کہ وہ سپید کپڑے ہیں۔ اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے یہ لباس نہ ہوتا۔

۱۲۔ رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔ سامنے ایک محل نظر آیا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی وضو ک میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے۔ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمر کا مسکن ہے۔ میں نے چاہا کہ اندر جاؤں غیرت یاد آئی تو الٹا پھر گیا۔

حضرت عمر سن کر رو پڑے۔ عرض کی حضور! میں آپ سے غیرت کرتا۔ (صحیح بخاری جلد ۱ ص۴۲۵ و مسلم ترمذی ک (مناقب عمر)

۱۳۔ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال تم کونسا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں

توں کی چاپ کی آواز سنی۔ عرض کی حضور علیہ السلام ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب نیا وضو کرتا ہوں تو دو رکعت نماز ڑھ لیتا ہوں (بخاری مناقب بلال، ترمذی مناقب عمر)

۱۴۔ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ دیا جس میں ابتدائے آفرینش سے جنت و دوزخ تک کے احوال بیان فرمادیے۔ عمر ابن الخطاب ے یہ الفاظ ہیں۔

خْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ قِيَامَةِ (مشکوٰۃ باب المعجزات)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان تمام واقعات کی اطلاع دی جو قیامت تک ہونے والے تھے۔

۱۵۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے زمین کے تمام کناروں کو میرے سامنے کردیا

یت مشارق الارض و مغاربها	میں نے اس کے مغرب و مشرق کو دیکھ لیا

۱۶۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ خدا نے میرے لیے دنیا کو پیش فرمادیا تو میں دنیا میں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے س کو اس طرح دیکھ رہا ہوں۔

تما انظر الی کفی هذه	جیسے اپنے اس ہاتھ کو (مواہب لدنیہ، زرقانی)

۔ آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا، مجھ سے جو چاہو سوال کرو۔ بخدا جب تک میں اس منبر پر ہوں۔ تمہارے ہر وال کا جواب دوں گا۔ ایک شخص کھڑا ہوا۔ عرض کی حضور! میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟

ال النار ۔ فرمایا جہنم۔ پھر عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے عرض کی۔ میرا باپ کون ہے۔ حضور سلام نے فرمایا۔ حذافہ

ثم اکثر ان یقول سلونی سلونی (بخاری، کتاب الاعتصام)	پھر آپ نے متعدد بار فرمایا۔ لوگو! پوچھو، پوچھو

۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ جس طرح آدم (علیہ السلام) پر ان کی اولاد اپنی اپنی صورتوں میں پیش کی گئی تھی۔ اسی طرح پر میری اُمت لوگوں کی پیدائش سے پہلے پیش کی گئی مجھے بتادیا گیا ہے کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا اور کون نہیں۔ علیہ السلام کے ان جملوں کی اطلاع منافقین کو پہنچی وہ کہنے لگے۔ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اب یہ گمان کرتے ہیں کہ ں مومن وکافر کی خبر ہے۔ حالانکہ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم کو نہیں جانتے۔ جب منافقین کی یہ باتیں آپ تک پہنچیں پ منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

حال اقوام طعنوا فی علمی لا تسئلونی شیء فیما بینکم و بین الساعة نبأتکم به (خازن، پارہ ۴)	اس قوم کا کیا حال ہے جو ہمارے علم میں طعن کرتے ہیں (حالانکہ) اب سے لے کر قیامت تک جس چیز کے متعلق پوچھو گے ہم اس کی تم کو خبر دیں گے

حتی کہ ایک بار جب آپ مصروف نماز تھے۔ جمالِ الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ میں نے دیکھا کہ جمالِ الٰہی بے پردہ ے سامنے ہے۔ خطاب ہوا تم جانتے ہو فرشتگان کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں۔ عرض کی، نہیں یارب العالمین۔

پھر خدا نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا۔ جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی۔

فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
(مشکوٰۃ شریف باب المساجد)

اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں میری نگاہوں کے سامنے آگئیں

اب خطاب ہوا۔ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کی ان اعمال کی نسبت جو گنا کو مٹا دیتے ہیں۔ خطاب ہوا وہ کیا ہیں؟ عرض کی نماز باجماعت کی شرکت کے لیے قدم اٹھانا۔ نماز کے بعد مسجد میں ٹھ جانا اور ناگواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا۔ جو ایسا کرے گا اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہوں گے۔ وہ گنا سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے اس دن جب اس کی ماں نے اس کو جنا۔

پھر سوال ہوا یا محمد! اور درجات کیا ہیں؟ عرض کی کھانا کھلانا جب دنیا سوتی ہو تو اٹھ کر نماز پڑھنا (مسند احم بن حنبل ج ۵ ص ۳۴۳) ——— الغرض اس نوع کے کئی مشاہدات اور مسموعات ہیں جو حضور سید عالم صل علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً پیش آیا کرتے تھے اور یہ بات بھی حضور علیہ السلام کے خصائص سے تھی۔

قبر میں حضور علیہ السلام کے متعلق سوال

ما علمك یہ خطاب مقبور کو ہوگا اور هذا الرجل سے حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس ہے اور سوال کرنے والے ہیں جو قبر میں آتے ہیں جن کو منکر و نکیر کہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ هذا اسم اشارہ ہے جو مشار الیہ حسی کو چاہتا لہٰذا اس چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو محسوس بھی ہو اور نظر بھی آئے تو کیا قبر میں خود بنفس نفیس حضور علیہ السلام لاتے ہیں یا آپ کی تصویر پیش کی جاتی ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نہ تو حضور علیہ السلام قبر میں آتے ہیں اور نہ آپ کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے مقامِ ارفع و جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ حجاب اور پردہ تو مقبور کے لیے ہوتا ہے بحکم خداوندی مقبور کے لیے وہ حجاب اٹھ جاتے ہیں وہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے ہیں اور فرشتہ آپ کی ذاتِ اقدس کی طرف اشارہ کرکے پوچھتے ہیں کہ متعلق تیرا کیا اعتقاد ہے؟ تو مومن اس سوال کا جواب دیتے ہیں حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت کا اقرار کر کافر اس امتحان میں فیل ہو جائے گا اور وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس پر مومن سے کہا جائیگا کہ اب امن و کے ساتھ سو جا ——— علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ التثبیا باظہار ما کان خف میں لکھا ہے کہ قبر میں حضور علیہ السلام کے متعلق سوال ہونا یہ آپ کی خصوصیات سے ہے۔ کسی اور نبی کو یہ مرتبہ حاص ہے کہ اس کی نبوت و رسالت کے متعلق قبر میں بھی سوال ہوگا۔ اس سوال سے مقصود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے و مقام کی برتری اور آپ کے عزّ و شرف کا اظہار ہے۔

کیا قبر میں کافر سے بھی سوال ہوگا؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ قبر میں صرف مومن اور منافق سے ہوگا جو دنیا میں اسلام کے مدعی تھے اور یہاں مسلمانوں کی سی گزارتے تھے اور کافر مجاہر جو ظاہراً و باطناً کافر تھا اس سے سوال نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں ان سوالات کا منشاء یہ ہے

افق میں فرق ہوجائے اور کافر مجاہر میں التباس تھا ہی نہیں لہٰذا اس سے سوال کیوں ہو؟ حیرت ہے کہ علامہ جلال الدین یوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ وہ شرح الصدور میں لکھتے ہیں کہ ابن البر نے کہا کہ یہ سوال صرف مومن اور افق کے ساتھ مخصوص ہے اور جن احادیث میں کافر کا لفظ آیا ہے اس سے بھی منافق ہی مراد ہے۔ لیکن اگر ان حضرات زدیک کافر سے سوال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے ممتاز ہے تو یہ میز و امتیاز تو مومن کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا یہ چاہیئے کہ مومن سے بھی قبر میں سوال نہ ہوگا۔ صرف منافق سے ہوگا اور شاید اسی اعتراض سے بچنے کے لیے علامہ ابن قیم کتاب الروح میں یہ لکھا ہے کہ سوال صرف منافق سے ہی ہوگا۔

بہر حال مسلک حق یہ ہے کہ قبر میں تینوں سے سوال ہوگا۔ منافق سے بھی مومن سے بھی اور کافر مجاہر سے بھی اور منشاء سوال باس کو دور کرنا اور مومن و منافق میں فرق کرنا نہیں۔ چنانچہ احادیث میں یہ تصریح ہے کہ جب مومن سوالات کے صحیح ب دے گا تو فرشتے اس سے یہ کہیں گے کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو حضور علیہ السلام کی رسالت و نبوت پر یقین تا ہے۔ اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ قبر کے سوالات کا منشاء مومن و منافق میں فرق کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت حضور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت کا اظہار ہے۔ خود علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ تثبیت میں لکھا۔

ما اَلْمَقْصُوْدُ مِنَ السُّؤَالِ اُمُوْرٌ حدُ هُمَا اِظْهَارُ شَرَفِ النَّبِيِّ لَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	اس سوال سے مقصود متعدد امور ہیں۔ ایک ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف کا اظہار بھی ہے۔

جب مقصودِ سوال حضور علیہ السلام کے فضل و شرف کا اظہار ہے کہ یہ وہ ذاتِ مقدس ہیں۔ جن کی رسالت و ت کے متعلق قبر میں بھی پوچھا جاتا ہے تو یہ سوالات مومن، منافق اور کافر تینوں سے ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ل الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تکملہ میں ان آیات کی تفسیر اس طرح کی ہے:-

۱- يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (هو كلمة التوحيد)

۲- فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (في القبر)

۳- وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (الكفار فلا يهتدون للجواب الصواب)

اس تفسیر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبر میں کافر سے بھی سوال ہوگا ——— لہٰذا جب مقصودِ سوال حضور السلام کے فضل و شرف کا اظہار ہے تو یہ سوالات کافر، منافق اور مومن تینوں سے ہونے چاہئیں۔ اس کے وہ اس باب کی احادیث میں اما المنافق والکافر بھی آیا ہے۔ واؤ عاطفہ مغایرت کے لیے آتی ہے۔ جس سے ضح ہوتا کہ یہ سوال کافر اور منافق دونوں سے ہوں گے۔ چنانچہ آیت یثبت اللہ الذین امنوا (الی) یضل ہ الظالمین سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ظالمین کا ذکر امنوا کے مقابل کیا گیا ہے اور لفظ ظالم کافر نافق دونوں کو شامل ہے۔ نیز طبرانی میں حدیث مرفوع بسند حسن آئی ہے۔ ابن حبان نے اس کو اپنی صحیح میں درج س کا مضمون یہ ہے۔

”کافر جب سوال ہوگا تو وہ صحیح جواب نہ دے سکے گا جس پر قبر اس کے لیے تنگ ہو جائے گی یہاں تک
اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ اسی کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے ۔ من اعرض
عن ذکری فان لہ معیشت ضنکا“

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے میں کافر اور منافق دونوں شامل ہیں۔

مسائل حدیث

۱۔ واضح ہو کہ یہ نماز جس کا ذکر حدیث زیر بحث ہے کسوف کی نماز تھی۔ جو سنہ ۹ھ
اس وقت ہوا تھا جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم
نے انتقال فرمایا تھا اور نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا۔ حدیث زیر بحث، مسائل ذیل پر مشتمل

۲۔ جنت و دوزخ پیدا ہو چکی ہیں اور آج موجود ہیں۔ یہی مذہب ہے اہلسنت وجماعت کا۔ جس پر آیات وا
اخبار متواترہ دال ہیں۔ البتہ معتزلہ اس بات کا انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ حساب وعقاب سے
قبل پیدا کی جائیں گی۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا یہ کہنا:۔

باطل ہے دین سے تلاعب ہے اور اجماع کے بھی خلاف ہے۔	هٰذَا بَاطِلٌ وَتَلَاعُبٌ بِالدِّيْنِ وَانْسِلَالٌ عَنْ اِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ (عینی ج ۱ ص ۴۹)

۳۔ عذاب قبر اور قبر میں منکر نکیر کا سوال کرنا برحق ہے ۴۔ صلوٰۃ کسوف سنت اور اس میں قیام طویل
کے بعد خطبہ دینا مسنون ہے ۵۔ عمل قلیل سے نماز فاسد نہیں ہوتی ۶۔ ایسی بیہوشی جس میں عقل باقی رہے نا
نہیں ہے ۷۔ خطبہ کے اول میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہونی چاہیے ۸۔ منافق اس کو کہتے ہیں جو بظاہر کلمہ پڑھے
یں کفر رکھے اور مرتاب وہ ہے جو اسلام کی حقانیت وصداقت میں شک کرے۔

ایک شبہ کا ازالہ

مخالفین تقلید نے اس موقع پر عجیب وغریب شبہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس
سے تقلید کی مذمت نکلتی ہے کیونکہ منافق فرشتے کے سوال پر یہ جواب دیگا کہ میں
لوگوں کو کہتے سنا وہی میں نے کہا۔ مطلب یہ کہ اس نے نہ خود غور کیا اور نہ تحقیق کی بلکہ ایمان تقلیدی کا اظہار کیا
کا یہ استدلال اتنا کچا اور بودا اور لایعنی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملے گی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ وہ امور جو ایمان سے
ہیں جیسے توحید ورسالت، حشر ونشر، قیامت۔ اسی طرح وہ احکام جو کتاب وسنت نے واضح طور پر بیان دیئے
پانچ نمازیں، تیس روزے، شراب وخنزیر کی حرمت وغیرہ ذالک، مسائل واحکام صریحہ یہ وہ امور ہیں
تقلید جائز ہے اور نہ کوئی مقلد ان امور میں کسی امام کی تقلید کرتا ہے تو جب مقلدین ائمہ اربعہ کے نزدیک ایمانیا
احکام صریحہ منصوصہ میں تقلید جائز ہی نہیں ہے تو حدیث مذکورہ سے تقلید کی مذمت کیسے ثابت ہوئی۔ تقلید تو
ان امور کی کی جاتی ہے جنہیں قرآن وحدیث نے بیان نہیں کیا اور جنہیں مجتہد دلائل شرعیہ کی روشنی میں اجتہاد واست
نکالتا ہے اور حدیث میں جن امور کے متعلق قبر میں سوال ہونے کا ذکر ہے۔ یہ امور تقلیدی نہیں ہیں۔

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حدیث ہذا کے راویوں میں حضرت اسماء بھی ہیں۔ آپ حضرت

عالیٰ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ تعالےٰ عنہا حضرت زبیر کے نکاح میں تھیں۔ ان سے ۵۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۴ کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا اور ۱۴ پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا ہے۔ انھوں نے مکہ میں ماہ جمادی الاول ۷۳ھ میں بعد شہادت حضرت عبداللہ بن زبیر کے انتقال کیا۔ ان کی عمر مبارک ایکسو سال ہوئی۔ اس عمر میں بھی کوئی دانت نہ گرا اور نہ عقل میں فتور آیا۔

بَابُ تَحْرِيْضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب اس امر کے بیان میں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

خْبِرُوا مَنْ وَرَآءَهُمْ وَقَالَ مَالِكُ ابْنُ حُوَيْرِثِ قَالَ لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِعُوْا اِلٰى اَهْلِيْكُمْ فَعَلِّمُوْهُمْ

(بخاری)

نے وفد عبد القیس کو رغبت دلائی کہ وہ ایمان اور علم کی باتیں یاد رکھیں اور دوسروں تک پہنچائیں اور مالک ابن حویرث کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ اور ان کو دین کی باتیں سکھاؤ۔

وائد ومسائل تحریض، کے معنی ہیں کسی کام کی رغبت دلانے، برانگیختہ کرنے اور ابھارنے کے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی وفد کو یا اشخاص و افراد کو دین کے احکام و مسائل تعلیم فرماتے تو یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ تم نے جو کچھ مجھ سے سیکھا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

یہ تعلیق حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نے کتاب الصلوٰۃ اور ادب میں موصولاً ذکر فرمایا ہے۔ امام مسلم نے بھی اس کو ذکر کیا ہے ۲۔ مالک ابن حویرث بن حشیش صحابی ہیں۔ یہ پانچ افراد کے ہمراہ خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اسلام لائے اور چند دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے اور پھر اپنی قوم کی طرف واپس ہونے کی اجازت چاہی تو حضور علیہ السلام نے ان کو مذکورہ بالا حکم دیا۔ ان سے کل ۱۵ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا اور ایک حدیث کو بخاری نے منفرداً ذکر کیا۔ حضرت مالک ابن حویرث نے ۹۴ھ میں بصرہ میں انتقال فرمایا۔ ایک جماعت نے آپ سے روایت کی ہے ۳۔ اس کے بعد امام بخاری نے ایک حدیث ۸۶ ذکر کی ہے جو کتاب الایمان میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے۔ یعنی حدیث وفد عبد القیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ دیا۔

بَابُ الرِّحْلَةِ فِىْ مَسْئَلَةِ النَّازِلَةِ

باب جب کوئی مسئلہ آپڑے تو اس کے جواب کے حصول کے لیے سفر کرنا

علامہ دوانی نے شرح عقائد میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایک عالم دین کا انتظام و انصرام کریں تاکہ لوگ اس سے اپنے مسائل ضروریہ نازلہ پوچھ سکیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرینگے تو گنہگار ہوں گے۔

۸۔ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ اَنَّهٗ تَزَوَّجَ ةً لِاَبِيْ اِهَابِ بْنِ عَزِيْزٍ فَاَتَتْهُ رَاَةٌ فَقَالَتْ اِنِّيْ قَدْ اَرْضَعْتُ

عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نکاح کیا ابو اہاب بن عزیز کی بیٹی سے تو ایک عورت آئی کہنے لگی میں نے عقبہ کو اور اس لڑکی

عُقْبَةُ وَالَّتِي تَزَوَّجَ بِهَا قَالَ لَهَا عُقْبَةُ مَا أَعْلَمُ إِنَّكِ أَرْضَعْتِنِي وَلَا أَخْبَرْتِنِي فَرَكِبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِينَةِ فَسَأَلَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ

(بخاری)

جس سے عقبہ نے نکاح کیا ہے، دُودھ پلایا ہے۔ عقبہ نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تُو نے مجھے دُودھ اور نہ تُو نے اس سے قبل کبھی اس کا ذکر کیا عقبہ سواری پر سوار ہو کر مدینہ منورہ حضور صلی علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کیسے اور جب کہ کہا ہے ——— پس عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور عورت نے دوسرا خاوند کرلیا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کا باب سے تعلق یہ ہے کہ اس میں حضرت عقبہ کا مسئلہ پوچھنے کے لیے سفر کا ذکر ہے۔ ۲۔ امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الشہادات میں بھی ذکر کیا ہے۔ تفصیلی بحث ہم انشاء اسی مقام پر کریں گے ۳۔ کیف وقد قیل، کا حاصلِ معنیٰ یہ ہے کہ تم ایک ایسی عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات کیسے سکتے ہو جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ تمہاری رضاعی بہن ہے ۴۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک عورت کے قول سے ثابت نہیں ہوتی اور نہ محض اس کے قول کی بنا پر نکاح فاسد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد محض یعنی ورع اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ تہمت کے مواضع سے بھی بچا جائے۔

رضاعت کا ثبوت اس باب میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ رضاع کا ثبوت اسی طرح ہوگا جس طرح مال ہے یعنی دو مردوں کی شہادت یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ صرف ایک قول نہیں مانا جائے گا کیونکہ ثبوتِ حرمت بابِ نکاح میں لوازم الملک سے ہے اور ملک کا زوال ایک عورت کی نہیں ہوتا۔ لہٰذا حرمت ثابت نہ ہوگی اور امام شافعی یہ فرماتے ہیں۔ ثبوتِ شہادت چار عورتوں کی شہادت سے اور امام مالک کے نزدیک دو عورتوں کی شہادت سے اور امام احمد کے نزدیک صرف مرضعہ کے کہنے سے رضاعت ہو جائے گا۔ ان کی دلیل حدیثِ زیرِ بحث ہے۔

بَابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

باب علم حاصل کرنے کے لیے باری مقرر کرنا

۸۸۔ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَجَارٌ لِي مِنَ الْأَنْصَارِ فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُولَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میرا ہمسایہ انصاری عوالی مدینہ کے ایک گاؤں بن زید میں رہتے تھے اور ہم دونوں باری باری صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے دن وہ اور ایک دن میں دربارِ نبوی میں حاضری

نْزِلُ يَوْمًا وَ اَنْزِلُ يَوْمًا فَاِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهٗ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَ غَيْرِهٖ وَاِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ فَنَزَلَ صَاحِبِي الْاَنْصَارِيُّ يَوْمَ نَوْبَتِهٖ فَضَرَبَ بَابِي ضَرْبًا شَدِيْدًا فَقَالَ اَثَمَّ هُوَ فَزِعْتُ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ حَدَثَ اَمْرٌ عَظِيْمٌ فَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ فَاِذَا هِيَ تَبْكِيْ فَقُلْتُ اَطَلَّقَكُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ لَا اَدْرِيْ ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ وَاَنَا قَائِمٌ اَطَلَّقْتَ نِسَآءَكَ قَالَ لَا فَقُلْتُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ

(بخاری)

اس دن جو وحی ہوتی اور جو مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں اپنے ساتھی انصاری کو اس کی اطلاع دیتا اسی طرح وہ بھی کرتا تو ایک دن میرے ساتھی انصاری کی باری تھی۔ وہ لوٹ کر آیا اور اس نے زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا یہاں عمر ہیں؟ میں گھبرا گیا اور مکان سے باہر آیا۔ اس نے کہا آج بہت بڑا حادثہ رونما ہوا ہے (یعنی حضور علیہ السلام نے اپنی بی بیوں کو طلاق دیدی ہے) پس میں حفصہ کے ہاں آیا اور ان کو روتا ہوا پایا۔ میں نے کہا کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی ہے؟ تو حفصہ نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ پھر میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور کھڑے کھڑے عرض کی۔ آپ نے اپنی بیبیوں کو طلاق دیدی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں! میں نے کہا اللہ اکبر

وائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام بخاری نے نکاح اور مطاعم میں بھی ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے طلاق میں ترمذی نے تفسیر میں۔ نسائی نے صوم اور عشرۃ النساء میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اس حدیث سے ذیل کے مسائل علوم ہوئے۔ خبرِ واحد اور صحابہ کے مراسیل پر عمل درست ہے — صحابہ کرام علمِ دین کے حریص تھے اور جو کچھ حضور یہ السلام سے سنتے دوسروں تک پہنچاتے — باپ کو اپنی بیٹی کے گھر اس کے خاوند سے اجازت لیے بغیر جانا جائز ہے۔

بَابُ الْغَضَبِ فِى الْمَوْعِظَةِ

باب خلاف شرع بات دیکھنے پر تعلیم

وَالتَّعْلِيْمِ اِذَا رَاٰى مَا يَكْرَهُ

۸ ـ عَنْ اَبِىْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا اَكَادُ اُدْرِكُ الصَّلٰوةَ مِمَّا يُطَوِّلُ بِنَا فُلَانٌ فَمَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمَئِذٍ فَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنَفِّرُوْنَ فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الْمَرِيْضَ

و تعلیم میں غصہ کا اظہار کرنا

ابی مسعود الانصاری سے ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نماز کو نہیں پا سکتا بوجہ لمبا کرنے فلاں شخص کے نماز کو (ابی مسعود کہتے ہیں) میں نے کسی وعظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن سے زیادہ غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ پس جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اس میں تخفیف کرے۔ کیونکہ نماز پڑھنے والوں میں

وَالضَّعِيْفَ وَ ذَا الْحَاجَةِ (بخاری)

مریض بھی ہوتے ہیں اور ضعیف بھی اور حاجت

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری نے اس حدیث کو صلوٰۃ، ادب اور احکام میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ مسلم نے صلوٰۃ میں
نے علم میں اور ابن ماجہ نے محمد بن عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے ۲۔ شکایت کرنے والے کا
ابی کعب ہے اور نماز پڑھانے والے معاذ ابن جبل تھے۔ لا اکاد ادرک الصلوٰۃ۔ یعنی حزم نے عرض کی کہ معاذ
اتنی لمبی نماز پڑھاتے ہیں کہ میں نماز کو پا نہیں سکتا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جب قیام طویل ہوگا تو ہر شخص نماز کو با آس
ہے اس لیے شارحین نے ان جملوں کی متعدد تفسیریں کی ہیں۔ بعض نے کہا ادرک کی جگہ اترک کا لفظ تھا۔ یعنی
کی وجہ سے قریب تھا کہ میں نماز کو چھوڑ دوں۔ لیکن یہ تاویل الفاظ حدیث کے موافق نہیں ہے۔ البتہ ابن الزناد و
جو معنی بیان کیے ہیں وہ خوب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو ضعف تھا اور جب امام نے نماز کو طول دیا
ضعف و کمزوری رکوع اور سجدہ نہ کر سکتے تھے یعنی امام کے ساتھ نماز پوری کرنے کے قابل نہ رہے ۳۔ اس
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کے لہجہ میں فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ لہٰذا جب کوئی نماز پڑھائے
کرے اور مریض، ضعیف اور حاجتمندوں کی رعایت کرے۔

مسائل حدیث

حدیث ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔
۱۔ جب کوئی شخص اکیلا نماز پڑھے تو جس قدر اس کی طاقت ہو نماز کو طول دے
لیکن جب وہ امامت کرے تو سنت کے مطابق اس کو ادا کرے اور اتنا طول نہ دے کہ لوگ اکتا جائیں۔ اس سے
ہوا کہ اطالۃ الصلوٰۃ پر تعزیر بالکلام جائز ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کا اظہار فرما کر اس فعل
فرمایا ۲۔ جب امورِ دین میں منکر نظر آئے تو وہاں کا غضب کا اظہار جائز ہے ۳۔ جس سے کوئی خلاف شرع بات صا
کا نام لے کر بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ بتا دینا چاہیے الا یہ کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ نام لیا جائے
لے کر مسئلہ بیان کرنے میں حرج کیا ہے۔

۹۰۔ عَنْ زَيْدِ ابْنِ خَالِدِ نِ الْجُهَنِيِّ اَنَّ
النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاَلَهُ رَجُلٌ
عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اَعْرِفْ وِكَاءَهَا اَوْ قَالَ
وِعَاءَهَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ
اسْتَمْتِعْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا
اِلَيْهِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ فَغَضِبَ حَتّٰى
احْمَرَّتْ وَجْنَتَاهُ (اَوْ قَالَ احْمَرَّ
وَجْهُهٗ) فَقَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاؤُهَا
وَحِذَاؤُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَرْعَى الشَّجَرَ

زید ابن خالد الجہنی سے روایت ہے ایک شخص
کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا
فرمایا اس کا بندھن یا اس کا برتن یا تھیلی خوب
اور ایک سال تک اس کی تشہیر کرو پھر نفع اٹھ
اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اس کو دیدے
عرض کی گمشدہ اونٹ کسی کو ملے تو اس کا کیا
پر آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا یہاں تک کہ آپ
رخسارے یا چہرہ اقدس سرخ ہوگیا۔ پھر فرمایا
سے کیا واسطہ اس کی مشک ہے اس کا موز

رْهَا حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا قَالَ
ضَالَّةُ الْغَنَمِ قَالَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ
وْ لِلذِّئْبِ

(بخاری)

خود پانی پر جاتا ہے اور درخت چرتا ہے۔ پس تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کا مالک اس سے مل جائے پھر اس نے عرض کیا اگر گم شدہ بکری کسی کو ملے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یا وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی ہے

پھر بھیڑیے کے لیے ہے۔

ائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے لقطہ وادب میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے قضاء میں۔ ابوداؤد نے لقطہ میں۔ ترمذی وابن ماجہ نے احکام میں۔ ابوداؤد نے ضوال اور لقطہ میں ذکر فرمایا ۲۔ حضرت خالد صحابی یں۔ جہینہ کی طرف منسوب ہیں۔ فتح مکہ کے دن ان کے ہاتھ میں قبیلہ جہینہ کا جھنڈا تھا۔ آپ سے کل اکاسی حدیثیں مروی یں۔ امام بخاری نے آپ سے پانچ حدیثیں لی ہیں۔ مدینہ منورہ یا مصر میں بعمر ۸۵ سال ۷۸ھ میں انتقال فرمایا ۳۔ لقطہ کے لغوی معنی کسی چیز کے بغیر طلب اور جستجو کے مل جانے کے ہیں۔ وکاء، اس تاگہ یا رسی کو کہتے ہیں جس سے تھیلی یا رسی کا منہ باندھا تا ہے۔ وعاء، اس برتن یا تھیلے کو کہتے ہیں جس میں آدمی اپنا سامان یا زادِ راہ وغیرہ رکھتا ہے۔ عفاص، اس کپڑے کتے ہیں جو تھیلی کے منہ پر رکھ کر باندھا جاتا ہے۔ اعرف وکاءھا۔ معرفۃ سے ہے مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس تھیلی یا رتن یرہ میں ملے اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھا جائے تاکہ جب اس کا مالک ملے تو اس سے نشانی پوچھی جائے اور ان کی تکذیب تصدیق کی جاسکے۔ ثم عرفها۔ یعنی اٹھانے والے پر ایک سال تک اس کی تشہیر واجب ہے۔ اگر مالک مل جائے تو اس کو دیدیا جائے ورنہ اس کو کام میں لایا جائے۔ فغضب یعنی جب سائل نے اونٹ کے متعلق پوچھا تو حضور علیہ السلام نے اس سوال پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ اس لیے کہ انھوں نے اونٹ کو بھی لقطہ میں شمار کرلیا۔ حالانکہ لقطہ اس کو کہتے ہیں الک سے جدا ہوجائے اور خود مالک تک نہ پہنچ سکے اور اگر اس کو وہیں چھوڑ دیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو لاف اونٹ کے کہ اس کے مرنے کا احتمال بہت کم ہے کیونکہ وہ خود چرتا ہے۔ ہفتہ بھر کا پانی یکدم پی لیتا ہے اور بھیڑیے وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے اور عموماً مالک اس کو تلاش کرلیتا ہے۔ لہٰذا اونٹ کو پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اونٹ کے متعلق یہ م اسی زمانہ کے ساتھ خاص معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں اونٹ اگر بغیر مالک ملے گا تو ممکن ہے اس کی ذات کو کوئی قصان نہ پہنچے۔ مگر دوسروں کو ضرور نقصان پہنچ جائیگا۔ بلکہ اس زمانہ میں تو لوگ ہاتھی کو بھی نہیں چھوڑتے تو اونٹ کو کون چھوڑے گا۔ لہٰذا اونٹ اگر آوارہ مل جائے تو اس کو بھی اپنی حفاظت میں اس نیت سے لے لینا جائز ہے کہ مالک کا پتہ نے پر اس کے سپرد کردیا جائے۔

قطہ کے مسائل

۱۔ ہر قسم کی پڑی چیز کا اٹھا لانا جائز ہے۔ مثلاً متاع، جانور بلکہ اونٹ وغیرہ، پڑا ہوا مال کہیں ملا اور یہ خیال ہو کہ میں اس کے مالک کو تلاش کرکے دیدوں گا تو اٹھا لینا مستحب ہے اور اگر اندیشہ ہو شاید میں خود ہی رکھ لوں اور مالک کو تلاش نہ کرسکوں تو چھوڑ دینا بہتر ہے اور اگر ظن غالب ہو کہ مالک کو نہ دوں گا تو اٹھانا ناجا ے اور پڑا ہوا مال اپنے لیے اٹھانا حرام ہے۔ اگر یہ ظن غالب ہو کہ اگر نہ اٹھاؤں گا تو یہ چیز ضائع ہوجائے گی تو اٹھا لینا

ضروری ہے۔ ۲۔ اس حدیث میں آیا کہ لقطہ کی ایک سال تک تشہیر کی جائے۔ اٹھانے والے پر تشہیر کرنا لازم ہے اور شارع عام میں اور مساجد میں اور آج کے زمانہ میں بہترین ذریعہ ریڈیو اور اخبارات ہیں۔ ان کے ذریعے تشہیر تشہیر کی مدت میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اتنے زمانہ تک تشہیر کرے کہ ظن غالب ہو جائے کہ مالک نہ کرتا ہوگا۔

۳۔ لقطہ اٹھانے والے کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے۔ یعنی اگر ملتقط نے اس کی اپنے مال کی طرح حفاظت اس کے باوجود تلف ہو گیا تو اس پر تاوان نہ ہوگا مگر اس میں یہ شرط ہے کہ اٹھاتے وقت کسی کو گواہ بنا لیا ہو گواہ نہ کیا تو تلف ہونے کی صورت میں تاوان دینا پڑے گا۔ ہاں اگر وہاں کوئی نہ ہو تو یہ اندیشہ ہو کہ گواہ بنائے گا چھین لے گا اور مالک تک نہ پہنچائے گا تو اس صورت میں تلف ہو جانے پر ضمان نہیں ہے۔

۴۔ تشہیر کی مدت پوری ہو جانے کے بعد اٹھانے والے کو اختیار ہے کہ یا تو لقطہ کی خود حفاظت کرے تا مالک مل جائے یا کسی غریب و مسکین کو دیدے یا اگر خود غریب و نادار ہے تو اپنے کام میں لے آئے لیکن ان سب جب بھی مالک آ گیا اس کو اختیار ہے کہ یا تو صدقہ کو جائز کر دے یا اگر وہ چیز بعینہٖ موجود ہے تو اس کو لے لے اور ہے تو تاوان لے لے۔

۵۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک غریب و امیر دونوں کے لیے جائز ہے کہ تشہیر کی مدت پوری ہو جانے اپنے استعمال میں لے آئے۔ مگر حنفیہ کے ہاں دولت مند کو لقطہ اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔ مفصل م بہار شریعت حصہ دہم کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۹۱ - عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَشْیَآءَ كَرِهَهَا فَلَمَّا اُكْثِرَ عَلَيْهِ غَضِبَ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مَنْ اَبِیْ قَالَ اَبُوْكَ حُذَافَةُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَبُوْكَ سَالِمٌ مَوْلٰی شَیْبَةَ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ مَا فِیْ وَجْهِهٖ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا نَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے صلی اللہ علیہ وسلم سے چند اُمور کے متعلق سوال جن کو آپ نے ناپسند فرمایا۔ جب سوالات ہو گئی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا مجھ سے جس چیز کے متعلق چاہو پوچھ لو۔ کھڑے ہوئے عرض کی۔ میرا باپ کون ہے۔ حذافہ ہے ایک اور صاحب کھڑے ہوئے کون ہے؟ فرمایا تیرا باپ سالم ہے مولیٰ شیبہ جب حضرت عمر نے حضور علیہ السلام کی ناپسند تو عرض کی یا رسول اللہ ہم اللہ کے حضور توبہ

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الاعتصام میں باب ما یکرہ من کثرۃ السوال میں ذکر فرمایا ہے۔ ۲۔ ان تینوں حدیثوں کا باب سے تعلق یہی ہے کہ تعلیم و تعلم و وعظ و نصیحت

ار حسب موقع وحال جائز ہے ۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ ایسے سوالات کر رہے تھے۔ جن کا تعلق فرض
سے نہ تھا۔ اس پر آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا کہ ایسے سوالات جو غیر ضروری ہیں وہ نہ کیے جائیں لیکن جب
والات کی کثرت ہوگئی تو آپ نے فرمایا "مجھ سے جو چاہو پوچھ لو" ـــــ اس جملہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اللہ
نے مجھے ہر چیز کا علم عطا فرمایا ہے۔ میرا سینہ علم و معرفت کا خزینہ ہے۔ اگر تم ایسے امور سے متعلق سوال کروگے جن
جواب کی مجھ پر ذمہ داری نہیں ہے تو میں ان کے جواب بھی دینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے اس کا عملی
ت اسی وقت دیدیا۔ جن صاحب نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا تھا کہ میرا باپ کون ہے؟
پ نے اس کے باپ کا نام بتا دیا۔

ضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز کے عالم ہیں

۴۔ چنانچہ سلونی عمّا شئتم کہ مجھ سے جو چاہو پوچھو اس میں کوئی قید نہیں ہے بلکہ عموم و اطلاق ہے جس کا
ا و مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کی طاقت رکھتا ہوں خواہ تمہارا وہ سوال دین سے متعلق ہو یا
یا سے، غیب سے اس کا تعلق ہو یا شہادت سے (سبحان اللہ) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم کے لیے یہ
وری نہیں ہے کہ سائل کے بیکار اور فضول سوالات کا بھی جواب دے جیسا کہ آج کل رواج ہو گیا ہے کہ لوگ دین کے
وری مسائل تو پوچھتے نہیں۔ سوال کرتے ہیں تو یہ کہ حضرت عیسٰے نے کتنے مُردے زندہ کیے تھے؟ اور اصحاب کہف
کتے کا رنگ اور عمر کتنی تھی؟ حضرت موسیٰ کے عصا کی لمبائی کتنی تھی؟ آج کل عوام اسی قسم کے سوالات کرنے کے عادی
گئے ہیں۔ ایسے بیکار سوالات کے جوابات دینے کی عالم پر ذمہ داری نہیں ہے۔

۵۔ اس حدیث پر غور کیجیے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر ادب
ترام کرتے تھے کہ مزاجِ نبوی کے خلاف امر کو دیکھ کر نہ صرف ان کو روک دیا بلکہ اس فعل پر اللہ تعالےٰ کے حضور توبہ کرنے
قین کی۔

بَابُ مَنْ بَرَكَ رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْإِمَامِ أَوِ الْمُحَدِّثِ

باب محدث یا امام کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنا

یعنی آدابِ متعلم سے یہ ہے کہ وہ استاذ کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھے جیسا کہ دربارِ نبوت صحابہ کرام بیٹھا کرتے
تے۔ اس باب میں امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو ابھی ابھی مع تفہیم کے ہم پیش کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یہ
ضمون اور زیادہ ہے جو عنوان کے متعلق ہے کہ جب عبداللہ نے یہ سوال کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ تو حضور علیہ السلام نے
ب دیا اور متعدد بار یہ فرماتے رہے سَلُونِیْ ـــــ مجھ سے پوچھ لو، مجھ سے پوچھ لو۔

۹ - فَبَرَكَ عُمَرُ عَلٰی رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ
ضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا
بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زانوؤں پر رکھے (یعنی دو زانو ہو کر نہایت ادب و احترام سے دربارِ نبوت میں بیٹھے) اور عرض کی ہم اللہ

فَكَتَ (بخاری)

کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوئے (حضرت عمر نے یہ جملے عرض کیے تو تب جاکر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی بھی کوئی شخص دربارِ نبوی میں حضور اکرم کے مزاج کوئی بات کرتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اظہارِ ناراضگی فرماتے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کردیتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان جملوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی ختم جس سے واضح ہوتا ہے کہ دربارِ نبوی میں حضرت فاروق اعظم کا ایک خاص مقام تھا۔ وہ مزاجِ نبوت کو سمجھتے دربارِ نبوی سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے۔ پھر لطف یہ کہ حضور علیہ السلام چاہے کیسے کچھ برہم کیوں نہ ہوں فاروق اعظم محبت میں ڈوبے ہوئے جملے مزاجِ نبوت میں سکون پیدا کردیتے تھے۔

بَابُ مَنْ اَعَادَ الْحَدِيْثَ ثَلَاثًا لِيُفْهَمَ عَنْهُ

باب ایک بات کو تین بار کہنا تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں

گزشتہ باب میں سائل اور متعلم کی شان کا بیان تھا کہ اس کو استاد کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھ یہ باب شانِ معلم سے متعلق ہے کیونکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات کئی بار اس لیے دہراتے تھے کہ سا متعلمین آپ کے کلام کو اچھی طرح سن لیں اور آپ کی باتیں خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

فَقَالَ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا (بخاری)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا سن (بولنا) اور کئی بار آپ نے یہ کلم

یہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نے کتاب الشہادات میں مکمل لکھا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں سنگین قسم کے گناہوں سے مطلع نہ کروں (تین بار فرمایا) صحابہ نے عرض کی فرمائیے تو فرمایا کے ساتھ شرک کرنا۔ والدین کی نافرمانی کرنا۔ پھر آپ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور تین بار فرمایا۔ خبردار جھوٹی گواہی (تین بار

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا (بخاری)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ حضور صلی نے تین بار فرمایا۔ کیا میں نے تم کو اللہ کا پیغ

۹۳۔ اَنَّهٗ كَانَ تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلٰثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَاِذَا اَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلٰثًا (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام کرتے تو تین اور جب کوئی بات کرتے تو تین بار اس کو (تاکہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھ لیں)۔

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے استیذان میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی نے مناقب میں ذکر کیا ہے۔ تین بار سلام کرنا یہ حضور علیہ السلام کا ہمیشہ کا قاعدہ نہ تھا۔ ممکن ہے تین بار سلام اس وقت کیا ہو جب کہ لوگوں نے سنا نہ ہو۔ علامہ قسطلانی نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ حضور اکرم صل

ب کسی قوم کے پاس جاتے تو سلام کرتے۔ یہ استیذان کا سلام ہوا۔ پھر جب اندر داخل ہوتے تو سلام کرتے یہ تحیت کا سلام ۔ پھر جب لوٹتے تو سلام کہتے یہ رخصت کا سلام ہوا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تین مرتبہ سلام کرنا ضروری نہیں ہے اور اگر حضور علیہ السلام یک کہ تین مرتبہ سلام کیا کرتے تو امت میں یہی رائج ہوتا ۲۔ بعض اوقات حضور علیہ السلام جب کوئی بات کرتے تو اس کو ین بار ارشاد فرماتے تھے۔ تاکہ وہ بات لوگوں کے خوب ذہن نشین ہو جائے ۳۔ ابن منیر نے کہا کہ اس ترجمہ باب سے امام بخاری ثابت کیا ہے کہ جس نے حدیث کا دوبارہ بیان کرنا مکروہ کہا ہے۔ اس کا قول غلط ہے۔ اسی طرح طالب کی درخواست بارہ بیان کرنے کو مکروہ سمجھنا یا اس کو کند ذہن قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ طبائع اور اذہان بھی مختلف ہوتے ہیں اس سے ہوا کہ عالم اگر ضرورت محسوس کرے تو کسی مسئلہ کو بار بار بیان کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسا کرنا مسنون ہے اور جب کوئی شخص دوبارہ سننا چاہے تو عالم کو عذر نہ ہونا چاہیے اور دوبارہ مسئلہ بتا دینا چاہیے ۵۔ اس باب میں امام نے بالکل اسی مضمون کی یث اور ذکر کی ہے اور ایک اور حدیث بھی لکھی ہے جو (باب من رفع صوته بالعلم) میں مع تفہیم و ئل کے گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے ان دونوں حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے ۵۔ تین بار سلام کرنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہے ب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو تین بار سلام کرتے جیسے آج کل بھی اس کا رواج ہے ب کسی مجمع میں آدمی پہنچتا ہے تو پہلے ابتدا میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرتا ہے۔ پھر درمیان میں پہنچ کر اور پھر آخر میں ہنچتا ہے تو سلام کرتا ہے (واللہ اعلم)

بَابُ تَعْلِيْمِ الرَّجُلِ اَمَتَهٗ وَاَهْلَهٗ

باب اپنی لونڈی اور گھر والوں کو علم دین سکھانے کے بارے میں

۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ
بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ
مْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ
جُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَطَؤُهَا فَاَدَّبَهَا
حْسَنَ تَادِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا
عْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ ثُمَّ
عَامِرٌ اَعْطَيْنَاكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ
يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ

(بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمیوں کو دوہرا ثواب ملے گا۔ ایک اہل کتاب سے جو ایمان لایا۔ اپنے نبی پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی۔ دوم، وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی۔ سوم وہ جس کے قبضہ میں لونڈی ہے وہ اس سے صحبت کرتا ہے۔ پھر اس کو بہترین ادب سکھایا اور بہترین تعلیم دی۔ پھر اس کو آزاد کیا۔ پھر اس کے ساتھ نکاح کر لیا تو اس کے لیے دوہرا ثواب ہے۔ عامر نے کہا ہم نے تم کو یہ حدیث بلاعوض دیدی اور ایک زمانہ وہ تھا کہ اس سے کم تر کی حدیث کے لیے لوگ مدینہ تک کا سفر کرتے تھے۔

د و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے عتق، جہاد، احادیث انبیاء اور نکاح میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی و نسائی اور ابن ماجہ نے بھی کتاب النکاح میں درج ۲۔ دو اجر کا استحقاق صرف ان تین قسم کے

افراد کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ وہ لوگ بھی دوہرے ثواب کے مستحق ہوں گے جو نماز بھی پڑھیں اور روزہ بھی وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے والدین کی خدمت بھی کرے تو نماز کا ثواب علیحدہ ہے۔ روزہ کا پابند بھی دو اجر کا مستحق ہوگا اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے کہ کسی چیز پر نص کر دینا اس کے سوا کی واللّٰہ واسع علیم ۔ ۳۔ اس حدیث میں فرمایا کہ جس کی لونڈی ہو وہ اس سے صحبت بھی کرتا ہو کی تعلیم و تربیت باحسن وجوہ کی ہو۔ پھر اس سے نکاح کر لیا تو ایسا شخص دو اجر کا مستحق ہے۔ یہ بات تو بالکل کہ لونڈی نکاح میں لینا ایک نیکی ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت کرنا دوسری نیکی ہے لیکن یہ جو فرمایا کہ اس سے صحبت تھا۔ یہ جملہ یا تو اس امر کے اظہار کے لیے ہے کہ لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا میرے خیال میں اس جملے سے مقصود اس شخص کے خلوص اور نیک نیتی کا اظہار ہے اور یہ بالکل واضح بات لونڈی اس کی ملک میں ہے۔ مالک کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اس کو بغیر نکاح کے صحبت جائز ہے اور وہ صحبت کر بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود مالک اپنی لونڈی سے نکاح کرتا ہے تو اس کی کے خلوص و للّٰہیت اور نیک نیتی پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لونڈی سے جو نکاح کیا ہے محض ثواب کی کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں کیا ہے کیونکہ دنیاوی غرضیں تو اپنی لونڈی سے نکاح کے بغیر بھی پوری کر سکتا کر رہا تھا۔ فافہم۔

اہلِ کتاب سے کون مراد ہیں

حدیث زیر بحث میں رجل من اہل الکتاب کے ہیں یعنی اہلِ کتاب سے جو شخص اپنے نبی پر ایمان لایا تو لیے دو عمل ہو گئے۔ لہٰذا یہ شخص دو اجروں کا مستحق ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اہلِ کتاب سے کون مراد ہیں اگر یہودی مراد لیے جائیں تو یہ بھی مشکل ہے کیونکہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر کے کافر کافر کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہود میں سے جو لوگ حضور علیہ السلام پر ایمان لائے تو وہ مستحق نہیں ہو سکتے ——— اور اگر اہل کتاب سے نصاریٰ کو مراد لیا جائے جیسا کہ حدیث بخاری میں ہیں رجل آمن بعیسیٰ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے صرف نصاریٰ مراد ہیں لیکن میں ایک اشکال اور پیدا ہوتا ہے کہ یہ حدیث قرآن کریم کی آیت سے مستفاد ہے۔ اولٰئک یؤتون اجرھم اور اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ جو حضور علیہ السلام پر ان کے حق میں نازل ہوئی جو پہلے یہودی تھے۔

قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ ان کے لیے دو اجر ہیں۔ ایک اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر حضور علیہ وسلم پر ایمان لانے کا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں ہی مراد یہی صحیح ہے کیونکہ اس مسئلہ کے متعلق صریح حدیث بھی ملتی ہے۔ نسائی میں آیت من لم یحکم بما کی تفسیر میں حدیث طویل وارد ہوئی ہے اور یؤتکم کفلین من رحمتہ کے تحت یہ الفاظ آئے

جرین بایمانهم بعیسٰی و بالتوراة و
نجیل و بایمانهم بمحمد صلی الله
ـه وسلم (نسائی جلد ۲ ص ۳۰)

یہ لوگ دو اجر کے مستحق ہیں۔ توریت و انجیل پر ایمان لانے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔

اور اہل کتاب میں یہود کو شامل کرنے کی صورت میں جو اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے ب عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کے اعمال حبط ہوئے وہ، وہ لوگ تھے جن کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ت ہوئی تھی اور جن کو حضرت عیسیٰ نے اپنی شریعت کی طرف دعوت دی تھی (یعنی بنی اسرائیل) تو جن کی طرف حضرت سیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور آپ نے انہیں دعوت توحید و شریعت دی وہ یہود شام تھے اور شام کے یہودیوں ے جو بھی حضور علیہ السلام پر ایمان لایا وہ ایک اجر کا مستحق ہوگا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر کے وہ کافر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا اجر بسبب کفر کے برباد ہو گیا۔

لیکن یہود مدینہ یہ وہ لوگ تھے جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پہنچی ہی نہیں۔ یہ تو شام سے بھاگ کر مدینہ میں وگئے تھے۔ جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے اور ان کے مدینہ میں آباد ہو جانے کے دو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ی تھی۔ چنانچہ مدینہ شریف کی معتبر تاریخ وفا میں لکھا ہے کہ مدینہ کے نواح میں ایک پتھر پایا گیا۔ جس پر یہ عبارت لکھی ی تھی۔

ذا قبر رسول رسول عیسٰی علیه السلام
اء للتبلیغ فلم یقدر له الوصول
ـهم

یہ قبر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نائب کی جس کو حضرت عیسیٰ نے تبلیغ کے لیے بھیجا تھا مگر وہ (مدینہ کے یہود تک) پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

اس لیے (یہود مدینہ) جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ جو یہودیت پر قائم رہے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایمان لائے۔ وہ دو اجر کے مستحق ہوں گے کیونکہ یہود مدینہ کو جناب عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت نہیں پہنچی۔ لہذا وہ ودیت پر قائم رہے اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مانہ آیا۔ ان میں سے ایک طائفہ نے جن میں حضرت عبداللہ بن سلام بھی تھے اسلام کو قبول کیا۔ انہیں حضرات کے متعلق ن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ وَهُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (الی قولہ)
اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ (عینی جلد ۱ ص ۱۵۱)

یہ عبارت وفا کی ہے اور تاریخ طبری میں بھی یہ عبارت موجود ہے مگر وہاں کاتب کی غلطی سے رسولِ رسول عیسیٰ کے الفاظ گہ رسولِ عیسیٰ کا لفظ درج ہو گیا۔ مرزائی طبری کے اسی غلط حوالہ کو لے کر عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر تو ینہ میں بھی ہے حالانکہ کتب تواریخ میں جس قبر کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ی کی ہے جس کو آپ نے مدینہ شریف کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا اور وہ فرض تبلیغ ادا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے

رہا یہ سوال کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے شریعتِ عیسیٰ[1] علیہ السلام کو قبول کیوں نہیں کیا اور اپنے سابقہ دین پر کیوں قائم رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کو پہنچ جاتی۔ تو ان کے لیے اس کا قبول واجب ہوتا۔ مگر حال یہ ہے کہ یہودِ اہلِ مدینہ کو دعوت پہنچی ہی نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہ حواری جنہیں تبلیغ کے لیے مدینہ کی طرف روانہ کیا تھا وہ تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ ایسی صورت اور دیگر یہودِ مدینہ پر شریعتِ عیسوی کو قبول کرنا واجب نہ تھا۔ اس لیے یہ لوگ اپنے دینِ یہودیت پر قائم رہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور انھوں نے حضور علیہ السلام کی غلامی کو اختیار کر لیا —— البتہ انھیں ظہور علیہ السلام کی اطلاع ملی اور حضرت عبداللہ بن سلام کی سلامتیِ فطرت، حق گوئی و حق کوشی کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کہ ظہورِ عیسوی کی خبر پا کر ضرور انھوں نے نبوتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی ہوگی۔ بلکہ مدینہ کا ہر یہودی جو صحیح معنی یہودیت پر قائم ہے اس نے ضرور نبوتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی ہوگی۔ غرضکہ ان دلائل کی روشنی میں یہ واضح اہلِ کتاب میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں اور مراد ان سے مومنینِ اہلِ کتاب ہی ہیں۔

بَابُ عِظَةِ الْاِمَامِ النِّسَآءَ وَتَعْلِيْمِهِنَّ

باب امام کا عورتوں کو وعظ کہنا اور ان کو دین کی تعلیم دینا

٩٧ - اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَمَعَهُ بِلَالٌ فَظَنَّ اَنَّهٗ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْاَةُ تُلْقِي الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ وَبِلَالٌ يَاْخُذُ فِيْ طَرَفِ ثَوْبِهٖ (بخاری)

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام مجلس سے باہر تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ بلال آپ نے خیال کیا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں آپ نے عورتوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور صدقہ کا حکم دیا تو عورتوں نے اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں کو بلال اپنے کرتے کے دامن میں لے رہے تھے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا اور نسائی نے کتاب اور کتاب العلم میں ذکر فرمایا ہے۔

صدقہ صدقہ وہ مال ہے جو آدمی ثواب کی نیت سے کرتا ہے۔ یہ لفظ فرض اور نفل دونوں میں بولا جاتا ہے لیکن اس سے مراد محض نفلی صدقہ ہے۔ **قُرط** ہر اس زیور کو کہتے ہیں جو عورتیں کان کی لو میں پہنتی ہیں

---

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودِ مدینہ کو تبلیغ کے لیے جو اپنا حواری بھیجا تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت عیسےٰ کی بعثت حضور علیہ السلام کی طرح عام تھی؟ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے اور یہودِ مدینہ بنی اسرائیل ہی تھے شام سے بھاگ کر مدینہ میں آباد ہو گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رسولِ بنی اسرائیل ہونا نصِ قرآن پاک سے ثابت ہے۔ اسلئے آپ نے یہودِ مدینہ کو جو دعوت پہنچانا چاہی اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کی بعثت عام تھی بلکہ یہ تھی کہ یہود بنی اسرائیل تھے

کسی چیز کا بنا ہوا ہو۔ خاتَم انگوٹھی کو کہتے ہیں۔ خیتام۔ خاتام۔ خاتم سب کے ایک ہی معنٰی ہیں۔

حدیثِ ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عورتوں کو وعظ و نصیحت کرنا، دین کی باتیں بتانا، آخرت کو یاد دلانا اور صدقہ و یرات کی ترغیب دینا مستحب ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وعظ و موعوظ (سامعین) کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں ی پردہ وغیرہ کا انتظام ہو اور وہاں کسی غیر شرعی فعل کے رونما ہونے کا خدشہ نہ ہو ۲۔ نفلی صدقہ کے لیے ایجاب و قبول ضرورت نہیں ہے۔ ۳۔ صدقاتِ نافلہ کا مصرف امام کی رائے ہے جہاں وہ مناسب خیال کرے خرچ کرے ۴۔ اس یثِ صحیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو اپنے ذاتی مال میں سے شوہر کی اجازت کے بغیر صدقہ و خیرات کرنا جائز ہے لیکن سائی و ابنِ ماجہ کی حدیث میں ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت کو اپنے شوہر کی بلا اجازت صدقہ دینا جائز یں تو اس کا جواب یہ ہے اوّل تو یہ حدیث ثابت نہیں۔ ثانیاً۔ احادیثِ صحیحہ کے مقابل اس کی وہ حیثیت نہیں ثالثاً۔ اگر س حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ شوہر سے اجازت لے کر صدقہ و خیرات کرے یعنی شوہر سے اجازت لینا بیوی کے لیے اولیٰ و الیق ہے فرض یا واجب نہیں ہے رابعاً۔ یہ کہ حدیث داؤد کا تعلق صرف مالِ زوج سے ہے۔ یعنی مطلبِ حدیث یہ ہو کہ بیوی کو شوہر کے ذاتی مال سے اس کی اجازت بغیر صدقہ و خیرات کرنا حلال نہیں ہے تو اس توجیہ پر دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ فافہم

بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ حدیثِ مذکورہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاوند کی ملک میں بلا اجازت تصرف کرنا نہیں کیونکہ عورت کا اپنی ملک میں بلا اجازت تصرف کرنا اور اس کا جائز ہونا تو قرآنِ پاک کی مندرجہ ذیل نصوص سے ت ہے:۔

۱۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ ۲۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ يْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا

بَابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيْثِ

باب حدیث سننے پر حرص کرنے کے بیان میں

۹۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ يَا سُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ تُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ اَنْ لَّا يَسْئَلَنِیْ عَنْ الْحَدِيْثِ اَحَدٌ اَوَّلُ مِنْكَ لِمَا رَاَيْتُ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيْثِ اَسْعَدُ النَّاسِ عَتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قیامت کے روز کون شخص آپ کی شفاعت سے سعادتمند ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوہریرہ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے اس بات کو تجھ سے پہلے کوئی نہ پوچھے گا کیونکہ میں دیکھ چکا ہوں تیری حرص کو حدیث سننے پر۔ قیامت کے دن میری شفاعت سے وہ سعادتمند ہوگا جس نے صدقِ دل کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (راوی کو شک ہے) کہ

اِلَّا اللّٰہُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِہٖ اَوْ نَفْسِہٖ | لفظ قلب ارشاد فرمایا یا نفس کا

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے باب صفۃ الجنۃ میں اور نسائی نے علم میں ذکر کیا ہے ۲۔ سعادۃ اور شقاوت کی ضد ہے۔ جیسے عرب بولتے ہیں۔ سعد الرجل (فھو سعید) یا تو بمعنی سعید ہے یا اسعد کو اپنے حقیقی معنیٰ پر رکھا جائے تو اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ ورع و تقویٰ کے لحاظ سے شفاعت سے مشرف ہونے والوں کے لیے درجے ہوں گے اور مومن مخلص کی سعادت ہوگی ۳۔ علامہ حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے حدیث ہٰذا کی شرح میں لکھا ہے کہ کثیر افراد شفاعت سے سعادتمند ہوں گے لیکن مومن مخلص اسعد الناس ہوگا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مختلف امور پر مشتمل ہوگی۔ یعنی

۱۔ آپ قیامت کے دن کی شدت و تکلیف سے نجات دلانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۲۔ بعض مومن جہنم سے نکالے جانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۳۔ بعض کو جہنم سے بچانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۴۔ بعض جنت میں بلاحساب و کتاب داخل ہونے کے لیے شفاعت فرمائیں گے ۵۔ بعض کے لیے جنت میں درجوں کی بلندی کے فرمائیں گے ۶۔ حتیٰ کہ بعض کافروں کے لیے تخفیفِ عذاب کے لیے بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں گے۔ جیسا کہ ابو طالب میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ (ترجمہ من وعن از فتح الباری العلامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ)

حدیث ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ سے دینی معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتے تھے اور عام صحابہ کرام بھی حدیث نبویہ کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا دینی تھے کیونکہ ان کے نزدیک دین کا ماخذ و منبع کتاب و سنت ہی تھا۔ ۲۔ شفاعت حق ہے حضور علیہ السلام کو اذنِ شفاعت چکا ہے ۳۔ شفاعت صرف ان افراد کی ہوگی جو مومن ہوں گے خواہ کیسے ہی گنہگار کیوں نہ ہوں۔ کافر و مشرک کے نہیں ہے ۴۔ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مسئلہ شفاعت حق ہے عقلاً و وجوباً —— اور اس باب احادیث آئی ہیں وہ مجموعی طور پر تواتر کو پہنچ جاتی ہیں اور سلف نے اس پر اجماع کیا ہے اور مذہب اہلسنت میں شفاعت حق ہے۔ البتہ خوارج اور بعض معتزلہ شفاعت کے منکر ہیں (عینی ج ۱ ص ۵۲۵)

بَابُ كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ

باب علم دین کے اٹھ جانے کے بیان میں

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِلٰى اَبِيْ بَكْرِ
بْنِ حَزْمٍ اُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيْثِ رَسُوْلِ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاكْتُبْهُ فَاِنِّيْ
خِفْتُ دُرُوْسَ الْعِلْمِ وَذِهَابَ الْعُلَمَاۗءِ
وَلَا تَقْبَلْ اِلَّا حَدِيْثَ النَّبِيِّ وَلْيُفْشُوا
الْعِلْمَ وَلْيَجْلِسُوْا حَتّٰى يُعَلَّمَ فَاِنَّ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابی بکر ابن حزم
حدیث نبوی تم پاؤ اس کو لکھو۔ کیونکہ مجھے
کہیں علم مٹ نہ جائے اور عالم دین وفات
حدیث نبوی کے سوا کسی کی بات قبول نہ کرو
نبوی کی اشاعت کرو اور علم کی تبلیغ کرو اور
لیے مجالس قائم کرو۔ علم نہیں اٹھتا جب تک

العِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتّٰى يَكُوْنَ سِرًّا

(بخاری)

نہیں جاتا (یعنی جب علمِ دین کی تبلیغ و اشاعت نہ کی جائے اور اس کو سینہ میں بند رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ علم کی ہلاکت ہے۔

فوائد و مسائل ۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا شمار خلفائے راشدین میں کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کی خلافت و حکومت، آپ کا ورع و تقویٰ، دیانت اور عدالت عہد خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی نظیر تھا۔ آپ نے حضرت ابوبکر بن حزم جو آپ کی طرف سے مدینہ منورہ میں حاکم و قاضی تھے ان کو حکم دیا تھا کہ احادیث نبویہ کو جمع کریں اور کتابی شکل میں لے آئیں ۲۔ مقدمہ میں ہم تفصیل کے ساتھ حدیث کی جمع و تدوین پر بحث کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ حدیث کی جمع و تدوین اور کتابت کا کام حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کے بعد ہر دور میں صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے علمِ حدیث کی حفاظت کی ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی سعی کرتے رہے ہیں۔

۹۹۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا

عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اللہ تعالیٰ علمِ دین کو یکدم نہیں اٹھائے گا۔ لیکن علمِ دین کا اٹھنا وفاتِ علماءِ دین کی وجہ سے ہوگا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالمِ دین نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے۔ پس ان سے مسائل پوچھے جائیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل ۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الاعتصام میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے قدر میں، ترمذی نے علم میں اور ابن ماجہ نے سنن میں اور نسائی نے علم میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علمِ دین کو اس طرح نہیں اٹھائیگا کہ لوگوں کے دل سے وہ محو ہو جائے یا آسمان پر یکدم اٹھا لیا جائے بلکہ علمِ دین کے اٹھنے کی صورت یہ ہوگی کہ علمِ دین کے حامل علماء انتقال کر جائیں گے ۳۔ بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی جب جاہلوں کو مفتی بنا لیا جائیگا تو پھر وہ اپنی ذاتی رائے سے فتویٰ دیں گے ۴۔ معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی مجتہد نہ رہے جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے ۵۔ جاہلوں کو امام و مفتی بنانا حرام ہے ۶۔ علمِ دین کے حفظ و بقا و اشاعت و تبلیغ کے لیے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے ۷۔ فتویٰ ہی حقیقی ریاست ہے ۸۔ علم کے بغیر فتویٰ دینا نہایت مذموم فعل ہے۔

اس حدیث میں عنوان کے متعلق لٰکِن یَقبِضُ العلم کا جملہ ہے۔

بَابٌ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمٌ عَلٰى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ

باب کیا عورتوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ دن مقرر کیا جا سکتا ہے؟

۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲۔ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ عورتوں نے

قَالَتِ النِّسَآءُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِّنْ نَّفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيْهِ فَوَعَظَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ فَكَانَ فِيْمَا قَالَ لَهُنَّ مَا مِنْكُنَّ امْرَاَةٌ تُقَدِّمُ ثَلٰثَةً مِّنْ وَّلَدِهَا اِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ وَاثْنَيْنِ فَقَالَ وَاثْنَيْنِ۔

(بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ ۔ مرد ہم پر غالب آ گئے تو آپ اپنی طرف سے لیے ایک دن مقرر کر دیجئے۔ حضور علیہ السلام نے وعدہ فرمایا اور اس دن عورتوں کے پاس تشریف ان کو وعظ کیا اور احکام دیئے تو اسی وعظ میں فرمایا تم میں جس عورت نے تین بچے آگے بھیجے (نابالغ بچے اس کے وفات پا گئے) تو یہ اس کے سے حجاب بن جائیں گے۔ ایک عورت نے عرض کی جس کے دو بچے فوت ہوئے آپ نے فرمایا۔ دو کا بھی

فوائد و مسائل

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو جائز اعلم الاعتصام میں بھی ذکر کیا اور امام مسلم نے ادب میں اور نسائی نے کتاب العلم میں درج کیا ۲۔ حدیث حسب ذیل مسائل پر مشتمل

۱۔ عورتوں کا دینی معلومات حاصل کرنے اور شریعت کے ضروری مسائل پوچھنے کے لیے مردوں سے گفتگو عالم دین کا جواب دینا اور عورتوں کی مجلس میں وعظ کرنا جائز ہے لیکن یہ ضروری بات ہے کہ پردہ کا مکمل ۲۔ وعظ و نصیحت کے لیے دن مقرر کرنا جائز ہے ۳۔ صحابہ کرام کی مستورات وعظ سننے اور دین کی باتوں کا علم کی شوقین تھیں ۴۔ مسلمانوں کے نابالغ بچے جنتی ہیں کیونکہ جب ان نابالغ بچوں کی وجہ سے ماں باپ جنت میں ہوں گے تو بچوں کا جنتی ہونا بالکل ظاہر ہے ___ ۵۔ علامہ مازری فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کے نابالغ بچے جو پا گئے ان کے جنتی ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

۶۔ حدیث ہذا کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ جس عورت کے تین یا دو بچے ہونے سے پہلے مر گئے تو وہ بچے لیے جہنم سے حجاب بن جائیں گے۔ حجاب بن جانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول، یہ کہ وہ بچے اپنے ماں شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور دوسری صورت یہ ہے موت پر والدین صبر و شکر سے کام لیں تو والدین کا صبر و شکر کرنا ان کی مغفرت اور دخولِ جنت کا باعث ہوگا جیسا کہ میں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے انصاری عورتو تم میں سے جس کے تین بچے وفات پا گئے اور اس نے صبر کیا تو

بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاجَعَهُ حَتّٰى يَعْرِفَهُ

باب ۔ کوئی مسئلہ سنا سمجھ میں نہ آیا تو اس کو سمجھنے کے لیے دوبارہ پوچھنا

۱۰۳۔ اِنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ اِلَّا رَاجَعَتْ فِيْهِ حَتّٰى تَعْرِفَهُ

حضرت عائشہ صدیقہ حضور علیہ السلام کی زوجہ یہ حال تھا کہ جب حضور علیہ السلام سے کوئی بات نہ سمجھتیں تو خوب سمجھنے تک اس کو دوبارہ پوچھتیں

نَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
نْ حُوْسِبَ عُذِّبَ قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ
لَيْسَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى فَسَوْفَ يُحَاسَبُ
حِسَابًا يَّسِيْرًا قَالَتْ فَقَالَ اِنَّمَا ذٰلِكَ
رْضُ وَلٰكِنْ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ
لِكُ

(بخاری)

دن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص سے حساب ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔ اس پر حضرت عائشہ نے عرض کی۔ کیا اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ پھر قریب ہے کہ وہ حساب کیا جائے آسانی سے آپ نے فرمایا۔ اس آیت میں جس حساب کا ذکر ہے۔ اس سے (ترازو) کے سامنے لایا جانا مراد ہے اور جس سے مناقشہ ہوگا۔ وہ ہلاک ہوگا۔

ئدو مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے تفسیر و رقاق میں بھی ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے بھی کتاب التفسیر میں ذکر کیا ہے ۲۔ نوقش۔ مناقشہ کے معنیٰ پورا پورا حساب لینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان طا و نسیان سے مرکب ہے۔ بحضور رب العالمین پورا پورا حساب دینے کی کس میں طاقت ہے۔ اس لیے حضور سید عالم صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے قیامت کے دن مناقشہ ہوگا وہ ہلاک ہوگا۔ اس پر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض ی حضور قرآن پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا۔ جس کا نامۂ اعمال داہنے تھ میں دیا جائے گا۔ اس سے حساب آسان ہوگا۔ یعنی اس کو عذاب نہ ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ میرا شاد قرآن پاک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آیت میں حساب سے مراد صرف عرضِ اعمال ہے یعنی داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال ے جانے والوں سے سہل حساب لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ان کے اعمال پیش کردیے جائیں گے۔ وہ اپنی طاعت ور اپنی بدیوں کو پہچانیں گے۔ پھر طاعت پر انہیں ثواب دیا جائیگا اور معصیت سے تجاوز کیا جائیگا۔ یہ ہے سہل حساب۔ ں میں نہ شدت مناقشہ ہوگا۔ نہ یہ کہا جائیگا کہ ایسا کیوں کیا اور نہ عذر کی طلب ہوگی اور نہ اس پر حجت قائم کی جائے گی لیکن س سے مناقشہ ہوگا اور یہ پوچھا جائیگا کہ یہ کام کیوں کیا؟ تو اسے کوئی عذر ہاتھ نہ آئے گا اور نہ وہ کوئی حجت پائیگا۔ اس لیے ک ہوگا (اللہ تعالیٰ ہمیں مناقشہ سے پناہ دے)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے بعض نمازوں میں حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ا کرتے سنا ہے:۔

هُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا قُلْتُ
نَبِيَّ اللّٰهِ مَا الْحِسَابُ الْيَسِيْرُ قَالَ
يُّنْظَرَ فِيْ كِتَابِهٖ فَيُتَجَاوَزَ عَنْهُ
هٗ مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ يَوْمَئِذٍ يَا
شَةُ هَلَكَ (مسند احمد بن حنبل)

اے اللہ! میرا حساب آسان فرمایا: میں نے عرض کیا۔ یا نبی اللہ! آسان حساب کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا" آسان حساب یہ ہے کہ بندہ کے اعمال پر نظر ڈالی جائے اور اس سے درگزر کی جائے (یعنی کوئی پوچھ گچھ اور جرح نہ کی جائے) بات یہ ہے کہ جس کے حساب میں اس جرح کی جائیگی اے عائشہ (اس کی خیر نہیں) وہ ہلاک ہو جائے گا۔

واضح ہو کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسان حساب کیے جانے کی دعا فرمانا تعلیم اُمّت کے لیے تھا
بات ہے کہ حضور علیہ السلام مرحوم ومغفور ومعصوم ہیں۔ شفیع المذنبین ہیں۔ آپ کی شفاعت اور آپ کے وسیلے
کی نجات ہوگی ۲۔ اس حدیث سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے یا بظاہر اس میں تضاد
ہو تو دوبارہ پوچھ کر سمجھ لینا چاہیے اور عالم کو چاہیے کہ دوبارہ سوال کرنے والے کو بھی جواب دے تاکہ وہ مسئلہ
سمجھ جائے اور وہ احادیث جن میں سوال کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت
کٹ حجتی کے لیے سوال کرنا منع ہے۔

اس حدیث سے سیدہ عفیفہ، طیبہ، طاہرہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے
کے حصول کی کوشش فرماتی تھیں۔ مسائل شرعیہ کے سمجھنے پر حریص تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ احکام شرعیہ کا ایک چو
سے منقول ہے اور آپ کی فقاہت واعلمیت کا جلیل القدر صحابہ کرام نے اعتراف کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض
گے جن سے پورا پورا حساب لیا جائیگا اور بعض وہ ہوں گے جن پر صرف ان کے اعمال پیش کردیے جائیں گے
کوئی پوچھ اور جرح نہ کی جائے گی۔

بَابٌ لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

باب کہ جو حاضر ہو غائب کو علم دین کی بات پہنچا دے

اس باب میں امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس کے ابتدائی جملوں کا ترجمہ یہ ہے کہ ابو شریح
بن صخر خزاعی کعبی مشہور صحابی نے عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ قرشی اموی سے کہا۔ جب کہ وہ مکہ معظمہ کی طرف
رہا تھا (یہ واقعہ ۶۱ھ کا ہے) اے امیر مجھے اجازت دے تاکہ میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو حضور اکرم صلی اللہ
فتح مکہ کے دوسرے روز (یعنی ۲۰ رمضان ۸ ہجری میں) ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کو میں نے اپنے کانوں سے
میری دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد وثنائے الٰہی کے بعد فرمایا:۔

۱۰۴۔ لَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ
لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
اَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَّلَا يَعْضِدُ بِهَا
شَجَرَةً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ
رَسُوْلِ اللّٰهِ فِيْهَا فَقُوْلُوْا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ
اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ وَلَمْ يَاْذَنْ لَكُمْ وَاِنَّمَا
اَذِنَ لِيْ فِيْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ
حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ
الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِيْلَ لِاَبِيْ شُرَيْحٍ مَا

مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا۔ لوگوں نے نہیں
مسلمان کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے
نہیں ہے کہ مکہ میں خون بہائے اور وہاں کے
پھر اگر کوئی شخص مکہ میں لڑائی کے جواز کی یہ دلیل
وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی
کا جواب یوں دو کہ اللہ تعالیٰ نے خاص
کو اجازت دی تھی تم کو نہیں دی اور مجھے بھی جو
اجازت ملی تھی وہ ایک ساعت دن کے لیے
کے بعد اس کی حرمت آج کے دن ایسی ہی

عَمْرٌو وَقَالَ اَنَا اَعْلَمُ مِنْكَ يَا اَبَا
ـرَيْحٍ لَا تُعِيْذُ عَاصِيًا وَّلَا فَارًّا
ـمٍ وَّلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ (بخاری)

کل بھی چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو یہ حکم پہنچا دے۔ حضرت ابو شریح سے پوچھا گیا کہ یہ حدیث سن کر عمرو بن سعید نے کیا جواب دیا تو حضرت ابو شریح نے کہا۔ یہ جواب
ـے ابو شریح اس بات کو میں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں مگر یہ گنہگار کو اور نہ اس کو جو خون یا چوری کر کے بھاگے
ـہیں دیتا۔

ـدو مسائل

۱۔ امام نے اس حدیث کو حج و مغازی میں۔ امام مسلم نے حج میں اور ترمذی نے حج و دیات میں اور نسائی نے حج اور علم میں ذکر کیا ہے۔ ۲۔ حضرت ابو شریح صحابی ہیں ۳۔ عمرو بن سعید کا لقب اشدق ہے۔ یہ یزید
ـر تھا۔ علامہ عینی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے۔ یہ تابعین باحسان میں سے نہ تھا اور اس کے باپ کے صحابی ہونے میں بھی
ـف ہے ۴۔ حضرت معاویہ کی وفات کے بعد جب یزید پلید تخت پر بیٹھا تو اس نے سیدنا امام حسین اور حضرت عبداللہ
ـبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیعت لینا چاہی۔ ان دونوں حضرات نے بیعت سے انکار کر دیا حضرت عبداللہ بن زبیر حرم مکہ
ـں پناہ گزین ہو گئے۔ یزید نے گورنر مدینہ عمرو بن سعید کو مکہ پر فوج کشی کا حکم دیا۔ جب عمرو بن سعید مکہ کی طرف لشکر بھیج رہا تھا۔
ـس وقت حضرت ابو شریح صحابی نے گورنر مدینہ کو حدیث بالا سنا کر یہ بتایا تھا کہ مکہ حرم ہے اور وہاں لڑائی کرنا منع ہے حضرت
ـللہ بن زبیر نے نہ کسی کا خون کیا ہے اور نہ چوری کی ہے۔ لہٰذا خدا سے ڈرو اور یزید کا ساتھ نہ دے۔ عمرو بن سعید نے اس کا
ـب یہ دیا کہ یہ بات مجھے بھی معلوم ہے لیکن مکہ مجرم کو پناہ نہیں دیتا۔ اس جواب سے اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ عبداللہ بن زبیر نے
ـت سے انکار کیا ہے اس لیے وہ باغی ہیں اور باغی کو مکہ میں پناہ نہیں مل سکتی۔ لیکن سعید کا یہ جواب دراصل غلط تھا حضرت
ـللہ بن زبیر بے قصور تھے اور یزید سے ہزار درجہ افضل تھے۔ صحابی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔
ـت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نواسے تھے۔ پھر دیندار اور نہایت ہی پرہیزگار تھے۔ علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حضرت
ـللہ بن زبیر، یزید پلید سے خلافت کے زیادہ مستحق تھے۔ کیونکہ آپ سے پہلے بیعت ہو چکی تھی اور یزید سے بعد میں ہوئی
ـعنوان سے متعلق حدیث کا صرف یہ جملہ ہے۔ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ کہ حاضر غائب کو یہ حدیث پہنچائیں۔
ـر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم دین سے متعلق جو ہدایات اپنے قول و عمل سے دیتے تھے تو اس کے متعلق یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ
ـن کی تبلیغ کی جائے۔ چنانچہ صحابہ کرام اس حکم کی تعمیل میں ہدایات نبویہ کی اشاعت و تبلیغ کو اپنی زندگی کا اہم فرض سمجھتے تھے۔

۱۔ عَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ ذُكِرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ
ـلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَكُمْ
ـوَالَكُمْ قَالَ مُحَمَّدٌ وَّ اَحْسِبُهُ
ـالَ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ
ـمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا اَلَا لِيُبَلِّغِ
ـاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ وَكَانَ مُحَمَّدٌ

حضرت ابو بکرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا اور کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تمہارے خون اور تمہارے مال (ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا) کہ تمہاری عزتیں و آبروئیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ جیسے اس دن کی (یوم النحر) کی حرمت ہے۔ اس مہینہ میں سن رکھو۔ جو شخص حاضر ہے وہ غائب کو یہ بات

يَقُوْلُ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ ذٰلِكَ، اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ مَرَّتَيْنِ (بخاری)

پہنچا دے۔ ابن سیرین (محمد) کہتے ہیں کہ حضور اکرم علیہ وسلم کا فرمانا سچ ہوا۔ جو لوگ اس وقت موجود نے یہ حدیث دوسروں تک پہنچا دی۔ حضور علیہ یہ بھی فرمایا کہ خبردار میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا ہے۔ دو مرتبہ فرمایا۔

مسائل حدیث

یہ دونوں حدیثیں دراصل قرآن کی ان آیات سے مستفاد ہیں۔ جن میں مکہ کی حرمت ا بیان ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بحضور رب العالمین عرض کی تھی۔ رَبِّ اجْعَلْ بَلَدًا اٰمِنًا۔ اے پروردگار! اس شہر کو امن والا کر دے۔ اللہ عزوجل نے اعلان فرمایا۔ اِنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا "ہم نے حرمِ مکہ کو امن والا کر دیا۔" وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا "جو حرم میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آیات کی توضیح و تبیین فرمائی اور حرم کے احکام و مسائل بیان فرمائے۔ مکہ معظمہ کے ارد گرد تک حرم کا جنگل تھا۔ ہر طرف اس کی حدیں بنی ہوئی ہیں۔ ان حدوں کے اندر تر گھاس اکھیڑنا، خود رو پیڑ کا کا کے وحشی جانور کو تکلیف دینا حرام ہے۔ حتیٰ کہ اگر سخت دھوپ ہو اور ایک ہی درخت ہے۔ اس کے سایہ میں ہے تو جائز نہیں کہ اپنے بیٹھنے کے لیے اسے اٹھا دے۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ نے حدیث کے الفاظ یسفك بہ سے یہ استدلال فرمایا کہ جو شخص حرم میں پناہ گزین ہو جائے اس کو قتل نہ کیا جائے۔

بَابُ اِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کے گناہ کے بیان میں

۱۰۹- سَمِعْتُ رِبْعِيَّ بْنَ حِرَاشٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُوْلُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكْذِبُوْا عَلَيَّ فَاِنَّهٗ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ (بخاری)

ربعی بن حراش کہتے ہیں میں نے حضرت علی کر وجہہ الکریم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلی نے فرمایا۔ مجھ پر جھوٹ مت باندھو کیونکہ جو مجھ پر باندھے چاہئے کہ وہ جہنم میں جائے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام مسلم علیہ الرحمۃ نے مقدمہ کتاب میں، ترمذی نے علم اور مناقب میں نے سنت میں ذکر کیا ہے۔

حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنا سخت گناہ ہے

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ حاضر غا دین کی بات پہنچا دے۔ اب اس باب میں ان ذکر ہے جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت نہ کی جا نہیں فرمائی۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا گناہ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔ ۲- کذب کی ضد ہے۔ جو بات واقع کے مطابق ہو وہ صدق ہے اور جو بات واقع کے خلاف ہو وہ کذب ہے — لا ت یہ نہی کا صیغہ ہے اور ہر قسم کے کذب کو عام ہے۔ ویسے تو ہر شخص پر جھوٹ باندھنا حرام ہے۔ لیکن اس حدیث

فرمایا کہ "میرے اوپر جھوٹ باندھنا" جس سے یہ واضح ہوا کہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنے کا گناہ غیر پر جھوٹ باندھنے کے گناہ سے اشد ہے کیونکہ جو بات حضور کی طرف جھوٹ منسوب کردی جائے گی وہ دین اور شریعت بن جائے گی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا خدا پر جھوٹ باندھنا ہوگا ۲۔ فلیلج النار۔ اس کا ترجمہ یہ ہے "چاہیئے کہ وہ جہنم میں جائے" یہ جواب الشرط ہے۔ اسی لیے یہاں ف موجود ہے۔ اگرچہ یہ امر کا صیغہ ہے لیکن مراد اس سے خبر ہے یعنی مفہوم یہ ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ جہنم میں جائیگا اور بعض شارحین نے اس کو بددعا کا جملہ قرار دیا ہے۔ بہرحال حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہیں فرمائی اشد کبائر سے ہے اور اگر توبہ کیے بغیر مرے گا تو جہنم میں جائے گا۔ علامہ عینی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ ترہیب و ترغیب کے لیے بھی حدیث وضع کرنا اکثر کبائر سے ہے۔ اسی طرح جس حدیث کا موضوع ہونا ثابت ہے اس کو صحیح قرار دینا اور اس سے استدلال کرنا بھی حرام ہے اور ایسا شخص اس وعید میں داخل ہے۔

حضرت ربعی بن حراش

اس حدیث کے راویوں میں ربعی اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم قابلِ ذکر ہیں۔ ربعی بن حراش بڑے عابد و زاہد، متقی و پرہیزگار شخص تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ان کے دو لڑکے تھے جن پر حجاج ناراض تھا اور ان کے قتل کا حکم دیا تھا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے گھر میں چھپ گئے تھے۔ حجاج سے کہا گیا کہ ان کے باپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ربعی سے پوچھا جائے تیرے دونوں لڑکے کہاں ہیں تو فوراً صحیح صحیح بتا دیں گے۔ چنانچہ جب ربعی سے پوچھا گیا تو جواب دیا۔ میرے دونوں لڑکے گھر میں ہیں۔ حجاج نے جب ان کی یہ صداقت دیکھی تو معاف کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ ربعی نے قسم کھائی تھی۔ جب تک میرا جنتی یا دوزخی ہونا معلوم نہ ہو جائے ہرگز نہیں ہنسوں گا۔ چنانچہ وہ عمر بھر نہیں ہنسے۔ حتیٰ کہ جب ان کا حضرت عمر بن عبد العزیز کے خلافت (سنہ ۱۰۱ھ یا سنہ ۱۰۴ھ) میں انتقال ہوا تو غاسل نے بتایا کہ ان کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم جلیل القدر صحابی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ چہارم ہیں۔ نہایت عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے اور ہر کمال و خوبی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ بچوں میں سب سے پہلے آپ اسلام لائے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں اُترنے کا آپ کو شرف حاصل ہے۔ آپ کی کنیت ابو الحسن ہے۔ حضور علیہ السلام نے آپ کی کنیت ابو تراب رکھی اور فرمایا تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ بنی ہاشم کے پہلے خلیفہ ہیں۔ آپ عشرہ مبشرہ اور ان چھ اہل الرائے اصحاب میں سے ہیں جن سے حضور علیہ السلام راضی تھے۔ مشاہد میں تبوک کے سوا حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے۔ جنگِ اُحد میں آپ کے ۱۲ زخم آئے۔ خیبر میں لڑائی کے وقت فوجی جھنڈا حضور علیہ السلام نے آپ کو عطا کیا اور فرمایا "ان کے ہاتھ خیبر فتح ہوگا"۔ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد آپ خلیفہ ہوئے۔ پانچ برس خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۶۳ سال کی عمر ہوئی۔ کوفہ کی جامع مسجد میں اتوار کی رات ۱۹ رمضان سنہ ۴۰ھ میں شقی ازلی ابن ملجم کی زہر آلود تلوار سے آپ نے شہادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ آپ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کل ۵۸۶ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ۲۰ پر بخاری و مسلم نے اتفاق

کیا اور ۹ کو بخاری نے اور ۱۵ کو مسلم نے انفراداً ذکر کیا۔

۱۰۷- عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ إِنِّيْ لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ فُلَانٌ قَالَ أَمَا إِنِّيْ لَمْ أُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

(بخاری)

عامر ابن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے روایت کر ہیں کہ انھوں نے حضرت زبیر بن عوام سے کہا کہ میں تم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں سنا کرتا جیسے فلاں فلاں حدیث بیان کرتے ہیں۔ اس کے جواب حضرت زبیر بن عوام نے فرمایا کہ میں حضور علیہ السلام سے جدا تو نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے ہے کہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا

فوائد و مسائل

اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں اور نسائی و ابوداود نے کتاب العلم میں ذکر کیا ۲۔ حضرت زبیر نے اپنے توقف کی وجہ یہ بتائی کہ حضور اکرم نے فرمایا ہے کہ مجھ پر جھوٹ باندھنے والا اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے۔ اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ میں صرف وہی حدیثیں بیان کرتا ہوں جو مجھے یاد رہتی ہیں اور جن کے متعلق وثوق ہوتا ہے۔ رہے وہ صحابی جو مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرتے ہیں تو وہ مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد رکھ سکتے ہیں۔ اس وہ زیادہ حدیثیں بیان کر دیتے ہیں ——— حدیث ہذا میں عبداللہ بن زبیر اور حضرت زبیر قابل ذکر ہیں

حضرت عبداللہ بن زبیر

ان کی کنیت ابو خبیب ہے۔ صحابی ابن صحابی ہیں اور امیر المومنین ہیں۔ یہ مدینہ میں سب سے پہلے اسلام میں پیدا ہونے والے ہیں ان کی والدہ کا نام اسماء حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ قبا میں جب پیدا ہوئے تو حضور علیہ السلام کی گود میں ان کو والد کھجور چبا کر ان کو کھلائی۔ اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا اور تحنیک کی اور دعا دی گویا سب سے پہلے جو غذا ان کو ملی علیہ السلام کا لعاب مبارک تھا۔ آپ اطلس تھے۔ ڈاڑھی نہ تھی۔ آپ قائم اللیل اور صائم الدہر تھے۔ رات کو نفل کے ہوتے تو صبح کر دیتے۔ یزید کے مرنے کے بعد سنہ ۶۴ھ میں اہل عراق یمن اور اہل حجاز نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے کعبہ کی تجدید کی اور اس کے دو دروازے بنا دیئے۔ ۹ حج کئے اور خلافت کے امور انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ حجا مکہ کا محاصرہ کیا (ماہ ذی الحجہ ۷۳ھ میں) اور یہ محاصرہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ آپ کے ایک پتھر لگا اور اس سے آپ شہید ہو گئے کے جسم مبارک کو سولی پر چڑھایا گیا اور سر مبارک خراسان میں لے جایا گیا۔ آپ سے ۳۳ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے امام چھ حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔

حضرت زبیر بن عوام

آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مہاجر ہیں۔ حواری نبی ہیں۔ یہ اسلام لانے میں چوتھے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام صفیہ بنت عبدالمطلب ہے جو حضور علیہ السلام کی پھوپھی تھیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ۱۶ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ تمام مشاہد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رہے۔ آپ سے ۳۸ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو پر بخاری و مسلم نے اتفاق کیا اور سات حدیثیں بخاری نے منفر

ہیں - جمل کی لڑائی سے آپ علیحدہ ہو گئے تھے تو ایک جماعت نے آپ کو وادی السباع میں ۳۶ھ میں شہید کر دیا۔ آپ وادی السباع میں جو بصرہ کے قریب ہے وہیں دفن ہوئے لیکن بعد میں آپ کو بصرہ میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۰۸- قَالَ اَنَسٌ اِنَّهٗ لَيَمْنَعُنِيْٓ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

حضرت انس نے فرمایا کہ مجھے زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ باندھا تو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

فوائد ومسائل

امام مسلم نے اس حدیث کو زہیر سے روایت کیا اور نسائی نے کتاب العلم میں ذکر کیا۔ زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنے کی وجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بتائی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھ پر قصداً جھوٹ باندھنے والا جہنمی ہے گویا وہ یہ بتا رہے ہیں کہ حدیث رسول کے بیان کرنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور صرف انہی حدیثوں کو بیان کرنا چاہئے جن کے متعلق سننے والے کو پورا پورا یقین ہو کہ یہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام احادیث نبویہ کی تبلیغ و بیان میں بہت احتیاط کرتے تھے اور ان باتوں کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے تھے۔ جن کے متعلق ان کو یقین ہوتا تھا کہ حضور علیہ السلام نے ایسا فرمایا ہے ۲- ۱۰۹ اس باب میں امام نے بالکل اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

۱۱۰- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسَمَّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ وَمَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے نام پر نام رکھو لیکن میری کنیت پر کنیت مت رکھو۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا۔ اس نے درحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

فوائد ومسائل

۱- امام نے اس حدیث کو ادب میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے مقدمہ کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

۲- لاتکتنوا، یہ باب تفعیل سے یا تفعل سے یا افتعال سے ہے۔ کنایہ کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کا ذکر کیا جائے اور مراد اس کا غیر ہو ۳- اسم علم، اگر مدح و ذم کا اظہار کرے تو اس کو لقب سے موسوم کرتے ہیں اور اگر مدح و ذم کا اظہار نہ کرے بلکہ اس سے ماں یا باپ کا ہونا ظاہر ہو تو اس کو کنیت کہتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اس کو اسم کہتے ہیں مثلاً حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک مُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور کنیت ابوالقاسم ہے اور لقب تو آپ کے بہت ہیں۔ مثلاً سید المرسلین، امام النبیین وغیرہ وغیرہ۔

اس حدیث میں چار امور بیان ہوئے ہیں۔ اول، حضور علیہ السلام کے نام پر نام رکھنا۔ دوم، حضور علیہ السلام کی کنیت پر کنیت نہ رکھنا۔ سوم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا۔ چہارم، آپ پر جھوٹ نہ باندھنا۔

حضور علیہ السلام کے نام پر نام رکھنا جائز ہے

اوّل و دوم - اہل ظاہر نے اس حدیث سے یہ استد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت کو اختیار کرنا مطلق خواہ بیٹے کا نام محمد و احمد رکھا ہو یا نہ رکھا ہو - امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے ۲- قاضی عیاض نے فرمایا کہ بعض کہا کہ بیٹے کا نام قاسم رکھنا منع ہے کیونکہ جب بیٹے کا نام قاسم ہوگا تو یہ بات سبب بنے گی ابوالقاسم کنیت رکھنے حضور علیہ السلام نے انما انا قاسم فرما کر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابوالقاسم کنیت میرے ساتھ خاص ۳- اہل علم کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جب بیٹے کا نام محمد و احمد نہ ہو تو کنیت ابوالقاسم رکھنا جائز ہے لیکن کا نام محمد اور احمد ہو تو کنیت ابوالقاسم رکھنا منع ہے ۴- لیکن جمہور سلف اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہی اب ہے یا یہ حکم حضور علیہ السلام کی حیاتِ ظاہری تک تھا اس کے بعد نہیں رہا - یہی وجہ ہے کہ سلف نے اپنے بچوں واحمد اور اپنی کنیت ابوالقاسم رکھی - دراصل حضور علیہ السلام نے اپنی کنیت رکھنے سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ ابوالقاسم کہہ کر پکارتے تو حضور علیہ السلام اس کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ جواب دیتے کہ ہم نے آپ کو نہیں بلایا ازراہِ شرارت ابوالقاسم کہہ کر پکارتے اور جب حضور جواب دیتے تو کہتے ہم نے آپ کو نہیں بلایا - اس لیے حضور صلی وسلم نے اپنے زمانہ مبارکہ میں مذکورہ بالا حکم دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری تک کے لیے تھا - اس کے حکم باقی نہ رہا - چنانچہ اس کی تائید حدیث ابوداؤد سے بھی ہوتی ہے - حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے عرض کی - حضور آپ کی وفات کے بعد میں اپنے بچوں کا نام محمد اور اپنی کنیت ابوالقاسم رکھ سکتا ہوں ؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وس فرمایا - "ہاں"-

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا

حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زی بڑی فضیلت کی بات ہے اور حق یہ ہے کہ خواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا - لہٰذا جس کو زیارتِ نبوی کا شرف حاصل ہو اس کو یقین کر کہ اس نے حضور علیہ السلام کی زیارت کی - یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے - ہم انشاءاللہ العزیز حدیث مذکورہ پر مکمل بحث اور اس میں علماء کے اقوال وغیرہ کی تفصیل آئندہ صفحات میں کریں گے یعنی کتاب الرؤیا میں -

چہارم - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا اور حدیثیں گھڑنا اور اس کو حضور علیہ السلام کی طرف منسو کیا کرنا ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اسی طرح حضور علیہ السلام کی خواب میں زیارت نہ ہو اور جھوٹ موٹ کہ د زیارت کی ہے یہ بھی اس وعید میں داخل ہے - امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر کسی راوی کا ایک مرتبہ بھی عمداً کذب ثا تو اس کی تمام روایتیں رد کر دی جائیں گی - بہرحال یہ وعید علماء و واعظین حضرات کو بھی یہ ہدایت کرتی ہے کہ وہ کے بیان کرنے میں کامل احتیاط سے کام لیں اور جو نپا تلا مضمون ہے اسی کو وعظ میں بیان کریں اور اپنی طرف سے حدیث لفظ کی کمی یا زیادتی نہ کریں - البتہ وعظ میں یا پڑھاتے وقت اصل حدیث کو پیش کرکے اس کی تشریح و توضیح کی حدیث سے استدلال اور استنباط کرنا اور اس کے مسائل و معارف و نکات کو بیان کرنا جائز ہے بلکہ محمود و مطلوب

فائدہ امام بخاری نے اس باب میں جس ترتیب سے حدیثیں ذکر کی ہیں وہ بہت خوب ہے۔ پہلے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی روایت کو پیش کیا ہے جس میں باب کا مقصد ہے۔ پھر حضرت زبیر کی حدیث ذکر کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے ڈرتے تھے۔ پھر حضرت انس کی حدیث ـرتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حدیث کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس حدیث کو بیان کرنے سے پرہیز کرتے تھے جس میں ان کو شک ہوتا تھا۔ آخر میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ذکر کی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام پر جھوٹ باندھنا ہر طرح حرام ہے خواہ بیداری میں آپ سے ملنے کا دعویٰ کرے یا خواب میں۔

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

باب علم کی کتابت کے بیان میں

گزشتہ باب میں اس امر کا بیان تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔ اب اس بیان میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ احادیثِ نبویہ کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی ہر طرح سے حفاظت کرنا قومِ مسلم کا فریضۂ حیات ہے خواہ علمِ دین کو حفظ یاد رکھ کر اس فریضہ کو ادا کیا جائے یا کتابت کی صورت ـے کر اس کی حفاظت کی جائے۔

اس باب میں امام بخاری نے جو حدیثیں درج کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کی کتابت جائز ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین دین سے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات خود حضور علیہ السلام بھی لکھوا دیا کرتے تھے۔ منکرینِ حدیث کہا کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت کر ـی تھی۔ بخاری کا یہ عنوان ہی ان کے دعویٰ کے باطل ہونے کی واضح دلیل ہے ——— منکرینِ سنت بخاری کی حدیث ـتکتبوا عنی کو لے کر یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنی حیات میں حدیثیں لکھنے سے منع کر دیا تھا لہٰذا حدیث کے حفظ وبقا کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہا اور موجودہ ذخیرہ حدیث جعلی اور وضعی ہے۔ ملّاں نے گھڑا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

کیا حضور علیہ السلام نے کتابتِ حدیث سے منع فرما دیا تھا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جب منکرینِ سنت کے نزدیک احادیث کا موجودہ ذخیرہ ہی ناقابلِ اعتبار ہے تو پھر حدیثِ بخاری سے استدلال کرنے کا ان کو کیا حق ہے؟ ثانیاً۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو بات قیدِ کتابت میں نہ آئے اس کے باقی رہنے کی کوئی سبیل ہی نہ رہے۔ ثالثاً، کتابت کی ممانعت، حفظ یاد رکھنے، حدیث کی تبلیغ کرنے اور اس کو زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی ممانعت کو کب مستلزم ہے۔ رابعاً، حضور علیہ السلام کے مذکورہ بالا ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے کتابتِ حدیث کی ممانعت فرما دی تھی یا کتابتِ حدیث سے اس لیے منع فرمایا تھا کہ حدیث دین نہیں ہے۔ اس ممانعت کا مقصود تو صرف اس قدر تھا کہ حدیث کو قرآنِ پاک کے ساتھ ملا کر ـت لکھو کیونکہ قرآن وحدیث کی عبارت کو ایک جگہ لکھنے سے التباس ہوگا۔ چنانچہ اسی حدیث کے آخری جملے یہ ہیں کہ وحدثوا

عنی مجھ سے حدیث سن کر بیان کرو۔ اس کی تبلیغ کرو اور مسند احمد بن حنبل میں بالکل واضح الفاظ موجود ہیں کہ۔

اکتبوا کتاب اللہ واخلصوا کتاب اللہ

(مسند احمد بن حنبل)

قرآنِ پاک کو لکھو۔ اور قرآن کو بالکل علیحدہ لکھو

یعنی متن قرآنِ پاک کے ساتھ کسی اور چیز کو مت لکھو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حدیث اور قرآن حکیم کو طور پر لکھنے سے منع فرمایا تھا مگر منکرینِ سنت نے انتہائی فریب کاری اور کج فہمی کے ساتھ حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کو مفہوم پہنادیا کہ حضور علیہ السلام نے تو حدیث لکھنے سے ہی منع کر دیا تھا۔ حالانکہ بخاری وصحاح کی احادیث سے ثابت ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے یہ حدیثیں لکھوائیں۔ اور صحابہ کی ایک جماعت حدیثیں لکھا کرتی تھی۔ اگر حضور علیہ السلام نے علی کتابتِ احادیث سے منع فرمادیا تھا تو پھر خود لکھوانے اور صحابہ کرام کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

چنانچہ حضرت عبد اللہ نے عرض کی یا رسول اللہ جو بات آپ سے سنوں اس کے لکھنے کی اجازت ہے۔ قال فاذن کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دیدی۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیثیں لکھنا شروع اس کا نام صادقہ رکھا تھا۔ اس مضمون کی ایک نہیں بیسیوں حدیثیں مل جاتی ہیں۔ جن میں صریح طور پر کتابتِ حدیث اجازت مذکور ہے مگر ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟

۱۱۱۔ عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِیٍّ
هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللّٰهِ
اَوْ فَهْمٌ اُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ اَوْ مَا فِيْ
هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ قَالَ قُلْتُ وَمَا فِيْ هٰذِهِ
الصَّحِيْفَةِ قَالَ الْعَقْلُ وَفَكَاكُ الْاَسِيْرِ
وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ

(بخاری)

حضرت ابی جحیفہ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت علی سے آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ تو انہوں نے جواب نہیں مگر اللہ کی کتاب (قرآنِ پاک) یا وہ فہم جو ایک کو عطا ہوتی ہے یا جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔ میں کہ اس صحیفہ میں کیا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کہا۔ عقل۔ فکاک الاسیر اور لاتقتل مسلم الخ (ایسے اس میں درج ہیں۔)

فوائد ومسائل

۱۔ اس روایت کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے جہاد اور دیات میں بھی ذکر کیا ہے اور ترمذی وابن دیات میں ذکر فرمایا ہے۔ ۲۔ عقل۔ کے معنی دیت کے ہیں اور مراد اس سے دیت کے احکام اور کی مقدار ہے۔ فکاک الاسیر کے معنی قیدی کو چھڑانے کے ہیں۔ اسی لیے رہن رکھی ہوئی چیز کو چھڑانے پر عرب فک کہتے ہیں۔

صحیفۂ علی کی حقیقت

ھل عندکم۔ ابی جحیفہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے سوال کیا کے پاس کوئی کتاب ہے؟ یہ سوال انہوں نے اس لیے کیا کہ بعض لوگ یہ کہا تھے کہ حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت اطہار کو خصوصاً حضرت علی کو دینِ اسلام سے متعلق ایسی بتائی ہیں جن کا علم کسی اور کو نہیں ہے۔ ان لوگوں کے خیال کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

کورہ بالا سوال ہوا تو آپ نے فرمایا میرے پاس دین کے ایسے احکام تو نہیں ہیں جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف مجھے تائے ہوں اور دوسروں کو بتانے سے منع کر دیا ہو۔ میرے پاس قرآن حکیم ہے اور وہ علم و بصیرت ہے جو ایک مسلمان کو دی جاتی ہے یا یہ صحیفہ ہے لیکن اس میں بھی دیت اور فکاک اسیر کے احکام درج ہیں اور یہ لکھا ہے کہ کافر کے بدلے مسلمان کو نہ مارا جائے۔

امام بخاری نے کتاب الجہاد میں جو روایت ذکر کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ سے بو جحیفہ نے یہ سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن حکیم کے علاوہ بھی کوئی وحی ہے؟ یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وحی کا ایک حصہ یسا ہے جو حضور علیہ السلام نے صرف حضرت علی ہی کو بتایا ہے۔ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حضرت جحیفہ نے وچھا تو حضرت علی نے فرمایا۔ میرے پاس یہی قرآن پاک ہے جو سب کے پاس ہے یعنی وحی الٰہی جو حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس کو چھپایا جاتا یا کسی ایک فرد تک اس کے بعض اجزاء کو محدود رکھا جاتا —— وحی کے متعلق تو قرآنِ حکیم کا حکم ہے کہ سب تک بلا کم و کاست پہنچا دی جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ حضور علیہ السلام وحی کا کچھ حصہ صرف مجھ تک محدود رکھتے اور کسی اور کو نہ بتاتے۔

حضرت ابو جحیفہ

ان کا نام وہب بن عبد اللہ السوائی ہے۔ انہوں نے حضور علیہ السلام سے ۴۵ حدیثیں روایت کی ہیں جن میں سے دو پر بخاری اور مسلم نے اتفاق کیا اور دو کو بخاری نے اور تین کو مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔ ابو جحیفہ کو حضرت علی بہت محبوب رکھتے تھے اور ان پر آپ کو اعتماد بھی بہت تھا۔ آپ نے کوفہ میں یت المال کا افسر بھی آپ کو ہی بنایا تھا۔ یہ صحابہ میں سب سے چھوٹی عمر کے صحابی تھے۔ ۷۲ھ میں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مسائل

یہ روایت مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے پاس دین کے ایسے احکام و مسائل نہ تھے جو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہی بتائے ہوں یا ان کی تبلیغ و اشاعت سے منع فرما دیا ہو۔ دینِ اسلام ایک تبلیغی دین ہے اور اس کے احکام و مسائل چھپانا حرام و ناجائز ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت علی احکام اسلامیہ کو چھپائیں یا حضور علیہ السلام ان کو احکامِ اسلامی بتائیں اور یہ تاکید بھی فرما دیں کہ ان کی تبلیغ نہ کرنا ۲۔ حضرت علی نے احکامِ شرعیہ لکھ رکھے تھے جس سے علم کی کتابت کا جواز ثابت ہوا ۳۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام سے ایسے امور کے متعلق سوال کرنا جو اس کی ذات سے متعلق ہوں جائز ہے۔ ان منیر کہتے ہیں کہ حضرت علی کے اس جملے سے کہ "وہ فہم جو ایک مسلمان کو دی گئی" واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی کے پاس یفہ میں وہ مسائلِ فقہ تھے جو انھوں نے اپنے علم و بصیرت سے قرآن پاک سے اخذ فرمائے تھے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن یں غور و فکر کر کے ان مسائل کو نکالنا جو قرآنِ کریم میں صراحۃً مذکور نہیں ہیں جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ مسائل اصولِ شرعیہ خلاف نہ ہوں ۵۔ اس حدیث سے امام مالک شافعی و احمد علیہم الرحمۃ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے ے قصاصاً نہیں قتل کیا جائیگا۔ امام اوزاعی، ثوری، اسحٰق، ابو بکر رازی اہلِ ظاہر اور ایک جماعت تابعین کا یہی مسلک ہے۔

اگر مسلمان ذمی کافر کو قتل کردے تو اس سے ضمان لیا جائیگا یا نہیں

۲۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مسلمان ذمی کو ناحق قتل کردے تو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ نے فرمایا کہ ولا یقتل مسلم بکافر میں کافر سے مراد ہے کیونکہ حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں۔ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِیْ عَهْدِ ضروری ہے کہ کافر سے حربی مراد لیا جائے تاکہ ذمی کافر اور عہد میں تقابل قائم رہے۔ چنانچہ اس کی تائید ذیل کی حدیث بھی ہوتی ہے جو اگرچہ منقطع ہے۔

اُتِیَ بِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ قَدْ قَتَلَ مُعَاهِدًا مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَاَمَرَ بِهٖ فَضَرَبَ عُنُقَهٗ وَقَالَ اَنَا اَوْلٰی مَنْ وَفٰی بِذِمَّتِهٖ (طحاوی)

حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک مسلمان جس نے ایک معاہد ذمی کافر کو ناحق قتل کر دیا علیہ السلام نے اس مسلمان کو قصاصاً قتل کرنے اور فرمایا۔ میں اس کے ذمہ کی زیادہ وفا کرنے

اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ کافر جس کے مال و جان عزت و آبرو ناموس کی حفاظت و صیانت کا ذمہ لیا ہے اگر اس کو کوئی مسلمان قتل کردے تو اس کے قصاص میں مسلمان کو بھی قتل کیا جائے تاکہ انصاف پورا ہو۔ حربی کا خون و مال حلال ہے۔ لیکن جب وہ کافر ہماری حفاظت میں آجاتا ہے اور جزیہ ادا کرتا ہے تو خون اور مال کی حرمت ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی کہ خونِ مسلم کی حرمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ذمی کافر کا اس کا ہاتھ حداً کاٹ جاتا ہے خواہ چور مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا جب اس کے مال چرانے پر ہاتھ کاٹ دیا اس کے خون بہانے پر تو بطریق اولٰے قصاص لینا چاہیے۔ حضرت امام نخعی، شعبی، حضرت سعید ابن مسیب و محمد وجناب فاروق اعظم و عبد اللہ بن مسعود و عمر بن عبد العزیز کا بھی یہی مسلک ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے بدلے قصا جائے۔ یہاں ہم نے بہت مختصر گفتگو کی ہے۔ تفصیل کے لیے اہلِ علم "طحاوی" باالمؤمن تقتل الکافر متع کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم انشاء اللہ العزیز کتاب القصاص والدیات میں اس مسئلہ پر مزید وضاحت سے گفتگو کریں گے

۱۲۔ عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوْا رَجُلًا مِنْ بَنِیْ لَیْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتِیْلٍ مِنْهُمْ قَتَلُوْهُ فَاُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَخَطَبَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ اَوِ الْفِیْلَ قَالَ مُحَمَّدٌ وَاجْعَلُوْهُ عَلَى الشَّكِّ كَذَا قَالَ اَبُوْ نُعَیْمٍ الْقَتْلَ اَوِ الْفِیْلَ وَغَیْرُهٗ

ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص نے بنی لیث کے شخص کو فتح مکہ کے دن قتل کر دیا۔ اس مقتول کے جس کو بنی لیث نے قتل کیا تھا۔ جب اس کی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے اونٹنی پر دیا۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے مکہ میں قتل کو یا فیل کو اللہ کے رسول اور مسلمان اہلِ مکہ پر غالب کے مجھ سے پہلے بھی کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور

تْلَ اَلْفِيْلَ وَسُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَلَا وَاِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ
قَبْلِیْ وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ بَعْدِیْ اَلَا وَاِنَّهَا
حَلَّتْ لِیْ سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ اَلَا وَاِنَّهَا
سَاعَتِیْ هٰذِهٖ حَرَامٌ لَا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا
وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا يُلْتَقَطُ
سَاقِطَتُهَا اِلَّا لِمُنْشِدٍ فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ
بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ اِمَّا اَنْ يُّعْقَلَ وَاِمَّا اَنْ
قَادَ اَهْلُ الْقَتِيْلِ فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ
يَمَنِ اُكْتُبْ لِیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِیُّ اُكْتُبُوْا لِاَبِیْ فُلَانٍ
قَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا الْاِذْخِرَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّا
نَجْعَلُهٗ فِیْ بُيُوْتِنَا وَقُبُوْرِنَا فَقَالَ
نَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا الْاِذْخِرَ
اِلَّا الْاِذْخِرَ

(بخاری)

کسی کے لیے حلال ہوگا۔ خبردار! صرف میرے لیے حرم میں قتل کرنا صرف ایک گھڑی دن کے لیے حلال ہوا تھا۔ خبردار! اب یہ ساعت (جس میں خطبہ دے رہا ہوں) مکہ حرم ہے۔ حرم کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔ یہاں کے درخت نہ اکھیڑے جائیں۔ یہاں کا لُقطہ (پڑی ہوئی چیز) نہ اٹھائی جائے۔ مگر وہ شخص لقطہ اٹھائے (جو مالک تک اس کو پہنچائے۔ پھر جس کا کوئی شخص مارا جائے۔ اس کو اختیار ہے دو باتوں میں سے ایک کا جو اس کو پسند آئے یا دیت لے یا قصاص لے تو ایک شخص یمنی آئے عرض کی حضور! یہ احکام مجھے لکھ دیجئے۔ فرمایا فلاں کو یہ احکام لکھ دو۔ پھر ایک قریشی نے عرض کی مگر اذخر گھاس (یعنی اس کو حرم سے کاٹنا منع نہ فرمایا جائے) کیونکہ اذخر ہمارے گھروں اور قبروں کے کام آتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مگر اذخر! مگر اذخر!

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو کتاب الدیۃ اور لقطہ میں بھی ذکر کیا۔ امام مسلم نے حج میں نیز ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

۲۔ ان اللہ حبس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں قتل کو حرام فرما دیا ہے۔ راوی کو شک ہے کہ حضور علیہ السلام نے تل کا لفظ ارشاد فرمایا یا فیل کا۔ فیل ہاتھی کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہوگا جو سورہ الم ترکیف میں ہے کہ ابرہہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی فوج کو مع ہاتھیوں کے ک کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت اہل مکہ مسلمان نہ تھے اور اب جبکہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا تو اب اس کی حرمت میں دہ اضافہ ہوگیا۔ شوکھا۔ یعنی حرم کے کانٹے اور درخت نہ کاٹے جائیں۔ لیکن وہ کانٹے جن سے نقصان پہنچے ان کو کاٹنا ئز ہے۔ جیسے حرم کے موذی جانوروں کو مارنا جائز ہے۔ الّا لمنشد: انشاد کے اصل معنیٰ آواز بلند کرنے کے ہیں۔ اسی سے انشاد شعر خوذ ہے۔ نشدت الضالۃ عرب اس وقت بولتے ہیں جب کہ گم شدہ چیز کے مالک کو تلاش کریں۔ حرم کے لقطہ کے تعلق امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ پانے والا اس کا انشاد اعلان کرتا ہی رہے تاآنکہ اس کا مالک مل جائے۔ امام مالک کا مسلک ہے کہ لقطہ حرم وحل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ منشد کے معنیٰ وہ یہ کرتے ہیں کہ جیسے عام جگہوں کے لقطہ کے متعلق ایک سال اعلان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حرم کے لقطہ کے متعلق بھی اعلان کیا جائے۔ پھر جب یہ یقین ہو جائے کہ اب مالک نہیں سکتا تو پانے والا مالک ہو جائے گا۔ امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی حرم وحل کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر فرق نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کے لقطہ کو خصوصی طور پر کیوں بیان کیا۔ اس کا یہ ہے کہ خصوصی طور پر بیان کرنے کی علت یہ نہیں ہے کہ حرم اور غیر حرم کے لقطہ میں فرق ہے بلکہ اس کی علت کی عظمتِ شان ہے اور یا یہ کہ لوگوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ حرم کی گری پڑی چیز کے متعلق اعلان کرنے کا خاطر خواہ ہو سکتا کیونکہ حرم ایک ایسی جگہ ہے جہاں مختلف بلاد و امصار کے مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور پھر کوئی کر کے اپنے وطن کو واپس ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے حرم کے لقطہ کے متعلق خصوصی طور پر ہدایت دی بھی ضرور اعلان کیا جائے۔ وھو بخیر النظرین ۔ یہاں خیر افعل التفضیل کے معنیٰ میں ہے۔ عبارت یہ ہوگی النظرین مطلب یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء یا تو دیت لیں یا قصاص اما ان یعقل سے یہ بتایا گیا ہے کہ قصاص بھی لیا جائے یہ نہیں کہ قاتل پر قابو نہ چلے تو اس کے کسی رشتہ دار یا خاندان کے کسی فرد یا قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل

مسائلِ حدیث

حدیث ہٰذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے:۔ ۱۔ علم کی کتابت جائز ہے ۲۔ حضور علیہ السلام نے لکھنے کی اجازت دی ۳۔ خطبہ کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر دینا زیادہ مستحب ہے خواہ خطبہ ۴۔ حرم کا احترام فرض ہے۔ وہاں کے باشندوں سے قتال و جدال جائز نہیں ہے ۵۔ حرم کے درخت اور جائز نہیں ہے ۶۔ حضرت امام اعظم، ابو یوسف، محمد، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، عبداللہ بن ذکوان، عبداللہ بن بن حی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ قتلِ عمد میں یا تو قصاص لیں یا معاف کر دیں۔ ہاں اولیاء مقتول کو دیت بھی اختیار ہے۔ بشرطیکہ قاتل دیت دینے پر راضی ہو جائے۔ چنانچہ حدیث زیر بحث امام کے مسلک کی بھی دلیل ہے بات اس میں قاتل کی رضا کا ذکر نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قاتل کا مال دینے پر راضی ہو جانا بدیہی مشکل تو یہ امر ہے کہ اولیاء مقتول کو دیت لینے پر راضی کیا جائے کیونکہ جان کے بدلے مال لینے پر کم لوگ ہی تیار

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مالکِ شریعت ہیں

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک استدعا کی کہ اذخر گھاس ہمارے کام کی اس کو حرام نہ کیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے حرم کی اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت دیدی۔ جس سے یہ بات ثابت کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ اختیار دیا ہے کہ حرام چیزوں میں جس چیز کو چاہیں حلال فرما دیں۔ جیسے ہے کہ جس مباح کو چاہیں واجب کر دیں۔ چنانچہ کتاب و سنت سے واضح ہوتا ہے کہ احکامِ شریعت حضور صلی اللہ سپرد ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی۔ حضور! کیا حج ہر سال فرض ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اگر میں ہاں کہہ دوں تو واجب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا! مجھے چھوڑے رہو، جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں۔ اگلی امتیں اسی اور اپنے انبیاء کے خلافِ مراد چلنے سے ہلاک ہوئیں۔ جب میں کسی بات کا حکم دوں تو بجا لاؤ۔ منع کر دوں تو جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ کھود کھود کر مت پوچھو۔ میری زبان حق کی ترجمان ہے۔ اگر میں نے کسی بھی یا حرام ہونے کا حکم دے دیا تو وہ واجب یا حرام ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت امام شعرانی میزان شریف میں لکھتے کی دوسری قسم وہ ہے جو مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب عزوجل نے ماذون فرمایا کہ خود اپنی رائے سے

ی رایہ) جو راہ چاہیں قائم فرمادیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کا مردوں کے لیے ریشم پہننا حرام کرنا اور حرمتِ مکہ سے ذخر گھاس کو استثنا فرمادینا اسی قبیل سے ہے۔ منہ ـــــ اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "روح الایمان" مطالعہ کیجئے۔ جو دفتر "رضوان" لاہور سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

۱۱۳۔ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ كْثَرَ حَدِيْثًا عَنْهُ مِنِّيْ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا كْتُبُ (بخاری)

ہمام بن منبہ نے کہا۔ میں نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی مجھ سے زیادہ حدیث روایت نہیں کرتا۔ مگر عبداللہ بن عمر۔ کیونکہ وہ حدیث سن کر لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

فوائد ومسائل

اس روایت کو ترمذی نے علم اور مناقب میں اور نسائی نے صرف مناقب میں ذکر کیا ہے۔ ترجمہ باب سے اس حدیث کا تعلق بالکل ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو افاضل صحابہ سے ہیں وہ حادیثِ نبویہ کو لکھا کرتے تھے۔ اسی سے منکرینِ حدیث کے اس دعویٰ کا رد ہوجاتا ہے کہ حدیث کی کتابت عہدِ نبوی میں نہیں ہوئی یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات اپنے ارشادات لکھوائے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت حدیث کو لکھتی بھی تھی اور حفظ بھی کرتی تھی اور دوسری جماعت صرف حفظِ حدیث پر اکتفا کرتی تھی۔ چنانچہ بیہقی اور مسند امام احمد میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور علیہ السلام سے حدیث لکھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے ان کو اجازت دیدی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حافظہ

واضح ہو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پانچ ہزار تین سو حدیثیں مروی ہیں اور آٹھ سو تابعین نے آپ سے روایت کی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر سے صرف سات سو حدیثیں مروی ہیں لہٰذا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فرمانا کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کوئی حدیث روایت نہیں کرتا سوائے عبداللہ بن عمر کے ـــــ یہ قول ان کا ابتدائی حالت کا ہے جب کہ حضور علیہ السلام نے ان کے لیے دعائے برکت نہ کی تھی۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ حدیثوں کے حافظ تھے لیکن جب حضور علیہ السلام کی خدمت میں انھوں نے اپنے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جھولی میں کچھ ڈال دیا تو پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت ہوگئی کہ جو کچھ حضور علیہ السلام سے سنتے نہ بھولتے۔ چنانچہ بارگاہِ نبوی سے قوتِ حافظہ پانے کے بعد حضرت ابوہریرہ ہی سب سے بڑے حافظِ حدیث قرار پائے ۲۔ روایت زیر بحث سے یہ بھی ثابت ہے کہ علم کی کتابت جائز ہے (واللہ اعلم)

۱۱۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهٗ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِكِتَابٍ اَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرض زیادہ ہوا تو آپ نے فرمایا۔ میرے پاس سامانِ کتابت لاؤ۔ میں ایک تحریر

لَا تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ قَالَ عُمَرُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوْا وَكَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قُوْمُوْا عَنِّيْ وَلَا يَنْبَغِيْ عِنْدِي التَّنَازُعُ فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ اِنَّ الرَّزِيَّةَ كُلَّ الرَّزِيَّةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهٖ

(بخاری)

لکھ دوں تاکہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو تو حضرت عمر رضی تعالیٰ عنہ نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درد غالب اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن کریم) ہے اور وہ کافی ہے۔ پس حاضرین میں اختلاف ہوا اور باتیں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میرے پاس سے اٹھ جا پاس جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔ پھر ابن عباس یہ کہتے نکلے کہ مصیبت ہے بڑی مصیبت جو حائل ہو گئی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور آپ کی تحریر کے درمیان

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام بخاری نے مغازی اور طب اور الاعتصام میں بھی ذکر فرمایا ہے اور مسلم میں اور نسائی نے علم اور طب میں ذکر کیا ہے۔ حدیث ہذا کا باب سے تعلق بالکل واضح ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتابت حدیث عہد نبوی میں ہی مروج ہو گئی تھی اور یہ کہ حدیث کی کتابت جائز ہے۔

حدیث قرطاس

واضح ہو کہ یہ حدیث، حدیث قرطاس کے نام سے موسوم ہے۔ بخاری میں واقعہ قر کی حدیث سات جگہ آئی ہے۔ ان تمام حدیثوں پر نظر رکھتے ہوئے جو مضمون حاصل ہو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ کاغذ قلم دوات تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ حضرت عمر نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بیماری کی ہے اور ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اھجر استفھموہ یعنی کیا جدائی کا وقت قریب ہے دریافت تو کرلو۔ مخالفین کہتے ہیں کہ لفظ ھجر کے معنی یہاں ہذیان کے ہیں اور یہ لفظ حضرت عمر نے ہی رسول علیہ وسلم کی شان میں استعمال کیا ہے۔

اس قصہ قرطاس میں تین الزامات حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قائم کیے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے رسول بکنے والا کہا اور سخت توہین رسول کی۔ دوم یہ کہ انھوں نے ایسی ضروری تحریر نہ لکھنے دی جو امت کو گمراہی سے بچاتی۔ کتاب اللہ کو کافی کہہ کر انھوں نے حدیث رسول کا لغو اور بے کار ہونا ظاہر کیا۔

جواب:- پہلے الزام کا یہ ہے کہ اول تو لفظ ھجر حضرت عمر کا منقول نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں سات جگہ یہ روایت کہیں بھی یہ لفظ حضرت عمر سے منقول نہیں۔ قالوا بصیغہ جمع ہے یعنی لوگوں نے کہا۔ اب یہ کہنے والے کون لوگ تھے معلوم نہیں۔ شارحین نے اپنے قیاس سے کام لیا ہے۔ کسی نے کہا یہ قول اس جماعت کا ہے جو لکھوانے کی موید تھی کہا۔ کچھ لوگ نومسلم تھے یہ ان کا مقولہ ہے۔ غرضیکہ حضرت عمر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا بالکل بے اصل و بے حدیث کی کتاب میں کوئی صحیح معتبر روایت اس مضمون کی نہیں ہے کہ یہ لفظ حضرت عمر نے کہا۔ مخالفین صحابہ نے بڑ اور ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک سو برس سے مجتہدین اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ کوئی روایت

جس میں یہ لفظ حضرت عمر کا مقولہ ہو کر نہیں مل۔ دوسری بات یہ ہے کہ لفظ ھجر کے معنی یہاں ہذیان نہیں ہے بلکہ بمعنی جدائی کے ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیماری کی حالت میں ایسی تحریر لکھوانے کا ارادہ ظاہر کیا جو آخری وقت میں ہے تو صحابہ کرام کے قلوب پر ایک بجلی سی گری اور ان میں سے کسی نے کہا۔ اَهَجَرَ استفهموه۔ کیا جدائی کا وقت یا پوچھ تو۔ یہ پوچھنے کا مضمون صاف قرینہ اس امر کا ہے کہ ھجر بمعنی ہذیان نہیں۔ جس کو ہذیان ہو گیا ہو اس سے پوچھنا یہ لفظ بمعنی جدائی قرآنِ مجید میں بھی مستعمل ہے۔ قولہٗ تعالیٰ واهجرهم هجراً جميلاً۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظ ہمزہ استفہام کے ساتھ مروی ہے۔ چنانچہ بخاری کی چھ روایتوں میں ہمزہ کے ساتھ ہے۔ صرف ایک میں بغیر ہمزہ ہے۔ حسب قاعدہ اصولِ حدیث جو روایت بے ہمزہ کے ہے اس میں بھی ہمزہ مانا جائے گا۔ پس یہ لفظ بمعنی ہذیان ہو تو بھی استفہام انکاری ہے۔

المختصر رسول کو ہذیان کہنے کا الزام حضرت عمرؓ تو کیا کسی پر بھی قائم نہیں ہوتا۔ جواب دوسرے الزام کا یہ ہے کہ تحریر لکھوانے کا الزام حضرت عمرؓ پر ہرگز نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اگر وہ تحریر ہی ایسی ضروری تھی تو اس واقعہ کے بعد پانچ دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رہے۔ اس مدت میں جب حضرت عمرؓ نہ ہوتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیے تھا کہ لکھوا دیتے یا حضرت علی پر لازم تھا کہ وہ لکھوا لیتے اور حضرت عمرؓ اگر اس تحریر کو روک بھی رہے تھے تو ان کا روکنا چیز ہی کیا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ڈرتے تھے اور مارے ڈر کے ان کے خلاف نہ کر سکتے تھے تو نبوت ایک کھیل ہو جائے گی اور سارا دین ناقابلِ اعتبار ہو جائے گا۔ یہ بات کس کی عقل میں آ سکتی ہے کہ وہ رسول جس نے مدتوں کفارِ مکہ سے کچھ خوف نہ کیا اور توحید کا اعلان اور شرک کا ابطال کیا وہ حضرت عمرؓ سے اس قدر ڈر جائے کہ اپنی امت کے لیے ایک ایسی ضروری تحریر نہ لکھوائے۔ ان هذا لشیء عجیب ـــــ اس مقام پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس واقعہ قرطاس سے بہت پہلے یہ آیۂ قرآنی نازل ہو چکی تھی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ۔ یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اگر واقعی کوئی ایسی تحریر باقی تھی تو بغیر اس کے دین کامل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر مذکورہ بالا الزام مان لیا جائے تو آیتِ قرآنی کے خلاف ہے۔

ضروری نوٹ واقعہ قرطاس کے متعلق یہاں ہم نے نہایت ہی مختصر گفتگو کی ہے کیونکہ اس موضوع پر ہم نے ایک کتابچہ بنام "حدیثِ قرطاس" علیحدہ شائع کر دیا ہے۔ اس میں حدیثِ قرطاس پر محققانہ تبصرہ ہے اور ان تمام اعتراضات و شبہات و الزامات کے مکمل و مدلل و مفصل جوابات دیئے ہیں۔ جو اس سلسلہ میں کیے جاتے ہیں۔ یہ کتابچہ دفتر رسالہ "رضوان" لاہور سے مل سکتا ہے۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

باب رات کے وقت تعلیم و وعظ کے بیان میں

عظہ کے معنی اپنے نفس کو وعظ کرنے کے ہیں اور وعظ کے معنی دوسروں کو نصیحت کرنے کے ہیں۔

١١۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اِسْتَيْقَظَ | حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک رات

النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ أَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا ! سبحا
آج رات کو کیا کیا فتنے اُترے اور کیا کیا خزانے کھ
حجرے والیوں کو (عبادت کے لیے) جگاؤ۔ بہت
جو دنیا میں پہنے اوڑھے ہیں۔ آخرت میں ننگی
گی۔ (بخاری)

فوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کا باب سے تعلق واضح ہے ۲۔ امام نے حدیث ہذا کو ابواب ذیل میں ذکر فرمایا ہے
صلوٰۃ اللیل، علامات النبوۃ، کتاب الادب، کتاب اللباس، کتاب
——— اور ترمذی نے کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے ۳۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ
ازواج سے ہیں۔ ان کا نام ہند یا رملہ ہے۔ یہ سہل بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم کی صاحبزادی ہیں۔ ان
۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔ ۱۳ حدیثوں پر بخاری ومسلم نے اتفاق کیا ہے۔ ۴۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ، اللہ کی تسبیح ہے۔ ایک
میں انزل اللہ آیا ہے۔ انزال کے معنیٰ کسی چیز کو اوپر سے نیچے اُتارنے کے ہیں۔ یہاں حقیقی معنیٰ نہیں بن سکتے "مجازی
گے: "یعنی اللہ تعالیٰ نے امورِ مقدرہ کی ملائکہ کو اطلاع دی"۔ اسی طرح انزل اللہ القرآن میں انزال کے مجازی معنی
ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن وہ معنیٰ ہے جو قائم بالذات ہے تو اس کا انزال یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کلمات
وجود میں لایا جو معنیٰ پر دلالت کریں اور ان کو لوح محفوظ میں ثبت کر دیا اور اگر قرآن حکیم سے مراد الفاظ ہو تو اس کا انز
ان لفظوں کو لوح محفوظ میں ثبت کرنا ہوگا۔ کیونکہ انزال وجود شے کے بعد ہی ہو سکتا ہے ——— انزال کتب سماو
یہ ہیں کہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ سے تلقی روحانی پائی یا لوح محفوظ سے اس کو حفظ کیا اور اس کو لے کر اترا اور انبیاء کرا

مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ منصوب علی الظرفیۃ ہے۔ حاصلِ معنیٰ یہ ہوں گے کہ اس رات اللہ تعالیٰ نے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ رونما ہونے والے فتنوں سے اطلاع دی یا ان کا مشاہدہ کرایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرما
بارش کے مسلسل قطرات کی طرح فتنوں کو اُترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ
ہمیں قیامت تک ہونے والے واقعات وحادثات کی اطلاع دی۔ (بخاری ومسلم)

ماذا میں چند وجہیں ہیں ۱۔ ما استفہام کے لیے اور ذا اشارہ کے لیے ۲۔ ما اشارہ کے لیے ذا موص
الذی ۳۔ ما زائدہ اور ذا اشارہ کے لیے ۴۔ ماذا، ترکیب میں کلمہ استفہام ہو ۵۔ ما نکرہ موصوفہ بمعنی شی
استفہام کے لیے ذا زائدہ ہو ——— ایک جماعت نے جن میں ابن مالک بھی شامل ہیں، اس کو جائز ک

اُنْزِلَ صیغہ مجہول ہے۔

وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ

عام شارحین نے خزائن سے صحابہ کرام کی فتوحات مراد لی ہیں۔ چنا
شاہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشگوئی فرمائی۔ حضر
خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھوں پوری ہوئی۔ انہیں کے زمانہ میں روم وایران کی سلطنتیں زیروزبر
ان دونوں ملکوں پر اسلام کا قبضہ ہوا اور قیصر وکسریٰ کے خزانے ہاتھ آئے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یں مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو پھر حضرت خالد بن ولید کو ملک ایران کی طرف بھیجا اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کو ملا۔ ابھی ایران کا کوئی شہر فتح نہ ہونے پایا تھا کہ قیصر روم کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ یرموک کی عظیم الشان لڑائی پیش آئی۔ جس میں مسلمانوں کو ڑی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور دمشق بھی آپ کے وقت میں فتح ہوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فتوحات تو حد شمار سے باہر ہیں۔ روم، ایران، مصر آپ کے زمانہ میں فتح ہوئے الۃ الخفاء میں ہے کہ ایک ہزار چھتیس شہر مع ان کے مضافات کے مفتوح ہوئے اور چار ہزار مسجدیں بنیں اور چار ہزار گرجے ویران ہوئے اور نو سو منبر مسجدوں میں بنائے گئے۔ یعنی ۹ سو جامع مسجدیں بنیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی عظیم فتوحات ہوئیں۔ قسطنطنیہ، افریقہ، جزیرہ قبرص بحری و ی جنگوں کے بعد فتح ہوئے اور ہرقل انہیں کے زمانہ میں فی النار ہوا۔ اس کے علاوہ بعض وہ ممالک جو باغی ہو گئے تھے ثلاً ہمدان، رے، اسکندریہ، فارس، خراسان، آذربائیجان از سر نو فتح ہوئے۔

غرضکہ اللہ عزوجل نے جن فتوحاتِ آئندہ کی اطلاع دی یا حضور علیہ السلام کو ان کا مشاہدہ کرایا۔ وہ حضرات ثلاثہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئیں۔ جس سے حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خلافت کا برحق ہونا بھی ثابت ہوا۔

اس کے بعد آپ نے صواحب الحجر یعنی ازواجِ مطہرات کو جگانے کا حکم دیا تاکہ وہ رات کے نوافل پڑھیں۔ یہ حضور علیہ السلام کی عادتِ کریمہ تھی کہ جب کسی اہم بات کا ظہور ہوتا تو آپ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور اوروں کو بھی اس طرف متوجہ فرماتے۔ چونکہ اس وقت ازواجِ مطہرات ہی حاضر تھیں اس لیے ان کو جگانے کا حکم دیا۔

بَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا یعنی بہت سی عورتیں کو اس دنیا میں تو پہنے اوڑھے نظر آتی ہیں مگر آخرت میں ننگی ہوں گی۔ اس میں عورتوں کی خصوصی طور پر عمل کی ترغیب دی گئی ہے ان کو چاہیے کہ وہ احکامِ اسلامیہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔

سائل حدیث حدیثِ ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ آدمی کو رات میں اپنے اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت کے لیے جگانا مستحب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ کسی اہم بات کا ظہور ہو۔ ور تعجب کے اظہار کے لیے سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا جائز ہے۔ ۳۔ رات کے وقت علم دین کی تعلیم دینا اور نصیحت کرنا بھی ئز ہے۔

بَابُ السَّمَرِ فِي الْعِلْمِ

باب رات کو سونے سے قبل علم کی باتیں کرنا

سمر: اس گفتگو کو کہتے ہیں جو رات کو سونے سے پہلے کی جاتی ہے۔ عموماً لوگ اپنی خوابگاہوں میں نیند آنے سے ے قصے کہانیاں اور فضول باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ سو جاتے ہیں۔ ایسا سمر جو امورِ خیر پر مشتمل نہ ہو ممنوع ہے لیکن ں اس سے مراد وعظ و نصیحت کی گفتگو ہے جو مستحب اور محمود عند الشرع ہے۔

۱۱- اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ قَالَ صَلّٰى بِنَا النَّبِيُّ

حضرت عبد اللہ بن عمر نے بیان کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِيْ آخِرِ حَيَاتِهٖ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ قَالَ أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ

نے اپنی حیات کے آخری ایام میں ہمیں نماز عش جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ تم بتا اس رات کا حال جتنے لوگ اس وقت زمین پ سے سو برس کے بعد ان میں سے کوئی نہیں ر

(بخاری)

فوائد ومسائل اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے فضائل میں گزشتہ باب کو وعظ ونصیحت کرنے کا ذکر تھا۔ اس باب میں سونے سے قبل وعظ ونصیحت کا بیان ہے اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز ادا فرمائی وہ عشاء کی نماز تھی اور اپنے وصال کے ایک ماہ قبل یہ نماز پڑھائی تھی۔ جس ک نے آخر حیاتہ کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے ۲۔ اس حدیث میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر کی ناپائیداری کی خ والی ہے اور اللہ عزوجل کی بندگی وفرماں برداری میں وقت گزارنے اور امور خیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی

لایبقی علامہ نووی نے فرمایا حدیث کے اس حد کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حضور علیہ السلام کے تکلم کے وقت پر موجود ہیں وہ سو سال سے زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہیں گے۔ لیکن جو لوگ اس تکلم کے بعد وہ اس میں داخل نہیں ہیں یعنی ان کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کیا کہا حالانکہ وہ بھی زندہ ہیں اور شیطان بھی زندہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا تعلق بنی آ سے اور وہ بھی جو زمین پر ہو کیونکہ وجہ الارض کا لفظ موجود ہے اور خطاب بھی صرف انسانوں سے ہے۔ حضرت علیہ السلام زمین پر نہیں ہیں بلکہ آسمانوں پر ہیں اور شیطان بنی آدم سے نہیں ہے بلکہ جن ہے۔ اسی طرح کی موت پر بھی استدلالِ تام نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس وقت حضرت خضر زمین پر نہ ہوں بلکہ سمندر میں یہ بھی ممکن ہے کہ زمین سے مراد ہی عرب کی زمین ہو جیسا کہ آیتِ قرآنی الم تکن ارض اللّٰہ واسعۃ میں ارض مدینہ کی زمین ہے اور حضرت خضر اس رات عرب کی زمین پر نہ ہوں۔ غرضکہ ساکنانِ بحر وآسمان وہوا اور غیر ارشادِ نبوی میں داخل ہی نہیں ہیں۔ بعض شارحین نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت مجلسِ نبوی موجود تھے ان سے یہ فرمایا کہ جن کو تم دیکھتے اور جانتے ہو۔ وہ سو برس سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ سب سے صحابی ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں۔ جنہوں نے ۱۱۰ھ مکہ میں اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ میں اسی انعد وفات پائی۔ واللہ اعلم۔

۱۱۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِيْ بَيْتِ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا فِيْ لَيْلَتِهَا فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ جَاءَ

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے میمونہ بنت جو میری خالہ ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہیں۔ ان کے ہاں رات گزاری اور حضور اقدس صلی علیہ وسلم نے نمازِ عشاء پڑھی۔ پھر اپنے حجرہ میں آکر

إِلٰى مَنْزِلِهٖ فَصَلّٰى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ ثُمَّ قَالَ نَامَ الْغُلَيِّمُ أَوْ كَلِمَةً تُشْبِهُهَا ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَصَلّٰى خَمْسَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتّٰى سَمِعْتُ غَطِيْطَهٗ أَوْ خَصِيْطَهٗ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلٰوةِ (بخاری)

پڑھیں۔ پھر سو رہے پھر اُٹھے اور فرمایا، غُلیم سو گیا یا اسی کے مشابہ کوئی کلمہ فرمایا۔ پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہوگئے (میں بھی جاگا) اور آپ کے بائیں طرف کھڑا ہوا۔ آپ نے مجھے اپنی سیدھی طرف کرلیا اور پھر پانچ رکعت پڑھیں۔ پھر دو رکعت پڑھیں۔ پھر آپ سو گئے۔ حتیٰ کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سُنی۔ پھر آپ نماز فجر کے لیے (مسجد میں) تشریف لے گئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا۔ اسی طرح ابوداؤد نسائی نے۔ **غُلَيِّم**۔ غلام کی تصغیر ہے۔ اس سے حضرت ابن عباس مراد ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد کل گیارہ رکعتیں پڑھیں ۶ نفل ۳ وتر۔ اس کے بعد دو رکعتیں۔ یہ سنّتِ فجر تھیں۔

حدیثِ ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ اس حدیث سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی فضیلت نکلتی ہے کہ باوجود کم سنی کے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے اعمال پر نگاہ رکھتے تھے ۲۔ نفل نماز با جماعت پڑھ سکتے ہیں۔ ۳۔ عمل یسیر سے نماز فاسد نہیں ہوتی ۴۔ اگر مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو ۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقضِ وضو نہیں اور اس پر اُمت کا اجماع بھی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ آپ سو کر اُٹھتے ہیں تو بغیر وضو فرمائے نماز ادا فرما لیتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے جواب دیا کہ "عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں دل جاگتا ہے" ——— معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی نیند بھی بے مثل ہے۔ لوگ سوتے ہیں تو ان کی آنکھیں اور دل بھی سو جاتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مقدس ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

باب علم دین کو یاد رکھنے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے سوائے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے کسی اور سے روایت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیّدنا ابوہریرہ حافظِ حدیث ہیں۔ یہ حضور علیہ السلام سے جو بات سنتے تھے اُسے بھولتے نہ تھے اور یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو کسی اور صحابی میں نہ تھی۔

۱۱۸۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ إِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ أَكْثَرَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلَوْلَا اٰيَتَانِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيْثًا ثُمَّ يَتْلُوْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى إِلٰى قَوْلِهِ الرَّحِيْمُ إِنَّ إِخْوَانَنَا

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ابوہریرۃ نے بہت حدیثیں روایت کیں اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث روایت نہ کرتا (قرآن میں سورۃ بقرہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں

مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاقِ وَاِنَّ اِخْوَانَنَا مِنَ الْاَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِيْ اَمْوَالِهِمْ وَاِنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِبَعِ بَطْنِهٖ وَيَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُوْنَ وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُوْنَ

(بخاری)

اور ہدایت کو جو ہم نے اُتاریں - اخیر تک (یعنی التواب الرحیم تک) ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید فروخت میں مشغول رہتے اور ہمارے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے اور ابوہریرہ (تجارت کرتا زراعت) وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور رہتا شکم سیر ہو کر اور ایسے موقعوں پر حاضر رہتا جب حاضر نہ رہتے اور وہ باتیں یاد رکھتا جن کو لوگ یاد نہ رکھتے

فوائد ۱- اس حدیث کو امام نے باب الزراعت اور الاعتصام میں ذکر کیا اور مسلم نے فضائل میں۔ ابن ماجہ نے سنت میں ذکر فرمایا۔ اکثر ابوہریرۃ - یہ لوگوں کے کلام کی حکایت ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں - ابوہریرہ بہت روایت کرتے ہیں - ولولا ایتان - حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں - اگر قرآن میں کتمان دین کی ممانعت نہ ہوتی تو حدیث بیان نہ کرتا لیکن قرآن حکیم نے دین کے چھپانے سے منع فرما دیا تو اب مجھ پر واجب ہو گیا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنوں اس کو دوسروں تک پہنچا دوں - صفق کے لغوی معنی پُشتِ دست پر ہاتھ مارنے کے ہیں - مراد بیع و شرا ہے - من الانصار - انصاری وہ لوگ ہیں جنھوں نے مدینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جگہ دی ہر طرح سے آپ کی مدد کی - العمل فی اموالھم سے مراد کھیتی باڑی ہے - مسلم میں تصریح ہے کان یشغلھم عمل ارضھم مطلب یہ کہ مہاجرین و انصار خرید و فروخت و زراعت میں مشغول رہتے - اس وجہ سے ان کو دربارِ نبوی میں زیادہ حاضری کا موقع نہ ملتا اور حضرت ابوہریرہ تجارت و زراعت سے بے نیاز تھے - خود ہی فرماتے ہیں - میں صفہ میں سے ایک مسکین تھا اور پھر حضرت ابوہریرہ مجلسِ نبوی کے حاضر باش تھے - یہ بات بھی ان کی کثرت روایت کا سبب بنی -

مسائل حدیث معلوم ہوا کہ صحابہ کرام حدیثِ رسول کو دین سمجھتے تھے اور دین سے متعلق قولاً و عملاً حضور علیہ السلام جو بھی دیتے اس کے اظہار کو واجب جانتے تھے ۲- حضرت ابوہریرہ نے جن دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے میں ایک تو یہاں مذکور ہے - دوسری آیت بھی اسی صورت میں ہے یعنی یکتمون ما انزل اللہ من الکتب ویشترون به ثمنا قلیلا - اخیر تک - مطلب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ہے کہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لیے بڑے عذاب کا وعدہ کیا ہے اور ان پر لعنت کی ہے جو دین کی بات کو چھپاتے ہیں - اس لیے جو حدیثیں مجھ کو معلوم ہیں ان کو بیان کرتا ہوں -

۱۱۹/۱۲۰ - عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنْسَاهُ قَالَ ابْسُطْ رِدَاءَكَ فَبَسَطْتُهُ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ عرض کی یارسول اللہ! میں آپ سے بہت باتیں ہوں اور بھول جاتا ہوں - آپ نے فرمایا - اپنی

رَفَ بِيَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ ضُمَّ فَضَمَمْتُهٗ
نَسِيْتُ شَيْئًا بَعْدُ (بخاری)

پھیلا۔ میں نے چادر پھیلائی۔ آپ نے میری چادر میں دو مٹھی بھر کر (ڈال دیا) فرمایا۔ چادر سمیٹ لے۔ میں نے

س کے بعد پھر میں کوئی بات نہ بھولا۔

اس حدیث کو امام بخاری نے علامات النبوۃ میں ذکر کیا ہے اور ترمذی نے مناقب میں ذکر کیا اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابن عیینہ کی روایت میں زہری سے ہے کہ ابوہریرہ نے کہا۔ جب سے حضور علیہ السلام نے میری در میں کچھ ڈالا ہے۔ خدا کی قسم جو کچھ آپ سے سنتا ہوں بھولتا نہیں ہوں۔ یہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ نے حضرت ابوہریرہ کو قوتِ حافظہ عطا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسبِ ضرورت اپنی واقعی فضیلت کو بیان کرنا جائز ے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ نے اپنی فضیلت بیان کی۔ ہاں ازراہِ تکبر و غرور اپنی فضیلت کو بیان کرنا ممنوع ہے۔

۱۲۱- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ
سُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ
مَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ وَاَمَّا الْاٰخَرُ
وْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ قَالَ اَبُوْ
دِاللّٰهِ الْبُلْعُوْمُ مَجْرَى الطَّعَامِ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن بھرے ہیں۔ ایک برتن کو تو میں نے پھیلا دیا (اس کی تبلیغ کر دی) دوسرے برتن کو اگر پھیلاؤں تو میرا نرخرہ کاٹ دیا جائے (امام بخاری نے فرمایا۔ بلعوم وہ ہے جس سے کھانا اترتا ہے)

د و مسائل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علم حاصل کیے۔ ایک وہ جن کا تعلق دین سے تھا تو جو حدیثیں دین اور شریعت سے ق تھیں ان کو میں نے پھیلا دیا کیونکہ ان کی تبلیغ و اشاعت فرض تھی لیکن دوسرا علم جس کا احکامِ شرعیہ سے کوئی تعلق نہ ر اس کا اظہار بھی ضروری نہ تھا اس کو میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتمانِ دین حرام ہے اور جس ی کی کوئی بات معلوم ہو اس کا اظہار اور اس کی تبلیغ واجب ہے۔ اس لیے سابقہ حدیث میں حضرت ابوہریرہ نے اگر قرآن پاک میں دین کے چھپانے کی ممانعت نہ ہوتی تو میں حدیث بیان کرنے میں اتنی کوشش نہ کرتا۔

بَابُ الْاِنْصَاتِ لِلْعُلَمَآءِ

باب عالموں کی بات خاموش رہ کر سننے کا بیان

انصات ۔ کے معنی گوشِ ہوش سے سننے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وعظ و نصیحت کی بات کی جائے تو حاضرین وشی کے ساتھ سننا چاہیے۔

۱۲۲- عَنْ جَرِيْرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
سَلَّمَ قَالَ لَهٗ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اِسْتَنْصِتِ
سَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا
رِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ مجھے حجۃ الوداع کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگوں کو خاموش کرو۔ پھر فرمایا۔ میرے بعد ایک دوسرے کو قتل کر کے کافروں کے سے کام نہ کرنا۔

فوائد و مسائل

۱۔ حدیث ہٰذا کو امام نے مغازی اور دیات میں بھی ذکر فرمایا۔ مسلم نے ایمان اور جنایات، نسائی نے
ابن ماجہ نے فتن میں ۲۔ جریر ابن عبد اللہ بجلی ابو زرعہ کے دادا تھے۔ نہایت خوبصورت بلند قامت
مضبوط بدن کے صحابی تھے۔ ان کا قد اونٹ کے کوہان تک پہنچتا تھا اور جوتے کی لمبائی ایک ہاتھ تک ہوتی تھی۔ آپ
رمضان سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے مسلمان ہوئے ۳۔ یہ روایت دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ
ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے دن جب کہ لوگ رمی جمار کے لیے جمع تھے، ارشاد فرمایا جیسا کہ مسلم شریف میں ہے۔ ۴۔ حدیث
کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر کافر نہ بن جانا۔ لیکن اس سے افعال کفار کی مشابہت مراد
یعنی کافروں کے سے کام نہ کرنا۔ چنانچہ دیگر دلائل شرعیہ سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کو ظلماً مارنے والا کافر نہیں ہوتا
پر اجماع بھی ہے یا پھر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قتلِ مومن کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

مسائل حدیث

مسلمان کے قتل کو حلال سمجھنا کفر ہے اور حرام جانتے ہوئے ظلماً ناحق مار دینا گناہِ کبیرہ ہے
فعل پر کتاب مجید میں سخت وعید آئی ہے ۲۔ جب وعظ و نصیحت کی مجلس قائم ہو تو
مجلس کو سکون و اطمینان سے سننا چاہیے۔

بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ

باب جب عالم سے یہ سوال ہو کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون

أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكِلَ الْعِلْمَ إِلَى اللّٰهِ | ہے تو اس کو جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ ہی

۱۲۳۔ اس باب میں امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے۔ جس میں حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا واقعہ ہے۔
میں باب سے متعلق صرف اتنا واقعہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے
آپ نے فرمایا میں ہوں۔ اگرچہ آپ کا یہ جواب بالکل حق و صواب تھا۔ کیونکہ نبی اپنی امت میں سب سے زیادہ
نبوت و امور شریعت کو جانتا ہے اور علم کے لحاظ سے بھی سب سے اعلم و افضل ہوتا ہے۔ مگر یہ جواب عند اللہ زیادہ
نہ قرار پایا۔ اس وجہ سے اللہ عزوجل نے آپ پر عتاب فرمایا اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بتایا کہ ان کو ہم نے
جس کے تم حامل نہیں ہو۔ حدیث کے اس ٹکڑے سے امام نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ جب اس قسم کا سوال ہو تو
کے لفظ سے جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔ یہ حدیث مع تفہیم کے پہلے گزر چکی ہے اور امام نے اس حدیث کو
پر ذکر کیا ہے اس لیے یہاں دوبارہ نہیں لکھی۔

بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

باب ایک شخص کھڑے کھڑے سوال کرے اور عالم بیٹھا ہوا ہو

علامہ ابن حجر نے فرمایا۔ اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سائل کھڑے کھڑے سوال کرے اور عالم بیٹھ
جواب دے تو جائز ہے بشرطیکہ بیٹھ کر جواب دینا از راہِ تکبر و غرور نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسب ضرورت جس
جواب دینا جائز ہے ۲۔ عنوان کی ترکیب یہ ہے۔ من موصولہ و حالیہ عالماً مفعول ہے سائل کا اور

۱۲۴ - عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ جَآءَ رَجُلٌ
ى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ
سُوْلَ اللّٰهِ مَا الْقِتَالُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّ
حَدَنَا يُقَاتِلُ غَضَبًا وَّيُقَاتِلُ حَمِيَّةً
رَفَعَ اِلَيْهِ رَاْسَهٗ قَالَ فَرَفَعَ اِلَيْهِ
سَهٗ اِلَّا اَنَّهٗ كَانَ قَآئِمًا فَقَالَ مَنْ
تَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ
سَبِيْلِ اللّٰهِ (بخاری)

حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوال کیا — یارسول اللہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی (شخصی یا قومی یا ملکی) حمیت (غیرت) کی وجہ سے لڑتا ہے۔ آپ نے اس کی طرف سر اٹھایا۔ اس لیے کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور سائل کھڑا تھا۔ فرمایا جو کوئی اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ لڑنا اللہ کی راہ میں لڑنا ہے۔

وائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے جہاد، توحید اور کتاب الخمس میں ذکر کیا۔ ترمذی، ابوداؤد، مسلم وابن ماجہ نے کتاب الجہاد میں ذکر کیا۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ عمل کا مدار نیت پر ہے جب تک عمل ں اخلاص نہ ہو مقبول نہ ہوگا ۲۔ مجاہد وہ ہے جو صرف اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے لڑے۔ ذاتی یا دنیوی مفاد کو اس میں دخل نہ ہو۔ غضب اور غصہ کبھی دنیا کے لیے ہوتا ہے کبھی خدا کے لیے۔ تو جو غصہ اور غیرت اللہ کے لیے ہو وہ مطلوب ب ہے۔ باعثِ اجر و ثواب ہے اور جو دنیا کے لیے ہے وہ دنیا ہی کے لیے ہے۔ یہ حدیث جوامع الکلم سے ہے۔ ضور علیہ السلام نے سائل کو بہت جامع مانع جواب دیا اور حمیت وغیرت کی تقسیم نہیں فرمائی کیونکہ پھر کلام طویل ہو جاتا آپ ے اصولی بات ارشاد فرمائی۔

"اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے لڑنے والا مجاہد فی سبیل اللہ ہے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات طیبات رح کی جائے تو دفتر بھر جائیں۔

بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

باب رمی جمار کے وقت مسئلہ پوچھنے اور جواب دینے کے بیان میں

۱۲۵- حافظ ابن حجر نے فرمایا۔ اس باب سے امام کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر عالم عبادت میں مشغول ہو اور وہ عبادت ی ہو۔ جس میں بولنا جائز ہو تو سائل کو ایسی حالت میں سوال کرنا اور عالم کو جواب دینا جائز ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ سلم سے اس وقت سوال کیا گیا جب کہ آپ جمرہ عقبہ کے پاس تھے اور آپ نے سائل کو جواب بھی دیا اس باب میں امام نے جو یث ذکر کی ہے وہ باب الفتیا۔ علی الدابۃ میں مع شرح کے گزر چکی ہے۔ اسلیے ہم نے یہاں پر نہیں لکھی۔

بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى

باب اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بیان میں

مَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

کہ تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا

لہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے

اس باب سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مخلوقات کو جس قدر علوم عطا

ہوتے ہیں وہ اللہ عزوجل کے سامنے بہرحال قلیل ہیں اور مخلوقات میں سے کوئی خواہ نبی ہو یا غیر نبی، اللہ عزوجل کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ بخاری میں حدیث خضر میں ہے کہ ایک چڑیا نے کشتی کے کنارہ پر بیٹھ کر جب دریا میں اپنی چونچ [illegible] تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا۔ اے موسیٰ میرا علم تیرا علم اور تمام مخلوقات کا علم باری تعالےٰ کے علم کے سامنے ایسا ہے جیسے کہ دریا کے مقابلے میں اس چڑیا کا چونچ تر کرلینا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وما اوتیتم [illegible] کے خطاب میں آپ بھی شامل ہیں؟ ہاں میں بھی اور تم بھی۔ مطلب یہ کہ انبیاء کے علوم ہوں یا غیر انبیاء کے وہ علوم الٰہی سے [illegible] حضور قلیل ہی ہیں اور وہ نسبت بھی نہیں رکھتے جو ذرہ کو آفتاب سے اور قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔ علامہ خفاجی حواشی بیضاوی میں طیبی سے نقل فرماتے ہیں کہ:-

غیب السموات والارض وما یبدونہ و مایکتمونہ قطرۃ منہا	آسمانوں اور زمینوں کے غیب علم الٰہی سے ایک قطرہ ہیں۔ (بیضاوی)

حضور علیہ السلام کا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے ایک قطرہ ہے

ہم اہلسنت وجماعت حضور اقدس [illegible] علیہ وسلم کے لیے علم ماکان وما یکون [illegible] کرتے ہیں۔ تو یہ بھی اللہ عزوجل کے سامنے قلیل ہی ہے۔ مخلوقات میں سے کسی کو نہ تو اللہ عزوجل کے برابر علم ہو سکتا نہ تمام معلومات الٰہیہ کا کوئی احاطہ کرسکتا ہے۔ غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ علم جو غیب السموٰت والارض اور [illegible] کے علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اللہ تعالےٰ کے سامنے قلیل ہی ہے مگر مخلوقات کے سامنے کثیر ہے اور ایسا کثیر [illegible] تمام مخلوقات کا علم بلکہ لوح وقلم کے علوم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ایک قطرہ ہیں۔

۱۲۶- عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَرِبِ الْمَدِيْنَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى عَسِيْبٍ مَعَهٗ فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْئَلُوْهُ لَا يَجِيْءُ فِيْهِ بِشَيْءٍ تَكْرَهُوْنَهٗ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَنَسْئَلَنَّهٗ فَقَالَ يَا اَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوْحُ فَسَكَتَ فَقُلْتُ اِنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيْهِ فَقُمْتُ فَلَمَّا انْجَلٰى عَنْهُ فَقَالَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا	حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں میں حضور صلی [illegible] کے ہمراہ مدینہ کے ویران مکانوں میں چل رہا تھا اور حضور [illegible] کی چھڑی سے ٹیک لگائے ہوئے تھے جو آپ کے ساتھ [illegible] پھر آپ چند یہودیوں کے سامنے سے گزرے۔ ان میں بعض نے بعض سے کہا۔ ان سے رُوح کے متعلق [illegible] بعض نے کہا روح کے متعلق سوال مت کرو کہیں ایسا [illegible] کہ یہ جواب میں ایسی بات کہیں جو تم کو بری لگے اور [illegible] کہا ہم ضرور سوال کریں گے۔ پس سوال کیا اے ابو [illegible] ہے۔ حضور علیہ السلام نے سکوت فرمایا۔ میں نے اپنے [illegible] کہا کہ حضور پر وحی آرہی ہے۔ اس لیے میں کھڑا [illegible] جب وحی کی کیفیت جاتی رہی۔ آپ نے فرمایا (یہ آیت [illegible] ہوتی ہے۔ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں

(بخاری)

رُوح امر ربی سے ہے اور ان کو علم نہیں دیا گیا مگر کم

فوائد حدیث

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے توحید، الاعتصام، باب مایکرہ من کثرۃ السوال میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم نے رقاق میں، ترمذی و نسائی نے تفسیر میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ امام بخاری نے عنوان باندھا تھا کہ مخلوقات کو جو علم دیا گیا ہے۔ وہ علمِ الٰہی کے مقابل قلیل ہے۔ چنانچہ آیہ مبارکہ میں اسی کا ذکر ہے ۳۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و امانت، چال چلن پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کر سکے اور حضور علیہ السلام نے نبوت کا اظہار فرما دیا تو اب انہوں نے طے کیا کہ اس معاملہ میں یہود سے مدد لی جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہود سے مشورہ لیا۔ یہودیوں نے کہا آپ سے تین سوال کرو۔ اگر تینوں کا جواب دیدیں یا تینوں کا جواب نہ دیں تو یہ نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو ضرور نبی ہیں۔ قریش نے حضور علیہ السلام سے تین سوال کئے۔ اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور رُوح کے متعلق، حضور علیہ السلام نے اوّل الذکر دونوں سوالوں کا تفصیل کے ساتھ جواب دیدیا۔ مگر رُوح کے متعلق آپ خاموش رہے۔ حتیٰ کہ وحی آگئی۔ چنانچہ قریش سوال کر کے نادم ہوئے۔ واضح ہو کہ توریت میں بھی روح کے متعلق مبہم ہی جواب تھا۔ اس لیے یہود نے حضور علیہ السلام کی صداقت کا معیار یہ مقرر کیا کہ آپ رُوح کے متعلق جواب نہ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال پر سکوت فرمایا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:۔

قالت الیهود ان فسر الروح فلیس بنبی فلذلك لم یجبهم (عینی ج ۱ صـ ۶۱۱)

یہود نے یہ طے کیا کہ آپ نے رُوح کی تفسیر کر دی تو آپ نبی نہیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب نہ دیا۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سکوت فرمانے اور وحی کا انتظار کرنے کو اس امر کی دلیل بنانا غلط ہے کہ آپ کو روح کی حقیقت کا علم نہ تھا کیونکہ حضور علیہ السلام کا سکوت فرمانا تو اس لیے تھا کہ کفار نے آپ کی صداقت کا معیار یہ ٹھہرایا تھا کہ آپ رُوح کے متعلق سوال کا جواب نہ دیں۔ چنانچہ حضرت علامہ عینی شارح بخاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے معاملہ کو خلق پر مبہم رکھا ہے حتیٰ کہ انھوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی رُوح کی حقیقت سے واقف نہ تھے۔

قُلْتُ جَلَّ مَنْصَبُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ حَبِيْبُ اللّٰهِ وَسَيِّدُ خَلْقِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ غَيْرَ عَالِمٍ بِالرُّوْحِ وَكَيْفَ وَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِقَوْلِهٖ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا

(عینی جلد ۱ صـ ۶۱۲)

میں کہتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب بہت جلیل ہے وہ حبیب اللہ ہیں اور تمام مخلوقاتِ الٰہیہ کے سردار ہیں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ رُوح کے عالم نہ ہوں جب کہ اللہ تعالےٰ نے آپ پر احسان فرمایا (اور قرآنِ حکیم میں آپ کے متعلق فرمایا) ہم نے آپ کو سکھا دیا جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر تو اللہ کا فضلِ عظیم ہے۔

دیکھئے علامہ عینی نے آیہ مبارکہ "علمك مالم تکن تعلم" میں "ما" کو عموم پر رکھا اور ما سے یہ استدلال فرمایا کہ اس کے عموم میں روح بھی داخل ہے۔ پھر کیسے یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روح کا علم نہ دیا ہو۔

اس کے بعد علامہ عینی لکھتے ہیں۔ آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعا
کو روح کا علم نہیں دیا یا حضور علیہ السلام روح کی حقیقت نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ وَقَ
اَکْثَرُ الْعُلَمَاءِ لَیْسَ فِی الْاٰیَةِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الرُّوْحَ لَا یُعْلَمُ وَلَا عَلٰی اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ
وَسَلَّمَ لَمْ یَکُنْ یَعْلَمُهَا (عینی ج ۱ ص ۶۱۲)

بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْاِخْتِيَارِ مَخَافَةَ

اَنْ يَّقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ فَيَقَعُوْا فِیْ اَشَدَّ مِنْهُ

باب ایک راجح کام کو اس وجہ سے چھوڑ دینا کہ لوگوں کی عقلیں اس حکمت تک نہ پہنچیں اور اس کو کرنے
اس سے بڑھ کر کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

اس باب میں امام نے جس امر کی طرف توجہ دلائی ہے وہ فی زمانہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ امام یہ بتانا چاہتے
کام ایسے ہوتے ہیں جو فی نفسہٖ اچھے ہوتے ہیں لیکن ان اچھے کاموں کے کرنے سے جب یہ خطرہ محسوس ہو کہ لوگ
نہیں سمجھیں گے اور کسی بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے تو ان کاموں کو نہ کرنا بہتر ہے۔

۱۲۷ ۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَائِشَةُ لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِیْثٌ عَهْدُهُمْ قَالَ ابْنُ الزُّبَیْرِ بِکُفْرٍ لَنَقَضْتُ الْکَعْبَةَ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَیْنِ بَابًا یَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا یَخْرُجُوْنَ مِنْهُ فَفَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَیْرِ

(بخاری شریف)

حضرت عائشہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
قوم کا زمانہ نیا نہ ہوتا (ابن الزبیر نے فرمایا۔ اس
ہے کہ اگر قریش کے کفر کا زمانہ قریب نہ گزرا ہو
لائے ہوئے ان کو عرصہ گزر گیا ہوتا) تو میں عمارت
گرا دیتا اور اس کے دو دروازے کر دیتا۔ ایک
ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکلتے۔ پس
ابن الزبیر نے کعبے کے دو دروازے کر دیئے۔

فوائد اس حدیث کو امام نے حج اور تمنی میں ذکر کیا ہے۔ مسلم و ابن ماجہ نے حج میں ذکر کیا۔ "حدیث عہدہم
معنی یہ ہیں کہ قریش نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور ابھی وہ اس مقام پر نہیں پہنچے ہیں کہ اف
کو سمجھ سکیں اور افضل و ادنیٰ میں فرق کر سکیں ۲۔ حضور علیہ السلام کعبہ شریف کی عمارت کو قواعد ابراہیم علیہ السلام پ
تھے اور اس کے دو دروازے رکھنا چاہتے تھے مگر آپ نے محض اس مصلحت کی بنا پر اس کو ترک فرما دیا کہ قریش کے
معظمہ کی عظمت بہت ہے۔ کہیں وہ میرے اس فعل کی حکمت کو نہ سمجھیں اور کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں ۳۔ علامہ عینی
سب سے پہلے کعبہ ملائکہ نے تعمیر کیا۔ پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد عمالقہ نے اس کے بعد قبیلہ جرہم
بعد قریش نے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کے مطابق کعبہ شریف کو بنایا۔ لیکن ظالم حجاج نے پھر ویسے ہی کر دیا جیسا کہ جاہلیت
تھا اور اب تک اسی حالت میں ہے ۴۔ ہارون نے امام مالک سے سوال کیا تھا کہ کیا اب کعبہ اسی طرح نہ بنا دیا جائے

حضور علیہ السلام چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ایسا مت کرو۔ اس لیے کہ پھر یہ کام ایک کھیل بن جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی افضل کام کو اس خطرہ کی بنا پر ترک کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کرنے سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ کام فرض و واجب نہ ہو کیونکہ جو امور فرض و واجب ہیں وہ تو بہر صورت انجام دیے جائیں گے۔ اس میں حکام کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ امورِ سلطنت کو انجام دینے میں مصلحتِ وقت کا خیال رکھیں۔ رُوح کے متعلق مزید گفتگو انشاء اللہ العزیز کتاب التفسیر میں ہوگی۔

بَابُ مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا

باب علم کی بعض باتیں ایک قوم کو بتانا اور دوسری

دُوْنَ قَوْمٍ كَرَاهِيَةَ اَنْ لَّا يَفْهَمُوْا قَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُّكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (بخاری)

کو نہ بتانا اس خیال سے کہ وہ نہ سمجھیں گے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا لوگوں سے وہ باتیں بیان کرو جو وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ وہ اللہ و رسول کو جھٹلائیں۔

گزشتہ باب میں اس کا بیان تھا کہ کسی افضل کام کو اس لیے ترک کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کرنے سے لوگ کسی بڑے فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ اس باب میں فعل کی جگہ قول کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے كَلِّمُوْهُمْ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ کہ لوگوں سے ان کے فہم و عقل کے موافق کلام کیا جائے اور ایسے امور جو مجمل و مبہم ہوں اور ایسے الفاظ جن کے ظاہری معنی مراد نہ ہوں۔ وہ بغیر تفسیر و تشریح کے عوام کے سامنے نہ رکھے جائیں کیونکہ جو لوگ دین کی عمومی تعلیم اور قرآن و حدیث کے طرزِ بیان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ صرف ترجمہ سے کچھ کا کچھ سمجھ جاتے ہیں اور یہ بات اللہ و رسول کی تکذیب کا سبب بن جاتی ہے اور اس کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔

کبھی لفظ مجمل ہوتا ہے اور جب تک اس کی شرح نہ کر دی جائے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی لفظ کے ظاہری معنیٰ مراد نہیں ہوتے اور یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ لفظ یہاں اس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں لفظ کے حقیقی اور کہیں مجازی معنیٰ مراد ہوتے ہیں اور کہیں سیاق و سباق کو دیکھ کر اور دیگر دلائلِ شرعیہ کو پیش نظر رکھ کر معنیٰ متعین کیے جاتے ہیں۔ کہیں شارع علیہ السلام کا کوئی حکم یا فعل کسی خاص موقع یا محل کے لیے خاص ہوتا ہے اور لوگ صرف ترجمے سے اس کو عام حکم سمجھ جاتے ہیں اور شارع کے مرادی معنیٰ تک ان کی فہم نہیں پہنچتی ہے۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ عوام کے سامنے دینی مسائل و عقائد اسی طرح بیان کیے جائیں گے کہ وہ مسائل و عقائد کو سمجھ جائیں۔

۱۲۸۔ قَالَ ثَنَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ

حضرت انس بن مالک راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو جب کہ وہ آپ کے ساتھ ایک ہی کجاوے پر سوار تھے پکارا اور فرمایا یا معاذ! انہوں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ و سعدیک۔ تین مرتبہ

يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلٰثًا قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَّشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْنَ قَالَ اِذًا يَّتَّكِلُوْا وَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا (بخاری)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کسی دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت اللہ تعالٰے نے دوزخ پر ایسے شخص کو حرام کر دیا۔ معاذ نے عرض کی کیا میں لوگوں کو اس کی خبر نہ کر وہ خوش ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ پھر پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ پھر حضرت کتمانِ علم کے خوف سے بوقتِ وفات یہ حدیث سے بیان کی۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام مسلم نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے اسی مضمون کی ایک حدیث اس باب میں ذکر کی ہے مضمون دونوں کا ایک ہے۔ اس لیے ہم نے اس کو اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ کو بشارت دینے سے منع فرمانا نہی تنزیہی تھی تحریمی نہ تھی۔ اسی لیے حضرت بوقتِ وفات اس حدیث کو بیان کیا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام حدیث رسول کو دین سمجھتے تھے اور اس کو گناہِ عظیم ۲۔ چونکہ مذکورہ بالا حدیث کے مضمون سے بعض افراد کا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا امکان تھا کہ لیے صرف توحید و رسالت کا اقرار کافی ہے۔ عمل کی ضرورت نہیں ہے"۔ اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بشارت کی اشاعت سے نہایت حکیمانہ انداز میں منع فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ بھروسہ کر لیں گے"۔ اس سے علمائے کرام کو یہ ہدایت ملتی ہے کہ وہ ایسی آیات اور احادیث کو جن کا مضمون مجمل تشریح سے بیان کریں۔ تاکہ عوام شارع علیہ السلام کی اصل مراد و حکمت تک پہنچ جائیں اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں

کیا صرف اقرارِ توحید و رسالت نجات کے لیے کافی ہے

متعدد حدیثوں کا یہ مضمون ہے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی صدقِ دل سے گواہی دی وہ جنتی ہے بلکہ بعض حدیثوں میں صرف اقرارِ توحید پر جنت کی بشارت دی گئی۔ تو اس تمام حدیثوں میں اللہ کی توحید اور حضور علیہ السلام کی رسالت کی شہادت ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حضور اللہ علیہ وسلم کی پوری ایمانی دعوت کو قبول کرے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین بنا لے۔ اسی لیے ان کے ادا کرنے کا مطلب ہمیشہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص نے حضور علیہ السلام کی ایمانی دعوت کو قبول کر لیا اور بنا لیا۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کافر اور مسلمان بھی توحید و رسالت کی شہادت اور لا الٰہ کا مطلب حضور کی پوری دعوت کو قبول کر لینا ہی سمجھتے تھے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آج کل اردو محاورہ میں کرنے کو کلمہ پڑھنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی اسلام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ پس جس نے اس کلمہ کی شہادت ادا کی۔ اس نے درحقیقت حضور صلی

ے پورے دین کو مان لیا اور پورے دین کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن امور پر یمان لانے کا حکم دیا ان سب کی تصدیق کی جائے اور زبان سے ان کا اقرار کیا جائے۔ لہٰذا حدیث زیرِ بحث کا مطلب یہ ہوا س نے کلمہ پڑھ لیا یعنی حضور کے لائے ہوئے دین کو اور آپ کی ایمانی دعوت کو مکمل طور پر قبول کرلیا اور اگر اسی حال میں مرگیا تو نت میں ضرور جائیگا۔ چنانچہ اس کی تائید و توثیق کہ توحید و رسالت پر ایمان لانے سے حضور علیہ السلام کی پوری دعوتِ ایمانی قبول کرنا اور پورے اسلام کو دین ماننا ہے۔ بخاری شریف ہی کی متعدد روایتوں سے ہوتی ہے جن میں توحید و رسالت کے ساتھ ساتھ دیگر ضروریاتِ دین کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

لہٰذا اگر کوئی توحید و رسالت کا اقرار کرے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت قبول نہ کرے۔ توحید و رسالت کے علاوہ وسرے ایمانیات کا انکار کرے مثلاً تقدیر، ملائکہ اور قیامت وغیرہ کو نہ مانے تو ایسا شخص ہرگز اس بشارت کا مستحق نہیں ہے ور جو لوگ مذکورہ بالا مضمون کی احادیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ توحید و رسالت کی شہادت ادا کرنے والا خواہ کتنا ہی بدعقیدہ ہو اور ایمانیات میں سے چاہے کسی ایک کا منکر ہو، وہ بہر حال مسلمان ہے اور عذابِ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔ وہ ان بشارتی حدیثوں کے صحیح مفہوم و مدعا کے سمجھنے سے محروم ہیں اور قرآن و حدیث کے محاورہ و طرزِ بیان سے بالکل ناواقف ہیں۔ بعض لوگ ان ــــــ بشارتی حدیثوں کا یہی مطلب لیتے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ دوسرے ابواب کی حدیثیں بلکہ قرآنِ پاک کی آیتیں ان کے اس نظریہ کی واضح لفظوں میں تردید کرتی ہیں۔ غرضکہ جن حدیثوں میں توحید یا توحید و رسالت کی گواہی پر جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ ان کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت کو قبول کرلے۔ اسلام کو اپنا دین بنائے اور تمام ضروریاتِ دین کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرے۔ پھر اگر ی حال میں مرجائے تو عذابِ دوزخ سے ضرور محفوظ رہے گا۔

بَابُ الْحَيَآءِ فِي الْعِلْمِ

باب علم میں شرم کرنے کے بیان میں

وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُسْتَكْبِرٌ	اور امام مجاہد نے فرمایا جس کو حیا ہوگی یا غرور ہوگا وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔

یعنی جو شخص متکبر ہوگا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا اور وہ شخص جو کسی سے پڑھنے اور علم سیکھنے میں شرم کریگا وہ کیا حاصل کر سکتا ے۔ اسی لیے عقلاء نے کہا۔ علم کے لیے آفتیں ہیں۔ ان سب میں بڑی آفت استنکاف ہے جس کا ثمرہ جہالت ہے۔ سیدنا ام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا۔ آپ کو یہ علمِ عظیم کیسے حاصل ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے کسی کو علم کے بتانے میں خل نہیں کیا اور کسی سے علم حاصل کرنے میں شرم نہیں کی۔

وَقَالَتْ عَائِشَةُ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ (بخاری)	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا انصار کی عورتیں کیا اچھی عورتیں ہیں جن کو شرم مسائلِ دینیہ کے سمجھنے سے نہیں روک سکی۔

یعنی انصار کی عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ضروری مسائل پوچھنے میں شرم نہیں کی۔ جس کی وجہ سے عالم کی عورتوں کو فائدہ پہنچا اور عورتوں سے مخصوص بہت سے دینی مسائل معلوم ہوگئے۔

١٣٠- عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ اُمُّ سُلَيْمٍ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ فَهَلْ عَلَى الْمَرْاَةِ مِنْ غُسْلٍ اِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَتِ الْمَاءَ فَغَطَّتْ اُمُّ سَلَمَةَ تَعْنِيْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْاَةُ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا (بخاری)

حضرت ام سلیم (حضرت انس کی والدہ) حضور اکرم صلی علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں۔ عرض کی حضور اللہ حق کے اظہار سے حیا نہیں فرماتا۔ کیا عورت کو احت تو اس پر غسل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاں اس پر غسل واجب ہے جب کہ وہ منی کو دیکھے کپڑے پر یہ سن کر حضرت ام سلمہ ام المومنین نے ڈھانپ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ! کیا عورت کو احتلام ہوتا ہے۔ حضور نے فرمایا۔ ہاں! (تیرے ہوں) اسی لیے تو عورت کا بچہ اس کا ہم شکل ہوتا ہے۔

فوائد و مسائل

۱- اس حدیث کو امام بخاری نے طہارت میں بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ترمذی، ابو داؤد اور ابن بھی طہارت میں ذکر کیا ہے اور مسلم نے طہارت و علم میں ذکر فرمایا ہے۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر

۱- بوقت ضرورت مسائل دینیہ کے معلوم کرنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔ ۲- عورت کو اگر خواب میں احتلام ہو تو اس فرض ہے۔

۲- ارسطو کا نظریہ یہ ہے کہ عورت کے بھی منی ہوتی ہے اور بچہ عورت اور مرد دونوں کی منی سے بنتا ہے۔ جالینوس کا خیال یہ ہے کہ بچہ صرف مرد کی منی سے بنتا ہے اور عورت کے منی نہیں ہوتی ایک رطوبت ہے جو منی کے حدیث میں ہے مرد کی منی غلیظ اور بودار ہوتی ہے اور عورت کی منی رقیق زردی مائل ہوتی ہے تو زوجین میں سے جس کی آجائے بچہ اسی کی شکل پر ہوتا ہے۔ اس حدیث نے جالینوس کے خیال کی تردید کردی۔

۳- حضرت ام سلیم نے احتلام کے متعلق سوال کیا اور اس سے شرم نہ کی جس سے واضح ہوا کہ مسائل واحکام دین کے اور پوچھنے میں شرم کرنا مذموم ہے۔ ۴- امہات المومنین کو اللہ عز وجل نے حاضری خدمت سے پہلے بھی احتلام سے محفوظ اس لیے کہ احتلام میں شیطان کی مداخلت ہوتی ہے اور شیطانی مداخلتوں سے ازواج مطہرات پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ام سلیم نے احتلام کے متعلق سوال کیا تو حضرت ام المومنین ام سلمہ کو اس سوال پر تعجب ہوا۔

نوٹ اس کے بعد امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو کتاب العلم کے شروع میں گزر چکی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ نے صحابہ سے سوال کیا تھا کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے۔ مسلمان کی وہی بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ میرا ذہن کھجور کے درخت کی طرف گیا۔ مگر میں شرم جواب نہ دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ اگر تم اس وقت جواب دیدیتے تو۔

فَقَالَ لَأَنْ تَكُوْنَ قُلْتَهَا اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لِيْ كَذَا وَكَذَا (بخاری)

تمہارا جواب مجھے کثیر دولت مل جانے سے زیادہ محبوب ہوتا

شارحین نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے حدیث کے اتنے ٹکڑے سے یہ استدلال کیا ہے کہ دین کی بات میں شرم کرنا اچھا نہیں۔ جبھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ملامت کی کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوال فرما رہے تھے اور تمہارے ذہن میں جواب آیا تھا تو عرض کیوں نہ کر دیا اور اگر تم عرض کر دیتے تو مجھے بہت سے خزانے مل جانے سے زیادہ خوشی ہوتی اور یہی ترجمۃ الباب ہے۔

بَابُ مَنِ اسْتَحْيٰ فَاَمَرَ غَيْرَهٗ بِالسُّؤَالِ

باب، جو علم کی بات خود پوچھنے میں شرم کرے پس دوسرے کو سوال کرنیکا حکم دے

۱۳۲۔ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَاَمَرْتُ الْمِقْدَادَ اَنْ يَّسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ فِيْهِ الْوُضُوْءُ

(بخاری شریف)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کہتے ہیں میں ایک مرد تھا بہت مذی والا۔ میں نے مقداد سے کہا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کریں پس انہوں نے حضور سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ مذی کے نکلنے پر وضو ہے (غسل نہیں)

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے دوسری بار طہارت میں ذکر کیا ہے۔ نسائی و مسلم نے طہارت و علم میں ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ مذی۔ اس لیسدار رطوبت کو کہتے ہیں جو بوقت بوس و کنار مرد کی شرمگاہ سے نکلتی ہے۔ مذی کے نکلنے سے شہوت ختم نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس منی گاڑھی ہوتی ہے۔ اس میں بدبو بھی ہوتی ہے۔ جب یہ خارج ہو تو لذت آتی ہے اور منی کے نکلنے کے بعد سکون ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ابتداء میں جو رطوبت نکلتی ہے۔ جس کو مذی کہتے ہیں صرف اس کے نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا البتہ وضو ٹوٹتا ہے۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی تھے اس لیے انہوں نے خود اس مسئلہ کے پوچھنے میں شرم کی اور حضرت مقداد کے ذریعہ مسئلہ معلوم کرایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی خود مسئلہ پوچھنے میں شرم کرے تو دوسرے کے ذریعے معلوم کرائے۔ اسی طرح اگر عورتیں اپنے مخصوص مسائل خود معلوم کرتے میں شرم محسوس کریں تو اپنے شوہروں کے ذریعہ سے معلوم کرائیں۔

بَابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْيَا فِي الْمَسْجِدِ

باب، مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتویٰ دینا

۱۳۳۔ اس باب میں امام بخاری نے ایک حدیث ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر حضور علیہ السلام سے حج کے متعلق پوچھا اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا —— حدیث کے اس ٹکڑے سے امام بخاری نے یہ استدلال کیا کہ مسجد میں دین کا درس دینا اور مقدمات کا فیصلہ کرنا جائز ہے۔ یہ

حدیث کتاب الحج میں آ رہی ہے۔ وہاں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔

بَابُ مَنْ اَجَابَ السَّائِلَ بِاَكْثَرَ مِمَّا سَاَلَهٗ

باب، سوال کرنے والے نے جتنا سوال کیا اس سے زیادہ جواب دینا

۴۳۱۔ اس باب میں امام نے حدیث ذکر کی ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ جو
باندھے ہوئے ہو وہ کیا پہنے؟ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ قمیص، عمامہ، پائجامہ اور ٹوپی
امام نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا کہ سائل کے سوال سے زیادہ جواب دینا جائز ہے۔ کیونکہ سائل نے
پوچھا تھا کہ محرم کونسا لباس پہنے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا فلاں فلاں لباس نہ پہنے۔ جواب سوال سے
یہ حدیث کتاب الحج میں آ رہی ہے۔ وہاں ہم مفصل گفتگو کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

خاتمہ کتاب العلم ختم ہوگئی۔ اس کے بعد کتاب الوضوء شروع ہوگئی۔ کتاب العلم میں کل
ہیں۔ ان میں متابعات بصیغہ تعلیق ۱۸ ہیں اور جن تعلیقوں کو امام نے وصل نہیں کیا
باقی اسّی حدیثیں موصول ہیں جن میں مکرر ۱۶ حدیثیں ہیں۔ بحذف مکرر اس کتاب میں صرف ۶۴ حدیثیں ہیں

کِتَابُ الْوُضُوْءِ

۱۔ چونکہ ایمان کے بعد سب سے اہم فرض نماز ہے اور نماز کے لیے طہارت شرط ہے اس لیے اب وضو
شروع ہوتا ہے۔ بخاری کے بعض نسخوں میں کتاب الوضوء کی جگہ کتاب الطہارت کے الفاظ آئے ہیں جو
کیونکہ طہارت عام ہے اور وضوء خاص ہے۔ پھر لفظ کتاب بھی متقاضی تھا کہ بڑا عنوان لفظ عام (طہارت)

۲۔ اس کتاب میں طہارت کی ایک نوع وضوء کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۳۔ وضوء وضاءۃ سے ہے۔ اس کے معنی نظافت کے ہیں۔ اس میں تین لغت ہیں۔ وَضُوْء یہ نام
وَضُوْء وہ پانی ہے جس سے نظافت حاصل کی جائے ـــــ وِضُوْء آلہ نظافت کو کہتے ہیں
شرع میں وضوء۔ ہاتھ پاؤں اور چہرہ کو دھونے اور سر کے مسح کرنے کو کہتے ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ

باب اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے متعلق کہ فرمایا

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا	جب تم نماز کا ارادہ کرو اور بے وضو ہو
وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا	منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت دھوؤ اور
بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (بخاری)	ٹخنوں سمیت دھوؤ

۱۔ امام نے آیت بطور تبرک لکھی ہے اور یہ بتانے کے لئے بھی کہ مسائل وضوء میں آیت اصل (جڑ) کا حکم
اور حدیث میں وضوء سے متعلق جو ہدایات بیان ہوں گی وہ اسی آیت سے مستفاد ہیں اور اسی کی تشریح

لوٰۃ، صَلّی سے مشتق ہے۔ صلی اس ہڈی کو کہتے ہیں جس پر سرین قائم ہے اور اصطلاحِ شرع میں صلوٰۃ ارکان صوص واذکارِ معلومہ کا نام ہے۔ فَاغْسِلُوْا۔ غسل کے معنی شریعت میں عضو پر پانی بہانے کے ہیں۔ اس طرح کہ کم از کم بوند پانی عضو سے بہہ جائے۔ صرف عضو کو بھگو لینے یا تیل کی طرح پانی چپڑ لینے یا ایک آدھ بوند پانی بہہ جانے کو غسل (دھونا) ہیں کہیں گے نہ اس سے وضو و غسل ادا ہوگا اور اگر عضو پر نجاست ہو تو پھر دھونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس طرح پانی بہایا ے کہ نجاست بالکل زائل ہو جائے۔ وُجُوْهَكُمْ۔ وجہ کی جمع ہے۔ شروع پیشانی سے جہاں سے بال جمنے کی ابتداء ٹھوڑی تک طول میں اور عرض میں ایک کان سے دوسرے کان تک چہرہ ہے۔ اس حد کے اندر جلد کے ہر حصہ پر ایک پانی بہہ جانا ضروری ہے۔ اگر بال برابر بھی سوکھا رہ گیا وضو نہ ہوگا۔ وایدیکم، جمع ہے ید کی۔ مرافق جمع ہے فق کی۔ مرفق کہنی کو کہتے ہیں یعنی وضو میں ہاتھ کہنی سمیت دھوئے جائیں۔ وامسحوا مسح کے متعدد معنیٰ ہیں۔ ں نا، تلوار سے کاٹنا، زمین کو ناپنا، سفر کرنا۔ عرب بولتے ہیں۔ مسح الارض مساحۃ مسح المرأۃ مسحہ سیف۔ مسحت الابل یومھا (فافہم) —— اصطلاحِ شرع میں ہاتھ پر پانی کی جو تری رہ جائے اس کو عضو پر پھیرنے کا نام مسح ہے۔ خواہ وہ تری اعضا کے دھونے کے بعد رہ گئی ہو یا نئے پانی سے ہاتھ کو تر کیا گیا ہو۔ رؤسکم، س کی جمع ہے —— احناف کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ ارجلکم، رجل کی جمع ہے اور کعب پاؤں کے خنے کو کہتے ہیں۔ وضو میں ٹخنوں سمیت پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے۔

ضو میں ایک بار اعضاء کو دھونا فرض ہے

وَقَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ وَبَيَّنَ النَّبِيُّ نَّ فَرْضَ الْوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً وَتَوَضَّأَ يْضًا مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلَاثًا وَلَمْ يَزِدْ لٰى ثَلَاثٍ وَكَرِهَ اَهْلُ الْعِلْمِ الْاِسْرَافَ يْهِ وَاَنْ يُّجَاوِزُوْا فِعْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ يْهِ وَسَلَّمَ (بخاری)

امام بخاری نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے (حدیث میں) بیان کر دیا کہ وضو میں ایک ایک بار اعضاء کا دھونا (فرض) ہے۔ نیز آپ نے دو دو بار اعضاءِ وضو کو دھویا اور تین بار بھی۔ مگر تین بار سے زیادہ نہیں دھویا اور اہلِ علم نے وضو میں اسراف اور حضور علیہ السلام کے فعل سے بڑھ جانا مکروہ سمجھا ہے۔

واضح ہوا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اعضاءِ وضو کو ایک ایک بار دو دو بار اور تین تین بار تک دھونا ثابت ہے۔ لیکن تین بار سے زائد دھونا ثابت نہیں۔ حضرات علی و عثمان وابی امامہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تین بار دھونا مروی ہے اور حضرت ابن عباس و فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایک بار اور حضرت عبداللہ بن زید سے دو بار دھونا مروی ہے اری) جس سے واضح ہوا کہ اعضاءِ وضو کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور تین بار دھونا سُنّت ہے۔ کیونکہ اگر دو دو بار یا ین تین بار دھونا فرض ہوتا تو حضور علیہ السلام ایک بار دھونے پر اکتفا نہ فرماتے۔ اسی لیے ائمہ اربعہ اس امر پر متفق ہیں کہ ین بار سے زائد دھونا مکروہ تحریمی ہے اور خلافِ سُنّت ہے۔ نیز ابن ماجہ و ابوداؤد میں ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ لم نے فرمایا۔ جس نے تین بار سے زائد دھویا (فَقَدْ اَسَاءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ) اس نے زیادتی کی کیونکہ حدِ سُنّت سے

تجاوز کیا۔ ظلم کیا کیونکہ اس نے چیز کو اس کے محل میں نہ رکھا برا کیا کیونکہ افضل کو ترک کیا۔

بَابٌ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ

باب، بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوتی

۱۳۵۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْبَلُ صَلٰوةُ مَنْ اَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّاَ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ حَضْرَ مَوْتَ مَا الْحَدَثُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ فُسَاءٌ اَوْ ضُرَاطٌ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و فرمایا جس شخص کو حدث ہوا اس کی نماز قبول نہیں جب تک وضو نہ کرے ایک شخص جو حضر موت کے والے تھے انہوں نے پوچھا ابوہریرہ! حدث کسے کہتے ہیں؟ کہا پھسکی یا گوز کو!

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری نے اس حدیث کو باب ترک الحیل میں بھی ذکر کیا ہے۔ امام مسلم و ترمذی و کتاب الطہارت میں ذکر کیا ہے ۲۔ فساء اس ریح کو کہتے ہیں جو پاخانہ کے مقام اس میں آواز نہ ہو اور جس میں آواز ہو اس کو ضراط کہتے ہیں۔ لا تقبل صلاۃ، قبول کے حقیقی معنی کا ثواب ملے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور فرض ذمہ سے ساقط ہو جائے لیکن یہاں قبول کے حقیقی معنی قبول کے معنی صحت کے ہیں اور لا تقبل صلاۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ بے وضو کی نماز صحیح نہیں ہوتی اور یہ جو حضور صلی اللہ فرمایا کہ جو کاہن کے پاس جائے اس کی نماز قبول نہیں۔ یہاں قبول کے حقیقی معنیٰ مراد ہیں یعنی ایسے شخص کی نماز بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت حاصل نہیں کرتی اور ثواب نہیں ملتا۔ معلوم ہوا کہ ہر مقبول عمل صحیح ہے لیکن نہیں کہ ہر صحیح عمل مقبول بھی ہو۔ صلاۃ سے ہر قسم کی نماز مراد ہے۔ خواہ وہ فرض نماز ہو یا سنت یا واجب۔ ہر وضو و طہارت پر موقوف ہے۔

مَنْ اَحْدَثَ کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے حدث کو پایا۔ حدث اکبر جنابت حیض و نفاس ہے اس سے غسل ہے اور حدث اصغر وہ چیزیں ہیں جن سے وضو لازم آتا ہے۔ جیسے مرد و عورت کے آگے سے منی (بلا شہوت کا اخ ودی، پاخانہ یا پیشاب کا نکلنا یا پیچھے سے ہوا کا خارج ہونا۔ لیٹ کر سونا اور منہ بھر قے کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ حدث ہو تو جب تک وہ حدث کو دور نہ کرے اس وقت تک اسکی نماز صحیح نہ ہوگی۔ حتی توضأ۔ یہ "نفی قبول" کا بیان ہے کہ نماز اس کی صحیح ہوگی جو کہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اگر پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم کرے کیونکہ تیمم وضو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّعِيْدُ الطَّيِّبُ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ | پاک مٹی مسلمان کا وضوء ہے۔

فُسَاءٌ اَوْ ضُرَاطٌ کے معنی

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف ہوا خارج ہونے کو حدث کیوں کہا؟ حالانکہ پیشاب و پاخانہ کا حدث ہے۔ شارحین نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔ اول، سائل کو چونکہ باقی انواع حدث کا

لیے ابوہریرہ نے صرف "ہوا کے خارج ہونے" کے بیان پر اکتفا کیا۔ دوم، حضرت ابوہریرہ نے ہوا کے خارج ہونے پر اکتفا اس لیے کیا کہ جب ہوا کا خارج ہونا حدث ہے تو اس کی جگہ پیشاب پاخانہ یا منی وغیرہ خارج ہوگا تو وہ بطریق اولیٰ حدث ہوگا۔ سوم، حضرت ابوہریرہ کا مقصد حصر نہیں ہے کہ صرف فساء وضراط ہی حدث ہیں۔ چہارم یہ کہ سائل نے پوچھا تھا کہ نماز کے اندر حدث کیا ہوتا ہے تو حضرت ابوہریرہ نے بتایا کہ نماز میں حدث یہی ہے کہ ہوا خارج ہو جائے۔ کیونکہ پاخانہ وپیشاب عموماً نماز میں نہیں آتے تو ابوہریرہ نے سائل کے سوال کے مطابق جواب دیدیا۔

مسائل حدیث

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ ہر قسم کی نماز کے لیے وضوء شرط ہے۔ خواہ وہ نماز فرض ہو یا واجب، جنازہ کی ہو یا عیدین کی اور اس مسئلہ پر علمائے اُمت کا اجماع ہے۔ بعض شافعیہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ جس نے قصداً بے وضوء نماز پڑھی وہ سخت گناہگار ہے اور حضرت امام اعظم سے منقول ہے کہ ایسا شخص کافر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ازراہِ تمسخر واستہزاء بے وضوء نماز پڑھے وہ کافر ہے ۲۔ نماز پڑھتے ہوئے حدث ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔

بَابُ فَضْلِ الْوُضُوْءِ وَالْغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ

باب، وضوء کی فضیلت اور ان لوگوں کی جو قیامت کے دن وضوء کے نشانوں سے سپید پیشانی والے ہوں گے

۱۳۶ ـ عَنْ نُعَيْمِ الْمُجْمِرِ قَالَ رَقِيْتُ مَعَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَلٰى ظَهْرِ الْمَسْجِدِ فَتَوَضَّاَ فَقَالَ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اُمَّتِيْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يُّطِيْلَ غُرَّتَهٗ فَلْيَفْعَلْ (بخاری شریف)

نعیم بن عبداللہ مجمر سے روایت ہے انہوں نے کہا میں ابوہریرہ کے ساتھ مسجد کی چھت پر چڑھا۔ ابوہریرہ نے وضوء کیا۔ پھر کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ میری اُمت کے لوگ قیامت کے دن بُلائے جائیں گے۔ سپید پیشانیوں اور سفید ہاتھ پیر والے وضوء کے نشانوں سے تو جو کوئی تم میں سے سفیدی بڑھانا چاہے۔ وہ بڑھائے۔

فوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کو امام مسلم علیہ الرحمۃ نے طہارت میں ذکر کیا ہے ۲۔ یہ حدیث گیارہ صحابہ کرام نے روایت کی ہے ۳۔ غُرٌّ، اغرّ کی جمع ہے۔ محجلین۔ جمع ہے محجل کی۔ وہ سپیدی جو گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں میں ہو اس کو محجل کہتے ہیں۔ المسجد میں الف لام عہدی ہے۔ اس سے مسجدِ نبوی مراد ہے۔ نعیم مجمر مجمر اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اجمار کے معنی عود وعنبر ولوبان وغیرہ سے دھونی دینے کے ہیں کیونکہ حضرت نعیم مسجدِ نبوی میں خوشبو کرنے کے لیے لوبان وغیرہ سُلگایا کرتے تھے۔ اس لیے ان کو مجمر کہا گیا۔ یُدْعَوْنَ۔ دُعا بمعنی ندا ہے۔ یعنی اُمتِ محمدیہ قیامت کے دن میزان پر بُلائی جائے گی اور ان کے اعضاءِ وضوء نورانی ہوں گے اور عرصاتِ محشر میں اعضاءِ وضوء کی نورانیت ان کو دیگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں سے ممتاز کر دے گی۔

۳۔ حدیث ہٰذا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ تک ہیں۔ فَمَنِ اسْتَطَاعَ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا کلام ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کی روایت میں خود نعیم یہ کہتے ہیں کہ میں نہیں کہ یہ جملہ حضور علیہ السلام کا فرمودہ ہے یا حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔ اس کے علاوہ دس صحابہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے مگر کسی میں یہ آخری جملہ نہیں ہے۔ ان یطیل غرتہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اعضائے وضوء کی نورانیت زیادہ کرنا چاہے تو وہ ان اعضاء کو جس حد تک کہ ان کا دھونا ضروری ہے۔ اس سے زیادہ دھوئے۔ مثلاً ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں تو ہاتھ کو مونڈھوں تک دھوئے۔ اس طرح دوسرے اعضاء کو دھوئے۔ یہ حضرت ابوہریرہ کا اپنا مس ہے جو مقبول نہیں ہوا لیکن "ان یطیل غرتہ" کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضوء کیا جائے تو جیسے ایک ایک بار دھونے کے بعد دوسری بار دھونے سے نظافت و پاکیزگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی وضوء پر وضوء کرنے سے ہیں اعضائے وضوء کی نورانیت میں اضافہ ہوگا۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد کی چھت پر وضوء کیا؛ اس سے مسجد کی چھت پر وضوء کرنے کا جو ہے اور چونکہ مسجد اور اس کی چھت سب کا حکم ایک ہے۔ اس بناء پر حضرت ابن عباس وابن عمر وعطاء ونخعی وطا ابن قاسم وغیرہ صحابہ کرام وفقہاء عظام نے مسجد میں وضوء کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فر ہیں کہ جو جگہ مسجد میں وضوء کے لیے مقرر کر دی گئی ہے وہاں تو جائز ہے لیکن مسجد میں وضوء کرنا مکروہ ہے۔ امام اعظم کا یہ قول دراصل حضور علیہ السلام کی ان قولی احادیث سے مستفاد ہے۔ جن میں مسجد کی نظافت و پاکیزگی کو قائم رکھنے ہدایت دی گئی ہے۔

واضح ہو کہ جو اہلِ علم مسجد میں وضوء کے جواز کے قائل ہیں۔ وہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جائز اس صورت میں ہے مسجد خراب نہ ہو اور نمازیوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس زمانہ میں مسجدیں کچی ہوتی تھیں۔ زمین ریتلی تھی۔ پانی گرا اور جلد خ گیا۔ اس لیے انھوں نے جواز کا قول کیا لیکن ہمارے زمانہ میں اگر مسجد کے اندر وضوء کی اجازت ہو جائے تو پھر فرش خراب ہونے کے علاوہ نمازیوں کو بھی کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا اور مسجد کی نظافت و پاکیزگی میں فرق آجائے گا کے پیش نظر سوائے اس مقام کے جو وضوء کے لیے مقرر ہے۔ مسجد کے باقی حصص پر وضوء کرنا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے شافعی علماء نے کہا کہ مسجد میں وضوء اس وقت جائز ہے جب کہ پانی وغیرہ برتن میں رہے۔ فرشِ زمین پر نہ گرے۔

۵۔ علماءِ کرام نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے وضوء کرنے والوں کے اعض ہوں گے اور یہ حضور علیہ السلام کی اُمت کے خصائص سے ہے۔ کسی دوسرے نبی کی اُمت میں یہ بات نہ ہوگی۔

۶۔ حدیث ہٰذا سے وضوء کرنے والوں کی فضیلت معلوم ہوتی اور یہ کہ قیامت حق ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ:۔

مَا اَطْلَعَ اللّٰهُ نَبِيَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْمُغَيَّبَاتِ الْمُسْتَقْبَلَةِ الَّتِيْ لَا يَطَّلِعُ	کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مغیبات مستق اُخرویہ کے ان احوالات وصفات اور حالات پر

يْهَا نَبِيًّا غَيْرَهٗ مِنْ اُمُوْرِ الْاٰخِرَةِ وَ صِفَاتِ مَا فِيْهَا

فرمایا۔ جن پر کسی اور نبی کو مطلع نہیں کیا گیا۔
(عینی ج ۱ ص ۶۷۰)

بَابٌ لَا يَتَوَضَّاُ مِنَ الشَّكِّ حَتّٰى يَسْتَيْقِنَ

باب محض شک کی وجہ سے وضوء نہ کرے جبتک کہ حدث کا یقین نہ آجائے

۱۳۷- عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ عَنْ عَمِّهٖ اَنَّهٗ شَكٰى اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ الَّذِيْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهٗ يَجِدُ الشَّيْءَ فِي الصَّلٰوةِ فَقَالَ لَا يَنْفَتِلْ اَوْ لَا يَنْصَرِفْ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ يَجِدَ رِيْحًا (بخاری)

حضرت عبادہ بن تمیم اپنے چچا (عبداللہ بن زید) سے راوی ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ایک شخص ہے جس کو نماز میں ہوا نکلنے کا شبہ ہوا۔ آپ نے فرمایا (وہ نماز کو نہ چھوڑے یا نہ مڑے جب تک کہ ہوا نکلنے کی آواز نہ سنے یا بدبو نہ پائے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب البیوع اور باب من لم یرالو ... الخ میں ذکر کیا اور نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد نے کتاب الطہارت میں ذکر فرمایا ۲۔ مطلب حدیث یہ ہے کہ جب تک حدث کا یقین نہ ہو جائے تب تک نماز نہ چھوڑے اور وضوء کے لیے نہ جائے۔ یعنی اگر نماز میں شک ہوا کہ ہوا نکلی ہے تو محض شک کی وجہ سے وضوء نہ جائے گا۔ ہاں اگر یقین ہو جائے کہ ہوا خارج ہوئی ہے خواہ آواز ہو یا نہ ہو۔ بدبو محسوس ہو یا نہ ہو مگر یہ یقین ہو کہ ہوا نکلی ہے تو اس صورت میں وضو جاتا رہے گا اور یہ حکم صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے یعنی اگر خارج نماز ہوا نکلنے کا شبہ ہو تو جب تک یقین نہ ہو وضو نہیں ٹوٹے گا البتہ شک کی صورت میں دوبارہ وضوء کرنے میں حرج نہیں۔ بشرطیکہ وسوسہ کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔

چنانچہ علامہ عینی نے حدیث ہذا کے اس ٹکڑے "حَتّٰى يَسْمَعَ اَوْ يَجِدَ رِيْحًا" کے تحت لکھا ہے جو شخص بہرا ہو وہ آواز نہیں سن سکتا اور جس کی قوت شامہ ختم ہوگئی ہو اس کو بدبو نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ہوا نکلنے کا احساس ہوتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ ہوا نکلی ہے مگر اس میں آواز اور بو نہیں ہوتی تو اس سے واضح ہوا کہ یہ حکم بُو اور بُو کی آواز کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مطلب حدیث یہ ہے کہ جب ہوا نکلنے کا یقین ہو تو وضوء جاتا رہتا ہے۔ خواہ آواز یا بُو ہو یا نہ ہو۔ علماء و فقہاء نے فرمایا کہ حدیث ہذا سے ایک کلیہ قاعدہ نکلتا ہے کہ کوئی یقینی کام شک کی وجہ سے زائل نہ ہوگا۔ یعنی ہر شے اپنے اصل حکم پہ باقی رہے گی تاوقتیکہ اس کے خلاف پر یقین نہ آجائے اور محض شک سے اس شے کا اصل حکم باطل نہ ہوگا مثلاً ہر کپڑا، ہر فرش یا ہر جگہ پاک ہے تو اگر شک ہو کہ یہ نجس ہوگا تو وہ پاک ہی سمجھا جائیگا۔ محض شک کی وجہ سے اُسے نجس نہ کہیں گے جب تک یقینی طور پہ نجاست معلوم نہ ہو جائے۔ اسی طرح باوضوء ہونے پر یقین ہے۔ تو محض اس شبہ کی بناء پر کہ ممکن ہے وضوء ٹوٹ گیا ہو، وضوء نہیں ٹوٹے گا یا مثلاً وضو کے بعد شک ہوتا ہے کہ کسی عضوء کو نہیں دھویا ہے یا اعضاء وضو میں سے کوئی جگہ سوکھی رہ گئی ہوگی تو اس صورت میں محض شک وضوء کی صحت میں خلل انداز نہ ہوگا۔ یونہی کسی کے منہ سے شراب کی بدبو آرہی

ہے مگر وہ نہ تو اقراری ہے اور نہ ہی اس پر کوئی گواہ ہے۔ تو ایسی صورت میں حد جاری نہیں کی جائے گی کیونکہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ حدیث ہذا میں وہمیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ وہم پر کسی چیز کی بنیاد نہ رکھیں۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ محض شک و شبہ کی بنا پر کسی مسلمان سے بدگمان نہ ہونا چاہیے۔

بَابُ التَّخْفِيْفِ فِي الْوُضُوْءِ

باب ہلکا وضو کرنے کے بیان میں

ہلکا وضو کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اعضاء وضو میں سے کسی عضو کو نہ دھویا جائے یا صرف تیل کی طرح اس طرح چپڑ لیا جائے کہ دو قطرے پانی بھی نہ ٹپکے بلکہ ہلکا وضو کرنے سے مراد یہ ہے کہ تین تین مرتبہ دھونے کی بجائے ایک بار دھویا جائے یا ایسے دھوئے کہ اعضاء پر سے زیادہ پانی نہ بہے بلکہ صرف دو قطرے ہر عضو سے بہیں۔

۱۳۸- اِبْنَ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا كَانَ فِيْ بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ مِنْ شَنٍّ مُعَلَّقٍ وُضُوْءًا خَفِيْفًا يُخَفِّفُهٗ عَمْرٌو وَيُقَلِّلُهٗ وَقَامَ يُصَلِّيْ فَتَوَضَّأْتُ نَحْوًا مِّمَّا تَوَضَّأَ ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَّسَارِهٖ وَرُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ عَنْ شِمَالِهٖ فَحَوَّلَنِيْ فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ ثُمَّ صَلّٰى مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ اَتَاهُ الْمُنَادِيْ فَاٰذَنَهٗ بِالصَّلٰوةِ فَقَامَ مَعَهٗ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ قُلْنَا لِعَمْرٍو اِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَيْنُهٗ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهٗ قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ رُؤْيَا الْاَنْبِيَآءِ وَحْيٌ ثُمَّ قَرَاَ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ

(بخاری شریف)

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے
ام المومنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں رات
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہوئے۔ جب
تھوڑی رات گزر گئی۔ آپ اٹھے اور آپ نے ایک
پرانی مشک جو لٹک رہی تھی۔ اس سے وضو
بن دینار اس وضو کے ہلکے پن کو بیان کرتے تھے
کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی آپ کی طرح
کیا اور آپ کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا (سفیان نے
کی جگہ شمالہ کا لفظ روایت کیا دونوں کے معنی ایک
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی دائیں طرف
لیا۔ پھر حضور نے نفل پڑھے جتنے اللہ نے چاہے
کے بعد کروٹ پر آرام فرما ہوئے یہاں تک
لگے۔ پھر مؤذن آیا اور آپ کو نماز کے لیے جگایا۔
کے ساتھ نماز کے لیے تشریف لے گئے اور نماز
نہ کیا۔ سفیان نے کہا ہم نے عمرو سے کہا بعض لوگ
یہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی آنکھیں سوتی ہیں
سوتا۔ عمرو نے جواب دیا۔ میں نے عبید بن عمیر سے
تھے انبیاء کے خواب وحی ہیں۔ پھر سورہ صافات
پڑھی۔ انی اریٰ فی المنام ..... الخ یعنی بیٹا میں خواب

ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے کتاب الصلوٰۃ، کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم و ترمذی نے صلوٰۃ میں، ابن ماجہ و نسائی نے طہارت میں ذکر کیا۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقضِ وضو نہیں کیونکہ نیند کی حالت میں بھی حضور علیہ السلام کا دل بیدار رہتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں

حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے سورہ صافات کی آیت سے یہ استدلال فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خواب کی ہدایت پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا اقدام فرمایا تھا اور قرآن پاک نے ان کے اس اقدام کو غلط نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی مدح کی جس سے ثابت ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی نہیں ہوتے تو نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ذبح فرزند کا اقدام کر سکتے تھے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تحسین ہو سکتی تھی۔ جس سے واضح ہوتا ہے انبیاء کرام کا خواب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے جاگتے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ہو یا بذریعہ فرشتہ کوئی حکم اُترا ہو۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خواب کے من جانب الٰہی ہونے پر پورا بھروسہ تھا تو انھوں نے اپنے فرزند سے فانظر ماذا تریٰ کیوں فرمایا۔ جب یہ خدا کا حکم تھا تو بیٹے سے رائے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس شبہ کے جواب میں مفسرین نے فرمایا کہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خواب کے وحی الٰہی ہونے میں تو قطعی حتمی کوئی شبہ و تذبذب نہ تھا لیکن اس سوال سے خود بیٹے کی آزمائش ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے فرمایا۔

یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی	اے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تو تیری کیا رائے ہے۔

سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جواب دیا۔

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ	اے باپ! جو آپ کو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

غور کیجئے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ جواب بھی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی اس خواب کو وحی ربانی سمجھتے تھے تبھی تو انھوں نے "ما تؤمر" (جو آپ کو حکم ملا ہے) اس کی تعمیل کیجئے" فرمایا۔ اگر خالی اپنے والد مکرم کی اطاعت مقصود ہوتی تو آپ کے جواب کے الفاظ یہ ہوتے" اِفْعَلْ مَا تَرٰی جو آپ مناسب سمجھیں کیجئے" سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے ان الفاظ سے جواب نہیں دیا بلکہ اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ کے الفاظ کہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی الٰہی ہوتا ہے۔

انبیاء کرام کے خواب شیطانی اثر و تسلط سے پاک ہوتے ہیں

۱۔ انبیائے کرام کے خواب شیطانی اثر و تسلط سے قطعاً حتماً محفوظ ہوتے ہیں اور انہیں وحی کے بارے میں یہ شک ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ معاذ اللہ شیطانی ہے یا رحمانی۔ انبیاء کرام کو وحی الٰہی میں دھوکہ، مغالطہ، شبہ و لغزش اور خطا و غلطی نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بتقاضائے حکمتِ الٰہیہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو تعبیر رویا کے بارے میں

کبھی ابتداءً عارضی خفا لاحق ہوجاتا ہے جس کا وقوع بھی بغیر اذنِ الٰہی نہیں ہوتا۔ پھر حکمتِ خداوندی پورا اُترتے ہی وتردد زائل ہوجاتا ہے یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے بعد اس کی تعبیر و مراد اور اصل مقصود و مطلوب امر میں اپنی حکمت پورا کرنے کے لیے نبی پر مخفی فرما دے اور نبی کو وحی کے اصل مقصود و مطلوب کے سمجھنے میں عارضی ہوجائے اور پھر وہ خلافِ مرادِ الٰہی ایک کام کا ارادہ فرمالے۔ ایسا خفا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بھی واقع ہوا۔ علیہ السلام نے ذبحِ فرزند کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کو پردۂ خفا میں رکھا گیا کیونکہ مرادِ الٰہی ذبحِ اسمٰعیل علیہ اگر ذبحِ اسمٰعیل ہی مرادِ الٰہی ہوتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات کا ارادہ کرے اور وہ پوری نہ ہو۔ پس میں جو انھوں نے دیکھا مرادِ الٰہی تو مینڈھے کا ذبح ہونا ہی تھا مگر اللہ عزوجل نے اپنی حکمت پورا کرنے کے لیے اس اصل مراد کو حضرت ابراہیم پر مخفی فرمادیا اور (خلافِ مرادِ الٰہی) ذبحِ فرزند پر تیار ہوگئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو بچا لیا اور اس کی جگہ مینڈھا ذبح ہوگیا۔ جس سے واضح ہوا کہ اس خواب سے مرادِ الٰہی ذبحِ اسمٰعیل علیہ السلام نہ تھی تو ان کو ذبح ہونے سے نہ بچایا جاتا۔ چنانچہ مفسرین عظام نے لکھا کہ :-

”سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بارگاہِ خیال میں جو صورت دیکھی تھی اس سے اصل مقصود ذبحِ ولد کی ذبحِ کبش کے ساتھ تھی ورنہ حضرت اسمٰعیل کو ذبح ہونے سے نہ بچایا جاتا۔“

صاحب روح البیان نے لکھا :-

”سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بارگاہِ خیال میں جو صورت دیکھی تھی اس سے وہ اصل مقصود کی طرف تجاوز فرماتے کہ اپنے تمثیلِ خواب یعنی ذبحِ ولد کی تعبیر ذبحِ کبش کے ساتھ لیتے (یعنی جو خواب انھوں نے دیکھا اپنے فرزند کو ذبح کر رہا ہوں۔ اس خواب سے مرادِ الٰہی تھی یعنی دنبہ کا ذبح ہونا) اور وہ دنبہ ذبح فرمادیتے (تو ان پھر ان کے کمالِ فنا اور جذبۂ ایمان و استسلام ظاہر نہ ہوتا۔ اسی طرح ان کے بیٹے کے جذبۂ فرمانبرداری و اطاعت و استقامت کا ظہور بھی نہ ہوتا۔ اس حکمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے خواب کی تعبیر کو ان پر مخفی فرما دیا۔ تاکہ ان اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار ہوجائے۔ گویا خواب کے اصل مقصود کو ان پر مخفی رکھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔“ (روح البیان جلد ۹ صـ ۲۷)

یا جیسے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

رَاَيْتُ فِي الْمَنَامِ اِلٰى اُهَاجِرُ مِنْ مَكَّةَ اِلٰى اَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ فَذَهَبَ وَهْلِي اِلٰى اَنَّهَا الْيَمَامَةُ اَوْهَجَرُ فَاِذَا هِيَ مَدِيْنَةُ يَثْرِبَ (بخاری و مسلم)	خواب میں دیکھا کہ میں کھجوروں والی زمین کی ہجرت کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہوا زمین یمامہ ہے یا ہجر ہے۔ مگر وہ مدینہ نکلا۔

ہجرت کے متعلق حضور علیہ السلام نے جو خواب دیکھا اور پھر ابتدائے امر میں اس خواب کی تعبیر آپ رہی۔ آپ نے خیال فرمایا۔ مقامِ ہجرت یمامہ یا ہجر ہے مگر مقامِ ہجرت مدینہ قرار پایا۔ یہ بھی ایک عارضی

واب کو لاحق ہوا اور حکمت الٰہی پوری ہوجانے کے بعد وہ زائل ہوگیا۔ غرضیکہ نبی کو اپنے خواب کے حق وصواب ہونے ور منجانب اللہ ہونے میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ البتہ خواب کی تعبیر اور اس کے اصل مقصود ومراد الٰہی کے بارے میں حکمتِ خداوندی کے مطابق کبھی ابتداءً عارضی خفا لاحق ہوسکتا ہے —— خوب یاد رکھیے! کہ حضرات نبیاء علیہم السلام کو اگر اپنے رویائے مقدسہ سمجھنے میں کبھی تردد وتفکر واقع ہوتا ہے تو اس کو غلطی سے تعبیر کرنا جائز نہیں بلکہ یہ تامل ان کی عدم توجہ پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کو کسی وقت بھی ایسے حالات پیش آئیں تو ہوسکتا ہے کہ عوام ان کے علم کو ذاتی تصور کرلیں اور اس طرح شرک میں مبتلا ہوجائیں۔ لہٰذا خالق مخلوق ور علم ذاتی وعطائی کے فرق کو برقرار رکھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پر عدم توجہ اور ذہول جیسے حالات طاری ہو جاتے ہیں اور ان کا طریان عارضی ہوتا ہے۔ حکمتِ الٰہیہ کے پورا ہوجانے کے بعد وہ خفا اور تردد ایک آن کے لیے باقی نہیں رہتا۔ (فافہم)

۲۔ اس حدیث کے باقی مسائل یہ ہیں:۔ وضوء میں اعضاء کو دھونا فرض ہے اور تین تین بار ہر عضو کو دھونا سنت ہے اور کم سے کم دھونے کا درجہ یہ ہے کہ اعضاء پر اس طرح پانی بہایا جائے کہ دو قطرے پانی بہہ جائے کیونکہ عضو کے دھونے کے معنی یہ ہیں کہ اس عضو کے ہر حصہ پر کم از کم دو بوند پانی بہہ جائے۔ صرف بھیگ جانے یا تیل کی طرح پانی چپڑ لینے یا ایک آدھ بوند پانی بہہ جانے کو دھونا نہیں کہتے۔ نہ اس سے وضوء یا غسل ادا ہوگا۔ اس امر کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور نمازیں اکارت جاتی ہیں۔

۳۔ اس حدیث میں ہلکا وضو کرنے کا یہی مطلب ہے کہ اعضاء کو ایک ایک بار دھویا جائے تو وضوء ہوجائے گا یا یہ کہ اس طرح اعضاء کو دھویا جائے کہ پانی زیادہ نہ بہے بلکہ دو دو بوند بہہ جائے۔

۴۔ نیند سے انبیاء علیہم السلام کا وضو نہیں جاتا کیونکہ ان کا قلب ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں نیند ناقضِ وضو نہیں ہے۔ بلکہ نیند کو ناقضِ وضوء اس لیے کہتے ہیں کہ جب آدمی سوتا ہے تو بے خبر ہوجاتا ہے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑجاتے ہیں اور ہوا کے نکلنے کا احساس نہیں ہوتا حالانکہ ہوا نکل جاتی ہے۔ برخلاف انبیاء کے کہ ان کی آنکھیں بظاہر نیند میں ہوتی ہیں مگر دل پر غفلت طاری نہیں ہوتی۔

۵۔ جب مقتدی ایک ہو تو وہ امام کے دائیں طرف کھڑا ہو۔ امام احمد کا قول یہ ہے کہ بائیں طرف کھڑا ہونے سے نماز باطل ہوجائے گی۔ حضرت امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی ایک ہی ہو تو وہ امام کے بائیں طرف کھڑا ہو یا امام کے پیچھے کھڑا ہوجائے تو نماز باطل نہ ہوگی البتہ ایسا کرنا خلاف سنت ہے اور بُرا ہے۔

۶۔ ایک ہی وضوء سے نفل اور فرض پڑھ سکتے ہیں بلکہ جب تک وضو باقی رہے اسی وضوء سے جس قدر فرائض ونوافل چاہیں پڑھے جاسکتے ہیں ۷۔ نفل نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔

۸۔ دو آدمی ہوں تو ایک آدمی مقتدی اور دوسرا امام بن جائے جماعت کا ثواب مل جائیگا۔

۹۔ جس طرح فرض نماز کلام کرنے سے باطل ہوجاتی ہے اسی نفل بھی باطل ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت

ابن عباس حضور علیہ السلام کے بائیں جانب کھڑے ہوئے تو آپ نے ان کا سر پکڑ کر یا ہاتھ پکڑ کر یا بازو پکڑ کر دائیں طرف پھیر لیا اور کلام نہ فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتنے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

۱۰۔ نماز کی اصلاح کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا جائز ہے۔ ۱۱۔ مؤذن کا نماز کے لیے امام کو جگانا یا بلانا درست

۱۲۔ ہوشیار بچہ کی نماز درست ہے اگرچہ نابالغ کی امامت درست نہیں ہے۔

اس حدیث میں رات کے نوافل کا ذکر ہے جو پہلے واجب تھے پھر ان کی واجبیت منسوخ ہو گئی۔ اب رات کو سونے کے بعد تہجد پڑھنا سنت ہے اور تہجد پڑھنے والوں کو حج وعمرہ کا ثواب ملتا ہے (ترمذی شریف)

بَابُ اِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ

باب پورا وضوء کرنے کے بیان میں

لغت میں اسباغ کے معنی پورا کرنے اور تمام کرنے کے آتے ہیں۔ وضوء میں اسباغ یہ ہے کہ اعضاء کے ہر حصہ کو مکمل طور پر دھویا جائے۔ اس طرح کہ عضو کا کوئی حصہ خشک نہ رہے خواہ ایک ہی بار دھوئے لیکن اسباغ کے فضائل کی حدیث پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسباغِ وضوء کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ ہر عضو کے ہر حصہ کو تین بار دھویا جائے۔

قَالَ ابْنُ عُمَرَ اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ الْاِنْقَاءُ

حضرت ابن عمر نے فرمایا۔ اسباغ وضوء کے معنی اعضاء کو خوب اچھی طرح دھونے کے ہیں

اس تعلیق کو امام عبد الرزاق علیہ الرحمۃ نے موصولاً اسنادِ صحیح کے ساتھ اپنے مصنف میں ذکر کیا کہ حضرت ابن عمر نے اسباغ کی تفسیر انقاء کے لفظ سے کی ہے —— یہ ظاہر ہے کہ اسباغ کے معنی لغت میں اتمام کے ہیں اور اتمام لازم ہے تو حضرت ابن عمر نے شی کی تفسیر اس کے لازم سے فرما دی کیونکہ جب ہر عضو کو تین تین بار خوب اچھی طرح دھویا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعضاء سے میل کچیل زائل ہو جائے گا۔

۲۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابن عمر پاؤں کو سات بار دھوتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ ایسا نہیں کرتے تھے نہ سات بار دھونے کو سنت سمجھتے تھے بلکہ بوقتِ ضرورت جب کہ پاؤں پر زیادہ میل کچیل جم جاتا ہوگا تو اس صورت میں کرتے ہوں گے اور یہ جائز ہے۔

۱۳۹۔ دَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عَرَفَةَ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِالشِّعْبِ نَزَلَ فَبَالَ ثُمَّ تَوَضَّاَ وَلَمْ يُسْبِغِ الْوُضُوْءَ فَقُلْتُ الصَّلٰوةَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ الصَّلٰوةُ اَمَامَكَ فَرَكِبَ فَلَمَّا جَاءَ الْمُزْدَلِفَةَ نَزَلَ

حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ عرفات سے واپس ہوئے جب گھاٹی میں پہنچے سے حاجی جاتے ہیں) تو آپ اترے پیشاب کیا کیا لیکن پورا وضوء نہیں کیا۔ میں نے عرض کی یارسول نماز پڑھیے گا۔ آپ نے فرمایا۔ آگے چل کر پڑھیں گے۔ پھر آپ سوار ہوئے۔ جب مزدلفہ پہنچے تو

فَتَوَضَّأَ فَأَسْبَغَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ
أُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ
ثُمَّ أَنَاخَ كُلُّ إِنْسَانٍ بَعِيْرَهٗ
فِيْ مَنْزِلِهٖ ثُمَّ أُقِيْمَتِ الْعِشَاءُ
فَصَلّٰى وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا
(بخاری شریف)

اور وضو کیا پورا وضو۔ پھر نماز کی تکبیر کہی گئی۔ آپ نے مغرب کی نماز پڑھی۔ بعد اس کے کہ ہر آدمی نے اپنا اونٹ اپنے ٹھکانے میں (جہاں وہ اُترنا چاہتا تھا) بٹھایا۔ پھر عشاء کی تکبیر ہوئی۔ آپ نے عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی (یعنی مغرب وعشاء کے فرضوں کے درمیان کوئی سنت یا نفل نہیں پڑھی)

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حج و طہارت میں اور مسلم۔ نسائی اور ابو داؤد نے صرف حج میں ذکر کیا۔

۲۔ حضرت اسامہ بن زید حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی ہیں۔ ان کے والد اور دادا بھی صحابی تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم، آپ کے والد زید کا نام قرآن کریم میں آیا۔ آپ کی انگوٹھی کے نقش کی عبارت، حُبّ رسول اللہ، اللہ کے رسول کا محبوب) تھی۔ آپ سے کل ایک سو اٹھائیس حدیثیں مروی ہیں۔ جن پر بخاری و مسلم نے پندرہ پر اتفاق کیا اور دو کو بخاری نے اور دو کو مسلم نے منفرداً ذکر کیا۔ اسامہ نامی چھ صحابی ہیں لیکن اسامہ بن زید صرف یہی ہیں حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اقدس علیہ السلام نے ۱۸ سال کی عمر میں لشکر کا سردار بنایا تھا۔ بوقت وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ وادی القریٰ میں بعد شہادتِ عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا ۵۴ھ میں وفات پائی۔

۳۔ یہ واقعہ حج کے موقع کا ہے جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وقوفِ عرفات سے فارغ ہو کر مزدلفہ آ رہے تھے راستہ میں آپ نے پیشاب کیا اور اس کے بعد خفیف وضو فرمایا۔ حضرت اسامہ نے عرض کی۔ حضور مغرب کی نماز پڑھیے گا؟ فرمایا۔ نماز کی جگہ تیرے آگے ہے یعنی مغرب وعشا کے وقت میں مزدلفہ پہنچ کر پڑھی جائے گی۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ و محمد بن حسن نے اس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ عرفات سے واپسی مغرب کو عشا کے وقت تک مؤخر کرنا واجب ہے۔ اگر کسی نے راستہ میں مغرب اس کے وقت میں پڑھ لی تو جائز نہ ہوگی۔ اس کو مغرب دوبارہ عشا کے وقت میں مزدلفہ پہنچ کر پڑھنا ہوگی۔ مغرب کو عشا کے وقت میں پڑھنے کا حکم صرف اس شخص کے لیے ہے جو عرفات سے مزدلفہ آئے۔ لیکن وہ شخص جو رات کو عرفات ہی میں رہ گیا یا مزدلفہ کے سوا کسی دوسرے راستے سے آیا تو اُسے مغرب کی نماز اپنے وقت ہی میں پڑھنی ضروری ہے۔ امام زفر اور کوفیوں کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب ہے۔

۴۔ اس حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے مزدلفہ پہنچ کر پہلے مغرب پڑھی۔ پھر لوگوں نے اپنے اونٹ اور سامان محفوظ کیا۔ اس کے بعد عشاء پڑھی گئی۔ جس سے واضح ہوا کہ مغرب وعشاء کے درمیان موالات واجب نہیں ہے لیکن حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچتے ہی اسباب وغیرہ اتارنے سے پہلے مغرب اور پھر عشاء پڑھی جائے اور مغرب وعشا کے درمیان فصل نہ کیا جائے جیسا کہ صحیح روایات میں آیا ہے۔ اِنَّهُمْ صَلَّوْا قَبْلَ

حَطِّ رِحَالِهِمْ حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا بھی یہی قول ہے۔

۴۔ اس حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد سنتیں وغیرہ نہیں پڑھیں بلکہ اس
بعد عشاء پڑھی۔ معلوم ہوا کہ مغرب کی سنتیں اور عشاء کی سنتیں اور وتر وغیرہ عشاء کے بعد پڑھے جائیں گے۔ اسی
اعظم علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال کیا کہ اگر مغرب کے بعد سنتیں پڑھ لیں یا کوئی اور کام کیا پھر عشاء پڑھی تو یہ بات
عشاء کی جمع میں مخل ہوگئی۔ اس لیے اب عشاء کے وقت بھی اقامت کہی جائے گی۔ جیسا کہ حدیث زیر بحث میں
کہ مغرب کے لیے الگ اقامت کہی گئی۔

۵۔ حضرت عبدالرحمن بن یزید، اسود، مالک، شافعی و امام احمد بن حنبل و حضرت فاروق اعظم و ابن مسعود رضی
عنہم کا مسلک یہ ہے کہ مغرب کے لیے علیحدہ اور عشاء کے لیے علیحدہ اقامت کہی جائے۔

۶۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و ابو یوسف و امام محمد کا مسلک یہ ہے کہ مزدلفہ میں مغرب و عشاء کے لیے
اذان اور ایک اقامت کہی جائے جیسا کہ حضرت جابر و عبداللہ بن عمرو ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے
ہے اور اگر مغرب کے بعد کوئی اور کام کر لیا تو پھر عشاء کے لیے بھی اقامت کہی جائے۔ اس مسئلہ میں امام کی دلیل حدیث
ہی ہے (فافہم)

۷۔ اس حدیث میں اذان کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن امام شافعی، امام احمد، ابوثور، عبدالملک بن الماجشون
فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ مغرب کے لیے اذان کہی جائے، عشاء کے لیے نہیں۔ امام طحاوی کا یہی مذہب ہے

۸۔ مزدلفہ پہنچ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء میں اسباغ فرمایا۔ یعنی خوب اچھی طرح وضوء فرمایا یا
کہ تین تین مرتبہ دھویا۔ باب سے حدیث کے صرف اتنے ہی ٹکڑے کا تعلق ہے۔ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا
یہ ہے کہ مغرب و عشاء کی سنتیں اور وتر وغیرہ عشاء کے بعد پڑھے جائیں تو جب مغرب و عشاء کے فرضوں کے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی سنتوں کو بھی نہیں پڑھا تو اس سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید ہوئی
مغرب و عشاء کے فرضوں کے درمیان کسی کام کو کر کے فصل نہ کیا جائے مگر جب کہ ضرورت ہو تو حرج نہیں۔ جیسے حض
اونٹوں کو مغرب پڑھ کر باندھ دیا کیونکہ ان کے کھلے رہنے میں حرج تھا۔

۹۔ اس حدیث سے امام شافعی نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ قضا نماز کے پڑھنے کے لیے صرف اقامت کہی جائے
نہیں لیکن ان کا یہ استدلال تام نہیں کیونکہ اس موقع پر مغرب کو جو عشاء کے وقت پڑھا جا رہا ہے یہ قضا نہیں ہے
ادا ہے اسی لیے مغرب کو ادا کی نیت سے پڑھتے ہیں نیز شارع علیہ السلام نے اس موقع پر مغرب کے لیے عشاء کا وقت
فرمایا ہے تو اس لحاظ سے بھی یہ ادا ہی ہے قضا نہیں ہے۔

بَابُ غَسْلِ الْوَجْهِ بِالْيَدَيْنِ مِنْ غُرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

باب ایک ہاتھ سے پانی کا چلو لے کر دونوں ہاتھوں سے منہ دھونے کے بیان میں

۱۔ اس عنوان سے امام بخاری کا مقصد یہ بتانا ہے کہ وضوء کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے چلو لینا واجب

جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے ایک ہاتھ سے پانی کا چلو لیا اور منہ دھوتے وقت دونوں ہاتھوں سے دھویا اور فرمایا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ۲- دونوں بابوں میں مناسبت یہ ہے کہ پہلے میں حضور علیہ السلام کے وضو کے طریقہ کا بیان تھا۔ اس میں اسی کی تفصیل ہے۔

۱۴۰- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ تَوَضَّاَ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّآءٍ فَتَمَضْمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّآءٍ فَجَعَلَ بِهَا هٰكَذَا اَضَافَهَا اِلٰى يَدِهِ الْاُخْرٰى فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُمْنٰى ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّآءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُسْرٰى ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً مِّنْ مَّآءٍ فَرَشَّ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُمْنٰى حَتّٰى غَسَلَهَا ثُمَّ اَخَذَ غُرْفَةً اُخْرٰى فَغَسَلَ بِهَا رِجْلَهٗ يَعْنِي الْيُسْرٰى ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّاُ۔ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وضو کیا اپنا منہ دھویا۔ ایک چلو پانی لیا۔ اس سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ پھر ایک چلو پانی لیا (ایک ہی ہاتھ سے) اور اس طرح کیا کہ اس کو جھکا کر دوسرے ہاتھ پر ڈال لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دھویا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا اور اس سے اپنا سیدھا ہاتھ دھویا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا اور اس سے اپنا بایاں ہاتھ دھویا۔ پھر اپنے سر پر مسح کیا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا۔ داہیں پاؤں پر چھڑکا۔ اس کو دھو ڈالا۔ پھر ایک اور چلو پانی لیا۔ اس سے بائیں پاؤں کو دھویا۔ اس کے بعد کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو ابن ماجہ، نسائی اور ابوداؤد نے طہارت میں ذکر کیا۔ نسائی کی حدیث میں کانوں کے مسح کرنے کا ذکر ہے۔ امام بخاری حضرت ابن عباس سے اس حدیث میں منفرد ہیں۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباس سے وضو کے باب میں کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ ۲- مضمضہ۔ کے لغوی معنی پانی کو منہ میں لے کر حرکت دینے کے ہیں اور وضو میں اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی کو لے کر حرکت دی جائے تاکہ سارے منہ میں پھر جائے۔ اس کے بعد کلی کر دی جائے۔ استنشاق۔ کے معنی ناک میں پانی داخل کرنے کے ہیں اور وضو میں اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کو ناک میں کھینچا جائے۔ یہاں تک کہ نرم ہڈی (جہاں پانی پہنچ کر لگتا ہے) تک پانی پہنچ جائے اس کے بعد اس کو جھاڑ دیا جائے۔ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنتِ مؤکدہ ہے اور غسل میں فرض ہے۔ لہٰذا غسل جنابت میں اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ غسل نہ ہوگا۔

مسائل حدیث

۱- اس حدیث میں ایک ایک مرتبہ ہر عضو کے دھونے کا بیان ہے۔ جس پر سب کا اجماع ہے کہ اس قدر فرض ہے۔ ۲- جس ترتیب سے حضرت ابن عباس نے وضو کر کے دکھایا اسی ترتیب سے وضو کرنا مسنون ہے۔ ۳- حضرت ابن عباس نے ایک ہی چلو پانی سے کلی بھی کی اور ناک میں پانی لیا یہ جائز ہے لیکن مستحب

واستنشاق کے لیے الگ الگ پانی لینا افضل ہے جیسا کہ طبرانی و ابوداؤد میں حدیث ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں فَاَخَذَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مَاءً جَدِيدًا ۴۔ یہ بھی سنت ہے کہ مضمضہ و استنشاق داہنے ہاتھ سے کیا جائے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سیدھے ہاتھ سے ناک میں پانی لیا۔ اس پر حضرت معاویہ نے اعتراض کیا اور ک رسول سے جہالت ہے۔ حضرت امام حسن نے فرمایا سنت تو ہمارے گھروں سے نکلی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نبی علیہ نے فرمایا۔ اَلْيَمِيْنُ لِلْوَجْهِ وَالْيَسَارُ لِلْمَقْعَدِ۔ سیدھا ہاتھ منہ کے لیے ہے اور بایاں ہاتھ استنجے (بدائع) البتہ ناک بائیں ہاتھ سے صاف کرنی چاہیے ۵۔ اس حدیث میں سر کے مسح کے لیے پانی لینے کا ذکر نہیں جس ہوتا ہے کہ مسح کے لیے ہاتھ تر ہونا ضروری ہے اور جو تری اعضا کے بعد رہ گئی ہو اس سے بھی مسح کیا جا سکتا ہے۔ امام اوزاعی و حسن وغیرہ کا یہی مسلک ہے لیکن امام شافعی و مالک کہتے ہیں ہاتھ میں جو تری رہ جاتی ہے اس سے مسح بلکہ مسح کے لیے دوبارہ ہاتھ کو تر کرنا چاہیے جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ ابن عباس نے مسح کے لیے ایک چلو ہاتھ کو جھاڑ کر مسح کیا۔ لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ میں جو تری رہ گئی اس سے مسح ہاتھ کو تر نہ کیا تو جب دونوں طرح حدیث میں مذکور ہے تو اعضا کے دھونے کے بعد جو تری رہ جاتی ہے اس سے جائز ہونا چاہیے اور یہ بھی جائز ہے کہ مسح کے لیے نئے پانی سے ہاتھ کو تر کرے ۶۔ امام مالک علیہ الرحمۃ نے حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فعل سے کہ انہوں نے مسح کے لیے نئے پانی سے ہاتھ کو تر نہ کیا بلکہ جو تری باقی تھی اسی سے لیا۔ یہ استدلال کیا ہے کہ پانی مستعمل طاہر و مطہر ہے کیونکہ جب ایک بار پانی عضو سے مل گیا تو وہ پانی مستعمل ہو گیا اعضاء وضو میں سے ایک (عضو مسح) میں اس کا استعمال جائز ہوا تو سب میں جائز ہونا چاہیے۔ علامہ عینی فرماتے مالک علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ پانی مستعمل اس کو کہتے ہیں جو عضو سے بہہ جائے اور جب تک پانی اور ٹپکے نہیں اس کو مستعمل نہیں کہا جا سکتا ۷۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ وضو میں پاؤں دھونا ضروری پانی چھڑک دینا کافی نہیں ہے۔

بَابُ التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَّعِنْدَ الْوِقَاعِ

باب ہر کام کے وقت بسم اللہ پڑھنا اور صحبت کے وقت بھی

۱۴۱۔ قَالَ لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا اَتٰى اَهْلَهٗ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا فَقُضِيَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ لَّمْ يَضُرَّهٗ (بخاری شریف)

حضرت ابن سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی اپنی صحبت کرنی چاہے تو یوں کہے۔ بسم الل ہم کو شیطان سے بچائے رکھ اور جو اولاد تم اس سے شیطان کو دور رکھ۔ پھر جو اولاد ہوگی اس کو شیطان نقصان نہ پہنچائے گا۔

فوائد حدیث اس باب میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ کہنا مسنون ہے۔ حتیٰ کہ جماع کے بسم اللہ پڑھنا باعث برکت ہے اور بسم اللہ ہر حال میں پڑھی جا سکتی ہے۔ خواہ آدمی

ناپاک، بے وضو ہو یا جنبی ۲- اس حدیث کو امام نے ذیل کے ابواب میں ذکر کیا ہے۔ توحید، دعوات، نکاح، صفۃ بلیس اور مسلم و ابوداؤد نے نکاح میں اور نسائی نے باب عشرۃ النساء میں ذکر کیا ہے۔

کیا وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے

حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ جماع سے پہلے بسم اللہ پڑھنا باعث برکت ہے۔ جو اولاد ہوگی وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہے گی ۳- اہل ظاہر اور اسحٰق بن راہویہ کا قول یہ ہے کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور جس نے قصداً عمداً بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں ہوگا۔ یہ لوگ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دلیل لاتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں ہوتی۔ وَلَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ جس نے بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں ہوگا۔ یہ حدیث اگرچہ متعدد طرق سے مروی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد و ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ مگر اس مضمون کی تمام حدیثوں میں علماء نے کلام کیا ہے۔ علامہ مروزی و بزار نے کہا کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی۔ تفصیل کیلئے نیل الاوطار جلد ۱، ص ۱۳۵ کا مطالعہ کافی ہوگا۔ غرضکہ اس باب میں کوئی حدیث صحیح ہے ہی نہیں تو ان سے واجب کا قول کرنا درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے غیر مقلدین کے آئمہ اربعہ میں سے کسی نے وضو کے لیے بسم اللہ پڑھنے کو واجب قرار نہیں دیا۔ ۵- حضرت امام اعظم، مالک، شافعی، احمد بن حنبل آئمہ اربعہ و جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سُنّت ہے۔ اگر کسی نے بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس کا وضو ہو جائیگا۔ یہ حضرات متعدد حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل بحث طحاوی میں مذکور ہے اور امام بیہقی نے متعدد حدیثوں سے یہی ثابت کیا ہے کہ وضو کے لیے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے واجب نہیں۔

ہر نیک کام سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھنا

فائدہ، حدیث زیر بحث اگرچہ جماع کے متعلق ہے کہ اس وقت بھی بسم اللہ پڑھ لینا باعث برکت ہے لیکن اس سے ایک قوی ہدایت یہ ملتی ہے کہ ہر وہ موقع و محل جہاں شیطان کے دخل کا امکان ہو وہاں بسم اللہ پڑھ لی جائے اور ظاہر ہے کہ شیطان ہر موقع و محل پر آدمی کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وضو ہو نماز ہو ہر جگہ ہر مقام پر فساد ڈالتا ہے۔ اسی لیے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے علیٰ کل حال کے الفاظ سے عنوان قائم کر دیا اور بتا دیا کہ جب بوقت جماع بسم اللہ پڑھنے کی ہدایت دی گئی ہے تو وضو کرتے وقت تو بطریق اولیٰ بسم اللہ کی مشروعیت ہونی چاہیئے۔ (۲) رہا یہ سوال کہ بسم اللہ پڑھنے کے باوجود بھی بعض کاموں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ نہیں ہونا چاہیئے تو جواب یہ ہے کہ بسم اللہ کی اصل تاثیر تو یہی ہے کہ جس کام سے پہلے اس کو پڑھ لیا جائے وہ فساد سے محفوظ و مصئون رہے اور اس میں برکت پیدا ہو جائے مگر اس کے لیے کچھ شرائط اور موانع بھی ہیں۔ اگر شرائط پائے جائیں اور موانع اُٹھ جائیں تو ضرور بالضرور اس کام میں برکت ہو۔ اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ کتب طب میں دواؤں کے خواص بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً لکھا جاتا ہے کہ اطریفل استعمال کرنے والا ہمیشہ نزلہ سے محفوظ رہے گا۔ اب اس سے یہ سمجھ لینا کہ اطریفل کا استعمال کرنیوالا تیل، ترشی وغیرہ انتہائی درجہ کی نزلہ پیدا کرنے والی چیزیں بھی کھاتا رہے اس کو بھی کبھی نزلہ نہیں ہوگا، سخت نافہمی اور غلطی

کے طرزِ کلام سے ناواقفی ہے۔ اس مثال سے واضح ہوگیا کہ اطریفل کی اپنی خاصیت تو یہ ہے کہ اس کے استعمال سے نزلہ سے محفوظ رہے لیکن اس کے ساتھ بد پرہیزیاں بھی کی جائیں تو وہ بھی اپنا اثر دکھائیں گی اور اس وقت یہ کہ نہ ہوگا کہ اطریفل میں نزلہ دُور کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی حال بسم اللہ کا ہے۔ اس کی اصل خاصیت یہی ہے جب پڑھی جائے برکت ہو لیکن اس کے ساتھ دوسری بداعمالیاں بھی ہوں تو پھر برکت نہ ہوگی اور یہ قصور کا نہیں بلکہ انسان کا خود اپنا ہوگا کہ وہ بسم اللہ کی برکت کو دوسرے اعمالِ قبیحہ کا ارتکاب کرکے ضائع کردیتا ہے پانی کی اصل خاصیت تو یہی ہے کہ وہ پودوں کی نشوونما کرے لیکن اگر کوئی باغبان صبح کو تو پودوں کو پانی دے اور کو جو پتے اور کونپل پیدا ہوں ان کو کاٹ ڈالے تو اس میں پانی کا نہیں خود باغبان کا اپنا قصور ہے۔

۴۔ خوب یاد رکھیے، اُمت کے طبیبِ اعظم اور معلمِ کائنات حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اعمالِ خیر پر بشارت ہے۔ مثلاً فرمایا وضو کرنے والے کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں یا جن دواؤں کے خواص بیان فرمائے ہیں مثلاً فرمایا کہ بیماریوں کے لیے شفا ہے یا جن کلمات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا پڑھنا باعثِ برکت ہے تو اس نوع کی جملہ مقصد و مطمحِ نظر کسی عملِ خیر یا کسی چیز کی ذاتی خاصیت اور اس کے اصل اثر کو بتلانا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اگر اعمال کا تقاضا اس کے خلاف ہوا تو پھر انجام کیا ہوگا۔ لہٰذا اگر کسی عمل یا کلمہ کے پڑھنے سے اس کی وہ خاصیت اور نہ ہو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس عمل میں خاصیت نہیں ہے۔ بلکہ سمجھنا چاہیے کہ اس عمل میں تو حضور علیہ السلام کی ارشاد فرمودہ خاصیت تھی اور اس کے اثرات بھی فی الواقع مرتب ہوتے مانع کی وجہ سے اس کا ظہور نہیں ہوا۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے کوئی جذباتی وخطابی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کہ اگر اس نکتہ کو ملحوظ رکھا گیا تو وعد و وعید، ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی صدہا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو جو غلط فہمی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جو اُلجھن ہوتی ہے وہ ان شاء اللہ العزیز نہ ہوگی۔ فافہم

بَابُ مَا يَقُولُ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب بیت الخلاء جاتے وقت کیا پڑھے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باب تو ہے وضوء کا اور امام نے استنجاء کے احکام و مسائل کی حدیثیں ذکر کرنی شروع جواب یہ ہے کہ امام بخاری کا اندازِ فکر یہ ہے کہ وہ جب کسی امر کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے متعلقات بھی ذکر فرما دیتے گزشتہ باب میں ہر کام کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنے کا بیان تھا۔ اب امام نے اسی کی نظیر میں یہ بتایا کہ بیت الخلاء وقت بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر مستحب ہے۔ پھر چونکہ بیت الخلاء کا ذکر آگیا تو اس کے آداب و احکام کی احادیث بھی

۱۴۲۔ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُولُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (بخاری)

عبدالعزیز بن صہیب کہتے ہیں۔ میں نے حضرت سے سُنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت الخلاء تو یوں فرماتے یا اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبائث سے۔

فوائد ومسائل

۱۔ اس حدیث کو امام بخاری نے دعوات میں بھی ذکر کیا اور مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد نے طہارت میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ خلاء، لغت میں خالی مکان کو کہتے ہیں۔ یہاں سے مراد بیت الخلاء ہے۔ خبث وخبائث، خبث جمع ہے خبیث کی اور مراد اس سے شیاطین وجنات کے مرد وعورتیں ہیں جو ایسی خالی جگہ اور ناپاک جگہ میں رہتے ہیں۔ شرح السنہ میں ہے خبث سے مراد کفر اور خبائث سے مراد شیطان ہے۔ ابن بطال نے کہا کہ خبث تمام برائیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کلام عرب میں خبث کا اطلاق (مکروہ) ناپسندیدہ چیز پہ آتا ہے۔ اگر وہ کلام میں ہو تو اس کو شتم کہتے ہیں، دین میں ہو تو کفر، کھانے میں ہو تو حرام، پینے کی چیز میں ہو تو اس کو ضار کہتے ہیں۔ بعض نے خبث کے معنیٰ برائی یا گناہ کے بھی کیے ہیں۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ بیت الخلاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں شیاطین اور دیگر مضر اور نقصان دہ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اس مقام پر جاتے وقت استعاذہ کی تعلیم دی گئی تاکہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور استعاذہ کی برکت سے اس مقام کے اثرات سے محفوظ رہے۔

۳۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا بیت الخلاء جاتے وقت یہ دُعا پڑھنا اور شیطان سے پناہ مانگنا تواضع کے لیے اور اُمت کی تعلیم کے لیے تھا ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو شیاطین جنّ وانس سے قطعاً حتماً محفوظ ہیں۔ کیا دیکھا نہیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنی مسجد شریف کے ایک ستون سے ایک شیطان کو باندھ دیا تھا (عینی ج ۱ صـ ۶۹۸)۔

۴۔ بعض علماء نے کہا کہ اعوذ کے ساتھ بسم اللہ بھی ملا لے۔ چنانچہ ایک حدیث میں جو شرطِ مسلم پر ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام بیت الخلاء جاتے تو فرماتے۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ (عینی ج ۱ صـ ۶۹۸)۔ (۵) حدیث ہذا میں اِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ بیت الخلاء میں جانے کا ارادہ فرماتے اس وقت دعا پڑھتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا۔ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اس کے معنیٰ یہی ہیں کہ جب قرآن پڑھنے کا قصد کیا جائے تو اعوذ پڑھی جائے۔ اسی طرح یہاں ہے (چنانچہ خود امام نے (ادبِ مفرد) میں، جو حدیث درج کی ہے۔ اس میں اِذَا اَرَادَ الدُّخُوْلَ کے لفظ صراحۃً موجود ہیں (فافہم) جب پاخانہ جانے کا ارادہ کیا جائے تو اس وقت بسم اللہ پڑھ لی جائے اور اگر پاخانہ بنا ہوا نہ ہو تو حاجت شروع کرنے یعنی کپڑا اُٹھانے سے پہلے یہ دُعا پڑھی جائے ۶۔ پاخانہ میں داخل ہو کر یا قضائے حاجت کرتے وقت زبان سے اللہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

بَابُ وَضْعِ الْمَآءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب بیت الخلاء کے پاس پانی رکھنا

۱۴۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْخَلَاءَ فَوَضَعْتُ لَهٗ وَضُوْءًا قَالَ مَنْ وَضَعَ هٰذَا فَاُخْبِرَ فَقَالَ اللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء گئے تو میں نے آپ کے لیے وضو کا پانی رکھا۔ آپ نے باہر آکر پوچھا۔ یہ پانی کس نے رکھا۔ لوگوں نے عرض کی ابن عباس نے فرمایا اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما۔

فوائد و مسائل

حدیثِ ہذا کو امام نے کتاب الصلوٰۃ میں بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ و مسلم و ابوداؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ حدیثِ ہذا عنوان سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عنوان تو یہ کہ پاخانہ پیشاب کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کر سکتے ہیں جب کہ کوئی آڑ ہو۔ لیکن حدیثِ ہذا میں مطلقاً ممانعت موجود ہے یعنی کوئی آڑ ہو یا نہ ہو بہر صورت قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف استدبار و استقبال نہ ہونا چاہیے۔ امام بخاری کی طرف سے شارحین نے اس اشکال کے دو جواب دیے ہیں۔ اول یہ کہ امام نے یہ حدیث محض ممانعت کے اثبات کے لیے ذکر کی ہے اور عمارت کا استثناء حدیث ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو آگے آ رہی ہے اس سے ثابت کیا ہے۔ دوم یہ کہ غائط اس جگہ کو کہتے ہیں جو میدان میں ہو جہاں کوئی آڑ وغیرہ نہ ہو۔ لہٰذا میدان میں قبلہ کی طرف استقبال و است کی ممانعت سے یہ سمجھا گیا کہ عمارت میں ایسا کرنا جائز ہے۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں متعدد قول ہیں جن کی تفصیل کے لیے عینی و فتح الباری، نیل الاوطار کا مطالعہ کیجیے شافعی و امام مالک و اسحٰق و احمد و شعبی و حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ بوقتِ قضا کعبہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنا کھلے میدان میں جبکہ آڑ نہ ہو منع ہے لیکن اگر عمارت یا پاخانے بنے ہوں یا آڑ ہو تو جا ہے۔ ان کی دلیل حدیث ابن عمر ہے جو آگے آ رہی ہے ۲۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ و امام مجاہد اور ابراہیم نخعی و سفیان ثوری و ابی ثور و احمد (فی روایۃ) و ابو ایوب انصاری، ابو ہریرہ و ابن مسعود و سراقہ بن مالک و عطاء و اوزاعی و صحابہ و تابعین اور اکثر علماء محققین کا مسلک یہ ہے کہ بوقتِ رفع حاجت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا بہر صورت خواہ آڑ ہو یا نہ ہو۔ امام کی دلیل حدیث زیرِ بحث ہے جس میں قبلہ کی طرف مطلقاً استدبار و استقبال سے منع فرمایا نیز عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ قبلہ کی طرف استقبال و استدبار مطلقاً منع نہ ہو کیونکہ ممانعت کی علت احترام کعبہ ہے یہ علت کھلا میدان ہو یا عمارت دونوں جگہ پائی جاتی ہے۔ پھر عمارت میں استدبار و استقبال کے جواز کا قول حائل کی وجہ سے کیا گیا ہے تو یہ حائل تو کھلے میدان میں بھی موجود ہے کیونکہ وہاں بھی دریا و پہاڑ وغیرہ کعبہ کے لیے آڑ بنے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کھلے میدان میں بھی جواز کا قول کرنا چاہیے۔ فافہم

شرّقوا او غرّبوا

اس حدیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب قضائے حاجت کے لیے بیٹھو تو منہ یا پیٹھ کعبہ کی طرف نہ کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو تو یہ خطاب اہلِ مدینہ کو ہے کیونکہ ان کا قبلہ جنوب کی طرف واقع ہے۔ لہٰذا جن ملکوں میں جہتِ قبلہ مشرق و مغرب کی طرف ہو۔ جیسے پاک و ہند میں مغرب کی طرف قبلہ ہے تو ان کو یا شمال کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے بیٹھنا چاہیے ۱۔ مکان بناتے وقت لوگ عام طور پر اس مسئلہ کا خیال نہیں رکھتے۔ مسلمانوں چاہیے کہ وہ پاخانہ یا پیشاب خانہ ایسے بنائیں کہ جب اس میں قضاء حاجت کے لیے بیٹھا جائے تو قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کی جائے ۲۔ نیز ویسے بھی قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونا منع ہے۔

نوٹ:۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل اور علماء کی آراء معلوم کرنے کے لیے عینی و فتح الباری اور نیل الاوطار دیکھنی چاہیے۔

فوائد و مسائل

۱- امام مسلم نے فضائل ابن عباس میں اور نسائی نے مناقب میں اس حدیث کا ذکر کیا ۲- حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے لیے پانی کا لوٹا رکھ دیا۔ یہ آپ کی فطانت و ذکاوت کی دلیل ہے اور بیت الخلاء کے قریب اس لیے رکھا تاکہ حضور علیہ السلام کو بعد فراغت پانی طلب نہ کرنا پڑے بلکہ نکلتے ہی بلا کسی تکلف کے آپ کو پانی مل جائے۔ حضرت ابن عباس کی اس فطانت و ذکاوت کو دیکھ کر حضور علیہ السلام نے آپ کو مذکورہ بالا دعا دی ۳- حضرت ابن عباس نے جو پانی رکھا وہ استنجا کے لیے تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ پانی سے استنجا کرنا جائز ہے۔ علاوہ نووی لکھتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ پہلے ڈھیلے سے استنجا کر لیا جائے۔ اس کے بعد پانی سے دھویا جائے۔ یہی افضل ہے لیکن صرف پانی سے دھونے کو بھی علما نے افضل کہا ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

بَابٌ لَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ

باب، پیشاب، پاخانہ کرتے وقت

بَغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ إِلَّا عِنْدَ الْبِنَاءِ جِدَارٍ أَوْ نَحْوِهٖ

قبلہ کی طرف منہ نہ کرے مگر جب کسی عمارت کی آڑ میں ہو جیسے دیوار وغیرہ

۱۴۴- عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يُوَلِّهَا ظَهْرَهٗ شَرِّقُوْا أَوْ غَرِّبُوْا

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی تم میں سے پاخانہ کو آئے تو قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کرے بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے

(بخاری)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا نام خالد بن زید انصاری ہے۔ نجبار صحابہ سے ہیں۔ مدینہ میں حضور اکرم کے اولین میزبان ہیں۔ ہجرت کے موقع پر حضور علیہ السلام کی اونٹنی مدینہ میں انہیں کے مکان میں ٹھہری تھی۔ بدر اور عقبۃ الثانیہ میں شریک ہوئے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ساتھ بھی تمام محاربات میں شریک رہے۔ جب کہ حضرت معاویہ قسطنطنیہ میں جہاد کر رہے تھے تو آپ ان کے ساتھ شریک جہاد ہونے کے لیے گئے مگر بیمار پڑ گئے۔ جب مرض بڑھ گیا تو آپ نے اصحاب کو وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے جنازے کو اٹھا لینا اور جب تم دشمن کے سامنے صف بستہ ہو جاؤ تو مجھے اپنے قدموں میں دفن کر دینا چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ کی قبر قسطنطنیہ کے قلعہ کی چار دیواری کے قریب ہے جو آج تک مشہور ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ لوگ آپ کی قبر کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے وسیلے سے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے (عینی ج ۱ ص ۷۲۰) آپ سے ۱۵۰ احادیث مروی ہیں جن میں سے بخاری و مسلم نے سات پر اتفاق کیا ہے اور ایک حدیث امام بخاری نے آپ سے منفرداً ذکر کی ہے۔ گویا بخاری میں آپ سے کل آٹھ حدیثیں مروی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

بَابُ مَنْ تَبَرَّزَ عَلٰى لَبِنَتَيْنِ

باب دو کچی اینٹوں پر بیٹھ کر پاخانہ کرنا

اسلام چونکہ ایک کامل و مکمل اور ابدی دین ہے اس لیے وہ اپنے ماننے والوں کی ہر موقع پر رہنمائی کرتا ہے۔ کسی اور مذہب میں یہ کاملیت آپ کو نہیں ملے گی کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہدایات دے۔ یہ شرف تو ص اسلام کو حاصل ہے کہ وہ قوم مسلم کی ہر دینی و دنیوی معاملہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ زمانہ رسالت کے مشرکین یہ دیکھ ہوا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ تمہارے رسول تو تم کو پیشاب و پاخانہ کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ صحابہ جواب کہ ہاں ہمارے رسول نے ہمیں قبلہ کی طرف منہ کر کے پیشاب، پاخانہ کرنے، داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے سے منع حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے باپ کی طرح ہوں اور تم کو تعلیم دیتا ہوں۔ یعنی جیسے ماں باپ شفقت کے ساتھ بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور ان کی بہتری و بھلائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ حضور اکرم علیہ وسلم کو اپنی اُمت کی فلاح و بہبود مطلوب ہے۔ پیغمبر اپنی اُمّت کا رُوحانی باپ ہوتا ہے اور پیغمبر باپ بھی ایسا دینی علم و عرفان کا گنجینہ ہوتا ہے۔ وہ اُمّت کا معلّم حکیم اور مزکّی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادنیٰ بات سے لے کر سب کے متعلق وہ اپنی اُمّت کو ہدایت دیتا ہے۔ یہ بیت الخلاء کے آداب و احکامات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کے اصلی معنیٰ براز کی طرف نکلنے کے ہیں۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ پھر عام طور پر تبرز کے معنیٰ رفع حاجت کے ۳۔ لَبِنَتَیْنِ تثنیہ ہے لَبِنَۃٌ کا، اینٹ کو کہتے ہیں جو مٹی سے بنائی جائے اور آگ میں اس کو پکایا نہ پکی ہوئی اینٹ کو آجر کہتے ہیں ۴۔ مطلب عنوان یہ ہے کہ آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر ممکن ہو تو بوقت قضا اپنے دونوں پاؤں کو زمین سے اونچا رکھے تاکہ نجاست سے ملوّث ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ جیسے دو اینٹوں پر قضا کی جائے ۵۔ اس باب میں امام نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث اس کی مخصص ہے جس میں مطلقاً قبلہ کی طرف منہ کرنے اور پیٹھ کرنے کی ممانعت آئی ہے کیونکہ حضرت ابن عمر کا بیان ہے انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کیے ہوئے قضاء حاجت کرتے سے واضح ہوا کہ اگر کوئی حائل ہو تو پھر کعبہ کی طرف استقبال میں حرج نہیں۔ حدیث ابن عمر یہ ہے:۔

۱۴۵۔ عَنْ عَمِّهٖ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ عَنْ
عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ اِنَّ
نَاسًا يَقُوْلُوْنَ اِذَا قَعَدْتَ عَلٰى حَاجَتِكَ
فَلَا تَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا بَيْتَ الْمَقْدِسِ
فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ عُمَرَ لَقَدِ ارْتَقَيْتُ
يَوْمًا عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَنَا فَرَاَيْتُ رَسُوْلَ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى لَبِنَتَيْنِ

محمد بن یحییٰ اپنے چچا واسع بن حبان سے اور وہ
عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ واسع
حبان کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ
کہ جب تم حاجت کے لیے بیٹھو تو قبلہ کی
منہ نہ کرو اور نہ بیت المقدس کی طرف۔ عبد
عمر نے کہا میں ایک دن اپنے گھر کی چھت پر
(اچانک میری نظر پڑ گئی) میں نے دیکھا کہ

ستَقْبِلًا بَيْتَ الْمَقْدِسِ لِحَاجَتِهٖ وَ
لَعَلَّكَ مِنَ الَّذِيْنَ يُصَلُّوْنَ عَلٰى اَوْرَاكِهِمْ
تُ لَا اَدْرِيْ وَاللّٰهِ قَالَ مَالِكٌ يَعْنِيْ
ذِيْ يُصَلِّيْ وَلَا يَرْتَفِعُ عَنِ الْاَرْضِ
سْجُدُ وَهُوَ لَاصِقٌ بِالْاَرْضِ (بخاری)

علیہ وسلم دو کچی اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے حاجت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابن عمر نے واسع سے کہا کہ شاید تو ان لوگوں میں سے ہے جو سرین کے بل نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ امام مالک نے کہا ابن عمر نے اس شخص سے وہ مراد
جو نماز میں زمین سے اونچا نہ رہے اور سجدہ میں زمین سے چمٹ جائے۔

ئد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب الطہارۃ میں مکرر اور خمس میں بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ و ابوداؤد و امام مسلم نے بھی اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ اس سے یہ نہ سمجھا
ئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام کی اس حالتِ خاص کو قصداً، عمداً دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ جب
مکان کی چھت پر چڑھے تو اچانک ان کی نظر حضور اکرم پر پڑ گئی اور اس کو بیان اس لیے کیا کہ حضور کے اقوال وافعال
یث ہیں ۳۔ حضرت واسع حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے
ر کیا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں یعنی حضرت ابو ایوب انصاری و ابوہریرہ و معقل الاسدی وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو مکان میں
قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ
نے اپنا مسلک بیان کیا کہ مکان میں کعبہ کی طرف منہ کرنا جائز ہے کیونکہ میں نے خود حضور اکرم کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ ۴۔
کے بعد آپ نے واسع سے فرمایا کہ شاید تو بھی ان لوگوں میں سے ہے جو سرین کے بل نماز پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ
ت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جملہ کا مسئلہ قضاءِ حاجت سے کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا۔ شارحین کرام نے ربط
قائم کرنے کے لیے متعدد توجیہیں کی ہیں۔

بعض نے کہا مقصد حضرت ابن عمر کا اس جملہ سے یہ ہے کہ جیسے وہ لوگ جو سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹا
یں تو جیسے یہ لوگ سجدہ کے مسئلہ سے ناواقف ہیں اسی طرح تم بھی مسئلہ قضاءِ حاجت سے ناواقف ہو کیونکہ اگر واقف
ے تو یہ جان لیتے کہ قضاءِ حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنے کی ممانعت میدان میں ہے مکان میں نہیں لیکن ظاہر ہے
جیہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اول تو روایت میں مذکور نہیں ہے کہ یہ مسئلہ حضرت واسع نے پوچھا تھا تاآنکہ وہ ان کو جاہل قرار دیتے
بھی ضروری نہیں کہ جو سجدہ کی سُنّت سے ناواقف ہو، وہ قضاءِ حاجت کے طریقے سے بھی ناواقف ہو — بعض نے
ی کی اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر کے اس جملہ کا مسئلہ قضاءِ حاجت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل
ت ابن عمر نے واسع کو نماز پڑھتے دیکھا اور حضرت واسع نے سجدہ میں کوئی غلطی کی ہوگی۔ اس لیے آپ کو ان کو سجدہ
ے کا طریقہ بتا دیا کہ مرد کے لیے سجدہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سجدہ میں پیٹ کو رانوں سے چمٹاتے نہیں۔ سات اعضاء
جدہ کرے اور کہنیاں زمین پر نہ بچھائے جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ مسلم کی حدیث اس توجیہ کی تائید کرتی
س کا مضمون یہ ہے کہ حضرت واسع کہتے ہیں۔ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اور حضرت ابن عمر بیٹھے تھے۔ جب میں

میں نماز پڑھ چکا تو ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا! بعض لوگ کہتے ہیں؛ پھر پوری حدیث کو اخیر تک بیان کیا۔ یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن عمر نے حضرت واسع کو سجدہ میں کوئی غلطی کرتے دیکھا تھا۔ اس بنا پر سجدہ کا مسئلہ قضائے مسئلہ کے ساتھ بیان کر دیا۔

بوقتِ قضاءِ حاجت کعبہ معظمہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنیکے متعلق تفصیلی گفتگو

واضح ہو کہ اس مسئلہ متعدد قول ہیں۔ عروہ بن زبیر و ربیعۃ الرائی و داود الراقی کا قول یہ ہے کہ قضاءِ حاجت کے وقت کعبہ شریف کی طرف استقبال و استدبار ہے۔ یہ لوگ حدیث ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس میں ممانعت آئی ہے اکو منسوخ قرار دیتے ہیں اور حدیث تعالیٰ عنہ کو اس کا ناسخ۔ دوم۔ امام مالک و شافعی و احمد و اسحٰق و عبد اللہ بن عمر وغیرہ صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ اگر کھلے میدان میں کی جائے جہاں کوئی آڑ نہ ہو تو پھر تو کعبہ شریف کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا جائز نہیں ہے اور اگر مکان میں حاجت کی جائے یا کوئی آڑ ہو تو پھر تو کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنے میں حرج نہیں ہے۔ یہ حضرات احادیث مندرجہ ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔ اول، حدیث ابن عمر جو زیر بحث ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے قضاءِ حاجت کرتے ہوئے

امام مالک و شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کا اس حدیث سے مذکورہ بالا استدلال کرنا متعدد وجوہ سے درست نہیں ہے۔

اولاً۔ جس سوال کے جواب میں حضرت عبد اللہ بن عمر نے یہ جواب دیا وہ یہ تھا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قضاءِ کے وقت قبلہ اور بیت المقدس کی طرف منہ نہ کیا جائے۔ اس کے جواب میں حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا۔ میں نے علیہ السلام کو بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے قضاءِ حاجت کرتے دیکھا ہے۔ اس سوال و جواب پر غور کرنے سے ہوتا ہے کہ اس میں مسئلہ استقبالِ قبلہ کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے بلکہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو اس کے مسلک کی تردید کر رہے ہیں جو استقبالِ بیت المقدس کو استقبالِ کعبہ کی طرح مکروہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں استقبال و استدبارِ کعبہ کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ استقبالِ بیت المقدس کا ذکر فرمایا۔ رہا یہ سوال کہ مدینہ شریف میں بیت المقدس کی طرف منہ ہوگا تو کعبہ شریف کی طرف پیٹھ ہو جائے گی تو اس کے لیے پہلے سمت بیت المقدس کی کرنی پڑے گی اور یہ بات علماءِ علم جغرافیہ ہی سے طے کر سکتے ہیں۔ بہر حال اتنی بات واضح ہے کہ حضرت ابن عمر جس بات تردید کر رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ استقبالِ بیت المقدس کو استقبالِ کعبہ کی طرح سمجھا جائے۔ رہا کعبہ کی طرف استدبار کا مسئلہ تو اس حدیث میں اس کا بیان نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ فضل اللہ توربشتی نے شرح المصابیح میں حدیث ابن عمر میں جناب ابن عمر نے استدبارِ کعبہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ وَانما انکر علی من قال بالنهی عن

استقبال بیت المقدس فافہم

ثانیاً۔ حضرت عبد اللہ بن عمر کی اچانک نظر پڑ گئی تھی اور یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی حضور علیہ السلام کی خاص کو قصداً عمداً دیکھے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قضاءِ حاجت کے وقت حضور اکرم واقعی کعبہ

بیٹھ گئے تھے ; یہ بھی تو ممکن ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بیٹھے ہوں کہ صرف آپ کا چہرۂ[1] اقدس بیت اللہ کی طرف ہو۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جس سمت کی طرف بیٹھ کر پیشاب و پاخانہ کرتا ہے۔ چہرہ کسی اور سمت کی طرف موڑ لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضور واقعی کعبہ کی طرف ہو کر قضاء حاجت نہ فرما رہے ہوں۔

ثالثاً۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اچانک نظر پڑ جانے پر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ فیصلہ فرما لینا کہ حضور اکرم واقعی کعبہ کی طرف ہو کر قضاء حاجت فرما رہے تھے۔ یہ ان کا ظن و فہم ہی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس مسئلہ کے متعلق کوئی حدیث مرفوع نہیں تھی اگر ہوتی تو وہ ضرور پیش کر دیتے خصوصاً معارضہ کی صورت میں تو جب حدیث ابن عمر خود مشتبہ ہے تو اس سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم واقعی کعبہ کی طرف ہو کر ہی قضاء حاجت فرما رہے تھے یا نہیں تو اس سے جواز کا استدلال کرنا کیونکر درست قرار پا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ممانعتِ استقبال و استدبار کے متعلق حضور کی مرفوع حدیث موجود ہے جو ایک قانونِ کلی کی حیثیت رکھتی ہے فافہم۔

حدیث حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کعبہ کی طرف استقبال و استدبار سے منع فرمایا لیکن میں نے دیکھا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی وفات کے ایک سال قبل کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے پیشاب فرمایا (ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم نے فرمایا یہ حدیث شرطِ مسلم پر صحیح ہے)۔ اس سے وہ لوگ جو مطلقاً استقبال و استدبار کے جواز کے قائل ہیں استدلال کرتے ہیں لیکن اس سے بھی مطلقاً استدبار و استقبال کے جواز پر دلیل لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی وہی احتمالات موجود ہیں جو حدیثِ ابن عمر میں ہم نے بیان کئے ہیں — اور ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ واقعی حضور علیہ السلام نے کعبہ کے رُخ ہو کر پیشاب فرمایا تو یہ حضور اکرم کے خصائص سے ہو گا کیونکہ حضور علیہ السلام کعبہ سے قطعاً و حتماً افضل ہیں لہٰذا آپ کے لیے استقبال جائز ہو گا اور اگر فضیلت کو خصوصیت کی علت نہ بنایا جائے تو بھی بعض احکام میں حضور اقدس کا مختلف ہونا امر محقق ہے۔ حضور علیہ السلام نے جناب علی[2] مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کو فرمایا۔ میرے اور تمہارے سوا کسی کو مسجد میں بحالتِ جنابت رہنا جائز نہیں ہے اس حدیث

---

[1] واضح ہو کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بوقتِ قضاء حاجت کعبہ کی طرف منہ نہ کرو۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ شرمگاہ کعبہ کی طرف نہ ہو۔ اگر صورت یہ ہو کہ شرمگاہ تو کعبہ کی طرف نہیں ہے اور کسی نے صرف اپنا منہ کعبہ کی طرف کر لیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ۱۲ منہ

[2] رہی یہ بات کہ حضور اکرم نے صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو کیوں مخصوص فرمایا حالانکہ وہ نبی نہیں ہیں تو سیرۃ محمدیہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے مصر میں مسجد بنائی تو اعلان کیا کہ میرے اور ہارون کے سوا کسی کو مسجد میں بحالتِ جنابت رہنا جائز نہیں ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ مسجد میں بحالتِ جنابت رہنے کا جواز خصائصِ نبوت سے ہے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم چونکہ بمنزلہ ہارون کے ہیں اور حضور نے فرمایا۔ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ۔ اس لیے حضور نے حضرت علی کے لیے یہ رخصت دے دی کہ وہ بحالت جنابت

(اگلے صفحہ پر)

کو امام بخاری نے حسن کہا۔ حالانکہ عام قانون یہی ہے کہ بحالتِ جنابت مسجد میں رہنا جائز نہیں ہے لیکن حضور اقدس علیہ السلام نے اس عام قانون سے اپنی ذات کو اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو خاص کر لیا۔ یہی حال استقبال قبلہ کا بھی ہو سکتا ہے اور خصوصیت کا قول اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ حضور کی عام عادت اور جس بات کو حضور علیہ السلام نے ایک قانونِ کلی قرار دیا ہے وہ یہی ہے کہ بوقت قضاءِ حاجت کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے۔ فافہم

اس کے علاوہ عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ حضور علیہ السلام کے لیے بوقتِ قضاءِ حاجت کعبہ شریف کو استقبال و استدبار جائز ہو کیونکہ صحیح احادیث و روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور کے فضلاتِ مبارک عام انسانوں کی طرح نہیں تھے اور کعبہ شریف کو استقبال و استدبار کی علت احترام کعبہ ہی ہے اور حضور کے استقبال و استدبار سے احترام کعبہ میں کوئی خلل نہیں آتا۔ چنانچہ جناب سیدہ عائشہ صدیقہ طیبہ و طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عرض کی آپ جس جگہ قضاءِ حاجت فرماتے ہیں وہاں پر کچھ نہیں باقی۔ اس پر حضورِ اقدس نے فرمایا۔

اما تعلم ان الارض تبتلع عذرات الانبیاء	کیا تم نہیں جانتیں کہ انبیاء کرام کے عذرات کو زمین نگل جاتی ہے۔

یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِن اجساد الانبیاء نابتۃ علٰی اجسادِ الملائکۃِ (کنز العمال)	انبیاءِ کرام کے جسم اجسادِ ملائکہ پر پیدا فرمائے گئے ہیں۔

خصائصِ کبریٰ میں علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے جو حدیث نقل کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی حضور وہاں میں مشک و عنبر کی خوشبو پاتی ہوں۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمارے اجساد و ارواح اہل جنت پر پیدا فرمائے گئے ہیں الخ۔ بتائیے جس ہستی مقدس کی یہ شان ہو وہ اگر بوقتِ قضاءِ حاجت کعبہ کو استقبال و استدبار فرمائے تو احترام کعبہ میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

حدیثِ عراک اس سلسلہ میں مجوزین کی طرف سے یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ جس کی سند یہ ہے۔ (حدثنا وکیع عن حماد بن سلمہ عن خالد الحذاء عن خالد بن ابی الصلت عن عراک بن مالک عن عائشۃ قالت) حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کے سامنے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جو کعبہ شریف کی طرف شرمگاہ کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں تو اس پر آپ نے فرمایا۔ میرے پاخانہ کی بیٹھک قبلے کی طرف دو (رواہ ابن ماجہ) اس حدیث کے وصل و ارسال سے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے۔

۱۔ ابن ابی حاتم نے اس حدیث کو مرسل قرار دیا ہے کیونکہ امام احمد ابن حنبل نے فرمایا ہے کہ عراک کا حضرت عائشہ سے

مسجد میں رہ سکیں لیکن اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرما دی۔ الا انہ لا نبی بعدی، کہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی تاکہ کوئی دجال یہ نہ کہہ سکے کہ حضرت علی جب بمنزلہ ہارون علیہ السلام کے ہوئے تو نبی ہو گئے (فافہم)

ثابت نہیں ہے۔ بعض علماء نے جواب میں کہا کہ امام مسلم نے عراک کا سماع حضرت عائشہ صدیقہ سے ثابت کیا ہے اور ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ جس میں عراک حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جناب احمد بن حنبل کا ارشاد مسلم سے زیادہ لائقِ اتباع ہے لہٰذا یہ حدیث اگرچہ امام مسلم کے نزدیک صحیح ہے لیکن عند احمد معلول ہے۔

اسی طرح امام نووی نے کہا اس کی اسناد حسن ہے مگر اسناد کے حسن ہونے سے حدیث کا حسن ہونا لازم نہیں آتا۔

اور امام ذہبی نے میزان میں لکھا کہ خالد بن ابی الصلت منکر ہے۔ ظاہر ہے کہ امام ذہبی معرفتِ رجال اور تنقیدِ حدیث میں کہیں افضل و اعلیٰ ہیں۔ پھر اس حدیث کا موقوف ہونا بدیہی بات ہے۔ یہی حدیث عراک نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے پیش کی تھی لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس پر عمل نہیں کیا۔ (رواہ البیہقی و دارالقطنی) اور عمل نہ کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک مرفوع نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اس باب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہے اور حضور کی قولی مرفوع حدیثوں سے اس کا کوئی ربط قائم نہیں ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ حدیث عراک حدیثِ ابوایوب سے (جس میں ممانعت وارد ہوتی ہے) یا متقدم ہے یا مؤخر۔ اگر متقدم ہے تو حدیث ابوایوب انصاری (جو مرفوع متصل قولی حدیث ہے) اسے منسوخ قرار پائے گی اور اگر مؤخر ہے تو یہ بات بہت ہی بعید ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استقبال و استدبار سے مطلقاً صریح طور پر منع فرمانے کے بعد چند لوگوں کے متعجب ہونے پر اس نہی کو واپس لے لیں۔ یہ بات بھی حدیثِ عراک کے موقوف ہونے کی دلیل ہے اور اس سے یہ وضاحت ملتی ہے۔ اِسْتَقْبِلُوْا بِمَقْعَدَتِی الْقِبْلَةَ کا امر امرِ نبوی نہیں ہے بلکہ امرِ عائشہ ہوگا فافہم

خلاصہ کلام یہ کہ جو حضرات اس امر کے قائل ہیں کہ اگر مکان میں رفع حاجت کی جائے یا کوئی آڑ ہو تو پھر کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا جائز ہے وہ جس قدر حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ سب کی سب متعدد احتمالات کی حامل ہیں اور ان سے یقینی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور علیہ السلام نے واقعی کعبہ کو استقبال و استدبار فرمایا۔ پھر ان میں سے بعض کے اسناد میں محدثین نے یہ کلام کیا ہے کہ منکر و مرسل قرار دیا ہے۔ ان سب باتوں سے صرفِ نظر کیجئے تو یہ بات تو بالکل بدیہی ہے یہ سب کی سب حدیثیں موقوف ہیں۔ حتیٰ کہ حدیث ابن عمر بھی حضور علیہ السلام کا قول نہیں ہے۔ لہٰذا اس نوع کی احادیث سے کسی مسئلہ کی حلت و حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس باب میں مرفوع متصل صحیح احادیث سے مسئلہ کا فیصلہ کریں جو اس باب میں نصِ صریح ہیں۔ چنانچہ اس باب کی قولی احادیث سے بلا کھینچ تان کے آفتاب نیم روز کی طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بوقتِ قضائے حاجت کعبہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا بہرصورت ممنوع ہے۔ وہ احادیث یہ ہیں۔

۱۔ حدیث عبداللہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کا مضمون یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب نہ کرے (عینی جلد ۱ ص۷) اس حدیث کو ابن حبان نے صحیح کہا۔

۲۔ حدیث معقل بن ابی معقل جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَتَیْنِ بِبَوْلٍ اَوْ غَائِطٍ (ابن ماجہ ابوداؤد)	حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ بیت المقدس اور کعبہ کی طرف منہ کر کے پیشاب یا پاخانہ کیا جائے۔

۳۔ حدیث سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کے لفظ یہ ہیں :-

نَهَانَا اَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ (مسلم، بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کریں۔

۴۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کے الفاظ یہ ہیں :-

فَاِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی)

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء جائے تو قبلہ کو منہ بھی نہ کرے اور پیٹھ بھی نہ کرے۔

۵۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں قضاء حاجت کے وقت مطلقاً قبلہ کی طرف استقبال و استدبار کی ممانعت وارد ہوئی ہیں۔

یہ ہیں وہ صاف و صریح واضح حدیثیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قضاءِ حاجت کے وقت کعبہ کی طرف منہ پیٹھ کرنا خواہ آڑ ہو یا نہ ہو، بہر صورت ممنوع ہے۔ یہ مسلک سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا ہے اور جہاں تک دلائل کا تعلق ہے مسلک امام اعظم بہت ہی قوی و مستحکم ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربی علیہ الرحمۃ نے شرح ترمذی میں یہ لکھا کہ اقرب و اقوی باب میں مذہب حنفیہ ہی ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ خُرُوْجِ النِّسَآءِ اِلَى الْبَرَازِ

باب مستورات کا قضاءِ حاجت کے لیے نکلنے کے بیان میں

۱۴۶۔ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اَزْوَاجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ يَخْرُجْنَ بِاللَّيْلِ اِذَا تَبَرَّزْنَ اِلَى الْمَنَاصِعِ وَهِيَ صَعِيْدٌ اَفْيَحُ وَكَانَ عُمَرُ يَقُوْلُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُ فَخَرَجَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِّنَ اللَّيَالِيْ عِشَآءً وَكَانَتِ امْرَاَةً طَوِيْلَةً فَنَادَاهَا عُمَرُ اَلَا قَدْ عَرَفْنَاكِ يَا سَوْدَةُ حِرْصًا عَلٰى اَنْ يُّنْزَلَ الْحِجَابُ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ الْحِجَابَ (بخاری شریف)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ازواج مطہرات رات کو پاخانہ کے لیے مناصع کی طرف نکلتی تھیں اور مناصع ایک وسیع (کھلا) میدان تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کرتے تھے کہ حضور اپنی ازواج کو پردہ میں بٹھائیے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا حکم نہیں تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت ام المومنین سودہ بنت زمعہ عشاء کے وقت قضاء حاجت کے لیے نکلیں لمبے قد کی عورت تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ان کو دیکھ کر) آواز دی۔ اے سودہ ہم نے تمہیں پہچان لیا۔ کیونکہ عمر کو اس بات کی حرص تھی کہ پردہ کا حکم آ جائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پردہ کا حکم نازل فرمادیا۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم نے استیذان میں ذکر فرمایا ۲۔ مناصع وہ مقامات ہیں جو مدینہ منورہ

کنارے بقیع کی طرف ہیں۔ یہاں مستورات قضاءِ حاجت کے لیے جایا کرتی تھیں۔ صعید افیح کے لفظ سے مناصع کی تفسیر کی گئی یعنی وہ جگہ جو کھلی ہو وسیع ہو۔ افیح کے معنی کشادہ جگہ کے ہیں۔

احجب نسآءک

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گزارش یہ تھی کہ حضور اکرم ازواجِ مطہرات کو بالکل گھر سے نکلنے کی ممانعت فرما دیں۔ یعنی حضرت عمر کا منشا یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات چادر اوڑھ کر بھی باہر نہ نکلیں۔ لیکن وحی نے ان کی اس رائے سے موافقت نہیں کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقتِ ضرورت پردہ کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت کو برقرار رکھا۔ جیسا کہ اس باب کی اگلی حدیث سے واضح ہو رہا ہے اور بخاری کتاب التفسیر میں اس کی وضاحت و تشریح ہے کہ جناب سودہ رضی اللہ عنہا حکمِ حجاب کے نزول کے بعد نکلی تھیں اور جناب فاروقِ اعظم کی خواہش یہ ہوئی کہ چادر اوڑھنے کے بعد بھی جسم کا طول و عرض معلوم دیتا ہے اس کے چھپانے کا بھی حکم دیا جائے مگر ان کی اس رائے سے وحی الٰہی نے موافقت نہیں فرمائی۔ فافہم۔

ہاں آیتِ حجاب کا نزول جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہوا اور حجاب کا حکم بھی ان گیارہ امور میں سے ہے جن میں وحی الٰہی نے جناب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کی تائید و توثیق کی۔

علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حجاب کا مطلب یہ ہے کہ مستورات چادر سے اپنے تمام جسم کو چھپائیں اور راستہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھلی رکھیں

۱۴۷- عَنْ عَآئِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ فِيْ حَاجَتِكُنَّ قَالَ هِشَامٌ يَعْنِي الْبَرَازَ (بخاری)

جناب عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہیں حاجت کے لیے گھر سے باہر جانا جائز ہے۔ (مگر چادر اوڑھ کر)

کتاب التفسیر میں اس کا واقعہ یوں آیا ہے کہ حجاب کا حکم نازل ہو جانے کے بعد جناب سودہ رضی اللہ تعالیٰ رات کے وقت (چادر اوڑھ کر) قضاءِ حاجت کے لیے نکلیں۔ چونکہ یہ فربہ عورت تھیں۔ اس لیے حضرت عمر نے ان کو پہچان لیا اور م ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہو۔ حضرت سودہ نے حضور علیہ السلام سے شکایت کی۔ حضرت عمر ایسا کہتے تھے۔ حضور علیہ السلام اس وقت رات کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ آپ پر وحی آئی اور فرمایا کہ تمہیں بوقتِ ضرورت (چادر اوڑھ کر) نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔

بَابُ التَّبَرُّزِ فِي الْبُيُوْتِ

باب گھروں میں قضاءِ حاجت کے بیان میں

۱۴۸- ۱۴۹ - امام نے یہ بیان دو باتوں کے بیان کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔

اول یہ کہ مستورات کو قضاءِ حاجت کے لیے گھروں سے باہر جانا اس وقت تک کے لیے تھا جب تک گھروں میں پاخانے نہیں بنے تھے لیکن جب گھروں میں پاخانے بنا دیئے گئے تو اب گھروں سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

رہی — دوم - یہ کہ گزشتہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں مستورات میں قضائے حاجت کے لیے جایا کرتی تھی - اس سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ قضاء حاجت کے لیے جنگل میں ضروری ہے اور گھروں میں پاخانے بنانا درست نہیں ہے - امام بخاری علیہ الرحمۃ نے عنوان مذکورہ قائم کرکے صرف مستورات کے لیے گھروں میں ضروری پاخانے بنائیں - اس لیے کہ جب وہ باہر نکلتی ہیں تو ان مواقع پر عموماً ان کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں -

اس عنوان کے ماتحت امام نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں -

پہلی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں کسی ضرورت کے لیے حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مکان کی چھت پر چڑھا - میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کعبہ اور شام کی طرف منہ کیے قضاء حاجت فرما رہے تھے - دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضور دو اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کیے ہوئے قضاء حاجت فرما رہے تھے - یہ احادیث مع تفہیم کے ہیں - اس لیے ہم نے ان کا متن نہیں لکھا -

بَابُ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْمَاءِ

باب پانی سے استنجا کرنے کے بیان میں

اس باب کے قائم کرنے سے امام کا مقصد ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پانی سے استنجا کرنا مکروہ ہے کہ پانی سے استنجا کرنا حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے -

۱۵۰ - يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ أَجِيْءُ أَنَا وَغُلَامٌ وَمَعَنَا إِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ يَعْنِي يَسْتَنْجِي بِهٖ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ نبی کریم علیہ وسلم جب قضاء حاجت کے لیے تشریف جاتے تو میں اور ایک لڑکا پانی کا کوزہ لے یعنی حضور علیہ السلام اس سے استنجا فرماتے -

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے صلوٰۃ اور طہارۃ میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، نسائی - ابوداؤد نے میں ذکر فرمایا ہے -

غلام اس کی جمع اغلمہ، غلمہ و غلمان ہے - غلام کی تعریف میں متعدد قول ہیں - دودھ چھٹنے سے سات عمر تک غلام ہے - ایک قول یہ ہے کہ جس کی مونچھیں ظاہر ہو جائیں - اس کو غلام کہیں گے - علامہ ہیں غلام وہ لڑکا ہے - جس کی داڑھی نہ نکلی ہو - ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ جس کی داڑھی آجائے اس کو غلام نہیں مگر مجازاً جیسے سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اپنے ایک رجز میں فرمایا - انا الغلام الهاشمی المکی - اداوۃ چھوٹے برتن کو کہتے ہیں جو چمڑے سے بنایا جائے -

۲ - اصیلی نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ امام بخاری کا اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ پانی سے استنجا

صحیح نہیں کیونکہ یستنجی بہ۔ حضرت انس کا قول نہیں ہے بلکہ ابوالولید کا ہے جو شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث کو سلیمان بن حرب نے شعبہ سے روایت کیا ہے۔

پانی سے استنجا کرنے کے مسائل اور اس کی تفصیلی بحث

مگر اس میں یستنجی بہ کا لفظ نہیں ہے۔ جس سے یہ استدلال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پانی استنجا کے لیے نہیں بلکہ وضو کے لیے لایا گیا ہو۔ جواب یہ ہے کہ متعدد روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے بطریق ابن بشار عن غندر عن شعبہ جو روایت کی ہے۔ اس میں یستنجی بالماء ہے اسی طرح روایت اسماعیلی من طریق عمرو بن مرزوق عن شعبہ اس کے لفظ یہ ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

مَعَنَا إِدَاوَةٌ فِيهَا مَاءٌ يَسْتَنْجِي مِنْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	ہمارے ساتھ پانی کا برتن تھا جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا فرمایا۔

اسی طرح بخاری نے روح بن قاسم سے انہوں نے عطاء بن ابی میمونہ سے جو روایت کی ہے اس میں اور مسلم نے بطریق خالد الحذاء عن عطاء عن انس میں اور صحیح ابی عوانہ میں بھی یہی لفظ ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے۔ یستنجی بہ حضرت انس ہی کا قول ہے۔ ابوالولید ابن ہشام کا نہیں ہے۔ ۲۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی سے استنجا فرمایا۔ مثلاً

۱۔ صحیح ابن خزیمہ میں ابراہیم ابن جریر سے ہے کہ حضور غیضہ میں قضاء حاجت کے لیے تشریف لائے اور جریر ایک ڈول لائے اور آپ نے پانی سے استنجاء فرمایا۔ ۲۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت کے لیے گئے تو میں نے آپ کے لیے پانی کا برتن رکھ دیا (بخاری شریف) ۳۔ مسلم نے پانی سے استنجا کرنے کو امور فطرۃ میں شمار کیا ہے۔ ۴۔ صحیح ابن حبان میں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ حضور علیہ السلام بیت الخلاء سے نکلے ہوں اور پانی نہ لیا ہو ۵۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اپنے خاوندوں سے کہو کہ وہ پاخانہ و پیشاب کے بعد پانی استعمال کریں کیونکہ حضور ایسا کرتے تھے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا۔ ۶۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے پانی سے استنجا فرمایا ۷۔ ابن حبیب نے شرح موطا میں ابان ابن عثمان سے روایت ذکر کی کہ حضور اقدس علیہ السلام نے فرمایا۔ پانی سے استنجا کیا کرو۔ اس میں زیادہ پاکیزگی ہے۔ یہ تمام تفصیلیں عینی ج ۱ صہ ۱۹۷ نیل اوطار و ارشاد الساری میں ہیں۔

ان احادیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو پانی سے استنجاء کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پانی سے استنجا حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔

توضیح

۱۔ جمہور سلف و خلف کا مسلک یہ ہے کہ پانی اور ڈھیلوں دونوں سے استنجاء کرنا افضل ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ڈھیلا لے تاکہ نجاست کم ہو جائے اس کے بعد پانی سے دھوئے۔

۲۔ اور اگر ایک پر اکتفا کرنا چاہے تو پانی سے استنجا کرنا افضل ہے۔ کیونکہ ڈھیلے سے صرف عین نجاست زائل ہوتی ہے

گر اثر زائل نہیں ہوتا اور پانی سے عین نجاست اور اس کا اثر دونوں زائل ہوجاتے ہیں اور اس میں زیادہ پاکیزگی ہے مگر مستحب یہ ہے کہ ڈھیلا لینے کے بعد پانی سے استنجا کرے کیونکہ ڈھیلا لینا بہر صورت سنت ہے۔

۳۔ رہی یہ بات کہ صرف ڈھیلے سے بھی استنجا کرنا کافی ہے یا نہیں ؟ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ و شافعی فرماتے ہیں صرف ڈھیلوں سے استنجا کر لینا کافی ہے کیونکہ پانی سے استنجا کرنا واجب نہیں ہے لیکن ڈھیلوں سے استنجا کی اس صورت میں کافی ہوگا اور اس سے نماز بھی درست ہوگی۔ جب کہ نجاست سے مخرج کے آس پاس کی جگہ ایک درہم زیادہ آلودہ نہ ہو اور اگر درہم سے زیادہ سن ہوجائے تو پھر دھونا فرض ہے اگرچہ ڈھیلا لینا اس صورت میں بھی سنت حضرت سعید بن ابی وقاص، ابن زبیر اور ابن مسیب اور عطار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی مسلک ہے کہ پانی سے استنجا واجب نہیں ہے اور صرف ڈھیلوں سے پاک کر لینا کافی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا کہ جب تم میں سے کوئی پاخانے کے لیے اور تین پتھروں سے استنجا کرے وہ کافی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صرف ڈھیلے سے استنجا کرنا کافی ہے اور پانی سے کرنا واجب نہیں ہے۔

۴۔ علامہ طحاوی نے پانی سے استنجا کرنے کا استدلال اس آیت سے کیا ہے۔ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ۔ یہ آیت جب نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے گروہِ انصار! اللہ تعالیٰ نے طہارۃ کے بارے میں تمہاری تعریف کی ہے تو بتاؤ تمہاری طہارت کیا ہے۔ عرض حضور! ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت سے غسل کرتے ہیں اور پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تو وہی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے اسی فعل کو پسند فرمایا ہے) لہٰذا اس کا التزام کرو۔ (ابن ماجہ

حسن بصری و ابن ابی لیلیٰ و حسن بن صالح اور ابو علی جبائی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم یہ کہتے ہیں۔ نماز کے لیے صرف ڈھیلے کافی نہیں اور پانی سے استنجار کرنا واجب ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا ظاہر ہے کہ اس آیت سے استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق وضو سے ہے استنجا سے نہیں ہے۔ اسی طرح لوگ احادیث ذیل سے بھی استدلال کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے :۔

۱۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی سے استنجا فرمایا۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عورتوں سے کہا کہ اپنے شوہروں کو پانی سے استنجا کرنے کی تاکید کر

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ پاخانہ کے بعد پانی لیتے ہوئے دیکھا

۴۔ اہلِ قبا سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اس کو لازم کرلو اور اہلِ قبا پانی سے استنجا کرتے تھے۔

لیکن ان احادیث سے پانی سے استنجا کرنے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ پانی پر اکتفا بہتر ہے ـــــ رہا یہ کہ اہلِ قبا کو حضور علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ پانی سے استنجار کرنے کو لازم کرلو۔ اس سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اہلِ قبا کی تخصیص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہت لوگ پانی سے استنجا نہیں کرتے تھے۔ تو اگر سے دھونا واجب ہوتا تو تمام صحابہ ایسا کرتے اور اگر پانی سے استنجا کرنے کا وجوب شارع علیہ السلام کو منظور ہوتا

ام لوگوں کو اس کا حکم دیتے۔ صرف اہلِ قباء کو مخصوص نہ فرماتے اور اہلِ قباء کو مخصوص فرمانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ن کے اس فعل کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا تو حضور علیہ السلام نے ان کو اس فعل پر قائم رہنے کی تلقین فرما دی۔

مسائل حدیث حدیث زیر بحث سے مسائل ذیل معلوم ہوئے۔

۱۔ بزرگوں اور اہلِ فضل کی خدمت کرنا اور اس سے برکت حاصل کرنا اور ان کی حاجت پورا کرنے کی تلاش میں رہنا۔ خصوصاً امورِ طہارت میں جائز ہے۔ ۲۔ بزرگوں کا اپنے متبعین سے جو آزاد ہو خدمت لینا جائز ہے ۳۔ قضاء حاجت کے لیے پوشیدہ مقام پر جانا ۴۔ اسبابِ وضوء میں کسی سے مدد لینا جائز ہے ۵۔ پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے۔

بَابُ مَنْ حُمِلَ مَعَهُ الْمَآءُ لِطُهُوْرِهٖ

باب طہارت کے لیے پانی کا ساتھ لے جانا

وَقَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ لَيْسَ فِيْكُمْ صَاحِبُ النَّعْلَيْنِ وَالطَّهُوْرِ وَالْوِسَادِ

اور ابودرداء نے (عراق والوں سے) کہا کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے جو (حضور علیہ السلام کی) نعلین وضوء کا پانی اور تکیہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

۱۔ اس تعلیق کو امام نے مناقب میں موصولاً ذکر کیا ہے۔ علقمہ بن قیس کہتے ہیں کہ شام کی مسجد میں میری ملاقات حضرت ابودرداء سے ہوئی۔ میں نے کہا میری خواہش ہے کہ آپ میرے سوالات کا جواب دیں۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا اہلِ کوفہ سے ہوں۔ اس پر حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کیا تم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نعلین بردار نہیں ہے۔ (یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ تم میں موجود نہیں ہیں؟) جن کو حضور علیہ السلام کی نعلین برداری، وضوء کا پانی اور تکیہ اٹھانے کا شرف حاصل تھا۔

۲۔ امام بخاری نے اس تعلیق کو حدیثِ انس کے ساتھ اپنے قائم کردہ تائید و توثیق کے لیے ذکر کیا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے اصحاب سے اس نوع کی خدمت لیا کرتے تھے۔

۱۵۱۔ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا خَرَجَ حَاجَتِهٖ تَبِعْتُهٗ اَنَا وَغُلَامٌ مِّنَّا مَعَنَا اِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ (بخاری)

عطاء ابن میمونہ کہتے ہیں میں نے انس سے سُنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حاجت کے لیے (جنگل) کو تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا دونوں مل کر ایک ڈول پانی لے کر آپ کے پیچھے جاتے۔

اس حدیث کی باب سے مناسبت بالکل ظاہر ہے یعنی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ استنجاء کے لیے اپنے ساتھ پانی لے جانا جائز ہے اور اگر کوئی خادم لے جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

بَابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ مَعَ الْمَاءِ فِي الْاِسْتِنْجَاءِ

باب استنجاء کے لیے پانی کے ساتھ نیزہ لے جانے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے مذکورہ بالا حدیث ہی ذکر کی ہے۔ البتہ اس میں عنزہ کا لفظ زیادہ ہے۔ حدیث زیر باب کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب قضاء حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا۔

۱۵۲- يَقُوْلُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَاَحْمِلُ اَنَا وَغُلَامٌ اِدَاوَةً مِّنْ مَّاءٍ وَعَنَزَةً يَسْتَنْجِيْ بِالْمَاءِ

پانی کا برتن اور نیزہ لے جاتے اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پانی سے استنجا فرماتے۔

فوائد و مسائل اس حدیث میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانی کے ساتھ نیزہ بھی لے جاتے۔ کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یہ کہ آپ کی ضرورت ہو تو نیزہ کو زمین میں گاڑ کر اس پر کپڑا ڈال دیں تاکہ پردہ ہو جائے یا زمین اگر سخت ہو تو اس کو کھود لیں تاکہ نرم ہو جائے اور پیشاب کی چھینٹیں نہ اڑیں۔ یا یہ کہ نیزہ کو بازو کی طرف گاڑ دیا جائے تاکہ راہ گزر یہ سمجھ لے کہ یہاں کوئی قضاء حاجت کر رہا ہے۔ یا یہ، موذی جانوروں سے حفاظت کے لیے اس کا ساتھ رکھا گیا کیونکہ حضور علیہ السلام آبادی سے دُور ویران جگہ میں قضاء حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ استنجے کے بعد آپ وضو کر کے نماز پڑھتے ہوں اور برچھی کو زمین میں گاڑ دیتے ہوں تاکہ سترہ کا کام دے۔ چنانچہ سترہ کے باب میں امام نے اسی مسئلہ کے بیان کرنے کے لیے حدیث زیر بحث کو ذکر کیا ہے۔ ۲- عنزہ، اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں شام لگی ہو۔

بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْيَمِيْنِ

باب داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت میں

۱۵۳- قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَرِبَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْاِنَاءِ وَاِذَا اَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمَسَّ ذَكَرَهُ بِيَمِيْنِهِ وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِيْنِهِ (بخاری)

ابو قتادہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی چیز پیے تو برتن میں سانس نہ لے اور جب کوئی پاخانہ میں آئے تو اپنی شرمگاہ کو سیدھا ہاتھ نہ لگائے اور نہ سیدھے ہاتھ سے استنجا کرے۔

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام نے مکرر طہارۃ میں اور کتاب الاشربہ میں ذکر کیا۔ ابو داؤد، نسائی و ابن ماجہ و ترمذی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ جب کوئی پینے کی چیز پی جائے تو برتن میں سانس نہ لیا جائے۔ حضور اکرم کے اس ارشاد کے فوائد بالکل ظاہر ہیں۔ اسی طرح داہنے ہاتھ سے مس ذکر نہ کیا جائے اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجا کیا جائے۔ یہ نہی تنزیہی ہے۔ اسی پر جمہور کا اتفاق ہے۔ فقہاء کرام نے اسی حدیث سے یہ مسئلہ نکالا کہ داہنے ہاتھ سے استنجا کرنا یا اس کو چھونا یا ڈھیلے کو داہنے ہاتھ سے گزارنا مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ داہنا ہاتھ عزت و بزرگی رکھتا ہے۔

بَابُ لَا يُمْسِكُ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ إِذَا بَالَ

باب پیشاب کرتے وقت شرمگاہ کو داہنے ہاتھ سے تھامنا

۱۵۴- عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَأْخُذَنَّ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَلَا يَسْتَنْجِي بِيَمِينِهِ وَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ (بخاری)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو اپنی شرمگاہ کو سیدھے ہاتھ سے نہ تھامے اور سیدھے ہاتھ سے استنجا نہ کرے اور نہ (برتن) میں سانس لے۔

فوائد ومسائل سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ باب پہلی حدیث سے بھی معلوم ہو گیا تھا۔ پھر تکرار سے فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ امام کی عادت یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو جس سے متعدد مسائل نکلتے ہوں متعدد ابواب میں لاتے ہیں حتیٰ کہ حدیث کے کسی ایک ٹکڑے سے بھی کوئی نئی بات پیدا ہوتی ہو تو عنوان قائم کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ اس میں اسناد و الفاظ متن کا فرق ہے۔ لہٰذا تکرار بے فائدہ نہ ہوئی۔ علامہ قسطلانی نے فرمایا۔ پہلے باب میں امام نے داہنے ہاتھ سے استنجاء کرنے کی ممانعت ثابت کی تھی اور اب اس باب میں داہنے ہاتھ سے شرمگاہ کو چھونے کی ممانعت بیان کی ہے۔

بَابُ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْحِجَارَةِ

باب ڈھیلوں سے استنجاء کرنے کے بیان میں

اس باب کو قائم کر کے امام نے ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو پانی سے استنجاء کرنے کو ضروری کہتے ہیں۔

۱۵۵- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ اتَّبَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَرَجَ لِحَاجَتِهِ وَكَانَ لَا يَلْتَفِتُ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَقَالَ ابْغِنِي أَحْجَارًا أَسْتَنْفِضْ بِهَا أَوْ نَحْوَهُ وَلَا تَأْتِنِي بِعَظْمٍ وَلَا رَوْثٍ فَأَتَيْتُهُ بِأَحْجَارٍ بِطَرَفِ ثِيَابِي فَوَضَعْتُهَا إِلَى جَنْبِهِ وَأَعْرَضْتُ عَنْهُ فَلَمَّا قَضَى أَتْبَعَهُ بِهِنَّ (بخاری شریف)

حضرت ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلا۔ آپ قضاء حاجت کے لیے نکلے تھے۔ اور (چلتے میں) پیچھے نہیں دیکھتے تھے۔ میں آپ کے قریب ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے لیے کچھ پتھر (ڈھیلے) ڈھونڈ کر لاؤ۔ تاکہ میں اس سے استنجاء کروں، یا ایسا ہی آپ نے کوئی اور جملہ کہا اور فرمایا ہڈی مینگنی نہ لانا۔ میں اپنے دامن میں کئی پتھر لے آیا اور آپ کے پاس رکھ دیئے اور ایک طرف ہٹ گیا۔ آپ جب قضاء حاجت سے فارغ ہوتے تو آپ نے ان سے پونچھا (استنجاء کیا)

فوائد ومسائل ۱۔ اس باب کے قائم کرنے سے امام کا مقصد ان لوگوں کے خیال کی تردید کرنا تھا۔ جو پانی سے استنجاء کرنے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حدیث زیر عنوان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ڈھیلوں سے استنجاء کرنا جائز ہے اور پانی سے استنجاء کرنا ضروری و لازمی نہیں ہے البتہ ڈھیلے سے طہارت اس وقت ہوگی جبکہ

نجاست سے مخرج کے آس پاس کی جگہ ایک درہم سے زیادہ آلودہ نہ ہو۔

۲۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ کسی بزرگ یا امام کا اپنے ساتھی یا ماتحت یا دوست یا نیازمند سے خدمت لینا جائز ہے۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لیے سامانِ استنجاء مہیا کر دینا جائز ہے۔

۳۔ گوبر ہڈی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے کیونکہ ہڈی جنوں کی خوراک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر ان کے لیے گوشت پیدا فرما دیتا ہے اور گوبر جنوں کے چارپاؤں کی خوراک ہے۔ پتھر سے استنجاء کرنا متعین نہیں ہے۔ ہر وہ چیز جو پاک ہو، جاذب نجاست زائل کر سکے وہ استنجاء کرنے کے کام آ سکتی ہے۔ جیسے پتھر، کنکر، مٹی کا ڈھیلا، کپڑا وغیرہ ان سے بلاکراہت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح دیوار سے بھی استنجاء سکھایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ غیر کی ملک نہ ہو۔ اگر دوسرے کی ہے اور اس سے استنجا سکھایا تو اگرچہ طہارت ہو جائے گی مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔ البتہ جو مکان کرائے پر لے رکھا ہے اس کی دیوار سے استنجاء سکھانا جائز ہے۔ پرائی دیوار سے ڈھیلے توڑ کر استنجاء کر لیا یا کاغذ سے کیا تو طہارت تو ہو جائے گی مگر یہ فعل [illegible] ناجائز اور ممنوع ہوگا۔ سونا، چاندی، ہڈی، گوبر، پکی اینٹ، ٹھیکری اور شیشہ، کوئلے اور جانور کے چارے وغیرہ سے استنجاء کرنا بھی مکروہ ہے۔ اگر کسی نے ان اشیاء سے استنجاء کر لیا تو ہو جائے گا (عامہ کتب فقہیہ حنفیہ)

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ استنجاء کے لیے پتھر تلاش کر لاؤ۔ پتھر کے لفظ سے بعض حنابلہ و ظاہریہ نے یہ استدلال کیا کہ استنجاء صرف پتھر ہی سے ہو سکتا ہے لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ابوہریرہ کو یہ حکم دیا کہ میرے لیے پتھر لاؤ۔ استنفض بھا تاکہ میں اس سے صفائی حاصل کروں۔ استنفض کے لفظ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ گمان کر سکتے تھے کہ جو چیز بھی نجاست کے اثر کو زائل کر دے وہ استنجاء کے کام آ سکتی ہے۔ خواہ وہ پتھر ہو، یا کچھ اور تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ہڈی و گوبر کی نفی کر دی تو ہڈی و گوبر کی نفی سے واضح کہ ان کے سوائے استنجاء جائز ہے۔ پس اگر استنجاء صرف پتھر کے ساتھ خاص مانا جائے تو ہڈی و گوبر کو نفی کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ رہی یہ بات کہ حضور علیہ السلام نے پتھر کی تخصیص کیوں فرمائی؟ تو اس یہ تھی کہ عامۃ الوجود ہے خصوصاً عرب کی سرزمین میں۔

گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے کا بیان

رہی یہ بات کہ اگر کسی نے گوبر یا ہڈی سے استنجاء کر لیا تو طہارت جائے گی یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے اور طول وطویل ہیں۔ مثلاً اگر گوبر و ہڈی سے استنجاء کی ممانعت کی علت یہ ہو کہ یہ جنوں کی خوراک ہے جیسا کہ بخاری کتاب المبعث حدیث میں وارد ہوا ہے تو اس سے تمام مطعومات (کھانے کی چیزوں) سے استنجاء کرنے کی ممانعت نکلے گی اور اگر ممانعت کی علت ہو کہ یہ خود نجس ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آئے گا کہ حضور علیہ السلام نے گوبر سے یہ کہہ کر استنجاء نہیں فرمایا کہ یہ نجس ہے تو اس سے نجس اشیاء سے استنجاء کی ممانعت ثابت ہوگی اور ہڈی سے ممانعت کی وجہ یہ ہو کہ وہ چکنی ہوتی ہے اور اس سے نجاست کا ازالہ تام نہیں ہوتا۔ تو اس سے چکنی چیزوں سے استنجاء کی ممانعت ثابت ہوگی جیسے شیشہ وغیرہ تو جب ممانعت کی علت میں علماء کا اختلاف ہوا، تو اس امر میں بھی اختلاف ہو گیا کہ آیا ان اشیاء سے

کرنے کی صورت میں طہارت ہوگی یا نہیں۔

امام شافعی وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے استنجا کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے کر لیا تو طہارت نہ ہوگی، یہ حضرات ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ گوبر و ہڈی سے استنجاء مت کرو؛ چنانچہ اس مضمون متعدد حدیثیں، مسلم، دارقطنی، نسائی، حاکم نے روایت کی ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالٰی عنہ یہ فرماتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے استنجاء کرنے کی ممانعت کی علت یہ ہے کہ وہ جنوں کی خوراک ہیں۔ کیونکہ جنوں نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی خوراک کے متعلق سوال کیا تو حضور نے فرمایا کہ ہڈی پر تمہارے لیے اور گوبر پر تمہارے چارپاؤں کے لیے اللہ تعالیٰ خوراک پیدا فرمادے گا اس پر جنوں نے عرض کی۔

إِنَّ بَنِيْ آدَمَ يُنَجِّسُوْنَهُ عَلَيْنَا فَعِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ لَا تَسْتَنْجُوْا بِرَوْثِ دَابَّةٍ وَلَا بِعَظْمٍ إِنَّهُ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ (طحاوی)

حضور! بنی آدم ہڈی اور گوبر سے استنجاء کرکے اس کو ناپاک کردیتے ہیں۔ اس پر حضور نے حکم دیا کہ تم لوگ ہڈی لید و گوبر سے استنجاء نہ کیا کرو کیونکہ یہ دونوں چیزیں تمہارے بھائی جنات کی خوراک ہیں۔

اسی مضمون کی حدیث بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد و نسائی، دارقطنی، حاکم نے روایت کی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ گوبر و ہڈی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجاء کرنے کی ممانعت اس لیے فرمائی کہ یہ جنوں کی خوراک ہے۔ لہٰذا ان اشیاء سے استنجاء کرنے کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ ان اشیاء سے ڈھیلوں کی طرح طہارت بھی نہیں ہوتی۔ رہی وہ حدیثیں جن میں حضور علیہ السلام نے ہڈی و گوبر سے استنجاء کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہمیں وہ تسلیم ہیں مگر ممانعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر کسی نے ہڈی و گوبر سے استنجاء کر لیا تو نجاست کا ازالہ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ استنجا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیے کہ نجاست کو زائل کر سکے۔ سوکھا ہوا گوبر، یا سوکھا ہوا اونٹ کا مینگنی یا ہڈی ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ان سے نجاست صاف ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے ان سے استنجاء کر لیا تو طہارت تو ہوجائے گی۔ اگرچہ اس کا یہ فعل مکروہ ہوگا۔

لہٰذا ممانعت کی حدیثوں سے یہ استدلال کرنا (جیسا کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ نے کیا ہے) کہ ہڈی و گوبر سے نجاست کا ازالہ ہی نہیں ہوگا۔ لہٰذا طہارت نہ ہوگی، صحیح نہیں بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ ممانعت اور چیز ہے اور نجاست کا زائل ہوجانا اور بات ہے دیکھئے کاغذ سے استنجاء کرنا ممنوع ہے اور اس کی علت کاغذ کا احترام ہے کہ اس پر لکھا جاتا ہے لہٰذا اس کو استنجاء کے لیے استعمال نہ کیا جائے لیکن اگر کسی نے بالفرض کاغذ سے استنجاء کر لیا اور نجاست کو اس سے پونچھ لیا تو اس کے متعلق یہ تو کہا جائے کہ اس نے برا کیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاغذ سے نجاست کو پونچھنے سے نجاست زائل نہیں ہوئی لہٰذا طہارت نہ ہوئی۔ فافہم

بَابٌ لَا يُسْتَنْجٰى بِرَوْثٍ

باب گوبر سے استنجاء نہ کیا جائے

۵۶: یَقُوْلُ اَتَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ الْغَائِطَ فَاَمَرَنِیْ اَنْ آتِیَہُ
بِثَلَاثَۃِ اَحْجَارٍ فَوَجَدْتُ حَجَرَیْنِ
وَالْتَمَسْتُ الثَّالِثَ فَلَمْ اَجِدْ فَاَخَذْتُ
رَوْثَۃً فَاَتَیْتُہُ بِھَا فَاَخَذَ الْحَجَرَیْنِ
وَاَلْقَی الرَّوْثَۃَ وَقَالَ ھٰذَا رِکْسٌ
(بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت کے لیے جنگل
مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا۔ میں نے دو پتھر
کر لیے۔ تیسرا ڈھونڈا نہ ملا تو میں نے گوبر کا
لیا اور آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔
دونوں پتھروں کو تو لے لیا اور گوبر پھینک دیا
یہ پلید ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ یہ حدیث افراد بخاری سے ہے۔ امام مسلم علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کو نہیں لیا۔
ماجہ نے کتاب الطہارت میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ ۲۔ حدیث ہذا سے مسائل ذیل
۱۔ گوبر سے استنجا نہ کیا جائے۔ چنانچہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گوبر کے متعلق فرمایا کہ یہ رکس ہے یعنی
رکس کے معنی نجس کے لینا اولیٰ ہے کیونکہ روایت ابن ماجہ و ابن خزیمہ میں رکس کی جگہ رجس کا لفظ آیا ہے۔ ۲۔
سے یہ واضح ہوا کہ استنجا کے لیے تین ڈھیلوں کا ہونا ضروری نہیں ہے یعنی ڈھیلوں کی کوئی تعداد معین
جتنے سے صفائی ہو جائے کافی ہے تو اگر ایک سے صفائی ہو گئی سنت ادا ہو گئی اور اگر تین ڈھیلے لیے اور
ہوئی سنت ادا نہ ہوئی۔ البتہ یہ مستحب ہے کہ ڈھیلے طاق ہوں اور کم سے کم تین ہوں تو اگر ایک یا دو سے
گئی تو تین کی گنتی پوری رہنا مستحب ہے۔ اسی طرح اگر چار سے صفائی ہو گئی تو پانچواں اور لے لینا کہ طاق ہو
ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا یہی مسلک ہے اور اس کی دلیل اسی حدیث میں موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے
عبداللہ بن مسعود کو تین ڈھیلے لانے کا حکم دیا۔ ان کو دو ملے۔ تیسرے کی جگہ گوبر لے آئے۔ آپ نے گوبر کا استعمال
عدد ڈھیلوں سے استنجا فرمایا۔ جس سے واضح ہوا کہ دو ڈھیلوں پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے کیونکہ اگر تین عدد ڈھیلے
استنجا کرنا ضروری ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تیسرا ڈھیلا تلاش کرنے کا حکم صادر فرماتے مگر آپ
نہیں کیا بلکہ دو ہی سے استنجا فرما لیا۔

سوالات

علامہ طحاوی نے اس موقع پر یہ اعتراض کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرا ڈھیلا
حکم اس لیے نہ دیا کہ جس جگہ آپ قضاء حاجت کے لیے بیٹھے ہوں گے وہاں موجود ہوگا
متعدد وجوہ سے باطل ہے کیونکہ اگر وہاں ڈھیلے پہلے ہی سے موجود ہوتے تو حضور علیہ السلام حضرت
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ڈھیلے لانے کا حکم ہی کیوں دیتے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام ایسی جگہ
لیے تشریف لے گئے تھے جہاں پہلے سے ڈھیلے موجود نہ تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس جگہ تین عدد
ایک موجود تھا تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اگر ایک اس جگہ پہلے ہی سے موجود تھا تو پھر آپ کو تین کا عدد پورا
لیے دو عدد ڈھیلے لانے کا حکم دینا چاہیے تھا لیکن آپ نے دو کی بجائے تین کا حکم دیا جو اس امر کی دلیل

ید پہلے سے بھی ڈھیلہ موجود نہ تھا۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں امام طحاوی کے استدلال کی تردید میں لکھا ے۔ مسند احمد کی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو ڈھیلے اور ایک گوبر کا ٹکڑا لے کر حضور ی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں پہنچے تو آپ نے گوبر پھینک دیا اور فرمایا کہ اس کی جگہ ایک، اور پتھر لے آؤ۔ دیث کے رجال ثقہ ہیں۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا۔ استنجاء کے لیے تین عدد ڈھیلوں کا لینا واجب ہے۔ اگر تین ڈھیلے لینا واجب نہ ہوتا تو حضور سید عالم تیسرا ڈھیلا منگانے کا حکم نہ فرماتے۔ اس کا جواب علامہ عینی نے یہ دیا ہے س حدیث میں اسحٰق علقمہ سے روایت کرتے ہیں اور امام طحاوی کے نزدیک اسحٰق کا علقمہ سے سماع ثابت نہیں ہے لہٰذا یث منقطع ہے اور منقطع حدیث محدثین کے ہاں قابلِ عمل نہیں ہے۔ اسی طرح ابو شیبہ واسطی ضعیف ہیں۔ لہٰذا ان ابعت بھی معتبر نہیں (نیل الاوطار جلد ۱ صـ۹۹ عینی جلد ۱ صـ۴۳)۔ پس ثابت ہوا کہ استنجاء کے لیے تین عدد یلوں کا ہونا واجب نہیں اور بلا تعیین تعداد ڈھیلے سے استنجار کرنا سنت ہے اور ان کا طاق ہونا مستحب ہے۔

ح ہو

کہ اس باب کی متعدد حدیثوں کا مضمون یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین ڈھیلوں سے استنجا کیا جائے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ ہم تین ڈھیلوں پر اکتفا کریں۔ (احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی)۔ ان احادیث سے علماء کا ایک طبقہ استدلال کرتا ہے کہ کے لیے تین ڈھیلوں کا ہونا واجب ہے اور تین عدد سے کم سے استنجا جائز نہیں ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ ہ یہ فرماتے ہیں کہ مقصودِ استنجا سے صرف یہ ہے کہ نجاست زائل ہو جائے اور وہ جس قدر ڈھیلوں سے ہو جائے ت ہے۔ خواہ تین سے کم ہوں یا زیادہ جفت ہوں یا طاق اور وہ حدیثیں جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تین عدد ڈھیلوں ستنجار کیا کرو تو ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تین کا عدد ڈھیلوں کے لیے متعین ہے اور تین سے کم سے نجاست کا ازالہ ہیں سکتا۔ چنانچہ اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ تین عدد ڈھیلوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے تو سی قدر مزید ڈھیلے لینا واجب ہے۔ جن سے صفائی ہو جائے خواہ وہ تین سے کتنے ہی ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک متعدد طرف ہیں۔ مثلاً تین اطراف ہیں تو ان تینوں اطراف سے استنجا کیا تو جائز ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ ڈھیلوں تعداد معین سنت نہیں ہے۔ چنانچہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس مسلک کی تائید و توثیق حدیث ذیل سے بھی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سْتَجْمَرَ فَلْيُوْتِرْ مَنْ فَعَلَ فَقَدْ
سَنَ وَمَنْ لَا فَلَا حَرَجَ

(احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

جو شخص ڈھیلوں سے استنجار کرے تو ڈھیلے وتر (طاق) لے جس نے ایسا کیا اچھا کیا جس نے ایسا نہ کیا تو کوئی حرج نہیں۔

س مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں۔ جن سے واضح ہوا کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاق ڈھیلے لینے کا ستحباب کے دیا ہے۔ بطور فرضیت کے نہیں۔ اگر بطور فرضیت کے طاق ڈھیلے کا حکم فرمایا ہوتا تو پھر وَمَنْ لَا حَرَجَ (کہ جس نے طاق ڈھیلے نہیں لیے تو بھی کوئی حرج نہیں) نہ فرماتے۔ نیز اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ

جب حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دو ڈھیلے اور ایک گوبر کا ٹکڑا لے کر آئے تو آپ نے گوبر کو
دیا اور دونوں ڈھیلوں سے استنجا فرمالیا۔ حضور علیہ السلام کے اس فعل سے بھی واضح ہوا کہ ڈھیلوں میں تین عدد متعین
ہے بلکہ جتنوں سے نجاست زائل ہو جائے۔ اتنے ہی ڈھیلے لینا ضروری ہیں۔ خواہ دو ہوں یا تین۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے
کہ طاق ڈھیلے لینا مستحب ہے۔

نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے امام اعظم علیہ الرحمۃ کی رائے پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ وہ احادیث جن میں
علیہ السلام نے تین عدد ڈھیلے لینے کا حکم کیا ہے قولی ہیں اور حدیث عبداللہ بن مسعود جس میں یہ ہے کہ آپ نے
ڈھیلوں سے استنجا فرمایا فعلی ہے اور جب قولی اور فعلی حدیثوں میں تعارض ہو تو قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی
(نیل الاوطار ج ا ص ۹۶)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کی اصل دلیل فعلی نہیں بلکہ قولی ہی ہے۔ یعنی
ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاق ڈھیلے لیا کرو۔ جس نے طاق ڈھیلا لیا اچھا کیا اور جس
تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ رہی زیر بحث فعلی حدیث تو یہ امام نے بطور تائید کے پیش کی ہے نہ کہ بطور اصل دلیل
کے علاوہ یہ کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ فعلی اور قولی میں تعارض ہو تو ضرور ہر جگہ پر قول کو ترجیح دی جائے گی۔ جیسا کہ اہل
پر مخفی نہیں ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مَرَّةً مَرَّةً

باب وضوء میں ایک ایک بار اعضاء کو دھونا

۱۵۷- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَوَضَّاَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً مَرَّةً

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعضاء وضوء کو ایک ایک

بَابُ الْوُضُوْءِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

باب وضوء میں دو دو بار اعضاء کو دھونا

۱۵۸- اَلنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّاَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

عبداللہ بن زید کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
اعضاء وضوء کو دو دو بار دھویا۔

بَابُ الْوُضُوْءِ ثَلٰثًا ثَلٰثًا

باب وضوء میں اعضاء وضو کو تین تین بار دھونا

۱۵۹- اَنَّهٗ رَاٰى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا
بِاِنَاءٍ فَاَفْرَغَ عَلٰى كَفَّيْهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ
فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ اَدْخَلَ يَمِيْنَهٗ فِي الْاِنَاءِ
فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهٗ
ثَلٰثًا وَّيَدَيْهِ اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلٰثَ مِرَارٍ

(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام حمران نے
کہ انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان نے پانی کا برتن
(پہلے) اپنے دونوں پہونچوں پر تین بار ڈالا اور ان کو
پھر اپنا داہنا ہاتھ برتن میں ڈالا۔ پھر کلی کی اور ناک
اپنا منہ تین بار دھویا اور دونوں ہاتھ کہنیوں

ثُمَّ مَسَحَ بِرَاْسِهٖ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ
لٰثَ مِرَارٍ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ قَالَ
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ
تَوَضَّاَ نَحْوَ وُضُوْٓئِيْ هٰذَا ثُمَّ صَلّٰى
رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهٗ غُفِرَ لَهٗ
مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَّلٰكِنْ عُرْوَةُ يُحَدِّثُ
عَنْ حُمْرَانَ فَلَمَّا تَوَضَّاَ عُثْمَانُ قَالَ لَاُ
حَدِّثَنَّكُمْ حَدِيْثًا لَّوْلَا اٰيَةٌ مَّا حَدَّثْتُكُمُوْهُ
سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ
يَتَوَضَّاُ رَجُلٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْٓءَهٗ وَ
يُصَلِّي الصَّلٰوةَ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَيْنَهٗ
وَبَيْنَ الصَّلٰوةِ حَتّٰى يُصَلِّيَهَا ثُمَّ قَالَ
عُرْوَةُ الْاٰيَةَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ
نْزَلْنَا

دھوئے پھر سر پر مسح کیا (ایک بار) پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک تین بار دھوئے۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے اور دو رکعتیں (تحیۃ الوضوء) پڑھے اور اس عرصہ میں دنیا کا خیال اپنے دل میں نہ لائے تو اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

ابن شہاب نے کہا لیکن عروہ حمران سے اس حدیث کی یوں روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وضوء کر چکے تو کہنے لگے میں تم کو ایک حدیث سناتا ہوں۔ اگر قرآن حکیم کی ایک آیت نہ ہوتی تو میں تم کو یہ حدیث نہ سناتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص اچھی طرح وضوء کرے اور اس کے بعد نماز پڑھے تو جتنے گناہ اس نماز سے دوسری نماز کے پڑھنے تک ہوں گے، وہ بخش دیئے جائیں گے (بخاری)

توضیح حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس آیت کی طرف اشارہ کیا وہ سورۃ بقرہ کے دوسرے پارہ کی آیت ہے جو علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ یہ لوگ حضور علیہ السلام سے متعلق توریت میں جو بشارتیں یں ان کو چھپاتے تھے اور رجم اور دوسرے احکام پر بھی پردہ ڈالتے تھے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور یا گیا اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا الخ جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ں۔ ان پر اللہ لعنت فرماتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا کہ دین سے تعلق امور کی تبلیغ و اشاعت ضروری ہے اور اس کا کتمان حرام ہے۔ اس لیے میں حدیث نبوی کو بیان کرنا اپنا فرض جانتا ہوں س کے بعد آپ نے حدیث بیان کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جس نے اچھی وضوء کیا یعنی آداب و سنن کی رعایت کے تھ وضوء کیا۔ پھر نماز پڑھی تو اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ واضح ہو کہ حدیث کے اس جملے اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا ينهٗ وَبَيْنَ الصَّلٰوةِ حَتّٰى يُصَلِّيَهَا کا عام شراح حدیث نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ جتنے گناہ اس نماز سے دوسری ز کے پڑھنے تک ہوں گے بخش دیے جائیں گے لیکن علامہ عینی نے حَتّٰى يُصَلِّيَهَا کا ترجمہ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهَا کیا ہے۔

د و مسائل امام نے تین عنوان قائم کیے ہیں اور اس کے ضمن میں عنوان کے مناسب حدیثیں لکھی ہیں۔ تینوں حدیثوں کے مسائل و احکام بیان کیے جاتے ہیں۔ حدیث اول کو ابو داؤد، ترمذی و ابن ماجہ و نسائی نے روایت

کیا ہے۔ مسلم نے نہیں۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وضو میں اعضاء وضو کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے اگر ایک بار بھی نہ دھویا تو وضو ہوگا ہی نہیں۔ ان سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو وضو میں ہر عضو کو تین بار دھونا فرض قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وضو میں داڑھی کو خلال کرنا نہیں ہے کیونکہ ایک بار چہرہ دھونے کے بعد ہاتھوں میں اتنا پانی نہیں رہتا جس سے خلال کیا جاسکے۔ حدیث دوم افراد بخاری سے ہے۔ ابوداؤد ترمذی نے اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ لیکن ترمذی نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور حدیث سوم کو بخاری نے مکرر کتاب الطہارت میں اور کتاب الصوم میں کیا ہے اور مسلم، ابوداؤد ونسائی نے بھی اس حدیث کو کتاب الطہارت میں ذکر کیا ہے۔

مسائلِ احادیث

واضح ہو کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ وضو میں اعضاء وضو کو حضور نے تین تین بار دھو کبھی دو دو بار اور کبھی ایک ایک بار۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے بعض اعضا کو تین تین بار دھویا۔ بعض کو دو دو بار اور بعض کو صرف ایک ایک بار دھویا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام اعضاء صرف ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور اس سے زائد یعنی تین تین بار دھونا سنّت ہے:

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضو کے لیے پانی منگایا۔ اس سے ثابت ہے کہ وضو کے پانی لانے کے دوسرے سے مدد لینا جائز ہے ۳۔ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ جس سے ثابت ہوا کہ برتن میں ہاتھ سے پہلے ہاتھوں کو تین بار دھو لینا مستحب ہے ۴۔ پھر آپ نے اپنا داہنا ہاتھ برتن میں ڈالا۔ اس سے ثابت داہنے ہاتھ سے چلّو لینا چاہیے ۵۔ پھر آپ نے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ اگرچہ اس حدیث میں تین بار کلی کرنے کا نہیں لیکن روایتِ شعیب جو آگے آرہی ہے۔ اس میں تین بار کی تصریح ہے۔ اسی طرح حدیث ابوداؤد میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا۔

فَاَخَذَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مَاءً جَدِيدًا (ابوداؤد) | اور ہر بار نیا پانی کا چلّو لیا

وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنّت ہے۔ تین چلّو پانی سے تین کلیاں کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ ہر بار کے ہر پرتے پر پانی بہ جائے اور اگر روزہ دار نہ ہو تو غرغرہ کرے، کلی پہلے کرے اور اس کے بعد ناک میں تین چلّو سے تین بار پانی ڈالے اس طرح کہ جہاں تک نرم گوشت ہے اور جہاں پانی پہنچ کر رکتا ہے ہر بار اس پر پانی بہ جائے۔ کام سیدھے ہاتھ سے کیے جائیں اور ناک بائیں ہاتھ سے صاف کی جائے۔

اختلاف

اگر کسی نے بھول کر کلی نہیں کی یا ناک میں پانی نہیں لیا تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ اس میں علما اختلاف ہے۔ امام حسن عطاء، زہری، قتادہ ربیعہ یحییٰ انصاری ومالک واوزاعی اور امام شافعی ہیں دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں اور عطاء وزہری (فی اول قولیہ) وابن ابی لیلیٰ وحماد واسحاق یہ فرماتے ہیں کہ جس نے کلی کی وہ دوبارہ وضو کرے (وبہ قال ابو عبید وابو ثور)۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں لینا سنّت ہے فرض نہیں تو اگر کسی نے کلی نہ کی اور ناک میں پانی نہ لیا تو اس کا وضو ہو جائے گا۔

۶- پھر آپ نے منہ کو تین بار دھویا۔ منہ دھونا فرض ہے اور اس کی فرضیت قرآن کریم سے ثابت ہے۔ پانی کے تین وصف ہوتے ہیں۔ رنگ، بو، مزا۔ چلو میں پانی لینے سے اس کی رنگت اور ناک میں پانی لینے سے اس کی بو اور کلی کرنے سے اس کا مزا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس لیے منہ دھونے سے پہلے کلی کرنے اور ناک میں پانی لینے کی ہدایت دی گئی۔

۷- اس کے بعد آپ نے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت تین بار دھویا۔ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا بھی فرض ہے اور قرآن حکیم سے ثابت ہے

۸- پھر آپ نے سر کا مسح کیا۔ یہ بھی فرض ہے۔ مقدار مسح میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں واجب مسح میں صرف اتنا ہے کہ اس پر اسم مسح کا اطلاق آجائے۔ پس اگر کسی نے ایک بال یا تین بال کا مسح کر لیا ہوگا۔ امام مالک و احمد کا مسلک یہ ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔ جب تک سارے سر کا مسح نہ ہوگا وضو درست نہ ہوگا۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ یہ فرماتے ہیں کہ چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے کیونکہ قرآن کریم میں یہ فرمایا گیا کہ سر کا مسح کرو لیکن قرآن میں مقدارِ مسح نہیں بتائی۔ حضور علیہ السلام چونکہ قرآنی اصولوں کے شارح ہیں۔ آپ نے اپنے عمل سے یہ بتایا کہ چوتھائی سر کا مسح کیا جائے جیسا کہ حدیث مشہورہ میں وارد ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ سر کا مسح ایک بار کیا جائے یا تین بار؟ امام شافعی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ جیسے اور اعضاء وضو کو تین تین بار دھونا مستحب ہے۔ اسی طرح تین بار مسح کرنا بھی مستحب ہونا چاہیے حضرت امام شافعی مسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ کہ حضور علیہ السلام نے تین تین بار وضو کیا۔ وہ فرماتے ہیں تین تین بار وضو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وضو کے تمام اعضاء کو تین تین بار دھویا اور سر پر بھی تین بار مسح کیا۔ لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ خط کشیدہ جملوں کا مطلب یہ ہے کہ وضو میں جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین بار دھویا۔ چنانچہ صحاح کی کسی حدیث میں بھی مسح کا عدد مذکور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسح کا معنی تخفیف ہے تو اگر مسح میں بھی عدد کا اعتبار کیا جائے تو تخفیف باقی نہ رہے گی۔ لہذا مسح کو دیگر اعضاء وضو پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو اعضا دھوئے جاتے ہیں ان کو تین بار دھونے کی ہدایت تو اس بنا پر ہے کہ اعضاءِ وضو خوب اچھی طرح دھل جائیں برخلاف مسح کے حضرت امام مالک و احمد و امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ مسح ایک بار ہی کیا جائے۔ کیونکہ وہ احادیث جن میں وضو کا بیان ہے ان کا مضمون یہی ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تین بار ہاتھ دھوئے، تین بار کلی کی تین بار منہ دھویا اور سر کا مسح کیا۔ لیکن مسح کے ساتھ عدد کا ذکر نہیں ہوتا جو اس امر کی دلیل ہے کہ مسح ایک بار کرنا ہی مسنون ہے۔

۹- پھر دونوں پاؤں ٹخنے سمیت تین بار دھوئے۔ وضو میں پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے اور قرآنِ حکیم سے ثابت ہے۔

۱۰- حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ جب وضو کر چکے تو آپ نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص وضو کرے میرے وضو کی طرح اور دو رکعت نفل پڑھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وضو کے بعد دو رکعت نفل (تحیۃ الوضوء) پڑھنا مسنون ہے اور اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ اوقاتِ مکروہہ کے علاوہ ہر وقت پڑھے جا سکتے ہیں۔ لا یحدث فیہما کا مطلب یہ ہے یہ دو رکعتیں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی جائیں اور دل دنیاوی خیالات سے خالی ہو۔ البتہ جو وسوسے بے اختیار آجائیں وہ معاف ہیں۔ غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔ یعنی جو اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت تحیۃ الوضوء کے پڑھے گا۔ اس کے

اگلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اگرچہ الفاظ حدیث سے تمام گناہوں کی مغفرت ثابت ہوتی ہے خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لیکن علماء نے دیگر دلائل شرعیہ کے پیش نظر یہ تخصیص کی ہے کہ صغیرہ معاف ہو جائیں گے کبیرہ نہیں۔ اسی سلس ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ اس بشارت پر مغرور نہ ہو جانا۔ یعنی یہ خیال کر کے کہ گناہ تو ہو ہی جائیں گے۔ گناہ کرنے پر جرأت نہ کرنا۔ کیونکہ گناہ اس نماز سے معاف ہوتے ہیں جو بارگاہ خداوندی میں شرف قبول پائے۔ اب نامعلوم جو نماز پڑھی گئی ہے وہ مقبول ہے یا نہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی عمل پر بشارت کو سن کر گناہ پر دلیر خود ایک مستقل گناہ ہے۔

بَابُ الْاِسْتِنْثَارِ فِی الْوُضُوْءِ

باب وضوء میں ناک سنکنے کے بیان میں

۱۶۰۔ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ مَنْ تَوَضَّاَ فَلْیَسْتَنْثِرْ وَ مَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْیُوْتِرْ (بخاری شریف)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو وضوء کرے ناک سنکے اور جو استنجا کے لیے ڈھیلے لے تو طاق لے

فوائد اس حدیث کو ابن ماجہ و نسائی نے کتاب الطہارت میں ذکر کیا۔ من توضاء میں من موصولہ متضمن معنی شر اور فلیستنثر جواب شرط ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو کوئی وضوء کرے اور ناک میں پانی لے تو ناک سنکے۔ بخاری باب بدء الخلق کی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی تم میں سے سو کر اٹھے اور وضوء کرے تو تین بار ناک سنکے شیطان رات کو ناک پر شب باشی کرتا ہے۔ ناک سنکنے میں حکمت یہ ہے کہ خوب اچھی طرح صاف ہو جائے تاکہ حروف طرح ادا ہو سکیں۔ من استجمر، استجمار۔ پاخانہ و پیشاب کے بعد پتھر سے صاف کرنے کو کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ استنجے کے لیے ڈھیلے طاق لیے جائیں۔

مسائل حدیث ۱۔ وضوء میں کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنت ہے اور ناک سنکنا مستحب ہے اسی پر اجماع ہے

۲۔ امام احمد و اسحاق و ابو عبید و ابو ثور و ابن المنذر نے حدیث زیر بحث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے وضوء میں ناک میں پانی لینے کو واجب قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں فَلْیَسْتَنْثِرْ امر کا صیغہ ہے جو وجوب کو چاہتا ہے لیکن جمہور علماء و امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ یہاں امر ندب کے لیے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کرنے کا طریقہ ان لفظوں سے بتایا۔ تَوَضَّاْ کَمَا اَمَرَكَ اللّٰهُ (ترمذی اس طرح وضوء کر جس طرح قرآن حکیم میں وضوء کا بیان آیا ہے۔ امام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں وضوء کے متعلق ناک لینے اور کلی کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ہاتھ پاؤں، منہ دھونے اور سر کا مسح کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا کلی کرنا، ناک پانی لینے اور سنکنے کی فرضیت ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا حدیث میں ناک میں پانی لینے کو مستحب قرار دیا جانا چاہیے۔ اسی استنجا کے لیے طاق ڈھیلے لینے کی ہدایت بھی ندبی ہے۔

بَابُ الْاِسْتِجْمَارِ وِتْرًا

باب استنجاء میں طاق ڈھیلے کے بیان میں

۱۶۱- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَوَضَّاَ اَحَدُكُمْ فَلْیَجْعَلْ فِیْ اَنْفِهٖ مَاءً ثُمَّ لِیَنْتَثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْیُوْتِرْ وَاِذَا اسْتَیْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهٖ فَلْیَغْسِلْ یَدَهٗ قَبْلَ اَنْ یُدْخِلَهَا فِیْ وَضُوْئِهٖ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَا یَدْرِیْ اَیْنَ بَاتَتْ یَدُهٗ

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کوئی تم میں سے وضوء کرے تو اپنی ناک میں پانی ڈالے اور پھر سنکے اور جو کوئی استنجاء کے لیے ڈھیلے لے تو طاق لے اور تم میں سے جو کوئی سو کر اٹھے تو پہلے ہاتھ وضوء کے پانی میں ڈالنے سے دھوئے کہ معلوم نہیں اس کا ہاتھ کہاں رہا ہے۔

فوائد و مسائل ۱- اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور ابن ماجہ، مسلم، دارقطنی امام طحاوی و ابوداؤد نے بھی اسی مضمون کی حدیث کو روایت کیا ہے اور اس میں دوبار اور تین بار دھونے کے لفظ بھی آئے ہیں۔ ۲- یہ حدیث تین حکموں پر مشتمل ہے۔ وضوء کرتے وقت ناک میں پانی لینا اور سنکنا- استنجاء کے لیے طاق ڈھیلے لینا اور سو کر اٹھنے کے بعد برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دھولینا- بعض روایتوں میں دوبار اور بعض میں تین بار دھونے کا ذکر ہے۔ امام نے حدیث کے ایک ٹکڑے یعنی استنجاء میں طاق ڈھیلے لیے جائیں کا عنوان قائم کیا۔ ۳- ہاتھوں کو دھونے کی علت یہ بتائی گئی کہ ممکن ہے رات کو سوتے میں ہاتھ شرمگاہ تک پہنچ گیا ہو اور وہاں کا پسینہ ہاتھ کو لگا ہو- جس سے واضح ہوا کہ یہ حکم استحباب کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں ہے کیونکہ جو حکم متضمن شک ہو وجوب کا فائدہ نہیں دیتا۔

اس حکم کی علت یہ ہے کہ اہلِ حجاز عموماً ڈھیلے سے استنجاء کرتے تھے۔ اب سونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ پسینہ آئے اور ہاتھ شرمگاہ کی نجاست سے ملوث ہو جائے اس لیے دھونے کا حکم دیا گیا ہے مگر چونکہ یہ بات یقینی نہیں ہے بلکہ محض امکانی ہے۔ اس لیے دھونے کا حکم بھی استحبابی قرار دیا جائیگا- یعنی سو کر اٹھنے پر برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھ کو دھو لینا مستحب ہے۔ چنانچہ عام اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔ حدیث میں اگرچہ رات کے سونے کا ذکر ہے۔ مگر ہاتھ دھونے کی جو علت بیان فرمائی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب اور جس وقت بھی یہ شک ہو کہ ہاتھ نجس ہو گیا ہے اس کا دھو لینا مستحب ہے۔ خواہ رات کو سو کر اٹھنے پر شک ہو یا دن میں ہو یا بیداری میں شک ہو جائے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کہ محض شک کی صورت میں اگر بغیر دھوئے ہاتھ برتن میں ڈال دے تو پانی ناپاک نہ ہوگا لیکن بلا دھلا ہاتھ برتن میں ڈالنے سے پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور وضوء کے قابل نہیں رہتا۔

۴- روایت مسلم میں آیا ہے کہ فی الاناء تو یا تو اس سے چھوٹا برتن مراد ہے جیسے گلاس اور لوٹا تو ایسی صورت میں ہاتھ نہ ڈالے بلکہ پانی انڈیل کر ہاتھ دھوئے۔ لیکن اگر پانی بڑے برتن میں ہے اور چھوٹا برتن بھی موجود ہے تو پھر بھی ہاتھ نہ ڈالے

بلکہ چھوٹے برتن سے نکال کر ہاتھ دھوئے۔ لیکن اگر پانی بڑے برتن میں ہے اور کوئی چھوٹا برتن بھی نہیں کہ اس میں پانی [illegible] کر ہاتھ دھوئے تو اسے چاہیے کہ بائیں ہاتھ کی انگلیاں ملا کر صرف وہ انگلیاں پانی میں ڈالے کہ ہتھیلی کا کوئی حصہ [illegible] میں نہ پڑے اور انگلیوں سے پانی نکال کر داہنا ہاتھ گٹے تک دھوئے (تین بار ایسا ہی کرے۔ پھر داہنے ہاتھ [illegible] تک دھویا ہے بلا تکلف پانی میں ڈال سکتا ہے اور اس سے پانی نکال کر بایاں ہاتھ دھوئے اور اگر چھوٹے [illegible] پانی ہے یا پانی بڑے برتن میں ہے مگر وہاں چھوٹا برتن بھی موجود ہے اور اس صورت میں اس نے بے دھویا ہاتھ [illegible] میں ڈال دیا بلکہ صرف انگلی کا پورا یا ناخن ڈال دیا تو وہ سارا پانی ماءِ مستعمل ہو گیا یعنی یہ پانی وضوء کے قابل نہ رہا [illegible] مسئلہ سے لوگ بہت بے پرواہی برتتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیے۔

واضح ہو یہ تمام احکام اس صورت میں ہیں جب کہ ہاتھ میں کوئی نجاست نہ لگی ہو۔ اگر ہاتھ پر نجاست لگی ہو [illegible] چاہے برتن چھوٹا ہو یا بڑا کسی طرح بھی ہاتھ ڈالے گا پانی نجس و ناپاک ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ کہ برتن بڑا ہو تو بائیں [illegible] انگلیوں کو ملا کر پانی نکال لے اور سیدھے ہاتھ کو دھوئے، یہ بھی اسی صورت میں ہے جب کہ ہاتھ پر نجاست نہ لگی [illegible] صرف وضوء کرنے کی غرض سے پانی میں ہاتھ ڈالنا مقصود ہو۔ فافہم۔

یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

۱۔ ماءِ قلیل میں اگرچہ قلتین ہی ہو اور نجاست کا اثر بھی پانی میں نمودار نہ ہو تو پانی پھر بھی ناپاک ہو جائے [illegible]

۲۔ نجس کپڑے یا کسی بھی نجس چیز کو تین مرتبہ دھونا مستحب ہے کیونکہ جب شک کی صورت میں ہاتھ کو تین مرتبہ [illegible] کی ہدایت دی گئی ہے تو جس چیز کا ناپاک ہونا یقینی ہے اس کا تین مرتبہ دھونا بطریق اولیٰ مستحب ہونا چاہیے [illegible] پاخانہ پھرنے کے بعد مٹی یا پتھر وغیرہ سے استنجا کیا گیا پانی سے دھویا نہیں تو وہ جگہ نجس ہی رہے گی، تو اگر موضع [illegible] پہنچی اور وہ تری کپڑے یا شلوار وغیرہ کو لگ گئی تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ ہاں ڈھیلے سے استنجا کرنے کے بعد نماز پڑھی جا سکتی ہے یعنی نماز کے حق میں اتنی نجاست معاف ہے۔

بَابُ غَسلِ الرِّجلَینِ

باب وضوء میں پاؤں دھونا (ضروری ہے)

وَلَا یَمسَحُ عَلَی القَدَمَینِ | مسح نہ کرے

۱۔ اس عنوان کے قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ وضوء میں پاؤں دھونا فرض ہے اور پاؤں پر مسح کرنے سے وضوء نہ ہوگا۔

۱۶۲۔ اس عنوان کے ماتحت امام نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو باب من رفع صوتہ بالعلم میں مع تفسیر گزر چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔ اس حدیث کا مضمون یہ تھا کہ بعض لوگ وضوء کر رہے تھے اور پاؤں پر مسح کر رہے تھے یا پاؤں اچھی طرح نہیں دھو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دوزخ کی آگ [illegible] ایڑیوں کی خرابی ہوگی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ وضوء میں پاؤں کا دھونا ضروری ہے۔

بَابُ الْمَضْمَضَةِ فِي الْوُضُوءِ

باب وضوء میں کلی کرنے کے بیان میں

۱۶۳- أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ دَعَا بِوَضُوءٍ ف فَرَغَ عَلَى يَدَيْهِ مِنْ إِنَائِهِ فَغَسَلَهُمَا لٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِينَهُ فِي الْوَضُوءِ ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلٰثًا يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلٰثًا ثُمَّ مَسَحَ رَاسِهِ ثُمَّ غَسَلَ كُلَّ رِجْلٍ ثَلٰثًا ثُمَّ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا وَقَالَ مَنْ ضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا ثُمَّ صَلَّى كْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ فَرَ اللهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ

عمران جو حضرت عثمان کے غلام تھے انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان نے وضوء کے لیے پانی منگایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پر برتن میں سے پانی ڈالا۔ پس ہاتھوں کو تین بار دھویا۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈالا اس کے بعد پانی لے کر) کلی کی، ناک میں پانی چڑھایا اور ناک سُنکی پھر تین بار منہ دھویا اور تین بار کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئے اور سر کا مسح کیا پھر دونوں پاؤں کو تین بار دھویا۔ پھر کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے میں نے وضو کیا اور حضور نے فرمایا تھا۔ جو کوئی میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے پھر دو رکعت (تحیۃ المسجد خلوصِ قلب کے ساتھ پڑھے۔ اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

ائد و مسائل

یہ حدیث مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے۔ وضوء میں ترتیب، اعضاءِ وضوء کو تین بار دھونا، کلی کرنا اور ناک میں پانی لینا سنت ہے۔ ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ وضوء کرنے والا پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو گٹے دھوئے پھر منہ دھوئے پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے۔ پھر سر کا مسح کرے۔ اس کے بعد دونوں پاؤں سمیت دھوئے۔ پھر تحیۃ المسجد پڑھے یہ دو رکعت نفل ہیں جو وضوء کرنے کے بعد مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ حدیث بحث میں یہ بتایا گیا اس نفل کے پڑھنے سے آدمی کے اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

یۃ المسجد کے مسائل

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔ علماء نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ چار رکعت پڑھے خص ایسے وقت میں مسجد آیا۔ جس میں نفل پڑھنا مکروہ ہے مثلاً بعد طلوعِ فجر یا بعد نمازِ عصر تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے بلکہ یح وتہلیل، درود شریف میں مشغول ہو جائے حقِ مسجد ادا ہو جائے گا۔

بَابُ غَسْلِ الْأَعْقَابِ

باب ایڑیوں کے دھونے کے بیان میں

انَ ابْنُ سِيرِينَ يَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ

اور حضرت ابن سیرین جب وضو کرتے تو انگوٹھی

اِذَا تَوَضَّاَ (بخاری)

کی جگہ بھی دھوتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ و امام شافعی کا قول ہے کہ اگر انگوٹھی تنگ ہو تو اس کو ہلانا وضو میں سنت ہے، جیسے وقت انگلیوں کا خلال کرنا سنت ہے اور اگر انگوٹھی ڈھیلی ہے تو ہلانے کی ضرورت نہیں۔ خوب یاد رکھئے کہ انگوٹھی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی تنگ ہو کہ بغیر ہلائے بھی اس کے نیچے پانی بہہ جائے تو اب ایسی تنگ انگوٹھی میں ہلانا سنت ہے۔ لیکن بغیر ہلائے پانی پہنچتا ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں ہلانا فرض ہے تاکہ پانی جلد پر

وضو میں یہ ضروری ہے کہ اعضاء وضو اس طرح دھوئے جائیں کہ ایک بال برابر بھی خشکی نہ رہے۔ لہٰذا اگر یا عورتوں کے پاؤں میں چھلے وغیرہ ایسے تنگ ہیں کہ ہلانے سے ان کے نیچے پانی بہہ جائیگا تو ہلانا فرض ہے اور سے بھی پانی نہ بہے تو اُن کو اتار کر پانی بہانا فرض ہے۔ بعض لوگ کسی بیماری کی وجہ سے انگوٹھوں میں بہت کس باندھ لیتے ہیں کہ پانی کا بہانا درکنار تاگے کے نیچے بھی پانی نہیں بہتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تاگے کو علیحدہ کر کے اس جگہ

۱۶۴- قَالَ سَمِعْتُ اَبَا هُرَيْرَةَ وَكَانَ يَمُرُّ بِنَا وَالنَّاسُ يَتَوَضَّؤُنَ مِنَ الْمِطْهَرَةِ فَقَالَ اَسْبِغُوا الْوُضُوْءَ فَاِنَّ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ

محمد بن زیاد کہتے ہیں میں نے ابوہریرہ سے کہ وہ ہمارے پاس سے گزرے اور لوگ برتن وضو کر رہے تھے۔ تو وہ کہتے کہ لوگو! وضو کیونکہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کے لیے خرابی ہو۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام مسلم و نسائی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے یہ ہے کہ وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت اس طرح دھونا فرض ہے کہ ذرا بھی خشک نہ رہے مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس نے وضو کیا، مگر ایڑیوں پر پانی نہیں پر آپ نے فرمایا۔ ویل للاعقاب۔ ابوداؤد و دارقطنی و احمد کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص بحضور نبوی کرکے آئے مگر پاؤں ان کا ناخن کے برابر دھلنے سے رہ گیا۔ حضور نے فرمایا۔ اِرْجِعْ فَاَحْسِنْ وُضُوْءَكَ جاؤ طرح دوبارہ وضو کر کے آؤ۔ (نیل الاوطار جلد ا صـــ ۱۱)

پاؤں پر مسح کرنے سے وضو درست نہ ہوگا؟

واضح ہو جمہور صحابہ کرام و ائمہ دین سب کا اس پر اجماع وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ حافظ ابن حجر نے میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کا اس باب میں کوئی اختلاف نہیں البتہ حضرت علی و انس و ابن عباس کے متعلق یہ ہے کہ انھوں نے پاؤں پر مسح کیا۔ لیکن ان حضرات کا اس سے رجوع بھی ثابت ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے کے معاملہ میں پاؤں پر مسح کرنے کے متعلق جس قدر بھی آثار ملتے ہیں وہ سب کے سب منسوخ ہیں کیونکہ حضور کی قول اور صحابہ کرام کے عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاؤں کا دھونا فرض ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں کے سوکھے رہ جانے پر جہنم کی وعید سنائی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے

متعلق جو روایت منقول ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر صحن مسجد میں تشریف لائے پانی لایا گیا

فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ وَبِرَأْسِهِ وَرِجْلَيْهِ | تو آپ نے منہ ہاتھوں سر اور پاؤں کا مسح کیا

اس کے بعد فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔ وَهٰذَا وُضُوْءُ مَنْ لَمْ يُحْدِثْ اور یہ وضوء اس کا ہے جو باوضوء ہو (طحاوی)

ظاہر ہے کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وضوء میں پاؤں کا مسح کرنا کافی ہے، کیونکہ اس میں منہ اور ہاتھ کے مسح کرنے کا بھی ذکر ہے حالانکہ منہ اور ہاتھ کے مسح کا قول کسی نے نہیں کیا نیز حضرت علی کا یہ فرمانا کہ "یہ وضوء اس کا ہے جو باوضوء ہو"۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ وضوء جو حضرت علی نے کیا نماز کا وضوء نہ تھا بلکہ گرد وغبار دور کرنے یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے آپ نے اپنے منہ ہاتھ پاؤں اور سر پہ پانی مل لیا تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ وضوء نماز کا وضوء تھا، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مسح رجلیہ میں مسح کا لفظ (غسل) دھونے کے معنی میں ہے کیونکہ اس روایت میں مسح بوجہہ میں مسح کا لفظ غَسَلَ دھونے کے معنی میں آیا ہے۔ ایسے ہی مسح رجلیہ میں بھی مسح کا لفظ (غسل) دھونے کے معنی میں لینا ضروری ہے فافہم۔

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ فِي النَّعْلَيْنِ

باب چپل پہنے ہو تو پاؤں کو دھوئے

وَلَا يَمْسَحُ عَلَى النَّعْلَيْنِ | چپلوں پر مسح نہ کرے

فوائد و مسائل

اس عنوان سے امام کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی چپل پہنے تو اس کو وضوء کرتے وقت پاؤں کو دھونا چاہیے۔ موزوں کی طرح چپلوں پر مسح کرنے سے وضوء نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ وضوء میں پاؤں کا دھونا فرض ہے لیکن شریعت نے آسانی کے لیے موزوں پر مسح کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص موزہ پہنے ہو وہ اگر وضوء میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح کرے تو وضوء درست ہو جائے گا۔ مسح کے جواز میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں جو قریب قریب تواتر کے ہیں۔ اسی لیے امام کرخی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ جو مسح کو جائز نہ جانے اس کے کافر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ امام شیخ الاسلام نے فرمایا جو مسح کو جائز نہ جانے گمراہ ہے۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اہلسنت کی علامت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ تَفْضِيلُ الشَّيْخَيْنِ وَحُبُّ الْخَتَنَيْنِ وَمَسْحُ الْخُفَّيْنِ۔ سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تمام صحابہ سے افضل جاننا، سیدنا عثمان غنی و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت رکھنا اور موزوں پر مسح کرنا۔ امام نے ان تین باتوں کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ آپ کوفہ میں تشریف فرما تھے اور رافضیوں کی وہاں کثرت تھی، تو وہی علامات ارشاد فرمائیں جو ان کا رد ہیں۔ اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ صرف ان تین باتوں کا پایا جانا سنی ہونے کے لیے کافی ہے کیونکہ علامت شی میں پائی جاتی ہے۔ شی لازم علامت نہیں ہوتی۔ فافہم۔

موزوں پہ مسح کرنا جائز ہے

حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ تقریباً ستر افراد نے قولاً وعملاً موزوں پر مسح کرنے کی حدیث کو روایت کیا ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح کے جواز میں

مجھے کچھ تردد نہیں کیونکہ اس کے جواز پر مجھے چالیس صحابہ کرام سے حدیثیں پہنچی ہیں۔ ابن المنذر ابن المبارک سے کرتے ہیں موزوں پر مسح کے جائز ہونے میں صحابہ کرام میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی وفعلی اس باب میں کثرت سے آئی ہیں۔ چند احادیث کے تراجم بیان لکھے جاتے ہیں۔ ۱۔ حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ حضور پر مسح فرمایا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ پاؤں دھونا بھول گئے؟ حضور نے جواب دیا نہیں تو بھولا ہے مجھے نے موزوں پر مسح کا حکم دیا ہے (احمد و ابوداؤد) ۲۔ سیدنا صدیق اکبر سے روایت ہے کہ حضور نے مسافر کو تین دن تین مقیم کو ایک دن ایک رات موزوں پر مسح کرنے کی اجازت دی جب کہ موزے طہارت کے ساتھ پہنے ہوں (دار قطنی بن عسال کہتے ہیں۔ جب ہم مسافر ہوتے تو حضور ہمیں حکم فرماتے کہ ہم تین دن تین رات موزے نہ اُتاریں مگر بوجہ جنابت لیکن پاخانہ و پیشاب اور سونے کے بعد نہیں (ترمذی اور نسائی) ۴۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں۔ میں نے حضور کو موزوں پشت پر مسح کرتے دیکھا (ابوداؤد و ترمذی) غرضیکہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کیا جائے تو جائز بلا کراہت ہے بشرطیکہ موزہ پر مسح کرنے کی جو شرائط ہیں اس کا خیال رکھا جائے۔

موزوں پر مسح کرنے کے متعلق ضروری مسائل

موزوں پر مسح کرنے کے لیے چند شرائط ہیں۔ ۱۔ موزے کے ہوں یا کسی ایسی دبیز چیز کے بنے ہوتے ہوں کہ پانی نہ چھنے جیسے کرچ و پلاسٹک وغیرہ ۲۔ یہ موزے ایسے ہوں کہ ٹخنے چھپ جائیں۔ اس سے زیادہ ہونے کی ضرورت اگر انگل کم ہو کر ٹخنے کا کچھ حصہ کھلا رہے تو بھی مسح درست ہے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ ایڑھی کھلی نہ رہے۔ ۳۔ موزہ چست ہو کہ اس کو پہن کر آسانی سے بخوبی چل پھر سکیں ۴۔ وضو کر کے موزہ پہنا ہو یعنی پہننے کے بعد اور حدث پہلے ایک ایسا وقت ہو کہ اس وقت میں وہ شخص باوضو ہو خواہ پورا وضو کر کے پہنے یا صرف پاؤں دھو کر موزہ پہن وضو پورا کرے۔ مسح میں دو فرض ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر موزہ کا مسح ہاتھ کی چھوٹی تین انگلیوں کے برابر ہو (۱) دوم مسح پر کیا جائے تو اگر موزہ کے تلے یا کروٹ یا ٹخنے یا پنڈلی یا ایڑی پر مسح کیا تو مسح درست نہ ہوگا ۲۔ موزہ پر مسح کی مدت مقیم دن ایک رات ہے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین رات ہے۔ مسح کی مدت پہلی بار جو حدث ہوگا اس وقت مثلاً موزہ پہننے کے بعد پہلی مرتبہ حدث ہوا (یعنی وضو جاتا رہا) اس وقت سے مدت کا شمار ہوگا۔ فرض کیجیے صبح کے پہنا اور ظہر کے وقت پہلی بار حدث ہوا تو مقیم دوسرے دن کی ظہر تک مسح کرے گا اور مسافر چوتھے دن کی ظہر تک مسح کرے غسل فرض ہو وہ موزوں پر مسح نہیں کر سکتا ۴۔ جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے ان سے مسح بھی جاتا رہتا ہے ۵۔ مدت جانے سے مسح جاتا رہتا ہے۔ اس صورت میں صرف پاؤں دھو لینا کافی ہے پھر سے پورا وضو کرنے کی حاجت نہیں کہ پورا وضو کرے ۶۔ موزہ اُتار دینے سے مسح ٹوٹ جاتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی اُتارا ہو۔ یونہی اگر ایک پاؤں آدھے سے باہر ہو جائے مسح جاتا رہا ۷۔ خوب یاد رکھیے کہ سوتی یا اونی موزوں پر مسح جائز نہیں ہے۔ ان کو اُتار کر پاؤں دھو

۸۔ مندرجہ ذیل قسم کے موزوں پر مسح کر سکتے ہیں۔

اوّل ـ پورا موزہ ہی چمڑہ کا ہو۔ جو ٹخنوں کو ڈھانپ لے یا صرف تلہ چمڑے کا ہو اور باقی حصہ کسی اور دبیز

س پر بھی مسح جائز ہے۔

منعل ۔ پر بھی مسح جائز ہے یعنی سوتی یا اونی جراب کا تلہ چمڑہ کا بنا لیا جائے اور اس کو ساتھ ملا کر سی دیا جائے ث میں جو جرابوں پر مسح کا ذکر ہے اس سے ایسا ہی موزہ مراد ہے۔

مجلد ۔ پر بھی مسح جائز ہے یعنی اونی یا سوتی جراب پر چمڑہ کا پاتابہ چڑھا لیا جائے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ یہ پاتابہ جرابوں ساتھ سی لیا جائے۔ اگر سیا نہیں گیا تو مسح جائز نہ ہوگا۔

ضاحت

موزہ چمڑہ کا ہو یا کسی ایسی چیز کا بنا ہوا ہونا چاہیے، جس میں سے پانی نہ چھنے جیسے پلاسٹک، کرمچ وغیرہ، انگریزی بوٹ جو ٹخنے کو ڈھانپ لے اس پر بھی مسح جائز ہے یعنی اگر کسی نے بوٹ پہنے ہوں اور وضوء ت وقت ان پر مسح کر لیا وضوء درست ہو گیا لیکن نماز کے لیے یہ ضروری ہے کہ موزہ یا بوٹ ایسے نرم چمڑے کا بنا ہوا ہو کہ نے میں پاؤں کی انگلیاں مڑ سکیں اور انگلیوں کے پیٹ زمین سے چپٹ سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سجدہ میں پاؤں کی گی کے پیٹ کا زمین سے چپٹ جانا فرض ہے۔ اگر دونوں پاؤں سجدہ میں اٹھے رہے بلکہ صرف انگلی کی نوک زمین سے ب بھی نماز نہیں ہوتی۔ اس مسئلے سے بہت لوگ غافل ہیں۔ یہ چند ضروری مسائل یہاں لکھے گئے ہیں۔ مفصل احکام ل کے لیے بہار شریعت حصہ دوم کا مطالعہ کیجیے۔

ں پر مسح کی بحث

امام بخاری نے مذکورہ بالا عنوان قائم کر کے یہ بتایا ہے کہ چپلوں پر مسح کرنے سے وضوء نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ چمڑے کے موزوں پر ئز ہے لیکن چپلوں پر مسح جائز نہیں ہے لیکن صحابہ میں سے بعض افراد کے متعلق ایسی حدیثیں مل جاتی ہیں کہ انھوں نے ں پر مسح کیا۔ مثلاً اوس بن اوس کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ انھوں نے چپلوں پر مسح کیا۔ میں نے کہا یہ آپ کیا یں تو انھوں نے کہا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو بھی (نعلین) پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے یا ابوظبیان کہتے ہیں کہ میں نے ت علی کو دیکھا کہ انھوں نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا پھر وضوء کے لیے پانی منگایا۔ و مسح علی النعلین اور چپلوں پر مسح کیا اور مسجد میں جا کر تار کر نماز پڑھی (طحاوی باب المسح علی الخفین)۔ اس نوع کے آثار سے بعض لوگوں کے یہ استدلال درست نہیں کیونکہ لہ کی احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن نعلین پر حضور نے مسح فرمایا۔ ان کے نیچے چمڑے کے موزے بھی ہوں۔ پ کا ارادہ بھی موزوں پر ہی مسح کا ہو۔ کیونکہ اگر آپ چپل نہ پہنے ہوتے تو بھی موزوں پر ہی مسح فرماتے تو آپ کا ارادہ تو پر ہی مسح کا تھا۔ مگر آپ نے موزہ اور نعلین دونوں پر مسح فرمایا تو طہارت حاصل ہو گئی اور نعلین پر مسح فرمانا امر زائد ہوا چنانچہ وضاحت کہ حضور نے جن چپلوں پر مسح فرمایا ان کے نیچے موزے بھی پہنے ہوئے تھے حدیث ابوموسیٰ سے ہوتی ہے جس ظ یہ ہیں۔ مسح علی جوربیہ و نعلیہ۔ حضور نے جورب اور نعلین پر مسح فرمایا تو حدیث ابوموسیٰ سے نعلین نے کی کیفیت معلوم ہو گئی کہ حضور نے نعلین کے ساتھ ساتھ جورب پر بھی مسح فرمایا تو مقصود دراصل (جورب) موزوں نا تھا نہ کہ چپلوں اور جوتیوں پر۔ لہٰذا چپل پر مسح کرنے سے وضوء کی صحت ثابت نہ ہوئی۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جو حدیث ابن عمر سے نکلتا ہے کہ حضرت ابن عمر جب وضوء کرتے اور جوتے آپ کے پاؤں

میں ہوتے تو آپ ظاہر قدمین پر مسح کر لیتے اور یہ فرماتے کہ حضور اکرم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حدیث ابن عمر کے نعلین پر مسح کرنے کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کبھی حضور نعلین پر مسح کرتے ہوئے ظاہر قدمین پر بھی مسح فرمایا یعنی ظاہر قدمین پر مسح فرمانا تو علی سبیل الفرضیت تھا اور نعلین پر مسح کرنا، امر زائد تھا۔ (پھر یہ پاؤں پر مسح کرنے کا منسوخ ہو گیا)۔ غرضیکہ جن احادیث و آثار میں نعلین پر مسح کرنے کا بیان ہے۔ ان میں یہ دونوں احتمال پائے جاتے ہیں

اوّل یہ کہ نعلین پر مسح کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ آپ موزے بھی پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے نعلین اور موزہ پر مسح فرمایا جیسا کہ حدیث مغیرہ و حدیث ابوموسیٰ سے ثابت ہوتا ہے۔ جس کے لفظ یہ ہیں مَسَحَ عَلَى الجَوْرَبَ وَ النَّعْلَيْنِ اور جرابوں پر مسح کو امام اعظم علیہ الرحمۃ بھی جائز سمجھتے ہیں جب کہ وہ مجلد یا منعل ہوں یا ایسی دبیز چیز کی کہ ان میں پانی نہ چھنے۔ **دوم** یہ کہ حدیث ابن عمر سے یہ احتمال نکلتا ہے کہ حضور کبھی نعلین پر مسح کرتے ہوئے ظا پر بھی مسح فرمایا کرتے تھے تو گویا پاؤں پر مسح بطور فرض وضو کے تھا اور نعلین پر مسح ضمنی طور پر امر زائد تھا۔ پھر پاؤں مسح کرنا منسوخ ہو گیا۔ غرضیکہ وہ احادیث و آثار جن میں نعلین (چپل) پر مسح کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا دونوں معنوں سے کسی بھی معنیٰ پر محمول کر لیجیے۔ اس سے چپلوں پر مسح کرنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ عقل بھی چاہتی پر مسح کیا جائز نہ ہو کیونکہ یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر چمڑہ کا موزہ اتنا پھٹ جائے کہ پاؤں کا اکثر حصہ[1] ظاہر ہو جائے ایسے موزوں پر مسح جائز نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے چپل میں پاؤں کا اکثر حصہ ظاہر رہتا ہے لہٰذا چپل پر مسح جائز نہیں ہو

نیز اسی سلسلہ میں اہل علم کے لیے مندرجہ ذیل امور بھی قابل غور و فکر ہیں۔ اوّل حدیث مَسَحَ عَلَى الجَوْرَبَيْ محدثین نے اس میں کلام کیا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا یہ حدیث منکر ہے۔ سفیان ثوری عبدالرحمٰن بن مہدی احمد حنبل، یحییٰ بن معین اور علی المدینی و مسلم بن حجاج نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابوداؤد نے فرمایا کہ ابن مہدی اس حدیث کو روایت نہیں کرتے کیونکہ حضرت مغیرہ سے جو معروف و مشہور حدیث مروی ہے اس کا مضمون تو یہ ہے نے موزوں پر مسح کیا۔ اسی طرح یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے مگر یہ روایت بھی متصل نہیں ہے۔ حدیث کو ابن ماجہ نے بھی حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے لیکن ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس کی سند بھی متصل نہیں کیونکہ ابوموسیٰ سے ضحاک ابن عبدالرحمٰن نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے فرمایا کہ ضحاک کا سماع ابوموسیٰ سے ثابت ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن معین و امام بیہقی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے قوی نہیں ہے کیونکہ اس کی اسناد میں سنان بھی ہیں جو ضعیف ہیں لائق حجت نہیں ہیں (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۷۹)

دوم۔ اسی طرح وہ حدیث جس میں یہ آیا ہے کہ حضور نے نعلین پر مسح کیا۔ یہ سب حدیثیں فعلی ہیں۔ مثلاً اوس کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو نعلین پر مسح کرتے دیکھا تو ان سے میں نے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں تو انھوں نے دیا کہ میں نے حضور کو نعلین پر مسح کرتے دیکھا ہے (طحاوی، ابوداؤد) لیکن کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس میں یہ ہو کہ نے فرمایا کہ نعلین پر مسح کر دیا تمہیں نعلین پر مسح کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اسی طرح اس باب کی تمام حد

---

[1] بلکہ پیر کی تین انگلیوں کی مقدار اگر موزے سے کھل جاتی ہو تو مسح جائز نہیں۔ کذا فی عامۃ الکتب الفقہ

خبر احاد ہیں۔ لیکن اس کے برعکس چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کے جواز کی حدیثیں قولی بھی ہیں اور فعلی بھی بلکہ یث مغیرہ بن شعبہ تو حدیث مشہور ہے۔

سوم - حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق نعلین پر مسح کرنے کی جو حدیث ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ آپ نے نعلین پر مسح کیا۔ پھر مسجد میں گئے اور نعلین اُتار کر نماز پڑھی۔ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَخَلَعَ نَعْلَيْهِ ثُمَّ صَلّٰى (طحاوی) غور طلب بات یہ ہے کہ اگر حضرت علی نے نعلین پر مسح فرمایا تھا تو پھر نماز پڑھتے وقت اس کو اُتارا کیوں؟ اور اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ موزہ پر مسح کے بعد اگر اس کو اُتار دیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

ان امور کے پیشِ نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نعلین پر مسح کے متعلق جس قدر آثار ملتے ہیں۔ اول تو ان کی پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو حدیثِ مشہورہ کے مقابل لایا جائے، دوسرے یہ کہ "نعلین اُتار کر نماز پڑھی" کے جملہ سے اس توجیہ کو تقویت پہنچتی ہے کہ ضرور نعلین کے اندر چمڑہ کا موزہ پہنا ہوا تھا اور اس زمانہ کی چپل بھی ایسی ہوتی تھی کہ اس میں پاؤں کا اوپر کا حصہ بالکل ظاہر رہتا تھا۔ پس مسح علی نعلیہ کا مفہوم یہ ہوا کہ چپل پہنے پہنے موزہ پر مسح کر لیتے تھے کیونکہ چپل پہننے کی صورت میں بھی مسح کرنے کی جگہ ظاہر رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بوقت نماز چپل اُتار دیتے تھے ورنہ اگر چپل پر مسح کیا ہوتا تو اس کو اُتارتے نہیں کیونکہ اُتارنے سے مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

۱۶۵- عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ جُرَيْجٍ اِنَّهٗ
الَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ
اَيْتُكَ تَصْنَعُ اَرْبَعًا لَمْ اَرَ اَحَدًا مِّنْ
صْحَابِكَ يَصْنَعُهَا قَالَ وَمَا هِيَ يَا ابْنَ جُرَيْجٍ
الَ رَاَيْتُكَ لَا تَمَسُّ مِنَ الْاَرْكَانِ اِلَّا
يَمَانِيَيْنِ وَرَاَيْتُكَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِيَّةَ
اَيْتُكَ تَصْبُغُ بِالصُّفْرَةِ وَرَاَيْتُكَ اِذَا
تَ بِمَكَّةَ اَهَلَّ النَّاسُ اِذَا رَاَوُا الْهِلَالَ
لَمْ تُهِلَّ اَنْتَ حَتّٰى كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ
الَ عَبْدُ اللهِ اَمَّا الْاَرْكَانُ فَاِنِّيْ لَمْ اَرَ رَسُوْلَ اللهِ
لَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمَسُّ اِلَّا الْيَمَانِيَيْنِ
مَّا النِّعَالُ السِّبْتِيَّةُ فَاِنِّيْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ
هِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ
تِيْ لَيْسَ فِيْهَا شَعَرٌ وَيَتَوَضَّأُ فِيْهَا فَاَنَا
حِبُّ اَنْ اَلْبَسَهَا وَاَمَّا الصُّفْرَةُ فَاِنِّيْ

حضرت عبید اللہ بن جریج نے حضرت عبداللہ بن عمر سے کہا آپ چار کام ایسے کرتے جس کو میں نے تمہارے ساتھیوں کو کرتے نہیں دیکھا۔ عبداللہ بن عمر نے جواب دیا ابن جریج وہ چار باتیں کونسی ہیں۔ جریج نے جواب دیا وہ ہیں ۱۔ تم طواف میں سوائے رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے کسی اور کونے کو ہاتھ نہیں لگاتے ۲۔ تم زری کے جوتے پہنتے ہو اور زرد خضاب کرتے ہو ۳۔ تم حج کے دنوں میں مکہ میں ہوتے ہو تو لوگ (ذوالحجہ کا چاند) دیکھتے ہی احرام باندھ لیتے ہیں اور تم آٹھویں تاریخ تک نہیں باندھتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے جواب دیا۔ کعبہ کے کونوں کے متعلق جو تم کہتے ہو تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ نے حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے سوا کعبہ کے کسی کونے کو طواف میں ہاتھ لگایا ہو۔ زری کی جوتیوں کے متعلق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی میں نے پہنتے دیکھا ہے

فَاِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ يَصْبُغُ بِهَا فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَصْبُغَ بِهَا وَاَمَّا الْاِهْلَالُ فَاِنِّيْ لَمْ اَرَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُهِلُّ حَتّٰى تَنْبَعِثَ بِهٖ رَاحِلَتُهٗ

(بخاری)

اور آپ ان کو پہنے پہنے وضو فرماتے تو میں بھی ان کا پہننا پسند کرتا ہوں۔ رہا زرد خضاب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زرد خضاب فرماتے تھے تو میں بھی زرد رنگ پسند کرتا ہوں۔ احرام کا حال یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ کو اس وقت تک احرام باندھتے دیکھا جب تک آپ کی اونٹنی آپ کو لے کر نہ اٹھتی (یعنی یہ آٹھویں تاریخ ہوتی تھی۔ اسی دن حاجی منیٰ کو روانہ ہوتے تھے)

فوائد و مسائل

۱۔ اس حدیث کو امام نے کتاب اللباس میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد نے حج میں ترمذی نے شمائل میں۔ نسائی نے طہارۃ میں۔ ابن ماجہ نے لباس میں اور نسائی و مسلم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ۲۔ امام بخاری نے عنوان قائم کیا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے اور چپلوں پر مسح کرنے سے وضو نہ ہوگا۔ حدیث زیر بحث میں عنوان سے متعلق صرف "یتوضا فیہا" ہے کہ حضور علیہ السلام نے چپل پہنے پہنے وضو فرمایا یعنی کو دھویا چپلوں پر مسح نہیں کیا۔ کیونکہ اگر آپ نے چپلوں پر مسح کیا ہوتا تو حضرت عبداللہ بن عمر یتوضا کی جگہ یمسح کا بولتے جس سے واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص چپل پہنے تو وضو میں اس کو پاؤں کا دھونا ضروری ہے مسح کرنے سے وضو درست ہوگا ۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر کعبہ کا طواف کرتے وقت صرف رکن یمانی و سنگِ اسود کو بوسہ دیتے تھے (الا الیمانیین کا یہی مطلب ہے) ان سے پوچھا گیا۔ آپ باقی دو رکنوں کو کیوں نہیں بوسہ دیتے، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضور کو بھی صرف رکن یمانی و حجر اسود کو ہی بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ اس لیے میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔ اس مسئلہ کو سمجھنے نقشہ ذیل کو دیکھیے۔

طوافِ کعبہ میں حجرِ اسود کو چومنا

واضح ہو کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ کعبہ کے وقت حجرِ اسود کو بوسہ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ قیامت کے دن یہ پتھر اٹھایا جائیگا۔ جس شخص نے اس کو دیکھا اور اس کو چوما، اس کے لیے گواہی دے گا۔ حجرِ اسود پر دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر بوسہ دینا چاہیے کہ آواز پیدا نہ ہو۔ حجرِ اسود کے چومنے میں کسی کو ایذا نہ دے۔ بھیڑ کی وجہ سے نہ چوم سکے تو ہاتھ کو چھو کر اسے چوم لیا جائے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو لکڑی سے چھو کر اسے چوم لو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ہاتھوں کو اس کی طرف اٹھا کر اور ان کا اندرونی رخ حجرِ اسود کی طرف کر کے ہاتھوں کو چوم لیا جائے۔ اسی طرح رکنِ یمانی کو دونوں ہاتھ داہنے ہاتھ سے تبرکاً چھوا جائے اور اگر چاہے تو اس کو بھی بوسہ دے لیکن یہاں لکڑی سے چھونا یا اشارہ کر کے ہاتھ چومنا نہیں ہے اور رکن شامی یا رکنِ عراقی کو چھونے یا بوسہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۴۔ زرد خضاب کرنا سنت ہے۔ اور کالے خضاب میں علماء کا اختلاف ہے۔ علماءِ امیر اس کے مجوز ہیں لیکن

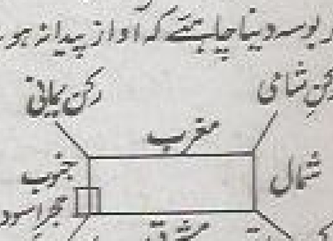

علماء بریلی اس کو حرام و ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اعلیٰحضرت بریلوی قدس سرہ العزیز نے کالے خضاب کے ناجائز ہونے پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام حک العیب ہے۔

۴۔ یوم الترویہ یعنی ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو جو احرام میں نہیں ہوتا غسل کر کے احرام باندھتا ہے۔ طوافِ کعبہ اور دو رکعت سنت احرام پڑھ کر حج کی نیت کی جاتی ہے اور لبیک کہتے ہیں اور بعد طلوعِ آفتاب منیٰ کو روانہ ہو جاتے ہیں اور حدیث ہذا میں اسی کا بیان ہے۔

بَابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوْءِ وَالْغُسْلِ

باب وضو و غسل کے وقت ابتداء سیدھی طرف کرنا

۱۶۶- ۱- قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُنَّ فِيْ غُسْلِ ابْنَتِهٖ ابْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا

ام عطیہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی (حضرت زینب) کو غسل دینے لگے تو آپ نے غسل دینے والی عورتوں سے فرمایا داہنی طرف سے اور وضو کے مقاموں سے ان کا غسل شروع کریں۔

۱۶۷- ۲- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِيْ تَنَعُّلِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَطُهُوْرِهٖ فِيْ شَأْنِهٖ كُلِّهٖ

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند تھا، جوتا پہننے اور کنگھی کرنے اور طہارۃ کرنے میں بھی۔

فوائد و مسائل حدیث ۱ کو امام نے کتاب الجنائز میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، نسائی، ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ میت کو نہلاتے وقت وضو کرانا مستحب ہے مگر کلی اور ناک میں پانی نہیں ڈالا جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ وضو سنتِ غسل سے ہے، تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وضو و غسل داہنی طرف سے شروع کیا جائے۔ بمیامنہا یہ ترجمہ باب ہے کیونکہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب غسل میں داہنی طرف سے شروع کرنے کا حکم ہوا ہے تو وضو میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

حدیث ۲ کو امام نے کتاب الصلوٰۃ اور اطعمہ اور کتاب اللباس میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی و ابن ماجہ اور مسلم نے طہارۃ میں۔ ابوداؤد نے لباس میں، ترمذی نے آخر صلوٰۃ میں اور شمائل میں ذکر کیا ہے۔

التیمن کے معنی ہر کام میں داہنی طرف سے شروع کرنے کے ہیں۔ حضور علیہ السلام جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو فرمانے حتی کہ تمام کاموں میں داہنی طرف سے ابتداء کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ "فِی شَانِ کُلِّہٖ" یہ عام مخصوص ہے کیونکہ بعض افعال بائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے پاخانہ جاتے وقت پہلے بایاں قدم رکھا جائے۔ امام شیخ محی الدین نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ اصول معلوم ہوا کہ وہ ہر کام جو عزت و بزرگی رکھتا ہے۔ اسے سیدھی طرف سے شروع کرنا مستحب ہے جیسے مسجد میں داخل ہونا، مصافحہ کرنا۔ کپڑے پہننا، وضو و غسل کرنا وغیرہ اور جس کام میں یہ بات نہیں جیسے مسجد سے باہر استنجا کرنا وغیرہ اس میں سیدھی طرف سے شروع کرنا نہیں ہے۔

بَابُ الْتِمَاسِ الْوَضُوْءِ اِذَا حَانَتِ الصَّلٰوةُ

باب جب صبح کی نماز کا وقت آئے تو پانی تلاش کرنا

قَالَتْ عَائِشَةُ حَضَرَتِ الصُّبْحُ فَالْتُمِسَ الْمَاءُ فَلَمْ يُوْجَدْ فَنَزَلَ التَّيَمُّمُ

حضرت عائشہ نے فرمایا۔ نماز صبح کا وقت ہو تو پانی ڈھونڈا نہ ملا آخر تیمم کی آیت اتری

عنوان اول میں التمس لاجل الوضوء کا ذکر ہے اور اس میں وضوء کے لیے پانی تلاش کرنے کا بیان ہے فالتمس سے ترجمہ باب نکلتا ہے۔

۱۶۸- عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَانَتْ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَالْتَمَسَ النَّاسُ الْوَضُوْءَ فَلَمْ يَجِدُوْهُ فَاُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَضُوْءٍ فَوَضَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ذٰلِكَ الْاِنَاءِ يَدَهٗ وَاَمَرَ النَّاسَ اَنْ يَّتَوَضَّؤُوْا مِنْهُ قَالَ فَرَاَيْتُ الْمَاءَ يَنْبُعُ مِنْ تَحْتِ اَصَابِعِهٖ حَتّٰى تَوَضَّؤُوْا مِنْ عِنْدِ اٰخِرِهِمْ

حضرت انس بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگوں نے پانی تلاش کیا مگر نہ حضور علیہ السلام کے پاس تھوڑا سا پانی لایا گیا آپ نے اپنا دست مبارک اس برتن میں رکھ دیا اور لوگوں سے فرمایا اس سے وضوء کرو (حضرت انس کہتے ہیں میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے پھوٹ رہا تھا یہاں تک کہ سب نے وضوء کیا۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام بخاری نے علامات النبوۃ میں بھی ذکر کیا ہے مسلم نے فضائل میں، نسائی نے طہارۃ میں اور ترمذی نے مناقب میں ذکر فرمایا ہے ۲۔ حضور کی مقدس انگلیوں سے پانی جاری کا معجزہ متعدد بار وقوع میں آیا۔ اس مقدس پانی سے سیراب ہونے والوں کی تعداد کسی واقعہ میں چودہ سو، کسی میں ہزار کسی میں ۱۵ سو آئی ہے۔ حضور کا یہ معجزہ جناب موسیٰ کلیم علیہ السلام کے معجزہ سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ پتھر سے نکلا ہی کرتا ہے مگر گوشت پوست کی انگلیوں سے پانی کے فواروں کا جاری ہو جانا بہت عجیب و غریب ہے۔ اس معجزہ پر تفصیلی بحث کے لیے ہماری کتاب جامع الصفات کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۳۔ علماء نے فرمایا سب پانیوں سے بہتر "ماء زمزم" ہے۔ شب معراج اسی پانی سے حضور اقدس کے قلب اقدس کو غسل دیا گیا۔ بعض نے آب کوثر کو قرار دیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ سب پانیوں سے افضل و برتر وہ پانی ہے جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگلیوں بہا، کیونکہ یہ پانی حضور کا جز ہے، حضور نے بھی اس کو طہور مبارک فرمایا۔ (بخاری)

پنجۂ مہر عرب ہے جس سے دریا بہہ گئے
چشمۂ خورشید میں تو نام کو بھی نم نہیں

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ وضوء کے لیے پانی کی تلاش اس وقت واجب ہے۔ جب کہ نماز کا وقت آجائے ۲۔ نماز اپنے وقت پر واجب ہوتی ہے ۳۔ نماز کا وقت آنے سے پیشتر وضوء کے لیے پانی مستحب ہے ۴۔ اس حدیث سے ان ملاحدہ کا رد ہو گیا جو معجزات کے منکر ہیں۔ حضور کی انگلیوں سے پانی کا

حضور کا معجزہ ہے جس کو ثقہ افراد کی جماعت کثیر نے نقل کیا۔ ۴۔ حضور کی انگلیوں سے بہا ہوا پانی متبرک و معظم تھا۔ مگر اس سے صحابہ نے وضو کیا جس سے زمزم کے پانی سے وضو و غسل کا جواز ثابت ہوا۔ نیز زمزم کے پانی سے وضو و غسل کے جائز ہونے کے متعلق صریح حدیث بھی مل جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ فَدَعَا بِسَجْلٍ مِّنْ مَّاءِ زَمْزَمَ فَشَرِبَ مِنْهُ وَتَوَضَّأَ (مسند احمد بن حنبل، نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۸) حضور علیہ السلام نے ایک ڈول زمزم کے پانی کا منگایا۔ آپ نے اس سے کچھ پانی نوش فرمایا اور وضو بھی کیا۔

بَابُ الْمَاءِ الَّذِیْ یُغْسَلُ بِهٖ شَعَرُ الْاِنْسَانِ

باب جس پانی سے آدمی کے بال دھوئے جائیں اور حضرت

وَكَانَ عَطَاءٌ لَّا يَرٰى بِهٖ بَاْسًا اَنْ يُّتَّخَذَ مِنْهَا الْخُيُوْطُ وَالْحِبَالُ وَسُؤْرِ الْكِلَابِ وَمَمَرِّهَا فِي الْمَسْجِدِ (بخاری)

عطاء۔ کا قول ہے کہ آدمی کے بال کی ڈوریاں یا رسیاں بنانے، کتے کے جھوٹے اور ان کے مسجد میں آنے جانے میں حرج نہیں۔

فوائد و مسائل بعض شارحین نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اس عنوان کو قائم کر کے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ آدمی کے بال جب اس کے جسم سے جدا ہو جائیں تو وہ نجس ہیں اور پانی میں گر جائیں تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عطاء کے قول سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اگر آدمی کے بال نجس ہوتے تو اس سے ڈوری و رسی بنانا جائز نہ ہوتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ آدمی کے بالوں کو جب کہ وہ جسم سے جدا ہو جائیں نجس قرار دیتے ہیں لیکن علامہ عینی نے لکھا ہے کہ امام شافعی نے اپنے اس قول سے رجوع فرما لیا تھا (عینی ج ۱ ص ۷۶۶) بہرحال احادیث سے صاف صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کے بال پاک ہیں یہ حضرت عطاء کا کہنا ہے کہ آدمی کے بال کی رسی وغیرہ بنانا جائز ہے یہ درست نہیں کیونکہ آدمی مکرم و محترم ہستی ہے۔ عزوجل نے لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ فرمایا۔ لہٰذا آدمی کے کسی جزء سے بعینہٖ نفع اٹھانا جائز نہیں ہے لہٰذا بال اک ہونا حق ہے۔ مگر بنی آدم کے اجزاء کو کام میں لانا، اس کے بالوں کا تیل نکالنا یا ہڈی وغیرہ کی کوئی چیز بنانا بوجہ کرامت و ی انسان کے ناجائز ہے۔ احناف کا یہی مسلک ہے۔ خود امام بخاری نے حضرت عطاء کے مذکورہ بالا قول سے صرف ی کے بالوں کے پاک ہونے کا استدلال کیا ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امام بخاری کے نزدیک بنی آدم کے اجزاء کا استعمال ز ہے۔ فافہم۔

قَالَ الزُّهْرِيُّ اِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِيْ اِنَاءٍ سَ لَهٗ وَضُوْءٌ غَيْرُهٗ يَتَوَضَّاُ بِهٖ (بخاری) قَالَ سُفْيَانُ هٰذَا الْفِقْهُ بِعَيْنِهٖ لِقَوْلِ عَزَّ وَجَلَّ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا هٰذَا مَاءٌ وَفِي النَّفْسِ مِنْهُ شَيْءٌ يَتَوَضَّاُ بِهٖ

اور زہری نے کہا ہے کہ جب کتا برتن میں منہ ڈال دے اور اس کے سوا پانی نہ ہو تو اسی پانی سے وضو کرے۔ اور سفیان نے کہا قرآن سے بھی یہی نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم پانی نہ پاؤ اور کتے کا جھوٹا آخر پانی ہے لیکن اس کے متعلق تردد یہ ہے کہ ممکن ہے کتے کا

وَيَتَيَمَّمُ | جوٹھا نجس ہو اس لیے وضو اور تیمم دونوں کرے۔

خوب یاد رکھیے کہ زہری اور سفیان کے ان مذکورہ بالا اقوال کے نقل کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام
جوٹھے کو پاک قرار دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے عنوان میں کوئی لفظ ایسا نہیں لکھا جس سے کتے کے جوٹھے کی طہارت
ہو بلکہ اس باب کے ماتحت انھوں نے جو حدیثیں درج کی ہیں ان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتے کا جوٹھا
سے ہے نیز اثر زہری کی نظیر وہ مسئلہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والا پاک کپڑا نہ پائے اور صرف ناپاک کپڑا اس کے
کیا اس کو ننگے نماز پڑھنا چاہیے؟ ظاہر ہے اس مسئلہ سے ناپاک کپڑے کی طہارۃ ثابت نہیں ہوتی۔ یہی حال
کا ہے۔ اسی طرح حضرت سفیان کے اثر کی نظیر نبیذ تمر ہے کہ اس کے متعلق وضو و تیمم کا حکم ہے بلکہ حضرت
لفظ "فِيهِ النَّفْسِ" الخ اس امر کی دلیل ہیں کہ ان کے نزدیک بھی کتے کا جوٹھا پاک نہیں ہے۔

۱۶۹- عَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ قُلْتُ لِعُبَيْدَةَ عِنْدَنَا مِنْ شَعَرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أَنَسٍ أَوْ مِنْ قِبَلِ أَهْلِ أَنَسٍ فَقَالَ لَأَنْ تَكُونَ عِنْدِي شَعَرَةٌ مِنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا

حضرت ابن سیرین کا بیان ہے انھوں نے
کہا میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ
ہمیں حضرت انس یا ان کے گھر والوں کی
سے ملے ہیں۔ عبیدہ نے کہا اگر ان میں سے
بھی میرے پاس ہو تو مجھے وہ دنیا اور جو دنیا
سب سے زیادہ محبوب ہے۔

۱۷۰- عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا حَلَقَ رَأْسَهُ كَانَ أَبُو طَلْحَةَ أَوَّلَ مَنْ أَخَذَ مِنْ شَعَرِهِ

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور نے جب
سر کے بال اترواے تو حضرت ابوطلحہ نے سب
پہلے حضور کے بال حاصل کیے۔

فوائد و مسائل حدیث ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ امام بخاری نے ان دونوں حدیثوں سے انسان
کے پاک ہونے کا استدلال فرمایا اور جب بال پاک ہیں تو پھر وہ پانی بھی پاک ہے جس
گر جائیں۔ واضح ہو کہ حضور سید عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کا پاک ہونا قطعی و حتمی بات ہے بلکہ
فضلاتِ مبارکہ طیب و طاہر ہیں۔ صحابہ کرام حضور کے آثارِ شریفہ، حضور کے موئے مبارک اور حضور کے
کپڑوں کو معظم و متبرک سمجھتے تھے اور ان سے برکت حاصل کرتے تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس
جبہ مبارک تھا۔ جس کے غسالہ کو وہ بیماروں کو پلاتی تھیں اور شفا ہوتی تھی (مسلم شریف) حضرت خالد بن
میں حضور کے بال مبارک کو بطور تبرک رکھتے تھے خود ہی فرماتے کہ ہر معرکہ میں فتح و نصرت مجھے انھیں مقدس
برکت سے حاصل ہوئی ہے۔

حضرت علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری نے ان لوگوں کی نہایت سخت انداز میں تردید کی جو حضور
مبارک اور فضلاتِ طیبہ کے عدم طہارۃ کا قول کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ حضور علیہ

ور قیاس کرنے والے اور آپ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کرنیوالے جاہل وغبی ہیں۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے حضور کے ضلات مبارکہ کے طیب وطاہر ہونے کے ثبوت میں احادیثِ ذیل ذکر کی ہیں۔ بزار طبرانی، حاکم و بیہقی و ابو نعیم نے یت کیا کہ ابن زبیر نے حضور کے پچھنے لگنے سے جو خون نکلا تھا، پیا تھا۔ حضرت ام ایمن نے حضور کا بول مبارک پیا تھا۔ قطنی، طبرانی و حاکم، حضرت سلمیٰ ام رافع نے حضور کے غسل کا پانی پیا۔ حضور نے فرمایا۔ اللہ نے تیرے بدن پر آتشِ دوزخ م کردی (عینی ج ۲ ص ۷۷۶)

صحابہ کرام کا حضور کے آثار شریفہ سے برکت حاصل کرنا

بخاری شریف میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام وضو فرماتے، تو حضور کے آبِ وضو پر صحابہ کرام بے تابانہ دوڑتے۔ قریب ہے کہ آپس میں کٹ مریں۔ حضور جب لعابِ دہن ڈالتے یا کھنکھارتے صحابہ اسے دونوں میں لے اپنے بدنوں اور چہروں پر ملتے ۱۔ حضور نے ایک پیالہ پانی میں اپنے ہاتھ اور چہرہ مبارک کو دھویا، اس میں کلی کی، حضرت ابو موسیٰ و بلال کو فرمایا اس کو پی لو اور اپنے چہرے پر ڈال لو ۲۔ صائب ابن یزید کہتے ہیں۔ میں بیمار تھا میری مجھے بحضور نبوی لے کر آئیں۔ میرے مرض کا ذکر کیا۔ حضور نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، برکت کی دعا دی۔ پھر آپ نے وضو یں نے آپ کے وضو کا پانی پیا۔ مجھے اس سے اسی وقت شفا ہو گئی اور میں نے حضور کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ نیل الاوطار علامہ شوکانی نے اس مضمون کی حدیث ذکر کرکے یہ لکھا ہے کہ

د استدل الجمهور بصبه صَلَّى اللّٰهُ عليهِ وَسَلَّمَ لوضوئه على جابر وتقريره الصحابة على التبرك بوضوئه	جمہور نے اس سے حضور علیہ السلام کے وضو کے پانی ڈالنے سے استدلال کیا ہے اور صحابہ اسے تبرک جانتے تھے (نیل الاوطار جلد ۱ صـ۱۹)

حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حضور کے موئے مبارک تھے جنہیں وہ عطر میں ڈالے رکھتی تھیں (مسند ابن حنبل) حضرت ام سلیم نے حضور کے پسینہ مبارک کو ایک شیشی میں محفوظ کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے خوشبو میں اس کو ملا دیا جائے (بخاری) صحابہ کرام نے حضور کے ناخن کے ٹکڑے بطور تبرک محفوظ کر رکھے تھے (مسند احمد بن حنبل) ت ام سلمہ نے چاندی کی ڈبیا میں حضور کے موئے مبارک رکھ چھوڑے تھے۔ جب کوئی بیمار ہوتا تو اس کا غسالہ مریض کو دیا وہ شفا پاتا (بخاری) یہ تمام حدیثیں نیل الاوطار میں شوکانی نے بھی ذکر کی ہیں۔ جن سے آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہوتا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثارِ شریفہ، نشانِ قدم، موئے مبارک اور تمام ان اشیاء کا جن کو آپ سے نسبت ہے ادب واحترام کرنا واجب ہے اور ان کو حفاظت سے رکھنا، ان سے برکت چاہنا، انھیں متبرک سمجھنا، ان سے حاصل کرنا جائز ہے اور سنتِ صحابہ کرام ہے۔ شفا میں علامہ قاضی نے لکھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر مسجد نبوی میں حضور نبر مبارک کے اس مقام پر جہاں حضور جلوہ فرما ہوتے تھے ہاتھ لگاتے اور پھر اس کو بوسہ دیتے تھے۔ علامہ خفاجی نے نسیم الریاض میں اس کے تحت لکھا ہے کہ :۔

یدل علی جواز التبرک بالانبیاء	کہ صحابہ کرام و حضرت عبداللہ بن عمر کے اس فعل سے

وَالصّٰلِحِيْنَ وَاٰثَارِهِمْ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِمْ | انبیاء کرام و اولیاء عظام کے آثار شریفہ سے اور ان سے جن کو ان سے نسبت ہو گئی ہے برکت حاصل کرنے کا جواز نکلتا ہے۔

اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس حدیث زیر بحث کی تشریح کرتے ہوئے مشہور غیر مقلد مولوی وحید الزمان نے لکھا کہ اس باب کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے موئے مبارک ہمیشہ صحابہ کرام لیتے رہے ہیں حضور نے دو بار سارے سر کے بال اُتروائے اور سارے بال تقسیم فرمائے اور یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام کے جسموں کو زمین نہیں کھاتی تو بال بھی آپ کے زمین نہیں کھا سکتی۔ لہٰذا اس زمانہ میں جن بالوں کے متعلق ہمیں بطور تواتر یا [illegible] یہ معلوم ہو کہ وہ حضور کے ہیں ان کی تکذیب نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہم پر ایسے بالوں کی عزت و حرمت لازم ہے اگرچہ اس میں شبہ بھی ہو پھر بھی ان کی تکریم و تعظیم ضروری ہے کیونکہ اگر وہ بال واقع میں آپ کا ہے تو اس کی تعظیم کرنے سے ہم گنہگار نہ ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہماری نیت کو جانتا ہے کہ ہم نے اس کا ادب اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے یہ حضور کے موئے مبارک ہیں اور تعجب ہے ان لوگوں پر جو اتباع سُنّت کا دعویٰ کرتے ہیں پھر خواہ مخواہ اس قسم کے آثار شریفہ (یعنی نشانِ قدم و موئے مبارک وغیرہ) کی تکذیب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غلو اور تعصب سے بچائے۔ باوجود علم کے بعض لوگوں نے ایسے کلمات منہ سے نکالے ہیں کہ ان کی نوبت کفر تک پہنچ جاتی ہے۔ [illegible] غافل ہیں اور نہیں جانتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے فضلات یہاں تک کہ آپ کا بول و براز بھی اور آپ کے جسم مبارک کی ہر چیز طیب و طاہر، مقدس و محترم ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے اور حق بھی [illegible] کہ حضور کے بالِ مبارک کیا آپ کی جوتی کی خاک بھی مومن کے لیے تو دنیا و مافیہا سے افضل و برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ [illegible] کی توفیق عطا فرمائے ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز (تسہیل القاری ج

بَابُ إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي الْإِنَاءِ

باب کتے کا برتن سے پانی پینے کا بیان

۱۷۱۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِيْ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا (بخاری)	حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کتا برتن سے پی لے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھو ڈالو۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابو داؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ بعض شُرّاح مثلاً ابن بطال نے کہا کہ اس حدیث سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ کتا جس برتن سے پانی پی لے اس کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ سور کتے سے نجس ہے۔ اسی طرح آدمی کا پاخانہ و پیشاب بھی نجس ہے اور ہر قسم کی نجاست کو زائل کرنے کے لیے ایک بار حد درجہ [illegible] بار دھونا کافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سات بار دھونے کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے بلکہ

اور مصلحت کی بنا پر ہو۔ یعنی بعض کتے زہریلے ہوتے ہیں تو احتمال ہے کہ برتن میں اس کے زہر کا اثر رہ جائے اس لیے مبالغۃً سات بار دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ابن بطال کا ایسا کہنا متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

اوّل اس لیے کہ کسی چیز کی طہارۃ کا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی وجہ یا حدث ہوتا ہے یا نجاست اور یہاں حدث ہو نہیں سکتا اس لیے نجاست متعین ہے یعنی دھونے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے۔

دوم اس لیے کہ سات بار دھونے کے حکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ نجس نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تین بار رفع نجاست کے لیے ہو اور چار بار دفع زہر کے لیے ہو۔ **سوم** مسلم کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

طهور اناء احدكم اذا ولغ الكلب ان يغسله سَبْعَ مَرَّاتٍ (مسلم واحمد بن حنبل)	اس برتن کے پاک کرنے کا طریقہ جس میں کتا منہ ڈال دے یہ ہے کہ اس کو سات بار دھویا جائے۔

اس حدیث میں طہور کا لفظ اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ دھونے کی علت زہر نہیں ہے بلکہ نجاست ہے چنانچہ اس کی تائید مزید "اثرِ ابنِ عباس سے ہوتی ہے۔" جس کو محمد بن نصر المروزی نے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ کتے کے منہ ڈالے برتن کو دھونے کی علت نجاست ہے اور کتا نجس ہے اور صحابہ سے اس کے خلاف ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ جس سے ثابت ہوا کہ کتا نجس ہے اور اس کا جوٹھا بھی نجس ہے۔

رہا ابن بطال کا یہ فرمانا کہ ان چار حدیثوں سے امام بخاری کی غرض کتے کے جوٹھے کی طہارۃ ثابت کرتی ہے۔ اس میں نظر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے امام بخاری کا مقصود صرف لوگوں کے مذاہب کا بیان کرنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "سُؤر الکلاب طاہر" کے الفاظ کے ساتھ عنوان قائم نہیں کیا۔ فافہم

سات بار دھونے کی بحث

واضح رہے کہ اس باب میں متعدد حدیثیں آئی ہیں ۱۔ حدیث ابوہریرہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب کتا برتن میں مُنہ ڈال دے تو

يرقه ثم ليغسله سبع مراتٍ (مسلم ونسائی)	اس پانی کو پھینک دو اور برتن کو سات بار دھو ڈالو

۲۔ حدیث حضرت عبداللہ بن مغفل میں سات بار دھونے کے بعد وعَفِّرُوه الثامنة بالتراب کے لفظ آئے ہیں یعنی آٹھویں بار مٹی سے مانجا جائے۔

اس مضمون کی احادیث سے حضرت ابن عباس وعروہ بن الزبیر ومحمد ابن سیرین وطاؤس وعمرو بن دینار واوزاعی ومالک وشافعی واحمد بن حنبل وابوثور وابوعبید وداؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس برتن میں کتا منہ ڈالدے اس کو سات بار دھونا واجب ہے۔

احناف وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ لعاب کلب اور دیگر نجاسات میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جب پاخانہ وپیشاب کو سات بار دھونا واجب نہیں ہے تو کتے کے جوٹھے کے لیے سات بار کے وجوب کا حکم کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نجاست غلیظہ کے لیے جب تین بار دھونا کافی ہے تو جو نجاستیں اس سے کم درجہ کی ہیں وہ تو بطریق اولیٰ تین بار دھونے سے پاک ہو جانی چاہییں۔ نیز اس سلسلہ میں حنفیہ صرف قیاس وعقل سے کام لے کر یہ رائے قائم نہیں کر رہے بلکہ مرفوع حدیثیں

بھی ان کے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ جناب ابوہریرہ جن سے سات بار دھونا مروی ہے انہیں سے تین بار دھونا بھی (مرفوعاً وموقوفاً) مروی ہے اور جمع بین الحدیثین کا یہی طریقہ نظر آتا ہے کہ سات بار دھونے کے حکم کو مبالغ قرار دیا جائے اور تین بار دھونے سے طہارت کا حصول مانا جائے۔ چنانچہ دارقطنی نے اسنادِ صحیح کے ساتھ روایت کی ک روایت کیا کہ جناب ابوہریرہ نے فرمایا کہ جب کُتّا برتن میں منہ ڈال دے تو۔

فاهرقه ثم اغسله ثلاث مرات	اس کو پھینک دو اور برتن کو تین بار دھو لو۔

اور ابن عدی نے کامل میں جو روایت نقل کی اس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ابوہریرہ نے کہا:۔

قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ احدكم فليهرقه وليغسله ثلاث مرات	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کُتّا برتن میں مُنہ ڈال دے تو اس چیز کو پھینک دو اور برتن کو تین بار دھو ڈالو (عینی ج ۱ ص ۷۴۸)

اس مرفوع حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ سات بار دھونا مستحب ہے کیونکہ اگر سات بار دھونا واجب ہوتا تو پھر تین بار دھونے کو کافی نہ قرار دیا جاتا۔ امام طحاوی نے فرمایا کہ جناب ابوہریرہ کے متعلق یہ ثابت ہے کہ آپ نے تین بار کا فتویٰ دیا۔ ظاہر ہے کہ سات بار دھونے والی حدیث کے راوی بھی حضرت ابوہریرہ ہیں۔ جب تین بار دھونے کا حکم دے رہے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سات بار دھونے کا حکم منسوخ ہے جبھی تو جناب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین دھونے کا فتویٰ دیا۔

بہرحال یہ مسئلہ حنفیہ وائمہ ثلاثہ میں مختلف فیہ ہے۔ حنفیہ تین بار دھونے کو کافی قرار دیتے ہیں اور سات بار دھونے کو مستحب اور مالک وشافعی واحمد بن حنبل سات بار دھونے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ہر فریق کی رائے سے متعلق تفصیلی بحث کے لیے طحاوی، نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۵ وعینی جلد اول ص ۷۴۸ دیکھنی چاہیے۔ یہاں ہم نے بقدرِ ضرورت کلام کیا ہے۔

مسائلِ حدیث

جمہور علماء نے حدیثِ زیرِ بحث سے کتے کے نجس ہونے کا استدلال کیا ہے کیونکہ جب اس کا لعابِ دہن نجس ہے جو منہ میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا باقی بدن بطریقِ اولیٰ نجس قرار پائے گا۔ اسی طرح دھونے کی علت بھی نجاست ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز میں کتا منہ ڈال دے اس کے پھینکنے کا حکم دیا گیا۔ البتہ امام مالک کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ ان کے نزدیک کتا پاک ہے اور ان کے اس قول کی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ کتے کے ذریعے جو شکار کیا جاتا ہے وہ حلال ہے شکار کرنے سے جانور پر کتے کا لعابِ دہن ضرور لگتا ہے اور ایسے شکار کے متعلق دھونے کا حکم نہیں دیا گیا لیکن یہ بات بہت بودی ہے کیونکہ کتے کے پکڑے ہوئے شکار کی اباحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو شکار نجس ہو جائے اس کو پاک کرکے استعمال کرنا ضروری نہیں ہے۔ دھونے کا حکم خصوصی طور پر نہ دینے کی وجہ یہی ہے کہ ہر نجس چیز کو پاک کرکے استعمال کرنے کا حکم پہلے ہی سے شریعت میں معروف ومشہور ہے فافہم

۱۷۲ - عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَجُلًا رَأَى كَلْبًا يَأْكُلُ	حضرت ابوہریرہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فر ایک آدمی نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے

الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَاَخَذَ الرَّجُلُ خُفَّہٗ فَجَعَلَ یَغْرِفُ لَہٗ بِہٖ حَتّٰی اَرْوَاہُ فَشَکَرَ اللّٰہُ لَہٗ فَاَدْخَلَہُ الْجَنَّۃَ

(بخاری)

گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ تو اس شخص نے اپنا موزہ اتارا اور پانی بھر بھر کر اس کو پلایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گیا اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ فعل پسند آیا اور اس کو جنت میں داخل فرمایا۔

فوائد ومسائل امام بخاری نے اس حدیث کو شرب مظالم ادب ذکر بنی اسرائیل میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم نے حیوان میں اور ابوداؤد نے کتاب الجہاد میں ذکر فرمایا ۲۔ ثری اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں تری ہو۔ شکر منعم کی تعظیم وثنار کو کہتے ہیں۔ فاشکر اللہ کے معنیٰ اجر وجزا کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس شخص کا یہ فعل پسند آگیا اور اس کی جزا میں اس کو جنت میں داخل کر دیا۔ اس حدیث میں مخلوقِ خدا پر رحم ورافت کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ اللہ عزوجل فاعلِ مختار ہے وہ چاہے تو خلوص کے ساتھ ایک معمولی سی نیکی کرنے والے کو نوازے اس کے دربار میں عمل کے وزن ومقدار کو نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کیا ہوا ایک معمولی سا عمل خیر کثیر کا باعث ہو جاتا ہے۔ حضور سرورِ عالم وسلم نے اسی نکتہ کو یوں بیان فرمایا کہ "تمہارا مسلمان بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی عبادت ہے"۔ اور قرآن نے اعلان کیا:۔

وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ واسع بھی ہے اور علیم بھی

جس کا حاصل یہی ہے کہ جسقدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ نیک کام کیا جائیگا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ کام فی نفسہٖ مقدار میں بڑا ہے یا چھوٹا ۲۔ اس حدیث سے کتے کے لعاب کی طہارت کا قول کیا گیا ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ اس شخص نے موزہ سے کتے کو پانی پلایا اور ضرور اس کا لعاب موزہ کو لگا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ موزہ پر لعاب لگنے سے کتے کے پاک ہونے کا استدلال کرنا بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ ثانیاً حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ اس شخص نے موزہ سے کتے کو پانی پلایا۔ ہو سکتا ہے کہ موزے کے ذریعے پانی لے کر کسی دوسری جگہ ڈال دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بعد میں موزہ کو دھو لیا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ وہ شخص جس کا حال اس حدیث میں بیان ہوا یہ کس وقت کا واقعہ ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ حضور کے زمانہ بعثت کا واقعہ نہیں ہے چنانچہ خود جناب ابوہریرہ سے روایت ہے کہ اَنَّہٗ کَانَ فِیْ شَرِیْعَۃِ غَیْرِنَا (عینی ج ا ص۷۴۹) لہٰذا کتے کی طہارت پر اس سے دلیل لینا درست نہیں ۳۔ اس حدیث سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ انسان پر اپنے مملوکہ ومقبوضہ جانوروں کا نفقہ واجب ہے۔

۱۶۴۔ قَالَ کَانَتِ الْکِلَابُ تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِی الْمَسْجِدِ فِیْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَکُوْنُوْا

حمزہ بن عبداللہ نے اپنے والد عبداللہ بن عمر سے روایت کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد میں کتے آتے جاتے تھے۔ پھر وہاں کسی جگہ

يَرُشُّوْنَ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ

پر پانی نہیں چھڑکتے تھے۔

فوائد اس تعلیق کو ابوداود نے بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں یہ ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا میں مسجد نبوی میں رات گزا (دروازہ نہ ہونے کی وجہ سے) کتے مسجد میں آتے جاتے تھے اور پیشاب کرتے۔ اس تعلیق سے بھی کتے کے لعاب کی طہارت کا قول کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی درست نہیں کیونکہ محض کتے کے آنے جانے سے اس کی طہارت ثابت ہوتی۔ رہی یہ بات کہ کتے پیشاب کر دیتے تھے اور صحابہ کرام زمین نہیں دھوتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو متعین نہ ہوتا تھا دوسرے یہ کہ زمین سوکھ جانے سے پاک ہو جاتی ہے اس لیے پانی نہیں بہاتے تھے۔ احناف نے سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب زمین کو نجاست پہنچے اور سورج یا ہوا سے سوکھ جائے اور اثر نجاست زائل ہو جائے اس زمین پر نماز پڑھی جا سکتی ہے یعنی نماز کے حق میں وہ زمین پاک قرار دی جائے گی۔

۱۷۴ - عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ فَقَتَلَ فَكُلْ وَإِذَا أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلٰى نَفْسِهٖ قُلْتُ أُرْسِلُ كَلْبِيْ فَأَجِدُ مَعَهٗ كَلْبًا آخَرَ قَالَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلٰى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلٰى كَلْبٍ آخَرَ (بخاری)

عدی بن عدی حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (کتے کے شکار) کے متعلق سوال کیا۔ حضور نے تو اپنا سدھایا ہوا کتا چھوڑے اور وہ شکار مارے کھالے اور اگر کتا اس جانور سے کھالے تو اس شکار مت کھا کیونکہ کتے نے یہ جانور اپنے لیے پکڑا نہیں) میں نے عرض کی کبھی میں اپنا کتا چھوڑتا ہوں ساتھ دوسرا کتا بھی پاتا ہوں۔ فرمایا اس شکار کو نہ تو نے اپنے شکاری کتے پر بسم اللہ پڑھی ہے دوسرے پر تو نہیں پڑھی۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام نے بیوع، صید ذبائح میں بھی ذکر کیا ہے اور مسلم، ابوداود و ابن ماجہ نے الصید میں ذکر کیا ا۔ اس حدیث سے بھی کتے اور اس کے لعاب کی طہارت کا قول کیا گیا اور انھوں کہا۔ حضور نے شکاری کتے کے ذریعے کیے ہوئے شکار کو کھانے کا حکم دیا اور یہ قید نہیں لگائی کہ جانور کے جس حصہ پر کتے نے لگایا ہے اس کو دھو کر کھایا جائے اس سے کتے کے لعاب کا پاک ہونا ثابت ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ محض مبہمات سے تمسک کرنا اور احادیث صریحہ کو نظر انداز کر کے مذکورہ بالا رائے قائم کرنا ہی ضعیف و رکیک ہے۔ کیونکہ حدیث زیر بحث میں دراصل کتے کے مارے ہوئے شکار کی ناپاکی کو بیان کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ جب بسم اللہ پڑھ کر کتے کو چھوڑا گیا اور اس نے شکار کیا تو کتے کا جانور کو قتل کرنا ہی ذبح کرنے کے مترادف ہے لہٰذا اس کو کھایا جائے۔

اور اگر اس دلیل کو مان لیا جائے کہ چونکہ حضور نے اس شکار کو دھو کر کھانے کی ہدایت نہیں دی اس لیے کتے لعاب دہن کی طہارت ثابت ہو گئی۔ تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حضور نے چونکہ جانور کے جو زخم آیا ہے اور اس سے بہا اس کے دھونے اور جانور کے پیٹ میں جو نجاست ہے اس کو صاف کرنے کا حکم بھی نہیں دیا ہے اس لیے

وجھڑی کی آلائش وغیرہ اور زخم کا دم مسفوح بھی پاک ہے؟

دراصل یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ شکاری کتے کے مارے ہوئے جانور کے دھونے کا ذکر حضور نے اس لیے نہیں فرمایا کہ اس کو دھونے اور صاف کرنے کی ہدایت پہلے ہی سے شارع کی جانب سے مقرر و متعین ہے اور یہاں مسئلہ صرف شکاری کتے کے کیے ہوئے شکار کا بتانا مقصود تھا۔ اس لیے صرف یہ بتانے پر اکتفا فرمایا کہ شکاری کتے نے جو شکار کیا ہے وہ حلال ہے۔

شکاری کُتّے کے شکار کے مسائل واحکام

حدیث زیر بحث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔ ۱۔ کلب معلّم اس کتے کو کہتے ہیں جو شکار کے لیے سدھا لیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عام درندوں کی طرح شکار پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے کتے کا شکار حلال ہے ۲۔ پھر چونکہ اس میں کتے کو مطلق رکھا گیا ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم و نسل کا کتا ہو، چاہے وہ اسود ہی کیوں نہ ہو۔ جب اس کو سدھا لیا جائے تو اس کا شکار حلال ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک کلب اسود کا شکار حلال نہیں ہے) ۳۔ حدیث زیر بحث سے واضح ہوتا ہے کہ کتے کے ذریعہ شکار کرنے کے لیے چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ اول، کتا سدھایا ہوا ہو۔ دوم ارسال یعنی کتے نے خود بخود شکار نہ کیا ہو بلکہ مالک کا اشارہ پا کر اس نے جانور کو پکڑا ہو۔ سوم، یہ کہ بوقت ارسال بسم اللہ پڑھ لی ہو۔ چہارم یہ کہ کتے نے شکار کو مالک کے لیے پکڑا ہو اور اس میں سے خود نہ کھایا ہو۔ اگر خود اس نے شکار سے کھا لیا تو شکار حرام ہوگا۔ چنانچہ حدیث کے یہ لفظ اذا اکل فلا تاکل سے یہ بات بالکل صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے ۴۔ اگر بھول کر بسم اللہ نہیں پڑھی تو شکار حلال ہے اور قصداً نہیں پڑھی تو حرام ہے ۵۔ اگر سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑا اور دوسرا کتا بھی شکار کرنے میں بھی شامل ہوگیا تو شکار حرام ہوگا کیونکہ شکاری نے بسم اللہ اپنے کتے پر پڑھی تھی نہ کہ دوسرے کتے پر ۶۔ یہ ہدایات قرآن پاک کی آیت سے ماخوذ ہیں۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا
اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهِ

اور جو شکاری جانور تم نے سدھا لیے انہیں شکار پر دوڑاتے جو علم تمہیں خدا نے دیا اس میں سے انہیں سکھاتے تو کھاؤ اس میں سے جو وہ مار کر تمہارے لیے رہنے دے اور اس پر اللہ کا نام لو۔

یہ آیت ابن حاتم اور حضرت زید بن مہلہل کے حق میں نازل ہوئی جن کا نام حضور نے زید الخیر رکھا تھا۔ ان دونوں صاحبوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم لوگ کتے اور باز کے ذریعہ شکار کرتے ہیں۔ کیا ہمارے لیے حلال ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الف۔ جو شکاری جانور خواہ وہ درندوں میں سے ہوں جیسے کتا اور چیتا یا شکاری پرندوں سے ہوں جیسے باز، شاہین، شکرہ وغیرہ۔ جب ان کو اس طرح سدھا لیا جائے کہ جو شکار کریں اس میں سے نہ کھائیں اور جب شکاری ان کو چھوڑے تب شکار پر جائیں اور جب واپس بلائے واپس آجائیں۔ ایسے شکاری جانور کو معلّم کہتے ہیں۔ آیت سے جو مستفاد ہوتا

ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے کتا یا شکرہ وغیرہ کوئی شکاری جانور شکار پر چھوڑا تو اسکا شکار چند شرطوں
۱۔ شکاری جانور مسلمان کا ہو اور سدھایا ہوا ہو ۲۔ اس نے شکار کو زخم لگا کر مارا ہو ۳۔ شکاری جانور بسم اللہ
کہہ کر چھوڑا گیا ہو ۴۔ شکار اگر زندہ ملے تو اس کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کر لیا جائے ۵۔ اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی
ہے کیونکہ بوقتِ ارسال بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ لیا گیا ہے۔

ب۔ اور مندرجہ ذیل صورتوں میں شکار حرام ہوگا۔ ۱۔ اگر شکاری جانور (معلم) سدھایا ہوا نہ ہو ۲۔ یا اس نے
کے زخم نہ کیا ہو ۳۔ یا شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا ہو ۴۔ یا شکار زندہ ملا ہو اور اس کو بسم اللہ
کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو ۵۔ یا معلّم کے ساتھ غیر معلّم شکار میں شریک ہو گیا ہو ۶۔ یا ایسا شکاری جانور شکار میں شریک
جس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر نہ چھوڑا گیا ہو ۷۔ یا وہ شکاری جانور کسی مجوسی کافر کا ہو۔ ان سب صورتوں میں شکار حرام ہے۔

ج۔ نیز یہی احکام تیر کے ساتھ شکار کے ہیں یعنی اگر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر تیر شکار پر چھوڑا اور تیر سے شکار مجروح ہو
پڑا اور مر گیا تو حلال ہے اور اگر مجروح ہو کر بھی زندہ رہا تو پھر اس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر دوبارہ ذبح کیا جائیگا اور اگر بوقت
ارسال تیر پر بسم اللہ نہیں پڑھی یا تیر نے شکار کو زخم نہیں پہنچایا یا زندہ پانے کے بعد دوبارہ اس کو ذبح نہ کیا تو ان صورتوں
میں تیر کا شکار بھی حرام ہوگا نیز بندوق کو تیر پر قیاس نہ کیا جائے بندوق کا شکار بغیر ذبح کے کسی حالت میں حلال نہیں۔

بَابُ مَنْ لَّمْ يَرَ الْوُضُوْءَ اِلَّا

باب ان لوگوں کے مسلک کے بیان جو یہ کہتے ہیں کہ وضو

مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى
اَوْجَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ (بخاری)

اسی حدث سے لازم آتا ہے جو دونوں راہوں (آگے
پیچھے) سے نکلے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا کوئی تم میں سے پاخانہ

فوائد و مسائل

قُبُل آگے کے مقام کو کہتے ہیں اور دُبُر پیچھے کے مقام کو۔ ان دونوں کو مَخْرَجَیْن سے
ہیں۔ غائط اس جگہ یا مکان کو کہتے ہیں جو پاخانہ و پیشاب کرنے کے لیے مقرر کر دی جاتی ہے
پاخانہ کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ احلیل (آلۂ تناسل)۔ پیشاب گاہ کے سوراخ کو کہتے ہیں۔ یعنی سوراخ ذکر اور قُبُل و دُبُر
سبیلین سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ آئندہ بحث میں چونکہ یہ الفاظ استعمال ہوں گے اس لیے ان لفظوں کے معنیٰ کو
خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔

وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

واضح کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ جب کوئی چیز سبیلین
دُبُر سے نکلے تو وضو توڑ دے گی اور اگر سبیلین سے نہ نکلے تو وضو نہیں
مثلاً پیشاب آیا، پاخانہ آیا یا کوئی اور چیز قُبُل و دُبُر سے نکلی تو وضو ٹوٹ جائیگا اور اگر اس کے علاوہ جسم کے کسی حصہ سے
نکلے مثلاً خون بہے یا پچھنے لگانے سے خون نکلے یا قے آئے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ وہ فرماتے ہیں آیت اَوْجَاءَ اَحَدٌ
مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ کا حاصل یہ ہے کہ صرف قُبُل و دُبُر کی راہوں سے نکلنے والی چیز وضو کو توڑ دے گی۔ احناف
نے کہا یہ تو ہمیں تسلیم ہے کہ قُبُل و دبر کی راہوں سے نکلنے والی چیز ناقضِ وضو ہے مگر ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صرف قُبُل

ے نکلنے والی چیز ہی ناقضِ وضوء قرار پائے گی۔ کیونکہ آیت میں حصر نہیں ہے اور آیت زیر بحث پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طہارت کو زائل کرنے والی اصل چیز نجاست کا نکلنا ہے اور سبیلین وغیر سبیلین کی اس میں کوئی تاثیر نہیں ہے س موثر صرف خروج نجاست ہے لہٰذا نجاست جس جگہ سے بھی خارج ہوگی وضوء کو توڑ دے گی خواہ وہ قبل و دبر سے خارج یا جسم کے کسی اور حصہ سے فافہم اور حق یہ ہے کہ اس باب میں احناف کی رائے بہت قوی ہے پس احناف کے نزدیک:۔

۱۔ پاخانہ، پیشاب، ودی، مذی، کیڑا، پتھر اور منی بلا شہوت مرد یا عورت کے آگے یا پیچھے کے مقام سے نکلے گی تو وٹ جائے گا۔ اسی طرح بدن کے کسی حصہ سے خون، پیپ یا زرد پانی نکل کر بہا اور اس کے بہنے میں ایسی جگہ پہنچنے کی لاحیت تھی۔ جس کا وضوء یا غسل میں دھونا فرض ہے وضوء کو توڑ دے گا اور اگر خون بدن کے کسی حصہ سے صرف چمکا یا ھرا اور بہا نہیں جیسے سوئی کی نوک یا چاقو کا کنارہ لگ جانے سے خون ابھر یا چمک جاتا ہے یا خلال یا مسواک کرنے یا انگلی سے دانت مانجھنے یا دانت سے کوئی چیز کاٹنے پر خون کا اثر محسوس ہوتا ہے یا انگلی، ناک میں ڈالنے سے اس پر خون کی ی آگئی۔ ان سب صورتوں میں خون بہنے کے قابل نہ ہو تو وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح اگر خون بہا مگر ایسی جگہ بہہ کر ں آیا جس کا وضوء یا غسل میں دھونا فرض ہو۔ مثلاً آنکھ میں دانا تھا وہ ٹوٹ کر آنکھ کے اندر ہی پھیل گیا باہر نہیں نکلا ن کے اندر دانا تھا اور اس کا پانی سوراخ سے باہر نہ نکلا یا زخم میں گڑھا پڑ گیا۔ اس میں رطوبت چمکی، ابھری، ظاہر مگر زخم کے اندر ہی اندر رہی تو ان سب صورتوں میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔ غرضیکہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک خروج نجاست ناقضِ وضوء ہے خواہ وہ جسم ی بھی حصہ سے نکل کر بہے (یعنی بہہ کر ایسی جگہ پر پہنچ جائے جس کا وضو اور غسل میں دھونا فرض ہے) چنانچہ امام خطابی نے معالم السنن میں فرمایا کہ اکثر فقہاء کا یہی ب ہے خون کا غیر سبیلین سے بہنا ناقضِ وضوء ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ اصحاب رسول اور تابعین کرام کے نزدیک ور نکسیر ناقضِ وضوء ہے اور امام احمد، سفیان ثوری اور ابن المبارک واسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا بھی مسلک ہے۔ اس ضح ہوگیا کہ احناف کا مسلک، وہی ہے جو اکثر اصحاب رسول کریم کا مسلک ہے۔

اولامستم النساء امام شافعی کے نزدیک عورت کو چھونے سے بھی وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ لمس ی چھونے کے ہیں۔ اسی طرح ذکر کو بلا حائل چھونے سے بھی وضوء ٹوٹ جائیگا۔ وہ کہتے ہیں ذکر کو چھونا بھی عورت کے چھو ں ہے۔ پس نیند سے وضوء اس لیے ٹوٹ جاتا ہے کہ ہوا نکلنے کا سبب بنتی ہے اور عورت کو چھونے اور ذکر کو چھونے ی نکلنے کا احتمال ہے تو امام شافعی نے لمس کو از روئے نص اور مسِ ذکر کو از روئے حدیث اس کے ساتھ ملحق کر کے ناقض ر دیا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سبیلین سے نکلنے والی چیز ناقضِ وضوء ہے۔ فافہم

نفیہ یہ کہتے ہیں۔ اولامستم لمس کے معنی عورت کو ہاتھ سے چھونے کے نہیں ہیں بلکہ یہ جماع سے کنایہ ہے۔ ضرت ابن عباس، علی ابن ابی طالب، ابو موسیٰ اشعری، عبیدۃ السلمانی وعبیدۃ الضبی، عطاء وطاؤس وحسن بصری ری، اوزاعی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب کے نزدیک اس آیت میں لمس سے مراد جماع ہے چنانچہ امام ے بھی اس کو اختیار کیا اور کتاب التفسیر میں اس کی تصریح بھی کی۔ یعنی آیت کا تعلق وضوء سے نہیں بلکہ جنابت سے ہے۔ س جنبی ہوگیا۔ اگر پانی پر قدرت نہ پائے تو تیمم کرے۔ لہٰذا محض عورت کو چھونے یا ذکر کو مس کرنے سے وضوء کے ٹوٹ

جانے کا آیۃ زیر بحث سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

وَقَالَ عَطَاءٌ فِيمَنْ يَخْرُجُ مِنْ دُبُرِهِ الدُّودُ أَوْ مِنْ ذَكَرِهِ نَحْوُ الْقَمْلَةِ يُعِيدُ الْوُضُوْءَ

اور عطاء نے کہا جس کی قبل یا دبر سے کوئی کیڑا وغیرہ
جوں کے نکلے وہ وضو دوبارہ کرے

یعنی اگر قبل و دبر سے کیڑا یا جانور وغیرہ نکلے تو یہ ناقضِ وضو ہے۔ حضرت امام شافعی، امام احمد اسحٰق ابی ثور ثوری، اوزاعی اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مسلک ہے اور حضرت قتادہ و امام مالک ہیں کہ خلافِ معمول کوئی چیز اگر قبل و دبر سے نکلے تو وہ ناقضِ وضو نہیں ہے لہٰذا کیڑے کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹے گا ہیں جو مرفوع حدیث حضرت ابن عمر سے ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وضو نہیں ٹوٹتا چیز سے جو قبل و دبر سے نکلے۔ دار قطنی نے کہا اس کی اسناد میں عبد اللہ بن محمد ضعیف ہے۔ بہرحال مسئلہ مختلف فیہ امام اعظم علیہ الرحمۃ کا مسلک یہی ہے کہ قبل و دبر سے جو چیز بھی خارج ہوگی وہ ناقضِ وضو قرار پائے گی۔

وَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلٰوةِ أَعَادَ الصَّلٰوةَ وَلَمْ يُعِدِ الْوُضُوْءَ[1]

حضرت جابر نے فرمایا اگر کوئی نماز میں
وہ نماز دوبارہ پڑھے مگر وضو دوبارہ نہ پڑھے

نماز میں قہقہے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے

واضح ہو کہ اس میں غالباً سب کا اتفاق ہے کہ اگر نماز میں تو نماز فاسد ہو جائے گی اور دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔ لیکن لگانے سے وضو بھی ٹوٹے گا یا نہیں؛ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام مالک و شافعی ولیث کے نزدیک قہقہہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اور امام نخعی و حسن و ثوری و اوزاعی و امام ابو حنیفہ رضی عنہم یہ فرماتے ہیں کہ نماز میں قہقہہ مارنے سے وضو بھی جاتا رہتا ہے۔ یہ حضرات گیارہ حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں سے چار مرسل ہیں اور سات مسند ہیں۔ دار قطنی نے ابی الملیح سے انھوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ ہم حضور کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص جن کو کم نظر آتا تھا آئے اور کنوئیں میں گر گئے۔ جس سے بعض نمازیوں سے ہنسی آگئی جسے قہقہہ کہا جاتا ہے۔ نماز کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

مَنْ ضَحِكَ مِنْكُمْ فَلْيُعِدِ الْوُضُوْءَ وَالصَّلٰوةَ (دار قطنی)

جو نماز میں ہنسا ہے وہ وضو بھی دوبارہ کرے اور
دوبارہ پڑھے۔

اور روایت ابن عمر کے الفاظ یہ ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ ضَحِكَ فِي الصَّلٰوةِ قَهْقَهَةً فَلْيُعِدِ الصَّلٰوةَ وَالْوُضُوْءَ (ابن عدی فی الکامل)

جو نماز میں قہقہہ مار کر ہنسا وہ نماز دوبارہ پڑھے
بھی دوبارہ کرے

اس حدیث سے ہنسنے کی کیفیت بھی معلوم ہو گئی کہ ہنسنے سے مراد قہقہہ مار کر ہنسنا ہے لہٰذا قہقہہ کا ناقضِ وضو

---

[1] واضح ہو کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ خارج نماز قہقہہ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا فافہم

ثابت ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس باب کی حدیثوں ضعیف بھی ہیں تو جواب یہ ہے کہ کثرۃ طرق متون و رواۃ سے ان میں ایسی قوت پیدا ہو گئی ہے کہ ان کے مقابل قیاس جلی کو چھوڑنا ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ صحابہ کرام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار میں اور نماز میں ہنسنا بڑی عجیب سی بات ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اول تو تمام صحابہ کا ہنسنا ثابت نہیں۔ ممکن ہے یہ ہنسنے والے وہ لوگ ہوں جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہنسی بے اختیار آجاتی ہے اور اس میں شرعاً کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ بہر حال متعدد حدیثوں سے ثابت ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے اور بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ واضح ہو کہ تبسم میں آواز نہیں ہوتی جس کو مسکرانا کہتے ہیں اور ضحک وہ ہنسنا ہے جس میں آواز ہوتی ہے مگر دوسرا نہیں سنتا۔ ضحک سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ نماز فاسد ہو جاتی ہے اور قہقہہ یہ ہے کہ ایسی آواز سے ہنسا جائے کہ خود بھی سنے اور ساتھی کو بھی سنائی دے۔ قہقہہ سے نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے اور وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر چونکہ قہقہہ کا ناقضِ وضوء ہونا خلافِ قیاس ہے اور جو بات خلافِ قیاس ہو وہ اپنے مورد پر بند رہتی ہے اس لیے سیدنا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ وہ نماز جس میں رکوع و سجدہ ہوتا ہے اس میں اگر قہقہہ لگایا گیا تو نماز فاسد ہو گی اور وضوء بھی جاتا رہے گا۔ پس اگر نمازِ جنازہ یا سجدہ تلاوت یا خارج نماز میں قہقہہ لگایا تو وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح نابالغ نے اپنی نماز میں قہقہہ لگایا تو وضوء نہیں ٹوٹے گا مگر نماز فاسد ہو جائے گی۔ صاحبِ ہدایہ نے اس کو علی ماقیل کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ اس مسئلے کے متعلق امام اعظم سے کوئی روایت نہیں ملتی۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بالغ کا قہقہہ یعنی اتنی آواز سے ہنسی کہ آس پاس والے سنیں۔ اگر جاگتے میں رکوع و سجدہ والی نماز میں ہو تو وضوء ٹوٹ جائیگا نماز فاسد ہو جائے گی (۲) اگر نماز کے اندر سوتے میں یا جنازہ یا سجدہ تلاوت میں قہقہہ ہو تو وضوء نہیں جائے گا مگر وہ نماز یا سجدہ فاسد ہوگا (۳) اور اگر اتنی آواز سے ہنسا کہ خود اس نے سنا۔ پاس والوں نے نہ سنا تو وضوء نہیں جائے گا نماز جاتی رہے گی (۴) اگر نماز میں مسکرایا کہ دانت نکلے مگر آواز بالکل پیدا نہیں ہوئی تو اس سے نہ نماز جائیگی نہ وضوء۔

وَقَالَ الْحَسَنُ اِنْ اَخَذَ مِنْ شَعْرِهٖ اَوْ اَظْفَارِهٖ اَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ فَلَا وُضُوْءَ عَلَيْهِ

اور حسن بصری نے کہا جو شخص اپنے سر کے بال منڈائے یا ناخن کترائے یا اپنے موزے اُتار ڈالے تو اس پر دوبارہ وضوء لازم نہیں ہے۔

فوائد و مسائل

۱۔ یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ اہلِ حجاز و عراق ابی العالیہ و حکم و حماد و مجاہد یہ فرماتے ہیں کہ وضوء کرنے کے بعد اگر بال اُتروا دیے یا ناخن ترشوائے تو دوبارہ وضوء کرنا واجب ہے۔ ۲۔ امام شافعی و نخعی و عطا کا قول ہے کہ صرف دوبارہ مسح کرے اور ہاتھ دھولے ۳۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ دوبارہ وضوء و مسح کی ضرورت نہیں پہلا وضوء ہی درست ہے۔ امام کی رائے تعلیق زیرِ بحث کے موافق ہے۔

اَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی نے وضوء کر کے موزے پہن لیے۔ پھر موزے اُتار دیے تو اس صورت میں دوبارہ وضوء کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف پاؤں کو دھو ڈالے۔ ۱۔ تعلیق اول کو سعید ابن منصور و ابن منذر نے حضرت حسن بصری سے باسنادِ صحیح موصولاً روایت کیا ہے اور تعلیق دوم کو ابن ابی شیبہ نے باسنادِ صحیح روایت کیا ہے۔

وَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ لَا وُضُوْءَ

حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا وضوء لازم نہیں ہوتا

اِلَّا مِنْ حَدَثٍ

مگر حدث سے۔

فوائد و مسائل اس تعلیق کو اسمٰعیل قاضی نے احکام میں بسند صحیح مجاہد سے موقوفاً روایت کیا ہے اور ابو عبید نے کتاب الطہور میں الفاظ ذیل سے روایت کیا ہے۔

لَا وُضُوْءَ اِلَّا مِنْ حَدَثٍ اَوْ صَوْتٍ اَوْ رِيْحٍ (عینی ج ۱ ص ۶۹۴)

وضو لازم نہیں ہوتا مگر حدث سے یا ہوا نکلنے کی آواز سے یا بو سے

ظاہر ہے کہ حدث کا لفظ عام ہے۔ سونا، بے ہوشی، جنون یہ بھی حدث ہے اور قبل و دبر سے کسی چیز کا نکلنا بھی حدث ہے اور جسم کے کسی حصہ سے بھی نجاست کا بہنا بھی حدث ہے۔ فافہم

وَيُذْكَرُ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ غَزْوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ فَرُمِيَ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَنَزَفَهُ الدَّمُ فَرَكَعَ وَسَجَدَ وَمَضٰى فِيْ صَلٰوتِهٖ

اور جابر ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضور ذات الرقاع کی لڑائی میں تھے۔ وہاں ایک شخص کو دوران نماز میں تیر لگا۔ اس میں سے خون بہا لیکن انہوں نے رکوع و سجدہ کیا اور نماز پڑھتے رہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو ابن اسحاق نے مغازی میں درج کیا جس کا قصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک گھاٹی میں مقیم ہوئے فرمایا آج رات کون ہمارا پہرہ دے گا تو ایک شخص مہاجر اور ایک انصاری نے یہ خدمت اپنے ذمے لی۔ بیہقی کی روایت میں یہ تصریح بھی ہے کہ انصاری کا نام عبادہ بن صامت ہے اور مہاجر کا نام حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہے۔ غرضیکہ ان دونوں حضرات نے باری مقرر کر لی۔ ایک صاحب سو گئے دوسرے پہرہ دینے لگے اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اتنے میں ایک کافر نے موقع تاک کر تیر مارا اور انہوں نے تیر کو جسم سے نکال دیا اور بدستور نماز میں مصروف رہے۔ اتنے دوسری بار تیر مارا اور یہ تیر کو جسم سے نکال کر نماز میں بدستور مصروف رہے۔ پھر تیسری بار تیر مارا۔ جب نماز پوری کر لی تو اپنے ساتھی کو جگایا۔ انہوں نے زخم سے خون بہتا دیکھا تو کہا تم نے مجھے پہلے تیر پر کیوں نہ جگایا۔ انصاری نے جواب دیا۔ بات یہ تھی کہ میں قرآن پاک کی ایک سورۃ پڑھنے میں محو تھا۔ اس لیے اس کو موقوف کرنا اچھا نہ لگا۔

۱۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، امام احمد نے مسند میں، دارقطنی نے سنن میں بیان کیا ۲۔ ارشاد حسین نے فرمایا کہ اس حدیث سے امام بخاری نے یہ بتایا ہے کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعد اثر حسن بصری کو ذکر کیا ہے کہ مسلمان اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔ لیکن یہ استدلال تام نہیں ہے۔ اوّل تو یہ معلوم نہیں کہ انصاری کے اس فعل کی اطلاع حضور علیہ السلام کو ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو پھر آپ نے اس کو جائز رکھا یا ناجائز؟ ثانیاً بہتے خون کا ناپاک و نجس ہونا قطعی اجماعی مسئلہ ہے۔ جب ان کے تیر لگا اور خون نکلا تو کپڑے اور جسم خون میں ملوث ہوئے تو امام شافعی کے نزدیک اگر تھوڑا خون بھی بدن یا کپڑے کو لگ جائے تو نماز نہیں ہوتی اور اگر یہ کہا جائے کہ زخم سے خون اس طرح نکلا ہوگا کہ بدن محفوظ رہا ہو؟ لیکن اگر ایسا ہوا ہو تو یہ بڑی عجیب بات ہوگی۔ جب کہ ان کے جسم کا خون سے محفوظ رہنا بعید از عقل ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زخم سے خون بہنے کے باوجود نماز میں مشغول رہنا ایک جذباتی فعل ہے۔ اس سے حکم فقہی اخذ نہیں کیا جا سکتا اور ان کا اپنے ساتھی کو کنت فی سورۃ اقرءھا فلم احب اقطعھا کے الفاظ سے جواب دینا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ وہ مشاہدہ حق میں غرق تھے۔ انہیں قرآن کریم کی قرأت میں لطف آ رہا تھا۔ یہ ایسے ہے جیسے قرآء صحابہ میں سے ایک صحابی جب شہید ہوئے اور خون نکلا تو وہ اپنے چہرہ پر ملنے لگے اور فرماتے تھے۔ (فُزْتُ وربِّ الکعبہ (بخاری) لیکن ان کے اس عاشقانہ انداز کو کسی امر کی دلیل نہیں بنایا گیا اور نہ اس پر کوئی تنقید کی گئی۔ ۲۔ حضرت حسن بصری کا یہ فرمانا کہ مسلمان زخموں کی حالت میں بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔" اس کو بھی اس امر کی دلیل بنانا کہ جسم سے خون نکلنے سے وضو نہیں جاتا درست نہیں ہے۔ جس کا بیان ابھی آتا ہے۔

وَقَالَ الْحَسَنُ مَا زَالَ الْمُسْلِمُوْنَ يُصَلُّوْنَ فِيْ جِرَاحَاتِهِمْ

اور حسن بصری نے کہا۔ مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔

وائد و مسائل حضرت حسن بصری کے اس اثر سے بھی امام شافعی نے استدلال فرمایا کہ "خروج دم من غیر السبیلین ناقض وضو نہیں ہے۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ اثر بصری سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ "زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ زخم تھا مگر اس سے خون بہتا نہیں تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں ہشیم سے انھوں نے یونس سے، انھوں نے حسن بصری سے روایت کیا کہ حسن بصری کے نزدیک جب خون نکل کر بہے تو ناقض وضو ہے (اسنادہ صحیح) اور احناف کا یہی مسلک ہے کہ محض خون کے ظہور سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ جب خون نکل کر بہے تو وہ وضو توڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ طَاؤُسٌ وَمُحَمَّدٌ وَ عَلِيٌّ وَعَطَاءٌ وَاَهْلُ الْحِجَازِ لَيْسَ فِي الدَّمِ وُضُوْءٌ وَعَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ وَبَزَقَ ابْنُ اَبِيْ اَوْفٰی دَمًا فَمَضٰی فِيْ صَلٰوتِهٖ

طاؤس اور امام محمد باقر اور عطاء اور اہل حجاز نے کہا خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور عبداللہ بن عمر نے ایک پھنسی کو دبایا اس میں سے خون نکلا۔ پھر وضو نہیں کیا اور ابن ابی اوفیٰ صحابی نے خون تھوکا مگر نماز میں بدستور مشغول رہے۔

ائد و مسائل حضرت طاؤس و محمد و ابن عمر و ابن ابی اوفیٰ کے ان اقوال سے بھی یہ استدلال کیا گیا کہ غیر سبیلین سے اگر خون نکلے تو ناقضِ وضو نہیں ہے لیکن یہ اقوال بھی حنفیہ کے مسلک کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ

۱۔ حضرت طاؤس و محمد کے اثر کا مطلب یہ ہے کہ محض خون کے ظاہر ہونے سے وضو نہیں جاتا اور حنفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خون کے ظہور سے نہیں بلکہ سیلان سے وضو ٹوٹتا ہے اور اس میں بہنے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ حضرت ابن عمر نے پھنسی کو دبایا۔ خون نکلا مگر انہوں نے وضو نہیں کیا؛ اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ وہ خون بہہ کر جگہ پہنچ گیا تھا۔ جس کا وضو و غسل میں دھونا فرض ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خون صرف ظاہر ہوا ہو بہا نہ ہو۔ غرضیکہ یہ بھی تمام نہیں ہے۔

۳۔ اور حضرت ابی اوفیٰ نے خون تھوکا مگر اس کے باوجود نماز میں مشغول رہے۔ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ تھوک پر

خون غالب تھا؟ ہو سکتا ہے کہ تھوک غالب ہو اور حنفیہ کے نزدیک بھی اگر کوئی تھوکے اور خون ظاہر ہو تو وضو اس صورت میں ٹوٹے گا جب کہ خون تھوک پر غالب ہو۔

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ وَالْحَسَنُ فِيْمَنِ احْتَجَمَ لَيْسَ عَلَيْهِ اِلَّا غَسْلُ مَحَاجِمِهٖ

اور ابن عمر و حسن بصری نے کہا جو کوئی پچھنے لگائے تو اس پر سوائے پچھنے کی جگہ کے دھونے کے اور کچھ نہیں ہے

فوائد و مسائل

۱۔ حضرت ابن عمر کے اثر کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب پچھنے لگواتے تو پچھنے کی جگہ کو دھوتے اور حسن بصری کے اثر کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حسن بصری سے کسی نے پوچھا کہ پچھنے لگوانے والے پر کیا لازم ہے آپ نے فرمایا۔ پچھنے کے مقامات کو دھو ڈالے۔ اس سے امام شافعی نے یہ استدلال فرمایا کہ غیر سبیلین سے اگر خون نکلے تو وہ ناقض نہیں ہے۔ لیکن حنفیہ یہ کہتے ہیں یہ دونوں اثر بھی ہمارے مسلک کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ پچھنے کی جگہ سے خون نکل کر بہا بھی تھا اور جب تک خون ظاہر ہو کر بہے وضو نہیں ٹوٹتا۔ گویا حضرت ابن عمر و حسن بصری کے اس فتوی کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے پچھنے لگوائے اور خون ظاہر ہوا اور بہا نہیں بلکہ محاجم پچھنے لگنے کی جگہ تک محدود رہا تو یہ ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اس باب میں متعدد مرفوع حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من اصابه قئ او رعاف او قلس او مذی فلينصرف فليتوضا

(دار قطنی، ابن ماجہ)

جس کو قے آ جائے یا نکسیر آئے یا منہ بھر کر قے آئے یا مذی نکلے تو وہ نماز کو چھوڑے، وضو دوبارہ کرے پھر آ کر بنا کرے

۲۔ امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ سات باتوں سے وضو لازم ہے پیشاب کا آنا، منہ بھر کر قے آنا، کروٹ پر سونا، نماز میں قہقہہ لگانا اور خون کا بہنا۔

۳۔ حضرت سلمان کہتے ہیں میری ناک سے خون بہا تو حضور علیہ السلام نے دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا۔ اس مضمون کی نہیں متعدد حدیثیں ہیں۔ اسی طرح آثارِ صحابہ و تابعین بھی بہت ہیں جن میں صاف صاف اس امر کا بیان ہے کہ خون ہے تو ناقضِ وضو ہے۔ چنانچہ عشرہ مبشرہ حضرت ابن مسعود و ابن عمر و زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، ابو الدرداء، زہری، علقمہ، اسود، عامر، شعبی، عروہ ابن زبیر، نخعی، قتادہ، حکم بن عیینہ، حماد ثوری، حسن بن صالح بن حی حیس، اوزاعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ و امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے جلیل القدر صحابہ کا یہی مسلک ہے کہ سبیلین کے علاوہ بھی اگر جسم کے کسی حصے سے خون نکل کر بہے تو وہ ناقضِ وضو ہے۔ اب اگر اس باب کی مرفوع حدیثوں میں بھی علماء نے کلام کیا ہے تو احتیاط پھر بھی مسلکِ حنفیہ کے اختیار کرنے ہی میں ہے

کن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے اور کن سے نہیں، ائمہ کا اختلاف اور انکے دلائل کا تفصیلی بیان

واضح ہو کہ جو چیزیں علماء حدث

ے نکلنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے وہ یہ ہیں :- پاخانہ، پیشاب، منی، دُبر سے ہوا کا نکلنا، حیض و نفاس، مذی کا نکلنا، جنون، بیہوشی، نشہ اور ذیل کی چیزیں باختلافِ علماء حدث ہیں (۱) قبل و دُبر سے خلافِ معمول کسی چیز کا نکلنا جیسے خون، کیڑا، پتھر کنکر وغیرہ (۲) قبل و دُبر کے علاوہ جسم کے کسی حصہ سے خون یا پیپ کا نکلنا (۳) قے کرنا (۴) غشی آنا (۵) قبل و دُبر کو چھونا (۶) سونا (۷) استحاضہ یا بواسیر کا خون نکلنا (۸) عورت کا چھونا (۹) آگ کی پکی ہوئی چیز کھانا (۱۰) اونٹ کا گوشت کھانا۔ یہ دس امور وہ ہیں جن کے حدث ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل یہ ہے :-

مُنہ بھر قے ناقضِ وضوء ہے

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلک یہ ہے کہ قے ناقضِ وضوء ہے۔ یعنی وہ قے جو منہ بھر کر ہو یعنی جس کو آدمی بے تکلیف روک نہ سکے خواہ پانی کی ہو یا صفراء کی، وضوء توڑ دے گی۔ اسی طرح بہتے خون کی قے بھی ناقضِ وضوء ہے اور یہ قے نجس ہے۔ قے میں یہ بھی شرط ہے کہ ایک ہی مجلس میں آئے تو اگر تھوڑی تھوڑی قے چند بار آئی کہ اس کا مجموعہ مُنہ بھر ہے۔ تو اگر ایک ہی متلی سے ہے تو وضوء توڑ دے گی اور اگر متلی جاتی رہی اور اس کا کوئی اثر نہ رہا۔ پھر نئے سرے سے متلی شروع ہوئی اور قے آئی۔ دونوں مرتبہ کی علیحدہ علیحدہ منہ بھر نہیں ہے مگر دونوں جمع کی جائیں تو منہ بھر ہیں تو ناقضِ وضوء نہیں۔ صرف بلغم کی قے خواہ منہ بھر ہو ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ امام کی دلیل متعدد ایسی حدیثیں ہیں جن میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جس کو قے آجائے نکسیر چھوٹے تو وہ دوبارہ وضوء کرے (۲) حضرت امام شافعی، امام باقر و صادق رضی اللہ تعالےٰ عنہم یہ کہتے ہیں کہ قے ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ امام شافعی کی دلیل حدیثِ ثوبان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے قے فرمائی۔ پھر وضوء کے لیے پانی مانگا اور وضوء فرمایا۔ میں نے عرض کی۔ حضور کیا قے سے وضوء فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر فرض ہوتا تو قرآنِ کریم میں اس کا ذکر ہوتا (دارقطنی) لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث لائقِ معارضہ نہیں ہے دارقطنی نے فرمایا کہ اس کی اسناد میں عتبہ بن سکن ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔

بیہوشی بھی ناقضِ وضوء ہے

بے ہوشی، جنون اور غشی اور اتنا نشہ کہ چلنے میں پاؤں لڑکھڑا جائیں ناقضِ وضوء ہے علامہ نووی نے فرمایا اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ عقل کے جاتے رہنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔ جیسے جنون، بیہوشی، نشہ خواہ شراب کا ہو یا کسی اور چیز کا اور علت اس مسئلہ میں زوالِ قوتِ ماسکہ ہے جو حدث کا سبب خفی ہے۔

مسِ ذکر و قبل ناقضِ وضوء نہیں

امام شافعی و مالک و احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ بلا حائل شرمگاہ کو چھونے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے یہ حضرات متعدد حدیثوں سے دلیل لیتے ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا :-

مَنْ مَسَّ فَرْجَهٗ فَلْيَتَوَضَّاْ	جو شرمگاہ کو چھوئے وضوء کرے

یا، بسرہ بنت صفوان سے روایت ہے وہ کہتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

يَأْمُرُ بِالْوُضُوْءِ مِنْ مَسِّ الْفَرْجِ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)	شرمگاہ کو چھونے پر وضوء کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

لیکن حضرت امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے اس باب کی احادیث پر مفصل بحث کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہے کہ ان کے راویوں میں کوئی ضعیف ہے اور کوئی منکر، کوئی مدلس ہے اور کوئی منقطع۔ لہٰذا ان سے استدلال درست نہیں ہے اس کے علاوہ قیاسِ جلی صحابہ کرام وتابعین عظام کا تعامل اور دوسرے آثار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، کے مسلک کی تردید کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس ایسے جلیل القدر فقہاء صحابہ مسِ فرج کو نہیں قرار دیتے اور تفقہ جودتِ ذہن واصابتِ رائے اور قربِ نبوی کے لحاظ سے ان حضرات کو جو ممتاز مقام و مرتبہ ہے وہ ان کو نہیں ہے جو مسِ فرج کو ناقضِ وضوء قرار دیتے ہیں۔ حضرت ربیعہ نے جب بسرہ کی حدیث سنی کہ مسِ ذکر سے ٹوٹ جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کیا اگر کوئی شخص خونِ حیض کو ہاتھ لگا دے تو اس کا وضوء ٹوٹ جائیگا؟ یعنی خونِ حیض کو مسِ ذکر سے کہیں بھاری ہے۔ لیکن خونِ حیض میں اگر ہاتھ ملوث ہو جائے تو وضوء نہیں جاتا۔ پھر مسِ ذکر سے کیسے غرضیکہ حضرت علی، ابن مسعود، عمار، حسن بصری، ربیعہ، عبداللہ بن عمرو، عبداللہ بن عباس، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ مسِ فرج ناقضِ وضوء نہیں، امام اعظم بھی متعدد آثار سے استدلال فرماتے ہیں۔ جن میں سے ہیں (۱) قیس ابن طلق کے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:۔

أَفِي مَسِّ الذَّكَرِ وُضُوْءٌ؟ قَالَ لَا	حضور شرمگاہ کے چھونے پر وضوء ہے؟ آپ نے فرمایا

(۲) انہیں سے دوسری حدیث ہے۔

قَالَ يَا نَبِيَّ اللهِ مَا تَرَىٰ فِي مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهُ بَعْدَ مَا تَوَضَّأَ فَقَالَ هَلْ هُوَ اِلَّا بُضْعَةٌ مِنْكَ (طحاوی باب الوضوء مس الفرج)	حضور اگر وضوء کرنے کے بعد آدمی اپنی شرمگاہ کو لگائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضور نے فرمایا۔ وہ تمہارے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔

امام طحاوی نے فرمایا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ مستقیم الاسناد ہے اور اس میں کچھ اضطراب نہیں ہے۔ غرضیکہ کی متعدد حدیثیں ہیں جو مسلک احناف کی دلیل ہیں۔ تفصیل کے لیے طحاوی، نیل الاوطار کا مطالعہ مفید رہے گا۔

نیند ناقضِ وضوء ہے

علامہ نووی نے فرمایا۔ نیند کے ناقضِ وضوء ہونے یا نہ ہونے میں آٹھ مذہب

مذہب اول:۔ ابوموسیٰ اشعری، سعید ابن مسیب، ابومجلز اور حمید اعرج نزدیک نیند مطلقاً ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ ان کی دلیل حدیث انس ہے (۱) وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول علیہ وسلم عشاء کے انتظار میں مسجد میں بیٹھے رہتے۔ حَتّٰى تَخْفِقُ رُؤُوْسُهُمْ ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّئُوْنَ یہاں تک ان کو نیند کی وجہ سے جھونکے آتے۔ پھر وہ بغیر وضوء کیے نماز پڑھ لیتے۔ اس حدیث کو امام شافعی بھی روایت کیا اور مسلم اور ترمذی نے بھی اور امام ابوداؤد نے روایت شعبہ عن قتادہ میں علی عهد رسول الله علیه وسلم کے لفظ زیادہ کیے اور ترمذی نے طریق شعبہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۲۔ لَقَدْ رَأَيْتُ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْقَظُوْنَ بِالصَّلٰوةِ حَتّٰى اِنِّي	میں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز کے لیے بیدار کیے جاتے یہاں تک کہ میں ان

لا يسمعُ لاحدهم غطيطًا ثم يقومون و يُصلّون ولا يتوضّؤن

بعض کے خراٹے سُنتا۔ پھر وہ کھڑے ہوتے اور نماز پڑھتے اور وضو نہ کرتے۔

ابن مبارک نے فرمایا۔ ہمارے نزدیک اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ وہ صحابہ بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ امام بیہقی نے فرمایا کہ امام شافعی اور عبدالرحمٰن بن مہدی نے بھی اس حدیث کا یہی مطلب لیا ہے کہ صحابہ کا مسجد میں نماز کے انتظار میں سونا بحالتِ قعود تھا۔ چنانچہ وہ روایت جس میں جھونکے کھانے کا ذکر ہے اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ جھونکا بحالتِ قعود ہی متصور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تاویل کی تردید یحییٰ بن قطان کی روایت سے ہو جاتی ہے۔ قتادہ حضرت انس سے روایت تے ہیں کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے انتظار میں رہتے۔

۲۔ فَیَضَعُوْنَ جُنُوْبَھُمْ فَمِنْھُمْ مَنْ نَامُ ثُمَّ یَقُوْمُ اِلَى الصَّلٰوةِ

پھر بعض ان میں سے کروٹ کے بل سو جاتے اور نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔

ابن دقیق العید نے کہا۔ یہ سونا محمول ہے نومِ خفیف پر۔ یعنی وہ پوری طرح نہیں سوتے تھے لیکن اس تاویل کی تردید وایت ترمذی سے ہو جاتی ہے جس میں غطیط کا لفظ موجود ہے یعنی ان سے خراٹے بھرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس سے اس امر تردید ہوتی ہے کہ ان کا سونا نومِ خفیف تھا۔ ہاں ترمذی نے بندار سے اور امام احمد نے طریق یحییٰ القطان سے جو روایت کی ہے ں میں کروٹ کے بل سونے کے الفاظ نہیں ہے۔ لیکن بیہقی بزار اور خلال کی روایت میں خط کشیدہ لفظ موجود ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ تمام روایتیں حضور علیہ السلام کا قول نہیں۔ بلکہ حضرت انس کا مشاہدہ ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ور علیہ السلام نے ان صحابہ کی (جو سو گئے خواہ بحالتِ جلوس سو گئے ہوں یا کروٹ کے بل اور پھر بغیر وضو کئے نماز کے لیے ے ہو گئے) نماز کو جائز قرار دیا یا ناجائز۔ (وفیہ نظر)

ہب دوم۔ حضرت حسن بصری، مزنی، ابوعبید قاسم بن سلام، اسحاق بن راہویہ۔ ابن منذر اور حضرت ابن س و ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے خواہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ ان حضرات یل حدیث صفوان و علی و معاویہ ہے:۔

۱۔ صفوان ابن عسال کہتے ہیں:۔

رَسُوْلُ اللّٰهِ یَاْمُرُنَا اِذَا كُنَّا سَفَرًا لَا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ لِیَھُنَّ اِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ لٰكِنْ غَائِطٍ وَّبَوْلٍ وَّنَوْمٍ (احمد نسائی، ترمذی وصححہ)

کہ حضور علیہ السلام ہمیں بحالتِ سفر تین دن رات موزے نہ اُتارنے کا حکم دیتے تھے مگر جنابت سے (یعنی جنبی ہو جانے پر اُتارنے کا حکم تھا) لیکن پاخانہ و پیشاب اور نیند سے موزہ اُتارنے کا حکم نہ دیتے تھے

حضرات کہتے ہیں کہ اس حدیث میں نیند کو بھی ناقضِ وضو قرار دیا گیا ہے۔ جیسے پاخانہ و پیشاب کا آنا ناقضِ وضو ہے لہذا سی حالت میں ہو کم ہو یا زیادہ ناقضِ وضو ہے۔

۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

اَلْعَیْنُ وِکَاءُ السَّہِ فَمَنْ نَامَ فَلْیَتَوَضَّأْ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)	آنکھ، یہ پچھلے حصہ کی بندش ہے جب آدمی سو جائے تو دوبارہ وضو کرے

۳۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلْعَیْنُ وِکَاءُ السَّہِ فَاِذَا نَامَتِ الْعَیْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِکَاءُ (احمد و دار قطنی)	کہ آنکھ دُبر کی بندش ہے۔ جب آنکھیں سو جاتی ہیں تو بندش کھل جاتی ہے (ڈھیلی ہو جاتی ہے)

اگرچہ حدیث ۲، ۳ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کو ضعیف تک قرار دیا گیا ہے مگر حدیث ۱ ان دونوں کے مفہوم کی تائید و توثیق کرتی ہے اور حدیث ۱ کی صحت پر سب کا اتفاق ہے۔ حدیث ۱ کو ابن ماجہ، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا۔ "امام ترمذی نے امام بخاری سے نقل کیا کہ یہ حدیث حسن ہے"۔ اس کی اسناد میں عاصم بن ابی جن کی ایک جماعت نے متابعت کی اور چالیس سے زیادہ افراد نے عاصم سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ تینوں مرفوع حدیثوں سے نیند کا ناقضِ وضو ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذہب سوم ۔ امام زہری، ربیعہ اوزاعی اور امام مالک و امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ نوم کثیر ناقضِ وضو ہے۔ لیکن قلیل ہر صورت میں ناقضِ وضو نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل حدیثِ انس ہے جو اوپر جا چکی ہے۔ جس کو یہ حضرات نوم خفیف پر محمول کرتے ہیں اور ایک یہ حدیث ہے جس کو امام بیہقی نے روایت کیا۔

مَنْ اسْتَحَقَّ النَّوْمَ فَعَلَیْہِ الْوُضُوْءُ	جو اتنا سوئے کہ لوگ اس کو سویا ہوا کہیں وہ وضو کرے۔

مذہب چہارم ۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رکوع و سجود میں سو جائے تو وضو جاتا رہے گا، صاحب بدر التمام و صاحب سبل السلام نے اس مذہب کو یوں ذکر کیا ہے۔ سونا ناقضِ وضو ہے مگر رکوع و سجود کی میں سونا ناقضِ وضو نہیں ہے اور ان کی دلیل حدیث اذا نام العبد فی صلاتہ ہے۔

مذہب پنجم ۔ یہ کہ نیند ناقضِ وضو نہیں ہے، مگر سجدہ کی حالت میں سونے سے وضو جاتا رہے گا۔ امام احمد بن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے۔

مذہب ششم ۔ نماز میں کسی صورت سونے سے وضو نہیں جاتا اور خارج صلوٰۃ ہر صورت و شکل پر سونا ناقض ہے۔ یہ زید ابن علی کا قول ہے اور یہ حدیث اذا نام العبد فی صلاتہ سے استدلال کرتے ہیں۔

مذہب ہفتم ۔ اگر زمین پر اس طرح بیٹھ کر سوئے کہ سرین زمین پر جم جائیں تو یہ ناقضِ وضو نہیں ہے۔ خواہ نوم قلیل یا کثیر، نماز میں ہو یا خارج نماز۔ اس کے علاوہ سب شکلوں میں نیند ناقضِ وضو ہے۔ علامہ نووی کہتے ہیں یہ امام شافعی کا

مذہب ہشتم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ و داؤد یہ فرماتے ہیں کہ رکوع و سجدہ قعود کی شکل میں سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور کروٹ سے یا چت سو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یعنی امام کے نیند ناقضِ وضو ہے (۱) ایسا سویا کہ سرین زمین پر خوب نہ جمے، یا (۲) ایسی ہیئت پر سویا جو غافل ہو کر سونے

نہ ہو۔ مثلاً اکڑوں بیٹھ کر سویا یا پیٹھ یا کروٹ پر لیٹ کر یا کسی پر تکیہ لگا کر یا بیٹھ کر سویا مگر ایک کروٹ کو جھکا کر کہ ایک یا دونوں سرین اُٹھے ہوئے ہوں یا ننگی پیٹھ پر سوار ہے کہ جانور نشیب میں اُتر رہا ہے یا دو زانو بیٹھا اور پیٹ رانوں پر رکھا کہ دونوں سرین جمے نہ رہیں یا چار زانو ہو کر سویا اور سر زانو یا پنڈلیوں پر ہے یا جس طرح عورتیں سجدہ کرتی ہیں۔ اسی شکل پر سوگیا۔ ان سب صورتوں میں سونے سے وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نماز میں ان صورتوں میں سے کسی صورت پر قصداً سویا تو نماز بھی گئی اور وضو بھی دوبارہ کر کے نماز پڑھے اور اگر بلا قصد سویا تو وضو۔ جاتا رہا نماز نہیں گئی۔ دوبارہ وضو کر کے جس رکن (سجدہ یا رکوع وغیرہ) میں سویا تھا، وہاں سے نماز ادا کرے۔ بہتر یہی ہے کہ از سر نو نماز کی نیت باندھ کر پوری نماز پڑھے (۳) دونوں سرین زمین پر یا تخت پر ہیں اور دونوں پاؤں ایک طرف پھیلے ہوئے یا دونوں سرین پر بیٹھا ہے اور گھٹنے کھڑے ہیں اور ہاتھ پنڈلیوں پر محیط ہوں خواہ زمین پر ہوں۔ دوزانو سیدھا بیٹھا ہو یا چار زانو پالتی مارے یا زمین پر سوار ہو یا ننگی پیٹھ پر سوار ہے مگر جانور چڑھائی چڑھ رہا ہے یا راستہ ہموار ہے یا کھڑے کھڑے یا رکوع کی حالت میں یا مردوں کے سجدہ مسنونہ کی شکل پر سویا، ان سب شکلوں پر سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ نماز میں اگر یہ صورتیں پیش آئیں تو نہ وضو جائے گا اور نہ نماز۔ ہاں اگر پورا رکن سوتے ہی میں ادا کیا تو اس کا اعادہ واجب ہے اور اگر جاگتے میں شروع کیا، پھر سو گیا، تو اگر جاگتے میں بقدر کفایت رکن (یعنی سجدہ، رکوع وغیرہ) ادا کر چکا ہے تو وہی کافی ہے ورنہ پورا کرے (۴) اونگھنے یا بیٹھے بیٹھے جھونکے لینے سے وضو نہیں جاتا۔ نماز وغیرہ کے انتظار میں بعض مرتبہ نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اگر غلبہ ایسا ہے کہ پہلی آواز میں بیدار نہیں ہوتا تو اس پر وضو لازم ہے اور اس معاملے میں اپنے خیال کا اعتبار نہیں۔ اگر معتبر شخص یہ کہے کہ تو غافل تھا۔ تجھے پکارا جواب نہ دیا یا مجلس کی باتیں جو اس کی غفلت میں ہوئیں پوچھی جائیں اور بتا نہ سکے تو ایسے شخص پر وضو دوبارہ کرنا لازم ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے مسلک کی احادیث یہ ہیں (۱) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سو رہا تھا۔ رات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں آپ کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ حضور نے مجھے اپنے داہنے طرف کھڑا کیا۔

فَجَعَلْتُ اِذَا اَغْفَيْتُ يَاخُذُ بِشَحْمَةِ اُذُنِيْ (مسلم و بخاری)	جب میں اُونگھتا تو آپ میرے کان کی لو پکڑ کر (جگاتے)

یہ حدیث بھی امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کی دلیل ہے کہ نماز کی حالت میں اونگھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) امام بیہقی علیہ الرحمۃ نے یزید بن قلیط سے انہوں نے جناب ابوہریرہ سے روایت کیا، آپ نے فرمایا۔

لَيْسَ عَلَى الْمُحْتَبِيْ النَّائِمِ وَلَا عَلَى الْقَائِمِ النَّائِمِ وُضُوْءٌ حَتّٰى يَضْطَجِعَ فَاِذَا اضْطَجَعَ تَوَضَّاء	جو شخص دونوں پاؤں کھڑا کر کے سرین پر سو جائے یا کھڑے کھڑے سو جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا یہاں تک کہ کروٹ سے سو جائے اور جب کروٹ سے لیٹ کر سوئے گا (تو وضو ٹوٹ جائیگا) وضو کرے۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا۔ اس کی اسناد جید اور حدیث موقوف ہے۔ یہ حدیث بھی امام کی دلیل ہے۔ اس سے واضح ہوا

ہے کہ کھڑے کھڑے سوئے اور سرین پر بیٹھ جائے اور گھٹنے کھڑے ہوں۔ اس حالت پر سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے کروٹ سے سونا ناقضِ وضو ہے۔ (۳) صفوان بن عسال کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام ہمیں حکم دیا کرتے تھے :۔

وَلٰكِن مِن غَائِطٍ وَبَولٍ وَنَومٍ (ترمذی وصححہ)

کہ ہم موزے پاخانہ یا پیشاب، و نیند کے بعد نہ اتاریں۔

اس حدیث صحیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے پیشاب پاخانہ کا آنا ناقضِ وضو ہے۔ اسی طرح نیند بھی ناقضِ وضو ہے۔ رہا مذہب دوم والوں کا یہ کہنا کہ اس حدیث میں نیند کو مطلقاً ناقضِ وضو قرار دیا گیا ہے لہٰذا بحالت قیام قعود و رکوع سوجانا بھی ناقضِ وضو ہونا چاہئے تو جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں قیام و قعود کا ذکر نہیں ہے صرف نیند کے ناقضِ وضو ہونے کا بیان ہے۔ رہا "بحالت قیام و قعود رکوع و سجود میں سونا ناقضِ وضو نہیں ہے" یا "صرف اونگھنا ناقضِ وضو نہیں ہے" یہ بات دوسرے آثار سے ثابت ہے لہٰذا اگر اس حدیث میں عموم مانا جائے تو دوسری حدیث سے تخصیص کی جائے گی (۴) یزید ابن عبدالرحمٰن قتادہ سے وہ ابی العالیہ وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم نے فرمایا۔

لَيْسَ عَلٰى مَنْ نَامَ سَاجِدًا وُضُوْءٌ حَتّٰى يَضْطَجِعَ فَاِنَّهٗ اِذَا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُهٗ (احمد ترمذی دارقطنی ابوداؤد)

جو بحالت سجدہ سو جائے اس پر وضو نہیں یہاں تک کہ کروٹ سے سوئے، کیونکہ کروٹ سے سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔

(۵) لَا وُضُوْءَ عَلٰى مَنْ نَامَ قَائِمًا (دارقطنی)

جو کھڑے کھڑے سو جائے اس پر وضو نہیں ہے۔

(۶) لَا يَجِبُ الْوُضُوْءُ عَلٰى مَنْ نَامَ جَالِسًا اَوْ قَائِمًا اَوْ سَاجِدًا حَتّٰى يَضَعَ جَنْبَهٗ۔ (بیہقی)

جو کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے یا سجدہ کی حالت میں سو جائے اس پر وضو واجب نہیں یہاں تک کہ کروٹ سے سو جائے۔

یزید سے مراد یزید دالانی ہیں۔ امام احمد و نسائی نے کہا۔ یزید دالانی میں کوئی برائی نہیں۔ امام ذہبی نے مغنی میں کہا یہ مشہور ہیں اور ان کی حدیث حسن ہے۔ ابو حاتم نے فرمایا یزید ثقہ ہے مگر دوسرے لوگوں نے سخت جرح کی ہے اور ضعیف قرار دیا ہے (واللہ اعلم) تفصیل کے لیے نیل الاوطار جلد ۱ صـ ۹۳، ۹۴ دیکھئے۔ بحالت سجدہ سونے میں وضو نہیں ٹوٹتا مگر اس سجدہ سے مراد سجدہ مسنونہ ہے جو نماز میں کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سجدہ میں کچھ استمساک باقی رہتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ نیند ناقضِ وضو نہیں ہے مگر نیند کو ناقضِ وضو اس لیے قرار دیا گیا کہ سونے سے آدمی بے خبر ہو جاتا ہے اور اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور عادۃً استرخاء اعضاء کے سبب ہوا کے نکل جانے پر ظنِ غالب ہوتا ہے اور جو بات عادۃً ثابت ہو وہ مثل تیقن کے ہوتی ہے تو اب کوئی شخص ایسا ہو جو نیند کی حالت میں بھی کامل طور پر غافل نہیں ہوتا اور گرد و پیش کے حالات کی خبر رہتی ہے اس کی نیند ناقضِ وضو نہ ہوگی۔ مگر یہ بات عام لوگوں میں عادۃً نہیں پائی جاتی۔ اس لیے نیند کو ناقضِ وضو ہی قرار دینا پڑے گا۔ امام نووی علیہ الرحمۃ نے شرح مسلم میں مذکورہ بالا آٹھ مذاہب کا ذکر کرنے کے بعد

ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ زوالِ عقل، جنون، بیہوشی اور نشہ ناقضِ وضو ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے یہ بھی ہے کہ آپ کا کروٹ سے سونا ناقضِ وضو نہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہوا حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کروٹ سے سوئے پھر بغیر وضو کئے آپ نے نماز پڑھی (انتہی)۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام کی نیند آپ پر غفلت و بے خبری کو طاری نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے استفسار پر حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا ہے۔

استحاضہ و بواسیر کا خون ناقضِ وضو ہے

بعض مالکیہ کا قول ہے کہ سبیلین سے خلافِ عادت جو چیز خارج ہو وہ ناقضِ نہیں ہے۔ مثلاً کنکر، پتھر، ریت، کیڑا وغیرہ کا نکلنا کیونکہ سبیلین سے جو چیز بھی خارج ہو خواہ معتاد ہو یا غیر معتاد بہر صورت ناقضِ وضو ہے۔ لہٰذا بواسیر کا خون اور استحاضہ کا خون ناقضِ وضو قرار پائے گا۔ استحاضہ اس خون کو کہتے ہیں جو عورت کی شرمگاہ سے کسی مرض کی وجہ سے آتا ہے۔ اب اگر استحاضہ اس حد تک پہنچ گیا اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وضو سے فرض نماز ادا کر سکے تو نماز کا پورا ایک وقت شروع سے آخر تک اسی حالت میں گزر جانے پر اس کو معذور قرار دیا جائیگا۔ اب وہ ایک وضو سے اس وقت میں جتنی نمازیں (فرض و واجب قضا، و نفل) چاہے پڑھے اس خاص صورت میں خون آنے سے اس کا وضو نہیں جائیگا۔ یہی حکم ہر شخص کا ہے جس کو کوئی ایسی بیماری ہے کہ ایک وقت پورا ایسا گزر گیا کہ وضو کے ساتھ نماز فرض ادا نہ کر سکا وہ معذور ہے۔ جیسے قطرہ کا مرض ہو یا دست آنا، یا ہوا خارج ہونا، یا دکھتی آنکھ سے پانی گرنا یا پھوڑے یا ناسور سے ہر وقت رطوبت بہنا یا کان سے ہر وقت رطوبت نکلنا کہ یہ سب بیماریاں وضو توڑنے والی ہیں۔ ان میں جب پورا وقت ایسا گزر گیا کہ ہر چند کوشش کی مگر وضو کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکا تو عذر ثابت ہوا۔ ایسے لوگ ہر نماز کے لیے وضو کریں اور اس ایک وضو سے جب تک اس نماز کا وقت موجود ہے اس میں جتنی نمازیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تمام مسائل متعدد حدیثوں سے اخذ کئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے استحاضہ کی بیماری ہے اور خون بند نہیں ہوا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

امرها ان تدع الصّلٰوة ايام اقرائها ثمّ تغتسل وتوضأ لكل صلوٰة و تصلى وان قطر الدّمُ على الحَصير

(بخاری و مسلم و طحاوی)

کہ وہ صرف حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھیں جب حیض کے دن پورے ہو جائیں تو غسل کریں اس کے بعد ہر نماز کے لیے تازہ وضو کریں اور نماز پڑھیں۔ اگرچہ یہ خون چٹائی پر ہی کیوں نہ ٹپک جائے۔

یہ اور اس مضمون کی متعدد حدیثیں واضح کرتی ہیں کہ سبیلین سے جو چیز بھی خارج ہو خواہ وہ معتاد ہو یا غیر معتاد بہر حال ناقضِ وضو ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس کو استحاضہ کی بیماری ہو، تو ایسی عورت کو چاہیئے کہ صرف ایام حیض میں نماز نہ پڑھے، جب حیض کی مدت پوری ہو جائے تو غسل کرلے اور اس کے بعد ہر نماز کے لیے وضو کرے اور نماز پڑھے جس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

عورت کو چھونا ناقضِ وضو نہیں ہے

اس مسئلہ میں بھی علماء و آئمہ کا اختلاف ہے۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود و ابن عمر و زہری و اور ان کے اصحاب اور زید ابن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ فرماتے ہیں کہ عورت کو چھونا ناقضِ وضو ہے خواہ شہوت سے عورت کو ہاتھ لگایا یا بغیر شہوت کے، خواہ عورت اجنبی ہو یا اجنبی نہ ہو۔ ان حضرات کی دلیل آیت اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً الخ ہے۔ یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں لمس سے مراد چھونا ہے۔ چنانچہ

۱۔ حضرت عمر اور عبداللہ ابن مسعود نے لمس کے معنیٰ ہاتھ سے چھونے کے کیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرمایا کرتے تھے عورت کا بوسہ لے یا چھوئے اس پر وضو ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ بوسہ لمس میں داخل ہے اور لمس سے وضو ہے۔ (بیہقی) ۲۔ حاکم نے فرمایا۔ لمس کے معنے چھونے کے ہیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ دن ایسا نہ ہوتا کہ حضور علیہ السلام ہمارے پاس تشریف لائیں اور بوسہ نہ لیں اور لمس نہ کریں۔ بیہقی نے حدیث ابوہریرہ استدلال کیا کہ ہاتھوں کا زنا لمس ہے اور ماعز کے واقعہ میں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ شاید تم نے بوسہ لیا ہو گا یا لمس کیا اس سے ثابت ہوا کہ لمس چھونے (ہاتھ لگانے) کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

احناف کا مسلک

حضرت علی و ابن عباس، عطاء، طاؤس، حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور حق یہ ہے کہ احناف کے دلائل اس مسئلہ میں بہت قوی

(۱) حنفیہ کہتے ہیں کہ آیت سے لمس سے مراد ہاتھ سے چھونا نہیں بلکہ جماع ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن حمید نے باسنادِ صحیح روایت کی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک لمس سے مراد جماع ہے اور تفسیر کے باب میں سیدنا ابن عباس کا قول ہے اور دیگر صحابہ حضرت عمر و ابن مسعود و ابن عمر کے قول کا درجہ نہیں ہے جو جناب ابن عباس کے قول کا ہے۔ اس کے احادیثِ مرفوعہ بھی اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (۲) رہا حدیثِ عائشہ و وقصہ ماعز رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے استدلال تو ان احادیث سے صرف اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ لمس کے معنیٰ ہاتھ چھونے یا بوسہ لینے کے بھی آتے ہیں، اور ہمیں اس سے انکار نہیں ہے۔ مَا بِهِ النِّزَاعُ تو یہ بات ہے کہ آیت میں لمس کے معنیٰ چھونے کے ہیں یا جماع کے تو حضرت ابن عباس نے اس کے معنیٰ جماع کے کیے اور ان کی تفسیر کا دیگر صحابہ کی تفسیر ارجح و اقویٰ ہونا ظاہر ہے۔

امام شافعی حدیثِ ذیل سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ اس شخص کے متعلق کیا حکم ہے جس نے ایک عورت سے سب کچھ کیا مگر جماع نہیں کیا تو اللہ تعالےٰ نے آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ الخ نازل فرمائی اور حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ توضأ ثم صل وضو کر اور پڑھ (احمد و دارقطنی)۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو ہاتھ لگانا یا بوسہ لینا وغیرہ ناقضِ ہے۔ حنفیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے۔ عبدالملک بن عمر عبدالرحمٰن بن ابی لیلےٰ سے وہ حضرت معاذ سے روایت کرتے ہیں لیکن عبدالرحمٰن کا حضرت معاذ سے سماع ثابت نہیں۔ اس حدیث کو عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے

کمافی النسائی اور صحیحین (بخاری و مسلم) نے اس حدیث کو روایت کیا ہے مگر اس میں یہ لفظ نہیں ہیں کہ حضور علیہ السلام نے اس کو وضو کرنے کا حکم دیا۔ علامہ شوکانی نے یہ لکھا کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عورت کو چھونا ناقضِ وضو ہے کیونکہ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام کے حکم دینے سے پہلے وہ شخص باوضو تھا اور یہ کہ وہ لمس سے پہلے باوضو تھا۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے اس کو وضو جاتے رہنے کی اطلاع دی (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۹۵) زیلعی علیہ الرحمۃ نے فرمایا یہ حدیث قابلِ حجت نہیں ہے۔ اول تو یہ ضعیف اور منقطع ہے۔ دوسرے ہو سکتا ہے کہ وضو کا حکم دینا گناہ کی معافی کے لیے ہو، نہ اس لیے کہ لمسِ امراۃ حدث ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں یہ ہے کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ عرض کی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو بخش دے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھی طرح وضو کر پھر دو رکعت پڑھ، پھر اللہ سے دعا کر۔ نیز علامہ زیلعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت میں لمس سے مراد چھونا لیتے تھے اس کو ابن عبدالبر نے ضعیف قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے۔ دراصل یہ قول حضرت عمر کا نہیں ہے بلکہ حضرت ابن عمر کا ہے۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ جن مرفوع حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک یہ ہیں۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُقَبِّلُ بَعْضَ أَزْوَاجِهِ ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ (ابوداؤد و نسائی)	کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض ازواجِ مطہرات کا بوسہ لینے کے بعد بغیر وضو فرمائے نماز ادا فرماتے تھے۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے مرسلاً روایت کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اس کے راویوں میں ابراہیم تیمی ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم کا جنابِ عائشہ صدیقہ سے سماع ثابت نہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ اس حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن عبدالبر اور ایک جماعت محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ راقم یہ کہتا ہے کہ اگر یہ حدیث مرسل یا ضعیف ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے علاوہ متعدد صحیح حدیثیں ہیں جو اس کے اصل مضمون کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نماز میں مصروف ہوتے اور میں آپ کے سامنے سو رہی ہوتی۔ آپ جب سجدہ فرماتے تو میرا پاؤں دبا دیتے۔ میں سمیٹ لیتی پھر جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پاؤں پھیلا دیتی (بخاری و مسلم) اس حدیثِ صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ مسِ امراۃ ناقضِ وضو نہیں ہے۔

آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا

علماء کا ایک طائفہ اس امر کا قائل ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ حضرات متعدد ایسی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جن کا مضمون یہ ہے کہ۔

(۱) ابراہیم بن عبداللہ بن قارظ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت ابوہریرہ کو مسجد میں وضو کرتے دیکھا تو ابوہریرہ نے کہا کہ میں نے پنیر کے ٹکڑے کھائے اس لیے وضو کر رہا ہوں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تَوَضَّؤُوا مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ (احمد، مسلم، نسائی) | وضو کرو، آگ کی پکی ہوئی چیزوں کے (کھانے سے)

تقریباً اسی مضمون کی دس پندرہ حدیثیں ہیں جو ابن ماجہ، نسائی، ابو داؤد، احمد ابن حنبل و طحاوی میں مختلف صحابۂ کرام حضرت انس، حضرت ابوہریرہ، زید ابن ثابت، ابو سلمہ، ابوطلحہ، ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں (دیکھو طحاوی نیل الاوطار ج ۱ صفحہ ۱۹۵) اس مضمون کی احادیث سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن احناف کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ وہ تمام حدیثیں جن میں آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے کو ناقض وضو قرار دیا گیا ہے منسوخ ہیں جیسا کہ اس باب کی دوسری حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل یہی تھا کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ خلفاء اربعہ، ابوبکر، عمر، عثمان و علی، عبداللہ بن مسعود، ابو درداء، ابن عباس، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جابر ابن سمرہ، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، ابی ابن کعب، ابوطلحہ، عامر بن ربیعہ، ابوامامہ، مغیرہ بن شعبہ، جابر بن عبداللہ، عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسے جلیل القدر صحابہ کرام، تابعین عظام، امام مالک و امام ابوحنیفہ امام شافعی و عبداللہ بن مبارک، امام احمد و اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ، ابوثور، ابوخیثمہ، سفیان ثوری، اہل حجاز، اہل رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قول یہ ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کا کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ یہ حضرات تقریباً اُنتیس حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن کو بخاری و مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، احمد، ابوداؤد و امام طحاوی نے ابن عباس، ابورافع، میمونہ، ام انس بن مالک، ام سلمہ، حضرت جابر ایسے صحابہ کرام سے روایت کیا جن کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بکری کا گوشت تناول فرمایا اور بغیر وضو کے نماز پڑھی اور آثار صحابہ و تابعین بھی بہت ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور عقل بھی یہ چاہتی ہے کیونکہ اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ آگ پر پکانے سے پہلے کسی چیز کا بھی کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ ٹھنڈے پانی سے وضو جائز ہے اور اسی طرح گرم پانی سے بھی جائز ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جن پاک چیزوں کو آگ پر پکانے سے پہلے کھانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ ان کا آگ پر پکانے کے بعد بھی ناقضِ وضو نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پانی سے وضو جائز ہے اور جب پانی گرم کر لیا جائے تو آگ اس پانی کے حکم میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتی۔ (تفصیل کے لیے نیل الاوطار (جلد اول و طحاوی) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اُونٹ کا گوشت کھانا ناقضِ وُضو نہیں ہے

علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبل، اسحاق بن یحییٰ بن یحییٰ، ابوبکر ابن المنذر اور ابن خزیمہ وغیرہ علماء کا یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ متعدد حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے حضرت جابر ابن سمرہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا ہم بکری کا گوشت کھا کر وضو کریں۔ آپ اگر جی چاہے تو وضو کرو ورنہ نہیں۔ اس شخص نے پھر سوال کیا:۔

أَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ قَالَ نَعَمْ (احمد، مسلم) | حضور اونٹ کا گوشت کھانے پر وضو کریں۔ فرمایا۔ ہاں

اور خلفاء اربعہ جناب صدیق اکبر و فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابن مسعود، ابی ابن کعب، ابن

بودرداء، ابوطلحہ، عامر بن ربیعہ، ابوامامہ، جمہور تابعین اور امام مالک وشافعی وامام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی حلال جانور کا پکا ہوا گوشت کھانا ناقضِ وضوء نہیں ہے خواہ وہ بکری کا گوشت ہو یا اونٹ کا۔ یہ حضرات حدیثِ جابر سے استدلال کرتے ہیں:۔

نَّ آخِرَ الْاَمْرَيْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا غَيَّرَتِ نَّارُ (طحاوی)

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر حکم آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے پر وضوء نہ کرنا تھا۔

اور اس میں بکری اور اونٹ دونوں کے گوشت شامل ہیں۔ تو جب بکری کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اونٹ گوشت کھانے سے بھی نہیں ٹوٹے گا کیونکہ بلحاظِ طہارت گوشت دونوں مساوی ہیں لہٰذا ان کے احکام میں بھی مساوات ہوگی (وفیہ نظر)

۱۷۵- عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الْعَبْدُ فِيْ صَلٰوةٍ مَا كَانَ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلٰوةَ مَا لَمْ يُحْدِثْ فَقَالَ رَجُلٌ اَعْجَمِيٌّ مَا الْحَدَثُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ الصَّوْتُ يَعْنِي الضَّرْطَةَ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ ہمیشہ نماز میں رہتا ہے (یعنی نماز کا ثواب اس کو ملتا رہتا ہے، جب تک مسجد میں نماز کا انتظار کرتا رہے اور اس کو حدث نہ ہو۔ اس پر ایک غیر عربی شخص نے سوال کیا۔ ابوہریرہ حدث کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہوا نکلنے کی آواز آنا۔

سائل حدیث

حدیثِ ہٰذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) نماز کے انتظار میں رہنا کارِ ثواب ہے۔ کیونکہ انتظارِ عبادت بھی عبادت ہے (۲) لِمَنْ لَّمْ یُحْدِثْ کے لفظ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ ثواب اس وقت ب ملتا ہے جب تک آدمی باوضوء ہے اور یہ کہ نماز کا انتظار مسجد میں کرے (۳) حضرت ابوہریرہ سے کسی نے سوال کیا حدث سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہوا کا نکلنا یعنی ہوا کے نکلنے سے وضو جاتا رہتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب بوہریرہ نے صرف (ہوا نکلنے کو) کیوں حدث قرار دیا۔ حالانکہ اس کے علاوہ بھی متعدد باتوں کے پائے جانے سے وضوء ٹ جاتا ہے۔ جیسے پاخانہ پیشاب کا آنا یا جسم کے کسی بھی حصے سے نجاست کا نکلنا وغیرہ تو جواب یہ ہے کہ یہاں حضرت ابوہریرہؓ مقصود یہ بتانا نہیں ہے کہ حدث صرف ہوا کا نکلنا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شخص مسجد میں باوضوء دوسری نماز کے نتظار میں بیٹھا ہے اس کا وضوء جاتے رہنے کی یہی شکل ہو سکتی ہے کہ ہوا خارج ہو جائے۔ کیونکہ عموماً مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص وضوء ہوا خارج ہونے سے ہی جاتا ہے اور پاخانہ و پیشاب و دیگر اسباب جو وضوء کو توڑ دیتے ہیں۔ ان کا ظہور عموماً مسجد ں نہیں ہوتا۔ اس لیے حضرت ابوہریرہ نے وضوء کو توڑنے والے اسباب میں سے صرف ایک خاص سبب ہوا کے خارج ہونے کا ذکر کر دیا (۴) اس حدیث کے بعد امام بخاری نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو (باب لا یتوضأ من الشک حتی یستیقن) میں گزر چکی ہے۔ ہم اس پر مکمل بحث گزشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھا۔ س حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہو وہ اس وقت تک نماز نہ توڑے جب تک

کہ ہوا نکلنے کی آواز آئے یا بدبو آئے۔ مطلب یہ ہے کہ محض ہوا نکلنے کا وہم یا شک ہونا وضو کو نہیں توڑتا (تفصیل

محض شک سے وضو نہیں ٹوٹتا

۱۷۶- عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْصَرِفُ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا اَوْ يَجِدَ رِيْحًا

عباد ابن تمیم اپنے چچا عبداللہ سے راوی ہیں کہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نماز نہ چھوڑے یہاں تک ہوا نکلنے کی آواز سُنے یا بدبو پائے۔

(بخاری)

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الطہارۃ میں اور مسلم، ابوداؤد و نسائی اور ابن ماجہ نے بھی کتاب میں ذکر کیا ہے (۲) مطلب حدیث یہ ہے کہ نمازی کو اگر نماز میں یہ شک ہو کہ ہوا نکلی ہے یا نہیں پڑھے جائیں یعنی محض شک و شبہ کی وجہ سے یہ نہ سمجھے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے کیونکہ یقینی بات شک سے زائل نہیں ہوتی۔ کا ہونا یقینی ہے اور حدث یعنی ہوا نکلنے کا شبہ یا شک عارضی ہے۔ ہاں اگر آواز سنائی دے بو آئے تو پھر یقین کیا جائے گا کہ نکلی ہے اور اب وضو ٹوٹا ہے۔

۱۷۷- مذی ناقضِ وضو ہے

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ میرے مذی بہت نکلتی تھی۔ نے حضور علیہ السلام سے اس کے متعلق خود پوچھنے میں شرم کی اور حضرت اسود سے کہا کہ وہ اس کے متعلق حضور علیہ السلام سے سوال کریں، ان کے سوال کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فِيْهِ الْوُضُوْءُ (بخاری) مذی کے نکلنے سے وضو ہے

فوائد و مسائل

یہ حدیث کتاب العلم میں صـ پر مع تفہیم و ترجمانی کے گزر چکی ہے۔ مذی اس رطوبت کو کہتے جو بوقت بوس وکنار شرمگاہ سے نکلتی ہے۔ بعض اوقات شہوانی خیالات کے آنے پر بھی یہ خارج ہو جاتی ہے۔ یہ لیسدار چپکیلا سا مادہ ہوتا ہے۔ جس میں منی کی سی بُو اور گاڑھا پن نہیں ہوتا۔ مذی کے نکلنے سے انتشار بھی ختم نہیں ہوتا اور ہر شخص کو خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ مذی نکلی ہے یا منی۔ یہ تشریح میں نے اس لیے کی ہے کہ لوگ مذی کے نکلنے سے پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ غسل واجب ہو گیا ہے۔ حالانکہ غسل اس وقت واجب ہے جب کہ منی شہوت کے ساتھ نکلے اور مذی کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر مذی خارج ہو تو شرمگاہ کو دھو کر جائے۔ مذی بھی منی کی طرح ناپاک ہے۔

۱۷۸- (۱) اَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَاَلَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قُلْتُ اَرَاَيْتَ اِذَا جَامَعَ وَلَمْ يُمْنِ قَالَ عُثْمَانُ يَتَوَضَّاُ كَمَا يَتَوَضَّاُ لِلصَّلٰوةِ وَيَغْسِلُ ذَكَرَهٗ قَالَ عُثْمَانُ سَمِعْتُهٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ عَلِيًّا

حضرت زید ابن خالد مدنی صحابی نے جناب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا مجھے بتایئے اگر شخص جماع کرے اور انزال نہ ہو تو اس پر یا نہیں؟ حضرت عثمان نے فرمایا۔ وہ نماز کے وضو وضو کرے اور شرمگاہ دھو ڈالے۔ حضرت عثمان نے میں نے حضور سے بھی سُنا اور میں نے اسی مسئلے کے

وَالزُّبَيْرِ وَطَلْحَةَ وَاُبَيِّ بْنَ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فَاَمَرُوْهُ بِذٰلِكَ

۱۷۹- (۲) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ نَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْسَلَ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَجَاءَ وَرَاْسُهٗ يَقْطُرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَلَّنَا اَعْجَلْنَاكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُعْجِلْتَ اَوْ قُحِطْتَ فَعَلَيْكَ الْوُضُوْءُ (بخاری)

حضرت علی و زبیر و طلحہ و ابی بن کعب سے بھی پوچھا تو انھوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔

حضرت ابوسعید خدری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کو بُلا بھیجا۔ وہ اسی حالت میں حاضر ہوئے کہ ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا (یعنی نہا کر آئے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید ہم نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ ہاں۔ تب آپ نے فرمایا۔ جب تم جلدی میں پڑ جاؤ یا تمہاری منی رُک جائے (انزال نہ ہو) تو تم پر وُضو ہے۔

فوائد و مسائل

(۱) حدیث ۱۷۸ کو امام نے مکرر اسی باب میں ذکر کیا ہے اور مسلم نے کتاب الطہارۃ میں درج کیا اور حدیث ۱۷۹ کو مسلم و ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے (۲) حدیث ۱۷۸ کا مطلب تو واضح ہے اور حدیث ۱۷۹ کا مفہوم یہ ے کہ وہ انصاری جن کو حضور علیہ السلام نے طلب فرمایا اور وہ اسی حالت میں حاضر ہوئے کہ سر سے پانی ٹپک رہا تھا تو حضور صلی اللہ یہ وسلم نے ان کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ مشغول تھے اور میرے بُلانے پر جلدی میں پڑ گئے اور بیوی سے علیحدہ وکر غسل کر کے حاضر ہوئے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر صحبت کی جائے اور انزال نہ ہو تو ایسی صورت میں غسل فرض نہیں ہوتا صرف ضو کافی ہے۔ باب سے ان دونوں حدیثوں کا تعلق یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں وضو کا ذکر ہے۔ یہ تو ہے ان دونوں حدیثوں کا نفسِ مضمون۔ اب اس مسئلہ کی پوری وضاحت کی جاتی ہے۔

خول کے بعد انزال نہ ہو تو غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں

واضح ہو کہ جب آدمی جماع کرے اور دخول ہو جائے۔ مگر انزال نہ ہو (یعنی منی نہ نکلے) تو غسل واجب ہوتا ے یا نہیں۔ تو اس مسئلہ میں صحابہ کرام میں بھی اختلاف رہا ہے۔ اس لیے علماء کرام کے بھی دو گروہ ہو گئے۔ عینی نے لکھا ہے کہ ضرت عثمان غنی و علی ابن طالب، ابوسعید خدری، ابی بن کعب، عطاء ابن رباح، ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن، ہشام بن عروہ مش، بعض اصحاب ظاہر کا قول یہ ہے کہ اس صورت میں غسل واجب نہیں ہوتا۔ صرف وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت یں صرف شرمگاہ کو دھو لیا جائے اور وُضو کیا جائے (عینی ج ۲ ص ۲۰۴) جو علماء غسل کے واجب ہونے کا قول نہیں کرتے ان ں دلیل یہ دونوں زیر بحث حدیثیں بھی ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں اور اقوال صحابہ ہیں جنہیں امام طحاوی نے حاوی میں درج کیا ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

(۱) اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَالْغُسْلُ عَلٰى مَنْ نْزَلَ

(۲) لَيْسَ فِي الْاِكْسَالِ اِلَّا الطُّهُوْرُ (طحاوی)

پانی پانی سے ہے یعنی غسل اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ منی نکلے

اور فرمایا کہ منی نہ نکلنے کی صورت میں صرف وضو ہے۔

(۲) اور حضرات خلفاء اربعہ وجمہور صحابہ وتابعین وفقہاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ اگر دخول کیا اور انزال نہ ہو تو بھی واجب ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ تمام صحابہ کرام کا اس امر پر اجماع ہے کہ مجرد دخول سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔ اگرچہ انزال نہ ہو (نیل الاوطار ج ا صفحہ ۲۲۰) ابن حزم نے کہا۔ جناب ام المومنین عائشہ صدیقہ، صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابن عباس، ابن مسعود، مہاجرین صحابہ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، احمد بن حنبل، امام نخعی وثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی مسلک ہے (عینی ج ۲ صفحہ ۵۴)

نیز علامہ ابن عربی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجرد دخول سے غسل پر اجماع ہوگیا (نووی شرح مسلم) اور وہ حدیثیں جن میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ منسوخ ہیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ابتداء میں یہی فتویٰ تھا دخول سے غسل واجب نہیں ہوتا لیکن اس کے بعد اس حکم کو منسوخ کردیا اور غسل کو واجب قرار دیا گیا۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَخَّصَ بِهَا فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ اَمَرَنَا بِالْاِغْتِسَالِ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

حضور علیہ السلام نے ابتداء اسلام میں اس امر کی رخصت دی تھی کہ جو شخص جماع کرے اور انزال نہ ہو وہ کرلے لیکن اس کے بعد یہ حکم منسوخ فرمادیا اور غسل کا حکم دیا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب آدمی جماع کرے

فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْغُسْلُ وَاِنْ لَّمْ يُنْزِلْ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ واحمد بن حنبل)

تو اس پر غسل واجب ہے اگرچہ انزال نہ ہو اور فرمایا۔

اِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ (طحاوی)

جب شرمگاہ سے شرمگاہ مل جائے تو غسل واجب ہوجاتا ہے۔

امام طحاوی نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور اس باب میں متعدد حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے واضح کہ حضور کے حکم والی حدیثیں منسوخ ہیں اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور دخول ہوجائے (یعنی داخل ہوجائے) تو خواہ منی نکلے یا نہ نکلے بہرصورت غسل واجب ہے۔

بَابُ الرَّجُلِ يُوَضِّئُ صَاحِبَهٗ

باب کسی شخص کا اپنے ساتھی کو وضو کرانا

اس باب میں امام بخاری نے دو حدیثیں لکھی ہیں۔ ۱۸۰۔ حدیث اول کا مضمون یہ ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ جب حضور علیہ السلام عرفات سے واپس ہوئے تو آپ گھاٹی کی طرف مڑ گئے۔ وہاں آپ حاجت سے ہوئے تو میں پانی لے کر حاضر ہوا۔ دوسری حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حضرت

۱۸۱۔ وَاَنَّ الْمُغِيْرَةَ جَعَلَ يَصُبُّ الْمَاءَ عَلَيْهِ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَغَسَلَ وَجْهَهٗ

مغیرہ آپ پر پانی ڈالنے لگے اور آپ وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے چہرہ مبارک اور ہاتھ دھوئے

وَيَدَيْهِ وَمَسَحَ بِرَاسِهٖ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ

سر مبارک کا مسح فرمایا اور موزوں پر مسح کیا۔ (بخاری)

ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ساتھی یا بزرگ کو وضو کرادے تو اس میں حرج نہیں اور یہ فعل بلا کراہت جائز و مباح ہے بلکہ سُنّت ہے اور یہ بھی کہ چمڑے کے موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح جائز ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

بَابُ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَغَيْرِهٖ

باب قرآن پاک کا بے وضو پڑھنا جائز ہے؟

وَقَالَ مَنْصُوْرٌ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ لَا بَاْسَ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْحَمَّامِ وَبِكَتْبِ الرِّسَالَةِ عَلٰى غَيْرِ وُضُوْءٍ وَقَالَ حَمَّادٌ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ اِنْ كَانَ عَلَيْهِ اِزَارٌ فَسَلِّمْ وَاِلَّا فَلَا تُسَلِّمْ

منصور نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا کہ حمام کے اندر قرآن پڑھنے میں حرج نہیں اور خط وغیرہ بے وضو لکھ سکتا ہے اور حماد بن سلیمان نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ نہا رہے ہوں۔ اگر وہ تہبند باندھے ہوں ان کو سلام کرو، ورنہ نہیں۔

فوائد و مسائل عنوان کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بے وضو ہو اس کو قراءت قرآن جائز ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس کو قرآن کریم کا پڑھنا جائز ہے تو تسبیح و تہلیل اور سلام کا جواب دینا بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

جنبی اور بے وضو کو قرآن کی تلاوت، درود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں

(۱) جو شخص بے وضو ہے اسے قرآن پڑھنا، ذکر و اذکار، درود شریف، تسبیح و تہلیل، ورد، وظائف میں مشغول رہنا، سلام کا جواب دینا اور چھینک کے جواب میں الحمد للہ کہنا، یا یرحمک اللہ سے جواب دینا یا اذان کا جواب دینا جائز ہے۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ ذکر و تسبیح و درود شریف وغیرہ باوضو ہو کر پڑھے۔ (۲) جو شخص بے وضو ہے۔ اس کو قرآنِ مجید یا اس کی کسی آیت کا چھونا حرام ہے ہاں بغیر چھوئے زبانی یا دیکھ کر پڑھے تو حرج نہیں (۳) جس کو نہانے کی حاجت ہو (جنبی) اس کو مسجد میں جانا، طواف کرنا، قرآنِ مجید چھونا، اگرچہ اس کا سادہ حاشیہ یا جلد یا چولی چھوئے یا دیکھ کر یا زبانی پڑھنا یا کسی آیت کا لکھنا یا آیت کا تعویذ لکھنا یا ایسا تعویذ چھونا یا ایسی انگوٹھی چھونا یا پہننا ناجائز ہے جس پر حروفِ مقطعات ہوں یا ایسا تعویذ یا تختی پہننا جس پر آیات قرآنی لکھی ہوں حرام ہے (۴) جنبی کو اذان کا جواب دینا جائز ہے۔ یونہی سلام کا جواب دینا اور تسبیح و تہلیل اور درود شریف پڑھنا بھی جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ وضو یا کلی کرکے پڑھیں اور صرف قرآنِ مجید کو دیکھنا اگرچہ حروف پر نظر پڑے اور الفاظ سمجھ میں آئیں اور زبان سے نہیں بلکہ خیال سے پڑھے جائیں حرج نہیں۔ جنبی اور بے وضو کو فقہ و تفسیر و حدیث کی کتابوں کا چھونا مکروہ ہے مگر جہاں کاغذ پر قرآنِ کریم کی آیت لکھی ہو اس پر ہاتھ رکھنا حرام ہے۔ قرآن کا ترجمہ فارسی یا اردو یا کسی اور زبان میں ہو اس کو بھی چھونے اور پڑھنے میں قرآنِ مجید ہی کا سا حکم ہے۔ جنبی کو قرآنِ کریم کی کتابت کرنا حرام ہے۔ یونہی بے وضو کو بھی قرآنِ کریم

کی کتابت جائز نہیں ہے۔

(ب) حضرت ابراہیم نخعی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ حمام میں قرآن پڑھنا جائز ہے۔ اس اثر کو سعید ابن منصور نے موصولاً روایت کیا ہے لیکن امام قسطلانی نے لکھا ہے کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک پاخانہ میں قرآن پڑھنا ناجائز ہے کیونکہ وہ نجاست کی جگہ ہے اور حمام میں بھی قرآن پڑھنا مکروہ ہے کہ وہ جگہ ماءِ مستعمل اور دوسری نجاستوں کا مخزن ہے، نیز ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ و نسائی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام جب بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو اپنی انگوٹھی اتار دیا کرتے تھے اور صحیح احادیث میں وارد ہوا کہ حضور علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھا۔ تو جب اس انگوٹھی کو جس پر اللہ کا نام تھا حضور علیہ السلام نے پاخانہ میں لے جانا گوارا نہ فرمایا تو نجاست کی جگہ پر ذکرِ الہی اور قراءتِ قرآنِ پاک کیونکر روا قرار پائے گی۔ ہاں اگر حمام بالکل پاک وصاف ہو اور آدمی ننگا بھی نہ ہو تو پھر قراءتِ قرآنِ پاک میں حرج نہیں ہے لیکن نجس مقامات پر زبان سے اللہ کا ذکر مکروہ ہے۔ ہاں ذکرِ قلبی ہر جگہ جائز ہے۔ (یعنی دل سے ذکرِ الہی کرنا)۔ علامہ نووی نے لکھا ہے کہ پاخانہ و پیشاب کے وقت زبان سے ذکرِ الہی کرنا مکروہ ہے۔ علماء نے فرمایا کہ ایسی حالت میں تسبیح وتہلیل وتکبیر اور سلام کا جواب اذان کا جواب چھینکنے والے کا الحمد للہ کہنا مکروہ ہے۔ یونہی جماع کی حالت میں بھی ذکرِ الہی مکروہ ہے۔ حتیٰ کہ پاخانہ و پیشاب کی حالت میں سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے متعدد ایسی حدیثیں ذکر کیں ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام قضاءِ حاجت فرما رہے تھے۔ کسی نے سلام کیا آپ نے اس کا جواب نہ دیا فراغت کے بعد وضو یا تیمم کرکے سلام کا جواب دیا۔

وَيَكْتُبُ الرِّسَالَةَ

اور بے وضو خط لکھنا بھی جائز ہے۔ خط یا رسالہ میں بسم اللہ یا کبھی قرآنِ کریم کی کوئی آیت لکھنے کی ضرورت پڑجاتی ہے تو امام نخعی سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا ہے لیکن جنبی اور حائضہ کو خط لکھتے وقت بسم اللہ یا کسی اور آیتِ قرآن کی کتابت جائز نہیں ہے۔

وَقَالَ حَمَّادٌ

اور جناب حماد ابن ابی سلیمان، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے استاذ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تہبند باندھ کر نہا رہا ہے تو اس کو سلام کرسکتے ہیں ورنہ نہیں۔ اس تعلیق کو امام ثوری نے موصولاً ذکر کیا اور ابن ماجہ و ابوداؤد میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی ممانعت فرمائی کہ دو شخص ستر کھولے ہوئے گفتگو کریں۔ تو جب اس حالت میں عام گفتگو کی ممانعت ہے تو ایسے شخص کو سلام کرنا جو ننگا ہو کیسے روا قرار پائے گا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور قرآنِ مجید میں سلام علیکم کے الفاظ ہیں

امام بخاری نے اس کے بعد ایک حدیث لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ ایک رات میں نے اپنی خالہ ام المومنین میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گزاری۔ میں بچھونے کے عرض میں لیٹ گیا اور حضور علیہ السلام مع اپنی زوجہ مطہرہ کے بسترے میں آرام فرما ہوئے پھر آپ سو گئے۔ آدھی رات یا اس کے کچھ پہلے یا اس کے کچھ بعد آپ بیدار ہوئے۔ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے، پھر آپ نے سورہ آل عمران کی اخیر کی دس آیتیں

(ان فی خلق السمٰوٰتِ) سے اخیر تک تلاوت فرمائیں۔ پھر ایک مشک سے جو لٹک رہی تھی آپ نے اچھی طرح وضو فرمایا۔ پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ میں نے حضور کی طرح وضو کیا اور آپ کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے اپنا داہنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرا داہنا کان پکڑا اور مجھے داہنے پہلو کر لیا۔ پھر آپ نے بارہ رکعتیں پڑھیں (دو دو رکعت کر کے) پھر وتر پڑھے، پھر لیٹ رہے۔ یہاں تک کہ موذن آیا۔ اس وقت آپ کھڑے ہوئے اور دو رکعت سنتِ فجر ہلکی پڑھیں پھر آپ مسجد میں آئے اور نماز فجر پڑھائی (بخاری)

فوائد و مسائل

۱۸۲۔ (۱) اس حدیث کا ہم نے عربی متن اس لیے نہیں لکھا کہ آئندہ ابواب میں اس حدیث پر مکرر بحث کرنی ہے (۲) امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں وتر کی تفسیر میں ذکر کیا۔ امام ترمذی نے شمائل میں، امام مسلم نے صلوٰۃ میں، ابن ماجہ نے طہارت میں ذکر کیا۔ اس حدیث میں یہ آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے بیدار ہو کر بغیر وضو کیے قرآن پاک کی آیات پڑھیں۔ اسی سے ترجمہ باب نکلتا ہے۔ مگر اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند تو بالاتفاق ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اس لیے عنوان سے حدیث کے مذکورہ بالا جملہ کا کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا کہ ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام جب بیدار ہوئے ہوں۔ اس وقت آپ کا وضو جاتا رہا ہو۔ یعنی نیند سے نہیں بلکہ کسی اور حدث سے اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ آپ نے نماز پڑھنے کے لیے وضو فرمایا۔ مگر یہ توجیہ کچھ یونہی سی ہے۔ کیونکہ اول تو اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ حضور علیہ السلام کو حدث ہوا۔ ثانیاً وضو فرمانا بھی حدث کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وضو پر وضو بھی تو کیا جاتا ہے (۳) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے موذن کا امام کو جگانا اور اقامتِ صلوٰۃ کی اطلاع دینا مستحب ہے۔

بَابُ مَنْ لَّمْ يَتَوَضَّأْ إِلَّا مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ

باب سخت غشی ہو تو وضو جائے گا۔ (ورنہ نہیں)

فوائد و مسائل

۱۸۳۔ اس باب میں امام بخاری نے وہی حدیث ذکر کی ہے جو کتاب العلم کے باب میں "اجاب الفتیا باشارۃ الید والراس" میں مکمل تفہیم و ترجمانی کے ساتھ گزر چکی ہے (دیکھو حدیث ۸۵)۔ اس حدیث میں حضرت اسماء رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے بیان کیا تھا کہ میں سورج گہن کی نماز کے لیے کھڑی ہوئی۔ گرمی کی وجہ سے مجھے غش آگیا تو میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ حدیث کے ان جملوں سے ترجمہ باب نکلتا ہے کہ حضرت اسماء کو غش آگیا مگر انھوں نے دوبارہ وضو نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ ایسی غشی جس میں ہوش و حواس باقی رہیں ناقضِ وضو نہیں ہے۔ حضرت اسماء پر خفیف سی غشی طاری ہوئی تھی جبھی تو انھوں نے اس حالت میں پانی ڈالنے کا احساس رہا۔ اس حدیث پر تفصیلی گفتگو چونکہ کتاب العلم ص۔ پر ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم نے متن حدیث نہیں لکھا۔

فائدہ۔ اغماء کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے اور غشی کا دل سے، احناف کے نزدیک اغماء و غشی ناقضِ وضو ہے۔

بَابُ مَسْحِ الرَّأْسِ كُلِّهِ لِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ

باب سارے سر پر مسح کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے سروں پر مسح کرو

وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ الْمَرْأَةُ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ تَمْسَحُ عَلٰی رَاْسِهَا وَسُئِلَ مَالِكٌ اَيُجْزِئُ اَنْ يَّمْسَحَ بَعْضَ رَاْسِهٖ فَاحْتَجَّ بِحَدِيْثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ (بخاری)

حضرت سعید ابن مسیب نے فرمایا۔ عورت بھی مرد کی طرح سر کا مسح کرے۔ اور امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا بعض سر کا مسح جائز ہے تو انھوں نے عبد اللہ بن زید کی حدیث سے دلیل لی۔

وضو میں سر کے مسح کی بحث

واضح ہو کہ وضو میں سارے سر کا مسح کرنا سنت ہے اور اس پر تمام ائمہ کرام کا اتفاق بھی ہے۔ البتہ مقدار مسح میں اختلاف ہے۔ (۱) امام مالک ر حضرت مزنی و جبائی اور امام احمد (فی روایۃ) و ابن علیہ کا مسلک یہ ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا واجب ہے (۲) امام شافعی علیہ بعض سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں مگر کوئی حد معین نہیں فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک انگلی سے مسح کرنا بھی کافی ہے (۳) حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے (۴) اور امام مالک علیہ الر یہ فرماتے ہیں کہ قرآن نے وامسحوا برؤسکم فرمایا اور اس میں کوئی مقدار نہیں فرمائی کہ آدھے سر کا مسح کر دیا۔ چوتھائی سر کا تو اگر بعض مراد ہوتا تو اللہ عزوجل اس کو بیان فرما دیتا۔ جیسے ہاتھ اور پاؤں کے متعلق تصریح فرمادی کہ ہاتھ کہنیوں سمیت اور پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے جائیں۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ متعدد ایسی حدیثوں سے بھی دلیل لاتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ رَاْسَهٗ بِيَدَيْهِ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ (رواه الجماعة)

کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح فرمایا۔ اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو آگے سے گدی کی طرف لے گئے پھر واپس لے آئے۔

احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آیت میں برؤسکم آیا ہے اور با یہاں تبعیض کے لیے ہے۔ ثانیاً آیت مسح میں مجمل ہے۔ حدیث نے اس اجمال کو بیان کر دیا کہ مقدار فرض چوتھائی سر کا مسح ہے۔ جیسا کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چوتھائی سر کا مسح فرمایا اور وہ حدیثیں جن میں یہ مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے سارے سر کا مسح کیا تو اس میں بیان وجوب نہیں بلکہ بیان فضیلت ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا مستحب ہے اور ہم بھی سارے سر کے مسح کو مسنون مانتے ہیں۔ پس سارے سر کے مسح کی فرضیت ثابت نہیں ہوئی۔ واضح ہو کہ مسح کے باب میں جس قدر آئی ہیں ان میں جو کیفیت مسح وارد ہوئی ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) ایک حدیث تو وہی ہے جس کو بخاری نے عنوان زیر بحث میں ذکر کیا یعنی حدیث عبد اللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام نے وضو فرمایا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر مسح کیا اور دونوں ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر جہاں سے شروع کیا تھا یعنی پیشانی سے وہیں تک واپس لے گئے۔

۱۸۴۔ ثُمَّ مَسَحَ بِيَدَيْهِ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ بِمُقَدَّمِ رَاْسِهٖ حَتّٰی ذَهَبَ بِهِمَا اِلٰی قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا اِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ بَدَاَ مِنْهُ (بخاری)

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں پانچ مرتبہ ذکر کیا ہے اور ابوداؤد و ابن ماجہ و مسلم و ترمذی نے بھی

کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔ ظاہر ہے اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں سارے سر کا مسح فرمایا (۲) اور ایسی بھی متعدد حدیثیں ہیں جن کا مضمون یہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ قِطْرِيَّةٌ فَأَدْخَلَ يَدَهُ تَحْتَ الْعِمَامَةِ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعِمَامَةَ (ابوداؤد)	اور سر مبارک پر دھاری دار عمامہ تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھ کو عمامہ میں داخل کیا اور سر کے اگلے حصہ کا مسح فرمایا اور عمامہ نہ اتارا۔

(۳) حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام سباطہ قوم پر آئے۔ آپ نے پیشاب کیا پھر وضو کیا۔

وَمَسَحَ يَمْسَحُ بِمُقَدَّمِهِ رَأْسِهِ إِذَا تَوَضَّأَ (مسلم و ابن ماجہ)	اور وضو میں چوتھائی سر کا مسح کیا اور موزوں پر مسح کیا

نیز بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے:۔

(۴) أَنَّهُ كَانَ يَمْسَحُ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ إِذَا تَوَضَّأَ (طحاوی ۳۷)	کہ حضرت سالم کے والد جب وضو کرتے تو مقدم راس کا مسح فرماتے۔

(۵) امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے اس مضمون کی مختلف حدیثیں لکھی ہیں کہ:۔

فَمَسَحَ عَلَى عِمَامَتِهِ وَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ	کہ حضور علیہ السلام نے وضو فرمایا تو آپ نے عمامہ اور پیشانی پر مسح فرمایا۔

ہم نے تقریباً اس باب کی تمام حدیثوں سے چند ذکر کردیں (نمبر دیدیے ہیں) جو تمام حدیثوں کی کیفیات کی جامع ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے سر کا مسح کیا اور یہ بھی کہ آپ نے صرف پیشانی کے مسح پر اکتفا فرمایا۔ جس سے یہ بات تو بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر پورے سر کا مسح کرنا واجب ہوتا تو حضور علیہ السلام پیشانی کے مسح پر اکتفا نہ فرماتے۔ ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا مستحب ہے جس کے احناف بھی قائل ہیں۔ لیکن پورے سر کے مسح کرنے کا وجوب اس سے ثابت نہیں ہوتا چنانچہ وضو کے دیگر اعضاء منہ اور ہاتھ اور پاؤں کے متعلق بھی حضور سے ایسے ہی مروی ہے کہ آپ نے کبھی ایک ایک بار کبھی دو دو بار اور کبھی تین تین بار اعضاءِ وضو کو دھویا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین بار دھونا فرض ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اعضاء وضو کو ایک ایک بار دھونا فرض ہے اور تین تین بار دھونا مستحب ہے تو اسی طرح مسح کے باب میں پیشانی (چوتھائی سر) کا مسح فرض قرار پائیگا اور سارے سر کا مستحب اور اگر عقل و قیاس کی رو سے غور کیا جائے تو بھی چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ دیکھئے وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کے دھونے کا حکم ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس عضو کا وضو میں دھونا فرض ہے اس کا تمام دھونا فرض ہے۔ اور وضو میں سر کے مسح کا حکم ہے تو اب ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ جس عضو کے مسح کرنے کا حکم ہے اس کی کیا کیفیت

ہے۔ آیا کل کا مسح کیا جائے یا بعض کا؟ تو موزوں پر مسح کے متعلق اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ سارے پاؤں کے مسح کی ضرورت نہیں تو جب مسح الخفین میں کل کا مسح ضروری نہیں بلکہ ظاہر قدم کا مسح ضروری ہے تو اسی پر سر کے مسح کو قیاس کرنا چاہیے۔ لہذا وضوء میں چوتھائی سر کا مسح فرض قرار پائے گا۔

توضیح حدیثِ اول میں سیدنا امام مالک کی دلیل ہے۔ وہ وضوء میں سارے سر کے مسح کو واجب قرار دیتے ہیں احناف کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ حدیثیں جن میں سارے سر کے مسح کرنے کا ذکر ہے یہ بطور استحباب ہے اور ان میں وجوب میں کوئی دلالت نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہوا۔ حدیث دوم، سوم، چہارم احناف کی دلیل ہیں جن میں پیشانی کے مسح کرنے کا ذکر ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن میں پیشانی پر مسح کرنے کا ذکر ہے اس امر کی دلیل ہیں کہ وضوء میں سر کے مسح کے متعلق مقدار مفروض پیشانی کا مسح (چوتھائی سر کا مسح) ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشانی سے زائد جو مسح فرمایا ہے وہ بیانِ فضیلت کے لیے ہے۔

فائدہ:۔ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ حدیثِ اول میں فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ کے لفظ آئے ہیں تو یہ اقبال ادبار دو حرکتیں ہیں دو مسح نہیں ہیں۔ یہ اقبال وادبار تو صرف اس لیے ہے کہ پورے سر کا مسح ہو جائے۔ چنانچہ اسی باب میں امام بخاری نے عبداللہ بن زید سے جو دوسری روایت درج کی ہے اس میں یہ لفظ بھی ہیں۔ فَاَقْبَلَ بِهِمَا وَاَدْبَرَ مرۃ واحدۃ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس روایت میں (مسح مرتین) کے الفاظ آئے ہیں اس میں تکرار فی المسح سے اقبال وادبار مراد ہے نہ کہ تکرار مسح فافہم

حدیث پنجم میں بھی احناف کی دلیل ہے۔ اس میں بھی یہ تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام نے ناصیہ یعنی چوتھائی سر کا مسح فرمایا۔ بعض علماء نے کہا کہ اس میں تو عمامہ پر مسح کا ذکر ہے تو اب نئی کیفیت یہ پیدا ہو گئی کہ اگر عمامہ باندھا ہو تو اس کو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پیشانی پر مسح کر لیا جائے اور عمامہ پر بھی ہاتھ پھیر لیا جائے تاکہ پورے سر کا مسح ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ بات یہی قرار پائی کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے سارے سر کا مسح فرمایا۔ ہاں نئی کیفیت یہ پیدا ہوئی کہ سر پر عمامہ ہو تو پیشانی پر مسح کر لیا جائے اور باقی مسح پگڑی پر کر لیا جائے۔ جس کا نتیجہ ہر صورت یہی نکلا کہ آپ نے پورے سر کا مسح فرمایا۔ احناف اس موقع پر بھی وہی جواب دیں گے کہ حضور علیہ السلام کا فقط پیشانی کے مسح پر اکتفا فرمانا بھی تو ثابت ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مقدار مفروضہ پیشانی ہے اور اس سے زائد کا مسح بطور استحباب کے ہے — غرضیکہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک وضوء میں چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے اور سارے سر کا مسح کرنا سنت ہے۔

سر کے مسح کرنے کا طریقہ، کان کا بھی مسح کیا جائے

(۱) پورے سر کا ایک بار مسح کرنا اور کانوں کا مسح کرنا سنت ہے۔ مسح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انگوٹھے اور کلمے کی کے سوا ایک ہاتھ کی باقی تین انگلیوں کا سرا اور دوسرے ہاتھ کی تینوں انگلیوں کے سرے سے ملائے اور پیشانی کے بال پر رکھ کر گُدی تک اس طرح لے جائے کہ ہتھیلیاں سر سے جُدا رہیں۔ وہاں سے ہتھیلیوں سے مسح کرتا ہوا واپس لائے اور کلمے کی انگلی کے پیٹ سے کان کے اندرونی حصہ کا مسح کرے۔ یہ طریقہ صحیح طور پر اس وقت سمجھ میں آتا ہے۔ جب کسی عالم دین سے

عملی طور پر اس کو سیکھ لیا جائے۔ کان کے ظاہر و باطن کے مسح سے متعلق چند حدیثیں یہ ہیں (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔

فَمَسَحَ بِرَاسِهٖ وَ اُذُنَيْهِ (طحاوی)	تو آپ نے سر اور کانوں کا مسح فرمایا۔

(۲) مقدام ابن معدی کرب کہتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو وضو کرتے دیکھا۔ تو جب آپ نے مسح کرنا چاہا

وَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى مُقَدَّمِ رَاْسِهٖ ثُمَّ مَرَّ بِهِمَا حَتّٰى بَلَغَ الْقَفَا ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتّٰى بَلَغَ الْمَكَانَ الَّذِیْ بَدَاَ وَمَسَحَ بِاُذُنَيْهِ ظَاهِرَهُمَا وَ بَاطِنَهُمَا مَرَّةً وَّاحِدَةً	تو آپ نے اپنی دونوں مقدم ہتھیلیاں مقدم راس پر رکھیں۔ پھر انہیں گدی تک لے گئے۔ پھر وہیں تک لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک دفعہ کانوں کے ظاہر اور باطن کا مسح فرمایا۔ (طحاوی)

(۳) ایک شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آیا تو آپ نے اس کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا:۔

فَاَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَتَيْنِ اُذُنَيْهِ فَمَسَحَ بِاِبْهَامَيْهِ ظَاهِرَ اُذُنَيْهِ وَ بِالسَّبَّابَتَيْنِ بَاطِنَ اُذُنَيْهِ (طحاوی شریف ص۲۹)	(اور بوقت مسح) اپنی دونوں انگشت شہادت کانوں کے سوراخوں میں داخل کیں اور انگوٹھوں سے کانوں کے اوپر کا مسح فرمایا اور انگشت شہادت سے کانوں کے اندر کا مسح کیا۔

اسی مضمون کی حدیثیں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد ابن حنبل میں بھی ہیں۔ ان حدیثوں سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) سر کا مسح ایک دفعہ کرنا ہی مسنون ہے (۲) سر اور کانوں کا مسح ایک ہی پانی سے کیا جائے، کانوں کے مسح کے لیے دوبارہ ہاتھوں کو تر کرنے کی ضرورت نہیں ہے (۳) کانوں کے ظاہر اور باطن کا مسح کرنا سنت ہے (۴) کان کے اندر کا مسح انگشت شہادت سے کیا جائے اور کان کے ظاہر کا مسح انگوٹھوں سے کیا جائے (۵) یہ بھی ثابت ہوا کہ کان سر کا حصہ قرار دیے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ الاذنان من الراس اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً سیدنا ابن عباس و ابن عمر و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کان سر میں داخل ہیں اور سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا بھی مسح کیا جائے۔ (طحاوی شریف)

بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ

باب وضو میں دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا

اس باب میں امام نے جو حدیث لکھی ہے اس میں وضو کرنے کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ اس حدیث میں یہ لفظ ہیں۔

۱۸۵۔ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ	کہ پھر انہوں نے اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے

عنوان سے متعلق حدیث کے صرف یہی جملے ہیں جو ہم نے لکھ دیئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا ٹخنوں سمیت دھونا ضروری ہے۔

بَابُ اِسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوْءِ النَّاسِ (بخاری)

باب وضو سے جو پانی بچ گیا اس کو کام میں لانے کے بیان میں

فضلِ وضو کا اگر یہ مطلب ہو کہ وہ پانی جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ رہے تو ظاہر ہے کہ اس پانی کے طاہر و مطہر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے اور اگر فضلِ وضو کا یہ مطلب ہو کہ وہ پانی جو وضو کرنے والے کے اعضاء سے جدا ہو جس کو فقہاء کرام ماءِ مستعمل کہتے ہیں۔ اس کے طاہر و نجس ہونے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تین قول منقول ہیں۔ اوّل روایتِ ابو یوسف میں نجس مخفف ہے (۲) روایت حسن بن زیاد میں نجس مغلظ (۳) روایت زفر و محمد بن حسن میں طاہر غیر طہور اسی کو محققین ماوراء النہر نے اختیار کیا محیط، اشہر اور مفید میں صحیح قرار دیا گیا اور علامہ اسبیجابی نے کہا کہ روایت سوم پر فتویٰ بھی ہے۔ علامہ قاضی خاں نے فرمایا تنجیس کے قول کی امام کی طرف نسبت ثابت نہیں اور امام نخعی حسن بصری زہری ثوری و امام مالک علیہم الرحمۃ کا قول یہ ہے کہ ماءِ مستعمل طاہر و طہور ہے اور امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک طاہر ہے طہور نہیں۔ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اگر ماءِ مستعمل کو ناپاک قرار دیا جائے تو پھر تو مطلقاً اس کا استعمال جائز نہ ہوگا اور اگر طاہر و مطہر قرار دیا جائے تو ہر چیز میں اس کا استعمال جائز قرار پائے گا اور اگر فقط طاہریت کا قول کیا جائے تو پینے، آٹا گوندھنے، نجاست کے زائل کرنے کے لیے اس کا استعمال درست قرار پائے گا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:-

وَالفتوى على انه طاهر غير طهور كما ذهب اليه محمد بن الحسن (عینی ج۱ ص۱۲۴)	اور حنفیہ کا فتویٰ ہے کہ ماءِ مستعمل طاہر ہے مطہر نہیں ہے جیسا کہ امام محمد بن حسن نے اختیار کیا۔

توضیح ماءِ مستعمل کے متعلق سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کی رائے میں بظاہر تضاد معلوم دیتا ہے مگر حقیقت میں تضاد نہیں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔ آنکھ، کان، ناک، سر، ہاتھ، پاؤں سب کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وضو کے بعد

من كل ذنب كهيأة ولدته امه (طبرانی)	سب گناہوں سے ایسا خالص ہو جاتا ہے جیسا کہ اپنی ماں سے پیدا ہوتے وقت تھا۔

اکثر علماء نے فرمایا کہ یہاں گناہوں سے صغائر مراد ہیں مگر تحقیق یہ ہے کہ کبائر بھی دھلتے ہیں اگرچہ زائل نہ ہوں۔ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ اکابر اولیاء کرام قدست اسرارہم کا، مشاہدہ ہے اور گناہ متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ سیدنا علیہ الرحمہ اہلِ مشاہدہ سے تھے۔ جب لوگوں کے آبِ وضو کو دیکھتے تو بعینہٖ ان گناہوں کو پہچان لیتے جو دھل کر پانی میں گرتے اسی وجہ سے ماءِ مستعمل کے متعلق آپ کے تین قول ہو گئے چنانچہ:-

سیدنا امام اعظم امام اہل کشف و مشاہدہ ہیں

امام عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ الربانی جو اولیاء شافعیہ سے ہیں۔ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے سردار حضرت علی خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (کہ وہ بھی شافعی ہیں) سنا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے مدارک باریک ہیں۔

اکابر اولیاء۔ اہلِ مشاہدہ ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ جب حوضِ وضوء کا پانی دیکھتے تو لوگوں کے وضوء کرنے میں گناہ کبیرہ، صغیرہ اور مکروہ جو کچھ دھل کر اس میں گرا سب پہچان لیتے۔ اسی لیے امام اعظم نے ماءِ مستعمل کے تین حکم رکھے۔ نجاست غلیظہ ہے۔ یہ اس صورت میں جب کہ استعمال کرنے والوں نے کوئی گناہِ کبیرہ کیا ہو۔ دوم نجاستِ خفیفہ ہے۔ یہ اس صورت میں جب کہ گناہِ صغیرہ کے مرتکب کا دھوون ہو۔ سوم۔ پاک ہے مگر پاک نہیں کرتا۔ یہ اس صورت میں کہ فعلِ مکروہ کے مرتکب کا دھوون ہو۔ ان کے مقلد سمجھے کہ یہ تینوں حکم ہر حال میں ہیں۔ حالانکہ وہ مختلف احوال پر ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اللہ راضی ہوا امام ابوحنیفہ سے اور ان کے مقلدوں پر رحم فرمائے کہ انھوں نے نجاست کی دو قسمیں کیں غلیظ اور خفیفہ اس لیے کہ گناہ دو ہی قسم کے ہیں کبیرہ اور صغیرہ ——— اور میں نے اپنے سردار علی خواص کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ آدمی کو کشف حاصل ہو تو لوگوں کے وضو۔ و غسل کے پانی کو نہایت گھنونا اور بدبودار پائے تو کبھی اس کا دل نہ ہو کہ اس سے طہارت کرے ——— امام شعرانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی کہ امام ابوحنیفہ و ابو یوسف کشف والے تھے کہ ماءِ مستعمل کو نجس مانتے ہیں۔ سیدی علی خواص نے فرمایا۔ ہاں یہ دونوں اعظم اہلِ کشف سے تھے۔ جب لوگوں کا آبِ وضو دیکھتے تو فوراً پہچان لیتے کہ یہ دھوون گناہِ کبیرہ کا ہے۔ یہ صغیرہ کا اور یہ مکروہ کے مرتکب کا ہے اور یہ خلافِ اولیٰ کا اور ایسے پہچانتے جیسے کوئی اجسام کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہم کو روایت پہنچی کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ جامع مسجد کوفہ کے حوض پر تشریف لے گئے۔ ایک جوان وضو کر رہا تھا۔ اس کا پانی جو ٹپکا تو امام نے اس پر نظر فرمائی اور کہا۔ اے میرے بیٹے ماں باپ کو ایذا دینے سے توبہ کر۔ اس نے فوراً توبہ کی۔ ایک اور شخص کا غسالہ دیکھ کر فرمایا۔ اے بھائی زنا سے توبہ کر۔ ایک اور شخص کا دھوون دیکھ کر فرمایا۔ شراب پینے اور مزامیر سننے سے توبہ کر۔ یہ دونوں تائب ہوئے (میزان الشریعۃ الکبریٰ (ترجمہ من وعن ہے)

ماءِ مستعمل کی جامع مانع تعریف، نجاست حکمی و حقیقی کا فرق، ماءِ مستعمل کی صورتیں

واضح ہو کہ نجاست دو قسم پر ہے۔ نجاست حقیقی، جیسے پاخانہ و پیشاب، شراب وغیرہ۔ فقہاء اس کو نجاستِ حقیقی کہتے ہیں اور جس چیز کو یہ نجاست لگ جائے گی تو اس کے متعلق یوں کہیں گے کہ اس چیز کو نجاستِ حقیقی لگی ہے۔ ——— نجاستِ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود حقیقتاً نجاست نہیں ہے۔ مگر شرع نے اس کو نجاست کا حکم دیا ہے جیسے بے وضو شخص یا جنبی اس کے بدن پر کوئی نجاستِ حقیقی نہیں ہے مگر نجاستِ حکمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے وضو کو قرآنِ مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے اور جنبی کو مسجد میں آنا قرآن پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اب جس پانی سے یہ نجاستِ حکمیہ زائل کی جائے گی اس پانی کو نجاستِ حکمیہ منتقل ہو جائے گی اور وہ پانی مستعمل ہو جائے گا۔

فائدہ:۔ (۱) جس پانی سے قربتِ مطلوبہ شرعاً کی اقامت کی جاتی ہے وہ انسان کے گناہ دھوتا ہے۔ گناہوں کی نجاست گویا اس کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ پانی مستعمل ہو جاتا ہے (۲) حج میں جو کنکریاں ایک بار کسی بھی جمرہ پر استعمال ہو چکیں انہیں دوبارہ استعمال کرنا مکروہ ہے۔ اگر ضرورت ہو تو ان کو تین بار دھو کر استعمال کرے بلکہ مطلقاً دھو کر ہی کام میں لانا مستحب ہے شاید کوئی نجاستِ حقیقیہ یا حکمیہ سے ملوث ہو (۳) ماءِ مستعمل وہ قلیل پانی ہے جس نے یا تو تطہیر نجاستِ حکمیہ سے کسی واجب کو

ساقط کیا یعنی انسان کے کسی ایسے پارہ جسم کو مس کیا جس کی تطہیر وضو یا غسل سے بالفعل لازم تھی یا ظاہر بدن پر اس کا استعمال خود کارِ ثواب تھا اور استعمال کرنے والے نے اپنے بدن پر اسی امرِ ثواب کی نیت سے استعمال کیا اور یوں اسقاطِ واجب تطہیر یا اقامتِ قربت کرکے عضو سے جدا ہوا۔ اگرچہ ہنوز کسی جگہ مستقر نہ ہوا بلکہ روانی میں ہے اور بعض نے زوالِ حرکت و استقرار کی قید لگائی۔ یہ حد جامع مانع ہے اور فتاویٰ رضویہ مؤلفہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سوا کہیں نہیں ملے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ عام قارئینِ کرام اس تعریف کو بخوبی نہیں سمجھ سکے ہوں گے۔ اس لیے ہم مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔
جو صاحب ان مسائل کی پوری بحث اور دلائل معلوم کرنا چاہیں وہ فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۲۳ کا بغور مطالعہ کریں۔

ان صورتوں میں پانی مستعمل قرار پائیگا

(۱) محدث (بے وضو یا جنبی آدمی) نے تمام یا بعض اعضاءِ وضو دھوئے اگرچہ وضو کی نیت نہ کی۔ محض ٹھنڈ حاصل کرنے یا میل وغیرہ جدا کرنے کے لیے کسی عضو کو دھویا تو یہ پانی جو اعضاء پر سے بہہ گیا۔ ماءِ مستعمل ہو گیا (یاد رکھے پانی اعضاء سے ل کر جدا ہو جانے کے بعد ہی مستعمل قرار پایا جائیگا) (۲) جنبی نے خود غسل کیا اور نہ ارادہ ہی کیا مگر کسی نے مثلاً اس کی پیٹھ پر پانی ڈالا۔ اب جو پانی اس کی پیٹھ پر سے بہا ہے ماءِ مستعمل ہو گیا (یعنی استعمال کیا ہوا پانی) (۳) باوضو آدمی نے بہ نیت دوبارہ وضو کیا۔ (۴) حائض و نفساء عورت نے نمازِ پنجگانہ کے وقت یا چاشت و اشراق و تہجد کے وقت محض یاد [illegible] کے لیے وضو کیا کہ عبادت کی عادت باقی رہے (۵) باوضو نے کھانا کھانے کو یا کھانا کھانے کے بعد بہ نیتِ ادائے سنت ہاتھ دھوئے یا کلی کی (۶) سمجھ دار نابالغ بچے نے وضو بقصدِ وضو کیا (۷) پاک آدمی نے ادائے سنت کو جمعہ یا عیدین یا عرفہ یا احرام یا اوقاتِ مستورہ کا غسل کیا یا میت کو نہلانے کا غسل یا وضو کیا (۸) وضو فرض یا نفل میں جو پانی کلی یا ناک میں پہنچانے میں صرف ہوا (۹) کچھ اعضاء دھو لیے تھے خشک ہو گئے۔ سُنّتِ موالات کی نیت سے انہیں دوبارہ دھو لیا شخص نے وضو علی الوضو کی نیت سے دوسرے کو کہا مجھے وضو کرا دے۔ اس پر دوسرے شخص نے بہ نیتِ ثواب کے اعضاء دھو دیئے۔ ان سب صورتوں میں جو پانی اعضاء سے مس کرکے جدا ہوا (بہا) ماءِ مستعمل ہے (۱۱) جنب یا بے کا اگر وہ عضو جس کی ابھی طہارت نہ کی (دھویا نہیں) اس عضو کا ذرا سا حصہ بھی ماءِ قلیل میں ڈوب جانے سے پانی ہو جائیگا۔ یعنی لوٹے میں پانی ہو تو جیسے اس میں سارا ہاتھ پڑنے سے پانی مستعمل ہو جائے گا۔ اسی طرح ناخن یا کوئی حصہ کے پڑنے سے بھی پانی مستعمل ہو جائے گا (۱۲) برتن میں پانی ہے اس میں بے وضو یا جنب کا پاؤں پڑ گیا (۱۳) یا کنویں یا حوضِ صغیر میں محض ٹھنڈ حاصل کرنے کے لیے غوطہ لگایا یا صرف ہاتھ پاؤں ڈالا یا ایک پورا ہی بلا دُھلا ڈال دیا مستعمل ہو گیا۔ اسی طرح غسل کرنے کی نیت سے جنب نے کنویں میں غوطہ لگایا پانی مستعمل ہو گیا۔

ان صورتوں میں پانی مستعمل نہیں ہوتا

(۱) وضو کرنے کے بعد پانی لوٹے میں بچ گیا۔ وہ ماءِ مستعمل نہیں ہے وہ پانی ہے جو استعمال سے بچ رہا ہے اس سے وضو کر سکتے ہیں پینے میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ (۲) جو شخص باوضو نہیں ہے اور پانی مٹکے وغیرہ میں ہے جس کو جھکا کر نہیں نکال سکتا تو کٹورے وغیرہ سے لے کر ہاتھ دھوئے یا کسی باوضو شخص یا نابالغ بچہ سے نکلوائے اور اگر یہ بھی مہیا نہ ہو تو چلو سے لے کر ہاتھ دھوئے

یا کسی باوضو شخص یا نابالغ بچہ سے نکلوائے اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو چلّو سے لے کر ہاتھ دھوئے۔ پانی اس ضرورت کے سبب مستعمل نہ ہوگا۔ بے ضرورت ہو تو مستعمل ہو جاتا ہے۔ (۳) آبِ کثیر یعنی دہ در دہ پانی یا جاری پانی جیسے نہر، سمندر، دریا میں بے وضو وضو کرے یا جنب غسل کرے یا کوئی نجاست ہی دھوئی جائے تو یہ پانی نجس نہ ہوگا اور نہ مستعمل ہوگا (۴) باوضو آدمی نے بلانیتِ وضو، اعضا ٹھنڈے کرنے یا میل دُور کرنے کے لیے وضو کیا (۵) یا باوضو آدمی نے بلانیتِ ثواب دوبارہ وضو کیا (۶) معلوم تھا کہ عضو، تین بار دھو چکا اور ہنوز پانی خشک نہ ہوا تھا۔ بلاوجہ چوتھی بار اور پانی اعضاء پر ڈالا۔

(۷) جیسے حاجتِ غسل نہیں ہے۔ اس پر غسل فرض نہ تھا۔ اس نے اعضاءِ وضو کے سوا مثلاً پیٹھ پر یا ران پر۔ یا سینہ یا پیٹ کو دھویا (۸) باوضو آدمی نے کھانا کھانے یا کھانے کے بعد یا ویسے ہی ہاتھ منہ صاف کرنے کو ہاتھ دھوئے کلی کی اور ادائے سنت کی نیت نہ کی تو ان سب صورتوں میں وہ پانی جو اعضا سے بہہ کر جُدا ہوا ماءِ مستعمل نہ ہوگا (۹) باوضو آدمی نے کوئی پاک کپڑا دھویا (۱۰) باوضو آدمی نے کسی جانور یا نابالغ بچے کو نہلایا اور بچے یا جانور کے بدن پر نجاست نہ تھی (پاک تھے)۔ اگرچہ وہ جانور غیر ماکول اللحم ہو جیسے بلّی چوہا اگرچہ بہ نیتِ ثواب نہلایا پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۱) عورت ابھی حیض و نفاس میں ہے۔ خون بند نہیں ہوا۔ اس حالت میں اس کا ہاتھ یا کوئی عضو، پانی میں پڑ جائے وہ پانی مستعمل نہ ہوگا کہ ابھی اس پر غسل واجب نہیں ہے۔ (والمسئلۃ فی الخانیۃ والخلاصۃ والبحر)۔ (۱۲) عورت ابھی حیض و نفاس میں ہے۔ خون بند نہیں ہوا، بے نیتِ قربت (عبادت و ثواب) غسل کیا پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۳) ناسمجھ بچے نے وضو کیا جس طرح دو تین سال کے بچے ماں باپ کو دیکھ کر بطور نقل و حکایتِ افعال وضو و نماز کرنے لگتے ہیں پانی مستعمل نہ ہوگا۔

(۱۴) باوضو شخص کا گرمی کے سبب عبادت یا مطالعہ کتاب میں دل نہیں جمتا۔ اس نیت سے ٹھنڈک پہنچے کو نہایا یا ہاتھ دھوئے۔ پانی مستعمل نہ ہوگا (۱۵) بے وضو نابالغ کا ہاتھ پانی میں ڈوب جانے سے پانی مستعمل نہ ہوگا۔ اس سے وضو روا ہے ہاں اگر شک ہو کہ بچہ کا ہاتھ ناپاک تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس پانی سے وضو نہ کیا جائے لیکن اگر کر لیا وضو ہوگیا کیونکہ محض شک سے کوئی چیز ناپاک نہیں ہوتی جب تک کہ یقین نہ ہو۔ (۱۶) بے وضو یا جنب نے کنویں یا حوضِ صغیر میں ڈول یا گلاس وغیرہ نکالنے کے لیے غوطہ مارا۔ پانی مستعمل نہ ہوگا کیونکہ یہ غوطہ مارنا ضرورت کے لیے ہے اور بضرورت ہاتھ ڈالنے اور غوطہ مارنے سے پانی مستعمل نہیں ہوتا۔

توضیح ضروری

۱۔ جس عضو کا جہاں تک پانی ڈالنا بضرورت ہے اتنا معاف ہے یعنی بضرورت اتنا ہاتھ پانی میں ڈالنے سے پانی مستعمل نہ ہوگا۔ مثلاً پانی بڑے مٹکے میں ہے اور کوئی برتن ایسا نہیں ہے جس سے پانی نکال کر استعمال کیا جائے تو چلّو لینے کے لیے جنب یا بے وضو نے ہاتھ ڈالا پانی مستعمل نہ ہوگا۔ لیکن اگر اسی صورت میں ہاتھ مثلاً کہنی یا نصف کلائی تک ڈال کر چلّو لیا تو پانی مستعمل ہو جائے گا کیونکہ چلّو بھر پانی لینے کے لیے ہاتھ کو نصف کلائی یا کہنی تک ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ (۲) مٹکے میں کٹورا یا گلاس گر گیا اس کو نکالنے کے لیے جنب یا بے وضو نے جتنے ہاتھ ڈالنے کی ضرورت تھی ڈالا اور کٹورا نکال لیا اگرچہ بازو تک یا بغل تک ہاتھ ڈالنا پڑا پانی مستعمل نہ ہوگا کیونکہ یہاں ضرورت ہے۔

۳۔ عورت کے جھوٹے پانی سے۔ اسی طرح عورت کے غسل یا وضو کرنے کے بعد جو پانی برتن یا لوٹے میں باقی رہ گیا مرد کو وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ یونہی مرد کے بچے ہوئے پانی سے عورت کو جائز ہے۔ (۴) کنویں میں غسل یا وضو کا پانی خواہ کتنا ہی ڈال دیا

مانے بشرطیکہ اس وضو و غسل کے پانی میں نجاست نہ ہو، کنواں پاک رہے گا اور برتن کا پانی مستعمل بھی نہ ہوگا۔ ہاں اگر مستعمل کی مقدار زائد ہو جائے تو پھر کنویں کا پانی مستعمل ہو جائے گا۔ مثلاً کنویں کا کل پانی فرض کیجیے ایک سو ڈول ہے۔ اب اس میں سے ایک سو ایک ڈول پانی مستعمل ڈال دیا، اب کنویں کا پانی بھی مستعمل ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

ماءِ مستعمل کا حکم

تحقیق یہ ہے کہ ہمارے سب ائمہ کے نزدیک ماءِ مستعمل پاک ہے اور حدث سے پاک کرنے والا نہیں ہے یعنی خود تو پاک ہے مگر نجاستِ حکمیہ کو زائل نہیں کرتا۔ اس لیے ماءِ مستعمل سے وضو و غسل نہیں ہو سکتا ہاں نجاستِ حقیقیہ اس سے دھو سکتے ہیں (۲) ماءِ مستعمل کو مسجد میں ڈالنا یا چھڑکنا حرام ہے (۳) ماءِ مستعمل سے کپڑے دھو سکتے ہیں۔ کسی چیز پر نجاست لگ جائے تو اس سے اس کو زائل کر سکتے ہیں۔ کپڑا اور وہ چیز پاک ہو جائے گی لیکن ماءِ مستعمل کو پینا اور اس سے آٹا گوندھنا مکروہ ہے (۴) مستعمل پانی سے محض بدن ٹھنڈا کرنے یا بدن سے میل کچیل زائل کرنے کے لیے نہا دھو سکتے ہیں (۵) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو بلکہ غسلِ جنابت کا پانی ہمارے حق میں طیب و طاہر ہے علیہ السلام کے آثارِ شریفہ مثل جبہ اقدس و نعلِ مبارک کا غسالہ شفاء و برکت ہے قابلِ وضو و مفیدِ طہارت ہے۔ مگر اس مقدس پانی سے اگر وضو کرے تو پاؤں پر نہ ڈالے، یا پاؤں کسی دوسرے پاک پانی سے دھو لے۔ ادب کا تقاضا یہی ہے ماءِ مستعمل کو قابلِ غسل و وضو بنانے کے دو طریقے ہیں۔ اول یہ کہ مستعمل پانی کی مقدار سے زائد اس میں طاہر و مطہر پانی ملا دیا جائے مثلاً ایک سیر پانی مستعمل ہے تو اس میں دو سیر پانی غیر مستعمل ملا دینے سے سب کا سب طاہر و مطہر ہو جائے گا۔ وضو اب اس پانی سے کر سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ جس برتن میں مستعمل پانی ہے اس میں غیر مستعمل پانی ڈالیے یہاں تک کہ برتن بھر جائے اور پانی برتن سے ابل کر بہنے لگے۔ اب سب پانی طاہر و مطہر ہو جائے گا۔

وَاَمَرَ جَرِيْرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ اَنْ يَّتَوَضَّئُوْا بِفَضْلِ سِوَاكِهٖ (بخاری شریف)

اور حضرت جریر ابن عبد اللہ نے اپنے اہل سے کہا مسواک کے بچے ہوئے پانی سے وضو کریں۔

اس اثر کو دارقطنی اور ابن شیبہ نے قیس ابن ابی حازم سے انھوں نے حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت جریر اپنی مسواک کا سر پانی میں ڈبو دیتے پھر اپنے گھر والوں سے کہتے اس پانی سے جو بچ رہا ہے وضو کر لو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ابو طالب نے امام احمد حنبل سے حضرت جریر کے مذکورہ بالا عمل کا مطلب پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت جریر اپنی مسواک برتن میں ڈال دیتے پھر اسی پانی سے وضو فرما لیتے۔

مسواک استعمال کرنے سے پہلے نرم کرنے کے لیے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پانی جس میں مسواک بھگوئی گئی ماءِ مستعمل نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی پاک چیز پانی میں ڈال دی جائے تو وہ پانی کو مستعمل نہیں کرتی۔ پھر یہ بھی سنت ہے کہ مسواک کرنے سے پہلے اور کرنے کے بعد اس کو تین بار دھویا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی جس سے مسواک کو دھویا گیا ماءِ مستعمل نہیں ہے کیونکہ ماءِ مستعمل ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کا استعمال بدنِ انسانی پر ہو (فافہم) اسلیے اس اثر کا باب سے تعلق سمجھ نہیں

توضیح

اس عنوان اور اس کے ماتحت اثر و احادیث کو ذکر کر کے امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ماءِ مستعمل طاہر و مطہر ہے لیکن اس عنوان کے ماتحت انھوں نے جس قدر حدیثیں ذکر کی ہیں وہ خاص حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی

اقدس سے متعلق ہیں کہ آپ کے اعضاء مبارک سے جو پانی ٹپکتا تھا صحابہ کرام اس کو تبرک سمجھتے تھے اور امر واقعہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے فضلات مبارک بھی طیب وطاہر ہیں تو آپ کے جسم پاک کے غسالہ کے طیب وطاہر ہونے میں کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان احادیث سے عام لوگوں کے استعمال کئے ہوئے پانی کو طاہر و مطہر قرار دینا کیوں کر صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۲) نیز ہمارے احناف بھی ماءِ مستعمل کو نجس قرار نہیں دیتے البتہ وہ احادیث جن میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے اور فضل طہور امراۃ سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ماءِ مستعمل سے پرہیز کرنا شارع علیہ السلام کو مطلوب ہے فافہم

۱۸۶- يَقُوْلُ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْهَاجِرَةِ فَأُتِيَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُوْنَ مِنْ فَضْلِ وَضُوْئِهِ فَيَتَمَسَّحُوْنَ بِهِ فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ

(۲) وَقَالَ أَبُوْ مُوْسٰى دَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فِيْهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيْهِ وَمَجَّ فِيْهِ ثُمَّ قَالَ لَهُمَا اشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلٰى وُجُوْهِكُمَا

۱۸۷- (۳) قَالَ أَخْبَرَنِيْ مَحْمُوْدُ بْنُ الرَّبِيْعِ قَالَ وَهُوَ الَّذِيْ مَجَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ وَجْهِهِ وَهُوَ غُلَامٌ مِنْ بِئْرِهِمْ وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَغَيْرِهِ يُصَدِّقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ وَإِذَا تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وَضُوْئِهِ

۱۸۸- (۴) بَابٌ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ يُوْنُسَ قَالَ حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمٰعِيْلَ عَنِ الْجَعْدِ قَالَ سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيْدَ يَقُوْلُ ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِيْ إِلَى النَّبِيِّ

حضرت ابوجحیفہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کو ہم پر برآمد ہوئے وضو کا پانی آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے وضو کیا۔ پھر لوگ آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی لینے لگے۔ پھر آپ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں (اس لیے کہ آپ مسافر تھے) اور آپ کے سامنے ایک برچھی گڑی تھی۔

اور ابوموسیٰ اشعری نے کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ پانی منگوایا اور اپنے منہ اور ہاتھ اس میں دھوئے اور اسی میں کلی کی۔ پھر بلال اور ابوموسیٰ سے کہا اس میں سے دونوں پی لو اور اپنے منہ اور سینہ پر ڈالو۔

محمود بن ربیع نے بیان کیا اور یہ محمود وہی ہیں جن کے منہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی کر دی تھی جب وہ بچے تھے ان کے کنوئیں کے پانی سے اور عروہ نے مسور بن مخرمہ وغیرہ (مروان) سے روایت کی ہر ایک اپنے ساتھی کو سچا بتاتا تھا کہ (عروہ بن مسعود نے مکہ کے مشرکوں سے کہا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے ہیں تو آپ کے وضو کے غسالہ کیلئے لوگ لڑنے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔

باب: ہم نے عبدالرحمٰن بن یونس نے بیان کیا۔ کہا ہم سے حاتم بن اسمٰعیل نے انھوں نے جعد بن عبدالرحمٰن سے انھوں نے کہا میں نے سائب بن یزید سے سُنا وہ کہتے تھے میری خالہ مجھ کو نبی کریم صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ابْنُ اُخْتِيْ وَجِعٌ فَمَسَحَ رَاْسِيْ وَدَعَالِيْ بِالْبَرَكَةِ ثُمَّ تَوَضَّاَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوْئِهٖ ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ

علیہ وسلم کے پاس لے گئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ میرا بھانجا بیمار ہے (پاؤں کے درد سے) آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا کی پھر آپ نے وضو کیا تو میں نے آپ کے وضو سے بچا ہوا پانی پی لیا پھر آپ کی پیٹھ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ میں نے مہر نبوت دیکھی آپ کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایسی تھی جیسے چھپر کھٹ کی گھنڈی۔

فوائد ومسائل

اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے یہ چند حدیثیں ذکر کی ہیں۔ ہم نمبروار ہر حدیث کے فوائد ومسائل بیان کرتے ہیں۔ حدیث اول کو امام بخاری نے صلوٰۃ و باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور امام مسلم نے صلوٰۃ میں ذکر کیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کے ماتحت لکھا کہ:

فِيْهِ جَوَازُ التَّبَرُّكِ بِاٰثَارِ الصَّالِحِيْنَ
(عینی ج ۱ صہ ۸۲۴)

کہ اس حدیث سے بزرگانِ دین کے آثار کو تبرک بنانے کا جواز نکلتا ہے۔

یہ واقعہ سفر کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں ظہر و عصر کی نمازیں قصر پڑھیں۔ جس سے واضح ہوا کہ بحالتِ سفر چار رکعتی فرض دو پڑھے جائیں اور یہ بھی کہ جب صحرا وغیرہ میں نماز پڑھی جائے تو کوئی چیز ایسی سامنے رکھ لی جائے یا گاڑ دی جائے جو سترہ کا کام دے سکے۔ حضور علیہ السلام کے سامنے نیزہ کھڑا ہوا تھا ۲۔ ہجر کے لغوی معنے ترک کرنے اور چھوڑنے کے ہیں۔ ھاجرہ وقت نصف النہار کو کہتے ہیں کیونکہ عرب اس وقت گرمی کی وجہ سے راستہ میں چلنا ترک کر دیتے تھے اور گھروں میں بیٹھ رہتے تھے۔ لہٰذا نصف النہار کے وقت کو ھاجرہ کہنے لگے۔

حدیث دوم، کے ماتحت علامہ کرمانی نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا لعاب مبارک مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار تھا۔ (عینی)۔ (۲) یہ دو خوش نصیب حضرات، ابو موسیٰ و حضرت بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) تھے جنھیں حضور علیہ السلام نے اپنی کلی کا پانی عطا فرمایا اور فرمایا اس کو پی لو اور اپنے چہرہ پر ڈال لو۔ معلوم ہوا کہ بزرگانِ دین کے استعمال کیے ہوئے پانی کو متبرک سمجھنا اور برکت کے لیے اپنے بدن پر ڈالنا جائز ہے۔

حدیث سوم، کو امام بخاری نے کتاب العلم باب متی یصح سماع الصغیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت محمود ابن ربیع کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے ان کے چہرہ پر کلی فرمادی۔ اس وقت ان کی عمر ۵ سال تھی۔

حدیث چہارم، صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابن مسعود ثقفی کفار مکہ کی طرف سے تفتیش حال کے لیے آئے تھے وہاں انھوں نے صحابہ کرام کی حضور علیہ السلام سے والہانہ محبت و عقیدت کو دیکھا۔ انھوں نے نظارہ کیا کہ جب حضور ناک سنکتے تو صحابہ بڑھ کر آپ کے فضلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور اپنے چہروں پر مل لیتے۔ جب حضور علیہ السلام وضو فرماتے تو صحابہ کرام وضو کے غسالہ کو حاصل کرنے کے لیے

کوشش کرتے تھے۔ حضرت عروہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے اس فعل کو کادوا یقتتلون علی وضوءہ کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

حدیث پنجم۔ کو امام نے طب، دعوات، صفۃ النبی میں ذکر کیا۔ مسلم نے صفۃ النبی میں، ترمذی نے مناقب میں اور نسائی نے طب میں ذکر کیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے حدیث ہذا کے تحت ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

وَهُوَ يَقُوْلُ بِطَهَارَةِ بَوْلِهٖ وَسَائِرِ فُضُلَاتِهٖ (عینی ج ۱ ص ۳۵)	حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ حضور علیہ السلام کے بول مبارک اور تمام فضلات کو پاک قرار دیتے ہیں۔

ان احادیث سے بلا کسی کھینچ تان کے امور ذیل پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات مبارک اور جسم پاک کا دھوون طیب و طاہر، باعث برکت موجب رحمت ہے۔ صحابہ کرام بھی اس سے برکت حاصل کرتے اور اس کو متبرک جانتے تھے اور اس سے نفع کی امید رکھتے تھے۔ ثابت ہوا کہ بزرگان دین کے آثار کو تبرک بنانا، متبرک سمجھنا اور نفع کی امید رکھنا بدعت و شرک نہیں ہے بلکہ جائز ہے اور سنت صحابہ ہے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تقریری ہے۔

مہر نبوت یہ حضور سید عالم علیہ السلام کے دونوں کندھوں کے درمیان گوشت کا ابھار سا تھا جس کے ارد گرد سیاہ بال تھے۔ صحابہ کرام نے اس کو مختلف الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مسلم میں بیضہ حمامہ کے لفظ آئے۔ یعنی وہ گوشت کا ابھار کبوتر کے انڈے کی طرح تھا۔ ترمذی میں کالتفاحۃ کا لفظ آیا ہے (یعنی سیب کی طرح تھا) خاتم نبوۃ میں محمد رسول اللہ کے لفظ دکھائی دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاتم نبوۃ دیکھ کر ہی حضور علیہ السلام پر ایمان لائے تھے ——— عیسائی راہبوں اور دین عیسوی کے عالموں نے انھیں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تین نشانیاں بتائی تھیں۔ اول یہ کہ خود صدقہ نہ کھائیں۔ دوم یہ کہ ہدیہ خود بھی تناول فرمائیں گے۔ سوم یہ کہ ان کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ پہلی دو علامتیں تو میں نے حضور میں پائی تھیں مگر تیسری علامت مہر نبوت کے دیکھنے کا میں مشتاق تھا اور اسی کے مشاہدہ کے لیے ایک دن میں حضور کی پس پشت کھڑا ہو گیا کہ کسی طرح مجھے خاتم نبوت نظر آئے۔ میں اسی کشش و پیچ میں تھا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت دیکھ کر چادر مبارک کو پشت سے علیحدہ کر دیا۔ جونہی مجھے مہر نبوت نظر آئی میں نے اسے چوم لیا۔ (حجۃ اللہ علی العالمین۔ (ابن سعد، بیہقی و ابو نعیم)

عیسائی راہبوں کا اپنے متعلقین کو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی علامت سے خاتم نبوت کو شمار کرنا اس امر کا اشارہ کرتا ہے کہ شاید کتب سماویہ میں حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علامات کا جو ذکر تھا ان میں مہر نبوت کا بھی ذکر ہو، (واللہ اعلم) بخاری کی زیر تفہیم حدیث میں مثل زر الحجلۃ کے لفظ آئے ہیں۔ حجلہ دراصل گنبد نما عمارت کو کہتے ہیں اور چھپر کھٹ کو بھی حجلہ کہتے ہیں۔ لکڑی کے تخت کے چاروں طرف بانس باندھ کر اس کو کپڑے سے آراستہ کرتے ہیں اور اس میں پھندنے لٹکا دیتے ہیں۔ مطلب صرف یہ ہے وہ گوشت کا ابھار چھپر کھٹ کے پھندنے کی طرح تھا۔

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ غُرْفَةٍ وَّاحِدَةٍ

باب ایک ہی چلو سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

اس باب کے قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصود یہ بتانا ہے کہ کلی اور ناک میں پانی لینا ایک ہی چلو پانی سے سنّت ہے اور امام نے حدیث عبداللہ بن زید سے استدلال کیا ہے جو یہ ہے کہ انھوں نے پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھویا

۱۸۹- وَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَّاحِدَةٍ فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلٰثًا (بخاری) | پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا ایک ہی چلو پانی سے تین بار ایسا کیا۔

پھر انھوں نے ہاتھ کہنیوں تک دھوئے (دو دو بار) اور سر کا مسح کیا اور ٹخنوں تک پاؤں دھوئے اور پھر کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔

یہ حدیث امام بخاری نے پانچ مرتبہ ذکر کی ہے اور جتنے جملے عربی عبارت کے ہم نے یہاں لکھے ہیں یہ ترجمہ باب احناف کا مسلک یہ ہے کہ ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ پانی کا چلو لینا سنّت ہے۔ البتہ ایک چلو سے کلی کی جائے اور ناک میں پانی ڈال لیا جائے تو جائز ہے۔ یہ حدیث احناف کے مسلک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ میں ایک ہی چلو سے ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کا جو ذکر ہے وہ بیان جواز کے لیے ہے اور احناف اس کے منکر نہیں ہے۔ البتہ ان کے نزدیک ناک میں پانی ڈالنے کے لیے علیحدہ پانی کا چلو لینا اور کلی کے لیے علیحدہ پانی لینا سنّت جیسا کہ حدیث داؤد میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہر دو کے لیے علیحدہ علیحدہ پانی کا چلو لیا —— شیخ ابن الہمام نے من کفۃ واحدۃ کی ایک اور ہی توجیہ کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ راوی کا مقصود اس جملے سے فصل و وصل نہیں ہے بلکہ بتانا مقصود ہے کہ مضمضہ و استنشاق کے لیے ایک کف استعمال ہو کفّیں نہیں یعنی وضو کے لیے دیگر اعضا کے دھونے کے لیے دونوں ہاتھ استعمال ہوتے ہیں تو راوی حدیث مذکورہ بالا سے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کلی کرنے اور ناک میں کے لیے ایک ہاتھ استعمال کیا جائے دو نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیلی گفتگو باب الوضوء مرۃ مرۃ (باب وضو میں ایک ایک بار دھونا) میں ہو چکی ہے۔ قارئین یہ مقام دوبارہ دیکھ لیں۔

بَابُ مَسْحِ الرَّاْسِ مَرَّةً

باب سر کا مسح ایک بار کرنا

اس عنوان کے ماتحت بھی امام بخاری نے حدیث عبداللہ بن زید ہی کو ذکر کیا ہے جس میں یہ لفظ آئے ہیں۔

۱۹۰، ۱۹۱- ثُمَّ مَسَحَ بِرَاْسِهٖ (بخاری) | پھر انھوں نے سر پر مسح کیا۔

سر کا مسح ایک بار کیا جائے یا تین بار

یہ حدیث باب غسل الرجلین الی الکعبین (پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے جائیں) حدیث ۱۸۵ کے ذیل میں گزر چکی ہے

حدیث کے مذکورہ بالا جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک بار کرنا سنّت ہے۔ چنانچہ وہیب کی روایت میں مسح برأسه مرّة کے لفظ موجود ہیں (بخاری)۔ واضح ہو کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سر کا مسح تین بار کرنا ہے وہ حدیث علی و عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے استدلال کرتے ہیں۔ جس میں یہ مذکور ہے کہ ان دونوں حضرات نے تین بار سر کا مسح کیا لیکن ان دونوں حدیثوں میں کلام ہے اور مجاہد، حسن بصری، امام ابوحنیفہ و محمد و مالک و ابونصر جو اصحاب

ستہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے نزدیک ایک بار مسح کرنا سنت ہے۔ ان حضرات رحمہم اللہ کے دلائل یہ ہیں۔

(۱) بخاری ومسلم میں حضرت عثمان وعبداللہ بن زید کی حدیث میں مسح کا عدد مذکور نہیں ہے۔ حالانکہ باقی اعضا کے تعلق تین تین بار کا ذکر ہے (۲) حدیث علی وابن ابی اوفی وابن عباس وسلمہ بن الاکوع وربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب میں ایک بار ہی مسح کرنے کی تصریح ہے۔ حدیث علی کے متعلق امام ترمذی نے فرمایا حسن صحیح ہے (۳) امام بیہقی نے فرمایا کہ حضرت عثمان سے تین بار مسح کرنا مروی ہے غریب ہے اور حفاظ ثقات کے خلاف ہے اس لیے حجت نہیں (۴) امام ابوداؤد نے فرمایا کہ حضرت عثمان سے اس بارے میں جو صحیح حدیثیں ہیں وہ اس پر دال ہیں کہ سر کا مسح ایک بار ہی ہے (نیل الاوطار) ابن خزیمہ نے حدیث عبداللہ بن عمرو ابن العاص کو صحیح کہا۔ اس میں یہ آیا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو سے فارغ ہوا۔ مسح فرمایا اور روایت سعید بن منصور میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے ایک بار سر کا مسح کیا تھا۔

من زاد علی هذا فقد اساء وظلم (عینی ج ۱ ص ۷۴۳) | جس نے اس پر زیادتی کی اس نے برا کیا اور ظلم کیا

اس حدیث سے بھی تین بار مسح کرنے کی مسنونیت کی نفی ہوتی ہے اور اس سلسلہ کی حدیثوں کے الفاظ یہ ہیں:۔

(۱) حدیث عبداللہ بن زید: ثم مسح رَاسه بيديه (بخاری) (۲) حدیث حضرت عثمان غنی: ثم مسح برأسه (بخاری) (۳) حدیث عبداللہ بن زید۔ فمسح راسه فاقبل بهما وادبر مرة واحدة (بخاری) (۴) حدیث وہیب۔ مَسَحَ راسه مرةً (بخاری) (۵) حدیث علی وَمَسَحَ براسه مرةً (ترمذی وصححہ) (۶) حدیث علی مَسَحَ براسه واحدة (ابوداؤد) (۷) حدیث عائشہ۔ مسحت راسها مسحة واحدة (نسائی) (۸) حدیث حضرت انس۔ مسح براسه مرة (طبرانی) (۹) حدیث سلمہ بن اکوع۔ ومسح براسه مرةً (۱۰) حدیث ربیع۔ مَسَحَ رَاسَه ما اقبل منه وَما ادبر وصدغيه واذنيه مرةً واحدةً (ترمذی وقال حسن صحیح) (۱۱) حدیث حسین بن علی مَسَحَ براسه مرة واحدة (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

توضیح | یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک تین بار مسح کرنا اور ہر بار نئے پانی سے ہاتھ کو تر کرکے مسح کرنا سنت ہے۔ اب اس سلسلہ کی جسقدر حدیثیں ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کس پایہ کی ہیں۔ ان میں جو لفظ ملتے ہیں وہ صرف یہ ہیں:۔

مَسَحَ ثلاثَ مرّاتٍ | حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین بار مسح کیا

میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ تکرار مسح کی حدیثوں میں تین بار مسح کا ذکر تو ہے مگر اس کی تصریح کسی روایت میں بھی نہیں ہے کہ "تین بار مسح" ہر بار نئے پانی سے ہاتھ تر کرکے کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی تین بار مسح کرنا جائز تو ہے۔ بشرطیکہ ایک دفعہ ہاتھ تر کرکے کیا جائے۔ ہر بار ہاتھ کو نئے پانی سے تر نہ کیا جائے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے تصریح کی والذی يروى من التثليث محمول عليه بماء واحد (ہدایہ اولین ص ۳۲) غرضیکہ تثلیث مسح کی حدیثوں کا مطلب مسحات متعددہ نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود استیعاب راس ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی مسنون ہے۔ فافہم۔

بَابُ وُضُوْءِ الرَّجُلِ مَعَ امْرَاَتِهٖ وَفَضْلِ وَضُوْءِ

باب مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ مل کر وضو کرنا اور عورت کے وضو سے جو پانی بچ جائے اس کا استعمال کرنا

الْمَرْاَةِ وَتَوَضَّاَ
عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْحَمِيْمِ
وَمِنْ بَيْتِ نَصْرَانِيَّةٍ

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضو کیا
ایک نصرانی عورت کے گھر سے پانی لے کر استعمال

فوائد و مسائل

عنوان ہذا سے مقصود یہ ہے کہ عورت و مرد مل کر اگر کسی برتن سے وضو کریں تو جائز ہے ؛ اسی طرح عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرنا بھی جائز ہے، نیز کافر کے گھر کا پانی جب کہ اس کے ناپاک ہونے پر دلیل نہ ہو استعمال کیا جا سکتا ہے اور قرآن میں جو "انما المشرکون نجس" آیا ہے اس سے نجاست اعتقادی مراد ہے۔

کفار کے کنوئیں اور برتن کے پانی کا حکم

علامہ عینی نے فرمایا کہ اس اثر سے کفار کے کنوؤں اور برتنوں سے پانی کے استعمال کا جواز نکلتا ہے لیکن ان کے برتنوں کو خواہ اہل کتاب یہودی و نصاریٰ ہی کیوں نہ ہوں استعمال کرنا مکروہ ہے (عینی ج) اسی لیے فقہاء احناف نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اور ہنود کے برتن اگر کسی مسلمان نے خرید لیے تو ان کو دھونے سے پہلے استعمال کرنا مکروہ ہے (ذخیرہ)

گرم پانی سے وضو و غسل کرنے کے مسائل

(۱) اتنے گرم پانی یا اتنے سرد پانی سے وضو و غسل مکروہ ہے جو بدن پر اچھی طرح نہ ڈالا جا سکے اور تکمیل سنت نہ کرنے دے اور اگر پانی گرم یا سرد ہے کہ فرض پورا کرنے سے روکے تو پھر ظاہر ہے کہ وضو و غسل ہوگا ہی نہیں (۲) اوطیوں سے گرم کیے ہوئے پانی سے وضو و غسل سے احتمالِ برص ہے، اس مسئلہ میں اختلافات بکثرت ہیں مگر قول اصح و ارجح یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب منتہی الآمال میں ثابت کیا ہے (۳) اپنی بیوی کے بچے ہوئے پانی سے وضو و غسل بلا کراہت جائز ہے۔ ہاں غیر محرم عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو و غسل کرنے کو ہمارے فقہاء نے مکروہ لکھا ہے کیونکہ اس میں فسادِ نیت کا خطرہ ہے۔

۱۹۲- اَنَّهٗ قَالَ كَانَ الرِّجَالُ وَالنِّسَآءُ
يَتَوَضَّئُوْنَ فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمِيْعًا (بخاری)

حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ مرد اور عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک برتن سے وضو کیا کرتے تھے (یعنی پردہ کا حکم آنے سے پہلے)

فوائد و مسائل

حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) صحابی جب کسی فعل کو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرف نسبت کرے تو اس کو رفع کا حکم دیا جائے گا۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے (۲) عورت مرد اگر ایک ہی برتن سے وضو کریں تو جائز ہے (۳) عورت وضو کر چکی اب برتن میں جو پانی باقی ہے اس سے وضو کرنا جائز ہے (۴) بعض شارحین نے حدیث زیر بحث کا مطلب یہ لیا ہے کہ پانی تو ایک ہی برتن میں ہوتا تھا اور پہلے عورتیں وضو کر کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ پھر مرد آتے اور وضو کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یکدم اکٹھے عورتیں و مرد ایک

ی برتن سے وضوء نہیں کرتے تھے یا اگر کرتے بھی تھے تو یہ واقعہ پردہ کے حکم کے نزول سے پہلے کا ہوگا۔

بَابُ صَبِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضُوْءَهٗ عَلَى الْمُغْمٰى عَلَيْهِ

باب حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وضوء کا بچا ہوا پانی ایک بیہوش آدمی پر ڈالا

۱۹۳ - يَقُوْلُ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُنِيْ وَاَنَا مَرِيْضٌ لَا اَعْقِلُ فَتَوَضَّأَ وَصَبَّ عَلَيَّ مِنْ وَضُوْئِهٖ فَعَقَلْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَنِ الْمِيْرَاثُ اِنَّمَا يَرِثُنِيْ كَلَالَةٌ فَنَزَلَتْ اٰيَةُ الْفَرَائِضِ

حضرت جابر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری بیمار پرسی کے لیے تشریف لائے میں ایسا بیمار تھا کہ بالکل بیہوش تھا۔ آپ نے وضوء کیا اور اپنے وضوء کے بچے ہوئے پانی کو مجھ پر ڈال دیا۔ مجھے ہوش آگیا۔ میں نے عرض میرا وارث کون ہوگا میں توکلالہ ہوں تب آیت فرائض نازل ہوئی۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے طب و فرائض میں ذکر کیا۔ مسلم نے فرائض میں۔ نسائی نے طب، طہارۃ اور تفسیر میں (۲) علامہ ابن بطال نے کہا۔ اس حدیث سے ماءِ مستعمل کے پاک ہونے کا ثبوت ملتا ہے لیکن ظاہر ہے یہ بات اس حدیث سے قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام نے جو پانی برتن میں وضوء کرنے کے بعد باقی رہ گیا تھا وہ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) پر ڈالا ہو اور اس کا پاک ہونا مسلم ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ حضور علیہ السلام کے جسم پاک کا دھوون ہی تھا تو اس کے طیب وطاہر ہونے میں کس کو کلام ہے (۳) علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا صالحین کے جھوٹے پانی سے برکت کی اُمید رکھنا جائز ہے۔ (وَفِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ بَرَكَةَ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تزول کل علة) اس میں اس امر پر بھی دلیل ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس کی برکت سے ہر بیماری دُور ہو جاتی ہے (عینی ج ۱ ص ۸۳۹) (۴) مسلمان خصوصاً غریب مسلمان کی عیادت کرنا مسنون ہے اور باعثِ ثواب ہے (۵) بڑے چھوٹوں کی عیادت کو جائیں۔

کلالہ کے معنیٰ

فرائض جمع ہے فریضہ کی اور یہاں اس سے مراد ورثہ کے وہ حصے ہیں جو قرآنِ مجید میں مقرر فرمائے گئے ہیں۔ کلالہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے بعد نہ باپ کو چھوڑے نہ اولاد کو۔ آیت یہ ہے۔ يَسْتَفْتُوْنَكَ لِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ الخ اس آیت کا شانِ نزول حدیث زیرِ بحث ہی ہے، جب حضور علیہ السلام نے حضرت جابر پر اپنا آبِ وضو ڈالا تو وہ صحت یاب ہو گئے۔ دیکھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں۔ عرض کی سرکار میں نے مال کا کیا انتظام کروں۔ اس پر یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ (بخاری و ابوداؤد) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور اکرم حضرت جابر سے فرمایا۔ میرے علم میں تمہاری موت اس بیماری سے نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کا ب وضو تبرک ہے اور اس کو حصولِ شفا کے لیے استعمال کرنا سنت ہے۔ مریضوں کی عیادت بھی سنت ہے۔

بَابُ الْغُسْلِ وَالْوُضُوْءِ فِي الْمِخْضَبِ وَالْقَدَحِ وَالْخَشَبِ وَالْحِجَارَةِ

باب لگن پیالے اور لکڑی اور پتھر کے برتن سے غسل اور وضو کرنا جائز ہے)

مخضب۔ اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کپڑے دھوئے جائیں یعنی مرکن۔ قدح کی جمع اقداح ہے جس میں پیاجاتاہے یعنی پیالہ۔ خشب لکڑی کو کہتے ہیں۔ حجارة سے مراد تمام جواہر ارض جیسے لوہا، پیتل، تانبا، پتھر اور تمام وہ اشیاء جن کے برتن وغیرہ بنتے ہیں۔

۱۹۴- عَنْ اَنَسٍ قَالَ حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَقَامَ مَنْ كَانَ قَرِيْبَ الدَّارِ اِلٰى اَهْلِهٖ وَبَقِيَ قَوْمٌ فَاُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِخْضَبٍ مِّنْ حِجَارَةٍ فِيْهِ مَاءٌ فَصَغُرَ الْمِخْضَبُ اَنْ يَّبْسُطَ فِيْهِ كَفَّهٗ فَتَوَضَّاَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ قُلْنَا كَمْ كُنْتُمْ قَالَ ثَمَانِيْنَ وَزِيَادَةً

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ (عصر کی) نماز کا وقت آگیا تو جس کا گھر قریب تھا وہ تو اپنے گھر (وضو کرنے) کو گیا اور کچھ لوگ رہ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پتھر کی ایک لگن لائی گئی جس میں پانی تھا، وہ اتنی چھوٹی تھی کہ حضور علیہ السلام اپنی ہتھیلی اس میں پھیلا نہ سکے لیکن باوجود اس کے سب لوگوں نے اسی سے وضو کیا۔ حضرت انس رضی اللہ سے تو پوچھا کہ اس وقت وضو کرنے والے کتنے تھے فرمایا اسی سے کچھ زیادہ (بخاری)

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام نے علامات نبوۃ میں بھی ذکر کیا۔ امام مسلم نے یوں روایت کیا کہ حضور علیہ السلام مقام زوراء میں تھے۔ وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی تو حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک پیالہ لایا گیا جس میں پانی تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس میں رکھ دیا تو آپ کی انگلیوں سے پانی نکلنے لگا اور اسی پانی سے تمام صحابہ کرام نے وضو کیا۔ (۲) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) انگلیوں سے پانی نکلنا حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم و جلیل معجزہ ہے (۲) برتن خواہ لکڑی کا ہو یا کسی اور دھات تانبا، پیتل، پتھر وغیرہ کا استعمال کرنا بلاکراہت جائز ہے۔ البتہ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام و ناجائز ہے۔

۱۹۵- عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا بِقَدَحٍ فِيْهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهٗ فِيْهِ وَمَجَّ فِيْهِ (بخاری شریف)

حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ایک پیالہ منگایا۔ اس میں ہاتھ دھوئے، منہ دھویا اور کلی کی۔

فوائد و مسائل (۱) یہ حدیث باب استعمال فضل وضوء الناس میں حدیث ۸۶ میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پانی کو متبرک کرنے کے لیے کبھی اس میں کلی فرمادیا کرتے تھے اور کبھی ہاتھ و چہرہ مبارک دھودیا کرتے تھے۔ یہ پانی صحابہ کرام بطور تبرک حاصل کرتے۔ بیماروں کو پلایا جاتا تو صحت یاب ہو جایا کرتے تھے۔

(۲) اس حدیث ۱۹۶ کے بعد امام نے ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم نے (ماءً فی

تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ) پیتل کی لگن میں پانی پیش کیا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔

واضح ہو کہ امام بخاری نے اس مضمون کی جس قدر حدیثیں لکھی ہیں۔ ان سے مقصود یہ جتانا ہے کہ تانبے پیتل وغیرہ جواہر ارض کے برتن سے وضو کرنا، اس میں کھانا پینا سب بلا کراہت جائز ہے۔ ایسے برتنوں سے وضو کرنے میں کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ ہاں بغیر قلعی کے برتن میں کھانا پینا مکروہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قلعی کا برتن جسمانی ضرر کا باعث ہے اور مٹی کا برتن تانبے پیتل کے برتن سے انفس ہے۔ علماء نے وضو کے آداب و مستحبات سے یہ بھی شمار کیا ہے کہ مٹی کے برتن سے وضو کیا جائے۔ اسی طرح مٹی کے برتن میں کھانا کھانا تواضع کے قریب تر ہے۔ (رد المحتار)

۱۹۷- أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاشْتَدَّ بِهِ وَجَعُهُ اسْتَأْذَنَ أَزْوَاجَهُ فِي أَنْ يُمَرَّضَ فِي بَيْتِي فَأَذِنَّ لَهُ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ تَخُطُّ رِجْلَاهُ فِي الْأَرْضِ بَيْنَ عَبَّاسٍ وَرَجُلٍ آخَرَ قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَأَخْبَرْتُ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ أَتَدْرِي مَنِ الرَّجُلُ الْآخَرُ قُلْتُ لَا قَالَ هُوَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَكَانَتْ عَائِشَةُ تُحَدِّثُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَعْدَ مَا دَخَلَ بَيْتَهُ وَاشْتَدَّ وَجَعُهُ هَرِيقُوا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَمْ تُحْلَلْ أَوْكِيَتُهُنَّ لَعَلِّي أَعْهَدُ إِلَى النَّاسِ وَأُجْلِسَ فِي مِخْضَبٍ لِحَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ طَفِقْنَا نَصُبُّ عَلَيْهِ تِلْكَ حَتَّى طَفِقَ يُشِيرُ إِلَيْنَا أَنْ قَدْ فَعَلْتُنَّ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى النَّاسِ (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سخت ہو گئی تو آپ نے اپنی ازواج سے میرے گھر میں تیمار داری ہونے کی اجازت لی۔ سب نے اجازت دیدی۔ آپ دو آدمیوں (عباس و علی) کے سہارے تشریف لائے۔ آپ کے دونوں پاؤں سے زمین پر لکیر کھنچتی جا رہی تھی۔ وہ دو آدمی عباس تھے اور ایک اور۔ عبید اللہ نے کہا میں نے یہ حدیث عبد اللہ بن عباس سے بیان کی۔ انھوں نے کہا تو جانتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کون تھے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا وہ علی ابن ابی طالب تھے اور حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرہ میں آ گئے اور آپ کی بیماری زیادہ ہو گئی تو آپ نے فرمایا مجھ پر ایسی سات مشکیں بہاؤ جن کے منہ نہ کھولے گئے ہوں تاکہ میں لوگوں کو وصیت کر سکوں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک لگن میں جو جونبے کی تھی) بٹھایا گیا اور ہم نے آپ پر مشکیں بہانا شروع کیں۔ یہاں تک آپ نے اشارہ سے فرمایا۔ تم اپنا کام پورا کر چکیں۔ پھر آپ لوگوں پر برآمد ہوئے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم نے صلوٰۃ میں، نسائی نے عشرۃ النساء و وفات میں، ترمذی نے جنائز میں اور امام بخاری نے اس حدیث کو تقریباً سات جگہ ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم نے پوری حدیث لکھ دی ہے۔ آئندہ جس عنوان کے ماتحت یہ حدیث آئے گی ہم پوری حدیث نہیں لکھیں گے بلکہ عنوان کے مناسب الفاظ نقل کریں گے۔ یہ

حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے۔

(۱) شوہر کو اپنی تمام بیویوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے۔ حضور علیہ السلام نے اپنی ازواج مطہرات کے لیے باری مقرر فرمادی تھی لیکن اس مرض میں حضور اکرم کا فطری رجحان یہ تھا کہ جناب عائشہ صدیقہ کے ہاں یہ ایام گزاریں۔ اس پر آپ نے اپنی باقی ازواج سے اجازت مانگی اور انھوں نے جونہی اجازت دیدی تب حضور علیہ السلام حضرت عائشہ صدیقہ تعالیٰ عنہا کے مکان میں آگئے (۲) خاندان کے فردِ اعلیٰ یا حاکم کو بوقتِ وفات ضروری امور کی وصیت کرنا اور ان کی طرف خصوصی توجہ دلانا مستحب ہے (۳) پیتل، تانبے وغیرہ کے برتن میں بیٹھ کر نہانا جائز ہے (۴) مریض پر بہ نیت دوا و شفا پانی جائز ہے۔ اس سے بزرگوں کے ٹوٹکوں کے جواز کا ثبوت بھی ملتا ہے، بشرطیکہ وہ خلافِ شریعت نہ ہوں (۵) سات مشک پانی ڈالنے کے حکم کی اصل حکمت تو اللہ کا رسول ہی جانتا ہے۔ ویسے شارحین نے لکھا ہے کہ سات کا عدد متبرک ہے اللہ تعالیٰ نے بہت سی اشیاء سات پیدا کی ہیں اور سات کا عدد وتر بھی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وتر پسند ہے (۶) حضور علیہ السلام نے ایسی سات مشکیں ڈالنے کا حکم فرمایا ہے۔ جن کے مُنہ نہ کھولے گئے ہوں۔ اس کی حکمت یہ ہوگی کہ پانی بالکل صاف و پاک ہو اور دست و برد سے محفوظ ہو (۷) اس حدیث سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت پر روشنی پڑتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاں قیام فرمانا محبوب جانا (۸) یہ سات عدد مشک ڈالنے سے حضور شفایاب ہوگئے۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ حضور علیہ السلام کو معلوم تھا کہ اس طریقہ سے میں ہوجاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عینی ج۱ ص۴۴۴ (۹) طبرانی کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضور علیہ السلام نے سات کنوؤں کا پانی طلب فرمایا تھا۔ اس نوع کی شرطیں بزرگوں کے عملیات و تعویذات میں بھی ہوتی ہیں جو غالباً اسی حدیث سے

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ التَّوْرِ

باب تور سے وضو کرنے کے بیان میں

واقعہ معراج کے متعلق جو حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس میں یہ لفظ ہیں۔ فاتی بطست من ذہب۔ اس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ تور کے معنی لوٹے کے ہیں کیونکہ طشت کے ساتھ لوٹے کی طرز کا ایک برتن ہوتا ہے۔ اس باب کے ماتحت امام نے حدیث عبداللہ بن زید ذکر کی ہے۔ جس میں وضو کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ حدیث **۱۹۸**۔ اوراق میں مع تفہیم کے گزر چکی ہے اس میں یہ ہے۔ فدعا بتور کہ انھوں نے پانی کا ایک لوٹا منگوایا۔ یہی ترجمہ ہے اور اس سے تانبا پیتل وغیرہ کے لوٹے سے وضو کرنے کا جواز نکلتا ہے (۲) امام نے اس باب میں حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ذکر کی ہے جس میں یہ لفظ ہیں:۔

۱۹۹۔ دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ مَاءٍ فَأُتِيَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ (بخاری شریف)

حضور علیہ السلام نے پانی کا ایک برتن منگوایا تو ایک ایسے پیالہ میں آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا جس کا منہ چوڑا تھا اور اس میں تھوڑا سا پانی بھی تھا۔

اس کے بعد مضمون حدیث یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس پیالہ میں رکھ دیا۔ حضرت

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی انگلیوں سے پانی جوش مارتے ہوئے دیکھا۔ اس ایک پیالہ سے وضوء کرنے والے صحابہ ستر یا اسی کے قریب تھے۔ اس مضمون کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے بھی پیالہ سے وضو کرنیکا جواز نکلتا ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ بِالْمُدِّ

باب ایک مدپانی سے وضو کرنیکا بیان

مسئلہ: امام شافعی علیہ الرحمۃ واہل حجاز کے نزدیک ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مُد دو رطل کا ہے۔ امام اعظم حدیثِ ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

۲۰۰- كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ بِمُدٍّ رَطْلَيْنِ وَ يَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ ثَمَانِيَةِ اَرْطَالٍ (دارقطنی وابن عدی)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدپانی سے وضو فرمایا۔ ایک مد دو رطل کا تھا اور ایک صاع پانی سے غسل فرمایا جو آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔

مد اور صاع کا وزن صاع کا ایک پیمانہ ہے۔ چار مدکا، اور مد جس کو من بھی کہتے ہیں۔ احناف کے نزدیک دو رطل ہے اور رطل شرعی (غیر منقسم ہندوستان میں جو چاندی کا روپیہ رائج تھا) چھتیس روپے بھر ہے کہ رطل بیس استار کا ہوتا ہے اور استار ساڑھے ۴ مثقال کا۔ ایک مثقال ساڑھے ۴ ماشہ کا اور چاندی کا سابقہ مروجہ روپیہ سوا گیارہ ماشہ یعنی ڈھائی مثقال ہے تو رطل شرعی کہ نوّے مثقال ہوا۔ ڈھائی پر تقسیم سے چھتیس آئے تو صاع کہ ہمارے نزدیک آٹھ رطل ہے۔ دو سو اٹھاسی روپے بھر ہوا۔ لہٰذا اسی تولہ کے سیر کے حساب سے صاع کا وزن ۱/۲ ۳ سیر ۸ تولہ ہوا اور مد دو رطل کا ہے۔ ایک رطل چھتیس روپے بھر ہوا۔ اس حساب سے مد کا وزن ۸۰ تولہ سیر کے مطابق تین پاؤ ۲ چھٹانک دو تولہ ہوا۔

يَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْسِلُ اَوْ كَانَ يَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ اِلٰى خَمْسَةِ اَمْدَادٍ وَ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ (بخاری شریف)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے لے کر پانچ مُد پانی کی (مقدار) تک غسل فرماتے اور ایک مُد پانی سے وضو کرتے۔

فوائد و مسائل یہاں چند اُمورِ قابلِ غور و فکر ہیں ۱۔ اوّل، حدیث مذکورہ میں مُد و صاع سے پانی کا اندازہ بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پیمانے اناج کے لیے ہوتے ہیں۔ پانی کیل نہیں کہ اس کے لیے کوئی مُد یا صاع علیحدہ مقرر ہو۔ فقہاءِ احناف نے تصریح کی۔ پانی قیمی ہے کیلی و موزوں نہیں۔ لہٰذا صاع اور مُد سے پانی کا جو اندازہ بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جائے گا کہ صاع یا مُد میں جسقدر اناج آجائے اس کے وزن کے برابر پانی ہو بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ صاع یا مُد بھر پانی سے وضو اور غسل فرمایا۔ ظاہر ہے کہ پانی اناج سے بھاری ہوتا ہے۔ ایک صاع یا مُد میں جس قدر اناج کے دانے سمائیں گے ان کا وزن یقیناً ایک صاع یا مُد میں جو پانی

آنے کا امکان کم ہی ہوگا۔ اسی لیے شارحین کرام علامہ عینی و علامہ قسطلانی علیہما الرحمۃ نے باب الغسل من الصاع کی ان لفظوں سے کی۔ " اى بالماء قدر ملء الصاع "۔ فافهم

دوم، یہ صاع کس اناج کا تھا؟ ظاہر ہے کہ اناج ہلکے بھاری ہوتے ہیں۔ جس پیمانے میں تین سیر جو آئیں گے گیہوں تین سیر سے زائد آئیں گے اور ماش اور بھی زائد، اسی طرح دو قسم کے گیہوں اگرچہ ایک ہی پیمانے میں ہوں وزن میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ امام صدر الشریعہ نے شرح وقایہ میں صاع سے گیہوں کا صاع مراد لیا ہے اور علامہ شامی نے ردالمحتار میں جو کا صاع احوط قرار دیا اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ اس لیے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو ہی عام طور پر پائے جاتے تھے۔ گیہوں کی کثرت زمانہ امیر معاویہ میں ہوئی۔ صحیح ابن خزیمہ میں عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہے کہ۔

"لَم تکن الصدقة على عهد رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الا التمر والزبيب والشعير ولم تكن الحنطة"

بخاری شریف میں جناب ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ کان طعامنا یومئذ الشعیر۔ قطع نظر اس کے یہ تو ظاہر ہے کہ مد و صاع کا اطلاق مُد و صاع جو کو بھی شامل تو اس پر عمل ضرور اتباع حدیث کی مد میں داخل

سوم، اس باب میں جو حدیثیں آئی ہیں وہ یہ ہیں:- (۱) حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے کہ حضور ایک مُد سے وضو فرماتے اور ایک صاع سے لے کر پانچ مد تک غسل فرماتے (بخاری) ۲- حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں ہے۔ ایک مُد پانی سے وضو اور ایک صاع سے غسل فرماتے (مسلم و ترمذی، طحاوی وغیرہ) ۳- حدیث عبداللہ بن زید میں ہے۔ توضأ بثلث المد۔ حضور علیہ السلام نے ایک تہائی مُد سے وضو فرمایا (حاکم) ۴- حدیث [illegible] میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمانا چاہا تو ایک برتن لایا گیا جس میں دو تہائی مُد کے برابر پانی تھا (ق[illegible] ثلثي المد) (ابوداؤد و نسائی)۔ اور وضو میں حضور علیہ السلام کی عادت کریمہ یہ تھی کہ ہر عضو کو تین تین بار دھوتے [illegible] دو بار بھی اعضاء دھوتے اور کبھی ایک ہی بار دھونے پر اکتفا فرمایا تو غالباً جب ایک بار اعضاء کو دھوتے تو تہائی [illegible] اور دو دو بار میں دو دو تہائی مُد اور تین تین بار پورا مُد پانی خرچ ہوتا ہوگا۔ ۵- اور ابوداؤد، نسائی وطحاوی ومسلم و[illegible] میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یوں ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ بمكوك ويغتسل بخمسة مكاكى

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکوک پانی سے وضو اور پانچ مکوک پانی سے غسل فرماتے۔

قاموس صحاح وغیرہ کتب لغت میں بتایا گیا کہ مکوک تین کیلہ کا ہوتا ہے اور کیلہ نصف صاع کا تو مکوک ڈیڑھ صاع کا ہوا۔ اس حساب سے وضو کے لیے چھ مُد پانی ہوا ——— لیکن امام طحاوی نے فرمایا کہ احتمال ہے کہ حدیث مذا میں مکوک سے مراد مُد ہے کیونکہ مُد کو مکوک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ نہایہ ابن اثیر جزری میں ہے کہ مکوک سے مراد مد ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد صاع ہے لیکن مُد مراد لینا اشبہ ہے کیونکہ دوسری حدیث میں مکوک کی تفسیر مُد سے مروی ہے۔ لہٰذا راجح یہ ہے کہ

رہ میں مکوک سے مُد مراد لیا جائے۔ غرضیکہ وضوء کے پانی کے متعلق جو آثار وارد ہوئے ہیں ان میں پانی کی کم سے کم مقدار تہائی ور زیادہ سے زیادہ مقدار ایک مُد ہے —— اور ایک مد کی تصریح تو متعدد احادیث مرفوعہ میں موجود ہے مثلاً حضور سید عالم للہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جزی من الوضوء مدٌّ (طبرانی، احمد، حاکم، بیہقی)

کہ وضوء کے لیے ایک مُد پانی کافی ہے

سل کے متعلق

اب غسل کے متعلق روایات و آثار پر غور کیجئے۔ جناب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ:۔

انها تَغْتَسِلُ هِيَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ لَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ يَسَعُ ثَلٰثَةَ مْدَادٍ اَوْ قَرِيْبًا مِنْ ذٰلِكَ (مسلم شریف)

وہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل فرمالیتے جس میں تین مُد یا اس کے قریب پانی کی گنجائش ہوتی۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ دونوں کا غسل اسی تین مد سے ہو جاتا تو ایک غسل کو گویا ڈیڑھ مُد ہی پانی رہا۔ ظاہر ہے کہ ڈیڑھ مُد پانی سے غسل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے علماء نے ی متعدد توجیہیں کیں —— علامہ قاضی عیاض نے فرمایا کہ اس حدیث میں ہر ایک کے جُدا جُدا غسل کا بیان ہے حضور علیہ السلام اسی ایک برتن سے جس میں تین مُد پانی آتا تھا، غسل فرمالیتے اور اسی طرح حضرت عائشہ بھی فرمالیتیں ی برتن تو ایک ہوتا تھا مگر پانی کی مقدار ہر غسل کے لیے تین تین مد ہوتی تھی لیکن اس توجیہ پر یہ معقول اعتراض پڑتا ہے کہ بخاری و مسلم کی دوسری روایتوں میں یہ لفظ بھی موجود ہیں کہ من اناء بینی وبینہ واحد فیبادرنی حتی اقول دع لی۔ اور نسائی کے یہ لفظ ہیں کہ من اناء واحد یبادرنی وابادرہ حتی یقول دع لی و اقول دع لی کہ جب حضور علیہ السلام اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تو میں کہتی میرے لیے پانی چھوڑ دیجئے اور حضور س فرماتے میرے لیے چھوڑ دینا۔ حدیث میں یہ تصریح مذکورہ بالا توجیہ کو بالکل ثابت کر دیتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے کہ صرف تین مد پانی ہی سے حضور علیہ السلام اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا غسل فرمالیتے تھے۔

بعض شراح حدیث نے فرمایا کہ یہاں مُد سے مراد صاع ہے۔ لیکن مُد بمعنی صاع آنا محتاج دلیل ہے اور کتب ت صراح، قاموس، تاج العروس، مختار، نہایہ، مختصر السیوطی، مختار، صحاح، مصباح المنیر، لغات یث وطلبۃ الطلبہ۔ حتیٰ کہ مجمع البحار میں بھی اس کی تصریح نہیں ملتی کہ مُد کا اطلاق صاع پر بھی آتا ہے۔

علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث میں زیادہ کا انکار نہیں ہے۔ حضور اکرم و ام المومنین معاً تین مد پانی سے نہانے ہوں جب پانی ختم ہو چکا تو اور لے لیا ہو۔ لیکن اس توجیہ پر ذکر مقدار فرمانا کہ برتن میں تین مُد پانی آتا تھا، عبث و بیکار جاتا ہے (واللہ اعلم)

شارہ۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ شوہر اور بیوی دونوں ایک برتن سے ایک ساتھ غسلِ جنابت کریں اگرچہ سترۃ ہو اور اس وقت غسل سے متعلق بات کریں۔ مثلاً یہ کہیں کہ میرے لیے پانی رہنے دو یا صابن اٹھا دو یا

یا تولیہ کپڑا دو وغیرہ وغیرہ تو جائز ہے۔

(۲) موطا امام مالک، وصحیح مسلم وابو داؤد میں ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَغْتَسِلُ مِنْ اناءٍ واحد هو الفرق مِنَ الجنابة

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فرق برتن سے غسل جنابت فرماتے۔

فرق میں اختلاف ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا۔ الفرق ثلثۃ آصع۔ فرق صرف تین صاع کا ہوتا ہے۔ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ علامہ نووی نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک فرق تین صاع کا ہے۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ فرق دو صاع کا ہے۔ علامہ نجم الدین نسفی نے طلبۃ الطلبہ میں نہایہ ابن اثیر وصحاح الجوہری اور ابوداؤد نے امام احمد بن حنبل سے نقل کیا کہ فرق سولہ (۱۶) رطل کا ہوتا مگر درحقیقت یہ اختلاف نہیں ہے کیونکہ دو صاع عراقی سولہ (۱۶) رطل کا ہوتا ہے۔ اور تین صاع حجازی بھی سولہ رطل کا ہوتا ہے۔ بہرحال غسل کے لیے پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو نصِ صریح ہے وہ حدیثِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی میں ہے۔ جس میں پانچ مُد پانی تک سے غسل فرمانے کا ذکر ہے اور غسل کے باب میں ارشادِ قولی ایک صاع ہے۔

فائدہ امام اجل طحاوی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ غسل کے لیے جو صاع بھر پانی مقرر ہے اس میں وہ وضو مراد نہیں ہے جو غسل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی صاع بھر پانی صرف غسل کے لیے ہے اور وہ جو اکثر احادیث میں ایک صاع اور حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانچ مُد آیا ہے اس میں یہ تطبیق دی ہے کہ ایک مُد پانی وضو کا ایک صاع غسل کا۔ یوں غسل کے لیے کل پانچ مُد ہوئے۔ طحاوی۔ غرضیکہ یہ وہ امور تنقیحیہ ہیں جو شراحِ حدیث نے وضو و غسل کی حدیثوں سے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔

کیا وضو و غسل کے لیے پانی کی مقدار متعین ہے؟

ان تمام حدیثوں پر غور و فکر کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ وضو و غسل کے لیے پانی کی مقدار معین نہیں ہے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ مقدار معین نہ ہو، کیونکہ ایک لمبا چوڑا دوسرا دُبلا پتلا، ایک کے تمام اعضاء پر بال، دوسرے کا بدن صاف، ایک گھنی ڈاڑھی والا، دوسرا بے ریش، ایک کے سر پہ گھنے بال، دوسرے کا سر منڈھا ہوا وعلیٰ ہٰذا سب کے لیے ایک مقدار مقرر کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے وضو و غسل میں جس مقدار پانی استعمال فرمایا اس میں بھی اختلاف ہے اور اس کا پایا جانا بدیہی ہے اور اس کی وجہ حالات کا تفاوت ہے۔ حدیث میں جو صاع اور مُد کا ذکر آیا اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ ایک مُد پانی سے وضو اور ایک صاع پانی سے غسل ہو سکتا ہے (یعنی ادنیٰ قدر سنت مُد و صاع سے ادا ہو سکتی ہے) چنانچہ ائمہ دین و علماء معتمدین مثل امام زکریا نووی، محمود بدر عینی، امام محمد ابن امیر الحاج و مُلا علی قاری نے نووی شرح مسلم، عینی شرح بخاری، شرح منیہ و شرح مشکوٰۃ امت میں نقل فرمایا کہ ان مقادیر پر قصر نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ پانی بلا وجہ محض زیادہ خرچ نہ ہو اور نہ ادائے سنت میں تقصیر

یعنی اتنا پانی جس سے وضو و غسل کے فرائض و واجبات و سنن ادا ہو جائیں استعمال کیا جائے خواہ وہ مُد و صاع سے زائد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب موزوں پر مسح کرنے کے بیان میں

اس باب میں امام بخاری نے چند حدیثیں لکھی ہیں جو یہ ہیں:-

اوّل:- حضرت سعد ابن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

۲۰۱- اِنَّهٗ مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری) | حضور علیہ السلام نے موزوں پر مسح کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موزوں پر مسح کے متعلق پوچھا، آپ نے کہا۔ فَقَالَ نَعَمْ۔ ہاں! حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا ہے اور حضرت سعد جب تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو پھر اس کے متعلق کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے (بخاری)

۲۰۲- **دوم:** حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام حاجت کے لیے نکلے مغیرہ ایک ڈول پانی لے کر آپ کے پیچھے چلے۔ جب آپ حاجت سے فارغ ہوئے تو مغیرہ نے آپ پر پانی ڈالا۔

فَتَوَضَّاَ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری) | حضور علیہ السلام نے وضو کیا اور موزوں پر مسح فرمایا۔

۲۰۳- **سوم:** حضرت عمرو بن امیہ ضمری نے اپنے والد سے سنا کہ انھوں نے حضور علیہ السلام کو دیکھا کہ

يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ (بخاری) | کہ آپ نے موزوں پہ مسح فرمایا۔

۲۰۴- **چہارم:** انھیں سے روایت ہے، کہتے ہیں۔

رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلٰى عِمَامَتِهٖ وَخُفَّيْهِ (بخاری) | کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عمامہ پر اور موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا۔

فوائد و مسائل مسح علی الخفین کی مکمل بحث اور ضروری مسائل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں۔ اب نمبروار مذکورہ حدیثوں کے فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) حدیث اوّل افراد بخاری سے ہے۔ امام نے صرف ایک دفعہ ہی ذکر کی ہے۔ اس حدیث سے مسح علی الخفین کا جائز ہونا آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہوتا ہے۔ عامہ فقہاء و عامہ صحابہ کرام جواز کے حق میں ہیں۔ البتہ شیعہ حضرات اس کے سخت مخالف ہیں۔ علامہ عینی نے لکھا کہ حضرت ابن عباس کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ مسح علی الخفین کو نا جائز کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ شیعہ حضرات کا قول ہے۔ ابن عباس کا نہیں۔ حضرت عمر ابن عبد البر نے فرمایا کہ تمام بدری صحابہ اور اہل بیت، مہاجرین و انصار تمام صحابہ کرام تابعین اور فقہاء مسلمین مسح علی الخف کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے حدیثیں مروی ہیں۔ امام طحاوی نے ان حدیثوں کو شرح معانی الآثار میں جمع فرمایا ہے۔ (۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی جلیل القدر و قدیم الصحبۃ پر بھی بعض اوقات کوئی اہم مسئلہ شرعی مخفی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عبد اللہ بن عمر

نے حضرت سعد سے مسح علی الخفین کی حدیث سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ یہ بسند صحیح

حدیث دوم کو امام نے طہارۃ، مغازی اور لباس میں ذکر کیا اور مسلم و ابو داؤد نے طہارۃ و صلوٰۃ میں ابن ماجہ و نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) مسح علی الخفین بلا شبہ جائز ہے (۲) وضو میں دوسرے سے مدد لینا جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت مغیرہ سے مدد لی۔ وہ پانی ڈال رہے تھے اور حضور علیہ وضو فرما رہے تھے۔ البتہ وضو میں کسی طرح کی مدد نہ لینا مستحب ہے اور کسی دوسرے سے اعضاء وضو کو دھلوا ہے۔ امام نووی نے فرمایا کہ وضو کے لیے کسی سے پانی منگوایا جائے اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اور پانی ڈلوانے ایک قول یہ ہے کہ مکروہ ہے اور ایک یہ کہ جائز ہے لیکن پانی ڈلوانا تو حضور علیہ السلام سے ثابت ہے۔ یہ مکروہ نہیں البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ کسی قسم کی مدد نہ لی جائے۔ (۳) حدیث زیر بحث کا واقعہ جنگ تبوک کا ہے اس سے ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو مسح علی الخفین کو آیت وضو سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ سورہ مائدہ جس وضو کا بیان ہے وہ غزوہ مریسیع میں نازل ہوئی اور غزوہ تبوک اس کے بعد واقع ہوا (۴) خبر واحد یقین کا فائدہ دیتی ہے جب کہ قرائن موجود ہوں (۵) اور یہ کہ خبر واحد احکام میں مقبول ہے (۶) ہمیشہ باوضو رہنا مستحب ہے (۷) قضاء حا کے لیے پوشیدہ مقام تلاش کرنا چاہیے۔

عمامہ پر مسح کی بحث

حدیث چہارم سے مسح علی الخفین کا جواز ثابت ہوا اور اس میں عمامہ پر مسح کا ذکر ہے۔ خود صحابہ کرام میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم و انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم جواز کے حق میں ہیں۔ اوزاعی، احمد بن حنبل، ابو ثور، داؤد بن علی ابن مالک و ابو درداء و عمر بن عبد العزیز، حسن، قتادہ، مکحول رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی جواز کے قائل ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا کہ عمامہ پر مسح کی حدیث صحیح ہو جائے تو میں بھی اس کا قائل ہوں۔ پھر مجوزین کے درمیان ایک اختلاف یہ کہ عمامہ پر مسح کے لیے کوئی شرط ہے یا نہیں؟ ابو ثور کے نزدیک عمامہ پر مسح اس صورت میں جائز ہے، جب کہ باوضو ہو۔ بعض کے نزدیک مطلقاً عمامہ پر مسح جائز ہے اور ابو ثور نے عمامہ پر مسح کے لیے وہی میعاد بھی مقرر کی جو مسح علی الخفین لیے ہے۔ نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۶۲ حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ عمامہ پر مسح اس صورت جائز ہے جب کہ ناصیہ (ماتھے) کا مسح بھی ساتھ کیا جائے۔ امام سفیان ثوری، مالک ابن انس، ابن المبارک، شافعی عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک عمامہ پر مسح جائز نہیں۔ یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں سر کا مسح فرض قرار اور عمامہ پر مسح کی حدیثوں کی تاویل صحیح ہو سکتی ہے تو یقینی امر کو احتمال کے لیے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی وہ حدیثیں جن پر مسح کا ذکر ہے ان کا مطلب ہے کہ حضور علیہ السلام نے مسح کے وقت عمامہ مبارک اتارا نہیں، بلکہ ناصیہ جو چوتھائی سر کا اور عمامہ پر بھی ہاتھ پھیر لیا۔ جیسا کہ حدیث مسلم میں آیا۔

تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَالْخُفَّيْنِ (مسلم)

کہ حضور علیہ السلام نے پیشانی پر مسح کرنے کے بعد پر مسح کیا۔

سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا بھی یہی مسلک ہے کہ صرف عمامہ پر مسح کرنا کافی نہیں، البتہ حدیثِ مسلم میں جو صورت مسح کرنے کی مذکور ہے ایسے کیا جائے تو درست ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) (۲) یہاں پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام بخاری نے جو حدیث ذکر کی ہے اس میں عمامہ پر مسح کا بھی ذکر ہے مگر انھوں نے عمامہ پر مسح کا عنوان قائم نہیں کیا۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ عمامہ پر مسح کے مسئلہ میں ضعف ہے ——— کیونکہ امام کا انداز فکر یہ ہے کہ جب روایت قوی ہو اور اس میں کوئی لفظ ایسا ہو جس میں فکر کو تردد ہو تو اس کا نہ عنوان باندھتے ہیں اور نہ اس سے استنباط کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہوتا ہے (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ إِذَا أَدْخَلَ رِجْلَيْهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ

باب موزوں کو باوضو پہننے کے بیان میں

۲۰۵ - قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا

(بخاری)

حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر (غزوہ تبوک) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ (آپ وضو کرنے لگے) میں جھکا تاکہ آپ کے موزے اُتار دوں اس پر آپ نے فرمایا موزے میں نے باوضو پہنے ہیں پھر آپ نے موزوں پر مسح کیا۔

فوائد و مسائل یہ واقعہ غزوہ تبوک کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چاہا کہ قدم اقدس سے موزے اُتار دیں تاکہ حضور علیہ السلام پاؤں دھولیں اس پر آپ نے فرمایا۔ موزے اُتارنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کو باوضو پہنا ہے۔ ایسی صورت میں مسح کافی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مسح علی الخفین جائز ہے جب کہ موزے وضو کرکے پہنے ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد و اسحاق کے نزدیک بوقت لبس طہارۃ کاملہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کو آپ مثال سے سمجھ لیجئے۔

(۱) اگر کسی شخص نے پورا وضو کرکے موزے پہن لیے۔ (دیکھئے بوقت لبس موزہ طہارۃ کاملہ موجود ہے) اس کے بعد اس کو حدث ہوا وضو جاتا رہا۔ اس نے اب وضو پورا کیا۔ (دیکھئے اس صورت میں بوقت لبس طہارۃ کاملہ نہ تھی)۔ مگر بوقت حدث طہارۃ کاملہ موجود ہے۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک اس صورت میں موزوں مسح جائز نہ ہوگا کیونکہ پہننے کے وقت طہارۃ کاملہ نہیں تھی۔ (۳) اگر کسی نے سارا وضو ترتیب کے ساتھ کیا اور ایک پاؤں دھوکر ایک موزہ پہن لیا۔ پھر دوسرا پاؤں دھو کر دوسرا موزہ پہن لیا۔ اس صورت میں بھی جب اس کا وضو رجائیگا اور وہ شخص وضو کرے گا۔ امام اعظم کے نزدیک اس کو مسح علی الخفین جائز ہوگا۔ کیونکہ بوقتِ حدث طہارۃ کاملہ پائی گئی۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ بوقت لبس طہارۃ کاملہ نہ تھی اور یہ ظاہر ہے کہ حدیث زیرِ بحث پر اگر غور کیا جائے تو اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ بوقت لبس طہارۃ کاملہ کا ہونا شرط نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے عینی ج ۳ ص۵۵ دیکھئے)

بَابُ مَنْ لَّمْ یَتَوَضَّأْ مِنْ لَّحْمِ الشَّاۃِ وَالسَّوِیْقِ

باب بکری کا گوشت اور ستو کھانے کے بعد وضو نہ کرنے کے بیان میں

(۱) وَاَکَلَ اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ وَعُثْمَانُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ لَحْمًا فَلَمْ یَتَوَضَّؤُوْا

اور حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق و عثمان غنی رضی تعالیٰ عنہم نے بکری کا پکا ہوا گوشت کھایا اور وضو نہیں

۲۰۶ - (۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکَلَ کَتِفَ شَاۃٍ ثُمَّ صَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کا شانہ تناول فر (اور نماز پڑھی) لیکن وضو نہ کیا۔

۲۰۷ - (۳) اَنَّہٗ رَاَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَحْتَزُّ مِنْ کَتِفِ شَاۃٍ فَدُعِیَ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاَلْقَی السِّکِّیْنَ فَصَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّأْ

(بخاری)

عمرو بن امیہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکری کے شانہ کا گوشت کاٹ کر کھا رہے تھے۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا اور بلائے گئے۔ آپ نے چھری رکھ دی پھر نماز پڑھائی اور وضو نہ کیا۔

فوائد و مسائل (۱) اس عنوان کے ماتحت امام بخاری نے جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مسئلہ کے متعلق ہم گزشتہ اوراق میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوائلِ اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ چنانچہ حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت ہے۔

کَانَ آخِرُ الْاَمْرَیْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ تَرْکُ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ (طحاوی، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حکم یہی تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو نہ کیا جائے۔

حدیث نمبر ۳ کو امام بخاری نے صلوٰۃ، جہاد، اطعمہ و طہارت میں بھی ذکر کیا ہے اور نسائی نے ولیمہ میں اور ابن نے طہارۃ میں۔ حدیث نمبر ۳ مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (۲) گوشت چھری سے کاٹ کر کھانا جائز ہے۔ ممانعت میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے (۳) امام مسجد کو نماز کے لیے بلانا جائز ہے۔ حضور علیہ السلام کو بلانے والے جناب بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

بَابُ مَنْ مَضْمَضَ مِنَ السَّوِیْقِ وَلَمْ یَتَوَضَّأْ

باب ستو کھانے کے بعد کلی کرکے نماز پڑھنا اور وضو نہ کرنے کے بیان میں

۲۰۹ - اَخْبَرَہٗ اَنَّہٗ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَامَ خَیْبَرَ حَتّٰی اِذَا کَانُوْا بِالصَّھْبَاءِ وَھِیَ اَدْنٰی خَیْبَرَ فَصَلّٰی

سوید بن نعمان نے خبر دی کہ جس سال خیبر فتح ہوا۔ وہ فتح ہوا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب مقام صہباء پر آئے وہاں آپ نے نمازِ عصر ادا کی۔

الْعَصْرَ ثُمَّ دَعَا بِالْأَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيقِ فَأَمَرَ بِهِ فَثُرِّيَ فَأَكَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَكَلْنَا ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ (بخاری)

پھر کھانے کا توشہ دان منگایا تو اس میں صرف ستو نکلے آپ کے حکم سے وہ بھگوئے گئے۔ پھر آپ نے اور سب حاضرین نے کھائے۔ اس کے بعد نماز مغرب کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے کلی کی اور ہم نے بھی کلی کی اور آپ نے نماز پڑھائی۔ (وضو نہ کیا)

فوائد و مسائل اس عنوان کے ماتحت امام نے ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے (۲) کہ حضور علیہ السلام نے بکری کا شانہ تناول فرمایا اور وضو نہ کیا۔ دونوں حدیثیں اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے (۱) آگ سے پکی ہوئی چیز کا کھانا ناقض وضو نہیں ہے اور یہ کہ کھانے پینے کے بعد جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو کلی کر لینا مستحب ہے تاکہ چکنائی وغیرہ سے منہ صاف ہو جائے۔ ویسے بھی کھانے کے بعد منہ کو صاف کرنا صحت کے لیے مفید ہے۔ کھانے پینے کے بعد ہاتھ منہ کو صاف کر لینے کو وضوء طعام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فائدہ حدیثِ اوّل کو امام نے سات جگہ ذکر کیا ہے۔ طہارۃ، مغازی، جہاد، اطعمہ وغیرہ میں اور نسائی و ابن ماجہ نے طہارۃ و ولیمہ میں اور حدیثِ دوم کو مسلم نے طہارۃ میں ذکر فرمایا (۲) صہبا وہی جگہ ہے جہاں سورج کے پلٹنے کا معجزہ ظہور میں آیا۔ صہبا مدینہ و خیبر کے درمیان ایک منزل ہے۔ امام طحاوی قدس سرہ العزیز نے مشکل الآثار میں اپنے شیخ سے نقل کیا کہ انہوں نے امت محمدیہ کو وصیت کی ہے کہ وہ اس معجزہ باہرہ کو جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ظہور پذیر ہوا خوب اچھی طرح یاد رکھیں۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

وقد حكى علي بن عبد الرحمن بن المغيرة عن احمد بن صالح انه كان يقول لا ينبغي لمن كان سبيله العلم التخلف عن حفظ حديث اسماء الذي روي لنا عنه لانه من اجلّ علاماتِ النبوة (مشکل الآثار ج ۲ صـ۱۱)

(۳) البتہ احناف کے نزدیک بھی مسِ ذکر و امراۃ اور اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کر لینا مستحب ہے۔ امام شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز بھی اس کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ طبرانی میں ہے کہ وہ جو بحالت جنابت سو جائے اور مر جائے تو

ان الملائكة لا تحضر جنازته | ملائکہ اس کے جنازے میں نہیں آتے

اور وضوء سے یہ مضرت چلی جاتی ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے فقہاء احناف نے تصریح کی کہ اجنبی عورت پر اگر نظر پڑ جائے تو وضو مستحب ہے تو مسِ ذکر و امراۃ تو اس سے بھی زیادہ افحش ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے استحباب وضوء کا قول بہت مناسب ہے۔

(۴) اور وہ جو حدیث میں آیا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کیا جائے تو یہ امر بھی استحبابی ہے اور اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ کھانے پینے سے پاک ہیں تو کھانے کے بعد وضو کی ہدایت اس لیے دی گئی تاکہ طبائع ملائکہ سے بُعد نہ رہے۔

بَابٌ هَلْ يُمَضْمِضُ مِنَ اللَّبَنِ

باب کیا دودھ پینے کے بعد کلی کی جائے

۲۱۰ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ اِنَّ لَهٗ دَسَمًا۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں رحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا پھر کلی کی اور فرمایا دودھ میں چکنائی ہوتی ہے

اس حدیث کو امام مسلم، ابوداؤد و نسائی نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا۔ اس حدیث سے چکنائی دار چیز کھانے کے بعد کلی کر لینے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نیز حضرت انس سے باسنادِ حسن ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے دودھ نوش فرمایا اور کلی نہ کی اور وضو بھی نہ کیا۔ اس سے ان لوگوں کی رائے کی تردید ہو جاتی ہے جو کھانے پینے کے بعد کلی کو واجب قرار دیتے ہیں (عینی ج ۱ ص ۶۶۳)

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنَ النَّوْمِ

باب نیند سے وضوء کے بیان میں

وَمَنْ لَّمْ يَرَ مِنَ النَّعْسَةِ وَالنَّعْسَتَيْنِ اَوِ الْخَفْقَةِ وُضُوْءًا (بخاری)

اور جو لوگ ایک دو بار اونگھنے یا ایک آدھ جھونکا لینے سے وضوء لازم نہیں سمجھتے اس کی دلیل کے بیان میں

۲۱۱ - عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَدْرِيْ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتے میں اونگھے تو وہ سو رہے۔ یہاں تک کہ نیند کا غلبہ اس پر سے جاتا رہے کیونکہ اونگھتے میں اگر کوئی نماز پڑھے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے لیے بخشش مانگے اور زبان پر برائی کے کلمے جاری ہو جائیں۔

۲۱۲ - ۲- عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا نَعَسَ فِي الصَّلٰوةِ فَلْيَنَمْ حَتّٰى يَعْلَمَ مَا يَقْرَاُ (بخاری)

حضرت انس سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی نماز میں اونگھے تو چاہیے کہ سو جائے یہاں تک کہ جو پڑھے وہ سمجھنے لگے۔

فوائد و مسائل (۱) حدیث اول کو امام ابوداؤد و مسلم نے کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کیا ۲- نعاس یعنی اونگھ نیند کی ایک ایسی قسم ہے جس میں آدمی ایسا ہوشیار رہتا ہے کہ پاس کے لوگ جو باتیں کریں وہ اکثر پر مطلع رہتا ہے۔ ایسی ہوشیاری نہ رہے تو پھر وہ نیند ہے۔ نیند ناقضِ وضوء ہے اور اونگھ ناقضِ وضوء نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔ اس حدیث سے مسائل ذیل معلوم ہوئے (۱) یہ جو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو نماز میں اونگھے تو اسے چاہیے کہ سو جائے۔ پھر نیند پوری کرنے کے بعد نماز پڑھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وقت میں گنجائش ہو تو ایسا کرے تاکہ

خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھی جاسکے۔ اونگھ کی حالت میں حضورِ قلب نہیں ہوگا۔ بعض علماء نے اس ہدایت کو رات کے نوافل کے ساتھ خاص کیا ہے لیکن حدیث میں صلوٰۃ کا لفظ عام ہے تمام نمازوں کو شامل ہے۔ (۲) اسی سے اس امر کی وضاحت بھی ہو گئی کہ اونگھ ناقضِ وضو نہیں ہے ورنہ حضور علیہ السلام نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم فرماتے اور حدیث دوم کو نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اونگھ ناقضِ وضو نہیں ہے۔

بَابُ الْوُضُوْءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ

باب بغیر حدث کے وضو کرنا

۲۱۳- عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ قُلْتُ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ قَالَ يُجْزِئُ اَحَدَنَا الْوُضُوْءُ مَا لَمْ يُحْدِثْ (بخاری)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے۔ عمرو بن عامر نے انس سے پوچھا تم لوگ کرتے تھے؟ یعنی تم بھی ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے حضرت انس نے جواب دیا ہم کو تو ایک ہی وضو کافی ہوتا جب تک کہ حدث نہ ہو۔

فوائد و مسائل اس کے بعد امام نے وہی حدیث ۲۰۹ ذکر کی ہے جو باب من مضمض من السویق میں گزر چکی ہے یعنی خیبر سے واپسی پر مقام صہباء پر حضور علیہ السلام نے قیام کیا اور ستو تناول فرمائے۔ پھر مغرب کی نماز کا وقت آیا۔

۲۱۴- ۲- ثُمَّ صَلّٰى لَنَا الْمَغْرِبَ وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ

تو آپ نے صرف کلی کی وضو نہیں کیا اور نماز پڑھائی۔

حدیثِ اول کو ترمذی ونسائی وابنِ ماجہ نے طہارۃ میں ذکر کیا۔ (۲) اس عنوان کے قیام سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا واجب نہیں ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے دو حدیثیں اس عنوان کے ماتحت لکھیں۔ پہلی حدیث سے یہ نکلتا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرمایا کرتے تھے۔ جس سے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کر لینا مستحب قرار پایا۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وضو سے دو نمازیں پڑھیں یعنی دوسری نماز کے لیے تازہ وضو نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے۔

امام احمد علیہ الرحمہ نے باسنادِ حسن جناب ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنے اور ہر وضو کے لیے مسواک کرنے کا حکم کرتا۔ اس مضمون کی احادیث سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ وضو ہونے کے باوجود تازہ وضو کر کے نماز پڑھنا موجب خیر و برکت اور باعث رحمت ہے۔ لیکن یہ بات واجب نہیں ہے۔

بَابٌ مِنَ الْكَبَائِرِ اَنْ لَا يَسْتَتِرَ مِنْ بَوْلِهٖ

باب پیشاب سے نہ بچنا کبیرہ گناہ ہے

۲۱۵ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِحَائِطٍ مِّنْ حِيْطَانِ الْمَدِيْنَةِ اَوْ مَكَّةَ فَسَمِعَ صَوْتَ اِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِي قُبُورِهِمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يُعَذَّبَانِ فَقَالَ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيْرٍ ثُمَّ قَالَ بَلٰى اَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهٖ وَكَانَ الْاٰخَرُ يَمْشِيْ بِالنَّمِيْمَةِ ثُمَّ دَعَا بِجَرِيْدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ فَوَضَعَ عَلٰى كُلِّ قَبْرٍ مِّنْهُمَا كِسْرَةً فَقِيْلَ لَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ لَعَلَّهٗ اَنْ يُّخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا مکہ کے باغ پر گزرے وہاں دو آدمیوں کی آواز سنی جنہیں قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس وقت آپ نے فرمایا دونوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ کسی بڑے گناہ میں نہیں پھر فرمایا البتہ بڑا گناہ ہے ان میں ایک تو اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا۔ پھر آپ نے کھجور کی ایک ہری ٹہنی منگوائی۔ اس کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ صحابہ کرام نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا۔ اس لیے کہ جب تک یہ ٹہنیاں سبز رہیں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہو۔

فوائد و مسائل

۱۔ حدیث ہذا کو امام بخاری نے طہارۃ و جنائز میں بھی ذکر کیا مسلم، ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی نے طہارۃ میں اور نسائی نے طہارۃ، جنائز و تفسیر میں درج کیا (۲) مقصود عنوان یہ بتانا تھا کہ پیشاب سے اپنے جسم اور کپڑوں کو محفوظ نہ رکھنا گناہ کبیرہ ہے۔ حدیث ہذا میں پیشاب سے نہ بچنے والے پر عذاب کا بیان ہوا جس سے اس گناہ کا اشد و اکبر ہونا ثابت ہوا۔

گناہ کبیرہ

(۱) حدیث بخاری عن ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سات گناہ لیے گئے اور حدیث حاکم میں نو اور کسی میں اس سے بھی زیادہ۔ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس گنتی سے حصر مقصود نہیں ہے۔ اسی سے بعض علماء نے فرمایا۔ ہر وہ گناہ جس کے ارتکاب پر شارع علیہ السلام نے وعید سنائی یا لعنت فرمائی یا عذاب و غضب آیا وہ کبیرہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے کہا گناہ کبیرہ سات ہیں؟ آپ نے کہا سات سو تک ہیں۔ یہ ہے کہ جیسے ایک چھوٹی سی نیکی اگر خلوص و للہیت کے ساتھ کی جائے تو اس کا اجر بڑھ جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک ذرا سا گناہ اللہ عزوجل سے جس قدر بے خوفی اور جرأت کے ساتھ کیا جائیگا۔ اسی قدر اس کی سنگینیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ علامہ عینی نے فرمایا۔ کبیرہ امر نسبی ہے ایک گناہ دوسرے گناہ کی نسبت کم درجہ کا ہوتا ہے تو اسی نسبت سے صغیرہ و کبیرہ کی تقسیم ہوگی۔ (عینی ج ۱ صفحہ) (۲) حائط کی جمع حیطان ہے کھجور کے باغ کو کہتے ہیں۔ جو چار دیواری میں ہو۔ دارقطنی کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ باغ جس میں حضور علیہ السلام کا گزر ہوا۔ ام المبشر انصاریہ کا تھا ۳۔ روایت اعمش میں مر بقبرین کے لفظ ہیں اور روایت ابن ماجہ میں بقبرین جدیدین کے لفظ آئے ہیں۔ یعنی وہ قبریں نئی تھیں۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے مقبور مسلمان تھے۔ ۴۔ لا یستتر بعض روایت میں لا یستبری اور لا یستنزہ بھی آیا۔ یہ تمام قریب المعنی ہیں اور ابو نعیم کی روایت میں لا یتوقی (نہیں بچتا تھا) آیا ہے۔

فسمع صوت انسانین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آواز سنی جنہیں قبر میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں جو کیفیات ہیں ان پر آدمی مطلع ہو سکتا ہے اور یہ کہ آیت وما انت بمسمع من فی القبور کے یہ بات منافی نہیں ہے کیونکہ آیت میں خود بخود سننے کی نفی ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ سنانا چاہے یا کسی کو ایسے حواس ہی عطا فرما دے جو احوال برزخ کا مشاہدہ کریں تو یہ ممکن ہے اور آیت کے منافی نہیں ہے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو اس کا وقوع ہو گیا اور حضور علیہ السلام نے عالم برزخ کے احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا

۵۔ نمیمہ کے معنی کسی بات کو دوسرے تک نقصان دینے کے لیے پہنچانے کے ہیں اور یہ فعل نہایت مکروہ ہے اور اشد کبائر سے ہے کیونکہ چغلی کی وجہ سے دو مسلمانوں میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے۔ بعض روایات میں آیا کہ شیطان دو مسلمانوں میں ناچاقی سے بہت خوش ہوتا ہے ۶۔ یعذبان۔ عذاب قبر حق ہے اور اس کے ثبوت میں جلیل القدر صحابہ سے احادیث وارد ہوئی ہیں ما یعذبان فی کبیر کے ایک معنی شارحین نے یہ کیے کہ وہ ایک ایسے کام سے نہیں بچتے تھے جس سے بچنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا (شرح السنۃ)

فی کبیر: علامہ نووی نے فرمایا۔ پیشاب سے پرہیز نہ کرنا فی نفسہٖ گناہ نہیں ہے۔ یہ کبیرہ اس لیے بن جاتا ہے کہ یہ فساد صلوٰۃ کا سبب بن جائیگا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ پاک رہنا ہر حال میں شارع علیہ السلام کو مطلوب ہے اور نجاست سے ملوث رہنا مکروہ ہے تو پیشاب سے پرہیز نہ کرنا اگرچہ صغیرہ ہے لیکن صغیرہ پر جب اصرار کیا جائے تو وہ کبیرہ ہو جاتا ہے (۲) اگرچہ حدیث میں عذاب قبر کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نجاسات سے نہ بچنا عذاب قبر کا سبب بن سکتا ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ ملائکہ کو ہر قسم کی نجاست سے ایذا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس گھر میں کتا یا جاندار کی تصویر ہو وہاں ملائکہ رحمت کا نزول نہیں ہوتا۔ پھر نجاست خواہ حسی ہو جیسے پیشاب ی جیسے چغل خوری ان سے بھی ملائکہ کو ایذا ہوتی ہے۔

اور حدیث میں جو پیشاب کو خاص کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پاخانہ گوبر اور دوسری نجاستیں ایسی ہیں جن سے عام طور پر پرہیز کرتے ہیں خواہ جاہل ہوں یا عالم۔ اس کے برعکس پیشاب ایک ایسی نجاست ہے کہ لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے مسٹران کرام کو دیکھ لیجئے کہ ان کی پتلونوں میں چھینٹیں پیشاب ہوتا ہے۔ عرب بھی پیشاب سے پرہیز کرنے کا خیال قطعی ں رکھا کرتے تھے جیسا کہ شارحین نے قصہ بول اعرابی فی المسجد کے ضمن میں تصریح کی ہے۔ لیکن جب اسلام آیا تو حضور علیہ السلام ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ پھر انہی عربوں کا یہ حال ہو گیا کہ خود قرآن مجید میں ان کی طہارت و پاکیزگی کو سراہا گیا۔

۳۔ حدیث میں آیا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہو گا تو مناسب ہوا کہ قبر میں طہارت کے متعلق سوال ہو کیونکہ برزخ حشر پر مقدم ہے اور طہارت نماز پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشاب سے نہ بچنے کے سبب قبر میں عذاب ہوا۔

۴۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تو یہ آیا ہے کہ ان من شئ الا یسبح بحمدہ کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے اور حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ جب تک یہ کھجور کی شاخیں تر رہیں گی تسبیح کریں گی۔ جواب یہ کہ آیت میں من شئ سے مراد شئ حی ہے اور ہر چیز کی حیات اس کے حسب حال ہوتی ہے تو ٹہنیوں کی زندگی اسی وقت

تک ہے جب تک وہ سبز رہیں۔ لیکن جواب کچھ یونہی سا ہے کیونکہ آیت کا عموم و اطلاق تو یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز وہ خشک ہو یا تر وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور محققین کرام نے بھی آیت کو اس کے عموم پر رکھا ہے۔ صحیح جواب یہ ہے حدیث میں تضاد ہے ہی نہیں۔ کیونکہ حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ بتایا ہے کہ کھجور کی ان شاخوں کی بحالتِ تر و تازگی تسبیح سے عذابِ قبر میں تخفیف ہوگی۔ باقی رہی یہ بات کہ خشک ہو جانے کے بعد بھی یہ تسبیح کرتی ہیں حدیث میں اس کی نفی نہیں ہے اور جب قرآنِ مجید میں یہ بات ہے تو حدیث میں اس کی نفی کیسے ہو سکتی ہے۔

کیا ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز اللہ عز و جل کی تسبیح کرتی ہے خشک ہو یا تر۔ اب یہ جو بعض آثار میں وارد ہوا کہ:

۱۔ کپڑا جب تک سفید رہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور جب میلا ہو جائے تو نہیں کرتا ۲۔ پانی جب تک جاری تسبیح کرتا ہے اور جب میلا ہو جائے تو نہیں کرتا ۳۔ پتھر جب تک اپنی جگہ پر ہے تسبیح کرتا ہے اور جب پہاڑ سے کٹ جائے تو نہیں کرتا۔ "تو نہیں کرتا" کا مطلب صرف یہ ہے کہ تسبیح تو ہر چیز ہر حال میں کرتی ہے مگر حال میں جب تغیر اس کی تسبیح میں بھی تغیر ہو جاتا ہے۔ دیکھئے انسان کو خوشی کی حالت میں بھی بھوک لگتی ہے اور غم کی حالت میں بھی لیکن حالت میں جو بھوک لگتی ہے وہ اس بھوک سے مختلف ہوتی ہے جو اس کو غم کی حالت میں لگتی ہے۔

چنانچہ خود قرآنِ مجید نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ اس کے حال کے مطابق ہوتی ہے۔ درخت جب تک تر و تازہ ہے تسبیح کرتا ہے مگر جب سوکھ جاتا ہے تو بھی تسبیح کرتا ہے تسبیح اس نوع کی نہیں ہوتی جیسی کہ وہ بحالتِ تر و تازگی تسبیح کرتا تھا۔ لکڑی جل جانے کے بعد بھی تسبیح کرتی ہے مگر جلنے سے کی تسبیح اور نوع کی تھی اور راکھ ہو جانے کے بعد اور نوع کی ہے۔ آدمی زندگی میں تسبیح کرتا ہے اور مرنے کے بعد جب عناصر جاتا ہے جب بھی تسبیح کرتا ہے مگر پہلی تسبیح، تسبیحِ حیات ہے اور دوسری تسبیح، تسبیحِ عناصر ہے۔ غرضیکہ جب یہ کہا جاتا کڑی سوکھنے کے بعد تسبیح نہیں کرتی تو نفی اس تسبیح کی جاتی ہے جو وہ بحالتِ تر و تازگی کرتی تھی مطلقاً تسبیح کی نفی نہیں کی جاتی

قبر پر پھول ڈالنا جائز ہے

لعلہ ان یخفف: کھجور کی تر شاخیں قبروں پر ڈالنے کی حکمت حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمائی کہ سبزے کی تسبیح سے ان کے عذاب میں تخفیف کی امید ہے۔ اس قبروں پر سبزہ ڈالنے کے جواز کا ثبوت ہوا اور جو لوگ سبزہ ڈالنے کو بدعت کہتے ہیں ان کے خیال کی تردید ہو گئی۔ اب جائے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ نے سبز شاخیں دیں لیکن اوروں کو یہ معلوم نہیں ہوتا تو اس کا جواب علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے یہ دیا کہ کسی مقبور کے متعلق ہمیں یہ معلوم قبر میں اس کا کیا حال ہے؟ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم وہ کام نہ کریں جو تخفیفِ عذاب کا سبب ہے۔ جیسے ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم مقبور کے لیے رحمت کی دعا بھی نہ کریں؟ (فتح الباری و عینی ج ۱ ص ۸۴۹) نیز بخاری میں ہے کہ حضرت بریدہ بن الحصیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بوقتِ وصال یہ وصیت فرمائی کہ میری قبر پر سبز شاخیں تو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ امر منقول ہے تو اس کے جائز ہونے میں کیا

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سبزہ کی تسبیح تخفیفِ عذاب کا سبب بنتی ہے اور قبر پر سبزہ ڈالنے میں فائدہ ہی کی امید ہے نقصان کی نہیں۔ اگر فی الواقع صاحبِ قبر کو عذاب نہیں ہو رہا تو بھی سبزہ کی تسبیح و تہلیل اس کے لیے باعثِ برکت و موجبِ مزید رحمت ہی ہوگی۔

قبر کے پاس تلاوتِ قرآن پاک جائز ہے

۹۔ علامہ خطابی نے فرمایا۔ جب سبز شاخوں کی تسبیح سے میت کے عذاب میں تخفیف کی اُمید کی جا سکتی ہے تو قبر پر قرآن مجید کی تلاوت تو بطریقِ اولیٰ مستحب ہونی چاہیے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

فِیهِ دَلِیْلٌ عَلٰی استحباب تِلَاوَةِ القرآنِ العزیز علی القبور لانه اِذَا کان یرجی عن المیت التخفیف بتسبیح الشجر فتلاوة القرآن العظیم اعظم رجاء وبرکة (عینی ج۱ ص۸۷۰)

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ قبر پر قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے کیونکہ جب تر شاخوں کی تسبیح سے تخفیفِ عذاب کی اُمید ہے تو قرآنِ عزیز کی تلاوت سے تو بہت ہی برکت کی امید ہے۔

(۱۰) علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ و احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مسلک یہ ہے کہ میت کو قرآن عزیز پڑھنے کا ثواب پہنچتا ہے اور اس باب میں احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً ابوبکر النجار نے کتاب السنن میں علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ مَرَّ بَیْنَ المَقَابِر فقرء قُلْ هُوَاللّٰه اَحَد احد عشر مرة ثم وهب اجرها للاموات اعطی اللّٰه تعالٰی بعدد الاموات

جو کوئی قبرستان پر گزرے اور گیارہ بار قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا ثواب اموات کو بخش دے اللہ تعالیٰ مردوں کے برابر ثواب عطا فرمائے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ دَخَلَ المقابر فقرء سورة یٰسین یخفف اللّٰه عَنْهُمْ یَوْمَئِذٍ (عن انس مرفوعاً)

جو قبرستان میں جائے اور سورہ یٰسین پڑھ کر میت کو پہنچا دے اللہ تعالیٰ عذاب میں تخفیف فرمائے

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ زَارَ قَبْرَ وَالِدَیْهِ اَوْ اَحَدِهِمَا فَقَرَءَ عِنْدَهٗ اَوْ عِنْدَهُمَا یٰسین غُفِرَ لَه

جو شخص اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے یا فقط ماں یا فقط باپ کی قبر پر جائے اور وہاں سورہ یٰسین پڑھے تو اللہ

اُن کی بخشش فرمائے۔

اور تمام علماء اسلام نے اجماع کیا کہ دعا سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے اور یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہے اللہ نے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ
سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

جو ان کے بعد آئے وہ یہ دعا کرتے ہیں کہ اے رب ہمارے ہماری مغفرت فرما اور ان کی بھی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے (اور وفات پا چکے)

اور بہت سی آیات واحادیث سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دعا کرنے سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ خود حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ

الٰہی بقیع غرقد کے رہنے والوں کی مغفرت فرمادے۔

اسی طرح نماز جنازہ میں حضور علیہ السلام نے یہ تعلیم دی کہ میت کے لیے اللّٰھم اغفر لحینا ومیتنا کے الفاظ کے ساتھ دعا مانگی جائے۔ اسی طرح ہر نیک عمل کا ثواب میت کو پہنچایا جاسکتا ہے۔ جس کے متعلق چند حدیثیں یہ ہیں۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ میں اپنے والد کے ساتھ ان کے مرنے کے بعد کیا نیکی کرسکتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ نیکی کرسکتے ہو۔

اَنْ تصلی لهما مع صلاتك وان تصوموا
لهما مع صيامك وان تصدق عنهما
صدقتك

کہ ان کے ایصال ثواب کی نیت سے اپنی نماز کے ساتھ اور نماز پڑھ لو اور روزہ کے ساتھ روزہ رکھ لو اور صدقہ کے ساتھ ان کے نام پر بھی صدقہ دے دو۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ اگر ہم اپنے وفات شدہ افراد کے ثواب پہنچانے کی نیت سے صدقہ دیں یا حج کریں تو ان کو پہنچے گا؟ حضور علیہ السلام نے جواب دیا۔

نعم ويفرحون كما يفرحون احدكم
بالطبق اذا اُهدِیَ اليه
(کتاب القاضی الامام ابوالحسین)

ہاں ثواب پہنچے گا اور تمہارے صدقے سے میت ایسے خوش ہوں گی جیسے تم کو کوئی ایک طشت کھانا وغیرہ ہدیہ میں دے۔

اسی طرح حضرت سعد نے عرض کی میں اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے غلام آزاد کروں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا نعم ہاں اور بخاری ومسلم میں ہے کہ ایک صاحب نے عرض کی حضور میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے تو میں صدقہ کروں تو ان کو نفع ہوگا؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا نعم ہاں! حضرت ابوجعفر بن محمد بن علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی ذاتِ پاک کو ایصالِ ثواب کے لیے غلام آزاد فرمایا کرتے (عینی ج ۱ ص ۲۶)

فائدہ :- (۱) اسی مضمون کی حدیثِ جابر کا مضمون یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے انھیں کھجور کی شاخ کے دو

ٹکڑے کر کے قبروں پر ڈالنے کا حکم دیا اور اس میں عذاب کے سبب کا ذکر نہیں ہے اور کلمہ ترجی بھی نہیں ہے اور حدیث ابوہریرہ میں یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک قبر پر سے گزرے اور کھجور کی دو شاخیں منگوائیں ایک قبر کے سرہانے گاڑ دی اور دوسری پائنتی پر گاڑ دی۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی واقعہ کی حکایت نہیں بلکہ ہر ایک مستقل واقعہ ہے (واللہ اعلم)

(۱۲) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چغلخوری ایک نہایت ہی مذموم فعل ہے اور گناہِ کبیرہ ہے اور ایسا گناہ ہے کہ اس کے سبب آدمی عذابِ قبر میں مبتلا ہو سکتا ہے اور یہی حال اپنے جسم اور کپڑوں کو پیشاب سے نہ بچانے کا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے حواس کی کیفیت

(۱۳) حدیث زیرِ بحث میں یہ تصریح ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کے اندر کی کیفیت کو دیکھ لیا اور وہاں جو آواز پیدا ہو رہی تھی اس کو سُن لیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قوائے بدنیہ عام انسانوں کے قویٰ سے بالکل الگ حیثیت کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ وہ کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں جو عام انسان دیکھ اور سُن نہیں سکتے۔ ابوالبتار نے "تعرفیات" میں نبوت پر بحث کرتے ہوئے بوعلی سینا کے حوالہ سے کیا خوب لکھا ہے کہ:۔

فنحن نری الاشیا وبواسطۃ الحس والنبی یری الاشیاء بواسطۃِ القوی الباطنۃ ونحن نری ثم نعلم والنبی یعلم ثم یری

ہم لوگ (عام انسان) اشیاء کو حواس کے ذریعے دیکھتے ہیں اور نبی قوائے باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے ہم لوگ ایک چیز دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی پہلے جانتا ہے اور پھر دیکھتا ہے۔

حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ نے اس حقیقت کا یوں اظہار فرمایا ہے۔

فلسفی کو منکرِ حنانہ است از حواسِ انبیاء بیگانہ است
نطقِ خاک و نطقِ آب و نطقِ گل ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے ہماری تالیف "جامع الصفات" کا مطالعہ کیجیے جو مکتبہ رضوان لاہور سے قیمتاً مل سکتی ہے۔

بَابُ مَاجَآءَ فِی غَسْلِ الْبَوْلِ

باب پیشاب کو دھونے کے بیان میں

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِصَاحِبِ الْقَبْرِ کَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِہٖ وَلَمْ یَذْکُرْ سِوٰی بَوْلِ النَّاسِ

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (سابقہ حدیث) میں یہ بھی فرمایا کہ وہ قبر والا جسے عذاب ہو رہا تھا پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا تو آپ نے آدمی ہی کے پیشاب کا ذکر کیا

یعنی حدیث سابقہ میں مِنْ بولہ کے لفظ آئے ہیں۔ یعنی جس کو قبر میں عذاب ہو رہا تھا اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ وہ اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا معلوم ہوا کہ مراد اس سے خاص آدمی کا پیشاب ہے لیکن

یہ بالکل ظاہر ہے کہ بولہ کے جملہ سے یہ استدلال کرنا کہ آدمی کے علاوہ جانوروں اور شیر خوار بچوں کا پیشاب پاک ہے کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے من بولہ تو صرف اس لیے فرمایا کہ اس شخص کا قبر میں عذاب پانے کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اپنے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔

۲۱۶- عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَبَرَّزَ لِحَاجَتِهِ أَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فَيَغْسِلُ بِهِ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب حاجت کے لیے جاتے تو میں پانی لے کر آتا آپ اس سے استنجاء فرماتے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) قضاء حاجت کے لیے دُور پوشیدہ مقام پر جانا۔ چھوٹے بچوں سے خدمت لینا اور پانی سے استنجاء کے متعلق تفصیلی گفتگو گزشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔

۲۱۷- اس کے بعد امام بخاری نے باب کا لفظ لکھ کر اس کے ماتحت وہی حدیث ۲۱۵ لکھی ہے۔ جس میں عذاب قبر کا بیان ہے۔ یہ حدیث مع تفہیم و ترجمانی کے پیش کی جا چکی ہے۔ اس لیے ہم نے یہاں نہیں لکھی۔

۲۱۸- (۱) بَابُ تَرْكِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسِ الْأَعْرَابِيَّ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهِ فِي الْمَسْجِدِ

باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اس گنوار کو جس نے مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا چھوڑے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ فارغ ہو گیا۔

۲۱۹- ۲۲۰- (۲) بَابُ صَبِّ الْمَاءِ عَلَى الْبَوْلِ فِي الْمَسْجِدِ

باب مسجد میں پیشاب پر پانی ڈالنے کے بیان میں۔

(۳) بَابُ يُهَرِيقُ الْمَاءَ عَلَى الْبَوْلِ (بخاری)

باب پیشاب پر پانی بہانے کے بیان میں۔

فوائد و مسائل امام بخاری نے یہ تین عنوان قائم کیے ہیں۔ بخاری کے بعض نسخوں میں عنوان اول و دوم تو ہے۔ مگر عنوان سوم نہیں ہے۔ ان تینوں عنوانوں کے ماتحت امام نے تین حدیثیں لکھی ہیں۔ اگر چونکہ تینوں کا مضمون ایک ہے اس لیے ہم بوجہ اختصار صرف ایک حدیث لکھیں گے (۲) گزشتہ باب میں پیشاب کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرنے کا بیان تھا۔ اب اس باب میں پیشاب کو زمین سے پانی کے ساتھ دھونے کا بیان ہے۔

أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ قَامَ أَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوهُ وَهَرِيقُوا عَلٰى بَوْلِهِ سَجْلًا مِنْ مَاءٍ أَوْ ذَنُوبًا مِنْ مَاءٍ فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ایک گنوار کھڑا ہوا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو پکڑنا چاہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رہنے دو اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے ایک ڈول پانی بہا دو۔ تم لوگوں پر نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو۔ سختی کے لیے نہیں۔ (بخاری شریف)

فوائد و مسائل حدیث ہذا مسائلِ ذیل پر مشتمل ہے (۱) آدمی کا پیشاب نجس ہے (۲) مسجد کو نجس چیزوں سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے (۳) اگر کسی بے سمجھ آدمی سے کوئی خلافِ شرع کام صادر ہو جائے تو اسے نرمی کے ساتھ سمجھا دینا چاہیے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے صحابہ کو روک دیا کہ وہ اسے کچھ نہ کہیں چنانچہ مسلم کی روایت میں ہے کہ جب وہ اعرابی پیشاب کر چکے تو حضور علیہ السلام نے ان کو بلایا اور فرمایا مسجدیں پیشاب و پاخانہ کے لیے نہیں ہیں بلکہ اللہ کے ذکر، نماز اور قرأت قرآن کے لیے ہیں (۴) اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ زمین کی طہارت صرف پانی سے ہو سکتی ہے۔ سوکھنے یا ہوا سے خشک ہونے سے نہیں ہو سکتی کہتے ہیں امام شافعی و امام مالک کا یہی مسلک ہے لیکن ظاہر ہے یہ استدلال درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کے کسی طرق میں بھی حصر و تخصیص نہیں ہے یعنی اس امر کی قید نہیں ہے کہ زمین صرف پانی بہانے سے ہی پاک ہوگی۔ کسی دوسرے طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں مصنف عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ میں یہ حدیث موجود ہے۔

خفاف الارض طهورها اذا جفت الارض فقد زكت	زمین کا سوکھ جانا اس کی طہارت ہے جب زمین سوکھ جائے تو پاک ہو جاتی ہے۔

اسی لیے سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ زمین دھوپ کی گرمی یا ہوا سے سوکھ جائے اور نجاست کا اثر یعنی رنگ و بو جاتا رہے پاک ہو گئی۔ اس پر نماز پڑھنا درست ہے۔ غرض کہ حدیث زیرِ بحث میں تو صرف اس امر کا بیان ہے کہ اگر زمین نجاست سے ملوث ہو جائے اور اس پر پانی بہا دیا جائے (نجاست کا اثر زائل ہو جائے تو زمین پاک ہو جائے گی۔ رہا یہ امر کہ زمین سوکھنے سے بھی پاک ہوتی ہے یا نہیں؟ تو حدیث زیرِ بحث میں نہ اس کی نفی ہے اور نہ اثبات (۲) ایک استدلال اس حدیث سے یہ کیا گیا کہ وہ پانی جس سے نجاست دھوئی گئی وہ پاک ہے کیونکہ وہ پانی جو زمین پر بہایا گیا ہے زمین میں جذب ہو گا لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہریقوا علی بولہ کے لفظ موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب پانی بہایا جائے گا تو نجاست اس کے ساتھ بہہ جائے گی اور ہریقوا کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقے سے پانی ڈالا جائے کہ نجاست کو ساتھ لے کر بہہ جائے۔ لہٰذا وہ پانی جو نجاست لے کر بہا ہے کیسے پاک ہو سکتا ہے (۵) اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا کہ کپڑوں کو دھوتے وقت نچوڑنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ زمین کو کپڑے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کپڑے کو تو نچوڑا جا سکتا ہے اور زمین کو نچوڑنا ممکن ہی نہیں ہے۔

بَابُ بَوْلِ الصِّبْيَانِ

باب بچوں کے پیشاب کے حکم کے بیان میں

۲۲۲-(۱) عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّهَا قَالَتْ أُتِيَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَبِيٍّ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَأَتْبَعَهُ إِيَّاهُ (بخاری)	(۱) حضرت عائشہ ام المومنین سے روایت ہے کہ ایک بچہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں لایا گیا تو اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا۔ آپ نے پانی منگایا اور کپڑے پر جہاں جہاں پیشاب تھا اس پر ڈال دیا۔

۲۲۳ - (۲) عَنْ اُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ اَنَّهَا اَتَتْ بِابْنٍ لَّهَا صَغِيْرٍ لَّمْ يَاْكُلِ الطَّعَامَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْلَسَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجْرِهٖ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهٖ فَدَعَا بِمَآءٍ فَنَضَحَهٗ وَلَمْ يَغْسِلْهُ

(۲) ام قیس بنت محصن اپنے لڑکے کو جو ابھی روٹی وغیرہ نہ کھاتا تھا (شیر خوار تھا) بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی گود میں بٹھایا اس نے پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگایا اور اس کو بہا دیا (دھویا نہیں)

(بخاری)

فوائد و مسائل

۱- حدیث اول کو امام نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا ہے اور حدیث دوم کو امام مسلم نے طب و طہارۃ میں اور ترمذی، ابن ماجہ و نسائی نے طہارۃ میں ذکر کیا (۲) صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین اپنے شیر خوار بچوں کو بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لاتے تھے، تاکہ حضور علیہ السلام بچہ کے لیے دعا فرمائیں اور تحنیک کریں اور حضور کی شفقت محبت کا یہ عالم تھا کہ بچہ کو گود میں لیتے تھے اور دست رحمت پھیر دیتے تھے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ جس کے لیے حضور علیہ السلام دعا فرما دیں :-

یسعد فی الدنیا والاخرۃ (عینی ج ا صـ۸۹۴)

وہ دین و دنیا میں سعید ہو جاتا ہے۔

کیا شیر خوار بچہ کا پیشاب پاک ہے

ان دونوں حدیثوں سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان حدیثوں میں شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے اور شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھونے کا بیان آیا۔ اس تفریق سے یہ واضح ہوا کہ شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہے اور شیر خوار لڑکی کا پیشاب نجس ہے لیکن ایسا کہنا باطل محض ہے اور اس کے باطل ہونے پر یہی بات کافی ہے کہ اگر شیر خوار لڑکے کا پیشاب پاک ہوتا تو پھر اس پر پانی بہانے کا حکم کیوں دیا جاتا۔ اسی سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جن حدیثوں میں فرشہ علیہ۔ فصب علی البول اور فنضحہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے دراصل غسل دھونا ہی مراد ہے اور لغت میں نہ سہی مگر کلام شارع میں صب رش اور نضح پانی بہانے کے معنی میں آیا ہے۔ نیز حنابلہ و شوافع کی طرف جو نسبت کی جاتی ہے کہ وہ شیر خوار بچے کے پیشاب کو پاک قرار دیتے ہیں یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ خود امام نووی علیہ الرحمۃ نے اس کی تردید فرما دی اور اس کو نقل باطل قرار دیا اور فرمایا :-

الخلاف فی کیفیۃ تطہیر الذی بال علیہ الصبی ولا خلاف فی نجاستہ

(عینی ج ا صـ۸۸۹)

کہ حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ اگر شیر خوار لڑکا پیشاب کر دے تو اس چیز کو کیسے پاک کیا جائے اور شیر خوار لڑکے کے پیشاب کے نجس ہونے میں اختلاف نہیں ہے (نووی شرح مسلم)

اس سے واضح ہو گیا کہ امام شافعی و امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ تعالی علیہما کے متعلق جو یہ مشہور ہو گیا کہ وہ شیر خوار لڑکے کے پیشاب کو پاک قرار دیتے ہیں تو اس شہرت کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ دونوں حضرات شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر نضح

چھڑک دینے سے طہارت کا حکم کر دیتے ہیں۔ اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ان حضرات کے نزدیک لڑکے کا پیشاب پاک ہوگا جبھی تو صرف پانی چھڑک دینے کے حکم پر اکتفا کیا۔ بہرحال یہ بات بالکل یقینی ہے کہ یہ حضرات بھی شیر خوار بچے کے پیشاب کو نجس ہی قرار دیتے ہیں البتہ تطہیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ صرف پانی چھڑکنے سے طہارت ہو جائے گی اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ دھونے سے پاک ہوگا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ احادیث جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں ان میں رشّ، فاتبعہ، فنضحہ کے لفظ آتے ہیں۔ اس سے مراد معمولی طور پر دھونا ہے اور بعض احادیث میں تو بول غلام و جاریہ میں بظاہر تفریق کی طرف اشارہ یا دلالت بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے ۱۔ حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ تعالیٰ کے لفظ یہ ہیں:۔

۱۔ انه قال في الرضيع يغسل بول الجارية وينضح بول الغلام (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)	شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے۔

(۲) حدیث ابی السمح رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ ہے۔

يغسل من بول الجارية ويرش من بول الغلام (ابوداؤد)	شیر خوار لڑکی کا پیشاب دھویا جائے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے۔

(۳) حدیث حضرت ابن عباس میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے کپڑوں یا جسم پر شیر خوار بچہ کا پیشاب

بول صبي وهو صغير فصب عليه من الماء بقدر البول (دار قطنی)	لگ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پانی بہایا جس قدر جگہ پیشاب کی تھی اس پر۔

(۴) حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ:۔

يصب على بول الغلام ويغسل بول الجارية (طبرانی)	شیر خوار لڑکے کے پیشاب پر پانی بہایا جائے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے۔

ان احادیث کے پیش نظر امام شافعی علیہ الرحمۃ نے یہ رائے قائم کی کہ شیر خوار بچہ کا پیشاب اگر کپڑے وغیرہ کو لگ جائے تو اتنی جگہ جہاں پیشاب لگا ہے پانی چھڑک دیا جائے پاک ہو جائے گا۔ پانی چھڑکنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ پر اتنا پانی ڈال دے جو ٹپکے نہیں بلکہ کپڑے میں ہی جذب ہو جائے اور شیر خوار لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے اور دھونے کا مطلب یہی ہے کہ پانی کپڑے سے ٹپک پڑے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شیر خوار لڑکی اور لڑکا جب روٹی کھانے لگ جائے تو اس کا پیشاب دھونے ہی سے کپڑا وغیرہ پاک ہوگا۔ صرف پانی چھڑکنے سے طہارت نہ ہوگی۔ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک چھوٹے اور بڑے سب کے پیشاب کا ایک ہی حکم ہے یعنی دھونے ہی سے کپڑا وغیرہ پاک ہوگا اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کیونکہ جب لڑکا اور لڑکی شیر خوار نہ ہوں تو ان کے پیشاب میں کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا زمانہ شیر خوارگی میں بھی تفریق نہیں ہونی چاہیئے۔ اور احادیث میں جو رش و نضح کے لفظ آئے ہیں تو کلام شارع علیہ السلام میں یہ لفظ غسل خفیف کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی دھونے کے معنیٰ ہی مراد لیے جائیں گے۔ چنانچہ اس امر کے دلائل کہ رش و نضح غسل کے معنی میں آیا ہے یہ ہیں۔

(۱) شرمگاہ کو مذی لگ جائے تو اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا:-

فلینضح فرجہ، ولیتوضأ (ابوداؤد)

چاہیے کہ وہ اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑک دے اور پھر وضو کرے۔

۲- دوسری حدیث میں فرمایا-

لیغسل ذکرہ ویتوضأ

چاہیے کہ شرمگاہ کو دھولے پھر وضو کرے۔

یہ دونوں حدیثیں ایک ہی سوال کے جواب میں ہیں۔ قصہ بھی ایک ہی ہے اور راوی بھی دونوں کے حضرت مقداد ابن اسود ہیں۔ ان میں سے ایک میں نضح کا لفظ آیا ہے اور دوسری میں غسل کا، معلوم ہوا کہ نضح (چھڑکنے) سے مراد دھونا ہی ہے۔ اسی طرح حدیث سہل بن حنیف میں ہے کہ انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ کپڑے کو مذی لگ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا-

(۳) یکفیک ان تاخذ کفا من ماء فتنضح بہ ثوبک حیث یری انہ اصابہ (ترمذی)

ایک کف پانی کا لے کر وہاں چھڑک دے جہاں جہاں تجھے کپڑے پر مذی لگی ہوئی نظر آئے۔

دیکھو یہاں بھی نضح سے مراد دھونا ہے صرف چھڑکنا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور علیہ السلام کے وضو کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرمائی ہے-

(۴) اخذ غرفۃ من ماء فرش علی رجلہ الیمنیٰ حتی غسلہا

حضور علیہ السلام نے ایک چلو پانی کا لیا اور اپنے سیدھے پاؤں پر چھڑکا یہاں تک کہ دھو دیا۔

دیکھئے یہاں بھی رش بمعنی غسل کے ہے اسی طرح نضح و رش غسل کے معنیٰ میں ان دو حدیثوں میں بھی وارد جو یہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا۔ ثم تنضحہ ثم تصلی فیہ ثم رشیہ وصلی فیہ (بخاری مسلم ترمذی) ان سے ثابت ہوا کہ کلام شارع میں رش و نضح دھونے کے معنیٰ میں آیا۔ پس بول غلام کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں۔ ان میں بھی رش و نضح دھونے کے معنیٰ میں لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ سیدنا امام شافعی علیہ الرحمۃ کے مسلک پر ایک سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ جب ان کے نزدیک بھی شیر خوار لڑکے کا پیشاب نجس ہے تو صرف اس پر پانی چھڑک دینے سے فائدہ؟ خصوصاً ایسی صورت میں جب ان کے نزدیک صرف اتنا پانی چھڑکنا چاہیے جو کپڑے کی اتنی جگہ پر پڑ کر جذب ہو جتنی جگہ کو پیشاب نے گھیرا ہے (۲) یہاں اہل علم کے لیے یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ خون حیض کے متعلق بھی حدیث میں نضح کے لفظ آئے ہیں (بخاری کتاب الحیض) اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ خون حیض ناپاک ہے لہٰذا شیر خوار بچہ کا پیشاب کے لفظ نضح سے اس کی طہارت کا قول کرنے والوں کو یہ چاہیے کہ وہ خون حیض کی طہارت کا بھی قول کریں فافہم۔

بَابُ الْبَوْلِ قَائِمًا وَقَاعِدًا

باب کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پیشاب کرنے کے بیان میں

۲۲۴- عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ اَتَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ (بخاری)

کوڑا جمع ہونے کی جگہ پر تشریف لائے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ پھر پانی منگایا۔ آپ نے وضو فرمایا۔

فوائد و مسائل

۱۔ امام بخاری نے متعدد بار اس حدیث کو کتاب الطہارۃ میں لکھا ہے۔ ترمذی، مسلم، ابن ماجہ، نسائی نے بھی کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ یہ اور اس مضمون کی دو ایک حدیثیں اور بھی بخاری میں ہیں جن میں حضور علیہ السلام کا کھڑے ہو کر پیشاب فرمانے کا ذکر ہے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

۱۔ حضرت سعید ابن مسیب، عروہ، محمد بن سیرین، زید ابن اصم، عبیدہ السلمانی، امام نخعی، حاکم، شعبی و امام احمد کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مباح قرار دیتے ہیں۔ حضرت علی و انس و ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مروی ہے۔ ۲۔ امام مالک علیہ الرحمۃ کی رائے یہ ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں چھینٹیں نہ لگیں تو حرج نہیں ورنہ مکروہ ہے۔

۳۔ ابن المنذر نے کہا بیٹھ کر پیشاب کرنا اچھا ہے اور کھڑے ہو کر مباح ہے۔ حضور علیہ السلام سے دونوں طرح ثابت ہے۔

(۴) عامہ علماء حنفیہ بلا عذر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ تنزیہہ قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (عینی ج ۱ ص ۸۹۴)

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز نہیں ہے؟

اس کی چند حدیثیں یہ ہیں:۔

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جو تم سے یہ بیان کرے کہ حضور علیہ السلام نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔ اس کی تصدیق مت کرو۔ ما کان یبول الا قاعدًا (رواہ الخمسہ) (۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبول الرجل قائما۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع فرمایا (ابن ماجہ) لیکن اس حدیث کی اسناد میں عدی بن الفضل ہے جو متروک ہے۔ (۳) حدیث بریدہ جس کو بزار نے بسند صحیح روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تین باتیں جفاء سے ہیں۔ ان یبول الرجل قائما (یہ کہ آدمی کھڑے ہو کر پیشاب کرے)۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو غیر محفوظ قرار دیا گیا ہے مگر بزار نے بسند صحیح روایت کیا ہے (عینی ج ۱ ص ۸۹۶) ۴۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو فرمایا۔

یا عمر لا تبل قائما قال فما بلت قائما بعدُ (بیہقی)

اے عمر کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو۔ تو پھر میں نے اس کے بعد کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

لیکن امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابن جریج، عبد الکریم بن امیہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ ضعیف ہیں۔ عبد الکریم نے اس حدیث کا رفع کیا ہے مگر ایوب نے ان میں کلام کیا اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ۵۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ:۔

مَا بَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کہ نزولِ قرآن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ے حدیث ۵ و ۶ دوسری حدیثوں کے متعارض نہیں ہیں کیونکہ حضرت عائشہ اپنا مشاہدہ بیان فرما رہی ہیں اور ان کا مشاہدہ ظاہر ہے کہ گھر ہی سے متعلق ہو

قَائِمًا منذ انزل علیه القرآن

کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

حدیث ہذا کو ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت کیا اور دارقطنی وغیرہ نے اس کو صحیح کہا۔ (۶) ابن ماجہ نے بعض مشائخ سے نقل کیا کہ عربوں کی عادت کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی تھی اور نسائی و ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پیشاب کیا تو ہم نے کہا۔

فقلنا انظر والیه یبول کما تبول المرأة

دیکھو حضور تو ایسے پیشاب کر رہے ہیں جیسے عورتیں کرتی ہیں (یعنی بیٹھ کر)

حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے فرمایا اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن حسنہ نے روایت کیا اور یہ صحیح ہے دارقطنی نے اس کو صحیح کہا۔ (نیل الاوطار ج ۱ ص ۸۹) (۷) اور حضرت ابوموسیٰ سے منقول ہے انھوں نے ایک شخص کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھ تو فرمایا وہ

ویحك افلا قاعدًا

برائی ہو بیٹھ کر کیوں نہیں کرتا

علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے ان تمام توضیحات کے بعد فرمایا کہ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طرح پیشاب کرنا جائز ہے۔ اکثر علماء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لوجود احادیث النهی واکثرها غیر ثابت فافهم۔ غرض کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی ممانعت کی حدیث صحیح ہو جائے تو پھر تو یہ فعل مکروہ تحریمی ہوگا اور اس کا قول نہیں بلکہ امام نسائی نے تو باب الرخصۃ فی البول فی الصحراء قائما کا عنوان قائم ہے اور علامہ سندھی نے دونوں حدیثوں میں یہ تطبیق دی ہے (۲) حدیث حذیفہ محمول ہے خارج بیت پر اور حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جس میں یہ آیا کہ حضور علیہ السلام بیٹھ کر پیشاب فرماتے تھے یہ محمول ہے بیت پر فافہم۔ (۳) ہاں بعض علماء نے حدیث مستدرک کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا کھڑے ہو کر پیشاب فرمانا کسی عذر کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ حدیث مستدرک للحاکم میں آیا کان لوجع فی مابضه یعنی گھٹنوں کے اندرونی حصہ میں حضور کو تکلیف تھی۔ اس لیے بحالت قیام پیشاب فرمایا۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن بیان احتمالات کا فائدہ دے سکتی ہے۔ (۴) البتہ بعض صلحاء امت نے اس معاملہ میں سختی بھی کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہمارے زمانہ میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا نصاریٰ کا شعار ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس معاملہ میں سختی کی جا تو پھر بھی مکروہ تنزیہی سے زیادہ کا حکم نہیں دیا جا سکتا (واللہ تعالیٰ اعلم)

بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ صَاحِبِهٖ وَالتَّسَتُّرِ بِالْحَائِطِ

باب اپنے ساتھی کے نزدیک پیشاب کرنا اور دیوار کی آڑ کرنا

۲۲۵- عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ رَاَيْتُنِيْ اَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَمَاشٰى فَاَتٰى سُبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ حَائِطٍ فَقَامَ

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چہل قدمی کر رہے تھے تو آپ قوم کی کوڑا ڈالنے کی جگہ پہنچے اور دیوار کے پیچھے ایسے کھڑے ہوئے جیسے تم

سکتا ہے اور گھر سے باہر کا حال انھیں معلوم نہیں ہے۔ منہ

كَمَا يَقُوْمُ اَحَدُكُمْ فَبَالَ فَانْتَبَذْتُ مِنْهُ فَاَشَارَ اِلَيَّ فَجِئْتُهُ فَقُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهٖ حَتّٰى فَرَغَ (بخاری)

میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے پھر آپ نے پیشاب کیا اور میں الگ ہو گیا۔ آپ نے اشارہ سے مجھے بلایا تو میں آپ کی ایڑی کے قریب کھڑا ہو گیا یہاں تک آپ فارغ ہو گئے۔

فوائد و مسائل (۱) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کبار صحابہ کرام سے ہیں۔ مسلم میں ہے کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک ہونے والے واقعات بتا دیے تھے۔ حضرت حذیفہ کے والد بھی صحابی تھے جو جنگِ اُحد میں شہید ہوئے اور حضرت حذیفہ نے جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی ابتدا خلافت ۳۶ھ میں وفات پائی۔ آپ سے بخاری میں بائیس ۲۲ حدیثیں مروی ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) (۲) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے:۔

(۱) اگر ساتھی نزدیک ہی بایں طور کھڑا ہو کہ شرمگاہ اس کی نظروں سے پوشیدہ رہے تو ایسی حالت میں پیشاب کرنا جائز ہے حضور علیہ السلام نے اپنی حفاظت کے لیے یا کسی اور وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے نزدیک کھڑا کر لیا ہو۔ اور وہ حضور علیہ السلام کی ایڑیوں کے قریب کھڑے ہو گئے تھے یا یہ کہ آپ نے ان کو اس لیے کھڑا کیا ہو کہ ایک طرف تو دیوار کا پردہ ہو جائے اور دوسری طرف حذیفہ حائل ہو جائیں جیسا کہ طبرانی کی حدیث میں یا حذیفہ استرنی کے لفظ آئے ہیں۔

(۲) اس سے بعض نے یہ استدلال کیا کہ پیشاب کرتے ہوئے باتیں کرنا جائز ہے مگر یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت حذیفہ کو اشارہ سے بلایا تھا اور حدیث میں اشارہ کا لفظ بھی موجود ہے۔ البتہ مسلم میں (ادن) کا لفظ آیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ روایت بالمعنی ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ دو آدمی ایسا نہ کریں جب کہ وہ اپنی شرمگاہوں کو کھولے ہوئے قضاء حاجت کر رہے ہوں۔

يَتَحَدَّثَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَمْقُتُ عَلٰى ذٰلِكَ (ابوداؤد) | اور باتیں کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں ہے

اس حدیث میں مذکورہ بالا صورت میں بات کرنے سے منع فرمایا گیا۔ ہاں اگر ضرورت شرعی ہو تو بات کرنے میں حرج ہیں —— علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہی تھی کہ قضاء حاجت بادی سے دُور جا کر فرماتے لیکن یہاں آبادی کے قریب قضاء حاجت فرمانا اس وجہ سے ہوگا کہ آپ اُمورِ مسلمین میں مشغول رہے وحاجت ہو گئی اور آبادی سے دُور جانے میں دشواری محسوس ہوئی۔ اس لیے قریب ہی رفع حاجت فرمائی۔

بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ سُبَاطَةِ قَوْمٍ

باب سباط قوم کے نزدیک پیشاب کرنے کے بیان میں

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اندازِ فکر یہ ہے کہ حدیث کے ایک ایک ٹکڑے کا عنوان باندھ دیتے ہیں۔ س عنوان کے ماتحت بھی امام نے مذکورہ بالا مضمون کی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے سباطہ قوم پر یاب فرمایا۔ سُباطہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بستی والے بستی کا کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں۔ ویسے سباطہ کے اصل معنی اس جگہ ے ہیں جہاں مٹی کا ڈھیر لگا ہوا ہو اور وہ ٹیلے کی صورت ہو جائے۔

۲۲۶- عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ كَانَ اَبُوْمُوْسٰى | حضرت ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ

الْاَشْعَرِيُّ يُشَدِّدُ فِي الْبَوْلِ وَيَقُوْلُ اِنَّ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ كَانَ اِذَا اَصَابَ ثَوْبَ اَحَدِهِمْ قَرَضَهٗ فَقَالَ حُذَيْفَةُ لَيْتَهٗ اَمْسَكَ اَتٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَآئِمًا

(بخاری)

اشعری پیشاب کرنے والے کے ساتھ سختی کرتے (منع کرتے) اور فرماتے (بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ تھا کہ کپڑے کو پیشاب لگ جائے تو اس کو کتر ڈالتے) حذیفہ نے کہا کاش ابوموسیٰ اس سختی سے باز رہتے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سباطہ قوم پر گئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھینٹوں سے بچنے کے لیے قارورہ میں پیشاب کیا کرتے تھے، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں عموماً چھینٹیں آتی ہیں۔ اس لیے وہ لوگوں کو خصوصی طور پر تنبیہ فرمایا کرتے کہ کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو اور ظاہر ہے کہ اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں کپڑوں اور جسم پر چھینٹیں لگیں تو یہ صورت ممنوع قرار پائے گی اور اس کی علت قیام نہیں بلکہ تلویث ثوب و بدن ہوگی۔ فافہم۔ اسی سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ ایسی ہیئت سے قضاءِ حاجت کرنا کہ کپڑے یا بدن ملوث ہوں ممنوع ہے۔

بَابُ غَسْلِ الدَّمِ

باب خون (حیض) دھونے کے بیان میں

۲۲۷۔ عَنْ اَسْمَآءَ قَالَتْ جَآءَتِ امْرَاَةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اَرَءَيْتَ اِحْدَانَا تَحِيْضُ فِي الثَّوْبِ كَيْفَ تَصْنَعُ قَالَ تَحُتُّهٗ ثُمَّ تَقْرُصُهٗ بِالْمَآءِ وَتَنْضَحُهٗ بِالْمَآءِ وَتُصَلِّيْ فِيْهِ (بخاری)

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کی ہم میں سے اگر کسی عورت کو کپڑے میں حیض آجائے تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا۔ پہلے اس کو کھرچ ڈال پھر پانی ڈال کر رگڑے اور پانی سے دھو ڈالے۔

فوائد و مسائل (۱) امام نے اس حدیث کو صلوٰۃ اور بیوع میں ذکر کیا۔ مسلم، ترمذی، نسائی و ابن ماجہ نے طہارت میں ذکر کیا (۲) حضرت اسماء سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ ماجدہ ہیں۔ آپ کو ذات النطاقین بھی کہتے ہیں۔ مہاجرات میں سے ہیں۔ علم تعبیر کی ماہر تھیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابن سیرین نے علم تعبیر حضرت ابن مسیب سے اور انہوں نے جناب اسماء سے حاصل کیا تھا۔ ۷۳ھ میں سو برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بخاری میں حضرت اسماء سے سولہ حدیثیں مروی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(۳) مطلب حدیث یہ ہے کہ اگر کپڑے کو خونِ حیض لگ جائے تو اس کو اچھی طرح رگڑ کر دھو لیا جائے پاک ہو جائے گا۔ دیکھئے۔ تنضحہ کا لفظ یہاں دھونے کے معنی میں ہے۔ نیز اس سلسلہ کی دوسری حدیثوں کے الفاظ یہ ہیں۔

(۱) اغسلیہ بالماء والسدر	(۱) بیری کے پتوں سے دھو ڈال
(۲) واطرحی فیہ ملحاً ثم اغسلی	(۲) پہلے کپڑے پر نمک ڈال دے پھر پانی سے دھو ڈال۔

(۳) ثم تقرص الدم من ثوبها عند طهرها وتغسله

(۴) فاغسلي موضع حيضك ثم صلي فيه قالت يا رسول الله ارى لم يخرج اثره قال يكفيك المآءَ ولا يضرك اثره

(مسند احمد، ابن ماجہ)

(۳) کپڑے سے خون کو کھُرچ پھر دھو ڈال

(۴) جس جگہ کپڑے پر خون حیض لگا ہے اس کو دھو ڈال

(۴) جس جگہ کپڑے پر خون حیض لگا ہے اس کو دھو ڈال عرض کی یا رسول اللہ اگرچہ خون کا دھبہ نہ جائے فرمایا۔ تیرے لیے پانی سے دھونا کافی ہے، دھبہ نقصان نہیں دیگا۔

۱۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کپڑے کو خونِ حیض لگ جائے تو بیری کے پتوں یا اُشنان یا صابن لگا کر دھو لیا جائے تاکہ خوب اچھی طرح دُھل جائے خوب دھونے کے باوجود بھی اگر دھبہ باقی رہ جائے تو معاف ہے (۲) یہ کہ خون ناپاک ہے (۳) ناپاک چیز کو دھونے کے لیے کوئی عدد مقرر نہیں۔ فقہاء کرام نے جو عدد مقرر کیا ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ تین دفعہ دھونے سے یقین ہو جاتا ہے کہ نجاست زائل ہو گئی ورنہ اگر واقعی ایک دفعہ دھونے سے نجاست دُور ہو جائے تو طہارت حاصل ہو جائے گی۔ غرضیکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نجاست زائل ہونے کا جب ظن غالب ہو جائے تو نجس چیز پاک ہو جائے گی، خواہ یہ ظن ایک دفعہ دھونے سے حاصل ہو یا دو یا تین دفعہ دھونے سے۔ البتہ جو شخص وسوسہ کے مرض میں مبتلا ہو اسے تین بار سے زائد نہ دھونا چاہئے کہ وسوسہ کا مریض ہزار بار بھی دھوئے تو بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

کیا عرق گلاب و کیوڑہ سے ناپاک کپڑا وغیرہ دھونے سے پاک ہو جائے گا؟

۱۔ علامہ خطابی و بیہقی نے اس حدیث سے یہ استدلال فرمایا کہ نجاست کا ازالہ صرف پانی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور دوسری رقیق و سیال چیزوں مثلاً عرق گلاب، کیوڑہ وغیرہ سے دھونے سے طہارت نہ ہوگی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حدیث میں پانی کی قید تو محض اس لیے ہے کہ عموماً پانی موجود ہوتا ہے یعنی حدیث میں پانی کو ازالۂ نجاست کے لیے شرط قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اس لیے احناف کا مسلک یہ ہے کہ ہر وہ پاک رقیق بہنے والی چیز جس سے نجاست دُور ہو جائے۔ مثلاً عرق کیوڑہ یا سرکہ اگر اس سے نجس چیز کو دھویا گیا تو پاک ہو جائے گی۔ لیکن بلا ضرورت گلاب و سرکہ وغیرہ سے اشیاء کو پاک کرنا ناجائز ہے کہ فضول خرچی ہے اور دودھ گھی تیل ایسی چکنی سیال چیزوں سے دھونے سے طہارت نہیں ہوگی۔ کیونکہ بوجہ چکناہٹ یہ چیزیں نجاست کو دُور نہیں کرتیں۔

ایک درہم سے کم نجاست کا حکم

واضح ہو کہ نجاست دو قسم پر ہے۔ غلیظہ جیسے پاخانہ، پیشاب، بہتا خون، پیپ، منہ بھر قے، حیض و نفاس و استحاضہ کا خون، منی، ودی اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کپڑے یا بدن میں ایک درہم سے زیادہ لگ جائے تو اس کا پاک کرنا فرض ہے۔ بے پاک کیے نماز پڑھی نہ ہوگی اور قصداً پڑھی گناہ بھی ہوا اور اگر بہ نیت توہین پڑھی تو کفر ہوا اور اگر درہم کے برابر ہے تو پاک کرنا واجب ہے۔ بے پاک کیے نماز پڑھی، ہو گئی مگر خلاف سنت ہوئی اور اس کا دوبارہ پڑھ لینا بہتر ہے لیکن اگر دوبارہ نہ لوٹائی تو گنہگار نہ ہوگا۔

(۲) احناف کی دلیل اس مسئلہ میں حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ ان حضرات نے ایک درہم

نجاست معین کی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالے عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کے برابر مقدار بتلائی (کمافی المحیط) اور حضرت عمر کے انگوٹھے کا ناخن عرضِ کف کے برابر تھا۔ صاحب محیط نے فرمایا۔ درہم کبیر عرضِ کف کے برابر ہے البتہ امام سرخسی نے یہ کہا کہ درہم رائج الوقت مراد لیا جائے۔ فافہم

٢٢٨۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَاطِمَةُ
بِنْتُ اَبِیْ حُبَیْشٍ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ
وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اِمْرَاَةٌ
اُسْتَحَاضُ فَلَا اَطْهُرُ اَفَاَدَعُ الصَّلٰوةَ
فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ
لَا اِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَلَیْسَ بِحَیْضٍ فَاِذَا
اَقْبَلَتْ حَیْضَتُكِ فَدَعِی الصَّلٰوةَ وَاِذَا
اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِیْ عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّیْ قَالَ
وَقَالَ اَبِیْ ثُمَّ تَوَضَّئِیْ لِكُلِّ صَلٰوةٍ حَتّٰی
یَجِیْءَ ذٰلِكَ الْوَقْتُ۔ (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں اور عرض کی یارسول اللہ مجھے استحاضہ کی بیماری ہے پاک نہیں رہتی کیا نماز چھوڑ دوں؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نماز چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک رگ کا خون ہے حیض نہیں ہے جب حسب معمول حیض کے دن آئیں تو نماز نہ پڑھو اور جب حیض کی مدت پوری ہو جائے تو بدن یا کپڑے پر خون لگا ہو تو اس کو دھو ڈالو اور وضوء کر کے نماز پڑھو میرے باپ عروہ نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا پھر نماز کے لیے وضوء کرتی رہ یہاں تک کہ پھر حیض کے دن آئیں

فوائد و مسائل اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی نے کتاب الصلوٰۃ میں درج کیا۔ حدیث ہذا مسائل ذیل پر مشتمل ہے ۱۔ مستورات کا اپنے مخصوص مسائل کا دریافت کرنا جائز ہے (۲) غیر محرم سے بضرورت شرعیہ گفتگو جائز ہے (۳) حائضہ عورت کو نماز پڑھنا خواہ نفل ہوں یا فرض حرام ہے۔ اسی طرح حائضہ کو طواف کعبہ، نماز جنازہ، سجدہ شکر بھی جائز نہیں (۴) خون نجس ہے (۵) جب حیض کا خون بند ہو جائے تو مجرد انقطاع سے نماز واجب ہو جاتی ہے۔ (۶) استحاضہ ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے عورت کو خون آتا ہے اور کبھی یہ مرض شدت اختیار کر جائے تو پھر ہر وقت آتا رہتا ہے۔ اسی مسئلہ کو حضرت فاطمہ نے حضور علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ خون جاری رہتا ہے اور میں پاک نہیں رہتی، نماز کے متعلق کیا حکم ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جتنے دن حیض آنے کی عادت ہے اس مدت میں تو نماز نہ پڑھی جائے۔ پھر جب حیض کی مدت ختم ہو جائے تو غسل کر (جیسا کہ دوسری روایت میں تصریح ہے) اور ہر نماز کے وقت کے لیے تازہ وضوء کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ گویا مسئلہ یہ ہوا کہ فرض کیجیے کسی عورت کو استحاضہ کی بیماری لاحق ہے اور اس کو ہر ماہ دس دن یکم سے لے کر ۱۰ تاریخ تک حیض آنے کی عادت ہے تو یہ دس دن تو حیض کے ہوں گے۔ ان دنوں میں نماز نہ پڑھے۔ گیارھویں دن غسل کرے اور اس کے بعد سے ہر نماز کے وقت تازہ وضوء کرے اور نماز پڑھتی رہے اور کپڑا وغیرہ رکھ لیا جائے تاکہ خون اس میں رہے جب تک نماز کا وقت باقی رہے گا وضو باقی رہے گا۔ خواہ خون جاری رہے۔ اس کے بعد جب دوسری نماز کا وقت آئے پھر تازہ وضوء کر کے نماز ادا کرے اسی طرح نماز پڑھتی رہے۔

بَابُ غَسْلِ الْمَنِيِّ وَفَرْكِهٖ وَ غَسْلِ مَا يُصِيْبُ مِنَ الْمَرْاَةِ

(۱) باب منی کا دھونا (۲) اور اس کا کھرچنا (۳) اور عورت کی شرمگاہ سے (کپڑے یا بدن) جو رطوبت لگ جائے اسکا دھونا

امام نے اس عنوان کو تین امور میں کیا ہے۔ منی کا دھونا، منی کا کھرچنا، رطوبت فرج کا دھونا۔ مگر اس عنوان کے ماتحت سے حدیث درج کی ہے۔ اس میں صرف منی کے دھونے کا بیان ہے۔ شارحین نے اس اعتراض کے متعدد جواب دیے ہیں اور گرما گرم بحثیں کی ہیں مگر سب کے سب عذر بار ہیں۔ دیکھو عینی، قسطلانی، فتح الباری۔

۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْسِلُ الْجَنَابَةَ مِنْ ثَوْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَخْرُجُ اِلَى الصَّلٰوةِ وَاِنَّ بُقَعَ الْمَآءِ فِيْ ثَوْبِهٖ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو دھو دیتی تھی اور حضور علیہ السلام وہ کپڑا اپنے نماز کے لیے جاتے درآنحالیکہ پانی کے دھبے آپ کے کپڑے پر ہوتے۔

فوائد و مسائل

(۱) امام نے اس حدیث کو اسی باب میں متعدد بار ذکر کیا ہے۔ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (۲) تسمیۃ الشیء باسم سببہ کے ماتحت یہاں جنابۃ کے لفظ سے منی مراد ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دوسروں کی منی نجس ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ حضور علیہ السلام کے کپڑوں سے منی دھوتی تھیں۔ حضور علیہ السلام اسی کپڑے کو پہن کر نماز کے لیے تشریف لے جاتے اور دھونے کا اثر اس پر باقی ہوتا تھا یعنی کپڑا گیلا ہی ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک بھی منی نجس ہے۔ واضح ہو کہ اگر کپڑے کو منی لگ جائے اور ابھی گیلی ہو تو دھونے سے ہی کپڑا پاک ہوگا اور اگر غلیظ ہو اور سوکھ جائے اور اس کو خوب اچھی طرح رگڑا جائے کہ اس کے اجزاء کپڑے سے جھڑ جائیں تو اس کپڑے کے ساتھ بغیر دھوئے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہیں:۔

منی کا حکم اور پاک کرنیکا طریقہ

(۱) ربما فركته من ثوب رسول اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وَسَلَّمَ باصابعي

جناب عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں میں کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو انگلیوں سے کھرچتی تھی۔ (ترمذی)

(۲) وَانى لاحكه من ثوب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وَسَلَّمَ يابسا بظفرى (ترمذی)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو اپنے ناخنوں سے کھرچتی تھی۔

(۳) انها كانت تحت المنى مِن ثوب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وَهو يصلى (بیہقی، دارقطنی)

حضرت عائشہ صدیقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے منی کو کھرچ دیتی تھیں اور حضور اسی کپڑے میں نماز ادا فرماتے۔

(۴) كُنت افرك المنى من ثوب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اذا كان يابسا وَاغسله اذا

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو کھرچتی تھی جب کہ وہ سوکھی ہوتی اور اگر تر ہوتی

کان رطبا - (بزار و ابو عوانہ)

| تو دھوتی تھی -

ان احادیث سے واضح ہوا کہ منی سوکھ جائے اور اس کو کھرچ دیا جائے تو اس کپڑے میں نماز جائز ہے اور اگر منی تر ہو تو پھر دھونا ضروری ہے - کیونکہ کھرچنے سے وہ زائل نہیں ہوگی -

بَابُ اَبْوَالِ الْاِبِلِ وَالدَّوَابِّ

باب اونٹوں، بکریوں اور چوپاؤں کے پیشاب

والغنم ومرابضها

وَصَلّٰى اَبُوْ مُوْسٰى فِيْ دَارِ الْبَرِيْدِ وَالسِّرْقِيْنِ وَالْبَرِّيَّةُ اِلٰى جَنْبِهٖ فَقَالَ هٰهُنَا اَوْ ثَمَّ سَوَاءٌ

اور وہاں نماز پڑھنے کے بیان میں

اور ابو موسیٰ نے دار البرید میں نماز پڑھی جہاں لید اور گوبر پڑا تھا حالانکہ جنگل ان کے پہلو میں تھا اور کہا کہ اس مقام میں اور صاف مقام میں کوئی فرق نہیں -

فوائد و مسائل اس اثر کو شیخ بخاری، ابو نعیم نے کتاب الصلوٰۃ میں وصل کیا - صلّی کا مطلب یہ لیا گیا کہ حضرت ابو موسیٰ نے اس جگہ نماز پڑھی جہاں لید اور گوبر پڑا ہوا تھا کیونکہ ان کے نزدیک حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ پاک ہے - لیکن اس مفہوم کو لینے میں نظر ہے کیونکہ عموماً جب نماز پڑھتے ہیں تو مصلّی یا چٹائی یا کپڑا بچھا کر پڑھتے ہیں تو حضرت ابو موسیٰ نے بھی چٹائی بچھا کر ہی نماز پڑھی ہوگی اور ناپاک زمین پر موٹا کپڑا یا چٹائی بچھا کر نماز پڑھنا بالاتفاق جائز ہے اور اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ ان کے نزدیک حلال جانور کا لید اور گوبر پاک تھا - اس لیے انھوں نے چٹائی وغیرہ بچھے بغیر نماز پڑھ لی تو یہ صرف ان کا ایک فعل ہے اور حضرت ابن عمر و دیگر صحابہ کرام اس کے خلاف ہیں -

۳۳۲ - عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ قَبْلَ اَنْ يُّبْنَى الْمَسْجِدُ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھتے تھے -

فوائد و مسائل اس حدیث سے امام نخعی، اوزاعی، زہری، امام مالک، احمد و محمد و زفر ابن خزیمہ و ابن حبان نے یہ استدلال کیا کہ جن جانوروں کا کھانا حلال ہے ان کا پیشاب و گوبر بھی پاک ہے - وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھی اور باڑہ عموماً لید، گوبر، پیشاب سے صاف نہیں ہوتا لیکن امام شافعی، ابو حنیفہ، جماعت سلف و جمہور علماء (کما فی الفتح) کا مسلک یہ ہے کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور گوبر بھی نجس ہے البتہ نجاست خفیفہ ہے - رہی یہ بات کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے چٹائی بچھا کر پڑھی ہو؟ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے -

کان یصلی علی الخمرة

| حضور علیہ السلام اوڑھنی پر نماز پڑھتے تھے -

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ان کے گھر میں حضور علیہ السلام نے

علی حصیر فی دارھم (بخاری و مسلم)

| چٹائی پر نماز پڑھی

اس کے علاوہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام ہدایت یہ تھی کہ گھروں میں نماز پڑھنے کے لیے صاف ستھری جگہ مقرر کی جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گھر میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنانے کا حکم دیا اور فرمایا:۔

وان تنظف وتطیب (ابوداؤد واحمد)

کہ اس جگہ کو پاک وصاف رکھا جائے۔

نیز بیہقی کی حدیث میں ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان لم تجدوا الا مرابض الغنم و اعطان الابل فصلوا فی مرابض الغنم ولا تصلوا فی اعطان الابل

اگر سوائے بکریوں کے باڑہ اور اونٹوں کے باڑہ کے نماز کے لیے کوئی اور جگہ نہ ملے تو بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھو، اونٹوں کے باڑہ میں نہیں۔

(ابن حبان وقال الترمذی حسن صحیح)

ان روایات کے پیش نظر اس امر کو تقویت پہنچتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بکریوں کے باڑہ میں جو نماز پڑھی وہ چٹائی بچھا کر ادا فرمائی ہوگی۔

وضاحت

اس سلسلہ میں امور ذیل بھی قابل ذکر ہیں ۱- جن احادیث میں بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے تو ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شارع علیہ السلام کو یہ امر مطلوب ہے کہ لوگ یہاں نماز پڑھا کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ لفظ ہیں اذا لم تجدوا جب تم نماز کے لیے بکریوں کے باڑے کے سوا اور کوئی جگہ نہ پاؤ تو پھر وہاں نماز پڑھو۔ اس سے مطلوبیت کی نفی ہو گئی۔ ثانیاً حضور علیہ السلام کا یہ امر ابتدائی بھی نہیں ہے کہ مستقل طور پر آپ نے از خود یہ مسئلہ بیان فرمایا ہو بلکہ طحاوی میں تو یہ تصریح ہے کہ حضور سے کسی نے سوال کیا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں۔ حضور اکرم نے فرمایا۔ ہاں! معلوم ہوا کہ یہ امر ابتدائی نہیں ہے بلکہ سائل کے جواب میں ہے۔ ثالثاً، بکریوں کے باڑہ میں نماز پڑھنے کی اجازت دینا اور اونٹوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنے سے ممانعت فرمانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب کا محبوب ترین مال بکریاں تھیں اور وہ ان کے قیام و طعام کا انتظام اپنے گھروں ہی میں کرتے تھے جہاں بکریاں رہتی تھیں وہیں بیٹھتے، اٹھتے، کھاتے پیتے تھے تو وہ ضرور ایک حصہ زمین کو نماز پڑھنے اور اپنے بیٹھنے کے لیے صاف ستھرا رکھتے ہوں گے چنانچہ حدیث موطا امام مالک کے یہ لفظ احسن مرابض الغنم واطب مراجها وصل فی ناحیه اس خیال کی تائید و توثیق کرتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوتی۔ بکریوں کے باڑے کے ایک کونہ میں نماز پڑھتے تھے جو صاف ستھرا رکھا جاتا تھا چنانچہ عینی میں مسند البزار کی حدیث کے لفظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں احسنوا الیها واميطوا نها الاذی۔ پس ثابت ہوا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے یہ استدلال کرنا کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور لید و گوبر پاک ہے صحیح نہیں ہے۔ فافہم

۲۳۳- عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ اُنَاسٌ مِّنْ عُكْلٍ اَوْ عُرَيْنَةَ فَاجْتَوَوُا الْمَدِيْنَةَ فَاَمَرَ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگ قبیلہ عکل و عرینہ کے مسلمان ہو کر مدینہ میں آئے

هُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلِقَاحٍ وَّاَنْ يَّشْرَبُوْا مِنْ اَبْوَالِهَا وَاَلْبَانِهَا فَانْطَلَقُوْا فَلَمَّا صَحُّوْا قَتَلُوْا رَاعِيَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاسْتَاقُوا النَّعَمَ فَجَآءَ الْخَبَرُ فِيْ اَوَّلِ النَّهَارِ فَبَعَثَ فِيْ اٰثَارِهِمْ فَلَمَّا ارْتَفَعَ النَّهَارُ جِيْءَ بِهِمْ فَاَمَرَ فَقَطَعَ اَيْدِيَهُمْ وَاَرْجُلَهُمْ وَاُلْقُوْا فِي الْحَرَّةِ يَسْتَسْقُوْنَ فَلَا يُسْقَوْنَ قَالَ اَبُوْ قِلَابَةَ فَهٰؤُلَآءِ سَرَقُوْا فَقَتَلُوْا وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَحَارَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (بخاری)

کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیتے رہیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ تندرست ہو گئے اور انھوں نے حضور علیہ السلام کے گلہ کے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹنیاں بھگا کر لے گئے۔ صبح کو یہ خبر حضور علیہ السلام کو پہنچی۔ آپ نے ان کے تعاقب کا حکم دیا۔ دن چڑھے وہ پکڑے گئے اور آپ نے حکم دیا تو ان کے ہاتھ کاٹے گئے آنکھیں پھوڑی گئیں اور پتھریلی زمین پر دھوپ میں ڈال دیئے گئے۔ وہ پیاس کی وجہ سے پانی مانگتے تھے لیکن کوئی پانی نہیں دیتا تھا۔ ابو قلابہ نے کہا یہ سزا انھیں اس لیے دی گئی کہ انھوں نے چوری کی قتل ناحق کیا۔ مرتد ہوئے اور اللہ و رسول سے لڑے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری نے آٹھ جگہ ذکر کیا۔ جہاد، دیات، حدود، تفسیر، مغازی، محاربین اور مسلم نے حدود میں، ابوداؤد نے طہارۃ میں، نسائی نے محاربہ میں (۲) طبرانی کی حدیث میں ہے کہ یہ قبیلہ عکل کے آٹھ اور عرینہ کے چار آدمی تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں دس گھوڑ سواروں کو ان کے تعاقب میں بھیجا تھا۔ انھوں نے مقام ذی ہمدر جو کہ قباء کے قریب مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے، حضور علیہ السلام کے غلام حضرت یسار کو مع ان کے ساتھیوں کے بیدردی سے شہید کیا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے تھے۔ زبان میں کانٹے چبھو دیے تھے اور اونٹنیاں لے کر فرار ہو گئے تھے۔ مسلم شریف میں یہ تشریح ہے کہ ان لوگوں کے رنگ زرد ہو گئے تھے اور پیٹ پھول گئے تھے اس لیے حضور علیہ السلام نے ان کو اونٹوں کے پیشاب اور دودھ پینے کی ہدایت دی انھوں نے ایسا ہی کیا اور صحت یاب ہونے پر مرتد ہو گئے اور اونٹوں کے محافظوں کو قتل کر دیا اور اونٹ لے کر بھاگ گئے۔ پھر جب یہ لوگ پکڑ کر لائے گئے تو حضور سید عالم نے سزا دینے میں وہی سختی اختیار فرمائی جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم اسلیے دیا۔

انھم سملوا اعین الرعاۃ

کہ انھوں نے اونٹ کے محافظوں کی آنکھیں پھوڑی تھیں۔

(۲) اس حدیث سے حضرت مالک علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال فرمایا کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔ امام محمد علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ حلال جانور کا پیشاب بطور دوا پینا حلال ہے لیکن امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ جانور خواہ حلال ہو یا حرام سب کا پیشاب نجس ہے اور بطور دوا بھی اس کا پینا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور وہ جو حضور علیہ السلام نے قبیلہ عرینین کے آدمیوں کو اونٹ کا پیشاب پینے کی ہدایت دی تھی وہ منسوخ ہے کیونکہ آپ نے فرمایا ہے۔

استنزھوا عن البول فان عامۃ عذاب

پیشاب سے بچو، عذاب قبر کا سبب عام طور پر پیشاب سے

القبر منہ	نہ بچنا بھی ہے۔

حرام اشیاء میں شفاء نہیں ہے

علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کو اونٹوں کے پیشاب پینے کی ہدایت وحی کی بناء پر دی تھی۔ حضور علیہ السلام کو بذریعہ وحی یہ بتا دیا گیا کہ یہ مرتد ہو کر مریں گے اور ان کے مرض کی دواء اونٹوں کا پیشاب ہے۔ پس اگر کسی کو قطعی حتمی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مریض کی شفا اسی میں ہے کہ حرام چیز کھائے یا پیئے تو الا ما اضطررتم الیہ کے تحت اس کو حرام چیز کا استعمال جائز ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ بڑے سے بڑا حکیم اور ڈاکٹر یہ قطعی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ فلاں دواء سے فلاں مریض ضرور اچھا ہو جائے گا اس لیے بطور دواء بھی حرام چیزوں کا کھانا ناجائز ہی قرار پائے گا۔ (عینی ج ۲ ص ۲۰)

اس سلسلہ کی چند حدیثیں یہ ہیں:

(۱) لا شفاء فی المحرم (حاشیہ نور الانوار ص ۲۲)	حرام چیزوں میں شفا نہیں ہے

(۲) بحضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کسی نے عرض کی حضور! شراب بطور دواء استعمال کر لی جائے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ فرمایا نہیں۔ تیسری بار اس نے عرض کی حضور شراب میں شفاء ہے۔ فرمایا:

فقال لا ولکنھا داء (عینی ج ۲ ص ۵۲۰)	نہیں اس میں شفا نہیں ہے۔ اس میں بیماری ہے۔

(۳) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ اللہ لم یجعل شفاءکم فی حرام (ابن حبان)	اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی

ان احادیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حرام چیزوں میں بدن کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ شراب کے متعلق تو خود قرآن مجید نے تصریح کی ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ فیھما اثم کبیر و منافع للناس اور منافع کو بھی قرآن نے مطلق رکھا ہے۔ اس میں کسی خاص نفع کی قید نہیں لگائی جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شارع علیہ السلام نے اس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے کوئی نفع ہی باقی نہ رہے بلکہ منافع للناس فرما کر تو قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ باوجود اس کے کہ کسی چیز میں نفع ہو مگر وہ بھی حرام کی جا سکتی ہے جیسے شراب ہی کو لے لیجئے کہ اس میں نفع بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کو حرام قرار دیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ قرآن مجید نے یہ

---

[1] بعض علماء نے یہ تاویل کی ہے کہ آیت میں منافع سے منافع تجارت مراد ہے۔ لیکن اس تاویل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اول تو قرآن مجید نے منافع کو مطلق رکھا ہے۔ خواہ وہ منافع تجارت ہوں یا منافع بدن۔ ثانیاً کھانے پینے کی چیزیں مطلوب بنفسہ ہوتی ہیں تو اگر ہم منافع تجارت، مراد لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک مطلوب بنفسہ چیز کو کسی دوسری چیز کے حصول کا ذریعہ اور آلہ کار قرار دیں تو اس صورت میں وہ چیز مطلوب بنفسہ نہ رہے گی بلکہ آلہ و ذریعہ ہو جائے گی جیسے کہ نقود روپیہ پیسہ کی ذات مطلوب نہیں ہوتی کہ یہ دوسری چیز کے حصول و ذریعہ بنتے ہیں۔ فافہم

تصریح بھی کی کہ شراب کا نقصان اس کے منافع سے زیادہ ہے۔ واثمهما اكبر من نفعهما۔ جس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ صراحتہً تو یہ جو چیز حرام ہے یہ ضروری نہیں کہ اس میں نفع نہ ہو اور بطور اشارہ یہ کہ جو چیز حرام کی جاتی ہے اس کے نقصانات اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں حضور سید عالم طبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا احادیث پر غور کیجیے۔ فرماتے۔ "اللہ نے حرام چیزوں میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی"۔

دیکھو حضور علیہ السلام نے شفا کی نفی فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ حرام چیزوں میں نفع ہوتا ہی نہیں تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وہی بات ظاہر ہوئی۔ جس کا اشارہ آیت میں موجود ہے کہ حرام چیز کے استعمال سے نفع ہو سکتا ہے مگر اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہوتے ہیں اور جس دوا میں نفع کم ہو اور نقصان زیادہ اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دو

توضیح واضح ہو کہ حدیث عرنیین مباحث اربعہ پر مشتمل ہے اور اب ہم ہر ایک کا مختصر بیان کرتے ہیں۔

اول، وہ جانور جن کا گوشت کھانا حلال ہے۔ ان کا پیشاب پاک ہے یا نہیں؟ تو امام مالک، اس حدیث سے استدلال فرماتے ہوئے بول ما یوکل لحمہ کو پاک قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر ناپاک ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرینہ کے لوگوں کو اونٹوں کے پیشاب کو پینا مباح قرار نہ دیتے۔ اب یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام قبیلہ عرینہ کے افراد کو اونٹوں کے پیشاب پینے کی جو اجازت دی کیا اس کی بنیاد اس امر پر تھی کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے یا یہ اجازت محض تداوی کے لیے تھی۔ اگر پہلی بات ثابت ہو جائے تو پھر تو امام مالک کا یہ استدلال صحیح ہو جاتا ہے کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے اور اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ اجازت محض دوا کے طور پر پینے کے لیے تھی تو اس صورت حضرت امام مالک کا استدلال صحیح قرار نہیں پائے گا۔ کیونکہ یہ جائز ہے کہ ایک شی فی نفسہ حرام ہو۔ مگر شارع علیہ السلام کسی ضرورت کی بنا پر اس کو حلال قرار دے دیں۔ جیسا کہ اضطراری حالت میں شراب و خنزیر کے استعمال کی اجازت خود قرآن پاک میں موجود ہے اور یہ بات خود اس سلسلہ کی احادیث سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے انہیں اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت بطور دوا کے دی تھی، جس کا اظہار حدیث کے یہ الفاظ فاجتووا المدينة کر رہے ہیں۔ نیز بخاری باب ابوال الابل میں ہے کہ كان المسلمون يتداوون بها کہ مسلمان اونٹوں کے پیشاب سے دوا کرتے تھے۔ بعض روایات میں آیا کہ انہیں استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی۔ ابن سینا نے لکھا ہے کہ استسقاء کی بیماری کے لیے اونٹوں کا پیشاب مفید ہے۔ بہر حال یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضور علیہ السلام نے انھیں اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت بطور دوا کے دی تھی۔ لہٰذا اس اجازت سے حلال جانوروں کے طہارت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پھر یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر اس حدیث سے طہارۃ ابوال کا استنباط کیا جائے تو پھر مسئلہ التداوی بالحرم کا استنباط نہیں ہو سکے گا اور اگر اس کو تداوی پر محمول کیا جائے۔ تو پھر مسئلہ طہارۃ ابوال کا استنباط درست نہ ہوگا۔ فافہم۔

دوم، حرام اشیاء کو بطور دوا پینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس پر ہم ابھی بحث کر چکے ہیں ثانیاً، اس معاملہ میں جب نصوص صریحہ صحیحہ موجود ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ حرام چیزوں میں مسلمانوں کے لیے شفا نہیں ہے تو اس نص کے ہوتے ہوئے تاویلات کے ذریعہ جواز نکالنا میں تو درست نہیں سمجھتا۔ (واللہ اعلم)

سوجو: یہ کہ مثلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو نسائی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے ہر خطبہ ں مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے اور حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واقعہ عرنیین احکام حدود نازل ہونے ے پہلے کا ہے۔ حدیث سے مثلہ کرنے کا جواز ثابت نہ ہوگا۔

بَابُ مَا يَقَعُ مِنَ النَّجَاسَاتِ فِي لسَّمْنِ وَالْمَاءِ

باب گھی یا پانی میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ لَا بَأْسَ بِالْمَاءِ مَا لَمْ يِّرْهُ طَعْمٌ أَوْ رِيحٌ أَوْ لَوْنٌ

وَقَالَ حَمَّادٌ لَا بَأْسَ بِرِيشِ الْمَيْتَةِ

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ فِي عِظَامِ الْمَوْتَى نَحْوَ لِ وَغَيْرِهِ أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ سَلَفِ الْعُلَمَاءِ شُطُونَ بِهَا وَيَدَّهِنُونَ فِيهَا لَا يَرَوْنَ بِهِ بَأْسًا

وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ وَإِبْرَاهِيمُ بَاسَ بِتِجَارَةِ الْعَاجِ (بخاری)

(۱) زہری نے کہا پانی کا جب تک رنگ یا بُو یا مزا نہ بدلے وہ پاک ہے

(۲) اور حماد بن ابی سلیمان نے کہا مردار کے بال اور پر پاک ہیں۔

(۳) اور زہری نے کہا مُردار کی ہڈیوں اور بارے میں نے کئی عالموں کو دیکھا وہ ان سے کنگھی کرتے اور ان میں تیل رکھتے تھے۔ اور اسمیں کوئی حرج نہ جانتے۔

(۴) اور محمد بن سیرین و ابراہیم نخعی نے کہا، ہاتھی دانت کی تجارت درست ہے۔

ئد و مسائل

ہم نے نمبر لگا دیئے ہیں۔ اب ہر مسئلہ پر نمبر وار بحث کی جاتی ہے۔

(۱) امام زہری علیہ الرحمۃ کا مسلک یہ ہے کہ پانی خواہ قلیل ہو یا کثیر نجاست کے گرنے سے ناپاک گا۔ جب تک کہ اس کا رنگ، بو یا مزے میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔ اس پر ابو عبیدہ نے کتاب الطہور میں اعتراض کیا کہ زہری ذہب کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی ایک پیالہ پانی میں پیشاب کر دے اور پانی کا رنگ و بو و مزا نہ بدلے تو وہ پانی رہنا چاہیئے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اعتراض کو نقل کیا مگر جواب نہیں دیا۔ بہرحال کچھ لوگ اس طرف گئے ہیں ی خواہ قلیل ہو یا کثیر جب تک نجاست اس کا کوئی وصف رنگ یا بُو یا مزا نہ بدل دے۔ اس وقت تک وہ پانی پاک نہ ہوگا۔ ۔ احادیث ذیل سے استدلال کرتے ہیں۔

اول۔ حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا کہ بضاعۃ کنویں سے وضو کر سکتے ہیں۔ بضاعۃ ایسا کنواں تھا ں میں مدینہ کے لوگ کوڑا کرکٹ حتی کہ مردار جانور کتے، بلی، حیض کے کپڑے ڈال دیا کرتے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لْمَاءُ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ (ترمذی) | کہ پانی پاک ہے اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ دیکھو اس کنویں میں ہر قسم کی نجاست ڈال جاتی تھی مگر اس کے باوجود حضور علیہ السلام نے اس ی کو پاک قرار دیا۔

کیا پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی؟

احناف اس استدلال کے متعدد الزامی و تحقیقی جواب دیتے ہیں۔ اولاً: حدیث ہذا میں پانی کی مقدار کا بیان نہیں ہے اور نہ رنگ بو و مزے کی تبدیلی کا بیان ہے بلکہ مطلقاً یہ بتایا گیا ہے کہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی تو نفس حدیث کے مضمون سے یہ لازم آتا ہے کہ ایک لوٹے پانی میں حیض کا کپڑا پڑ جائے تو وہ ناپاک نہ ہو۔ اسی طرح کنویں میں کیسی ہی نجاست گر جائے اور اس کے اوصاف رنگ و بو و مزے میں سے کوئی وصف بھی بدل جائے تو بھی کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ حدیث میں وصف بدلنے کی قید تو نہیں ہے۔ یہ بات زہری کا مسلک رکھنے والوں کے خلاف ہے۔ ثانیاً: یہ بات مشاہدہ میں آ چکی ہے کہ کنویں میں اگر کتے مرغی پھٹ پھول جائے تو پانی میں بو پیدا ہو جاتی ہے اور بیر بضاعہ میں تو کتے تک ڈال دیئے جاتے تھے، مگر لوگ اس کے باوجود اس کا پانی استعمال کرتے تھے۔ عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ لوگ ایسے وحشی نہیں تھے کہ پانی میں باوجود بدبو پیدا ہو جانے کے استعمال کرتے ہوں؟ جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ بیر بضاعہ کنویں کی شکل میں تھا مگر دراصل وہ کنواں نہ تھا بلکہ جاری پانی کی نہر تھی جس میں اسقدر پانی تھا اور اس کی روانی ایسی تھی کہ اسقدر غلیظ اشیاء ڈال دینے کے باوجود پانی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوتا تھا اور گندگی وغیرہ بہہ جاتی تھی۔ جیسے جاری نہر یا دریا میں گندگی ٹھہرتی نہیں بلکہ بہہ جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل مکہ معظمہ کے کنویں نہر زرقا پر جو بظاہر کنویں معلوم ہوتے ہیں مگر درحقیقت آب رواں کی نہریں ہیں اور انجینیر لوگ بھی کہتے یہ ہے کہ نہر زبیدہ منیٰ و عرفات تک کو سیراب کرتی ہے اور سعودی حکومت نے اسی نہر سے آج کل جگہ جگہ راستے میں نل لگا دیئے ہیں۔ یہی حال بیر بضاعہ کا تھا کہ وہ دراصل بہتے پانی کی نہر تھی۔ چنانچہ واقدی نے یہ تصریح کی۔

ان بئر بضاعة كانت طريقًا للماء الى البساتين فكان الماء لا يستقر فيها (طحاوی)

بضاعہ کنواں دراصل پانی کی نہر تھی جو باغوں میں داخل ہوتی تھی اور اس کا پانی نہیں ٹھہرتا تھا۔

گویا اس نہر کے ایک مقام پر کنویں کی شکل بنا دی گئی تھی تاکہ لوگ آسانی سے پانی بھر سکیں اور چونکہ یہ جاری نہر تھی اس میں گندگی وغیرہ بھی ڈال دی جاتی تھی جو ٹھہرتی نہ تھی۔ حضور علیہ السلام سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ الماء طهور کہ اس بیر بضاعہ کا پانی پاک ہے اس کو کوئی نجاست ناپاک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ جاری پانی ہے۔ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو خاص اس بیر بضاعہ کے لیے تھا جو ایک نہر جاری تھی مگر بعض علماء نے ارشاد نبوی کے موقع و محل کو پیش نظر نہ رکھا تو پھر انھوں نے وہی نتیجہ نکالا جو امام زہری کا مسلک ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا جو تالاب جنگلوں میں ہوتا ہے اور جس سے درندے و دیگر جانور پانی پیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث (ترمذی)

کہ پانی قلتین ہو تو نجاست کو نہیں اٹھاتا

تو کنویں کا پانی کیونکر نجس ہو سکے گا جب کہ اس میں سینکڑوں مشک پانی موجود ہے۔ اس استدلال کے بھی متعدد جواب دیے گئے ہیں۔ اولاً: یہ حدیث زہری کے مسلک کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو قلہ پانی کسی حالت میں ناپاک نہیں ہوتا خواہ اس کے وصف میں بھی تبدیلی آ جائے کیونکہ رنگ و بو و مزے کی تبدیلی کی قید اس میں بھی نہیں ہے۔ ثانیاً

"لم یحمل الخبث" کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دو قلہ پانی نجاست کو برداشت نہیں کرتا یعنی نجس ہو جاتا ہے۔ تاہم لفظ قلہ خود مجمل ہے۔ اس کے معنی مشک کے بھی آتے ہیں۔ پانچ مشکیزہ پانی کے بھی، انسان کی قد و قامت کے بھی اور پہاڑ کی چوٹی کے بھی۔ لہٰذا ایسا معنی متعین کرنے چاہئیں جو اس باب کی دوسری احادیث کی تصریحات کے مطابق ہوں اور اس کی مقدار یہی ہو سکتی ہے کہ دہ دہ در دہ ہوں جیسا کہ فقہاء احناف نے مقرر کیا ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ قلہ سے مراد آبِ رواں ہے جیسے نہروں کا پانی جاری ہوتا ہے۔ یہ جاری پانی یا ماءِ کثیر دہ در دہ نجاست پڑنے سے ناپاک نہ ہوگا۔ یہاں ہم نے مختصر سی بحث کی ہے۔ جو صاحب تفصیل بحث دیکھنا چاہیں وہ فتح الباری، عینی، قسطلانی، نیل الاوطار و طحاوی شریف کا مطالعہ کریں۔ غرضکہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ آبِ قلیل وہ حوض و تالاب جو دہ در دہ نہ ہو، نجاست گرنے سے ناپاک ہو جائے گا۔ اسی سلسلہ کی چند احادیث یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے

انہ نھی ان یبال فی الماء الراکد ثم یتوضاء فیہ (مسلم، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی)	ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے، پھر اس سے وضو کرنے سے منع فرمایا۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کوئی شخص ٹھہرے ہوتے پانی میں غسلِ جنابت نہ کرے ان سے پوچھا گیا پھر پانی کیسے استعمال کرے؛ حضرت ابوہریرہ نے کہا۔

یتناولہ تناولا (طحاوی)	علیحدہ (کسی برتن وغیرہ) میں پانی لے کر استعمال کرے

ان دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے اور پیشاب کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو پانی ناپاک ہو جائے گا تو اگر آبِ قلیل نجاست کے گرنے سے ناپاک نہ ہوتا تو حضور علیہ السلام اس سے وضو کرنے سے منع نہ فرماتے۔ (۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔

ان غلاما وقع فی بئر زمزم فنزحت (دار قطنی و طحاوی)	کہ صحابہ کے زمانے میں زمزم کے کنویں میں ایک لڑکا گر گیا تو اس کا پانی نکالا گیا۔

(۴) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ زمزم کے کنویں میں ایک حبشی گر کر مر گیا (فمات) تو آپ نے ایک آدمی کو کنویں میں اتارا جس نے لاش نکالی اس کے بعد فرمایا۔

اِنزحُوا مافِیھَا مِنَ الماءِ (بیہقی)	کہ کنویں میں جس قدر پانی ہے سب نکال دو۔

نیز طحاوی میں یہ تصریح بھی ہے کہ جب زمزم کا پانی نکالنے لگے تو اس کا پانی ختم نہ ہوتا تھا۔ جب دیکھا تو معلوم ہوا

(۵) فَاذا عَینٌ تجری من قِبَلِ الحَجَرِ الاَسوَدِ فَقَالَ الزبیرُ حَسبُکُم (طحاوی)	کہ اس کنویں میں پانی کا چشمہ ہے جو سنگِ اسود کی طرف سے آ رہا ہے حضرت ابن الزبیر نے فرمایا کافی ہے۔

ان احادیث سے مسائلِ ذیل معلوم ہوئے۔ اگر آدمی کنویں میں گر کر مر جائے تو کنواں نجس ہو جائے گا اور کل پانی نکالنے سے پاک ہوگا۔ کل پانی نکالنے کے بعد کنویں کی طہارت بھی ہو جائے گی اور کنویں کی دیواریں اور دیگر لوازمات ڈول، رسی وغیرہ

بھی پاک ہو جائے گی اور اگر کنواں ایسا ہو کہ اس کا پانی نہ ٹوٹ سکے تو پھر اندازہ سے پانی نکال لیا جائے گا۔ یعنی پہلی معلوم ہوا کہ کنوئیں کا کل پانی دس ہاتھ ہے۔ پھر تیزی کے ساتھ سو ڈول نکال لیے اور ناپا تو معلوم ہوا کہ اب نو ہاتھ پانی اس سے معلوم ہوا کہ سو ڈول نکالنے سے ایک ہاتھ پانی کم ہوتا ہے تو دس ہاتھ والے کنوئیں کے لیے ایک ہزار ڈول ہوتے یعنی ایک ہزار ڈول نکالنے سے کل پانی نکل جائے گا۔ نیز امام شعبی نے فرمایا کہ چڑیا بلی وغیرہ اگر کنوئیں میں گر کر مر جائیں تو چالیس ڈول پانی نکالا جائے۔ حضرت حماد ابن سلیمان تابعی نے فرمایا۔ مرغی گر کر مر جائے تو چالیس سے پچاس ڈول تک نکالے جائیں حضرت میسرہ نے روایت کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم نے فرمایا۔ جب چوہا اور اس کی مثل کوئی اور جانور گر جائے تو کنوئیں کا پانی نکالو۔ یہاں تک کہ پانی تم پر غالب آجائے (طحاوی شریف)۔ یہ اور اس مضمون کے اور بھی آثار ہیں جن سے ثابت ہے کہ کنوئیں یا ماء قلیل میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جائے گا۔ اور جب پانی حسب مقدار نکالا جائے گا تب پاک ہوگا۔

مُردار جانور کے بال و پَر

(۲) حضرت حماد بن ابی سلیمان علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مُردار جانور کے پر میں کوئی حرج نہیں یعنی مُردار جانور خواہ حلال ہو یا حرام اس کے بال و پر پاک ہیں ان کو استعمال کرنا جائز ہے پانی میں گر جائیں تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ مردار جانور کے بالوں اور پروں کو دھو کر استعمال کرنا بہتر ہے۔ سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ کا بھی یہ

مُردار کی ہڈی کا حکم

(۳) امام زہری نے فرمایا کہ مُردار کی ہڈی میں کوئی حرج نہیں۔ یعنی مُردار کی ہڈی جب کہ اس گوشت اور چکنائی باقی نہ رہے پاک ہے۔ جیسے ہاتھی دانت وغیرہ کی کنگھی اور تیل ڈالی بنائی ہیں ان سب کا استعمال جائز ہے۔ (۴) حضرت ابن سیرین نے فرمایا ہاتھی دانت کی تجارت بھی جائز ہے۔

واضح ہو

کہ مُردار جانور خواہ وہ حلال ہو یا حرام (سوائے خنزیر کے) اس کی ہڈی، بال، پر، اون جب کہ گوشت اور سے صاف ہوں پاک ہیں اور ان کا استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ قرآن پاک میں مُردار کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت ہے۔

انما حرم من المیتۃ ما یوکل عنہا	مُردار کی وہ چیز حرام کی گئی ہے جو کھائی جاتی ہے

اسی طرح مُردار کی کھال بھی استعمال کی جا سکتی ہے جب کہ اس کو دھولیا گیا ہو۔ جس کو رنگنا کہتے ہیں۔ چنانچہ اس میں چند حدیثیں یہ ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سُنا۔

ایما اھاب دُبغ فقد طھر (مسلم واحمد و ابن ماجہ و ترمذی)	جو کھال بھی رنگ لی جائے وہ پاک ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

امران ینتفع بجلود المیتۃ اذا دبغت (بخاری و مسلم)	دباغت کے بعد مُردار کی کھال سے نفع اُٹھانے کی اجازت دی۔
سُئل رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عن جلود المیتۃ فقالَ ذکاتِھا (نسائی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مُردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا نے فرمایا اس کی دباغت (رنگنا) اس کی طہارت ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بکری مرگئی۔ حضور علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم نے اس کی کھال کیوں نہ اُتار لی۔ کہا گیا مردار کی کھال؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مُردار کا گوشت کھانا حرام قرار دیا ہے۔

وانتم لا تطعمونه ان تدبغوا و تنتفعوا (رواہ باسناد صحیح، نیل الاوطار ج ۱ ص ۶۳)

اور تم تو اس کا گوشت نہیں کھاتے۔ اس کو رنگتے ہو اور نفع اُٹھاتے ہو۔

مُردار کی کھال وغیرہ کے احکام

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ مُردار کی کھال کو پکا لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ مردار سے مراد غیر مذبوح ہے یعنی جس کو بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو۔ جو جانور خود مر گیا یا گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا یا کسی جانور نے اس کو مار دیا مُردار ہے۔ اس کی کھال کو رنگنے سے پہلے بیچنا، استعمال کرنا حرام ہے اور دباغت کے بعد جائز ہے۔ مُردار کا پٹھا، بال، ہڈی، چونچ، کھُر، ناخن ان سب کو بیچ بھی سکتے ہیں اور کام میں بھی لا سکتے ہیں اور اس کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کر سکتے ہیں۔ خنزیر کے تمام اجزاء ناپاک و نجس ہیں۔ خنزیر کے بال اور کسی جز کی بیع باطل ہے اور اس کی کھال وبال کسی صورت بھی استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ خنزیر کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا۔ فانہ رجس خنزیر کے تمام اجزاء نجس ہیں۔

۲۳۵، ۲۳۶ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ فَارَةٍ سَقَطَتْ فِيْ سَمْنٍ فَقَالَ أَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوْا سَمْنَكُمْ (بخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت اُم المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ چوہا گھی میں گر پڑے تو کیا کریں۔ فرمایا اس کو پھینک دو اور اس پاس کے گھی کو بھی پھینک دو اور باقی گھی کھاؤ۔

فوائد و مسائل

امام نے اس حدیث کو کتاب الذبائح میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد و ترمذی نے اطعمہ میں، نسائی نے ذبائح میں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمی ہوئی چیز جیسے شہد یا گھی وغیرہ میں اگر چوہا یا اس کی مثل

ناپاک گھی کو پاک کرنے کا طریقہ

کوئی جانور گر جائے تو اس کو نکال کر پھینک دیں اور آس پاس سے تھوڑا تھوڑا گھی جہاں تک اس کی نجاست سرایت کرنے کا ظن ہو پھینک دیں باقی کا پاک ہے استعمال کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمے ہونے کی وجہ سے نجاست سارے گھی میں سرایت نہیں کرے گی بلکہ صرف اس حصہ میں سرایت کرے گی جو اس سے ملا ہوا ہوگا۔ اسی لیے آس پاس کے گھی کو نکال پھینکنے کا حکم دیا گیا اور اگر گھی جما ہوا نہیں ہے تو پھر سارا گھی ناپاک ہو جائے گا اور اس کے پاک کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس برتن میں ناپاک گھی ہے اسی میں پاک گھی ڈالتے رہیں۔ یہاں تک کہ برتن کے کناروں تک اُبل کر بہنے لگے۔ جو گھی بہے گا وہ ناپاک ہے اور جو برتن کے اندر رہ گیا وہ پاک ہو جائے گا۔

(۲) جو گھی یا تیل ناپاک ہو جائے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ جلانے یا اسی نوع کے دوسرے کاموں میں استعمال کر

سکتے ہیں۔ چنانچہ بیہقی میں ہے کہ:۔

اِنْ کَانَ السَّمْنُ مَائِعًا اِنْتَفِعُوْا بِہٖ وَلَا تَاْکُلُوْا

اگر وہ پتلا ہو تو اس کو استعمال کر لو کھاؤ نہیں۔

(کتاب الاطعمہ، فتح الباری ج ۹ صفحہ ۵۳)

روزِ قیامت مجاہد فی سبیل اللہ کے زخموں کی کیفیت

۲۳۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کُلُّ کَلْمٍ یُکْلَمُهُ الْمُسْلِمُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَکُوْنُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کَهَیْئَتِهَا اِذَا طُعِنَتْ تَفَجَّرُ دَمًا اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالْعَرْفُ عَرْفُ الْمِسْكِ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہِ خدا میں مسلمان کو جو زخم لگتا ہے۔ قیامت کے دن اسی حالت میں آجائے گا جیسے کہ لگا تھا

(بخاری شریف)

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الجہاد میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے بھی جہاد میں۔ ابن عساکر کی روایت کے لفظ یہ ہیں کہ اللہ عزوجل کو خون کا وہ قطرہ بہت محبوب ہے جو راہ خدا میں گرے اور چشم مسلم کا وہ آنسو بھی جو اندھیری رات میں بہے کیونکہ اللہ عزوجل مجدہٗ سے خوفِ خشیت کے وقت تنہائی میں جو اشکباری ہوگی وہ خلوص وللہیت ہی پر مشتمل ہوگی اور اسلام میں ہر کام کی مقبولیت خلوص پر موقوف ہے۔ یہ حدیث امور ذیل پر ہے (۱) راہ خدا میں کھائے ہوئے زخم آخرت کا بہترین سرمایہ ہیں (۲) بروزِ حشر یہ زخم ہرے ہو جائیں گے تاکہ شہید کے فضل کا اظہار ہو اور ظالم کے ظلم کا (۳) زخموں کے خون میں مشک و عنبر کی سی خوشبو ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ شہید فقہی کو نہ غسل دیا جاتا ہے اور نہ اس کے بدن کا خون دھویا جاتا ہے (۴) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا باب سے کیا تعلق ہے۔ شارحین کرام نے عنوان سے مناسبت کے متعلق گرماگرم بحثیں کی ہیں۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے ہر مناسبت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اہل علم عینی صفحہ ۹۳ کا مطالعہ کریں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے یہ مناسبت بیان فرمائی ہے کہ اس حدیث سے مشک کا پاک ہونا ثابت ہوتا ہے تو اگر مشک گھی وغیرہ میں گر جائے تو گھی وغیرہ ناپاک نہ ہوگا (فیہ نظر)

بَابُ الْبَوْلِ فِی الْمَآءِ الدَّآئِمِ

باب ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کے بیان میں

۲۳۸۔ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَا هُرَیْرَۃَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ وَبِاِسْنَادِهٖ قَالَ لَا یَبُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ فِی الْمَآءِ الدَّآئِمِ الَّذِیْ لَا یَجْرِیْ ثُمَّ یَغْتَسِلُ فِیْهِ

(بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم دنیا میں پچھلے ہیں۔ آخرت میں پہلے ہوں گے (اور اسی اسناد سے) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں جو جاری نہ ہو پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں غسل کرے۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام مسلم نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی طبرانی و طحاوی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ثم یتوضأ منہ اور باقی دوسری روایتوں میں ثم یغتسل منہ اور طحاوی کی روایت میں ثم یتوضأ منہ اور لیشرب منہ کے لفظ بھی آئے ہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے، پھر اس سے غسل کرے یا پیئے۔ مطلب یہ کہ پیشاب کرنے سے وہ پانی ناپاک ہو جائے گا۔ پھر اس سے وضو و غسل کرنا کیونکر روا ہو گا۔ یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ اسی طرح جاری پانی میں بھی پیشاب کرنا مکروہ ہے (۲) ناپاک پانی سے وضو و غسل کرنا حرام ہے (۳) جو پانی کہ وہ در دہ نہ ہو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جائے گا (۴) حدیث کے خط کشیدہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُمت سب سے اخیر میں دفن ہوگی اور سب سے پہلے اٹھائی جائے گی۔ کیونکہ زمین برتن کی طرح ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز برتن میں سب سے اخیر رکھی جائے وہ پہلے اٹھائی جاتی ہے۔

بَابٌ إِذَا أُلْقِيَ عَلَى ظَهْرِ الْمُصَلِّي قَذَرٌ أَوْ جِيفَةٌ لَمْ تَفْسُدْ عَلَيْهِ صَلَاتُهُ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا رَأَى فِي ثَوْبِهِ دَمًا وَهُوَ يُصَلِّي وَضَعَهُ وَمَضَى فِي صَلَاتِهِ وَقَالَ ابْنُ مُسَيَّبِ وَالشَّعْبِيُّ إِذَا صَلَّى وَفِي ثَوْبِهِ دَمٌ أَوْ جَنَابَةٌ أَوْ لِغَيْرِ الْقِبْلَةِ أَوْ تَيَمَّمَ فَصَلَّى ثُمَّ أَدْرَكَ الْمَاءَ فِي وَقْتِهِ لَا يُعِيدُ (بخاری)

باب (۱) جب نمازی کی پیٹھ پر نجاست یا مُردار ڈال دیا جائے تو نماز میں فساد نہ آئے گا (۲) اور حضرت عبداللہ بن عمر جب نماز کے اندر اپنے کپڑے پر خون دیکھتے تو اس کپڑے کو اُتار دیتے اور نماز پڑھے جاتے (۳) ابن المسیب اور عامر شعبی نے کہا کوئی شخص نماز پڑھ لے اس کے کپڑے میں خون لگا ہو، یا منی لگی ہو، یا قبلے کے سوا اور کسی طرف نماز پڑھی ہو، یا تیمم سے پڑھی ہو پھر وقت کے اندر پانی پالے تب بھی نماز نہ لوٹائے۔

فوائد و مسائل

ہم نے نمبر دیئے ہیں، ہر مسئلہ نمبر وار بیان کیا جاتا ہے۔ مسئلہ اول، امام بخاری کا مسلک یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے پاک ہونا ضروری ہے۔ پھر اگر دورانِ نماز نجاست لگ جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی لیکن احناف کے نزدیک دوران نماز بدن یا کپڑا ناپاک ہو جائے تو نماز دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

مسئلہ دوم، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فعل جو روایت ہوا، یہ صریحاً امام بخاری کے مسلک کے خلاف ہے کیونکہ اس میں تو یہ تصریح ہے کہ دورانِ نماز اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ کپڑے پر نجاست ہے تو وہ کپڑے کو اُتار دیتے تھے۔ جس سے ثابت ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر دورانِ نماز اگر کپڑا ناپاک ہو جائے تو وہ نماز جائز نہیں سمجھتے تھے۔

مسئلہ سوم، نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کپڑے پر منی یا خون لگا ہوا تھا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خون اور منی درہم سے کم تھی یا برابر اور اس اثر میں اس کا بھی ذکر نہیں لہٰذا یہ بھی امام بخاری کے مسلک کی دلیل نہیں بن سکتی۔ بہرحال حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر درہم سے کم تھی تو نماز درست ہو گئی اور اگر قدر درہم تھی تو نماز دوبارہ پڑھنا واجب ہے البتہ تیمم کے مسئلہ

میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے یعنی اگر پانی پر قدرت نہ تھی تو پھر تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وقت کے اندر اندر ہی پانی پر قدرت ہو گئی تو اب نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور قبلہ کے مسئلہ میں بھی امام اعظم ابوحنیفہ و امام مالک و احمد بن حنبل علیہم الرحمۃ کا اتفاق ہے۔ اگر کسی نے کسی سمت کو قبلہ جان کر (تحری کے بعد) نماز پڑھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سمتِ قبلہ وہ نہیں تھی جس طرف نماز پڑھی ہے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دوبارہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں اور اگر بغیر تحری کے بلا سوچے سمجھے نماز پڑھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سمتِ قبلہ اور طرف تھا تو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔

۲۳۹- اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ عِنْدَ الْبَيْتِ وَاَبُوْ جَهْلٍ وَّ اَصْحَابٌ لَّهٗ جُلُوْسٌ اِذْ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ اَيُّكُمْ يَجِيْءُ بِسَلَا جَزُوْرِ بَنِيْ فُلَانٍ فَيَضَعُهٗ عَلٰى ظَهْرِ مُحَمَّدٍ اِذَا سَجَدَ فَانْبَعَثَ اَشْقَى الْقَوْمِ فَجَآءَ بِهٖ فَنَظَرَ حَتّٰى اِذَا سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَهٗ عَلٰى ظَهْرِهٖ بَيْنَ كَتِفَيْهِ وَاَنَا اَنْظُرُ لَآ اُغْنِيْ شَيْئًا لَوْ كَانَتْ لِيْ مَنَعَةٌ قَالَ فَجَعَلُوْا يَضْحَكُوْنَ وَيُحِيْلُ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَاجِدٌ لَا يَرْفَعُ رَاْسَهٗ حَتّٰى جَآءَتْهُ فَاطِمَةُ فَطَرَحَتْهُ عَنْ ظَهْرِهٖ فَرَفَعَ رَاْسَهٗ ثُمَّ قَالَ اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ اِذْ دَعَا عَلَيْهِمْ قَالَ وَكَانُوْا يَرَوْنَ اَنَّ الدَّعْوَةَ فِيْ ذٰلِكَ الْبَلَدِ مُسْتَجَابَةٌ ثُمَّ سَمّٰى اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِاَبِيْ جَهْلٍ وَّعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ ابْنِ اَبِيْ رَبِيْعَةَ وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ وَالْوَلِيْدِ بْنِ عُتْبَةَ وَاُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ وَّعُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ وَعَدَّ السَّابِعَ فَلَمْ نَحْفَظْهُ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ رَاَيْتُ الَّذِيْنَ عَدَّ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس نماز ادا کر رہے تھے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی وہاں بیٹھے تھے پھر آپس میں کہنے لگے تم میں سے کون ہے جو فلاں لوگوں نے جو اونٹنی کاٹی ہے اس کا بچہ دان لائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر رکھ دے یہ سن کر ان میں سے سب سے بڑا شقی (عقبہ بن ابی معیط) اس کو اٹھا لایا تو اس نے اونٹ کا سلا آپ کی پشتِ مبارک پر رکھ دیا۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کاش! میرا بھی زور ہوتا (تو ان کو ہٹاتا) یہ لوگ ہنسنے لگے۔ ایک پر ایک گرے جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے۔ سر مبارک بوجھ کی وجہ سے نہ اٹھاتے تھے یہاں تک کہ حضرت فاطمۃ الزہرا آئیں اور آپ کی پشتِ مبارک سے اس کو اتار کر پھینک دیا۔ تب آپ نے سر اٹھایا اور دعا کی یا اللہ قریش سے سمجھ لے۔ تین بار یہ فرمایا۔ جب آپ نے ان کے لیے بددعا کی تو ان پر یہ گراں گزری کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مکہ میں دعا مستجاب ہوتی ہے۔ پھر آپ نے نام لے کر بددعا فرمائیں (ذیل کے نام لیے) ابوجہل، عتبہ بن ابی ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، ساتویں کا نام لیا جو ہمیں یاد نہ رہا۔ ابن مسعود کہتے ہیں۔ مجھے اس ذاتِ حق

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَرْعٰى فِي الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ (بخاری)

کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جن لوگوں کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ بدر کی لڑائی میں مارے گئے اور قلیب بدر میں ان کی لاشیں ڈال گئیں۔

فوائد و مسائل

(۱) امام بخاری نے اس حدیث کو جزیہ، مغازی، صلوٰۃ، جہاد میں بھی ذکر کیا اور مسلم نے مغازی میں اور نسائی نے سیر و طہارۃ میں ذکر کیا (۲) یہ واقعہ قبل ہجرت کا ہے۔

اس حدیث سے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے یہ استدلال فرمایا کہ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر کفار نے اونٹنی کی سلا رکھ دی تھی مگر حضور علیہ السلام بدستور سجدہ میں رہے۔ معلوم ہوا کہ دوران نماز اگر بدن یا کپڑے کو نجاست لگ جائے تو نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن ظاہر ہے کہ سجدہ میں حضور اس لیے بدستور مصروف رہے کہ بوجھ کی وجہ سے سر مبارک نہ اٹھا سکتے تھے۔ ثانیاً، حدیث میں حضور علیہ السلام کا بدستور نماز میں مشغول رہنے کی تصریح نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ سلا کے رکھ دینے کے بعد حضور سجدہ ہی میں رہے تا آنکہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا نے آکر اس کو ہٹایا اور جب تک ان امور کی وضاحت نہ ہو یہ استدلال صحیح نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے علاوہ حدیث ہذا میں ان امور کی بھی تصریح نہیں ہے کہ وہ نفل تھی یا فرض۔ پھر حضور علیہ السلام نے اس نماز کو دوبارہ پڑھایا یا نہیں۔ پھر جو دعا حضور نے فرمائی وہ سلام پھیر کر فرمائی یا سر اٹھاتے ہی فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ دعا ایسے کلمات پر مشتمل ہے جو نماز کو فاسد کر دیتی ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب کفار نے سلا رکھ دیا تو آپ کو نماز کے فاسد ہونے کا رنج ہوا اس لیے آپ نے ان کے لیے بددعا فرمائی ——— فتح الباری میں علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے یہ تصریح بھی کی ہے۔ یہ واقعہ آیت ثیابک فطہر کے نزول سے قبل کا ہے چنانچہ اصل الفاظ یہ ہیں:۔

اخرج ابن المنذر فی سبب نزولها من طریق زید ابن مرثد قال القی علی رسول الله صلی الله علیه وسلم سلا جزور فنزلت (وثیابك فطهر فتح الباری ج ۸ صہ ۴۸۱)

اس حدیث سے بات بالکل واضح ہوئی کہ حضور علیہ السلام کا یہ فعل ثیابک فطہر کے نزول سے قبل کا ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے یہ استدلال کرنا کہ دوران نماز کپڑے وغیرہ کو نجاست لگ جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی، کسی طرح بھی درست نہیں ہے (واللہ اعلم)

بَابُ الْبُزَاقِ وَالْمُخَاطِ وَنَحْوِهٖ فِي الثَّوْبِ

باب تھوک اور رینٹ وغیرہ کپڑے کے لگ جانے کے بیان میں

عروہ بن مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم نے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام صلح حدیبیہ کے زمانہ میں نکلے۔ پھر پوری حدیث بیان کی:۔

وَمَا تَنَخَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُخَامَةً اِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوکتے تو لوگ آپ کے لعاب مبارک کو اپنے ہاتھوں پر لیتے اور منہ

مِنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ

اور بدن پر ملتے۔ (بخاری)

۲۴۰۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ بَزَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ثَوْبِهِ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز) میں اپنے رومال میں تھوکا۔

مقصودِ عنوان یہ ہے کہ تھوک اور رینٹ پاک ہے اگر کپڑے کو لگ جائے نماز فاسد نہ ہوگی۔ اسی طرح پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ صلح حدیبیہ کا پورا واقعہ آئندہ حدیث میں آئے گا۔ اس حدیث سے یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ نماز میں اگر تھوک یا ناک آجائے تو رومال وغیرہ میں ڈال دے۔ مسجد میں نہ تھوکے کیونکہ مسجد میں تھوکنے سے حضور نے منع فرمایا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ آدمی کا لعابِ دہن اور ناک کے فضلات اور آنسو پاک ہیں۔ لیکن حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تھوک چونکہ پاک ہے۔ اس لیے کپڑے یا پانی میں تھوک دیا کرو۔ بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کپڑے یا پانی میں تھوک گر جائے تو وہ ناپاک نہ ہوگا۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلے گا کہ اگر بالفرض کسی کے پاس صرف ایسا پانی ہے جس میں لعابِ دہن پڑا ہوا ہے تو اس پانی کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہ ہوگا۔

بَابُ لَا يَجُوْزُ الْوُضُوْءُ بِالنَّبِيْذِ

باب نبیذ تمر اور نشہ والی شراب سے وضوء جائز

وَلَا بِالْمُسْكِرِ وَكَرِهَهُ الْحَسَنُ وَاَبُو الْعَالِيَةِ وَقَالَ عَطَاءٌ اَلتَّيَمُّمُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الْوُضُوْءِ بِالنَّبِيْذِ وَاللَّبَنِ (بخاری)

نہیں اور حسن و ابو العالیہ نے نبیذ تمر سے وضو کو مکروہ قرار دیا اور عطاء نے کہا دودھ یا نبیذ تمر سے وضوء کے بجائے تیمم میرے نزدیک اچھا ہے۔

کیا نبیذ تمر سے وضو جائز ہے

پانی میں چند کھجوریں بھگو دی جائیں کہ اس میں کھجوروں کی مٹھاس سی آجائے اور نشہ پیدا نہ ہو، اس کو نبیذ تمر کہتے ہیں۔ عرب کے پانی عموماً کھاری ہوا کرتے ہیں اس لیے لوگ چند سوکھی کھجوریں پانی میں بھگو دیتے جس سے پانی میں ذرا مٹھاس سی پیدا ہو جاتی تھی تو نبیذ تمر جس میں قطعاً نشہ نہ ہو اور رقتُ سیلان بھی باقی رہے۔ اگر کسی کے پاس صرف یہی پانی ہو تو اس صورت میں اس کو نبیذ تمر سے وضو کرنا چاہیے یا تیمم؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

(۱) امام بخاری کے نزدیک نبیذ تمر سے وضوء جائز نہیں لیکن امام نے اپنی تائید میں جو حضرت حسن بصری و ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے۔ یہ ان کو مفید نہیں ہے کیونکہ حضرت حسن بصری سے جو روایت ہے اس میں لا باس کے لفظ ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت حسن بصری کے نزدیک نبیذ تمر سے وضو جائز ہے۔ مگر مکروہ تنزیہی ہے۔ اسی طرح حضرت عطا ابن رباح کا قول بھی ان کے موافق نہیں کیونکہ حضرت عطاء یہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک تیمم کر لینا زیادہ اچھا ہے گویا وہ بھی عدم جواز کے قائل نہیں ہیں۔ فافہم۔

۲۔ امام شافعی و مالک و امام احمد علیہم الرحمۃ کے نزدیک کسی حال میں نبیذ تمر سے وضو جائز نہیں۔

۲- سیدنا امام اعظم علیہ الرحمۃ سے تین قول منسوب ہیں ___ اول، نبیذ تمر سے وضو کرے تیمم نہ کرے، امام زفر کا ی یہی مسلک ہے دوم، تیمم کرے اور نبیذ تمر سے وضو نہ کرے۔ اس کو نوح بن مریم وحسن بن زیاد نے روایت کیا۔ ضی خان نے فرمایا یہی صحیح ہے۔ اکثر علماء امام ابو یوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا سوم، یہ کہ تیمم بھی کرے اور نبیذ تمر سے وضو بھی کرے۔ امام محمد علیہ الرحمۃ کا یہی مسلک ہے (احکام القرآن لابی بکر الرازی) احب محیط نے فرمایا۔ نبیذ تمر کا مطلب یہ ہے کہ پانی میں چند کھجوریں ڈال دی جائیں۔ یہاں تک کہ پانی میں مٹھاس سی یدا ہوجائے لیکن وہ گاڑھا نہ ہو اور نشہ بھی نہ پیدا ہو۔ اگر نشہ پیدا ہوجائے تو اس کا پینا بھی حرام ہے وضو کیونکر جائز ہوگا۔

وضاحت: ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبیذ تمر جس سے حضور علیہ السلام نے وضو کیا۔

مرات القيتها فِي الْمَآءِ لان عادة العرب ها نطرح التمر فِي الْمَآءِ ليحلو (عینی ج ۱ ص ۹۴۴)	وہ چند کھجوریں تھیں جو پانی میں ڈال دی تھیں کیونکہ عرب کی عادت یہ تھی کہ وہ پانی میں کھجوریں ڈال دیتے تاکہ پانی میٹھا ہوجائے۔

اور لیلۃ الجن کی حدیث میں آیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یا، تمہارے ڈول میں کیا ہے انھوں نے عرض کی نبیذ ہے۔ حضور نے فرمایا۔

رَةٌ طَيِّبَةٌ وَمَآءٌ طَهُوْرٌ فَتَوَضَّأَ ا وَصَلَّى الْفَجْرَ (ترمذی، ابو داؤد)	کھجوریں ہیں طیب اور پانی پاک ہے پھر آپ نے اس سے وضو فرمایا اور فجر کی نماز پڑھی۔

امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے کہا اس حدیث کے راویوں میں ابو زید ہے جو مجہول ہے۔ اس بناء پر علماء سلف نے حدیث کو ضعیف قرار دیا۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا کہ ابن العربی نے فرمایا کہ ابو زید مولیٰ عمرو بن حریث روی عنہ راشد یسان اور ابو روق اور یہ بات ابو زید کو حد جہالت سے نکال دیتی ہے۔ ہاں ابو زید کا اصلی نام معلوم نہیں تو جائز ہے ام ترمذی نے جو فرمایا کہ وہ مجہول ہے۔ اس سے مراد مجہول الاسم ہو کیونکہ اسی حدیث کو چودہ افراد نے حضرت سعود سے روایت کیا ہے جیسا کہ ابو زید نے روایت کیا ہے۔ علامہ عینی نے ان چودہ افراد کے نام بھی گنائے ہیں؛ عینی ج ۱ ص ۹۴۹) ___ بہرحال اس حدیث کے پیش نظر سیدنا امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ نبیذ تمر سے وضو ہے، جبکہ وہ رقیق ہو اور اگر شہد کی طرح گاڑھا ہوجائے تو وضو جائز نہیں ہوگا اور اگر اس میں نشہ پیدا ہوجائے وضو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر تو اس کا پینا بھی حرام ہے۔

(۲) اور دودھ سے وضو بالاتفاق جائز نہیں ہے ___ اسی طرح جس پانی میں کوئی پاک چیز مل گئی کہ بول چال میں ہیں) اس کو پانی نہ کہیں جیسے شربت، شوربا، چائے، عرق گلاب، کیوڑہ وغیرہ اس سے وضو و غسل جائز نہیں ___ لسی سے بھی وضو جائز نہیں یعنی جب تک یہ کہا جائے کہ یہ تو پانی ہے، جس میں کچھ دودھ مل گیا ہے تو جائز ہے اور جب دیکھنے والا اسے دودھ یا دہی کی لسی کہے تو اس سے وضو و غسل جائز نہ ہوگا۔

۴- عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ

وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ (بخاری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پینے کی وہ چیز جو نشہ لائے حرام ہے۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام بخاری نے کتاب الاشربہ میں اور مسلم نے بھی اشربہ میں ذکر کیا۔ ترمذی و نسائی نے اشربہ و ولیمہ میں اور ابن ماجہ نے اشربہ میں ذکر کیا۔ کُلُّ شراب کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ پینے کی چیز جس میں نشہ ہو حرام ہے کیونکہ کلمہ "کل" جب نکرہ کی طرف مضاف ہو تو عموم افراد کا فائدہ دیتا ہے اور جب معرفہ کی طرف ہو تو عموم الاجزاء کا فائدہ دیتا ہے۔ واضح ہو کہ خمر جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے جس کو ہم اردو زبان میں شراب کہتے ہیں اس کا پینا ہر صورت حرام ہے خواہ نشہ ہو یا نہ ہو۔ تھوڑا پیا جائے یا زیادہ لیکن جو پینے کی چیز خمر نہیں ہے جیسے پوست، افیون، چرس، بھنگ اور اسی نوع کی اور چیزیں، ان کا اس مقدار میں پینا اور کھانا حرام ہے جب کہ نشہ لائیں اور اگر اتنی قلیل مقدار میں استعمال کی گئیں کہ نشہ نہ ہو تو پھر حرج نہیں جیسے ادویہ میں استعمال کی جاتی ہیں۔

بَابُ غَسْلِ الْمَرْاَةِ اَبَاهَا الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ

باب عورت کا اپنے والد کے چہرہ سے خون کا دھونا

وَقَالَ اَبُو الْعَالِيَةِ اَمْسَحُوْا عَلٰى رِجْلِيْ فَاِنَّهَا مَرِيْضَةٌ (بخاری)

اور ابو العالیہ نے کہا جب ان کے پاؤں میں تکلیف تھی میرے پاؤں پر مسح کر دو اس میں تکلیف ہے۔

عنوان سے مقصود یہ بتانا ہے کہ نجاست کے دور کرنے میں کسی دوسرے سے مدد لینا جائز ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احد کی لڑائی میں جو زخم آیا تو جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا نے اپنے ہاتھوں سے حضور علیہ السلام کے چہرہ مبارک سے خون صاف کیا اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ عورت کے چھونے سے وضو نہیں جاتا۔ اسی طرح بضرورت اگر اعضاء وضو کے دھونے میں دوسرے سے مدد لی جائے تو جائز ہے۔ جیسا کہ ابو العالیہ نے اپنے پاؤں پر مسح کرایا کیونکہ ان میں تکلیف تھی اور مسح اس لیے کیا کہ پانی نقصان دیتا تھا۔ اس اثر کو عبد الرزاق نے معمر سے انھوں نے عاصم بن سلیمان سے انھوں نے کہا کہ میں ابو العالیہ کی عیادت کو گیا کہ وہ بیمار تھے۔ لوگوں نے ان کو وضو کرایا۔ جب ایک پاؤں باقی رہ گیا تو کہا اس پر مسح کر دو۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

٢٤٢ - بِاَيِّ شَيْءٍ دُوْوِيَ جُرْحُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا بَقِيَ اَحَدٌ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ كَانَ عَلِيٌّ يَجِيْءُ بِتُرْسِهٖ فِيْهِ مَاءٌ وَفَاطِمَةُ تَغْسِلُ عَنْ وَجْهِهِ الدَّمَ فَاُخِذَ حَصِيْرٌ فَاُحْرِقَ فَحُشِيَ بِهٖ جُرْحُهٗ (بخاری)

سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو زخم احد کی لڑائی میں لگا تھا اس کو کیا دوا لگائی تھی انھوں نے کہا اب واقعہ کا جاننے والا مجھ سے زیادہ کوئی اور باقی نہیں رہا۔ علی کرم اللہ وجہہ الکریم اپنی ڈھال میں پانی لاتے تھے جناب فاطمہ حضور کے چہرہ مبارک سے خون دھو رہی تھیں تو ایک بوریا جلایا اور آپ کے زخم میں بھر دیا گیا۔

فوائد و مسائل (۱) اس حدیث کو امام نے مغازی اور نکاح میں بھی ذکر کیا۔ مسلم نے مغازی میں۔ ترمذی و ابن ماجہ نے طب میں ذکر فرمایا (۲) یہ واقعہ کتاب المغازی میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدنی انصاری صحابی جلیل القدر ہیں۔ ان کا اصل نام حزن تھا۔ حضور علیہ السلام نے سہل نام تجویز فرمایا۔ سو برس کی عمر ہوئی۔ ۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ سے کل ایک سو تراسی حدیثیں مروی ہیں۔ بخاری میں آپ سے اکتالیس حدیثیں مروی ہیں۔ مدینہ میں انتقال کرنے والے صحابہ میں سب سے آخری آپ ہی ہیں (۳) یہ حدیث مسائل ذیل پر مشتمل ہے (۱) پرانے بوریے کی راکھ زخم کے لیے مفید ہے اور خون فوراً بند کر دیتی ہے یہ ایک پرانا طریق علاج ہے جو بہت ہی مفید ہے (۲) دوا۔ وعلاج کرنے کا جواز ثابت ہوا۔ یہ کہ دوا کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے (۴) محارم سے خدمت لینا جائز ہے

بَابُ السِّوَاكِ

باب مسواک کرنے کے بیان میں

۱- وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ بِتُّ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَنَّ

حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گزاری۔ آپ نے (سو کر) اٹھ کر مسواک فرمائی۔

۲۴۳ (۲) عَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدْتُهٗ يَسْتَنُّ بِسِوَاكٍ بِيَدِهٖ يَقُوْلُ اُعْ اُعْ وَالسِّوَاكُ فِيْ فِيْهِ كَاَنَّهٗ يَتَهَوَّعُ (بخاری)

ابو بردہ اپنے والد سے راوی وہ کہتے ہیں میں نے دیکھا حضور علیہ السلام مسواک کر رہے تھے جو آپ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ اُع اُع کی آواز نکال رہے تھے اور مسواک آپ کے منہ میں تھی۔ گویا آپ قے کر رہے تھے۔

۲۴۴- (۳) عَنْ اَبِيْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ

حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سو کر اٹھتے تو اپنے منہ کو مسواک سے رگڑتے (صاف) کرتے۔

فوائد و مسائل حدیثوں پر نمبر لگا دیے ہیں۔ نمبر وار ان کے احکام و مسائل بیان کیے جاتے ہیں ۱- یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو آئندہ بیان ہوگی ۲- حدیث دوم کو امام مسلم و نسائی و ابو داؤد نے کتاب الطہارۃ میں ذکر کیا ہے۔ استنان کے معنیٰ مسواک کرنے کے ہیں۔ یتہوع کے معنیٰ قے کرنے کے ہیں لیکن بتکلف مطلب یہ ہے کہ مسواک اس طرح فرما رہے تھے کہ قے کی سی آواز نکل رہی تھی جیسے حلق میں انگلی یا برش سے صفائی کرتے ہیں تاکہ منہ اور گلے کی آلائش خارج ہو جائے ۳- حدیث سوم کو امام نے صلوۃ اللیل میں بھی ذکر کیا ہے اور ابو داؤد و مسلم و ابن ماجہ نے طہارۃ میں اور نسائی نے طہارۃ و صلوۃ میں ذکر کیا ہے۔ یشوص کے معنیٰ دھونے، صاف کرنے کے ہیں۔ ابن دقیق العید نے فرمایا کہ اس حدیث سے سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے

نیند میں معدہ کے ابخرات صعود کرتے ہیں، اس لیے سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کی ہدایت دی گئی تاکہ مسواک کے ذریعے منہ ان آلائشوں سے پاک وصاف ہوجائے ——— علامہ عینی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ یہ حدیثیں اس امر پر دال ہیں کہ مسواک سنتِ مؤکدہ ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مواظبت فرمائی۔ حتیٰ کہ اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ عین وفات شریف کے وقت بھی حضور علیہ السلام نے مسواک استعمال فرمائی ہے (بخاری)

مسواک کے فضائل

۱۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میری امت پر شاق ہوگا تو میں ان کو ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا امر فرماتا (طبرانی) ۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا بیان ہے کہ حضور اکرم جب باہر سے تشریف لاتے تو پہلا کام آپ کا مسواک کرنا ہوتا۔ (مسلم شریف) ۳۔ مسواک کا التزام رکھو یہ سبب ہے منہ کی صفائی اور اللہ عزوجل کی رضا کا ۴۔ دو رکعتیں جو مسواک کرکے پڑھی جائیں افضل ہیں بے مسواک کی ستر رکعتوں سے (ابونعیم) ۵۔ دس چیزیں فطرت سے ہیں یعنی ان کا حکم ہر شریعت میں تھا۔ مونچھیں کترنا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، انگلیوں کی چھتیں دھونا، بغل کے بال دور کرنا، موئے زیر ناف مونڈنا، استنجا کرنا، کلی کرنا —— یہ اور اس سلسلہ کی دیگر احادیث سے مسائلِ ذیل پر روشنی پڑتی ہے۔

مسواک کرنے کے مسائل

۱۔ کم سے کم تین مرتبہ داہنے، بائیں، اوپر نیچے دانتوں میں مسواک کرے اور ہر مرتبہ مسواک کو دھوئے، مسواک نہ بہت نرم ہو نہ بہت سخت، پیلو یا زیتون یا نیم وغیرہ کی کڑوی لکڑی کی ہو چھنگلیا کے برابر موٹی اور زیادہ سے زیادہ ایک بالشت لمبی ہو اور اتنی چھوٹی بھی نہ ہو کہ مسواک کرنا دشوار ہوجائے۔ مسواک داہنے ہاتھ سے کرے اور اس طرح ہاتھ میں لے کر چھنگلیا مسواک کے نیچے اور بیچ کی انگلیاں اوپر اور انگوٹھا سرے پر نیچے ہو اور مٹھی نہ باندھے۔ دانتوں کی چوڑائی میں مسواک کرے لمبائی میں نہیں، چت لیٹ کر مسواک نہ کرے، پہلے داہنی جانب کے دانت مانجھے پھر بائیں جانب کے اوپر کے پھر داہنی جانب کے نیچے کے پھر بائیں جانب کے نیچے کے۔ جب مسواک کرنا ہو تو اسے دھولے یونہی فارغ ہونے کے بعد دھو ڈالے اور زمین پر پڑی نہ چھوڑ دے بلکہ کھڑی رکھے اور ریشہ کی جانب اوپر ہو۔ مسواک جب قابلِ استعمال نہ رہے تو اسے دفن کردیا جائے یا کسی پاک جگہ رکھ دی جائے گندگی میں نہ ڈال جائے —— احناف کے نزدیک مسواک سنتِ وضو ہے سنتِ نماز نہیں ہے۔

بَابُ دَفْعِ السِّوَاكِ اِلَى الْاَكْبَرِ

باب جو عمر میں بڑا ہو پہلے اس کو مسواک دینے کے بیان میں

۲۴۵۔ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرَانِیْ اَتَسَوَّکُ بِسِوَاکٍ فَجَاءَنِیْ رَجُلَانِ اَحَدُھُمَا اَکْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاکَ الْاَصْغَرَ مِنْھُمَا فَقِیْلَ لِیْ کَبِّرْ فَدَفَعْتُہٗ اِلَی الْاَکْبَرِ مِنْھُمَا قَالَ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ مسواک کر رہا ہوں۔ اتنے میں دو شخص میرے پاس آئے۔ ایک عمر میں دوسرے سے بڑا تھا۔ میں نے پہلے اس کو مسواک دی جو عمر میں

اخْتَصَرَهُ نُعَيْمٌ عَنِ ابْنِ مُبَارَكٍ عَنْ أُسَامَةَ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ (بخاری)

تھا۔ تب مجھ سے کہا گیا کہ پہلے بڑے کو دو۔ میں نے بڑے کو دیدی۔

فوائد و مسائل اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ بڑوں کا حق مقدم ہے لیکن جب کوئی چیز بانٹی جائے تو چھوٹوں سے ابتداء کی جائے اور یہ طریقہ ہر بات میں سلام، تحیۃ، کھانے و پینے میں اختیار کیا جائے کہ یہی سنت ہے۔ حضرت مہلت علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔ بڑی عمر والے کو ہر بات میں مقدم رکھنا اولیٰ ہے لیکن جب ترتیب کے ساتھ بیٹھیں تو پھر ابتداء داہنی طرف والے سے کی جائے۔ ۲۔ دوسرے کی مسواک استعمال کرنا جائز ہے البتہ مناسب یہ ہے کہ دھو کر استعمال کرے۔ ۳۔ اس حدیث سے مسواک کی فضیلت نکلتی ہے کہ اس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی ہوئی۔ حضور علیہ السلام نے مسواک کے متعلق جو خواب دیکھا وہ وحی ہی تو تھا! (۴) عنوان کا مقصود مسواک کی فضیلت کا اثبات ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ اگر کوئی ایسی چیز آپ کے پاس ہوتی جو عند اللہ معمولی ہے تو حضار مجلس میں سے کمسن سے اس کی تقسیم فرماتے اور اگر وہ چیز ایسی ہوتی جو عند اللہ فضیلت والی ہے تو اس کی تقسیم بڑی عمر والے سے شروع فرمایا کرتے۔ مسواک چونکہ ایک فضیلت والی چیز تھی اسی لیے خواب میں آپ کو بڑی عمر والے کو دینے کی ہدایت دی گئی۔

بَابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الْوُضُوْءِ

باب باوضو سونے کی فضیلت کے بیان میں

۲۴۶۔ عَنِ الْبَرَاءِ ابْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قُلِ اللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ اللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ فَأَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ وَاجْعَلْهُنَّ اٰخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ فَرَدَّدْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَلَغْتُ اللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ قُلْتُ

براء بن عازب سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا جب تو اپنے سونے کی جگہ پر آجائے تو نماز کا سا وضو کرے پھر داہنے کروٹ پر لیٹ کر یوں دعا کر۔ یا اللہ! تیرے ثواب کے شوق میں اور تیرے عذاب کے ڈر سے میں نے اپنے تئیں تیرے سپرد کر دیا اور اپنا کام تجھ کو سونپ دیا اور اپنی پیٹھ تجھ پر ٹیک دی (یعنی تجھ پر بھروسہ کیا) تجھ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور کہیں ٹھکانا نہیں۔ مگر تیرے ہی پاس، یا اللہ میں تیری کتاب (قرآن پاک) پر ایمان لایا جس کو تو نے اتارا اور تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ اب اگر تو اسی رات مر جائے تو اسلام پر رہے گا اور ایسا کر کہ یہ دعا تیرا آخری کلام ہو۔ براء نے کہا۔ میں نے

رَسُوْلِكَ قَالَ لَا وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ (بخاری)

اس دعا کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (یاد کرنے کے لیے) دہرایا۔ جب اس جگہ پہنچا "آمنت بکتابک الذی انزلت" اس کے بعد میں نے یوں کہہ دیا "ورسولک" آپ نے فرمایا نہیں، (بلکہ) یوں کہہ "ونبیک الذی ارسلت"۔

فوائد و مسائل

اس حدیث کو امام نے دعوات میں بھی ذکر کیا ہے۔ مسلم نے دعا میں ابوداؤد نے ادب میں ترمذی نے دعوات میں اور نسائی نے فی الیوم ولیلۃ میں ——— باوضو سونے کی دیگر احادیث میں بھی فضیلت آئی ہے۔ ۲۔ سوتے وقت وضو کرلینا مستحب ہے اور اسی طرح دعا کرنا ۳۔ داہنی کروٹ سونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔ کیونکہ آپ ہر کام میں سیدھی طرف کو پسند فرماتے تھے۔ نیز داہنی کروٹ سونے سے زیادہ غفلت نہیں ہوتی اور تہجد کے لیے آنکھ کھل جاتی ہے ۴۔ اگر پہلے سے کسی کو وضو ہو تو سونے کے لیے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہی وضو کافی ہے اور باوضو سونے کی حکمت یہ ہے کہ ممکن ہے اسی رات موت آجائے تو وضو کی برکت سے شیطان سے محفوظ رہے گا۔ ۵۔ سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور کوئی دنیاوی بات نہ کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا دعا پڑھنا بھی تو اگر اسی نیند میں موت آگئی تو اس کے اعمال کا اختتام وضو پر اور دعا پر جو افضل اعمال ہے، ہوگا ۶۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے کتاب الوضوء کے اخیر میں یہ حدیث درج کرکے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے آدمی وضو بیداری کے اخیر میں کرتا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث کتاب الوضوء کا خاتمہ ہے۔

خاتمہ

اس حدیث مقدس پر كِتَابُ الْوُضُوْءِ ختم ہوئی۔ پارہ دوم انشاء اللہ العزیز كِتَابُ الْغُسْلِ سے شروع ہوگا ——— کتاب الوضوء میں کل مرفوع حدیثیں ۱۵۴ ہیں۔ ان میں سے موصول ۱۱۶ اور بصیغہ مطابعت و تعلیق ۳۸ حدیثیں ہیں اور مکرر ان میں ۷۳ حدیثیں گویا بلا تکرار کل ۸۱ حدیثیں ہیں جن میں ۳ معلق ہیں اور باقی موصول۔ کتاب الوضوء میں صحابہ و تابعین کے آثار موقوف ۴۸ ہیں۔ ان میں تین موصول ہیں باقی معلق ہیں۔

——— وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْن ———

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَبَارَكَ وَسَلَّمَ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى اَعْلَمُ

سید محمود احمد رضوی غفرلہ
دار العلوم حزب الاحناف لاہور
۱۹ ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۹ھ بمطابق ۲۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۹۵ء

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

دینِ مصطفیٰ

عَلَيْهِ التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ

عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق
معاشرت سے متعلق قرآن وحدیث اور
فقہ حنفی کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا
قابل مطالعہ مجموعہ

حسب فرمائش

جناب محترم الحاج امیر بخش صاحب
مخدوم کارپوریشن میکلوڈ روڈ لاہور

تالیف

علامہ سید محمود احمد رضوی

ناظم شعبہ تبلیغ دارالعلوم حزب الاحناف
گنج بخش روڈ
لاہور

روشنی

حضور ہادیِ عالم نورِ مجسم حبیبِ کبریا
سرورِ انبیا، حضرت محمد مصطفٰے علیہ التحیۃ والثنا
کے
ارشادات کا ایمان افروز مجموعہ

●

علامہ **سید محمود احمد رضوی**

تنظیم تبلیغ دار العلوم حزب الاحناف لاہور